نادر و نایاب تاریخی
رنگین تصاویر کے ساتھ

اللھم صل علی محمد النبی
الامی وعلی الہ وسلم تسلیما

افضل البشر خیر الرسل خاتم النبیین

ورفعنا لک ذکرک

حیاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

THE LIFE AND TIMES OF HOLY PROPHET (P.B.U.H)

A COMPREHENSIVE ACCOUNT

مصنف
ڈاکٹر محمد حسین ہیکل

مترجم
معاذ ہاشمی

حیاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مصنف
ڈاکٹر محمد حسین ہیکل

تہذیب وترجمہ
معاذ ہاشمی

اللہ رسول محمد

اے رب! میرے علم میں اضافہ فرما۔

ہماری کتابیں، معیاری کتابیں، پیاری کتابیں

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

١٤٥٢٩٦

ناشر: زاہد شیخ

نام کتاب حیات محمد ﷺ

مصنف ڈاکٹر محمد حسین ہیکل

تہذیب و ترجمہ معاذ ہاشمی

تزئین و اہتمام معاذ ہاشمی

پکچرز ایڈیٹنگ محمد عامر رشید / معظم جاوید

سرورق حامد رؤف / محمد ذیشان صدیقی

مطبع مجاہد پرنٹنگ پریس

مارکیٹنگ ایگزیکٹو عقیل باقر

سن اشاعت 2017ء

ٹائٹل خطاطی محمد عارف نوشاہی

ضروری گزارش

ایک مسلمان، قرآن مجید، احادیث اور دیگر دینی کتب میں عمداً غلطی کا تصور نہیں کر سکتا۔ سہواً جو اغلاط ہو گئی ہوں، اس کی تصحیح و اصلاح کا انتہائی اہتمام کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے ہر کتاب کی تصحیح پر ہم زرِ کثیر صرف کرتے ہیں۔ تاہم انسان، انسان ہی ہے۔ اگر اس اہتمام کے باوجود بھی کسی غلطی پر آپ مطلع ہوں تو اسی گزارش کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں فوری مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے اور آپ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى کے مصداق بن جائیں۔

جزاکم اللہ تعالٰی جزاءً جمیلاً جزیلاً

والسلام

مفتی عاصم زبیر ہاشمی

محکمہ جیل خانہ جات حکومت پنجاب

خوبصورت اور معیاری کتاب چھپوانے کے لئے رابطہ کریں۔ زاہد شیخ 0300-9476417

Marfat.com

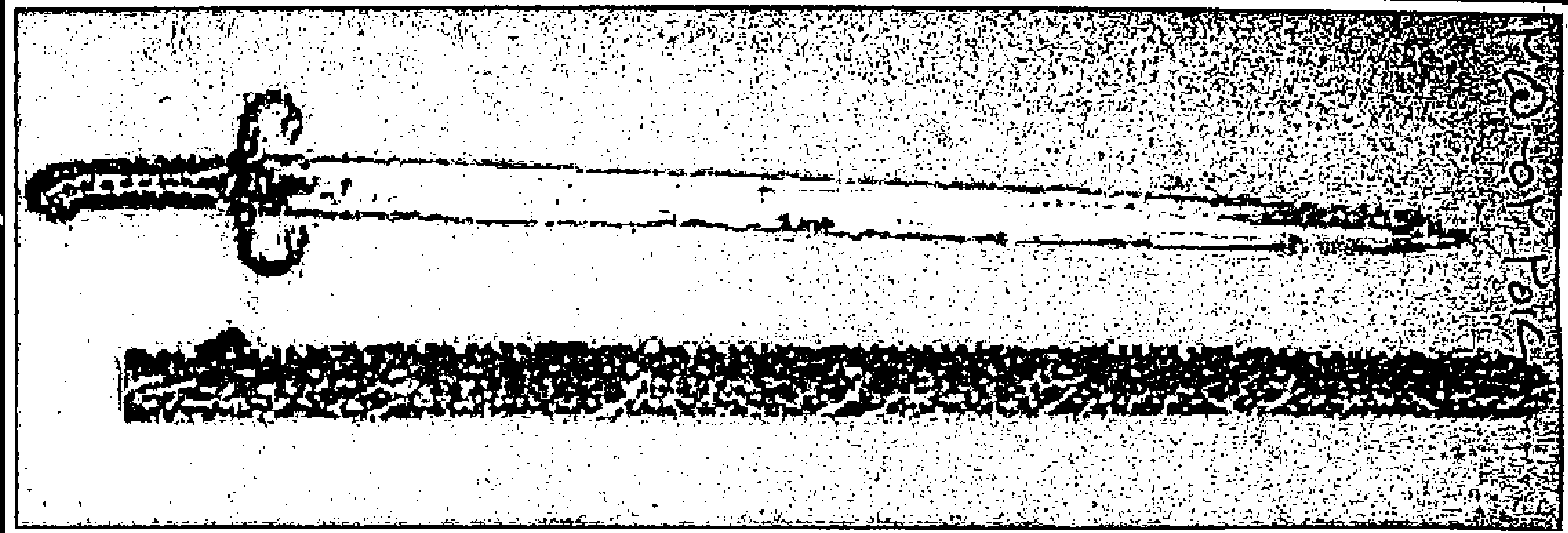

سیف الماثور

سیف البتار

سیف ذوالفقار

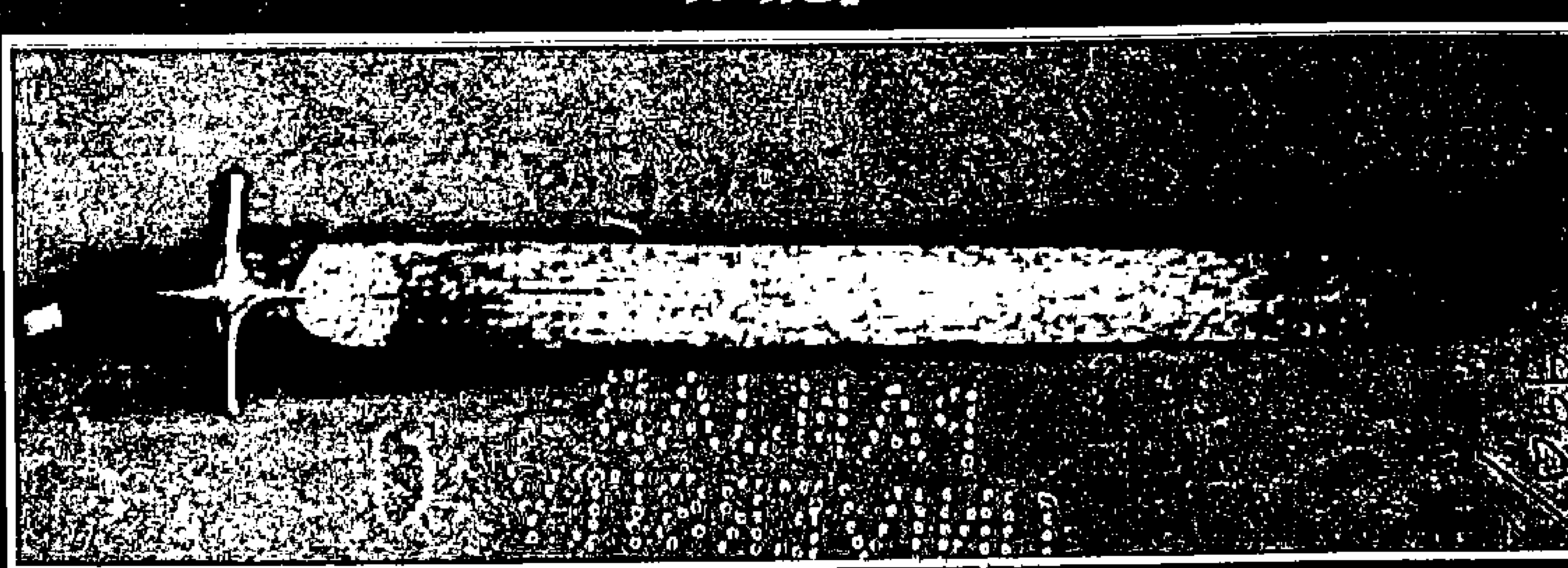

سیف الحتف

Marfat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلواریں

سیف المخذم

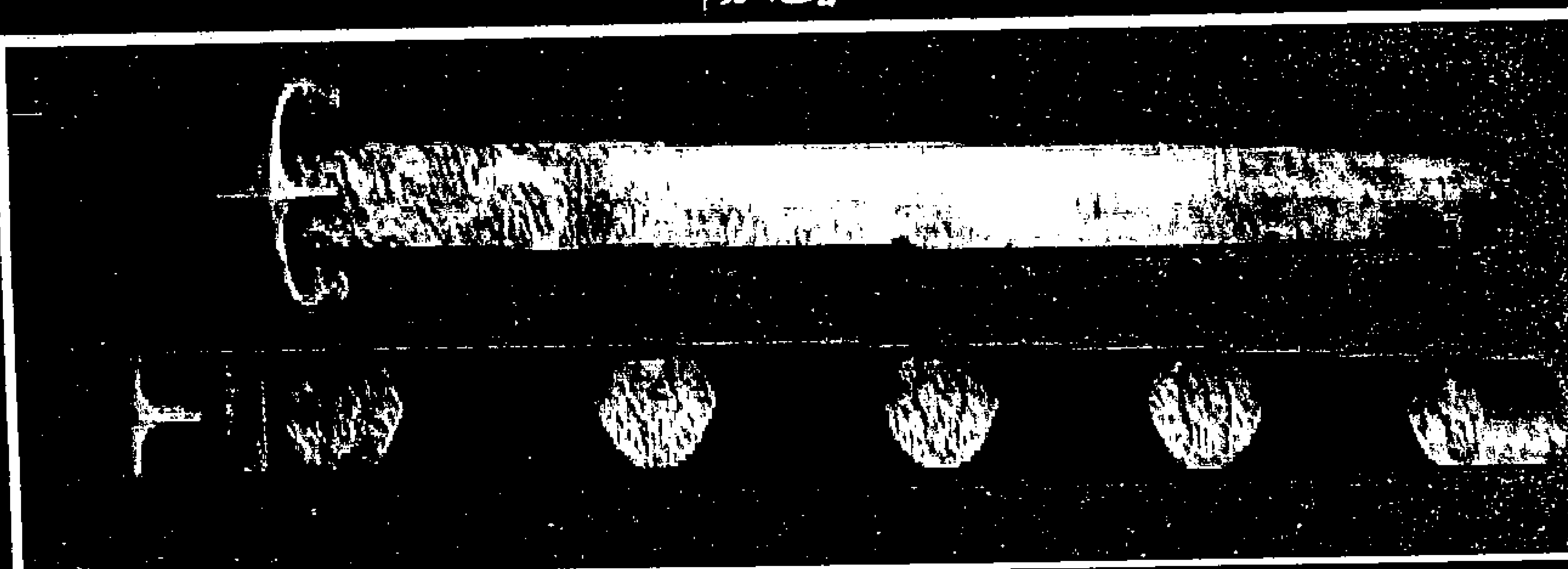

سیف الرسوب

سیف العضب

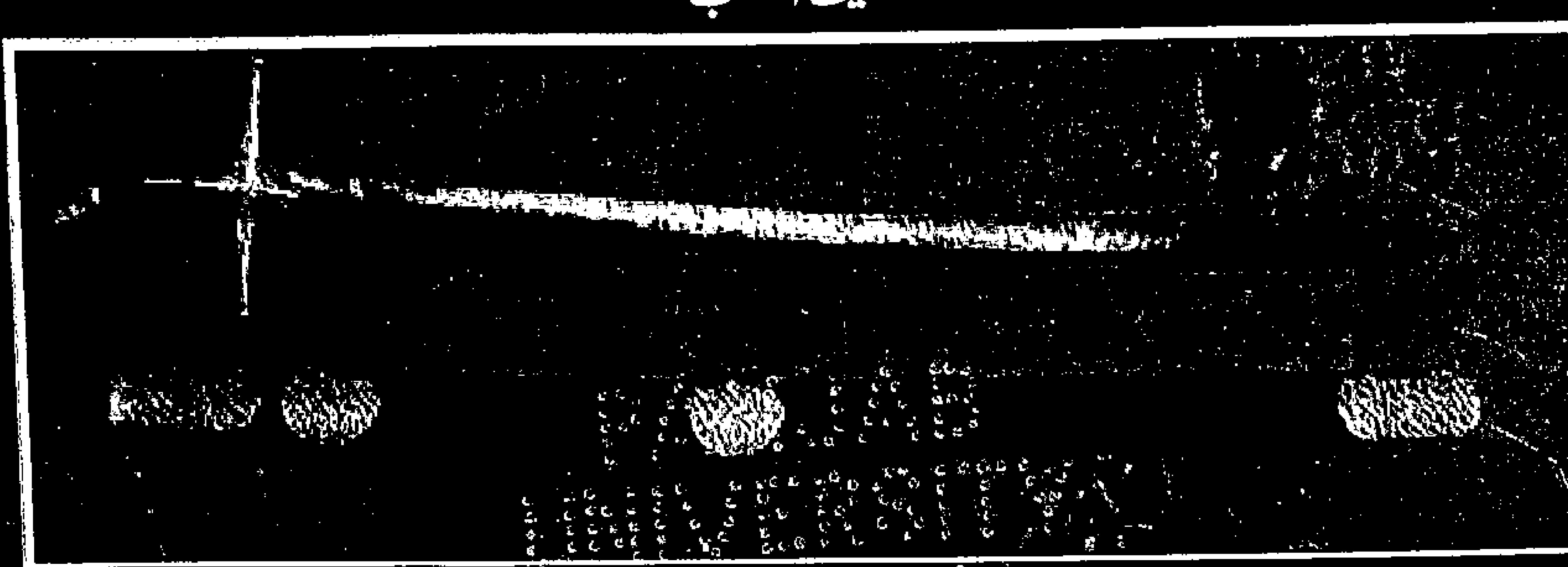

سیف القضیب

Marfat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلواریں

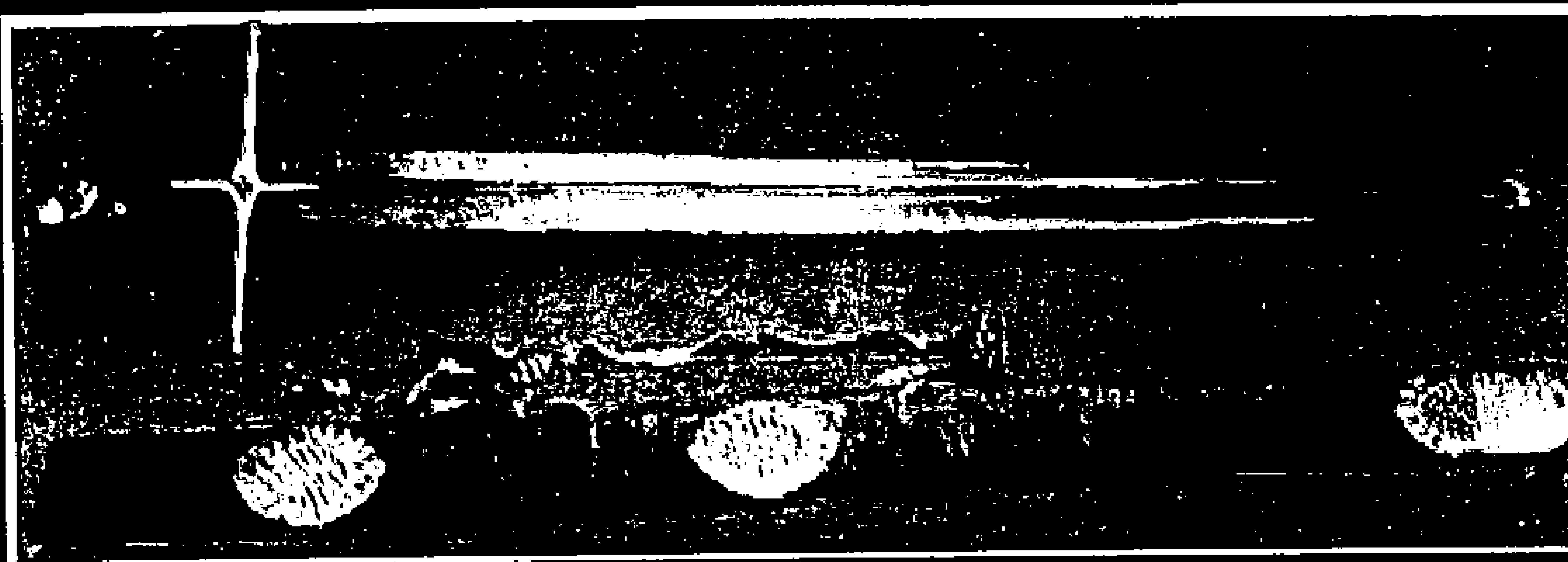

سیف القلعی

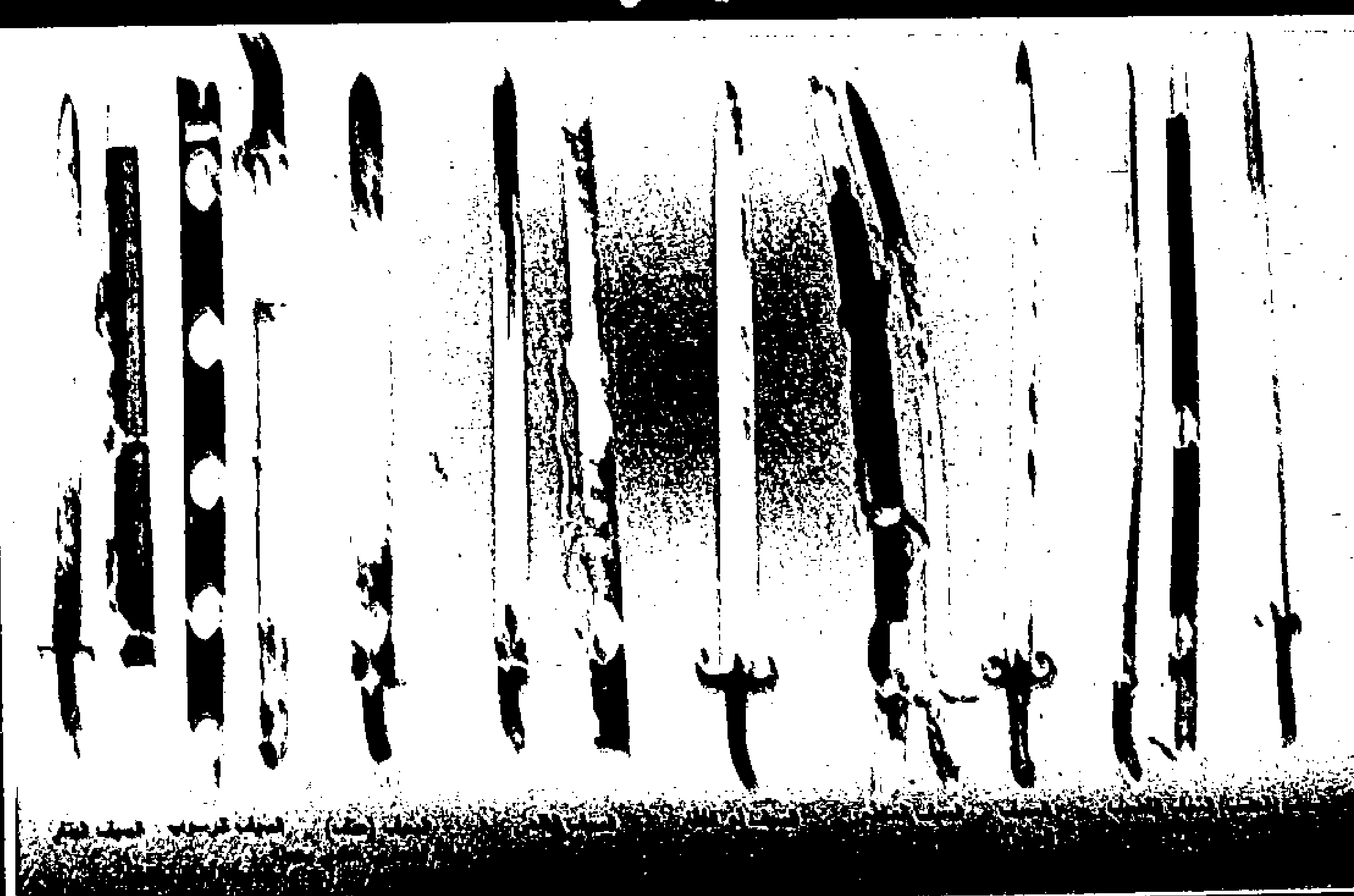

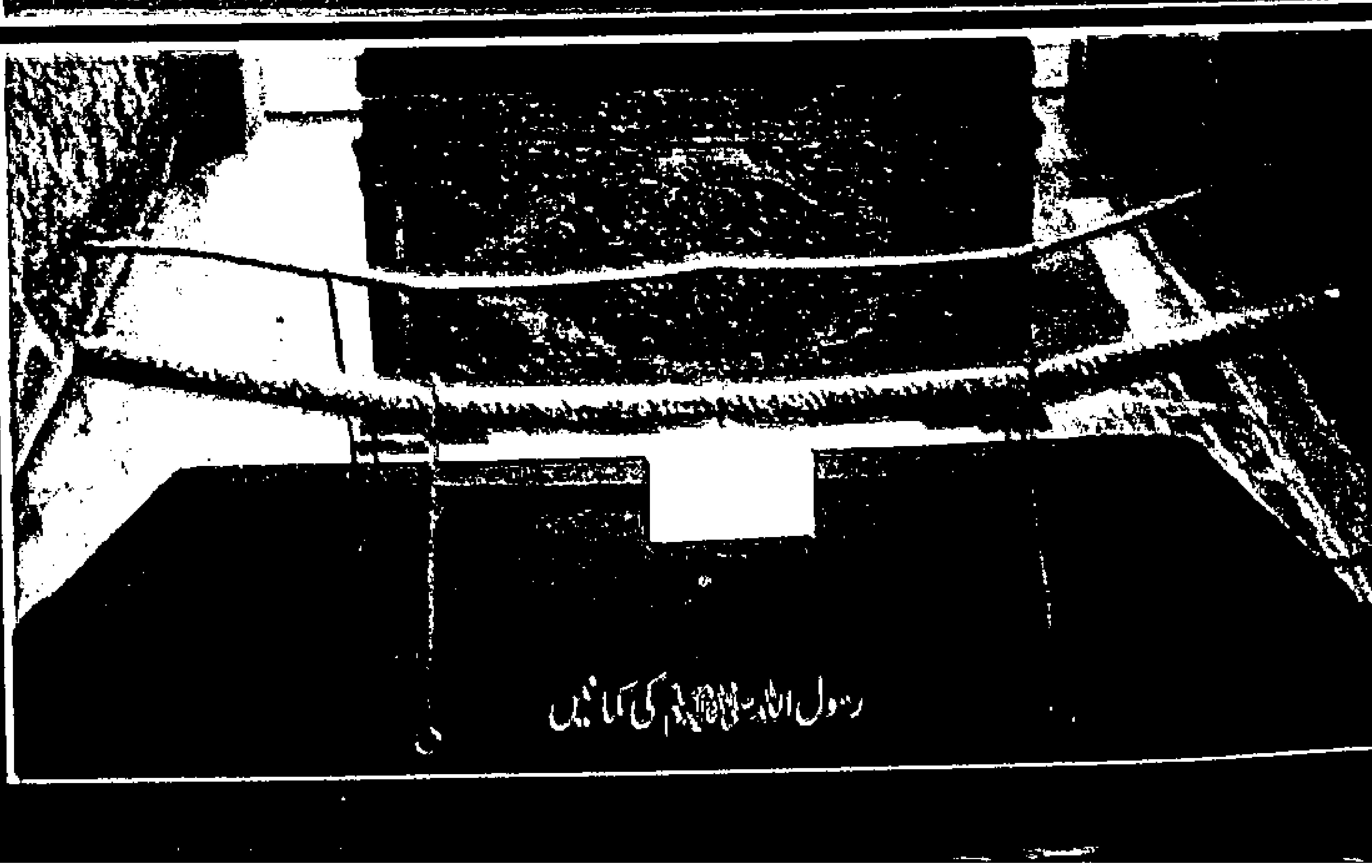

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کمانیں

Marfat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار کا غلاف

شاہ مصر مقوقس کے نام لکھا گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نامہ مبارک

Marfat.com

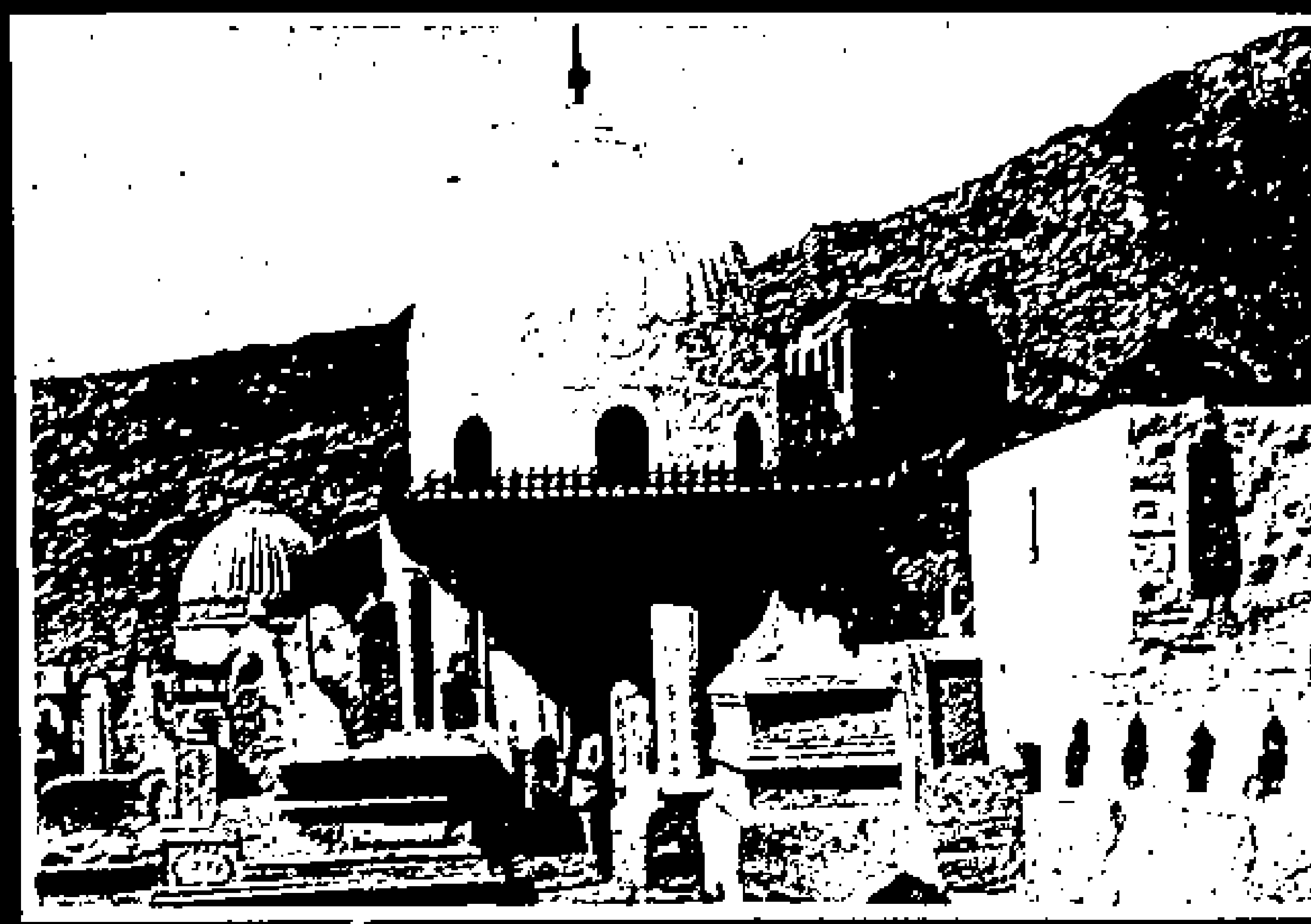

حضرت خدیجہؓ کا روضہ مبارک (قدیم عکس)

مولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

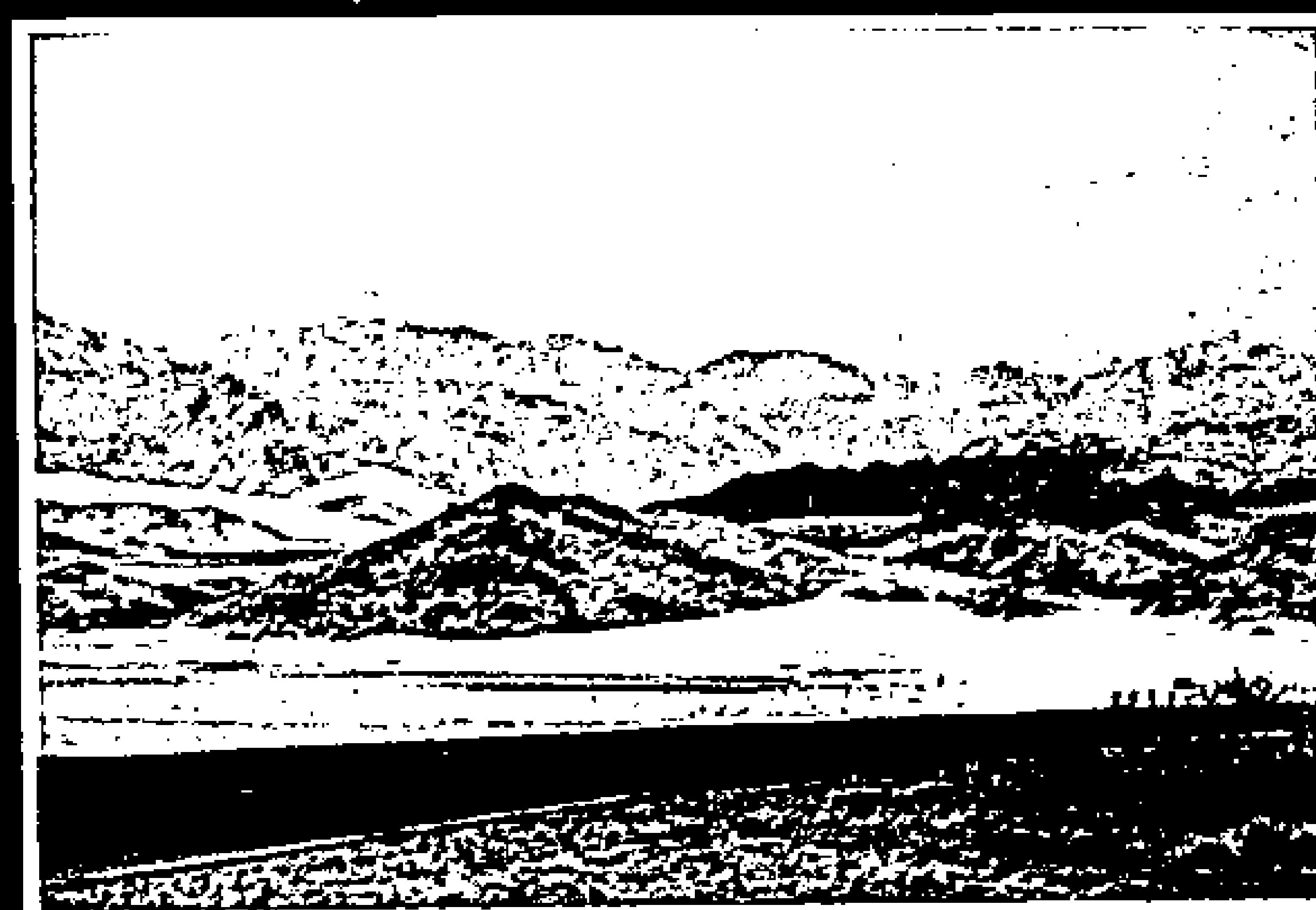

وادیٔ طائف

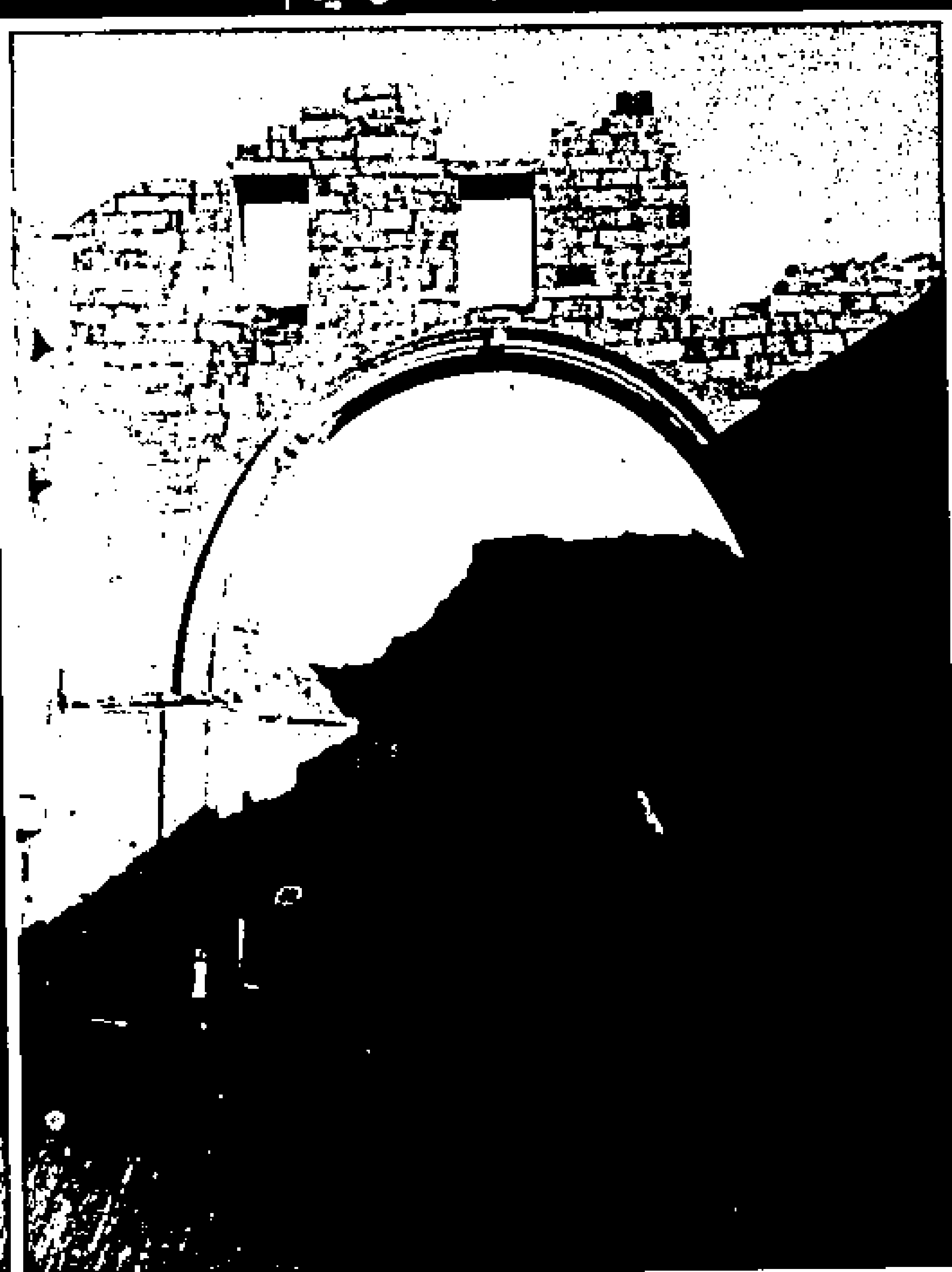

بحیرہ راہب کا گرجا

جبل احد کی دراڑ

غار حرا

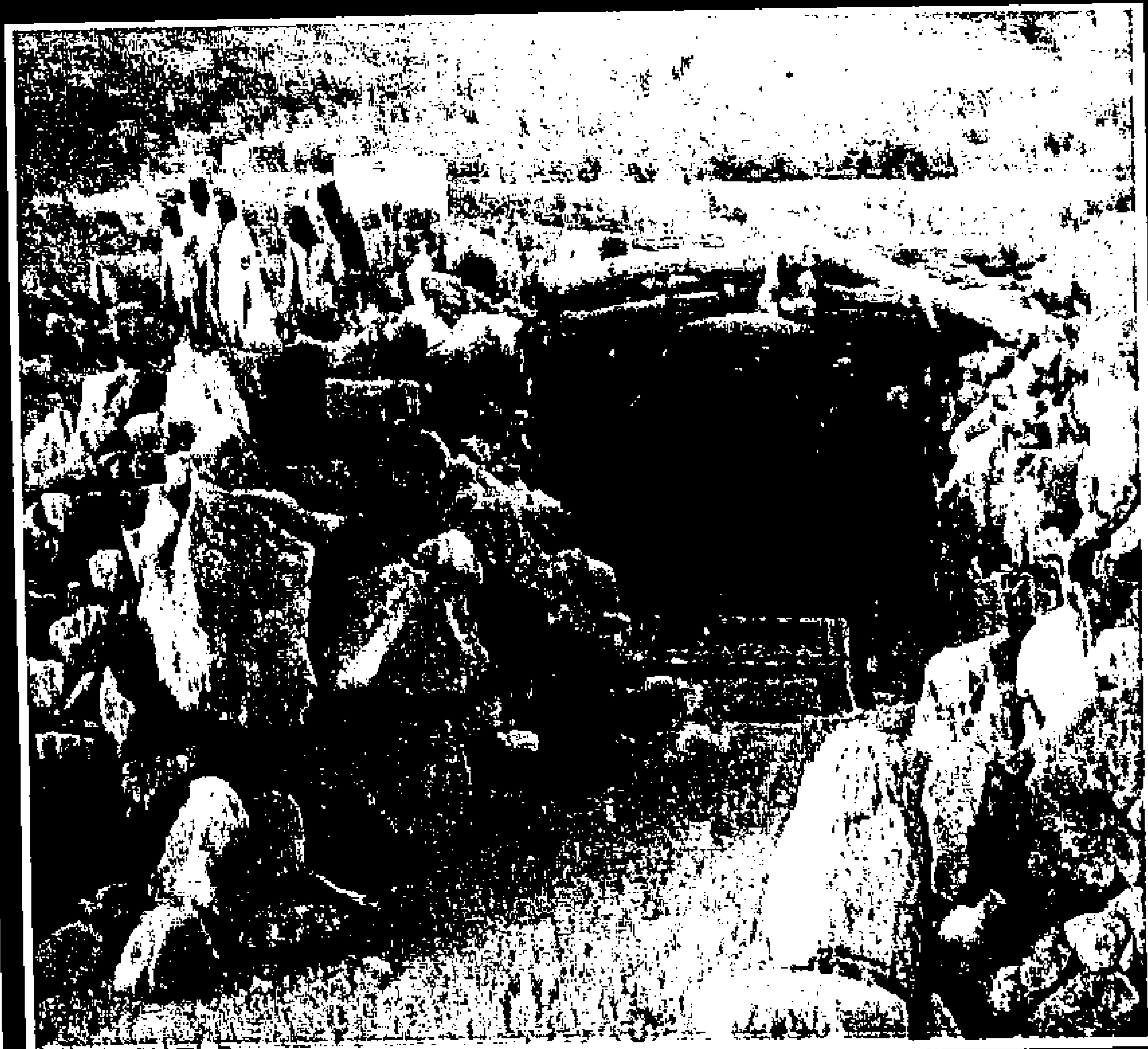

وہ کھنڈر جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حلیمہ سعدیہ کا گھر ہوتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بچپن یہاں گذرا تھا

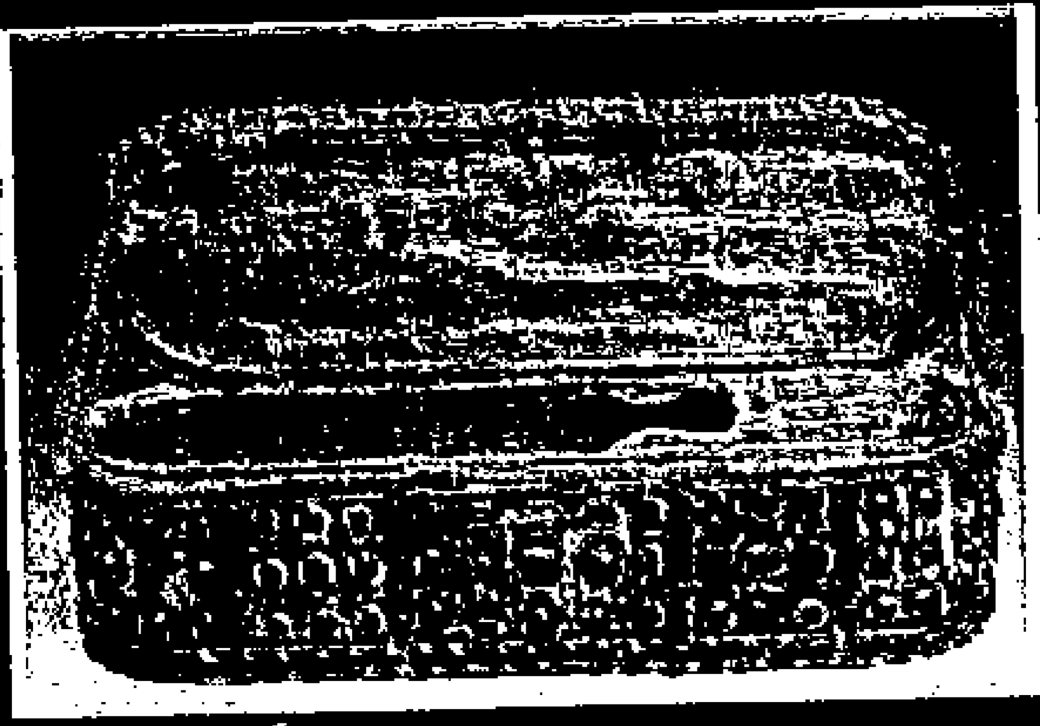

دندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بکس

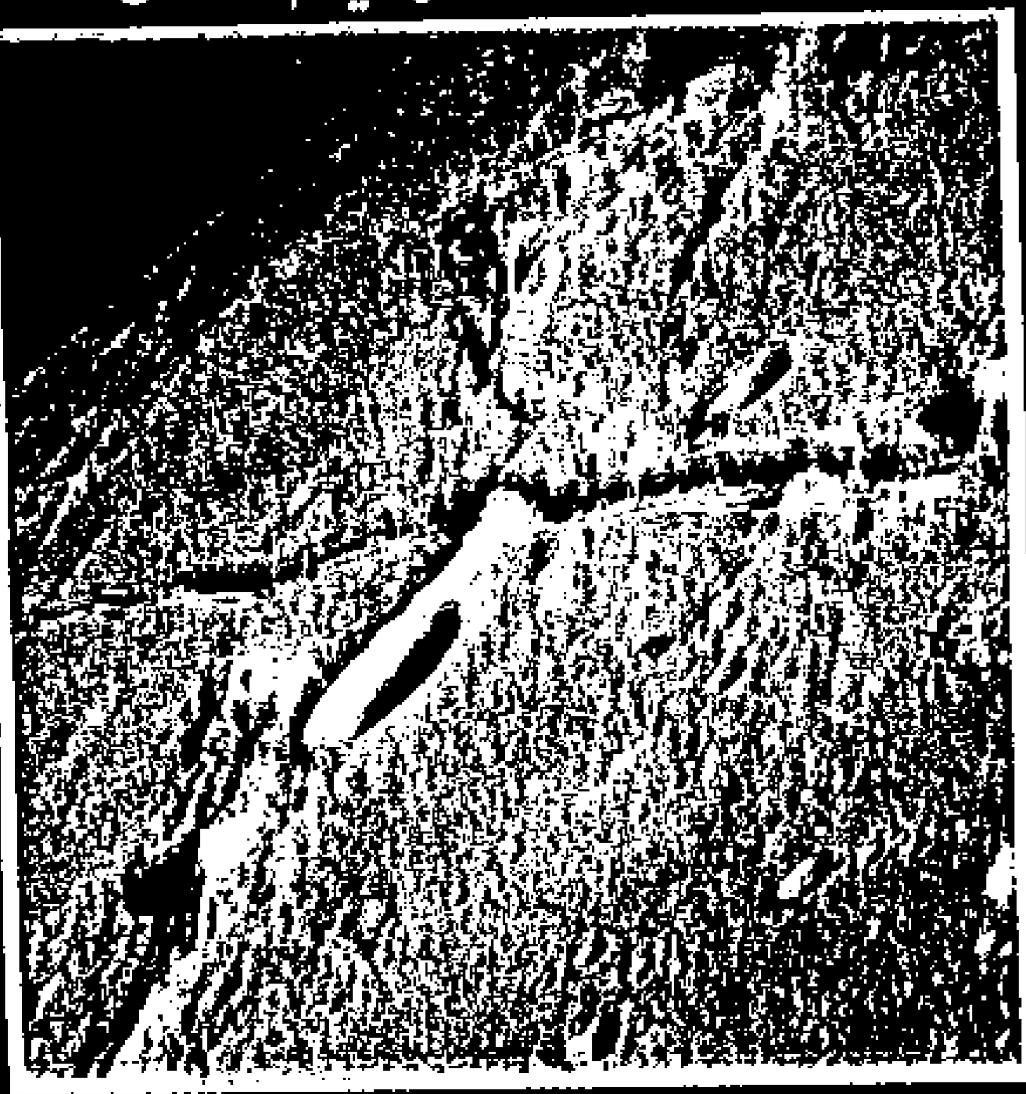

شق القمر کا سائنسی ثبوت

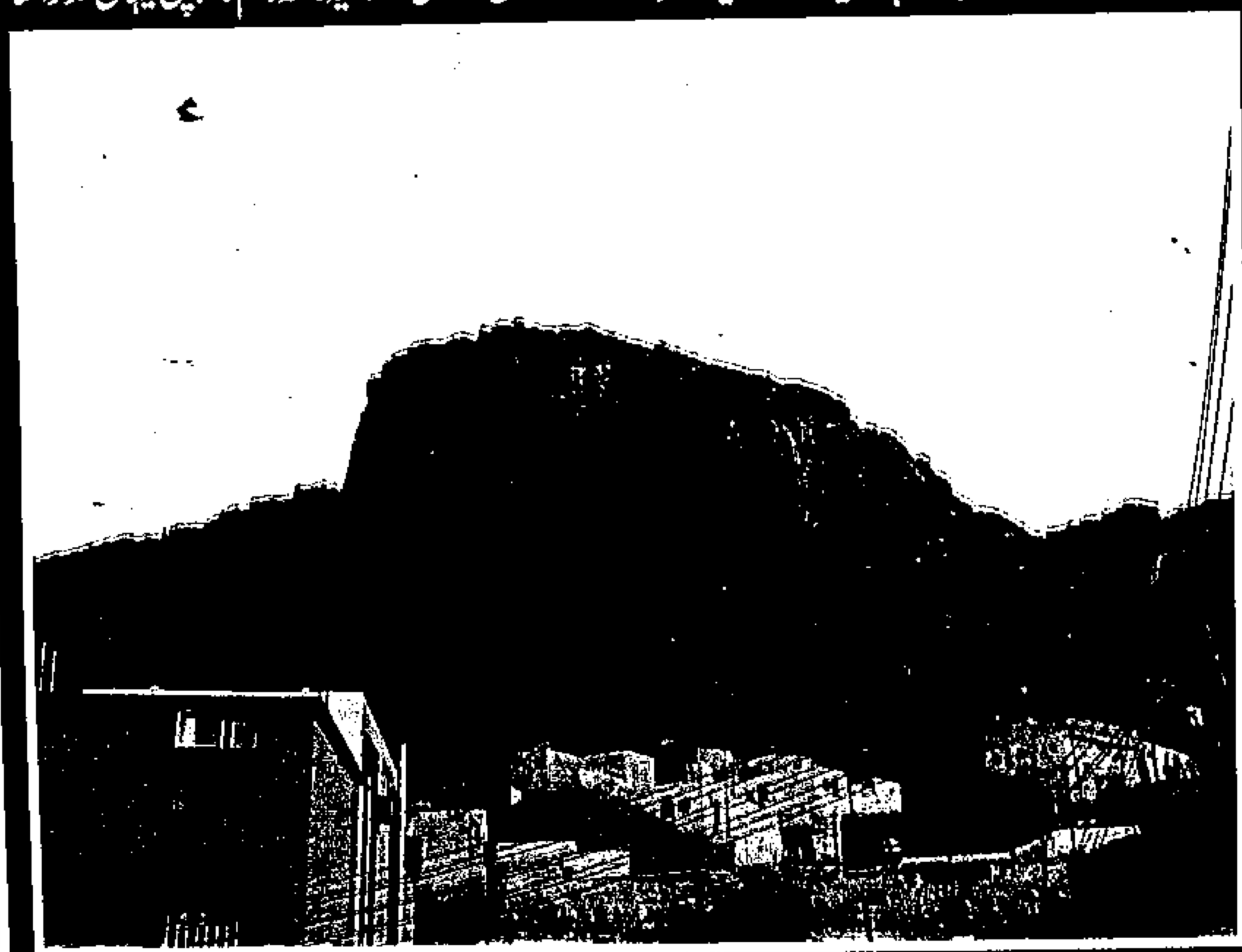

جبل نور کا منظر

حضرت خدیجہؓ کا مکان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مبارک کا ستر

دار الارقم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہلا تبلیغی مقام

Marfat.com

مکہ معظمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے 28 سال بسر کئے

مكان استقبال الوفود

مدخل غرفة الرسول صلى الله عليه وسلم

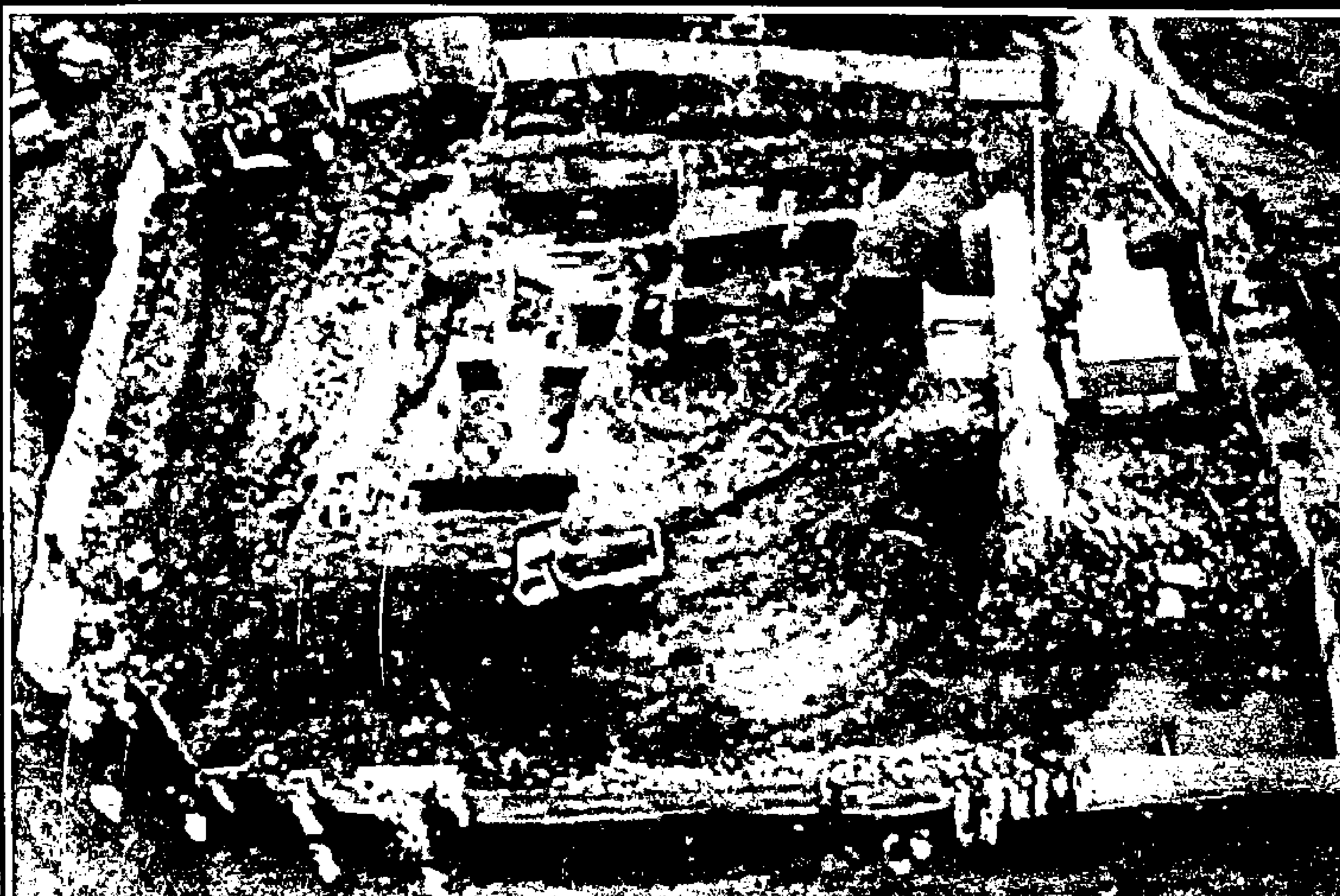

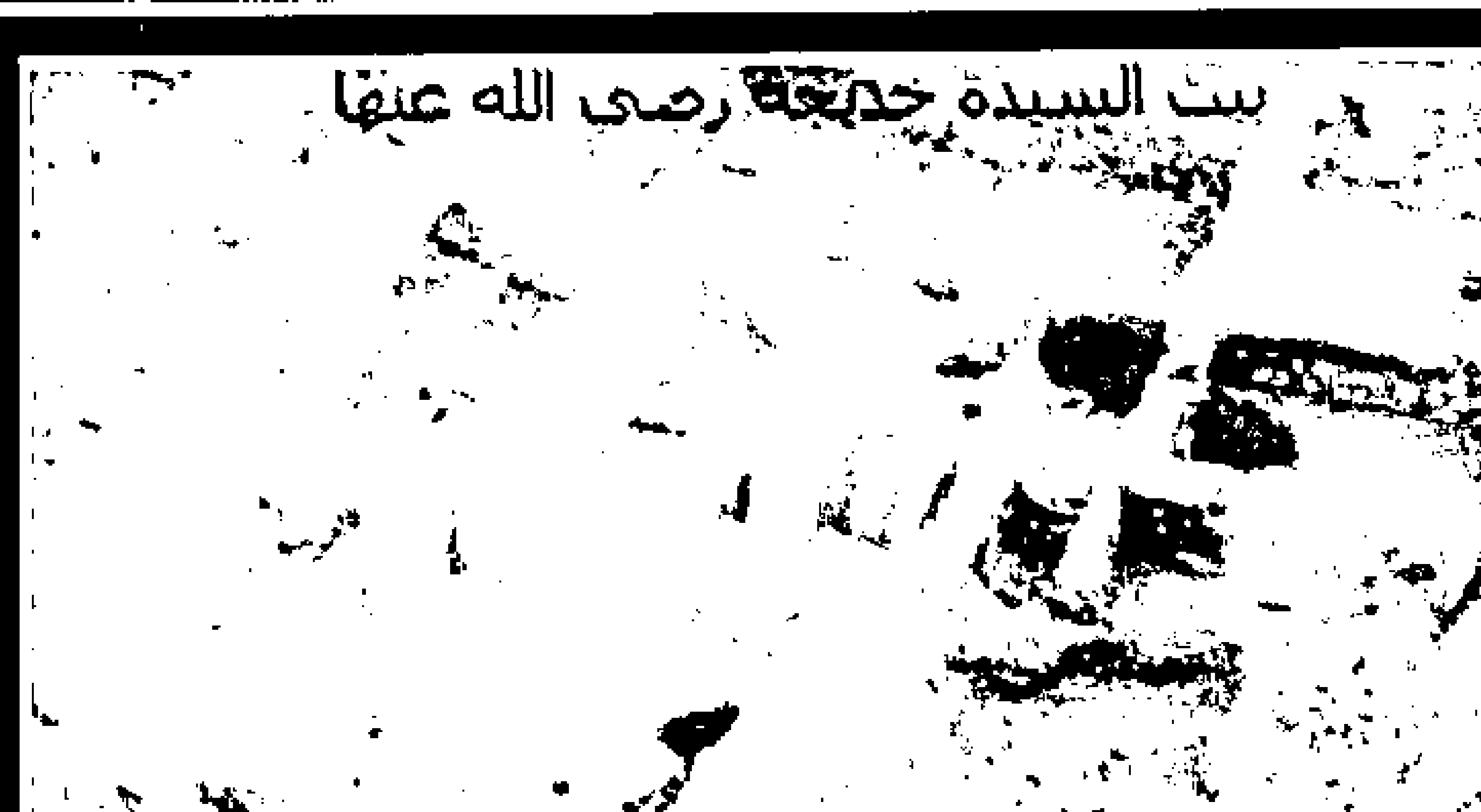
بيت السيدة خديجة رضي الله عنها

مصلى النبي صلى الله عليه وسلم

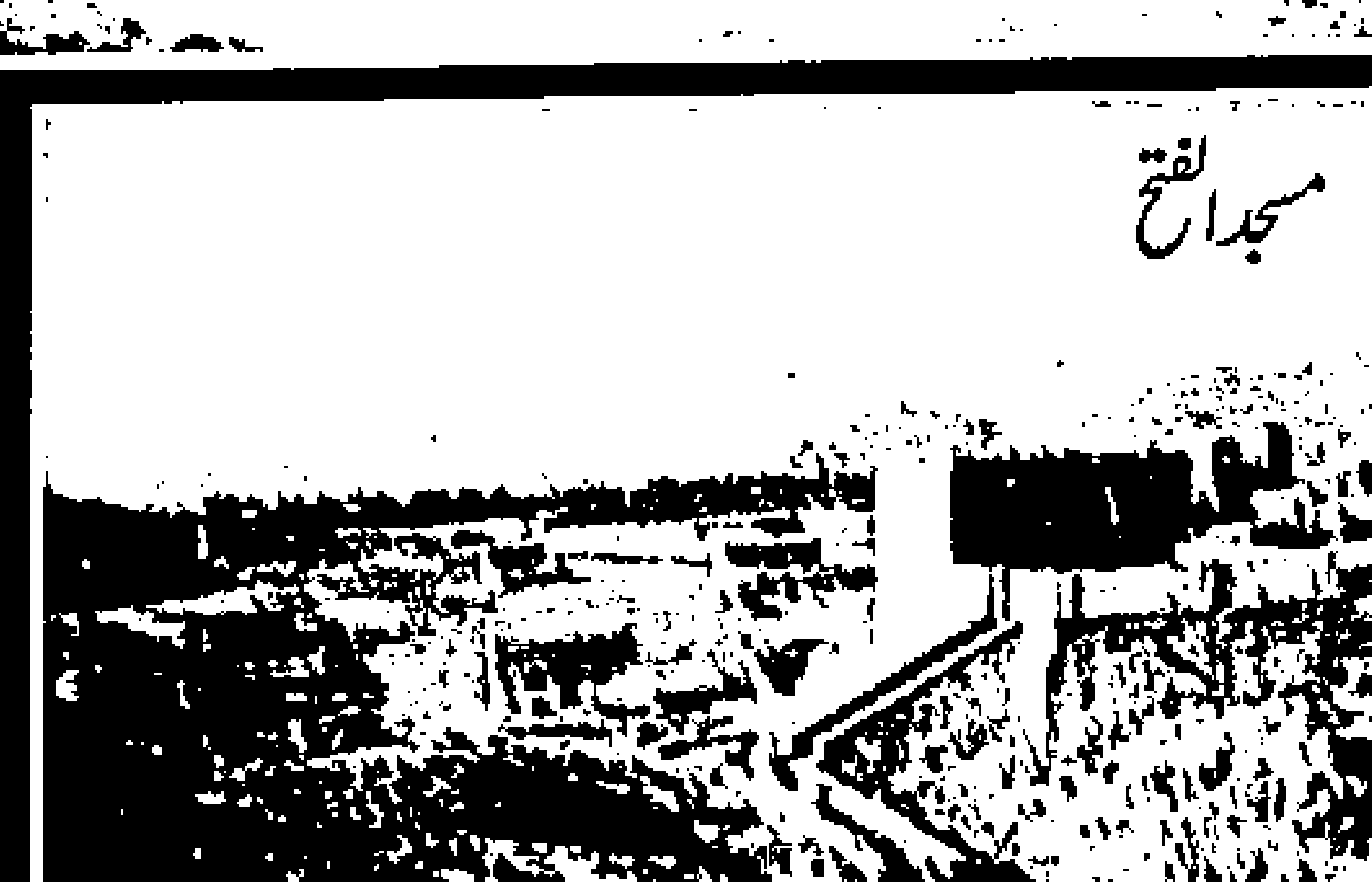
مسجد الفتح

Marfat.com

قبر مبارک حضرت سیدہ بی بی آمنہ

قبر مبارک حضرت ابراہیم علیہ السلام ابن حضرت محمد ﷺ

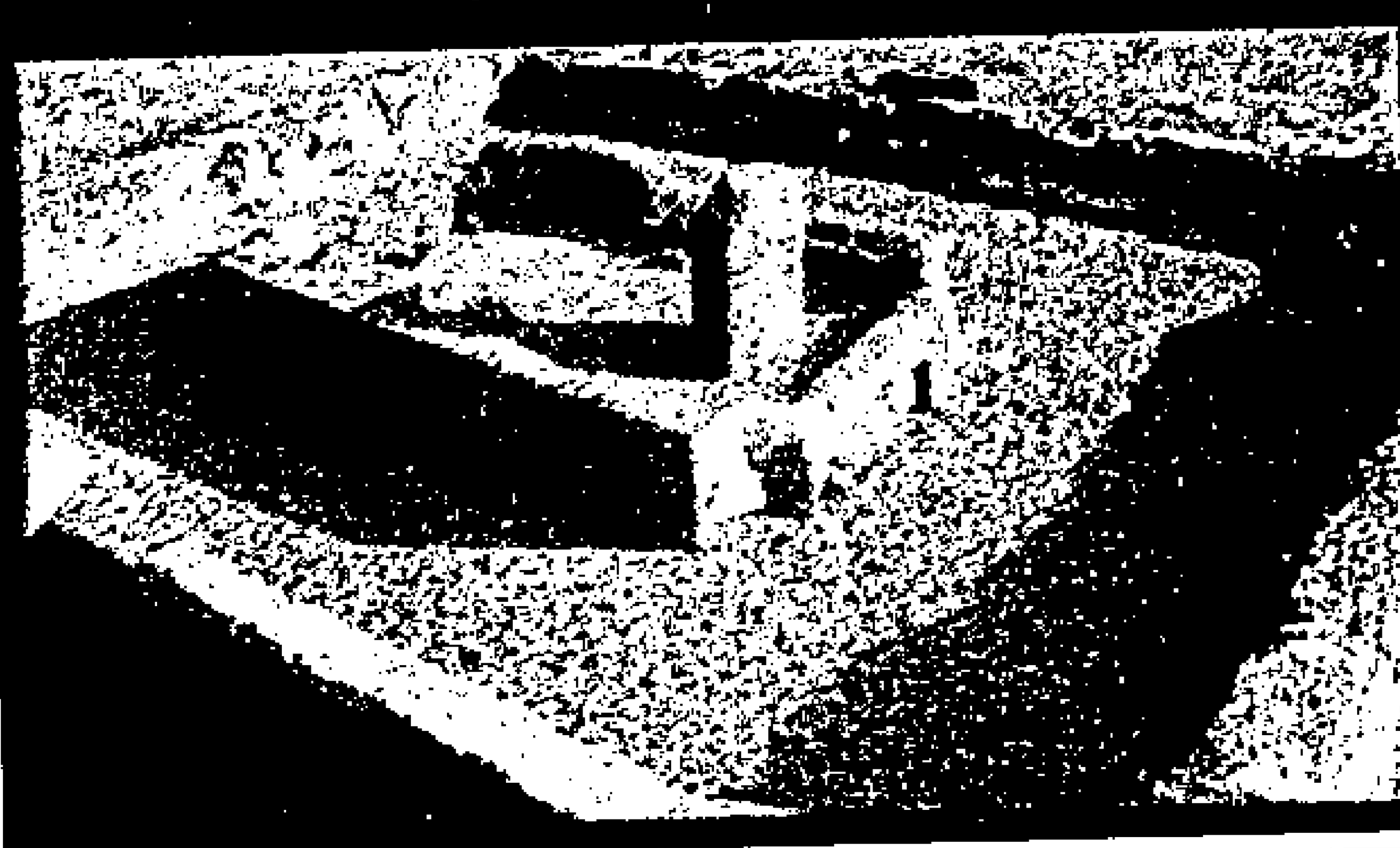

روضہ پاک کی جالی

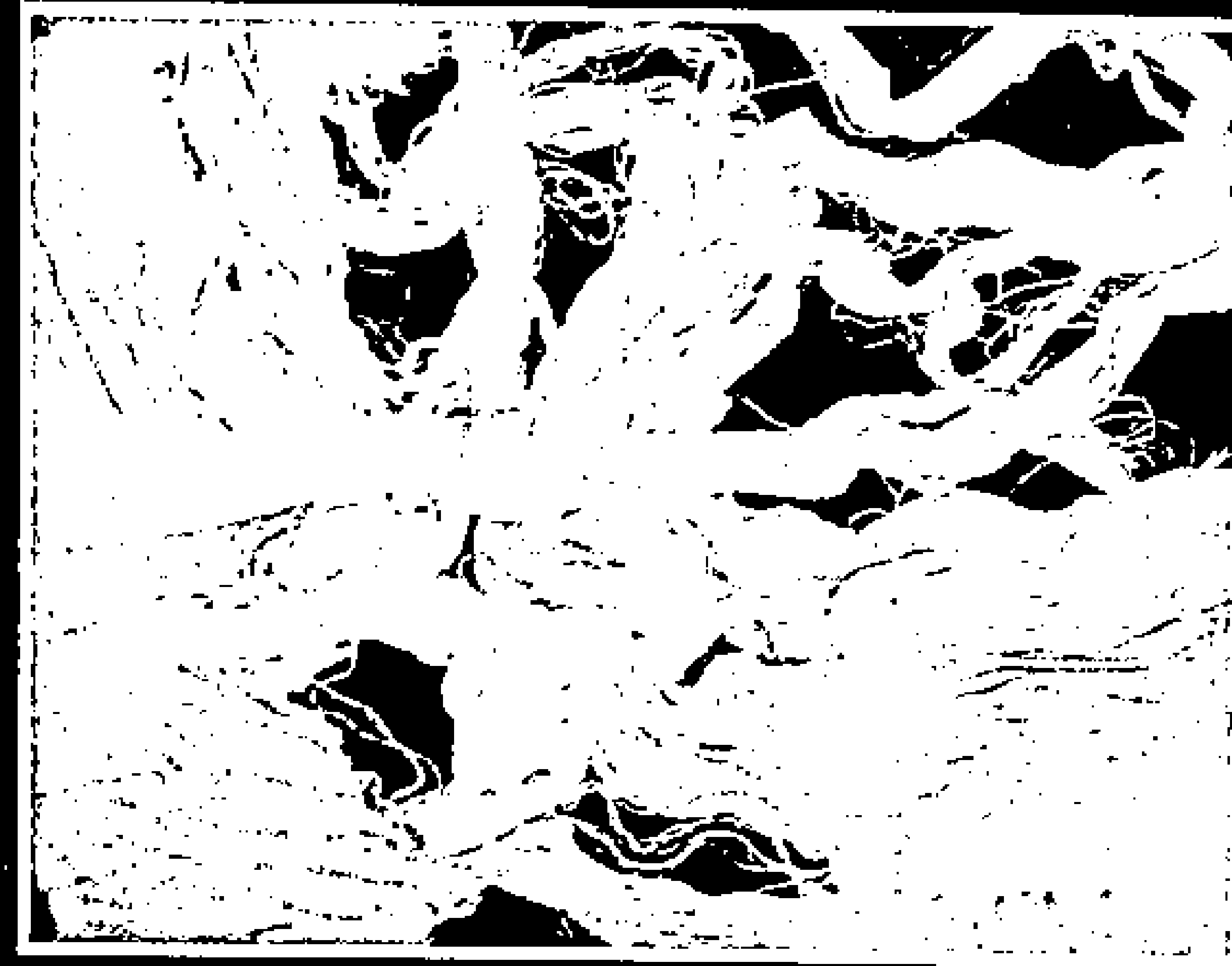

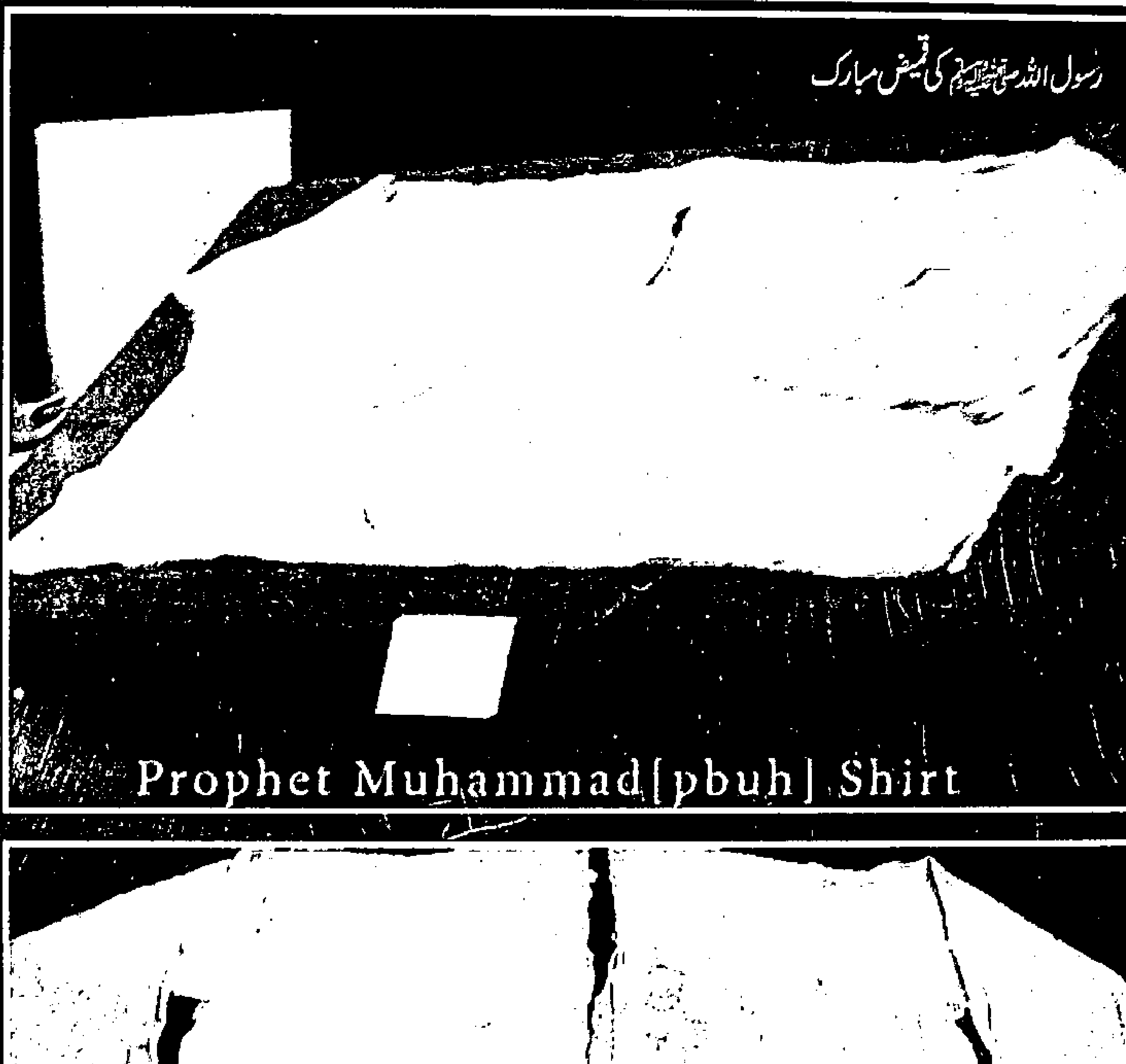

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قمیض مبارک

Prophet Muhammad[pbuh] Shirt

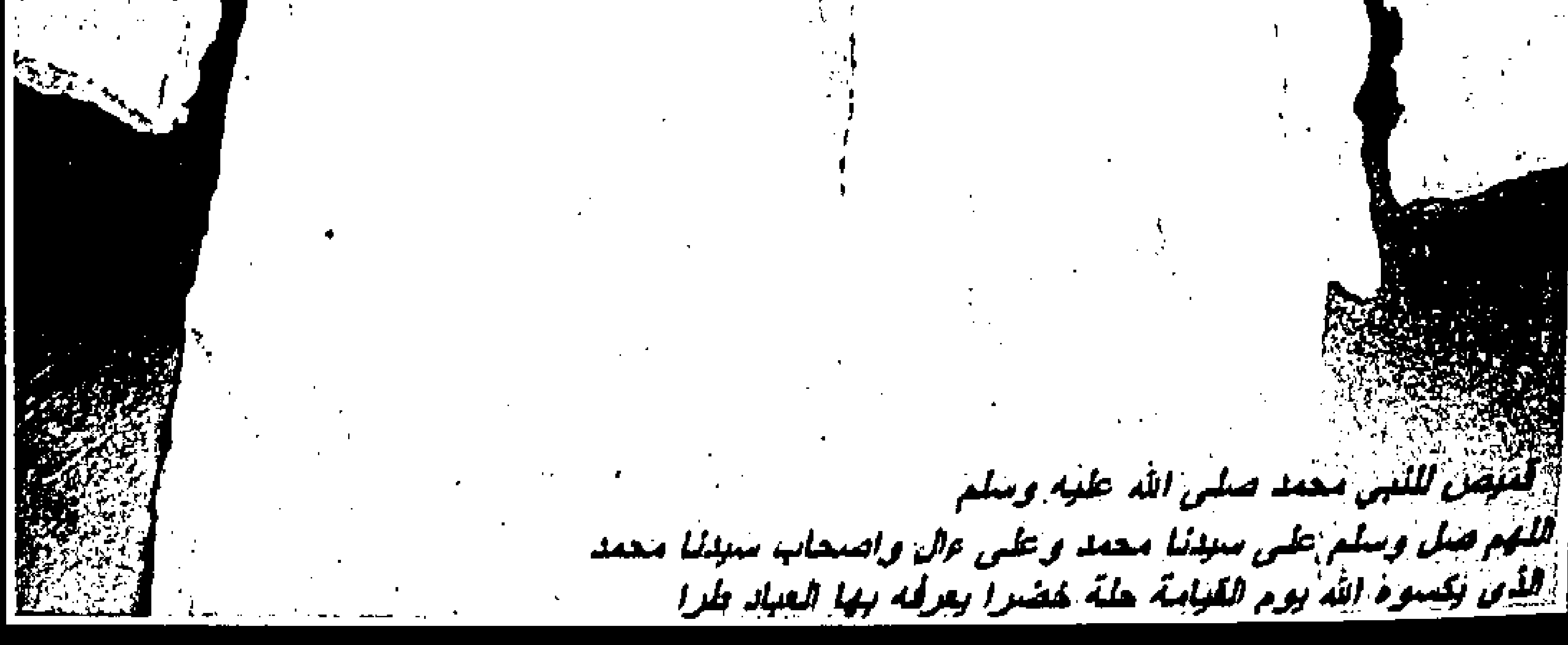

قميص للنبي محمد صلى الله عليه وسلم
اللهم صل وسلم على سيدنا محمد وعلى ءال واصحاب سيدنا محمد
الذى يكسوه الله يوم الكيامة حلة خضرا يعرفه بها العباد طرا

نعلین شریف

صندل من جلد كان للنبي محمد صلى الله عليه وسلم

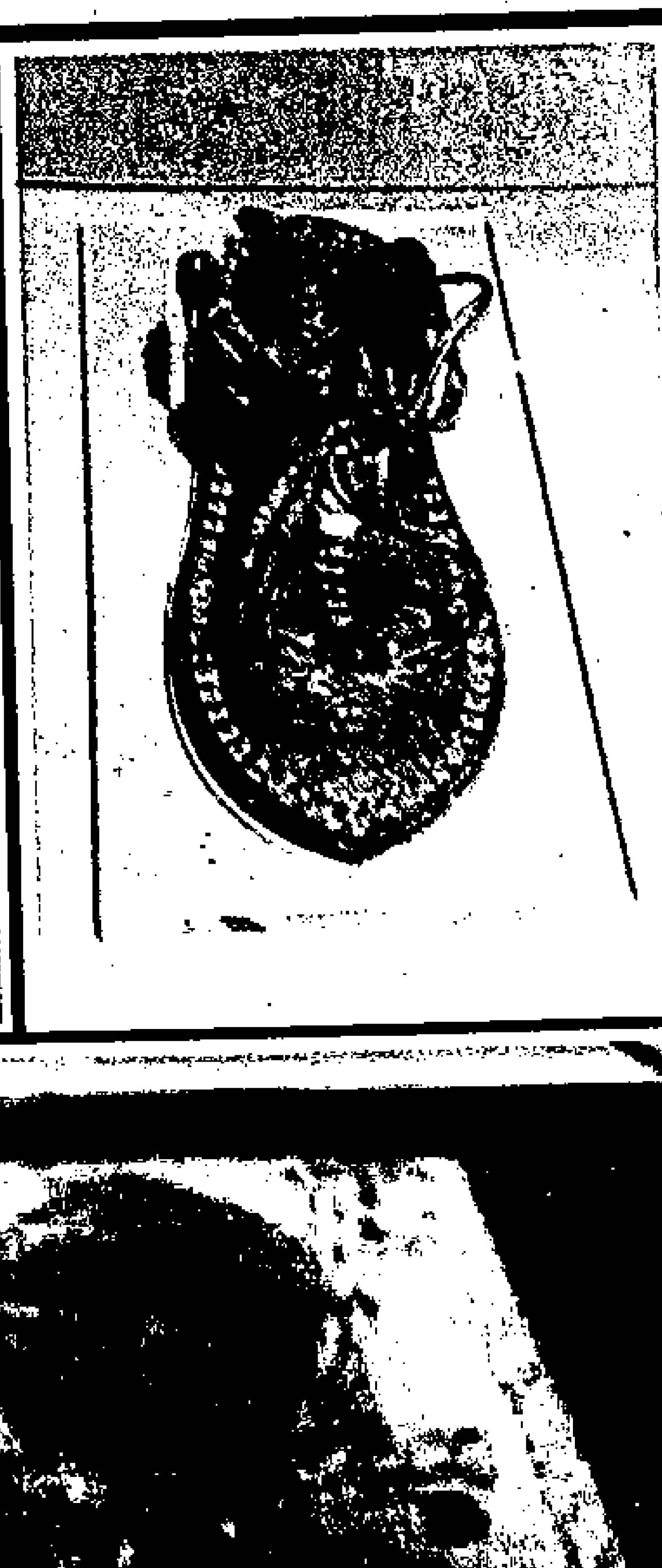

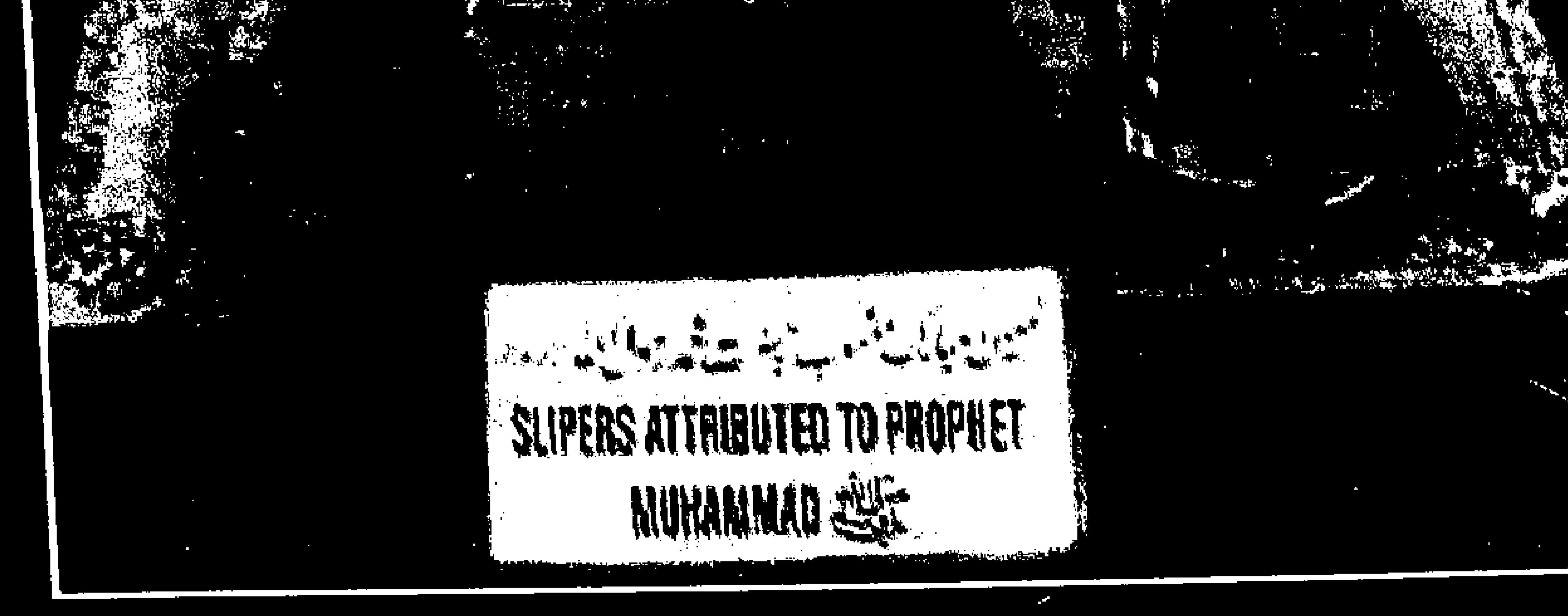
SLIPERS ATTRIBUTED TO PROPHET
MUHAMMAD ﷺ

Marfat.com

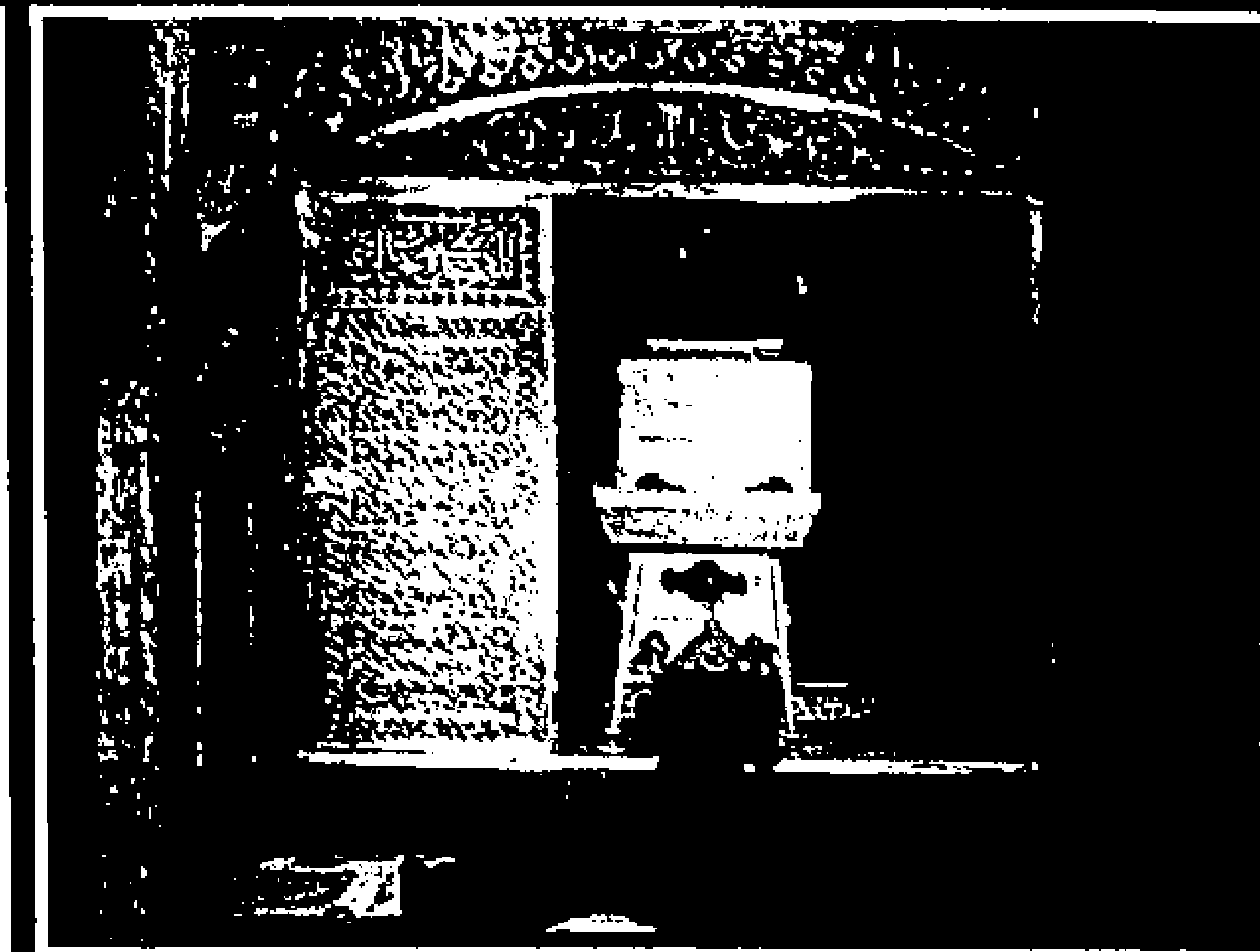

رسول اللہ ﷺ کا کمرکوٹ

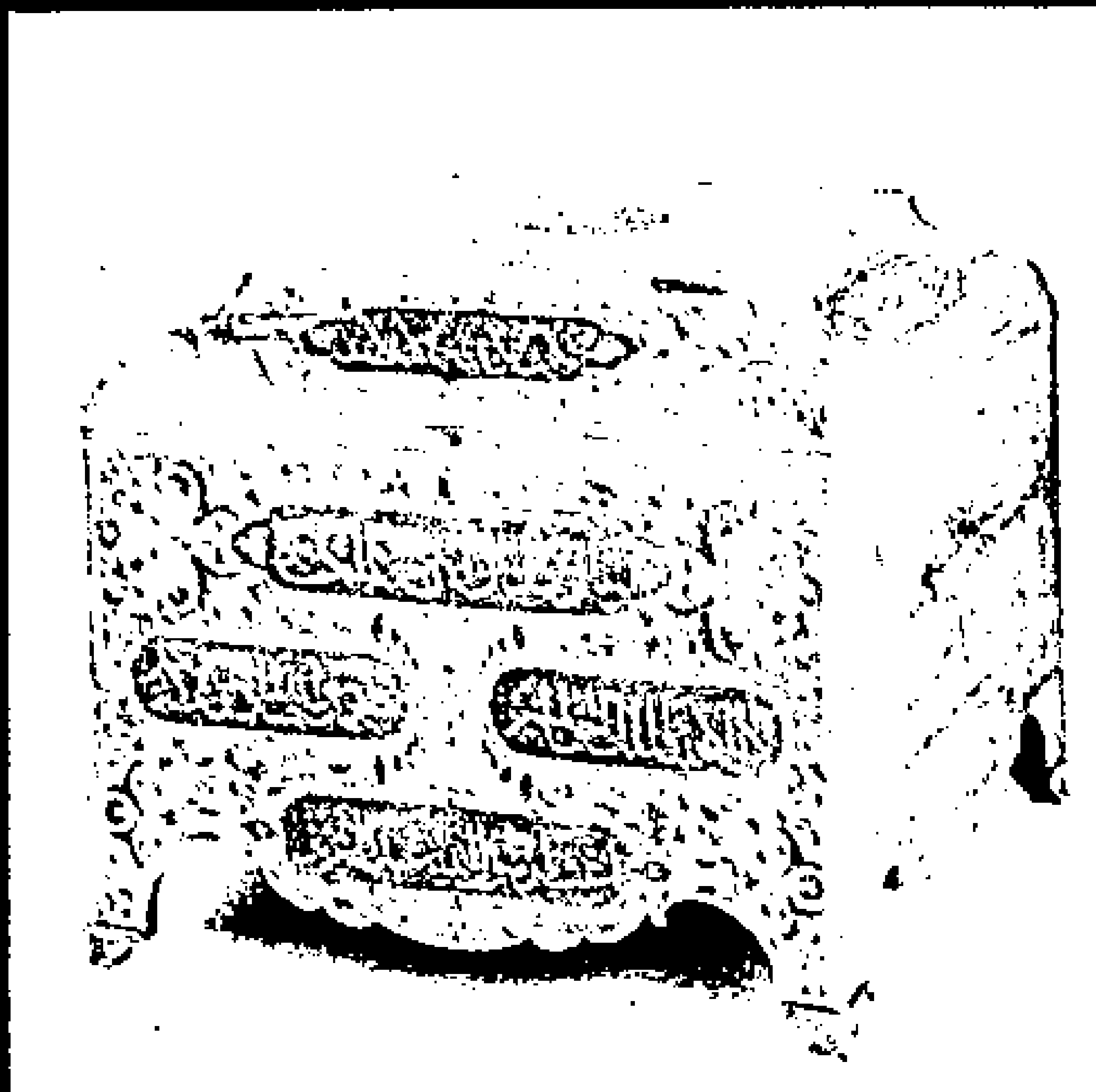

رسول اللہ ﷺ کا کمرکوٹ

رسول اللہ ﷺ کی زلف مبارک

رسول اللہ ﷺ کا جبہ مبارک

رسول اللہ ﷺ کی مہر مبارک

رسول اللہ ﷺ کی مہر مبارک

Marfat.com

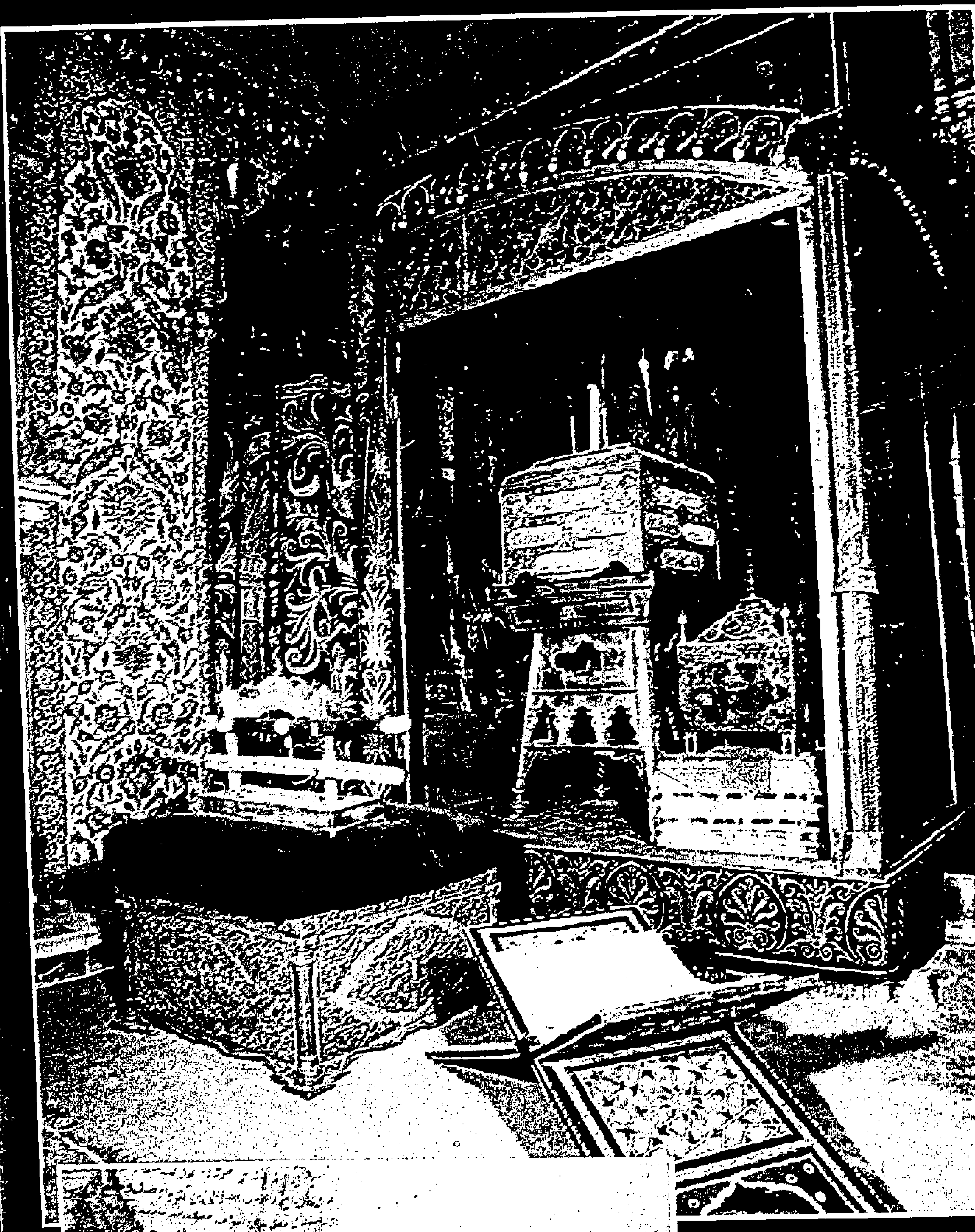

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے تبرکات
(ٹوپ کاپی میوزیم ترکی)

Marfat.com

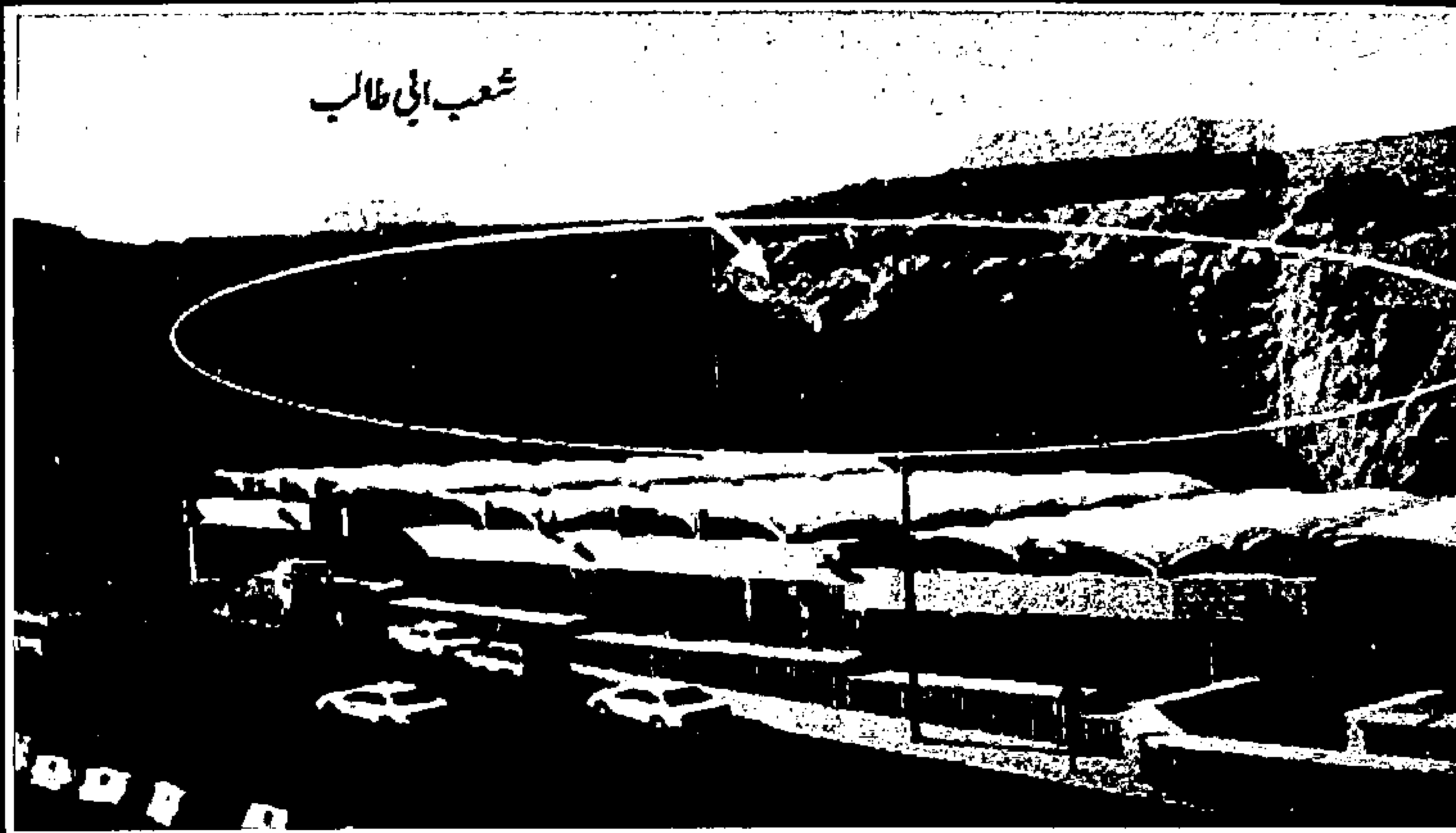

شعب ابی طالب نامی گھاٹی جہاں رسول اللہ ﷺ قریش مکہ کے بائیکاٹ کے بعد مقیم ہوئے

حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مکان

ایرانی فلم محمد رسول اللہ کیلئے تعمیر کیا گیا شعب ابی طالب کا عکسی سیٹ

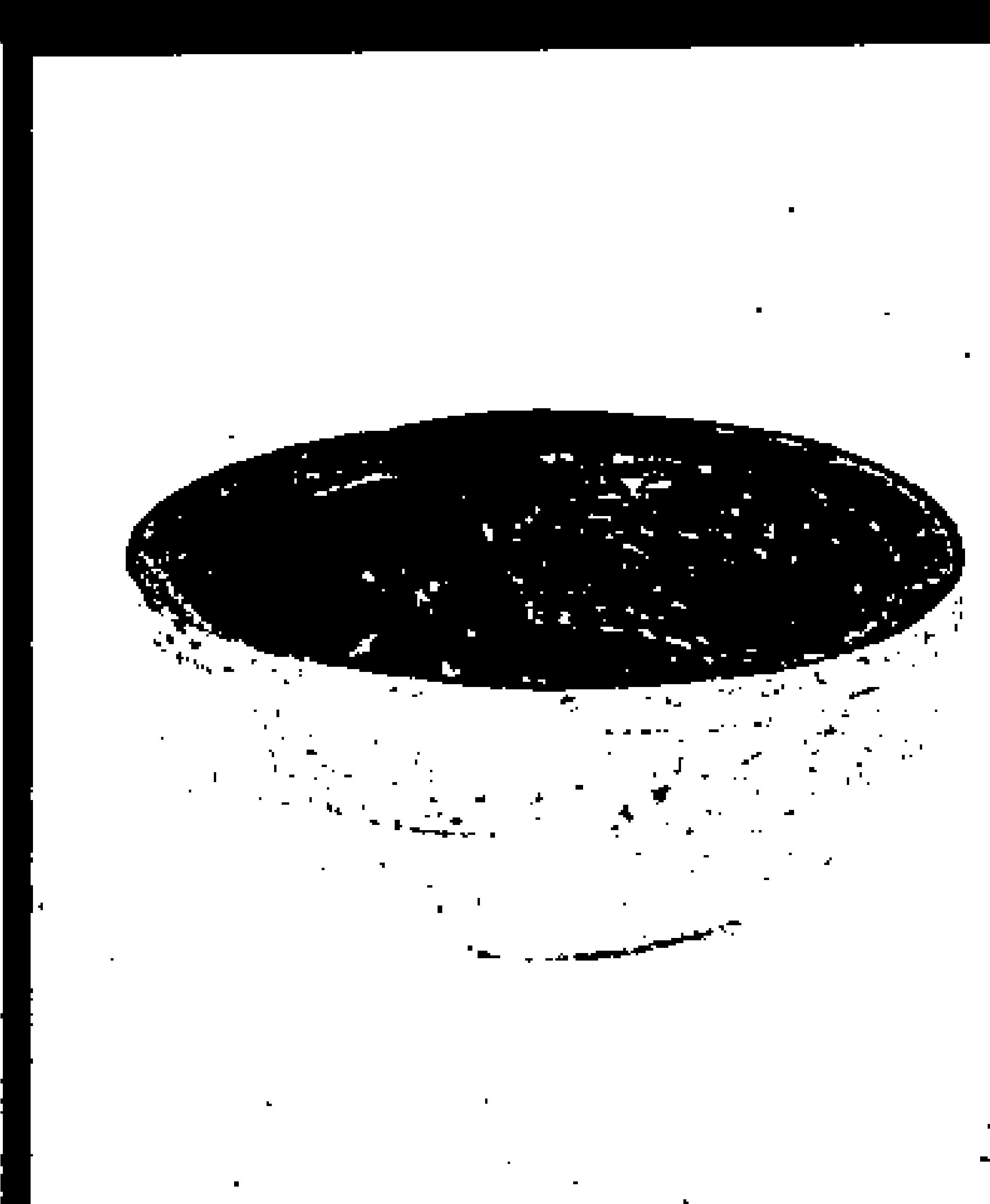

رسول اللہ ﷺ کا پیالہ

رسول اللہ ﷺ کے دندان مبارک کا عکس

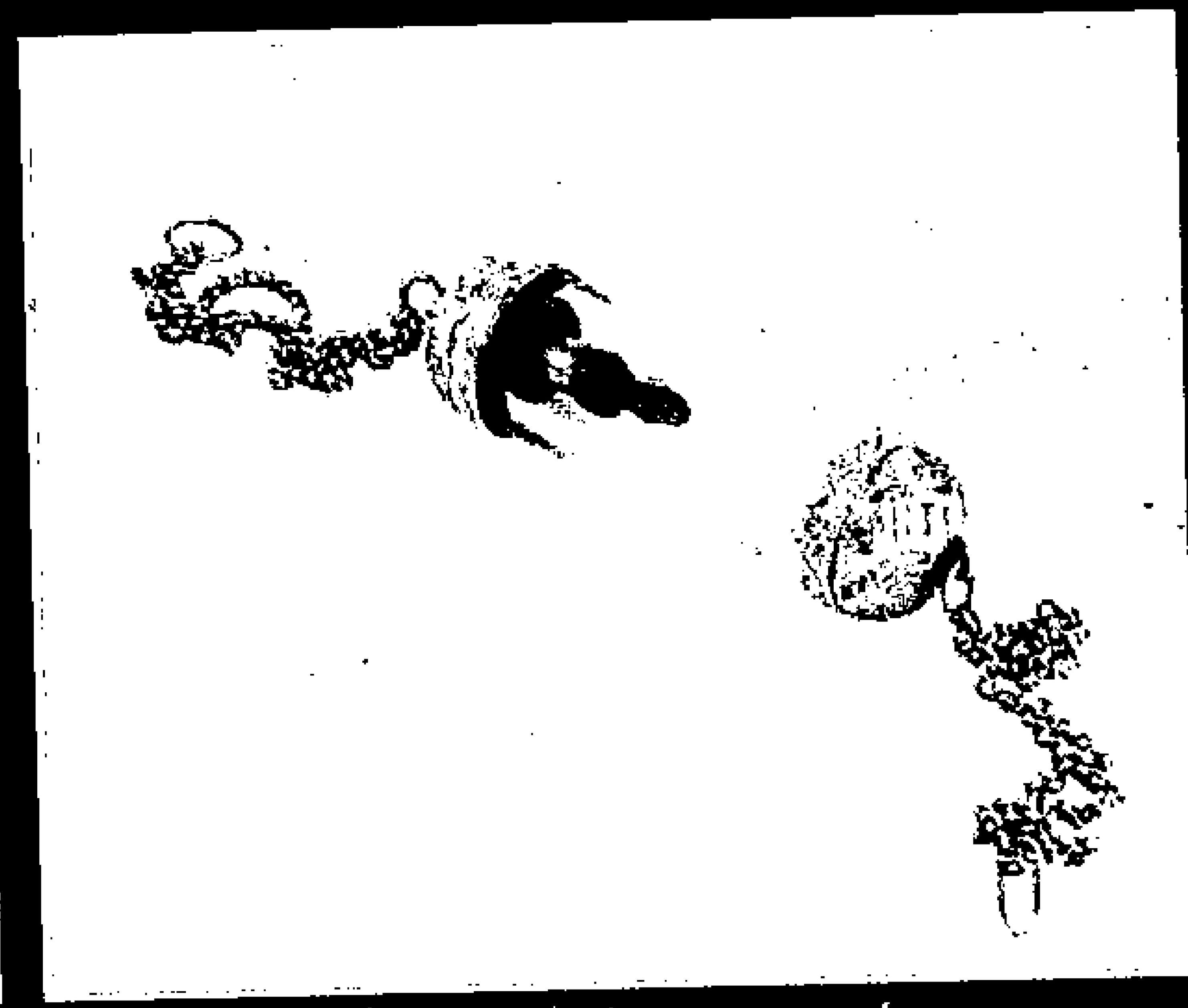

رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک

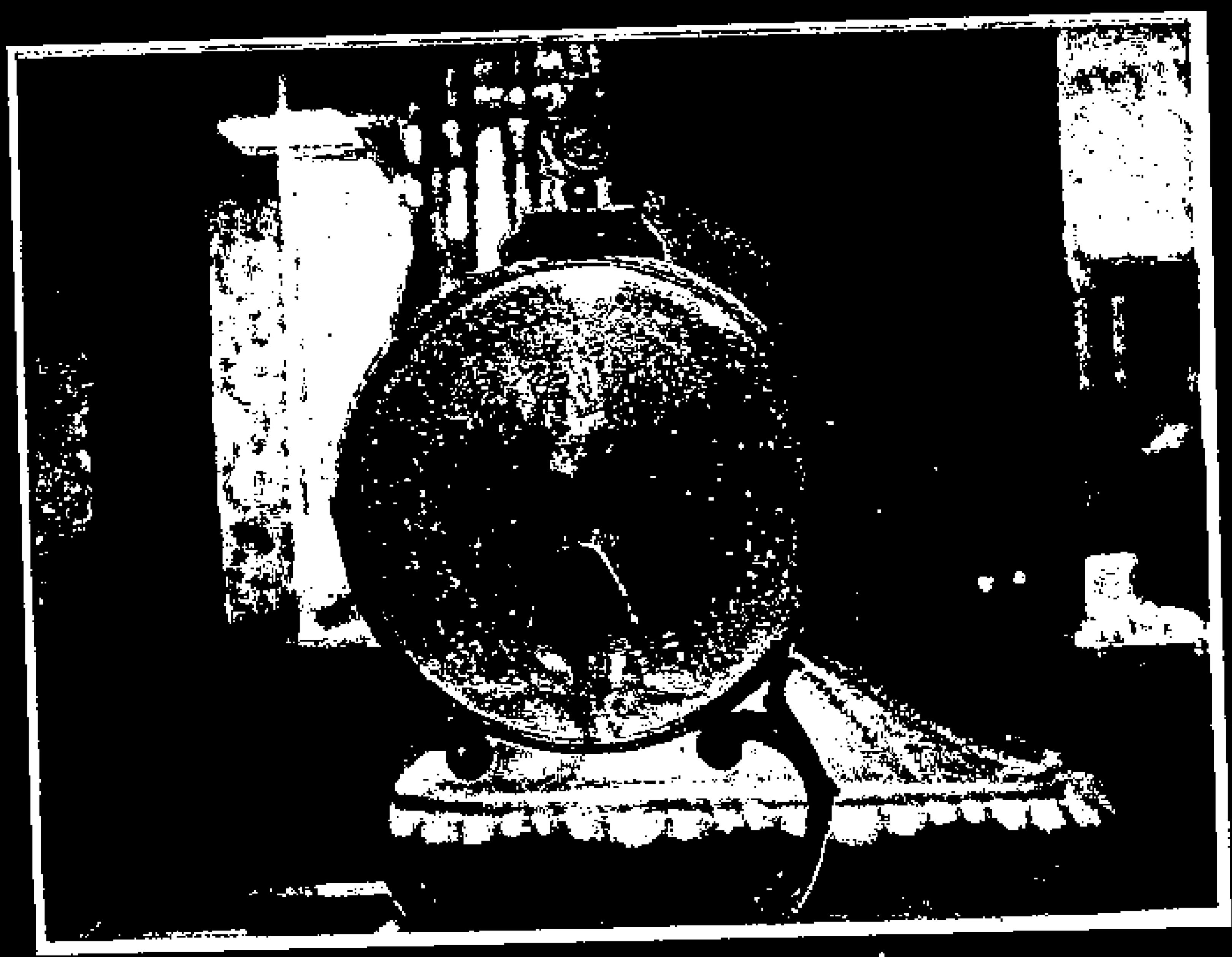

رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک

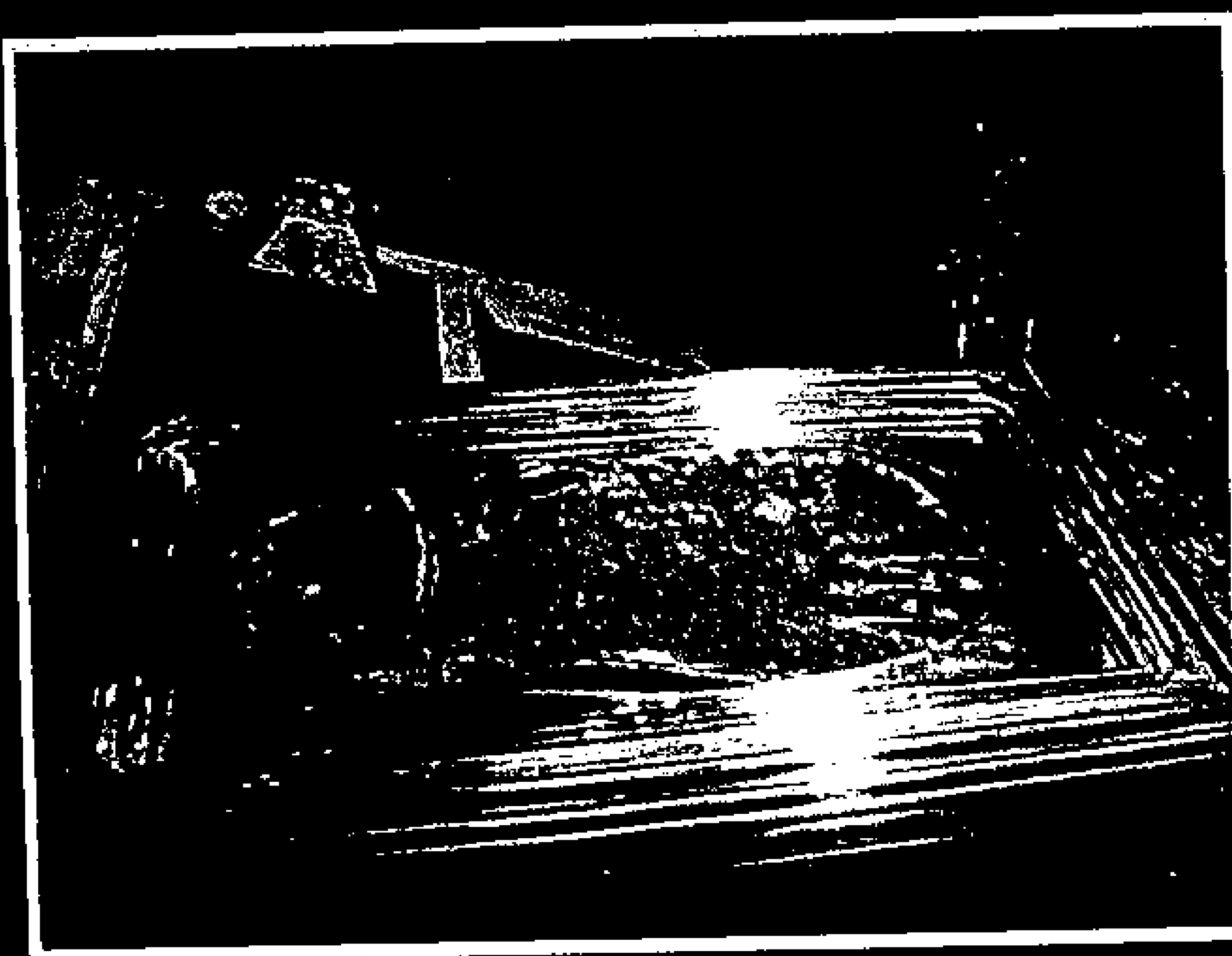

رسول اللہ ﷺ کا قدم مبارک

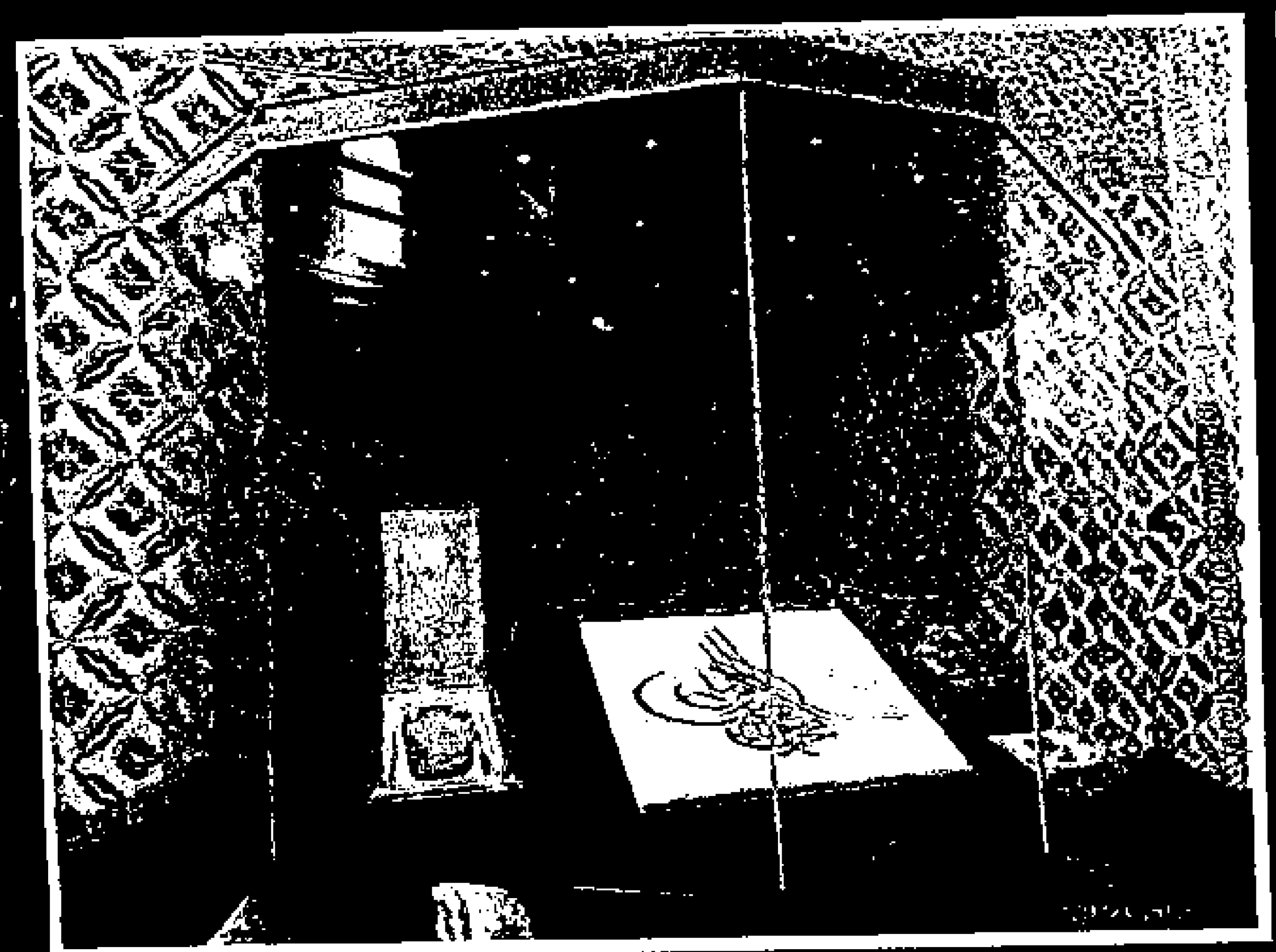

رسول اللہ ﷺ کا قدم مبارک

انتساب

میاں عامر محمود

کے نام

Marfat.com

درود شریف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا

اے اللہ رحمت بھیج حضرت محمد پر اور حضرت محمد کی آل پر

صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ

جس طرح تو نے رحمت بھیجی حضرت ابراہیم پر اور حضرت ابراہیم کی آل پر

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

بے شک تو تعریف کیا گیا بزرگ ہے

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا

اے اللہ برکت دے حضرت محمد کو اور حضرت محمد کی آل کو جس

بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ

طرح برکت دی تو نے حضرت ابراہیم کو اور حضرت ابراہیم کی آل کو

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

بے شک تو تعریف کیا گیا بزرگ ہے

Marfat.com

حُسنِ ترتیب

*	پیش لفظ از معاذ ہاشمی	19
*	سیرت اور مطالعۂ سیرت از مولانا ابوالکلام آزاد	31
*	مقدمہ از محمد حسین ہیکل (کتاب کی اولین اشاعت پر لکھا گیا)	57
*	مقدمہ از محمد حسین ہیکل (جو کتاب کے تیسرے ایڈیشن میں شائع ہوا)	83

باب 1	تاریخ عرب کا پس منظر	121 تا 161

* دنیا میں تہذیب وتمدن کا گہوارہ * مصری تہذیب پر اسلامی تمدن کا اثر * مسیحیت اور دین * زرتشت میں نبرد آزمائی * طاقت روم سے قسطنطنیہ منتقل ہوگئی * عیسائیوں میں فرقہ بندیاں * دین زرتشت بھی اختلاف کا شکار * دو طاقتوں کے درمیان * جزیرہ نمائے عرب کا جغرافیائی محل وقوع * قافلوں کے لئے دوراہیں * تمدنِ یمن * یمن میں یہود ونصاریٰ * یمن ایرانی تسلط میں * ایران میں شیرویہ کی حکومت * جزیرہ نمائے عرب کا اجتماعی نظام * بدوی معاشرت * بت پرستی * مسیحیت اور یہودیت * مکہ مکرمہ، کعبۃ اللہ اور قریش * مکہ کی اہمیت * محل وقوع * سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام * حضرت ابراہیم علیہ السلام اور سارہ علیہا السلام مصر میں * واقعہ ذبح قرآن حکیم میں * بنی جرہم کی آبادکاری * حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آمد کا واقعہ * کعبہ میں بت پرستی * ستارہ پرستی کا زور * پیغمبروں کی آمد * کعبہ اور مختلف مناصب * قصی سے پہلے کعبہ * غلبۂ قریش * قصی بن کلاب * ہاشم * عبدالمطلب * اصحاب الفیل * نبی کریم ﷺ کے والد حضرت عبداللہ

باب 2	حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ولادت سے نکاح تک	163 تا 180

* حضور ﷺ کے والدین کا عقد * حضرت عبداللہ کی وفات * رسول اللہ ﷺ کی ولادت * رضاعت حلیمہ سعدیہ * شق الصدر کا واقعہ * حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کی وفات * حضرت عبدالمطلب کی سرپرستی * حضرت عبدالمطلب کا انتقال * حضرت ابوطالب کی کفالت * شام کا پہلا سفر * حرب الفجار * حلف الفضول * گلہ بانی * شام کا دوسرا سفر * آغاز سفر * حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے نکاح

باب 3	عقد سے بعثت تک	181 تا 192

٭ شمائل و خصائل ٭ کعبہ کی دوبارہ تعمیر ٭ حجرِ اسود کی تنصیب ٭ قریش میں اختلافات کا ظہور ٭ آنحضرت ﷺ کی اولادِ مبارک ٭ بناتِ رسول ٭ ﷺ غارِ حرا میں عزلت گزینی ٭ رویائے صادقہ ٭ آغازِ وحی

باب 4	بعثت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام تک	193 تا 220

٭ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور ورقہ بن نوفل ٭ ورقہ بن نوفل سے ملاقات ٭ نزولِ وحی میں خلل ٭ سورۂ والضحیٰ کا نزول ٭ دعوت و تبلیغ کا آغاز ٭ نماز اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام ٭ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دائرۂ اسلام میں اور سابقون الاولون ٭ اہلِ مکہ کا ردِعمل ٭ اعزہ و اقربا کو دعوتِ اسلام ٭ تبلیغ و اشاعت اسلام ٭ شعرائے قریش اور معجزات مانگنے والے ٭ ایک ہاتھ پر چاند، ایک ہاتھ پر سورج ٭ بنو ہاشم کی حمایت ٭ مسلمانوں پر ابتلا ٭ مظالم پر صبر ٭ دعوتِ محمدیہ اور جدید علمی تجزیہ ٭ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام ٭ عتبہ بن ربیعہ کی سفارت ٭ ہجرتِ حبشہ ٭ دربارِ نجاشی میں قریش کے قاصد ٭ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی تقریر ٭ نجاشی اور درباریوں کا جواب ٭ ہجرتِ حبشہ کے حوالے سے خدشات کی حقیقت ٭ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام

باب 5	داستانِ غرانیق	221 تا 229

٭ مہاجرینِ حبشہ کی واپسی ٭ حقیقت کیا ہے؟ ٭ داستانِ غرانیق کا علمی و تنقیدی محاکمہ ٭ سورۂ والنجم کا سیاق و سباق ٭ نبی کریم ﷺ کی صداقت شعاری

باب 6	قریش کی ایذا رسانیاں	231 تا 246

٭ دعوت کا توڑ کرنے کے حربے ٭ جبر نصرانی ٭ طفیل بن عمرو دوسی ٭ رضی اللہ عنہ نصرانیوں پر تبلیغ کا اثر ٭ قریش کے تین بڑوں کا طرزِ عمل ٭ ابن اُمِ مکتوم رضی اللہ عنہ کا قصہ ٭ قریش کے قبولِ اسلام میں مانع امور ٭ روزِ قیامت کے عذاب کا خوف

باب 7	مقاطعے کے خاتمے سے (اسرا) معراج تک	247 تا 262

٭ حرمت کے مہینوں میں دعوتِ اسلام ٭ محصوری کے ایام ٭ ابوطالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات اور ظلم و ستم میں مزید اضافہ ٭ سفرِ طائف ٭ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عقد ٭ معراج ٭ معراج روحانی یا معراجِ جسمانی ٭ کتبِ سیرت میں معراج کا واقعہ ٭ ابن ہشام کی روایت ٭ معراج اور وحدتِ وجود ٭ معراج اور علومِ حاضرہ ٭ "اسراء" پر عرب کے تصورات ٭ اسراء بہ جسد

باب 8	بیعتِ عقبہ دو (۲) معاہدے	263 تا 274

٭ معراج کے بعد ٭ یثرب کی جانب سے نصرت ٭ سوید بن صامت اور ایاس بن معاذ رضی اللہ عنہ کا قصہ ٭ جنگِ بعاث ٭ مدینہ میں اسلام کا ورود ٭ عقبہ کی پہلی بیعت ٭ عقبہ کی دوسری بیعت ٭ معاہدۂ

Marfat.com

عقبہ سے قریش کی بدحواسی * ہجرت کا اذن

باب	عنوان	صفحات
باب 9	واقعاتِ ہجرت	275 تا 283

* حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جاں فروشی * غارِ ثور کا قیام * معجزہ اور کتب سیرت * مدینہ کی راہ پر * سراقہ کا قصہ * مسلمانانِ مدینہ اور انتظارِ رسول * ﷺ مدینہ میں اسلام کی اشاعت * مدینہ میں ورودِ مسعود

باب	عنوان	صفحات
باب 10	مدینہ منورہ کا ابتدائی زمانہ	285 تا 310

* مسجد نبوی ﷺ اور کاشانۂ نبوت کی تعمیر * جنگ سے بیزاری * ایک نئے باب کی شروعات * مؤاخات * یہودیوں سے معاہدہ * معاہدہ کا متن * یہودیوں سے معاہدہ * حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حرم نبوی ﷺ میں * تمدنِ اسلام کی بنیاد * آپ ﷺ کی شفقت و ملاطفت * عدل و انصاف * تقویٰ اور دنیا سے بے تعلقی * یہودیوں کی مخالفت کی ابتدا * داستان فنحاص * نجران کا وفد * ادیانِ ثلاثہ کا اجتماع * مکہ کی یاد

باب	عنوان	صفحات
باب 11	سرایا اور ابتدائی جھڑپیں	311 تا 324

* فوجی دستوں کی تشکیل * نبی کریم ﷺ کا سفر * گشتی نقل و حرکت کی غایت * ہمارا نقطۂ نظر * یہودیوں کی دسیسہ کاریوں کا سدباب * اسلام اور جنگ * قرآن اور جنگ * جہاد فی سبیل اللہ * عیسائیت اور جنگ * مقدسین اسلام و مسیحیت * اسلام دین فطرت ہے

باب	عنوان	صفحات
باب 12	حق و باطل کا پہلا معرکہ۔ غزوۂ بدر	325 تا 348

* ابوسفیان کا قافلہ تجارت * مسلمانوں کی نقل و حرکت * حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی تقریر * ابوسفیان کا فرار * بدر میں مسلمانوں کی آمد * جنگ کا آغاز * غنیمت کی مساوی تقسیم * نضر و عقبہ کا قتل * مدینہ میں فتح کی خوشخبری * اسیرانِ بدر کا معاملہ * مستشرقین کا اعتراض * مکہ میں شکست کی خبر * مقتولین بدر کا ماتم

باب	عنوان	صفحات
باب 13	بدر سے احد کا درمیانی وقفہ	349 تا 358

* فتح بدر کا مدینہ کے غیر مسلموں پر اثر * فتنہ پردازوں کا انجام * بنی قینقاع کا محاصرہ اور اخراج * مدینہ کی سیاسی وحدت * غزوہ سویق * یہودیوں کی وحشت * قریش کی تجارتی زبوں حالی * حضرت حفصہؓ سے عقد

باب	عنوان	صفحات
باب 14	غزوۂ احد	359 تا 382

* سپاہِ قریش کی پیش قدمی * عباس رضی اللہ عنہ کا قاصد * محاذ جنگ کے سلسلے میں اختلاف * فریقین کی صف آرائی * حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کا اعزاز * حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت * وطن کی مدافعت میں ایک منافق کی جنگ * مسلمانوں کا عزم و استقلال * فتح کے بعد شکست * مسلمانوں کی جانفشانی * شہدائے احد کی تدفین * قریش کا تعاقب * غزوۂ احد کے بعد * غزوۂ بنی اسد

Marfat.com

☆ خالد ہزلی ☆ واقعۂ رجیع ☆ واقعہ بئر معونہ ☆ یہود کی سازش ☆ عبداللہ بن ابی کی شرارت ☆ محاصرۂ بنی نضیر ☆ بنی نضیر کی جلاوطنی اور مدینہ میں امن کا قیام ☆ نبی کریم ﷺ کا کاتب ☆ بدر ثانی ☆ غزوۂ ذات الرقاع ☆ غزوۂ دومۃ الجندل

باب 15	تذکرۂ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن	383 تا 390

☆ نبی کریم ﷺ کی اولاد ☆ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ☆ تاریخی تحقیق کا نتیجہ ☆ واقعہ زینبؓ بنت جحش

باب 16	غزوۂ خندق (احزاب) اور یہود بنی قریظہ	391 تا 408

☆ یہودیوں کی شدید عداوت ☆ یہودیوں کے قاصد ☆ ایک یہودی مورخ کا عقیدہ ☆ قبائل عرب کو تحریک جنگ ☆ وحشت و اضطراب ☆ قریش کا خندق سے سامنا ☆ سرما کی شدت ☆ حیی بن اخطب کی چال ☆ بنی قریظہ اور قاصدانِ رسول ﷺ ☆ محصور مسلمانوں کی تشویش ☆ کفار کا حملہ ☆ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی شجاعت ☆ نعیمؓ بن مسعود کی سیاست ☆ طوفانِ باد و باراں ☆ غزوۂ بنی قریظہ ☆ سعدؓ بن معاذ کی ثالثی ☆ یہودیوں کی دلیری ☆ حی بن اخطب کی گردن پر بنی قریظہ کا خون ☆ بنی قریظہ کے اموال کی تقسیم

باب 17	غزوۂ خندق اور بنی قریظہ کے استیصال سے لے کر حدیبیہ تک	409 تا 432

☆ دیگر اقوام کی اخلاقی حالت ☆ اسلام اور اصلاح و تجدید ☆ غزوۂ بنی لحیان ☆ غزوۂ ذی قرد ☆ غزوۂ بنی مصطلق (یا مریسیع) ☆ واقعات ☆ عبداللہ بن ابی کا بغض و حسد ☆ واقعۂ افک ☆ اُم المومنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا ☆ فتنے کا آغاز ☆ اُم المومنین رضی اللہ عنہا کی بیماری ☆ اُم المومنین رضی اللہ عنہا کو تہمت کی اطلاع ☆ تحقیق کے لئے مجلس مشاورت ☆ اُم المومنین رضی اللہ عنہا سے جواب طلبی ☆ آیات برأت کا نزول ☆ عفو و درگزر

باب 18	حدیبیہ	433 تا 451

☆ مسلمانوں کا اشتیاقِ طواف ☆ مسلمان اور کعبہ ☆ حج بیت اللہ کے لئے اعلان ☆ غیر مسلم قبائل کو حج کی دعوت ☆ قریش کی پیش بندی ☆ آمنا سامنا ☆ صلح طلبی ☆ قریش کے قاصد ☆ عروہ بن مسعود کی سفارت ☆ قاصد رسول ﷺ سے بدسلوکی ☆ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی سفارت ☆ بیعت رضوان ☆ پیغمبر اسلام ﷺ کا قرارداد پر عمل ☆ ابو بصیر رضی اللہ عنہ کا قصہ ☆ مومنات کا معاملہ ☆ آنحضرت ﷺ کا طرز عمل

باب 19	غزوۂ خیبر سے لے کر عمرۃ القضا تک	453 تا 472

☆ سلاطین و امرا کے نام دعوت نامے ☆ دعوت اسلام کی توسیع ☆ حرمت شراب ☆ روم و ایران کی کشمکش ☆ یہود کا استیصال ☆ غزوۂ خیبر کی تیاری ☆ طرفین کی طاقت ☆ محاصرۂ خیبر ☆ یہودیوں کی مایوسی ☆ یہودیوں کے اقتدار کا خاتمہ ☆ فدک کے یہودی ☆ وادی القریٰ کی اطاعت

١٢٥٣٩٥

Marfat.com

*زہر آلود گوشت سے رسول اللہ ﷺ کی ضیافت * نواحی بادشاہوں کی طرف بھیجی جانے والی سفارتیں * کسریٰ کا رویہ * مقوقس کا جواب * نجاشی کا جواب * جوابات کی نرمی کی وجہ * حبشہ سے مسلمانوں کی واپسی * عمرہ قضا کا انتظار

باب 20	عمرۃ القضا سے لے کر خالد بن ولید ؓ، عمرو بن عاص ؓ اور عثمان بن طلحہ ؓ کے قبولِ اسلام تک	473 تا 478

* قریش کا مکہ سے خروج * مکہ میں تین دن * اُم المؤمنین میمونہ ؓ سے عقد * مدینہ کو واپسی
* خالد بن ولید ؓ کا قبولِ اسلام * عمرو بن عاص ؓ اور عثمان بن طلحہ ؓ کا اسلام

باب 21	غزوۂ موتہ وغزوہ سلاسل اور دیگر غزوات اور سرایا	479 تا 486

* غزوۂ موتہ * زید بن حارثہ ؓ کی شہادت * جعفر بن ابی طالب ؓ کی شہادت * ابن رواحہ ؓ کی شہادت * خالد بن ولید ؓ کی سپہ سالاری * شہداء کے ورثا کی تعزیت * غزوہ ذات السلاسل

باب 22	فتح مبین وتطہیر کعبہ	487 تا 506

* معاہدہ حدیبیہ کی تنسیخ * قریش کو خوف و ہراس * ابوسفیان مدینہ میں * فتح مکہ کی تیاریاں
*حاطب بن ابی بلتعہ ؓ کا خط * مکہ کی طرف کوچ * سیدنا عباس ؓ کا قبولِ اسلام
*ابوسفیان کا تجسس * کیا یہ اتفاقی واقعات ہیں؟ * مکہ میں داخلہ * سپاہ کی ترتیب * مکہ میں
*عفو عام * تطہیر کعبہ * انصار کے خدشات * معتوبین کی معافی * مکہ مکرمہ کو حرم قرار دیا گیا

باب 23	غزوۂ حنین و طائف	507 تا 520

* حنین کے درے میں پناہ گیری * آپ ﷺ کی ثابت قدمی * حضرت عباس ؓ کی پکار
*مسلمانوں کی واپسی * فتح کی قیمت * طائف کا محاصرہ * مسجد طائف * بنی ہوازن کا وفد
*بنی ہوازن کے اسیروں کی واپسی * انصار کا گلہ اور تالیف قلوب

باب 24	مدینہ کو واپسی	521 تا 534

* کعب بن زہیر ؓ کا قصہ * وفود کی آمد * زینب ؓ کی وفات * ابراہیم ؓ کی ولادت
*ماریہ قبطیہ ؓ اور دیگر ازواج * نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کی ازواج * ازواج مطہرات ؓ کا باہمی مشورہ * ازواج مطہرات ؓ کی ہیجانی کیفیت * زینب بنت جحش ؓ اور عائشہ ؓ
*ازواج سے علیحدگی * حضرت عمر ؓ کی جانب سے استرضا کی سعی * تنقید کی کسوٹی پر
*علمائے یورپ کے اعتراضات کا جواب

Marfat.com

باب 25	غزوۂ تبوک اور حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات	535 تا 548

* خراج وزکوٰۃ کا حصول * غزوۂ تبوک * مسلمانوں پر دعوت کا اثر * منافقین کی مخالفت * جیش عسرت * فوج کی روانگی * مقامِ حجر میں ورود * رومی بھاگ گئے * اہل سرحد کا معاہدہ * دومۃ الجندل پر چڑھائی * مدینہ کو واپسی * جو نہ جاسکے * منافقین پر سخت گرفت * اپنے فرزند ابراہیم رضی اللہ عنہ سے وابستگی * ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات

باب 26	سالِ وفود اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امارتِ حج	549 تا 567

* غزوۂ تبوک کے نتائج * عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اسلام * "لات" کا انہدام * وفود کی مسلسل آمد * حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امارتِ حج * آزادیٔ رائے اور مغربی تمدن * برہنگی کی ترغیب دینے والی تنظیمیں * شریعت اور رائے عامہ * مشرکین کی زندگی کا نقشہ * شرک کے خلاف اعلانِ جنگ کا جواز * عامر بن طفیل کا حشر * اربد بن قیس کا حشر * مسیلمہ

باب 27	عرب کے اہل کتاب سے لے کر حجۃ الوداع تک	569 تا 586

* وفود کی آمد کا تسلسل * وحدتِ امت * اہل نجران کا قبولِ اسلام * آخری وفد کی مدینہ میں آمد * حجۃ الوداع کی تیاری * رسول اللہ ﷺ کی حج کو روانگی * احرام وتلبیہ * حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یمن سے واپسی * ارکان حج کی ادائی * خطبہ حجۃ الوداع * نزول آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ

باب 28	از علالت تا بہ ارتحال	587 تا 614

* جھوٹے نبیوں کا خروج * رومی سلطنت پر چڑھائی کرنے کا ارادہ * لشکر کی سربراہی اسامہ رضی اللہ عنہ کو دینے کی مصلحتیں * مرض الموت کا آغاز * اہلِ قبور سے نبی کریم ﷺ کا خطاب * بیماری کے باوجود مسجد میں تشریف آوری * ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امامت کا حکم * واقعہ قرطاس * دوا پینے سے بیزاری * آخری پونجی کو صدقہ کر دینے کا حکم * آخری بار مسجد میں آمد * وفات * رسول اللہ کی وفات سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انکار * حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی واپسی اور مسلمانوں سے خطاب * کیا رسول اللہ ﷺ واقعی فوت ہو چکے ہیں؟ * واقعہ سقیفہ بنو ساعدہ * حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت * بیعت کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا پہلا خطبہ * رسول اللہ ﷺ کی تدفین کی تیاریاں * غسل * رسول اللہ ﷺ کا آخری دیدار * رسول اللہ ﷺ کی نماز جنازہ * سانحہ عظیم * قبائل عرب میں ارتداد کی لہر * قبر کی کھدائی * تدفین * حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جوارِ نبی میں * لشکر اسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی * حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی میراث طلبی * رسول اللہ ﷺ کی روحانی وراثت

* مستشرقین اور مطالعہ سیرت — از ڈاکٹر نثار احمد — 615
* ماخذ ومراجع

Marfat.com

پیش لفظ

امت مسلمہ اس وقت تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہی ہے۔ ''تہذیبوں کے تصادم'' سائنسی ترقی اور آزادیٔ اظہار کی نئی نئی شکلیں، اس پر ملت اسلامیہ کی زبوں حالی، تعلیم کی کمی، سائنسی میدان میں واضح ابتری، سستی، کاہلی اور کرپشن اور سب سے بڑا مسئلہ آپس کا نفاق...... اس دورِ اذیت میں کوئی رہنما بھی نہیں جو راہنما بنے...... یا جسے راہنما سمجھا وہ راہزن نکلا...... رہزنوں کی قیادت کے اس دور میں آزادی اظہار کے نام پر مغرب جو تماشا کر رہا ہے اس کا محور نبی کریم ﷺ کی ذات مبارک ہے۔ ملت اسلامیہ کا ہر فرد شدید کرب اور اذیت کا شکار ہا ہے لیکن کسی کو کوئی پرواہ نہیں۔ یہ نقطہ ہے کہ ملت اسلامیہ اس نقطہ پر اتفاق کی لڑی میں پروئی جاسکتی ہے اور ''نشاۃ ثانیہ'' حاصل کرسکتی ہے۔ یہ ٹرنگ پوائنٹ ہے جو ملت اسلامیہ کو دوبارہ ''شاہراہِ حریت'' پر لے جاسکتا ہے۔ ملت اسلامیہ پر ہر الزام صادق لیکن حرمت رسول ﷺ پر مضبوط اور متفق ہے۔

محمد حسین ہیکل بیسوی صدی کے عظیم مسلم اسکالرز میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی کتاب کا ترجمہ پیش کرنے کا مقصدِ اولین یہ ہے کہ ٹرنگ پوائنٹ کی طرف ملت اسلامیہ کو لایا جائے۔ حیاتِ طیبہ پر مذہبی محبت اور احترام سے جو لکھا گیا سو لکھا گیا اب تحقیقی اور غیر جانب دارانہ انداز میں لکھا جانا ضروری تھا۔ اس کمی کو ملت اسلامیہ میں جن عظیم شخصیات نے سب سے پہلے سمجھا اور لکھا محمد حسین ہیکل ان میں سے ایک ہیں بلکہ ان سب میں نمایاں ہیں۔ ان کی تحریر جدید زمانے کے تحقیقی اصولوں کے مطابق ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کی زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

محمد حسین ہیکل نے تحقیق جدید کے اصولوں کے مطابق جہاں پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کو پیش کیا وہاں ان کی عظیم شخصیت کے مختلف حصوں پر لکھی گئی تحریروں اور تحقیق سے استفادہ حاصل کیا اور خصوصاً ان مستشرقین کے سوالوں کے جوابات بھی سامنے آگئے جن کی وجہ سے یورپ کے کچھ نادان چاند پر تھوکنے کے سزاوار ہو رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ کم از کم اس کتاب کی اشاعت کے بعد اگر کوئی پرانے الزامات کو نئے پیرائے میں بیان کر رہا ہے تو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اپنے ذہن کا گند باہر نکال رہا ہے۔ اس ہذیان کا کوئی جواب ہو نہیں سکتا............

Marfat.com

دوسری طرف جدید مسلم ذہن میں اُبھرتے ہوئے سوالات کا جواب دینا ضروری تھا اس کی علمی و تحقیقی توجیہ بیان کرنی تھی اور ایک ترتیب کے ساتھ تاریخ کے اُلجھے ہوئے واقعات کو صاف شفاف طریقے سے بیان کرنا تھا۔ محمد حسین ہیکل نے یہ کام خوبی سے سرانجام دیا۔ ہاں اگر کہیں سقم رہ گیا تو کم از کم آنے والوں کے لیے مشکلات آسان ہوگئیں۔ کیا یہ کم ہے کہ آپ کو 14 سو سال پہلے کے واقعات چھان پھٹک کر پیش کر دیے جائیں۔ جہاں تک اس عظیم ہستی کی شخصیت کردار اور اثرات کا تعلق ہے۔ مائیکل ایچ ہارٹ کہتا ہے۔

> حضرت محمد ﷺ واحد تاریخی ہستی ہیں جو مذہبی اور دنیاوی دونوں محاذوں پر برابر طور پر کامیاب رہی۔ حضرت محمد ﷺ نے عاجزانہ طور پر اپنی مساعی کا آغاز کیا اور دنیا کے عظیم مذاہب میں سے ایک مذہب کی بنیاد رکھی اور اسے پھیلایا۔ وہ ایک انتہائی مؤثر سیاسی راہنما بھی ثابت ہوئے۔ آج تیرہ سو برس گزرنے کے باوجود ان کے اثرات انسانوں پر ہنوز مسلم اور گہرے ہیں......

جبکہ قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے مضمون "سیرت کی جامعیت کے چند بنیادی اصول" میں لکھا ہے۔

سرکار دو عالم فخر بنی آدم رسول الثقلین حضرت محمد مصطفی ﷺ کی سیرت مقدسہ اپنی ظاہری و باطنی وسعتوں اور پہنائیوں کے لحاظ سے کوئی شخصی سیرت نہیں بلکہ ایک عالمگیر بین الاقوامی سیرت ہے جو کسی شخصِ واحد کا دستور زندگی نہیں بلکہ جہانوں کے لئے ایک مکمل دستورِ حیات ہے۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا چلا جائے گا اسی حد تک انسانی زندگی کی استواری و ہمواری کے لیے اس سیرت کی ضرورت شدید سے شدید تر ہوتی چلی جائے گی۔

زمانہ اور اُس کا تمدن اپنی ارتقائی حرکت سے کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا اور کل کو نہ معلوم کہاں تک جا پہنچے لیکن وہ کہیں بھی پہنچے اور اس کی تمدنی زندگی کے گوشے کتنے بھی پھیل جائیں اور پھیل کر زمین و آسمان اور فضاء و خلاء سب ہی کو ڈھانپ لیں پھر بھی یہ ارتقائی سیرت اور اس کے تدیّن کے گوشے اسی حد تک تمدنی گوشوں کی تقویم و اصلاح کے لئے شاخ در شاخ ہو کر نمایاں ہوتے رہیں گے جیسا کہ وہ اب تک زمانہ کی مدنی ترقی کے ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے رہے اور ان میں سکون و اطمینان کی روح پھونکتے رہے ہیں۔

اس کی شرعی وجہ یہ ہے کہ آیت وانّك لعلیٰ خلقٍ عظیم کے بارے میں جب صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی اس خلقِ عظیم کی سیرت و اخلاق کے سلسلے میں پوچھا گیا تو فرمایا گیا کہ:

وكان خلقه القران

آپ کا خلق (سیرت) یہ قرآن ہی تو ہے۔ اور قرآن کے بارے میں خود حضرت صاحب سیرت

Marfat.com

علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ:

ولا تنقضی عجائبہ ولا یخلق عن کثرۃ الرد۔

اس قرآن کے عجائبات (علوم و معارف) کبھی ختم ہونے والے نہیں اور یہ بار بار کے تکرار سے کبھی بھی پرانا نہیں ہوگا (کہ اس سے دِل اکتا جائیں)

اس سے صاف نتیجہ یہی نکلتا ہے اور نکل بھی سکتا ہے کہ سیرت کے عجائبات بھی کبھی منقضی ہونے والے نہیں، فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ قرآن میں یہ لامحدود عجائبات علمی صورت میں اور ذات بابرکات نبوی کی سیرت میں یہی عجائبات عملی صورت میں ہیں، گویا ایک علمی قرآن جو اوراق میں محفوظ ہے اور ایک عملی قرآن یعنی سیرت ہے جو ذات نبوی ﷺ میں محفوظ ہے اور دونوں آپس میں ایک دوسرے کی تصویر ہیں۔

ہزاروں آیتیں درحقیقت سیرت مقدسہ کے علمی اور تعارفی ابواب ہیں اور ادھر سیرت کے یہ ہزاروں گوشے قرآن کے عملی پہلو ہیں، پس قرآن میں جو چیز قال ہے وہی ذاتِ نبوی میں حال ہے اور جو قرآن میں نقوش و دوال ہیں وہی ذاتِ اقدس میں سیرت و اعمال ہیں، اس لیے سیرت سے تو قرآن کی عملی صورتیں مشخص ہوتی ہیں اور قرآن سے سیرت کی عملی ہیئتیں کھلتی ہیں۔

اس قرآن حکیم کے مختلف مضامین اپنی اپنی نوعیت اور مناسبت کے مطابق سیرت کے مختلف الانواع پہلو ثابت ہوتے ہیں، قرآن میں ذات و صفات کی آیتیں آپ کے عقائد ہیں اور احکام کی آیتیں آپ کے اعمال، تکوین کی آیتیں آپ کا استدلال ہیں اور تشریح کی آیتیں آپ کا حال، قصص و امثال کی آیتیں آپ کی عبرت ہیں اور تذکیر کی آیتیں آپ کی موعظت، خدمتِ خلق کی آیتیں آپ کی عبدیت ہیں اور اور کبریاء حق کی آیتیں آپ کی نیابت، اخلاق کی آیتیں آپ کا حسنِ معیشت ہیں اور معاملات کی آیتیں آپ کا حسنِ معاشرت، توجہ الی اللہ کی آیتیں آپ کی خلوت ہیں اور تربیت کی آیتیں آپ کا مشاہدہ ہیں اور ابتغاء وجہ اللہ کی آیتیں آپ کا مراقبہ، ترکِ دنیا کی آیتیں آپ کا مجاہدہ ہیں اور احوالِ محشر کی آیتیں آپ کا محاسبہ، نفی غیر کی آیتیں آپ کی فنائیت ہیں اور اثباتِ حق کی آیتیں آپ کی بقائیت، انا اور انت کی آیتیں آپ کا شہود ہیں اور ہو کی آیتیں آپ کی غیبت، نعیم جنت کی آیتیں آپ کا شوق ہیں اور جحیم نار کی آیتیں آپ کا وہم وغم۔ رحمت کی آیتیں آپ کی رجاء ہیں اور عذاب کی آیتیں آپ کا خوف۔ انعام کی آیتیں آپ کا سکون وانس ہیں اور انتقام کی آیتیں آپ کا حزن، حدود و جہاد کی آیتیں آپ کا بغض فی اللہ ہیں اور امن و ترحم کی آیتیں آپ کا حب فی اللہ، نزولِ وحی کی آیتیں آپ کا عروج ہیں اور تعلیم و تبلیغ کی آیتیں آپ کا نزول، تنفیذ اوامر کی آیتیں آپ کی خلافت ہیں اور خطاب کی آیتیں آپ کی عبادت، وغیرہ وغیرہ۔ غرض کسی بھی نوع کی آیت لو وہ آپ کے کسی نہ کسی پیغمبرانہ سیرت اور کسی نہ کسی مقام نبوت کی تعبیر ہے اور آپ کی سیرت اُس کی تفسیر، جس سے صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس زریں مقولہ و کان خلقہ القرآن سے قرآن اور ذاتِ

Marfat.com

اقدس نبوی کی کامل تطبیق اور صدیقہ پاک کی علمی گہرائیوں اور ذاتی ذکاوتوں کا نشان ملتا ہے اس لیے یہ دعویٰ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ثابت ہوتا ہے کہ اگر قرآن کے علمی عجائبات کبھی ختم نہیں ہوسکتے تو سیرت نبوی کے عملی عجائبات بھی کبھی ختم ہونے والے نہیں، اور اگر قرآن عملی طور پر تاقیام امت اپنے شاخ درشاخ علوم سے بنی نوع انسان کی تکمیل کا ضامن ہے تو یہ سیرت جامعہ بھی تایوم محشر اپنے شاخ درشاخ عملی اسووں سے اقوامِ عالم کی تکمیل وتسکین کی کفیل رہے گی۔

اس توجیہہ و استدلال کے سلسلہ میں ذرا اور آگے بڑھو تو قرآن کی شرعی تفسیر حدیث پاک ہے، قرآن اگر متن ہے تو حدیث اس کا بیان اور شرح ہے جس سے قرآن کے مخفی گوشے مرادی طور پر کھلتے ہیں اور مطالب خداوندی نمایاں ہوجاتے ہیں، اس لیے اگر قرآن حضور ﷺ کی سیرت ہے تو حدیث اس سیرت کی تفصیل ہے اور اس لیے کتب حدیث کے ہزاروں ابواب وفصول درحقیقت سیرت مقدسہ ہی کے ابواب و فصول ہیں جن سے گزر کر ہی آدمی اقلیم سیرت میں داخل ہوسکتا ہے۔

اندریں صورت کہ قرآن وحدیث سیرت مقدسہ کی تعبیر ہے۔ فاتحۂ قرآن کو بھی اولاً ذاتِ حق پھر اُس کی ربوبیت عامہ پھر رحمت عامہ اور پھر مالکیت عامہ اور پھر عبادت و استعانت سے شروع کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ کو لو تو اُس کی ابتداء بھی ایمان بالغیب اور نماز و انفاق فی سبیل اللہ سے کی گئی ہے۔ بہرحال قرآن میں اولیت عقائد اور عبادات کو دی گئی ہے۔

اس کے بعد دوسرے ابواب میں دین کی تفصیل ہے، اسی طرح عموماً کتب حدیث میں اسی اسوۂ قرآنی کے مطابق ابواب وفصول کی ابتداء کتاب الایمان پھر کتاب الصلوٰۃ، کتاب الصوم، کتاب الحج وغیرہ سے کی گئی ہے۔ اس کے بعد اخلاق، معاملات، نکاح، طلاق، میراث، ہبہ، اوقات پھر وسائل معاش، زراعت، تجارت، صنعت وحرفت ملازمت اور پھر ان معاملات نفاذ کے لیے قضاءٗ، تعزیرات وکفارات وغیرہ اور پھر ان تمام ابواب کی حفاظت کے لیے آخر میں خلافت وامارات اور جہاد وسیاست کے ابواب لائے گئے ہیں۔ یہ سب کے سب مرتب شعبے بلاشبہ سیرت مقدسہ ہی کے ابواب ہیں، لیکن اس ترتیب نبوی اور اس کی متابعت میں ان ترتیبات نائبانِ نبوی سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی پیغمبرانہ سیرت کی اساس و بنیاد درحقیقت عقائد وعبادات ہی قرار دی گئی ہیں، خود حضور ﷺ نے بھی اسلام کی اساس و بنیاد عقائد وعبادات ہی کو قرار دیا جو دوسرے لفظوں میں سیرت کی بنیاد ہے، فرمایا:

بنی الاسلام علی خمس شهادة ان لا اله الا الله و ان محمد رسول الله و اقام الصلوٰة و ایتاء الزکوٰة و صوم رمضان و حج البیت من استطاع الیه سبیلا۔ (مشکوٰۃ)

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پہ ہے۔ لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دینا، نماز کا قائم

Marfat.com

کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے اور بیت اللہ کا حج اگر استطاعت ہو۔

میرا خیال ہے کہ ان تحریروں کے بعد کسی قسم کی بحث یا اضافہ کی ضرورت نہیں۔

محمد حسین ہیکل کی اس کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد کا مضمون شامل کیا گیا ہے۔ مولانا وقت کے امام تھے ان کی تحریر اور تقریر نے ملت اسلامیہ خصوصاً پاک و ہند پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ ان کا مضمون سیرت کو سمجھنے میں معاون و مددگار ثابت ہوگا۔

آخر میں ڈاکٹر نثار احمد کا مضمون ''مستشرقین اور مطالعۂ سیرت'' ایک پرمغز تحقیقی مضمون ہے۔ یہ مضمون ان تمام ابہام، الزامات اور تنقید کا مفصل جواب ہے جو مستشرقین نے اٹھائے اور تحریر کئے۔

مجھے امید ہے کہ یہ مضمون سیاق و سباق کے ساتھ تاریخ مستشرقین اور ان کی تحریروں کو سامنے لاتا ہے۔ اس مضمون کی کتاب میں شمولیت نے اس کتاب کی اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے۔

آخر میں اپنے تمام احباب شعیب بن عزیز، اسامہ محمود، ملک فاروق منیر احمد، عظیم احمد، علیم اقبال، محترمہ شاہدہ لطیف، صہیب مرغوب، سلمان غنی، سعید آسی، فضل اعوان، برادر وسیم بٹ، ضیاء پرویز، انجینئر محمد جمیل، قمر اقبال صوفی کا مشکور ہوں جن کے تعاون سے میں یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچا سکا۔ میں امید کرتا ہوں کہ میرے والد گرامی مولانا فقیر اللہ ہاشمی صاحب کے لیے تمام قارئین دُعا گو ہوں گے۔ وہ عاشق رسول ﷺ تھے اور میری تربیت میں عشق مصطفی انہوں نے گوندھی......

میری والدۂ محترمہ شہر بانو ہاشمی کے لیے صحت اور تندرستی کی دعاؤں کا درخواست گزار ہوں۔

نبی کریم ﷺ سے ان کی انتہائی محبت ہر قدم پر مجھے محسوس ہوئی......

آخر میں شیخ زاہد صاحب، برادرم عابد محمود قدوسی صاحب اور افتخار مجاز صاحب کا شکریہ ان افراد کی محبت شامل حال نہ ہوتی تو یہ کتاب آپ کے ہاتھ میں نہ ہوتی............

والسلام

غلامِ محمدؐ و آلِ محمدؐ

سید معاذ ہاشمی

Marfat.com

بسم الله الرحمن الرحيم

اللهم صل على محمد و على
آل محمد كما صليت على ابراهيم و
على آل ابراهيم انك حميد مجيد
اللهم بارك على محمد و على آل
محمد كما باركت على ابراهيم و على
آل ابراهيم انك حميد مجيد

Marfat.com

سیرت اور مطالعۂ سیرت

مولانا ابوالکلام آزاد

رشتہ در گردنم انگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

حافظ ابنِ کثیر

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخِ کبیر "البدایۃ والنہایۃ" میں شیخ عماد الدین واسطی کی نسبت لکھا ہے کہ ابتدا میں ان کا مسلک دوسرا تھا، لیکن پھر دوسرا ہی رنگ چڑھ گیا۔ اس تبدیلی کا باعث صرف امام ابنِ تیمیہ کی ایک صحبت ہوئی۔ ان کی نشوونما فقہا و متکلمین کی جماعت میں ہوئی تھی۔ اس لیے جدل و خلاف اور کلام ورائے کا اثر غالب تھا۔ مصر سے بغداد گئے تو وہاں خیالات میں توسیع ہوئی اور اپنی حالت کا محاسبہ کیا، تو یقین وطمانیت سے قلب کو خالی پایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فقہا و متکلمین کے طریق سے دل برداشتہ ہو گئے اور تصوف کی طرف توجہ ہوئی، لیکن عامہ متصوفین کی صحبتوں کا جو رنگ ڈھنگ نظر آیا، اس سے طبیعت اور زیادہ مکدر ہو گئی۔ بالآخر دمشق آئے اور امام ابنِ تیمیہ کی صحبت میں داخل ہوئے۔

امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کی ایک صحبت درس

وہ خود بیان کرتے ہیں کہ جب پہلی مرتبہ ان کی صحبتِ درس میں حاضر ہوا تو عجیب اتفاق ہے کہ علم کلام ہی کی نسبت صحبت تھی۔ امام موصوف فرما رہے تھے: "دنیا میں متکلمین و فلاسفہ سے بڑھ کر مضطرب و محروم اور اطمینانِ قلب و سرور روح کی لذت سے یک قلم نا آشنا اور کوئی گروہ نہیں۔" پھر مشاہیر فلاسفۂ قدماء و اربابِ مقالات کے چند اقوال سنائے جن میں انہوں نے خود اپنے وجود پر مجہولیت و نامرادی اور بدحالی و بے بصیرتی کی شہادت دی ہے، اسی سلسلے میں امام رازی کے اشعار پڑھے کہ اُن کی مدت العمر کی کاوش و تعمق اور طلب و جستجو کا ماحصل یہ تھا:

لعمری لقد طفتُ المعاهد کلّہا
و سیّرت طرفی بین تلک المعالم

فلم ارالا واضعاً کف حائر
علی ذقن، او تارماً سن نادم[1]

اور کہا کہ بعضوں نے اپنی مدت العمر کے قیل وقال اور کیف ولماذا کا حاصل یہ بتلایا ہے:

نهاية ارباب العقول عقال
و اکثر سعی العالمین ضلال
ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا
سوی ان جمعنا فیه قیل و قالوا[2]

فلاسفہ و متکلمین کی محرومی

آخر میں ایک ایسے قاطع اور اوقع طریق سے جو سارے شکوں کو مٹا دینے والا اور ساری بے چینیوں سے نجات دلانے والا تھا۔ ثابت کیا کہ جن لوگوں نے اپنی محرومی و محجوبیت اور کوری و مجہولیت پر خود یہ کچھ شہادتیں دی ہیں، بھلا ان کی پیروی سے کب بابِ معرفت تک رسائی ہو سکتی ہے؟ قلت وما احسن قول الشاعر العارف:

آں لعلِ گراں بہا زکان دگرست
واں دُرِّ یگانہ زانشانِ دگرست
اندیشۂ این و آں خیالِ من و تست
افسانۂ عشق را بیانِ دگرست

پس حقیقت وہی ہے جس کو وحیِ الٰہی اور حاملینِ منصبِ نبوت علی الخصوص آخرہم و اعظمہم محمد رسول اللہ ﷺ اور اُن کے اصحاب و اتباع نے دُنیا کے آگے پیش کیا اور شک وظن کی ظلمت و محجوبیت کی جگہ علومِ سماویہ و نبویہ کی یقینیات و براہین کا دروازہ نوعِ انسانی پر کھول دیا اور جس کے علم وعمل کا نمونہ سلف صالح و اوائل امتِ مرحومہ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ[3] من ورثۃ الانبیاء و خلفاء الرسل و ائمۃ الهدی، رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ[4] نے اخلاف و آخرِ امت کو ہمیشہ کے لیے دکھلا دیا: اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ[5] شیخ موصوف کہتے ہیں کہ اس ایک ہی صحبت میں سارے پردے شکوک و اضطراب کے اُٹھ گئے، اور میرے دل نے حلاوتِ ایقان وطمانیت کی لذّت پالی۔ میرا دل بے اختیار پکار اُٹھا کہ جس نُورِ حقیقت کی جستجو میں سرگرداں و حیران ہوں، اس کی شعاعیں امام ابنِ تیمیہ کے ناصیۂ امامت پر چمک رہی ہیں۔

ایک نصیحت

جب وہ میرے حالات سے مطلع ہوئے تو وصیّت کی کہ ساری چیزیں چھوڑ کر صرف سیرتِ نبویہ کے

Marfat.com

مطالعے اور تدبّر و تفکر کو اپنے اوپر لازم ٹھہرالو، یقین اور ایمان کی تمام بیماریوں کے لیے یہی ایک نسخہ کافی ہے، چنانچہ مَیں نے اس وصیت کو حرزِ جان بنا لیا، اور جو کچھ پایا، اسی کے وسیلے سے پایا اور ہلاکتِ دُنیا و آخرت سے نہیں بچا مگر اسی کے طفیل۔

شیخ موصوف نے صرف سیرتِ طیبہ کے مطالعے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ کمالِ شغف و ربطِ قلب سے اس باب میں بعض مفید تالیفات بھی کیں۔ ازاں جملہ ''سیرتِ ابنِ اسحاق'' کا خلاصہ ہے، جس کی حافظ ذہبی نے بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ گو ماخذ اس کا ''تہذیب ابنِ ہشام'' ہے، لیکن حسنِ تبویب و اضافۂ فوائد کے لحاظ سے مستحقِ ترجیح ہے۔

امام موصوف کا مرتبہ تجدید و مقام فاتحیت

شیخ عماد الدین واسطی رحمۃ اللہ علیہ نے امام موصوف کی جس صحبت کا ذکر کیا ہے، تو یہ مبحث منجملہ ان اہم ترین مباحثِ شریعت اور دقیق ترین مقامات معارف کتاب وسنت کے ہے، جن کی کشف و تحقیق اور بحث و تنقیب امام ابنِ تیمیہ کے مخصوص معارف میں سے ہے۔ بلکہ اُن کے منصبِ تجدید و امامت فی الدین کا اصلی جوہر اور اُن کے تمام علوم و مقالات کا روح الروح اور صفوۃ المقال یہی مقام ہے۔ حقیقت اگرچہ سلف کے یہاں حالاً و عملاً بہ حد کمال موجود تھی، لیکن قولاً و عملاً اس کو منتہا درجۂ بحث و تحقیق و وضوح تک پہنچا دینا اور بطریقِ جوامع وکلیات وقواعد و مقالید اس کا ثابت کرنا اور اس درجہ منقح و صاف کر دینا کہ لو کشف الغطاء لما ازددت یقینا ؎ کا جملہ اس پر صادق آئے، تو یہ فضلِ مخصوص صرف امامِ موصوف اور ان کے اصحاب و تلامذہ ہی کے حصہ میں آیا۔ اسی لیے امام ذہبی نے کہا: "ولقد نصر السنه المحضة و الطريقة السلفية واحتج لها ببراهين و مقدمات و امور لم يسبق اليها واطلق عبارات احجم عنها الاولون والاخرون۔" اور اسی لیے ان کا مرتبۂ تجدید اور فاتحیت تمام مجددین و فاتحینِ اعصارِ اواخر میں سب سے بالاتر و ارفع واقع ہوا، کیونکہ اکثر مجدّدینِ امت کی تجدید و دعوت متعلق اعمال و فروغ کے ہے لیکن امام موصوف کی تجدید براہِ راست علوم و عقائد و اصول و اساسات شریعت سے متعلق ہوئی۔ پس جو نسبت اصل اور فرع میں ہے، وہی نسبت ان کے مرتبہ تجدید اور دیگر مجدّدینِ امت کے مرتب میں سمجھنی چاہئے، اور پھر بسبب اکتساب فیضان نسبت جامعیت محمدی، علم و عمل کی اور تمام شاخوں اور راہوں کا بھی اُن کے مقامِ دعوت و تجدید نے احاطہ کیا اور اس طرح ''آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری'' کا معاملہ بھی واقع ہوا ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ اور اسی لیے گو ان کا ظہور دورِ متاخرین میں ہوا، لیکن بلحاظ مرتبہ و معنویت کے داخل صفوف اوائل و اسلاف امت و مصداقِ صحیح وَّاٰخَرِيۡنَ مِنۡهُمۡ لَمَّا يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ ؕ اور پھر اسی لیے سلسلہ اصلاح و تجدید امت میں ان کی دعوت خلف کے لیے واسطۃ العقد کا برزخ واقع ہوئی جو خلف کو

Marfat.com

سلف سے جوڑتی اور اواخر پر اوائل کے فیضان و برکات کا دروازہ کھولتی ہے اور یہی بات ہے کہ عہدِ آخر کے تمام معاملات و کاروبارِ تجدید و دعوت کی فاتحیت و قطبیت انہی کے سپرد ہوئی۔ وما احسن ما قال الشیخ بدرالدین بن عزالدین المغیثی فی رثائه رحمة الله علیهما۔

فلئن تاخر فی القرون لثامن
فلقد تقدم فی العلوم امام

موجودہ دور کا فتنۂ عقائد اور اس کا علاج

بہرحال اصحابِ تاویل و رائے اور متکلمین و اتباعِ فلاسفہ کی بے حاصلی و نامرادی اور سلفِ امت و اصحابِ تفویض کے مذہبِ حق و طریقِ حکمت اور عقلیات صادقہ و فاضلہ کے اثبات و نصرت میں امام ابنِ تیمیہ کے مباحث و مقالات اور براہین و قواطع کا عالم دوسرا ہے اور افسوس امت کی محرومی و واماندگی پر کہ صدیوں سے یہ خزائنِ معارف و کنوزِ حقائق موجود ہیں، مگر کوئی ان کا شناسا و عارف پیدا نہ ہوا۔ بلکہ ہمیشہ غفلت و جہل اور تعصب و جمود کی تاریکیوں میں مدفون و مجہول رکھا گیا۔ وھذہ لیست اوّل قارورة کسرت فی الاسلام، و کم نوبة قدموا الحق والعلم من قوس واحدة! علی الخصوص آج کل مسلمانوں میں جس فتنۂ عقائد نے سر اُٹھایا ہے اور بحکم بَلْ قَالُوا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ [1] وہ تمام فتنے اکٹھے ہو کر پلٹ آئے ہیں جو عقائد اسلامیہ کے مختلف دوروں میں فرداً فرداً ظاہر ہوئے تھے۔ اس کے لحاظ سے تو آج معارفِ ابن تیمیہ سے بڑھ کر اور کوئی چیز مطلوب و مقصودِ وقت نہیں۔ البتہ ضرورت بہت کچھ اضافۂ مطالب و تفصیلِ اجمال و توضیحِ اشارات و ضبط و تالیفِ اشتات و انتشار کی ہے۔

شیخ واسطی نے امام موصوف کے جو اشارات متکلمین و اربابِ تاویل کے باب میں نقل کیے ہیں، ان کو زیادہ تفصیل کے ساتھ انہوں نے اپنے مشہور مقالہ "عقیدة الحمویہ" میں لکھا ہے، یہ وہی تحریر ہے، جس کی بنا پر سب سے پہلے امام موصوف کے خلاف علمائے سوء نے فتنہ اٹھایا اور ربیع الاول ۶۹۸ھ میں مبتلائے محن و آلام ہوئے۔ یہ رسالہ مصر میں دو بار چھپ چکا ہے، علامہ سفارینی [1] نے کہ گیارھویں صدی [2] کے کبار اصحابِ اثر و اعاظم حماتِ طریقِ سلف میں سے ہیں۔ ایک ضخیم مجلّد میں اس کی شرح بھی لکھی ہے، اور اُن طالبانِ حق و جویانِ حقیقت کے لیے جن کے امراضِ قلب و اعتقاد کو علامہ نسفی و تفتازانی و دوّانی (رحمهم الله) کے شفاخانوں نے اور زیادہ مزمن و شدید کر کے چھوڑ دیا ہو، اکسیرِ اعظم و تریاقِ مجرب و شفاء لما فی الصدور کا حکم رکھتی ہے۔

فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ [3]

سرِّ خدا کہ عارف و زاہد کے نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید؟ [4]

Marfat.com

حیاتِ طیبۂ نبوت، علم و بصیرت کا اصلی سرچشمہ

بہر حال اس واقعے میں قابلِ غور وہ عشق و شغف ہے، جو امام موصوف کو خصوصیت کے ساتھ سیرتِ نبویہ سے تھا۔ ایک سرسری نظر رکھنے والا تو اس واقعے کو معمولی سی بات سمجھ کر معترضانہ آگے بڑھ جائے گا۔ لیکن صاحبِ نظر و بصیرت اسی ایک بات سے امام موصوف کے تمام علوم و اعمال کا محور و مرکز معلوم کر لے سکتا ہے۔

انہوں نے ایک ایسے صاحبِ علم مگر مریضِ شک و اضطراب کو جو مدعیانِ علم و حکمت کی دانش فروشیوں کے ہاتھوں اپنا یقین و اطمینان ضائع کر چکا تھا۔ یہ وصیت کی کہ ساری چیزیں چھوڑ کر صرف حیاتِ طیبہ نبوت کے مطالعہ و تفکر میں لگ جاؤ اور گویا اس طرح بتا دیا کہ علم و بصیرت کا اصلی سرچشمہ صرف حیات نبوت اور منہاجِ مقامِ رسالت ہے، جس کو قرآن حکیم نے "الحکمت" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا[5] کیونکہ دنیا میں "حکمتِ صادقہ" کا اس "حکمت" سے الگ کوئی وجود ہی نہیں۔ "حکمت" یا تو خود منہاج و سنتِ نبوت ہے، یا علم و عمل کی ہر وہ بات جو اُس سے ماخوذ اور صرف اُسی پر مبنی ہو۔ یہی "خیرِ کثیر" مبدِ جمیع خیرات و برکاتِ ارض و نوع ہے اور صرف اسی نسخۂ شفا سے دل اور روح کی ساری بیماریاں دور ہو سکتی ہیں، خواہ شکوک و ارتیاب کی بیماری ہو، خواہ اوہام و انکار کی، خواہ ادعائے ادریت کا ہیجان ہو، خواہ حیرانی و سرگردانی لاادریت کا خمار:

زہر مرض کہ بنالد کسے، شراب وحید[6]

کوئی بیماری ہو، دوا صرف ایک ہی ہے:

یکے دواست بدارالشفائے میکدہ ہا!

باقی یا تو اسمائے مختلفہ ہیں اور مسمّٰی وہی ایک ہے۔ مثلاً "سنت و سیرت" کی جگہ "قرآن و کتاب" کا لفظ بول دیا جائے کہ نام دو ہو گئے۔ مگر حکایتِ شہد و عسل سے زیادہ نہیں۔ یعنی بات وہی ایک رہی۔ دلالت و تسمیہ میں تعدد ہوا، مدلول و مسمّٰی میں نہیں:

عباراتنا شتی و حسنک واحد![7]

آثار و سیرتِ صحابہ

یا پھر اُسی نسخے کے اجزا و توابع جیسے آثار و سیرتِ صحابہ و سلفِ امت اور معارف و بصائر ماخوذہ و مکتسبۂ کتاب و سنت کہ گو اشکال و اسماء میں تفرقہ و امتیاز ہوا، مگر بحکم علیکم بسنتی و سنۃ خلفاء الراشدین[8] اور وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ[9] اور فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ[10] الخ اور ما انا علیہ و اصحابی[11] معناً و حکماً، جزء و کل، اصل و فرع مصدر و مشتق، یا شمس و کواکب کا سارا معاملہ واقع ہوا ہے۔ روشنی صرف ایک ہی ہے اور ایک ہی کی ہے، اگرچہ چاند سے بھی مل جائے اور چمکیلے

Marfat.com

ستاروں سے بھی۔

بحر یست متحد کہ بہ اشکالِ مختلف
باران و قطرہ و صدف و گوہر آمدہ
مشتق چونیک درنگری عین مصدر است
کیں در صفاتِ ظاہرِ خود مضمر آمدہ

ویقرب من هذا ما قیل بالعربیة۔

وما البحره الالموج لاشی غیره
وان فرقته کثرة المتعدد

اور اگر یہ دونوں صورتیں بھی نہیں، تو پھر جو کچھ ہے، نہ تو علم ہے اور نہ شفا بلکہ خود جہل ہے اور مرض! اگرچہ افسوس کہ اس دُنیا میں زیادہ حصہ انہی مریضوں کا بستا ہے۔ جنہوں نے ہمیشہ طلبِ مرض کو طلبِ شفا سمجھا ہے، اور سمِ قاتل سے اُمید حیات رکھی ہے! اور پھر یاد رہے کہ یہی معنی ہیں سلف کے اس قول کے کہ علم نہیں ہے مگر وہ جس میں حدثنا اور اخبرنا ہو۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وساوس وضلالت سے زیادہ نہیں۔ کما قال الشافعی رضی اللہ عنہ۔

کل العلوم سوی القرآن مشغلة
الاالحدیث و الاالفقه فی الدین
العلم ما کان فیه قول حدثنا
وما سوی ذاک وسواس الشیاطین

جوامع الکلم ۔ نبویہ

اور یہی معنی ہیں اس قولِ نبوی ﷺ کے کہ علم صرف تین ہیں، ما سوا ان کے جو کچھ ہے۔ فضل ہے، آیتِ محکمہ، سنتِ قائمہ، فریضہ عادلہ [۲۲] اور یہ منجملہ جوامع الکلم نبویہ کے ہے کہ اس دنیا میں علم کی حقیقت اور اس کے حدود و مقاصد و مراتب و انواع کی نسبت جو کچھ بھی کہا جا سکتا ہے، وہ سب کچھ ان تین لفظوں میں جمع کر دیا گیا اور بتلا دیا گیا۔ وَلکن مَا یَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ [۲۳] وقدس اللہ روح القائل و هو حجة الاسلام ابن قیم اذا یقول فی النونیة الکبریٰ [۲۴]

العلم قال اللہ قال رسوله	قال الصحابة هم اولو العرفانِ
ما العلم نصبك للخلاف سفاهة	بین الرسول و بین رأی فلان
کلا ولا عزل النصوص و انها	لیست تفید حقائق الایمان

Marfat.com

اذلا تفید کم یقیناً لا ، ولا — علماً، فقد عزلت عن الایقان
والعلم عند کم ینال بغیرھا — بزیالة الافکار والاذھان
سمیتموہ قواطعا عقلیه — نفی الظواھر حاملات معان
کلا ، ولا احصاء آراء الرجال — وضبطھا با الحصر والحسبان
کلا ، ولا التاویل و التبدیل — والتحریف للوحیین بالبھتان
کلا ولا الاشکال و التشکیك — والوقف الذی مافیه من عرفان
ھذی علومکم الّتی من اجلھا — عادیتمونا یا اولی العرفان

وقال الشیخ الاکبر، من جملة ابیات افتتح بھا الباب الثامن و ثلاث مائة من الفتوحات:

کل علم یشھد الشرع له — فھو علم نبه فلتعتصم
فاذا خالفه العقل فقل — طورك الزم مالکم فیه قدم

عدمِ یقین وبصیرت اور عوارض قلب وروح

اور سبب اس کا ظاہر ہے۔ قلب وروح کی جتنی بیماریاں بھی ہیں، اصل مبدا ان کا دو قسموں سے باہر نہیں۔ ایک قسم مرض کا نام الحاد وانکار ہے۔ دوسری کا توہم وسوفسطائیت۔ باقی تمام بیماریاں اسی کے اتباع و عوارض وفروع ہیں اور دونوں قسموں میں ظہورِ مرض کے علائم وآثار وعواقب مشترک ہیں، یعنی دونوں کا نتیجہ شک وجہل واضطراب اور فطرت کی طمانیت اور سرور وراحتِ قلبی کا ازالہ یعنی باصطلاحِ قرآنِ حکیم ''نفسِ مطمئنہ'' کا فقدان۔ پس مرض بلحاظِ علت وظہور ہر حال میں صرف یہی ہوا کہ شک وظلمت، اور اس عالم میں وحی الٰہی اور حکمتِ نبوت اور ان سے ماخوذ ومکتسب کے علاوہ جو کچھ ہے۔ ''یقین''، ''برہان''۔ ''بصیرت'' اور ''فرقان'' نہیں ہے، شک وظن ہے، عدمِ علم وبصیرت ہے، یا تخمین ورائے اور تلعب وتخرص بالریب ہے۔ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ [5] اور بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ [6] اور وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ [7] اور هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا [8] اور اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ؟ [9] اور وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـــًٔا [10] اور قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (آخر یوسف) [11] اور بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ [12] مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَاۗءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ

Marfat.com

اَلْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ٣٣ وغير ذالك مِنَ الايات والقواطع۔ اور اسی لیے دعوتِ خاتم الادیان و مکمل الشرائع کی نسبت اکثر خطباتِ نبویہ میں یہ اعلانِ عام پاتے ہو کہ اس کا ظہور کرۂ ارضی کے کمالِ جہل و فقدانِ علم کے وقتوں میں ہوا۔ یعنی اس لیے ہوا تاکہ علم و نُور سے دُنیا کو بھرپور کر دے اور علم و نور نہیں ہے مگر یقین و زوالِ شک و ریب۔ علی الخصوص اوّلین خطبۂ جمعہ بالمدینہ میں فرمایا: ارسله بالهدیٰ والنور والموعظة علی فترة من الرسل، و قلة من العلم و ضلالة من الناس الخ. اخرجه الحاکم علی شرط الصحيحين و الطبری فی تاریخه ٣٤ پس ظاہر ہے کہ جن نام نہاد علوم کا ماحصل خود ظلمتِ ظن و شک اور کوریِ وہم و رائے سے زیادہ نہیں، وہ مریضانِ یقین و اعتقاد کے لیے کیونکر نسخۂ شفا ہو سکتے ہیں؟ اور جو خود سرگشتۂ راہ اور داماندۂ کار ہے۔ وہ دوسرے گم کردہ راہوں کی کیا رہنمائی کر سکتا ہے؟

جوہر طینتِ آدم زخمیرِ دگر ست
تو توقع زگلِ کوزہ گراں می داری ٣٥

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ٣٦ مرض کا ازالہ دوا سے ہو سکتا ہے، نہ کہ خود تولیدِ مرض سے۔ اگر دنیا کا اصل مرض ''یقین'' اور ''بصیرت'' سے محرومی ہے اور شک و گمان کی ہلاکت، تو اس کا علاج وہ کیوں کر کر سکتے ہیں، جن کا خود اعلان یہ ہے کہ ہمارا منتہائے فکر و ادراک اس سے زیادہ نہیں کہ "لَا اَدْرِیْ وَلَا اَعْلَمُ" ہم نہیں جانتے اور نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہے اور کس لیے ہے؟ یعنی بحکم وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ٣٧ وہ خود اپنے منتہائے معرفت کو جہل سے زیادہ نہیں بتلاتے: اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ٣٨

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد ٣٩

دارالشفائے وحی و حکمتِ نبوت

اس کا علاج اور نسخۂ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ٤٠ تو صرف اُسی اعلم الخلائق و اعرف العباد کے دارالشفائے وحی میں مِل سکتا ہے، جو شک کی جگہ یقین کا، ظلمت کی جگہ نور کا، عدمِ علم کی جگہ علم و بصیرت کا، ظن و قیاس و گمان کی جگہ بینہ و حجت کا، برہان و فرقان کا اور تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ٤١ اور عروة الوثقیٰ کا غرض کہ "لا ادری" اور "لا اعلم" کی جگہ "اِنِّیْ اَعْلَمُ" اور قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ ٤٢ اور "اِنِّیْ اَشْهَدُ" بلکہ "رایت و سمعت" کا دعویٰ اور اعلان کر رہا ہو اور تمام نوعِ بشر کہ یہ کہہ کر بلا رہا ہو: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ٤٣! اور تمام منکرین و جاحدین سے بار بار مطالبہ کرتا ہو: قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؟ ٤٤ یعنی یہ علم و یقین اور خروج من ظلمات الجهل الی نور المعرفة والحقيقة کی راہ ہے، جس پر میں تم کو دعوت دے رہا ہوں۔ پھر تمہارے پاس بھی کوئی ''یقین''

اور "علم و بصیرت" ہے، جس کو دنیا کے آگے پیش کر سکتے ہو؟ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؟[5] اور قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ[6] ایک کہتا ہے، میرے پاس شک ہے، اگر تم میری طرف آؤ تو تم کو شک سے معمور کر دوں گا۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے بجز یقین اور برہان کے اور کچھ نہیں۔ لَّا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ[7] اور بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ[8] میں بصیرت ہوں۔ دعوتِ علم ہوں۔ پیامِ حجت و برہان ہوں۔ حقیقت جو ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتی، اس کی ایک ہی راہ ہوں۔ اقوام الطرق، اوضح السبل، صراط السوی: وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ[9] پھر بتلاؤ، دنیا کو، جو طمانیت و قرارِ قلب کی بھوکی پیاسی اور شک و اضطرابِ نفس کے زخموں سے جاں بلب ہے، کس کا ساتھ دینا چاہیے؟ اس کا جو خود شک و ریب کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہے، ایک تاریکی سے نکلنے کے لیے دوسری تاریکی میں ڈوبتا ہے، اور تاریکیوں کا یہ حال ہے کہ خود اپنا ہاتھ بھی سجھائی نہیں دیتا۔ ایک گتھی سلجھانا چاہتا ہے تو دس نئے الجھاؤ رشتۂ ادراک میں پڑ جاتے ہیں۔ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۚ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۚ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۚ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ؟[10] اور جس کی اُن ساری کوششوں اور طلب و جستجو کا جو حقیقت تک پہنچنے اور عقدۂ ہستی کو حل کرنے کے لیے کرتا ہے، یہ حال ہے کہ ہر نیا مرحلہ ایک نئی گمراہی کا پیام اور ہر منزل ایک نئے بعد و گم گشتگی کی مایوسی ہوتی ہے۔ جس نظریے پر رُکتا اور جس تھیوری کو فاتح کار سمجھ کر پوجتا ہے جب اس تک پہنچتا ہے، تو یقین کی جگہ وہ خود ایک نئے شک کی دعوت نکلتی ہے، اور جواب کی جگہ وہ خود ایک نیا سوال ہوتی ہے اور اس طرح اس کی تاری امیدیں اور ساری خوشیاں اس پیاسے کی اُمید سے زیادہ نہیں ثابت ہوتیں۔ جو ریگستان افریقہ کو دجلہ و فرات سمجھ کر بے تحاشا دوڑ رہا ہو: كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۚ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا[11] پس کیا کھوئے ہوؤں کو طلبِ دلیل و ہدایت میں اپنے ہی جیسے کھوئے ہوؤں کا دامن پکڑنا چاہیے؟ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ[12] اور لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ[13] یا پھر اس کا ساتھ دینا اور بلا چون و چرا سمع والطاعت کا سر جھکا دینا چاہیے۔ جس کی ساری پکار اور سارے پیاموں کی بنیاد ہی یہ ہے کہ میں ظلمت نہیں، بلکہ سرتا سر نُور ہوں۔ میں تاریکی میں اِدھر اُدھر بھٹکنے والا قدم اور خود اپنے ہاتھ کو بھی نہ دیکھ سکنے والی آنکھ نہیں ہوں، بلکہ معرفت و شہادت کا اُجالا ہوں، نورانیت میں بے خوفِ لغزش و بے خطرۂ گم رہی، دوڑنے والا قدم ہوں اور دوپہر کی چمکیلی روشنی میں ایک ایک ذرّہ تک کو دیکھ لینے اور پا لینے والی بینائی ہوں۔ السمحۃ الحنیفیۃ والحجۃ البیضاء۔ لیلھا کنھارھا یہاں ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ یمین و یسار بالا و

پست، اور مِنۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ بجز نُور اور نُوۡرٌ عَلٰى نُوۡرٍ [۵۴] کے اور کچھ نہیں ہے۔ وکان من دعائه ﷺ باللیل، اللّٰھمّ اجعل فی قلبی نورا و فی لسانی نورا، وجعل فی بصری نورًا و فی سمعی نورًا، واجعل من خلفی نورًا، ومن امامی نوراً۔ وجعل لی من فوقی نورًا، ومن تحتی نورًا، اللّٰھمّ اعطنی نُورًا (مسلم) [۵۵] نہ میری حقیقت بین آنکھ کے لیے زیغ ہے، نہ منزل شناس قدم کے لیے ٹھوکر: مَا زَاغَ الۡبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿۱۷﴾ لَقَدۡ رَاٰى مِنۡ اٰيٰتِ رَبِّهِ الۡكُبۡرٰى [۵۶] اور حدیث انس کہ وَالَّذِی نفسی بیدہٖ لقد عُرضت علیّ الجنة والنّار انفاً فی عرض ھٰذا الحائط وانا اصلی (بخاری) [۵۷] اور حدیث اسماء بنت ابی بکر اور خطبہ صلوٰۃ کسوف کہ ما من شی لم أره الاوقد رایته فی مقامی ھٰذا حتی الجنة والنار، واوحی الی ربکم یفتنون فی القبور الخ (رواہ البخاری [۵۸]) اور ابیت عند ربی یطعمنی و یسقینی [۵۹] (رواہ الاربعہ) اور ان سب سے بھی بڑھ کر یہ کہ اتانی ربی فی احسن صورة (وفی روایه اتانی اللیلة ربی) فقال فیم یختصم الملاء الاعلی فقلت لا ادری فوضع کفه بین کتفی حتی وجدت بردانا مله بین ثدیی و تجلی لی علم کل شیی اخرجه جماعة منھم احمد و ترمذی [۶۰] وصححہ۔ بلکہ جس حقیقتِ ہزار حجاب کا ایک سچا یا کم از کم سچائی سے قریب تصور بھی تم سے بن نہ آیا، میں نہ صرف اس کا سراغ ہی رکھتا ہوں بلکہ وہ تو میری دیکھی بھالی اور میرے سامنے کی مشہود و منظور ہے۔ حتی وجدت بردانا مله بین ثدیی! اس کی انگلیوں سے چھونے کی ٹھنڈک اپنے سینے پر محسوس کر رہا ہوں۔ اس کے بعد اور کیا باقی رہ گیا؟ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ﴿۸﴾ فَكَانَ قَابَ قَوۡسَيۡنِ اَوۡ اَدۡنٰى [۶۱]

جمالك فی عینی و حبك فی قلبی
وَ ذکرك فی فمی ، فاین تغیب؟ [۶۲]

حقائق و معارفِ کتاب وسنت

تم نے اپنی درماندگیوں سے عاجز آ کر اس کا نام ہی مافوق ادراک اور غیب رکھ دیا ہے۔ حالانکہ یہاں تو اس کی مشہودیت کا یہ حال ہے کہ اس کا ذکر ہی ''شہادت'' کے لفظ سے کیا جاتا ہے، جس کے معنی حضور ورویت کے ہیں: شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الۡعِلۡمِ قَآئِمًۢا بِالۡقِسۡطِ [۶۳] تم اس کی طلب وجستجو کو گمان وخیال اور قیاس وظن سے تعبیر کرتے ہو کہ اس سے آگے تمہارا قدم نہیں بڑھتا۔ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا [۶۴] حالانکہ یہاں ظن وگمان کا کیا ذکر، ظن کو تو یہاں زندگی و ہدایت کے دائرے ہی سے خارج اور موت (کفر) کا ہمنشین سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تو اس کی نسبت جو کچھ کہا اور سمجھا جاتا ہے، اس کا نام ہی ''ایمان'' اور ''ایقان'' ہے۔ یعنی عدم شک اور یقین صرف و بحت: يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰهِدِيۡنَ ﴿۸۳﴾ وَمَا لَنَا لَا نُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الۡحَقِّ ۙ وَنَطۡمَعُ اَنۡ يُّدۡخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الۡقَوۡمِ

الصّٰلِحِیْنَ ۵ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا یَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَیَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ[6] غرض کہ جس کا حال یہ ہو کہ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ③ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی[7] ان کا سا نہ ہو کہ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ[8] (مومن) اور بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًی وَّلَا کِتٰبٍ مُّنِیْرٍ[9] تو کیا صرف وہی اکیلا نہیں ہے جس کی راہ دُنیا کے لیے امن و سلامتی کی راہ ہے اور جس کے ساتھیوں کے لیے نہ تو کبھی شک کی بے چینی ہے اور نہ جہل و ظلمت کا ہراس: لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ[10] اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا کے بعد فرمایا: هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ؟ تو اس سے معلوم ہوا کہ معرفت و ایمانِ باری اور عِبَادَةً وَّتَبَتُّلٌ اِلَی اللّٰهِ کی بنیاد علم اور دانستن ہے، کیونکہ اس سے بڑھ کر جاننا اور پہچاننا کیا ہوگا کہ جب ساری خلقت، رات کے بسترِ عافیت پر سو رہی ہو، تو ایک عارفِ حق کو کسی جانے پہچانے ہوئے کا عشق بسترِ راحت سے اُٹھاتا اور اپنے سامنے جھکاتا ہے! وہ اُس کی انتظارِ رحمت کے لیے روتا ہے۔ اس کی ہیبت و جبروت سے کانپتا اور تھرّاتا ہے۔ اس کے بخشش کے بڑھے اور کھلے ہوئے ہاتھوں (بَلْ یَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ) کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر بے اختیار طلب و سوال کا ہاتھ بڑھاتا اور بیقراریوں کی آوازوں میں پکارتا اور مانگتا ہے۔ اسی لیے دوسری جگہ فرمایا: اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا کہ خوفِ الٰہی معرفتِ صفات کے بعد ہوسکتا ہے اور معرفت علم ہے، پس جو صاحبانِ علم ہیں، وہی اس سے ڈریں گے۔ غرض کہ قرآنِ حکیم کے نزدیک عبادت، علم و تعقل و ادرک ہے اور عصیان و غفلت، جہل و سفاہت و کوری اور یہ موقع مزید تشریح کا نہیں (مولانا آزاد) یہی معنی ہیں، اِن آیات کریمہ کے کہ اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ کَمَنْ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا[1] اور اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ؟[2] اور اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ فَوَیْلٌ لِّلْقٰسِیَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِکْرِ اللّٰهِ[3] وَغَیْرَ ذٰلِكَ مِنَ الْاٰیَاتِ فِیْ هٰذَا الْبَابِ اور فی الحقیقت یہی وہ نُورِ حقیقت اور مشکوٰۃِ معرفت ہے، جس کو ایک عجیب و غریب اور جامع و مانع تمثیل مرکب میں واضح فرمایا کہ: مَثَلُ نُوْرِهٖ کَمِشْکٰوةٍ فِیْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ کَاَنَّهَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَکَةٍ زَیْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِیَّةٍ وَّلَا غَرْبِیَّةٍ ۙ یَّکَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ؕ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَیَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ[4] اور یہ مقام منجملہ رُوح الروح معارف کتاب و سنت و حقیقۃ الحقائق قرآن و شریعت کے ہے جس کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ مگر اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں...... اربابِ ذوق و صلاح کے لیے ایک اشارہ حقیقت کافی ہے۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ تو ان کے لیے حقائق و معارف کے قناطیرِ مقنطرہ بھی بیکار ہیں وہ تو ہمیشہ یہی

Marfat.com

کہیں گے: مَاذَآ اَرَادَ اللّٰہُ بِھٰذَا مَثَلًا ؟ وَمَآ اَحْسَن و اصدق مَا قَال العرفی الشیرازی۔

ہزار معجزہ بنمود عشق و عقل جہول
ہنوز امّتِ اندیشہ ہائے خویشتن ست

نسخۂ شفائے شک وریب

غرض کہ امام ابنِ تیمیہ نے ایک ایسی حقیقت جو طبیعت کو جوار بابِ ظن ورائے کی صحبتوں سے وادیٔ شک و اضطراب میں حیران و سرگرداں ہوگئی تھی، اُن ساری باتوں میں سے ایک بات بھی نہیں کی جو اور لوگ کہہ سکتے تھے، بلکہ صرف یہ وصیّت کی کہ سیرتِ طیبہ نبویہ کا مطالعہ کرو، یہی نسخہ شفا شک و ریب کے سارے دکھوں کا ایک ہی علاج ہے، اور پھر قولاً بھی اپنی تمام مصنفات میں اسی چیز کو بنیاد و منبعِ ہر گونہ علم و ایقان بتلاتے ہیں، تو یہ بات بھی منجملہ انہیں خصائصِ مقامِ وراثتِ نبوّت کے ہے۔

علیم بأدواء النفوس یسوسھا
بحکمتہ فعل الطبیبِ المجرب[5]

اور حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف اُس عہد میں بلکہ جب تک دنیا باقی ہے، صاحبِ قرآن کی سیرت و حیاتِ مقدس کے مطالعہ سے بڑھ کر نوعِ انسانی کے تمام امراضِ قلوب وعللِ ارواح کا اور کوئی علاج نہیں، اسلام کا دائمی معجزہ اور ہمیشگی کی حجۃ اللہ البالغہ قرآن کے بعد اگر کوئی چیز ہے، تو وہ صاحبِ قرآن کی سیرت ہے اور دراصل قرآن اور حیاتِ نبوّت معناً ایک ہی ہیں، قرآن متن ہے اور سیرت اس کی شرح۔ قرآن علم ہے اور سیرت اس کا عمل، قرآن صفحات وقراطیس ما بین الدفتین اور فِیۡ صُدُوۡرِ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ[6] میں ہے، اور یہ ایک مجسم و ممثّل قرآن تھا، جو یثرب کی سرزمین پر چلتا پھرتا نظر آتا تھا۔ کما قالت الصدیقۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا: وَکَانَ خلقہ القرآن[7]

مادو جانے آمدہ د ریک بدن
من کیم؟ لیلیٰ، و لیلیٰ کیست؟ من[8]

سیرت انبیاء – دلیل و برہانِ حق

انبیائے کرام کی زندگی سے بڑھ کر "یقین" اور "ایمان" کی پکار اور کیا ہوسکتی ہے۔ محالِ قطعی ہے کہ ایک صاحبِ استعداد سیرتِ نبویہ کا کوئی چھوٹا سے چھوٹا ٹکڑا بھی پیشِ نظر رکھتا ہو اور پھر شک و اضطرابِ نفس کا افسونِ ہلاکت اس پر کارگر ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے جا بجا انبیائے کرام علیہم السلام کی نفسِ زندگی و وجود کو بطور ایک حجت و برہان کے پیش کیا ہے، نہ کہ محض بطور قصص، واظہارِ علم ما سبق، وانباء بالغیب کے جیسا کہ عموماً سمجھا گیا ہے۔

قرآنِ حکیم کا کھلا کھلا دعویٰ یہ ہے کہ ہر نبی کی زندگی جس طرح شروع ہوئی اور جس طرح ختم ہوئی اور جو کچھ اس پر گزرا اور قولاً وفعلاً جو کچھ اس سے تعلق رکھتا ہے، ان میں سے ہر بات بجائے خود ایک دلیل اور بُرہانِ حق ہے، اس سے بڑھ کر اس حقیقت کے اثبات کے لیے اور کوئی دلیل یقینی وقطعی نہیں ہوسکتی کہ خدا ہے اور ساری اچھی اور حسین صفتوں سے متصف ہے اور اس نے جس طرح عالمِ ہستی اور مافیہا کو بنایا، اُسی طرح اِس کے لیے قوانین ونوامیسِ عمل ونتائج بھی بنائے اور وہ ہر حال میں اٹل ہیں، دنیا میں انسان زیادہ سے زیادہ اور قطعی سے قطعی یقین جن چیزوں پر رکھتا ہے اور جن وسائل سے اُن کے یقینی ہونے کو مانتا ہے، قرآن کی یہ دلیل اُن سب سے زیادہ قطعی اور سب سے زیادہ روشن ومحکم ہے، اور اگر یقین کے لیے یہ دلیل کافی نہیں، تو پھر اس دنیا میں یقین کا وجود ہی نہیں۔ حتیٰ کہ دوپہر کے وقت چمکتے ہوئے سورج کا بھی نہیں، اور جسم کے ایک ایک مسام چھوتی اور لگ کر چلنے والی ہوا کا بھی نہیں، اگر تم کہتے ہو کہ دنیا میں صرف انہیں باتوں کو ماننا چاہئے جو ''یقینی'' ہوں اور ''ثابت'' شدہ یعنی تم اعتقاد کے لیے صرف ''امکان'' کو کافی نہیں سمجھتے، اثبات کے طلبگار ہو، تو جب بھی دُنیا میں الکلم الطیب اور العمل الصالح سے بڑھ کر اور کون سی ثابت وواقع حقیقت ہوسکتی ہے؟ خود تمہارا وجود اور اثباتِ ''انا'' بھی اس سے زیادہ ثابت ومشہود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے جا بجا دعوت الی الوحی کو ''قول الثابت'' اور دین القیم'' اور ''الواقع'' اور ''الثابت''[1] وغیرہ سے تعبیر کیا ہے۔ گو لوگ دوسری طرف چلے گئے۔ بہرحال حضرت نوح کا وجود بجائے خود ایک دلیل واثبات ہے، حضرت ابراہیم اپنی ذات کے اندر خود ایک حجتِ قائمہ اور آیتِ کاملہ ہیں، حضرت موسیٰ کی پوری زندگی صرف اس ایک لفظ میں بتلا دی جاسکتی ہے: برہانِ محکم ودلیلِ ثابت اور اِسی طرح تمام انبیاء ومُرسلین اور بوجہ ان کی تبعیت و معیت کے تمام نفوسِ صادقہٴ بشر من الصدّیقین و الشھداء و الصالحین علیھم الصلوۃ والسلام کی زندگیاں اور زندگی کے تمام وقائع واعمال بجائے خود ایک مستقل دلیل وبرہانِ حق ہیں اور اسی طرح ہر نبی کا تنہا وجود سینکڑوں دلیلوں اور ہزاروں شہادتوں کا مجموعہ ہے۔ اسی لیے قرآنِ حکیم اُن کا استشہاداً واستدلالاً ذکر کرتا اور ان کو ''آیت'' اور ''بیّنہ'' سے تعبیر کرتا اور اسی طرح گویا ہر ایک تذکرہ وحکایتِ حیاتِ نبوّت وَماجاء بالحق میں دنیا کے سامنے صدہا دلیلیں اور روشنیاں چمکا دیتا ہے۔

وقائع واعمال حیاتِ نبوت ۔ حجۃ اللہ البالغہ

علی الخصوص یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے جا بجا حضرت ختم المرسلین وصاحبِ اسوۂ حسنہ عالم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو بطورِ ایک مستقل دلیل وشاہدِ ثابت کے پیش کیا ہے اور نہایت کثرت کے ساتھ ان کی سیرت و سوانح اور وقائع وایّام پر مختلف پیرایوں اور مختلف لواحق اور روابط کے ساتھ بار بار توجہ دلائی ہے اور بسا مقامات میں ایسا بھی ہے کہ:

Marfat.com

گفتہ آید در حدیث دیگراں[80]

کا معاملہ ایک کیفیتِ خاص اور لذّتِ اشارات ارباب راز و نیاز کے ساتھ اصحابِ نظر و ذوق کے لیے قرۃ عُیُون اور سرورِ انفس وقلوب کا حکم رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض عرفاء و اصحابِ اشارات نے کہا۔ بائے بسم اللہ سے سین والناس تک جو کچھ ہے، گو حکایت مُوسیٰ کلیم کی ہو اور یوسف صدیق کی (صلوٰۃ اللہ علیہما) لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی ہے، اور گو نام دوسروں کے ہوں مگر رُوئے سخن اسی طرف ہے:

چشم سوئے فلک و روئے سخن سُوئے تو بود[81]

اور اُردو میں کسی نے خُوب کہا ہے:

نام اُن کا آسماں ٹھہرا لیا تحریر میں[82]

والکنایۃ ابلغ والذمن التصریح:

خوش دل کش ست قصۂ خوباں روزگار
تو یوسفی و قصہ ، تو احسن القصص[83]

اور اگر اس بات کو بابِ اشارات سے باہر بھی دیکھا جائے، جب بھی اس کی صداقت میں کلام نہیں، جب تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا وجود اصلاً ایک ہی اصل و حقیقت پر مبنی اور اپنے مقاصد و اعمال و وقائع میں جزءً وکلاً ایک ہی سلسلہ بعثت کی مختلف کڑیاں اور ہم رنگ و ہم معنی اشکال و صور ہیں، اور اس لیے باہم و گر یک قلم اشباہ و نظائر کا حکم رکھتے ہیں، بحدے کہ بوجہ کمالِ اشتراک صورت و معنی اگر ایک کڑی ہٹا دی جائے تو دوسری ٹھیک اس کی جگہ جُڑ جائے۔

منتہائے مرتبہ سیادت

اور معلوم ہے کہ اس سلسلہ کی آخری کڑی یعنی وجودِ مقدس حضرتِ خاتم الادیان ومکمل الشرائع ومتمم النعم ساری پچھلی کڑیوں کا جامع اور اسی لیے بحکم انا سید ولد آدم[84] اور لو کان موسیٰ حیًا ما وسعہ الا اتباعی اور نص قرآنی کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ[85] اور اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ[86] الخ اور فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا[87] منتہائے مرتبہ سیادت و قیادتِ عالم و مرکزیتِ رُسل و شرائع، و افضلیتِ کُلی نوع سے فائز و ممتاز ہے۔

بطرا زندگی قامتِ موزوں نازم
یک قبانیست کہ شائستہ اندامِ تو نیست[88]

جامعیت کبریٰ

تو لامحالہ بابِ فضائل و مقامات اور قصص و حکایات مناقب و برکات میں جو کچھ قرآن حکیم نے بیان کیا ہے، یا جو کچھ صدق لسان و تحقیق بیان کے ساتھ اس بارے میں کہا جائے گا۔ وہ گو بلا واسطہ دوسروں کی حکایت ہو، مگر بالواسطہ متعلق اسی وجودِ اجمع و اکمل سے ہوگی، اور جب کبھی خاص اس وجودِ جامعیت کی نسبت کچھ کہا جائے گا تو گو اس میں دوسروں کا ذکر لفظاً نہ آئے، لیکن حال یہ ہوگا کہ گویا تمام انبیاء و مرسلین بلکہ نوعِ انسانی کے تمام افرادِ فضیلت اور جماعتِ مَنْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ [۹] کے تمام اشخاصِ مراتب و کمال میں سے ایک ایک فرد کا ذکر کر دیا گیا، اور وہ سب کچھ آ گیا اور سمیٹ لیا، جو ان کے بارے میں کہا جا سکتا تھا۔ جب باغ و چمن کا نام لیا، تو گو تم نے نہ پھولوں کا نام لیا ہو، نہ ان کی رنگت و بو کا نہ نہروں کا ذکر کیا ہو نہ ان کی نضارت و روانی کا، لیکن خود بخود اُن سب کا ذکر آ گیا اور اس ایک نام کے ساتھ وہ سارے نام لے لیے گئے، اور جب تم نے کہا تختۂ گل، ہوائے عطر بیز، نظارۂ انہار و اشجار، بنفشہ و سنبل و یاسمن، تو اب تم باغ و چمن کا نام لو یا نہ لو، مگر اس کا نام تو تم نے ان ناموں میں سے ہر نام کے ساتھ لے ہی لیا، اور گو بظاہر ذکر بنفشہ و سنبل اور اشجار و انہار کا تھا مگر فی الحقیقت ذکر ان سب کا نہیں بلکہ صرف ایک ہی حقیقتِ جامعہ کا تھا، یعنی باغ و چمن کا۔ مولانا ؒ کے اشارات اس مقام کی نسبت از بس لطیف و پُر ذوق واقع ہوئے ہیں۔ ازاں جملہ کیا خوب فرمایا:

نام احمد نام جملہ انبیا ست
چونکہ صد آمد نو دہم پیش ماست

جب ''سو'' کہہ دیا تو اب ایک سے ننانوے تک جو کچھ ہے سب آ گیا اور جب کہا ایک دو، دس، پچاس، تو فی الحقیقت ذکر ''سو'' ہی کا ہوا۔ قرآنِ حکیم میں یا احکام ہیں، یا مواعظ و حِکَم ہیں، یا شرحِ قوانینِ ہدایت و ضلالت، اور یا پھر قصص الاوّلین، تو معلوم ہے کہ اگر احکام ہیں تو اُسی شریعت کے جس کا حامل سیّد المرسلین ہے۔ مواعظ و حِکَم ہیں تو وہی ہیں جن کی عملی تصویر و اسوۂ کاملہ وجودِ سیّد المرسلین ہے۔ قصص ہیں تو انہیں فضائل و مراتب کے جو سب کے سب مرتبہ جامعیتِ محمدی میں بوجہ اتم و اکمل جمع ہو گئے۔ پس اگر حضرات صوفیائے کرام نے تمام قرآن کو اسی ایک حسنِ اکمل و جمالِ بے ہمتا کی حکایتِ شمائل و شرحِ سراپا کہا، تو قطع نظر فسحتِ میدانِ اشارات کے، ویسے بھی یہ کیوں موجبِ قدح و شک ہو؟ حق یہ ہے کہ ''قرآن اور ''صاحبِ سنت'' کی باہمی یگانگت و اتحاد کے باب میں جو کچھ بھی اور جس قدر بھی کہا جائے۔ اس سے بہت کم ہے جس قدر کہنا چاہئے: وللہ در ما قال:

ما شئت قل فيه ، فانت مصدق
فالحب يقضي والمحاسن تشهد

بلکہ اس مقام پر حق تو وہ ہے جو شیخ ابن الفارض نے کہا:

Marfat.com

وعلی نفنن واصفیه بوصفه
یغنی الزمان و فیک مالم یُوصف

وَقَالَ ایضًا رحمۃ اللہ:

اریٰ کل مدح فی النبی مقصرا
وَان بالغ المثنی علیه وَاکثرا
اذاللہ اثنی بالذی ھو اھله
علیه فما مقدار مایمدح الوریٰ

خصائصِ قرآن کا ایک عظیم الشّان پہلُو

اور اگر خاص طور پر اس معاملہ کو دیکھا جائے، تو فی الحقیقت یہ چیز بھی منجملہ خصائصِ قرآن وصاحبِ قرآن کے ہے۔ آج تمام ادیانِ حاضرۂ عالم میں کوئی دین بھی ایسا نہیں جس کی کتابِ الٰہی اور صاحب و حاملِ کتاب کے باہمی علاقہ وحدت کا یہ حال ہو اور دونوں میں سے ہر وجود ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ وملحق اور باہم دگر شاہد ومشہود کا تعلق رکھتا ہو کہ کتاب، حاملِ کتاب کی صداقت پر دلیل وشاہد ہو اور حاملِ کتاب اصل کتاب کی صداقت پر:

ایں دو شمع اند کہ از یک دگر افروختہ اند!!

حتیٰ کہ اگر تاریخ شریعت کے تمام وسائل معدوم ہو جائیں اور روایت و حکایت کے تمام صحائف سے قطع نظر کر لیا جائے۔ جب بھی صاحبِ شریعت کے وجود وسیرت کی تاریخی حقیقت اسی طرح روشن و بیّن باقی رہے۔ جس طرح تاریخ و روایت کے دفاتر میں ہے اور اگر دنیا چاہے، تو اس کی پوری سوانح عمری اور تاریخِ حیات صرف ایک کتاب اللہ کی لوحِ محفوظ اور کتابِ قیم ہی سے بلا ایک نقطہ کی فروگذاشت کے مرتب کر لے!

قرآنِ حکیم اور سیرتِ طیبہ

لوگوں نے حیات وسیرتِ طیبہ ختم المرسلین (ﷺ) پر اس حیثیت سے بہت کم نظر ڈالی ہے کہ اگر روایات ودفاتر تاریخی سے قطع نظر کر لیا جائے اور صرف قرآنِ حکیم ہی کو سامنے رکھا جائے تو آپ کی سیرت و حیات پر کیسی روشنی پڑتی ہے! اور جس طرح قرآن اپنی کسی بات میں اپنے غیر کا محتاج نہیں، اسی طرح اپنے حامل ومبلّغ کے وجود وحیات کے بیان میں بھی خارج کا محتاج ہے یا نہیں! اصحابِ سیر ومحدّثینِ کرام نے فضائل و مدائح منصوصہ قرآنیہ کے تو باب باندھے ہیں، مثلاً قاضی عیاض نے ''شفا'' کے متعدد ابواب میں قرآنِ حکیم کی آیات متعلقِ فضائل ومدائح جمع کی ہیں، لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے آج تک کبھی اس کی

Marfat.com

کوشش نہیں کی گئی کہ صرف قرآنِ حکیم میں دائرۂ استناد و اخذ محدود رکھ کر ایک کتاب سیرت میں مُرتّب کی جائے۔ جس زمانہ میں مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے سیرتِ نبویہ کے بارے میں تذکرے رہتے تھے، تو ایک مرتبہ مجھے اس کا خیال ہوا تھا۔ میں نے کہا آپ سیرت میں ایک خاص باب یا سیرت کا ایک خاص حصّہ اس عنوان سے قرار دیجئے: ''قرآن اور سیرتِ محمدیہ'' اور اس میں صرف آیاتِ قرآنیہ کو بہ ربط و ترتیب جمع کر کے دکھلایئے کہ خود قرآن سے کہاں تک آپ کی شخصیت اور آپ کے وقائع و ایام معلوم ہو سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اعلیٰ علیّین میں جگہ دے، ان کی طبیعت میں ایک خاص بات یہ تھی کہ کوئی معاملہ ہو، وہ اس کی ابتداء ہمیشہ شک اور تردّد سے کیا کرتے تھے اور جب تک یقین کے لیے مجبور نہ ہو جائیں، یقین نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس خیال پر بہت ہی پسندیدگی ظاہر کی۔ مگر وہی اپنی عادت کے مطابق اظہار شک و نا اُمیدی کہ اتنا مواد صرف قرآن سے کہاں نکل سکتا ہے کہ سیرت کا ایک باب مرتّب ہو سکے! لیکن جب میں نے بہت اصرار کیا تو کہا اچھا اگر یہ ٹکڑا مرتّب کر دو، تو سیرت کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔ آخری یکجائی دہلی میں ہوئی تھی۔ اُس وقت انہوں نے کہا: اب مجھ کو بھی خیال ہوتا جاتا ہے کہ یہ ممکن ہے اور بہت ہی اہم چیز ہوگی۔ چنانچہ دہلی سے آ کر میں نے کچھ وقت اس میں صرف کیا اور ایک مُستقل سیرتِ نبویہ مجرّد قرآنِ حکیم سے ماخوذ و مستنبط شروع کر دی۔ جُوں جوں قدم آگے بڑھتا گیا۔ نئے نئے دروازے کُھلتے گئے، اور اُمید و توقع سے کہیں زیادہ کامیابی ہوئی۔ گو یہ حقیقت پہلے سے پیش نظر تھی، حتیٰ کہ اس بارے میں بڑا ذخیرہ آیات کا ذہن میں مُستحضر تھا، لیکن یہ بات تو کبھی وہم و گمان میں بھی نہیں گزری تھی کہ جس کتاب کو بظاہر جا بجا ذکرِ احکامِ و مسائل و قصصِ گذشتگان سے مملو پاتے ہیں، اس میں اس قدر وافر ذخیرہ خاص شخصِ رسالت کے حالات و وقائع کا بھی موجود ہوگا۔ کتاب کے مرتّب ہو جانے کے بعد جو دیکھا، تو ایک عجیب عالم نظر آیا۔ حیات و سیرت کا کوئی ضروری ٹکڑا ایسا نہیں ہے، جس کے لیے قرآن میں ایک سے زیادہ آیات نہ ہوں۔

قرآنِ حکیم اور حالات و خصائص صحابہ کرام

اور پھر نہ صرف آنحضرت ﷺ ہی کی سیرت بلکہ صحابہ کرام کے حالات و خصائص کا بھی کافی ذخیرہ موجود ملا۔ صحابہ کی جماعت درسگاہِ تزکیہ و تسلیم نبوت سے نکلی ہوئی مومنون الاوّلون کی اولین جماعت تھی وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ اِس لیے اُن کے سوانح و ایام بھی سیرتِ نبویہ ہی کے مختلف اجزاء ہیں بلکہ ہدایتِ قرآنی و حکمتِ نبویؐ کے عملی و مجسّم ثمرات ہونے کے لحاظ سے دلائل و آیاتِ نبوت کے حکم میں داخل۔ پس یقیناً آپ کی سیرت مکمل نہ ہوتی۔ اگر اُن کے حالات بھی قرآن میں پوری شرح و تفصیل سے نہ ملتے۔

Marfat.com

قرآنی سیرتِ نبوی ﷺ

اس ٹکڑے کو دیکھ کر مجھ کو آخری مرتبہ یقین اس بارے میں حاصل ہو گیا کہ اگر دنیا سے تاریخ اسلام کی ساری کتابیں معدوم ہو جائیں اور دُنیا نے جو کچھ چھٹی صدی عیسوی کے ایک ظہورِ دعوت کی نسبت سُنا ہے وہ سب کچھ بھلا دے اور صرف قرآن ہی دنیا میں باقی رہے، جب بھی آنحضرت ﷺ کی شخصیتِ مقدسہ اور آپ کی سیرت وحیات کے براہین وشواہد مٹ نہیں سکتے۔ صرف ایک قرآن ہی اس کے لیے بس کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ دنیا کو بتلا دے کہ اس کا لانے والا کون تھا؟ کیسے زمانے میں آیا؟ کِس ملک میں پیدا ہوا؟ اس کے خویش و بیگانہ کیسے تھے؟ قوم ومرزبوم کا کیا حال تھا؟ اس نے کیسی زندگی بسر کی؟ اس نے دنیا کے ساتھ کیا کیا اور دنیا نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ اس کی باہر کی زندگی کیسی تھی اور گھر کی معاشرت کا کیا حال تھا۔ اس کے دن کیسے بسر ہوتے تھے اور راتیں کن کاموں میں کٹتی تھیں؟ اس نے کتنی عمر پائی؟ کون کون سے اہم واقعات وحوادث پیش آئے؟ پھر جب دنیا سے جانے کا وقت آیا تو دنیا اور دنیا والوں کو کِس حال میں چھوڑ گیا؟ اس نے جب دنیا پر پہلی نظر ڈالی تھی تو دنیا کا کیا حال تھا؟ اور جب واپسین نظرِ وداع ڈالی، تو وہ کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی تھی؟ غرض کہ ایک وجود و مقاصدِ وجود اور اعلامِ صداقت وعظمت کے لیے اس کے وقائع وَما یتعلّق بھا وَمَا ینا سب ذٰلك میں سے جن جن باتوں کی ضرورت ہو سکتی ہے، وہ سب کچھ صرف قرآن ہی کی زبانی دنیا معلوم کر سکتی ہے۔ اور اس بارے میں بھی قرآن اپنے سے باہر کا ابداً محتاج نہیں اور پھر یہ سب کچھ از قبیل اشارات ومرموزات نہیں ہے جیسا کہ اربابِ نکات ودقایق کا طریق استنباط ہے، بلکہ صاف صاف اور کھلا کھلا بیان جو فقہاء کے طریقِ استنباطِ اشارۃ النص سے کہیں زیادہ واضح وظاہر ہے اور اگر رموز و اشارات وتلمیحات کا طریق اختیار کیا جائے تو پھر خاص خاص آیتوں کو چھانٹنے کی کیا ضرورت؟ پورے قرآن میں بجز اس ایک ذکر کے اور کوئی ذکر ہی نہیں ہے!

وَکل الی ذاك الجمال یشیر[93]!

اگر غور کیا جائے تو فی الحقیقت یہ معاملہ بھی منجملہ مہمات خصائص واعجازِ قرآن کے ہے۔ کسی پیغام کی صداقت جانچی نہیں جا سکتی، جب تک پیغام لانے والے کی صداقت وامانت نہ جانچی جا سکے اور وہ ممکن نہیں، جب تک اُس کی پوری زندگی اور زندگی کے وقائع واعمال دنیا کے سامنے نہ ہوں۔ پس اس اعتبار سے آج تمام عالم میں اگر کوئی صحیفہ آسمانی ایسا ہے جو اپنے لانے والے کی زندگی کے وقائع وسوانح ہر زمانے اور ہر عہد میں خود اپنی زبانی سنا دے سکتا ہے تو وہ بحکم هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ[94] بجز قرآنِ حکیم و محفوظ کے اور کوئی نہیں، اس کے علاوہ جس قدر کتبِ سماویہ (فی اعتقادنا او فی زَعْمِهِمْ) موجود ہیں وہ یا تو اپنی صداقت کی اور ساری باتوں کی طرح اس بارے میں بھی بالکل خاموش ومظلم ہیں، حتیٰ کہ اپنے لانے

Marfat.com

والوں کے وجود کے اثبات سے بھی عاجز اور اگر اس کی شخصیت کا ذکر کرتی بھی ہیں، تو ایسے مجہول وسراپا مشکوک وارتیاب شکل میں جس سے اثبات کی جگہ اور زیادہ سلب ونفی کا یقین پیدا ہو جاتا ہے اور پھر جب اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ آج دنیا میں شہرت وتواتر، نقل وحفظ وروایت، اور توارثِ اسناد وقرأت، وتعاملِ کروڑ ہا نفوسِ عالم نسلاً بعد نسلٍ وحین بعد حین، وتلاوتِ اوقاتِ خمسۂ لیل ونہار (فضلاً عَنْ تلاوته و تدبره فی کل حین و ان) کے اعتبار سے صرف یہی ایک کتاب قطعی ویقینی اور محفوظ وغیر مبدّل ہے۔ بحیث لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ [15] إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ [16] بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ﴿۲۱﴾ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ [17] فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ [18] وَغَيْرَ ذٰلِكَ مِنْ قواطع الحفظ و الصيانة، اور اسی لیے علی وجہ الارض اسم وعلَم ''الکتاب'' کا مستحق اور کوئی نہیں، تو پھر ظاہر ہے کہ جس وجود وشخصیت اور اس کی حیات وسیرت کا اثبات واعلام اس کتاب کے اندر ہوگا، اس کے وجود وسیرت سے بڑھ کر سماء دنیا کے نیچے اور کون سی انسانی ہستی قیامت تک کے لیے اثبت واقوم ہو سکتی ہے؟ اور دنیا اپنی ہدایت کے لیے اگر کسی انسان کے آگے جھک سکتی ہے، تو اس انسانیتِ کبریٰ وعبدیتِ اعلیٰ وبشریتِ واحدہ کے سوا اور کون انسان ہے جس پر آنکھوں سے دیکھنے والوں کی طرح ہمیشہ یقین کیا جا سکتا ہے؟ اور جس پر ایمان لانے کے لیے پچھلی امتیں اور نسلیں بھی پہلوں کی طرح قطعی ویقینی روشنی رکھتی ہیں؟ اور پھر جس وجود کی سیرت وحیات قیامت تک کے لیے اس طرح محفوظ وثبت کر دی گئی ہو، علاوہ اُن نقوشِ غیر فانی کے جو صفحۂ عالم پر ثبت ہیں، اور جس کی زندگی کے وقائع طیبہ کو اس طرح سورج کی دائمی روشنی اور ستاروں کی یکساں سیر وحرکت کے دامن سے باندھ دیا ہو کیوں نہ اس خاکدانِ جسم وزمان میں اس کی موت وحیات یکساں ہو؟ اور کیوں اس کی دائمی حیات وقیام کے عقیدہ سے انسان کے تاریک دلوں کو انکار اور غافل روحوں کو گریز ہو؟

دائرہ حقیقتِ محمدیہ

فی الحقیقت یہی معنی ہیں دیگر صدہا معانی وحقائقِ ثابتہ کے ساتھ اس رفعِ ذکر کے کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ [19] اور یہی وہ مقام ہے کہ جب اصحابِ کشف ومشاہدات کے سامنے کھلا تو انہوں نے ''حقیقتِ محمدیہ'' کے احاطہ وحیات اور عدمِ زوال و بقاء و استمرار کو تمام انبیائے کرام کے حقائقِ تعینات سے مافوق اور بوجہ دائرۃ الدوائر مرکزِ ادوارِ تعینات مابعد اور نقطۃ الحیات فی الاصل والحقیقت ہونے کے تمام انوارِ تعینات ووجد کو اس کی نورانیت کے سامنے بےفروغ وماند پایا اور اسی لیے شیخ اکبر نے اس کو تعیّن اوّل اور موردِ صحیح اصطلاح ''عقلِ اوّل'' کا قرار دیا اور پھر انسانِ کامل اور ''روحِ اعظم'' اور ''نفسِ واحدہ'' اور ''قلم الاعلیٰ'' اور ''نور الانوار'' اور ''نفس الکائنہ'' سے بھی اس کو تعبیر کیا گیا کہ بلحاظِ بقاء ذکر و دوام فیضان وحیات وہی ایک انسان الکامل روح الاعظم اور النفس الواحدہ والکائنہ ہے اور حیاتِ معنویۂ مستمرۂ نوع وارض کی مرکزیت صرف اُسی کو پہنچتی ہے اور اسی لیے قرآنِ حکیم نے صرف اسی وجود کو ''العبد'' سے تعبیر کیا کہ ساری عبودیتیں آنی ووقتی ہیں،

Marfat.com

مگر صرف یہی وہ عبودیتِ کاملہ و واحدہ ہے جو ہمیشہ عباد و معبود میں واسطہ ہدایت اور ہمیشہ عبد کو معبود سے واصل کر دینے کے لیے حیّ و قائم ہے۔ قال العارف البوصیری

منزہ عن شریك فی محاسنه

فجوهر الحسن فیه غیر منقسم

اور چونکہ نوعِ انسانی کی سعادت و تنویر کا مرکز و مبدء وجودِ انبیائے کرام ہے اور حقیقتِ محمدیہ بحکم وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا [11] اِن سب سے مافوق اور شمس و کواکب اور صباح و مصباح کے معاملہ کا حکم رکھتی ہے، اس لیے حیاتِ قائمہ و دائمہ کا نور الانوار اور مصباح المصابیح صرف وہی دائرہ ٹھہرا، اور اِسی لیے شیخ اکبر و جیلی نے اس کو "حقیقت الاسمائیہ" اور "لوحِ محفوظ" سے بھی تعبیر کیا۔ سُبحان اللہ! یہ آخری تسمیہ و تعبیر کِس درجہ ترجمانِ حقیقت واوفق بالشرع والعقل ہے! دنیا میں جس قدر بھی ہدایت و تعلیم کی لوحیں تھیں۔ سب کے لیے تغیر و تبدل ہوا۔ حتیٰ کہ آج کوئی بھی محفوظ نہیں، لیکن اللہ اکبر مقامِ محمدی کی محفوظیت و مصئونیت کہ اس کی سیرتِ طیبہ اور حیاتِ حیّہ و قائمہ کی لوحِ محفوظ کا ایک نقطہ بھی محو نہ ہو سکا اور قرآن محفوظ وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ [11] اور فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ [12] میں اس کا ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ اسی طرح نقش و ثبت ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ جس طرح قلمِ ازل نے اوّلِ صبحِ تعیّن کی کرنوں سے لکھ دیا تھا۔ پس قرآن کے بعد اگر کوئی اور ہستی "لوحِ محفوظ" ہو سکتی ہے، تو وہ صرف وہی روحِ اعظم و خالد ہے جس کے ذکر کو خود قرآن نے اپنی آغوشِ حفظ و صیانت میں ہمیشہ کے لیے لے لیا ہے۔ حضرت سیّد العارفین شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مقام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگرچہ بعض کم فہموں نے اس کی ضمیر متکلم کو نہ سمجھا اور ایک دوسری ہی وادی میں لے گئے، اور یہ آفت عام واعم ہے:

افلت شموس الاولین و شمسنا

ابدًا علی افق البقا لا تغرب!

حضرت والد [13] مرحوم نے اس ملفوظِ مبارک پر ایک دوسرا پیش مصرع لگا کر مطلب واضح کر دیا ہے۔ یہ ان کے طول طویل قصیدۂ بائیہ میں سے ہے:

شمس تقادم قبل آدم طلعها

ابدًا علی افق البقا لا تغرب [14]

اور یہ جو بعض اکابرِ نقشبندیہ علی الخصوص حضرت مجدّدِ سرہندی رحمۃ اللہ علیہم نے اپنے علومِ کشفیہ میں ظاہر کیا کہ دائرہ حقیقت محمدیہ سیرِ قدمی کی آخری حد ہے، اس کے بعد صرف سیر نظری کی گنجائش ہے۔ وَهُوَ من خصائصه صَلَّى اللهُ عليه وَسَلَّم۔ اور نیز تمام اصحابِ احوال و کشوف بھی اس پر متفق ہوئے، تو حقیقت اس کی بھی یہی ہے کہ چونکہ حقیقتِ محمدیہ روح و حیات کا آخری نقطہ اور سرچشمہ قرار پائی، تو لاجرم سیر و اقدام

Marfat.com

کی آخری منزل بھی وہی ٹھہری۔ اس کے بعد جو کچھ ہے، مافوق اور وراء الورا سے تعینات ہے۔ اس لیے نہ سیر کی وہاں گنجائش، نہ قافلہ طلب اور محملِ شوق کا وہاں گزر، بلکہ طائرِ فکر و مرغِ خیال بھی اس کی فضائے لاتعین میں درماندہ و پروبال سوختہ!

اے بروں از وہم و قال و قیل من
خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من! [۱۰۵]

والکلام فی ھذا یطول ولہ موضع غیر ھذا الموضع الذی نحن فیہ۔ اور یہ جملہ معترضہ بھی جو بعدِ فصل و خللِ ربطِ مطالب پہنچ گیا، تو اس لیے کہ مذکور کی جاذبیت، سے محبوبیت سے ذکر و ذاکر کی بیخودی و محویت ناگزیر ہے، اور اشارات کا طول و قصر مشارٌ الیہ کے جذب و کشش پر موقوف۔ پھر جس مذکور و مقصود کا یہ حال ہو کہ بقولِ صاحب ''فتوحاتِ مکیہ''

یامن ھو للقلوب مقناطیس

اور اس دنیا میں ذکر صرف اُسی کا ذکر اور بات صرف اُسی کی بات ہو۔ اس کے سوا جو کچھ ہو، یا اسی کی طرف مصروف و محمول ہو اور یہ نہ ہو تو پھر بیخودی و بے حاصلی، اتلافِ صرف و ضیاعِ بحث۔

اوقات ہماں بود کہ با یار بسر رفت
باقی ہمہ بے حاصلی و بے خردی بود

تو کیوں کر ممکن ہے کہ عنانِ قلم از دست رفتہ نہ ہو، اور سررشتہ فکر و شغل دامنِ صبر و شکیب کی طرح ہاتھ سے چھوٹ جائے۔

ویلہ وکنی فی ذکرہ قشعریر
لھا بین جلدی والعظام دبیب

ذکر سیرتِ نبویہ ماخوذ و مستنبط از قرآن کی نسبت تھا۔ سو الحمد للہ وہ امید و گمان سے بھی دہ چند اوسع و اکمل مرتب ہوگئی۔ ورأیت فیہ مالا عین رأت ومالا اذن سمعت انسانوں کی ترتیب دی ہوئی ساری سیرتیں اور تاریخیں ایک طرف اور خود لسانِ الٰہی کا ایک کلمۂ منطوقہ و محفوظہ ایک طرف تعجب ہے کہ اصحابِ سیر نے باوجود کمالِ سعی و نظر اور مشغولیت بجمیع طرق و ترتیباتِ سیرت اس طرف کیوں توجہ نہ کی؟ جب تک یہ چیز مُرتب نہیں ہوئی تھی، خود اپنا حال بھی دوسرا تھا۔ اور اب جو دیکھا، تو کارخانہ ہی دوسرا نظر آیا۔

تمام بود بہ یک حرف گرم و ما غافل
حکایتے کہ ہمہ نا تمام می گفتند [۱۰۶]

مع ھذا

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی [۱۰۷]

Marfat.com

حواشی

۱۔ صاحب تفسیر کبیر

۲۔ یہ اشعار شہرستانی نے اپنی تصنیف نہایۃ الاقدام فی علم الکلام میں نقل کیے ہیں، شاید انہی کے ہوں، لیکن یہی اشعار ابنِ باجہ معروف بابن الصائغ الاندلسی سے بھی منسوب ہیں۔

۳۔ یہ اشعار امام فخر الدین کے ہیں۔

۴۔ سورہ توبہ، آیت نمبر ۱۰۰

۵۔ سورہ توبہ، آیت نمبر ۱۰۰

۶۔ سورہ بقرہ، آیت نمبر ۵

۷۔ حضرت علی ؓ سے منسوب ایک قول۔

۸۔ سورہ جمعہ، آیت نمبر ۲

۹۔ ایضاً آیت نمبر ۳

۱۰۔ سورہ مومنون، آیت نمبر ۸۱

۱۱۔ محمد ابن احمد السفارینی (۱۱۱۴ھ تا ۱۱۸۸ھ) اصول و ادب و حدیث کے عالم۔

۱۲۔ بارہویں صدی ہجری کہنا چاہیے۔

۱۳۔ سورہ زخرف، آیت نمبر ۱۷

۱۴۔ حافظ شیرازی کا شعر ہے۔ پہلا مصرع اس طرح ہے: سرّ خدا کہ عارف سالک بکس نگفت

۱۵۔ سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۶۹

۱۶۔ یہ اور اس کے بعد والا مصرع یحییٰ کاشی کے ایک ہی شعر کے دو مصرع ہیں، یہ اس کا دوسرا مصرع ہے، پہلے مصرع کا پہلا جملہ "یکے دواست" کے بجائے "دوا یکسیت ہے"۔

۱۷۔ کسی نامعلوم شاعر کا مشہور شعر۔ دوسرا مصرع یہ ہے: و کل الی ذاک الجمال یشیر

۱۸۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں۔ یہ حدیث ابوداؤد، ابنِ ماجہ، الدارمی وغیرہ نے روایت کی ہے۔

۱۹۔ سورہ جمعہ آیت نمبر ۳

۲۰۔ سورہ نسائی، آیت نمبر ۶۹

۲۱۔ ایک حدیث کا ٹکڑا جو بخاری، نسائی وغیرہ میں روایت کی گئی ہے۔

۲۲۔ ایک حدیث نبوی کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جو ابوداؤد اور ابنِ ماجہ نے روایت کی ہے۔

۲۳۔ سورہ عنکبوت آیت نمبر ۴۳

۲۴۔ حافظ ابن قیم کے ایک طویل قصیدے بہ عنوان "الکافیۃ الشافعیہ فی انتصار الفرقۃ الناجیہ" کے چند شعر، پورے قصیدے میں ۵۸۲۸ شعر ہیں۔

۲۵۔ سورہ جاثیہ، آیت نمبر ۲۴

Marfat.com

۲۶۔ سورہ دخان، آیت نمبر ۹

۲۷۔ سورہ حج، آیت نمبر ۸،۹

۲۸۔ سورہ انعام، آیت نمبر ۱۴۸

۲۹۔ سورہ محمد، آیت نمبر ۱۴

۳۰۔ سورہ نجم، آیت نمبر ۲۸

۳۱۔ سورہ یوسف آیت نمبر ۱۰۸

۳۲۔ سورہ یونس، آیت نمبر ۳۹

۳۳۔ سورہ یوسف، آیت نمبر ۴۰

۳۴۔ تاریخ طبری (تاریخ الرسل والملوک) ۲:۱۲۵۷

۳۵۔ حافظ شیرازی کا شعر، بعض نسخوں میں جوہر کی جگہ گوہر کے اختلاف کے ساتھ صحیح شعر اس طرح ہے

جوہر جام جم از کان جہانے دگرست
تو تمناز گل کوزہ گراں می داری

۳۶۔ سورہ نمل، آیت نمبر ۶۶

۳۷۔ سورہ انعام، آیت نمبر ۱۳۰

۳۸۔ سورہ جاثیہ، آیت نمبر ۳۲

۳۹۔ عمر خیام کی ایک رباعی کا مصرع۔ رباعی یہ ہے۔

ہر چند دلم ز عشق محروم نشد — کم ماند ز اسرار کہ معلوم نشد
داکنوں کہ بچشم عقل دری نگرم — معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد

۴۰۔ سورہ یونس، آیت نمبر ۵۷

۴۱۔ سورہ نحل، آیت نمبر ۸۹

۴۲۔ سورہ انعام، آیت نمبر ۵۷

۴۳۔ سورہ یوسف، آیت نمبر ۱۰۸

۴۴۔ سورہ انعام، آیت نمبر ۱۴۸

۴۵۔ سورہ رعد، آیت نمبر ۱۶

۴۶۔ سورہ زمر، آیت نمبر ۹

۴۷۔ سورہ حم سجدہ، آیت نمبر ۴۲

۴۸۔ سورہ عنکبوت، آیت نمبر ۴۹

۴۹۔ سورہ انعام آیت نمبر ۱۵۳

۵۰۔ سورہ نور، آیت نمبر ۴۰

۵۱۔ سورہ نور، آیت نمبر ۳۹

Marfat.com

۵۲۔ سورہ حج آیت نمبر ۴۷
۵۳۔ سورہ حج، آیت نمبر ۱۳
۵۴۔ سورہ نور، آیت نمبر ۳۵
۵۵۔ صحیح مسلم میں مروی ایک دعائے نبوی ﷺ۔ کتاب صلوٰۃ المسافرین میں بہت جگہ آئی ہے۔
۵۶۔ سورہ نجم، آیت نمبر ۱۷، ۱۸
۵۷۔ بخاری کے علاوہ مسلم، نسائی وغیرہ میں بھی یہ حدیث روایت کی گئی ہے۔
۵۸۔ یہ حدیث بھی بخاری کے علاوہ مسلم، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ میں روایت کی گئی ہے۔
۵۹۔ بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ کے مختلف ابواب میں یہ حدیث بیان ہوئی ہے۔
۶۰۔ مسند احمد بن حنبل، سنن، ترمذی، ابوداؤد وغیرہ میں یہ حدیث کچھ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔
۶۱۔ سورہ نجم، آیت نمبر ۸، ۹
۶۲۔ منصور حلاج کا شعر ہے۔ دیوان میں اس طرح ہے۔

مثالك فی عینی و ذکرك فی فمی   وحبك فی قلبی فاین تغیب؟

۶۳۔ سورہ آل عمران، آیت نمبر ۱۸
۶۴۔ سورہ ص، آیت نمبر ۲۷
۶۵۔ سورہ مائدہ آیت نمبر ۸۳، ۸۴
۶۶۔ سورہ زمر، آیت نمبر ۹
۶۷۔ سورہ نجم، آیت نمبر ۳، ۴
۶۸۔ سورہ مومن، آیت نمبر ۳۵
۶۹۔ سورہ حج، آیت نمبر ۸
۷۰۔ سورہ فاطر، آیت نمبر ۳۵
۷۱۔ سورہ انعام، آیت نمبر ۱۲۲
۷۲۔ سورہ ملک، آیت نمبر ۲۲
۷۳۔ سورہ زمر، آیت نمبر ۲۲
۷۴۔ سورہ نور، آیت نمبر ۳۵
۷۵۔ امام احمد بن حنبل کی مدح میں شیخ نجم الدین اسحاق بن ابی بکر القری کے قصیدے کا شعر۔
۷۶۔ سورہ عنکبوت، آیت نمبر ۴۹
۷۷۔ صحیح مسلم کی مشہور حدیث
۷۸۔ مولانا رُوم کا شعر ہے، مثنوی میں اس طرح ہے۔ من کیم؟ لیلیٰ کیست؟ من   ما یکے روحیم اندر دو بدن۔
۷۹۔ یہ الفاظ جن سے یہاں دعوت الٰہی والی الوحی کا استشہاد کیا گیا ہے، سورۃ ابراہیمؑ، یوسف، روم اور ذاریات میں آئے ہیں۔
۸۰۔ مثنوی مولانا رُوم کا شعر ہے، پہلا مصرع یہ ہے: خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں۔

Marfat.com

۸۱۔ مرزا غالب کا شعر، جس کا مصرع اولیٰ یہ ہے: دوش کز گردش بختم گلہ بر بردئے تو بود

۸۲۔ نواب رامپور یوسف علی خاں ناظم کے ایک شعر کا مصرع ثانی، مصرع اولیٰ یہ ہے: اب لکھیں گے شکوۂ بیداد ہم دل کھول کر

۸۳۔ مولانا جامی کا شعر ہے جس کا مصرع اولی اس طرح ہے: بس دلکش است قصہ خوباں وزان میاں

۸۴۔ سنن ابی داؤد، مسند احمد بن حنبل کی ایک روایت۔

۸۵۔ سورہ آل عمران، آیت نمبر ۱۱۰

۸۶۔ سورہ مائدہ آیت نمبر ۳

۸۷۔ سورہ نساء آیت نمبر ۴۱

ان آیاتِ کریمہ سے فضیلت و سیادتِ حضرت ختم المرسلین کا یوں اثبات ہوا کہ امتِ مسلمہ کو ساری اُمتوں سے بہتر فرمایا اور شریعتِ محمدی کو تکمیلِ ادیان اور اتمامِ نعمت قرار دیا اور ظاہر ہے کہ مطیع کی افضلیت متکوم افضلیتِ مطاع اور نعمت کا تمام نعم سابقہ سے اعلیٰ و اتم ہونا حامل و مبلغِ نعمت کے اعلیٰ و افضل ہونے پر دال ہے۔ اگر آخری شریعت تمام پچھلی شریعتوں کی جامع اور اس لیے ان سب سے افضل ہے۔ اگر آخری امت ساری پچھلی امتوں کے برکات و نعم سے مالا مال اور اس لیے اُن سے امثل و اصلح ہے، اور اگر اسی طرح شریعتِ آخری کے ظہور و زمان و مکان و قوام و اعمال کی ساری باتیں پچھلی امتوں کی ان ساری باتوں پر فوقیت و فضیلت رکھتی ہیں، تو یہ بغیر اِس کے ممکن نہیں کہ امتِ آخری کا رسول و مقوم بھی سارے پچھلے رسولوں کے مراتب و مقامات کا جامع اور اس لیے اُن کا سب سے افضل و مافوق، اور ''آنچہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری'' کا مصداق ہو۔ کتاب و سنت کی نصوص و تصریحات اس بارے میں بے شمار ہیں: تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کی تفسیر میں اس مطلب کو کمال شرح و بسط اور شاید ایک طرزِ تازہ و استدلال جدید کے ساتھ لکھا جاتا ہے، اور حقیقت جامعیتِ رسالتِ محمدی، و جامعیتِ شریعت اسلامیہ و جامعیتِ امتِ مسلمہ، اور جامعیت جمیع ما یتعلق بہا پر ایک خاص اسلوبِ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ باقی رہا لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ تو وہ معاملہ دوسرا ہے۔ تفریق بین الرسل کو مسئلہ تفضیل سے کوئی تعلق نہیں، اسی طرح لا تفضلونی علی یونس بن متی و غیر ذالك تو اس نہی کا مورد و محل بھی دوسرا ہے اور منہی عنہ معاملہ تفضیل میں وہ تکلم بالرائے ہے جو منجر بہ تفریق بین الرسل ہو۔ جس نے تمام امم سابقہ کو گمراہ کیا، نہ کہ نفسِ تفضیل۔ کیونکہ انا سیّد ولد آدم ولا فخر اور آدم وما دونہ تحت لوائی کے بعد اور کیا باقی رہ گیا؟ اور پھر قطع نظر قرآنِ حکیم کے، خود نصوصِ سنت اس بارے میں بے شمار و معلوم۔

۸۸۔ نظیری کا شعر ہے لیکن مطبوعہ کلیات نظیری میں بطراز زندگی کی جگہ ''بیراز زندگی'' لفظ ہے۔

۸۹۔ سورۂ نسا کی آیت نمبر ۶۹ کی طرف اشارہ ہے۔

۹۰۔ ''مولانا'' کے لفظ سے اشارہ مولانا روم کی طرف ہے۔ آگے اُن کا ایک شعر بھی مثنوی کے دفتر اوّل سے آیا ہے۔

۹۱۔ عرفی کا مصرع، مکمل شعر اس طرح ہے:

از ازل حسن و محبت بہم اندوختہ اند ۔۔۔ در چراغ اند کہ از یک دگرا فروختہ اند

۹۲۔ سورہ آل عمران، آیت نمبر ۱۶۴، نیز سورہ جمعہ آیت نمبر ۲ میں یہ مضمون آیا ہے۔

۹۳۔ شاعر کے نام کا پتا نہیں چل سکا۔ مصرع اولیٰ یہ ہے: عبارتنا شتی و حسنك واحد

Marfat.com

۹۴۔ سورہ جاثیہ آیت نمبر ۲۹

۹۵۔ سورہ حٰم سجدہ، آیت نمبر ۴۲

۹۶۔ سورہ حجر، آیت نمبر ۹

۹۷۔ سورہ بروج، آیت نمبر ۲۱، ۲۲

۹۸۔ سورہ عنکبوت، آیت نمبر ۴۹

۹۹۔ سورہ انشراح، آیت نمبر ۴

۱۰۰۔ سورہ نسا، آیت نمبر ۴۱

۱۰۱۔ سورہ طور، آیت نمبر ۲، ۳

۱۰۲۔ سورہ عنکبوت، آیت نمبر ۴۹

۱۰۳۔ والد سے مراد مصنف (مولانا آزاد) کے والد مولوی خیر الدین ہیں۔

۱۰۴۔ یہ شعر مولوی خیر الدین کا ہے

۱۰۵۔ مولانا روم کا شعر ہے۔

۱۰۶۔ عرفی کا شعر ہے۔ پہلے مصرع میں گرم کی جگہ ختم ہے۔

۱۰۷۔ سعدی کا شعر ہے۔ کلیات میں پہلا مصرع اس طرح ہے

نہ حسنت آخرے دارد، نہ سعدی را سخن پایاں

Marfat.com

مقدمہ
(کتاب کی اولین اشاعت پر لکھا گیا)

محمد ﷺ!

تقریباً پندرہ سو سال قبل سے لے کر آج تک یہ مبارک نام ارب ہا مخلوقاتِ خدا کی زبانوں پر انتہائی احترام کے ساتھ جاری ہے اور ان کے دل و دماغ اور روحوں کو سرور و تازگی سے مالا مال کر رہا ہے۔ قلب و جگر میں فرحت و انبساط کی لہریں اسی پاک نام کے طفیل ہیں۔ صبح و شام کہیں نہ کہیں اس نامِ مبارک کا تذکرہ ہے، ہر وقت ہر جگہ دنیا کے کسی کونے میں اس نامِ مبارک کو لیا جاتا ہے اور ان شاء اللہ رہتی دنیا تک یہ نامِ مبارک بلند سے بلند ہوتا رہے گا۔

ہر روز صبح صادق سے پہلے ظلمتِ شب کا دامن چاک ہوتا ہے اور سحر نئی شان سے نمودار ہونے کو ہوتی ہے تو مؤذن کی آواز مخلوق کے کانوں تک پہنچتی ہے۔ الصّلوٰۃ خیر من النوم (نماز نیند سے بہتر ہے) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بندگانِ خدا رب کے آگے سر جھکائیں اور محمد ﷺ پر درود و سلام بھیجیں۔

دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی مخلوقِ خدا اس دعوتِ حق پر لبیک کہتی ہے اور جب روزانہ آفتاب مشرق سے مغرب کی جانب سفر کرتا ہے تو مؤذن ظہر اور عصر کے اوقات میں پھر یہی پیغام دہراتا ہے اور آخر میں غروبِ آفتاب کے بعد مغرب اور عشاء کے وقت یہی آواز بلند ہوتی ہے۔ لوگ اللہ کے آگے سر جھکاتے اور محمد ﷺ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔

عالم اسلام کے لوگ روزانہ انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ محمد ﷺ کا ذکرِ خیر کرتے ہیں ان کے دلوں میں اللہ کی یاد اور اللہ کے رسول کا تذکرہ ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔ شروع ہی سے مسلمانوں کا شعار یہی رہا ہے۔ پانچوں نمازوں میں سے کوئی نماز بھی ایسی نہیں جو ان اوراد سے خالی ہو۔ پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ بھی جب وہ اپنے آقا ﷺ کا نام سنتے ہیں تو جذبہ محبت ان کے دلوں میں سوز و گداز کی کیفیتیں سمو دیتا ہے۔ ماضی میں مسلمانوں کی شان یہی رہی ہے اور مستقبل میں بھی ان کا انداز یہی رہے گا۔ اس سے قدرت کی منشا یہی تھی اور یہی ہے کہ دین قیم کی بنیادیں مستحکم ہوں اور مخلوق کو قسم قسم کی نعمتوں سے نوازا جائے۔

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کی ذاتِ بابرکات ہی میں قدرت نے دین کی تکمیل کے سامان فراہم کر دیئے۔ تھوڑی سی مدت میں آفتابِ اسلام کی شعاعیں مشرق سے مغرب تک پھوٹ نکلیں۔ آپ ﷺ نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے جو راہیں اختیار کیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ کسریٰ اور ہرقل کے علاوہ آپ ﷺ نے اپنے ہم عصر فرمانرواؤں اور حکمرانوں کو بھی تبلیغی دعوت نامے ارسال کئے۔ ابھی ڈیڑھ سو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ مغربِ اقصیٰ سے مشرقِ اقصیٰ تک اسلام کا ڈنکا بجنے لگا۔ مغربی یورپ میں اندلس اور مشرق میں ہند، ترکی، افغانستان، شام اور چین و عرب کے درمیانی ممالک اسلام کے زیرِ سایہ آ گئے۔ مصر، برقہ، تیونس، الجزائر اور مراکش پر بھی قدرت نے حقانیت اسلام کی ابدی مہریں ثبت کر دیں۔ وہ تمام ممالک جو عرب، افریقہ اور یورپ کے مابین واقع تھے۔ اسلام کے زیرِ نگیں آ گئے۔

اندلس کے علاوہ مذکورہ مقامات پر آج بھی اسلام کے اثرات غالب ہیں۔ اندلس میں مسیحیت کے پیروؤں نے مسلمانوں پر وہ مظالم توڑے کہ خدا کی پناہ! مسلمانانِ اندلس کی ایک بڑی تعداد نے افریقہ کے بے آب و گیاہ صحرا میں پناہ گزینی اختیار کی بعض ایسے بھی مسلمان تھے جنہوں نے جان کے خوف سے تبدیلی مذہب کی ذلت بھی گوارا کی۔ اندلس میں مسلمانوں کی ہلاکت سامانی کی تلافی قدرت نے اس طرح کی کہ آلِ عثمان نے قسطنطنیہ پر جھنڈے گاڑ دیئے۔ بعدازاں بلقان بھی مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ یہاں سے اس کی شعاعیں روس اور بولون تک پہنچیں۔ مختصر یہ کہ ہسپانیہ (اندلس) میں جتنی زمین مسلمانوں کے قبضے سے نکل گئی تھی اتنی ہی انہیں مشرقی یورپ میں مل گئی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج تک کبھی کسی دین نے اسلام پر غلبہ نہیں پایا البتہ یہ بات ضرور ہوئی کہ بعض ممالک میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کیا گیا اور ان پر مظالم بھی توڑے گئے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ان مظالم سے بجائے نقصان کے اور فائدہ ہوا اور وہ یہ کہ تلخ تجربات نے ان کے اندر صبر و استقلال اور عزم و ثبات کا مادہ پیدا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی رحمت و رافت پر ان کا ایمان پہلے سے کہیں زیادہ قوی ہو گیا۔

اسلام کا فروغ اور اس کی روز افزوں ترقی پیروانِ مسیحیت پر شاق گزری۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام اور مسیحیت کے درمیان شدید اختلافات کی خلیج حائل ہو گئی اور اس نے ایک کشمکش کی شکل اختیار کر لی۔ یوں تو آنحضرت ﷺ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں بت پرستی پر ایک کاری ضرب رسید کی تھی۔ آپ ﷺ کے بعد جب خلافت راشدہ کا دور شروع ہوا تو خلفائے راشدین نے ایران و افغانستان پر بھی اسلام کا پرچم بلند کیا حتیٰ کہ ہندوستان کے ایک حصہ میں بھی اسلام کے شجر ثمر بار کی شاخیں پھوٹ نکلیں۔ حیرہ، یمن، شام اور مصر میں جہاں کئی صدیوں سے مسیحیت کا دور دورہ تھا، اسلام کی جڑیں مضبوط ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ عیسائیت کے مرکز قسطنطنیہ میں بھی اسلام کے پیروؤں نے اپنے قدم جمائے۔ مسیحیت کی تاریخ میں یہ ایک نازک ترین دور تھا۔ کیا مسیحیت کے مقدر میں بھی وہی کچھ تھا جو اس سے قبل پرستارانِ لات و ہبل کو پیش آ چکا تھا؟ باوجود اس کے

Marfat.com

کہ مسیحیت کے دین الٰہی ہونے میں خود آنحضرت ﷺ کو بھی کوئی کلام نہ تھا۔ اسلام نے اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو شروع شروع میں بت پرستی کے ساتھ کیا تھا۔ کیا عرب ایسے صحرائی خطہ کی قسمت میں اتنی سربلندی تھی کہ اس کے باشندے اندلس، بازنطینہ اور ان عیسائی ممالک پر چھا جائیں جن کے حکمراں اپنے زعم میں کسی قیمت پر بھی مقابل سے ہار نہیں مانتے تھے بلکہ ایسی ذلت پر موت کو ترجیح دیتے تھے؟

قصہ مختصر یہ ہے کہ جانبین کی یہ کشمکش کئی صدیوں تک جنگ و جدل کی ہولناک صورت اختیار کئے رہی۔ یہ پیکار باہمی صرف تیغ و تفنگ ہی سے نہیں ہوتی تھی بلکہ بحث و تکرار کے ہنگامے بھی برپا ہوتے تھے اور فریقین کے مناصرین کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اپنے مدمقابل حریف کو ایسے دندان شکن جواب دیں کہ وہ لاجواب ہو کر رہ جائے۔

اسلام نے مسلمانوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعظیم و تکریم کا سبق دیا اور ان پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ ایک پیغمبر کی حیثیت سے ان کی شخصیت واجب الاحترام ہے۔ قرآن حکیم کی آیات کے ذریعہ اسلام کا یہ اعلان کچھ کم وزن نہیں رکھتا کہ ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے ہیں۔ ان پر آسمانی کتاب انجیل کا نزول ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں منصب نبوت پر فائز کیا اور ہر حال میں ان پر اپنی نوازشیں کیں وہ جیتے جی نماز اور زکوٰۃ کے احکام پر چلے۔ اپنی والدہ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دامن پر جبر و شقاوت کا داغ نہیں آنے دیا۔ پس سلام ہو ان پر یوم ولادت سے یوم وصال تک اور پھر روزِ محشر بھی ان پر سلامتی ہو۔''[1]

آنحضرت ﷺ کے بارے میں عیسائیوں کی روش معاندانہ رہی ہے۔ انہوں نے ایسی ناروا باتیں کی ہیں کہ تہذیب و شائستگی کا سر بھی ندامت سے جھک جاتا ہے۔ کوئی مہذب انسان ایسے الفاظ کسی ادنیٰ درجے کے شخص کے لئے بھی استعمال نہیں کر سکتا۔ اس سے ان کے خبث باطن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دلوں میں کھوٹ ہوتا ہے تو زبانیں بھی زہر اگلتی ہیں۔ جو کچھ بھی انہوں نے کیا محض کسی دنیاوی مفاد کے پیش نظر کیا۔ صلیبی جنگوں پر صدیاں بیت چکی ہیں مگر ابھی تک اربابِ کلیسا کو آنحضرت ﷺ سے بیر اور بلا کا تعصب ہے۔ آج بھی اس تعصب میں فرق نہیں آیا ہے۔ ماضی میں مسیحی مبلغین آنحضرت ﷺ کے بارے میں کھلم کھلا اپنی متعصبانہ ذہنیت کا ثبوت دیتے تھے، البتہ دورِ حاضر میں انہوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس کی نوعیت کچھ اور ہے۔ شروع شروع میں تو محض احبار و رہبان یا ان کے متبعین اس اہانت آمیز تبلیغ میں پیش پیش تھے لیکن آج یورپ اور امریکہ کے ادبا، فلاسفر اور مستشرقین بھی تحقیق و تدقیق کے پردے میں اسلام دشمنی پر تلے ہوئے ہیں حالانکہ یہ وہ ہیں جنہیں مسیحیت سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔

حیرت کا مقام ہے کہ یہ مسیحی اربابِ قلم ایک طرف تو یہ ثابت کرتے ہیں کہ عصر حاضر علم و دانش اور ترقی کے اعتبار سے بلند ترین مقام پر فائز ہے لیکن دوسری طرف اسلام سے متعلق ان کی تنگ نظری میں مطلق کوئی

Marfat.com

فرق نہیں آیا ہے۔ ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب دورِ اول کے مسلمانوں کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے کوئی سلیم الطبع شخص یہ تسلیم کرتا ہے کہ مسلمانوں نے ایران کے مجوسیوں کے مقابلہ میں رومی عیسائیوں کے ساتھ کتنی مروت، رواداری اور انسانیت کا ثبوت دیا۔ یہ وہ دور ہے جبکہ ہرقل (روم کے عیسائی بادشاہ) نے کسریٰ (شاہ ایران) کو ناکوں چنے چبا دیئے تھے۔ اس واقعہ سے کچھ ہی پیشتر وہ اپنے مقبوضہ صوبہ یمن سے حبشیوں کو دیس نکالا دے چکا تھا۔ اسی کسریٰ نے ۶۱۴ء میں شہر براز[3] کی سرکردگی میں قیصر روم سے مقابلہ کے لئے ایک زبردست فوج روانہ کی تھی جس نے رومیوں کے ہرے بھرے زیتون کے باغ بھی اجاڑ دیئے تھے۔ رومیوں کو ان مجوسیوں نے اتنا پسپا کیا تھا کہ یہ اپنی فراخ وخوش منظر وادیوں سے اجڑ کر شام کے اس علاقے میں آ بسے تھے جسے باذرعات و بصریٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان ایام میں مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ مکہ میں کفارِ قریش نے ان پر عرصہ حیات تنگ کیا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود ان کی ہمدردیاں اپنے پڑوس کے ایرانیوں سے نہیں بلکہ روم کے عیسائیوں سے وابستہ تھیں اور غالباً یہ تعلق اس لئے تھا کہ عیسائی اہل کتاب ہیں اس کے برخلاف کفار مکہ کا تعلق خاطر ایرانیوں سے اس بنا پر تھا کہ یہ وحی و کتاب کے منکر تھے اور انہیں رومی عیسائیوں سے بھی اسی لئے عداوت تھی کہ وہ اہل کتاب تھے۔ عرب کا ایک حصہ ایران سے متصل تھا اور دوسرا روم سے۔ ان کی فتح و شکست کے اثرات عرب کے اس حصہ پر پڑنے ضروری تھے چنانچہ ہوا یہ کہ کفار مکہ نے عیسائیوں کی شکست کی خبر سنی تو انہیں حد درجہ مسرت ہوئی لیکن مسلمانوں کو اس حادثہ سے ملال ہوا۔ ایک دن کفار مکہ کے ایک سردار نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں عیسائیوں کی شکست خوردگی پر اظہار مسرت کیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تیور بدل کر خفگی سے کہا کہ ابھی اظہار مسرت کی چنداں ضرورت نہیں، جلد ہی وہ وقت آ رہا ہے جب عیسائی ان مجوسیوں پر غلبہ پائیں گے۔ کفار مکہ کا سردار (غالباً اس سردار کا نام ابی بن خلف تھا) یہ بات سنتے ہی سیخ پا ہو گیا اور بولا: ''تم جھوٹے ہو۔'' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنی ایمانی فراست پر یقین تھا، آپ رضی اللہ عنہ نے فوراً جواب دیا، اے دشمن خدا! جھوٹا تو ہے، اگر تجھے اپنی صداقت پر اعتماد ہے تو ہار جیت کی شرط رہی۔ اگر عیسائی ان مجوسیوں پر ایک سال سے پہلے غالب آ گئے تو میں دس اونٹ تیرے حوالے کر دوں گا اور اگر مجوسی، عیسائیوں سے مغلوب ہو گئے تو پھر دس اونٹ تجھے دینے ہوں گے۔[4]

آنحضرت ﷺ نے شرط کی بات چیت سنی تو فرمایا کہ اگر اُبی، شرط کے اونٹوں کی تعداد اور وقت مقررہ میں اضافہ کرنا چاہے تو آپ (ابوبکر رضی اللہ عنہ) بلا پس و پیش مان لیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ابی سے شرط کی بات پھر چھیڑی اور بحث و تکرار کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ہار جیت کی صورت میں فریقین کو سو سو اونٹ دینے ہوں گے۔ مدت نو سال قرار پائی چنانچہ ۶۲۵ء میں جب روم کے مسیحی بادشاہ ہرقل نے ایران کے مجوسیوں کو شکست فاش دی اور ان سے مفتوحہ سرزمین واپس لے لی، اس شان سے کہ ان کی عظمت رفتہ پھر عود

Marfat.com

کر آئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو شرط کے مطابق اونٹ ملے۔ غلبہ روم سے متعلق قرآن شریف کی ان آیات کا نزول ہوا:

الٓمّٓ ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿۲﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿۳﴾ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۭ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۴﴾ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۵﴾ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾

(سورۂ روم: ۱ تا ۶)

"الم۔ روم میں رومی عیسائی شکست کھا گئے (لیکن) عنقریب پھر انہیں غلبہ نصیب ہوگا اور صرف چند سال میں۔ ہر کام کا آغاز اور انجام اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے (جس روز یہ غلبہ ہوگا) اس روز مسلمان اس پر مسرت کا اظہار کریں گے۔ یہ نصرتِ الٰہی ہے وہ جس کی چاہتا ہے، نصرت فرماتا ہے وہ غالب و رحیم ہے اللہ اپنا وعدہ وفا کرتا ہے اس کے خلاف کبھی نہیں ہوتا لیکن اکثر و بیشتر لوگ ایسے ہیں جو یہ بات نہیں جانتے۔"

مسلمانوں کو ہرقل اور نصاریٰ کی سربلندی اور مجوسیوں پر انکی فتح مندی سے آغاز اسلام میں اتنی زیادہ دلچسپی تھی کہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان اخوت کی بنیاد مستحکم ہو چکی تھی۔ اس دور میں اسلام اور عیسائیت کے پیروؤں کے درمیان تکرار و نزاع کا سان گمان بھی نہ تھا۔ یہودیوں کا معاملہ اس کے برعکس تھا شروع شروع میں تو مسلمانوں سے ان کے تعلقات دوستانہ رہے لیکن ہجرت کے بعد جب مسلمان مدینہ پہنچے تو انہوں نے مسلمانوں سے جھگڑے شروع کر دیئے۔ ان جھگڑوں نے یہاں تک طول کھینچا کہ آخر کار یہودیوں کو جزیرۃ العرب سے نکلنا پڑا۔ اس کا ذکر قرآن شریف میں اس طرح آیا ہے۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ (سورۂ المائدہ: ۸۲)

"(اے پیغمبر) مومنین کی عداوت میں آپ یہودیوں اور مشرکین کو سخت پائیں گے اور مومنین کی دوستی میں سب سے زیادہ قریب آپ ان لوگوں کو پائیں گے جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں اس لئے کہ ان میں پادری اور راہب ہیں اور ان میں غرور اور تکبر نام کو بھی نہیں۔"

مسلمان اور عیسائیوں کے بعض عقائد جو زندگی، خالق و خلق، انسانیت اور مبداء کائنات سے متعلق ہیں آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ تخلیق آدم کے سلسلہ میں قرآن شریف کا بیان یہ ہے:

Marfat.com

"خدا نے آدم وحوا کی تخلیق کے بعد بہشت کو ان کا مسکن قرار دیا اور انہیں یہ تلقین کی کہ ایسا نہ ہو کہیں تم شیطان کے جھانسے میں آجاؤ اور اس درخت کا پھل چکھ بیٹھو اگر تم نے یہ کیا تو تمہیں بہشت سے نکال دیا جائے گا شیطان تم دونوں کا دشمن ہے اس لئے اس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔"

اس بیان سے عیسائی صرف اس جملہ کی حد تک اختلاف رکھتے ہیں کہ "شیطان نے آدمؑ کے حضور سجدہ کرنے کے بجائے خدا کے کلمہ کی تقدیس سے انکار کر دیا۔ اس نے حوا کو ورغلایا۔ ان کے سامنے ایک پُرفریب اور بنا سنورا نقشہ پیش کیا۔" بقیہ قصہ قرآن کریم اور انجیل مقدس میں واحد ہے مثلاً "آدمؑ اور حوا دونوں شیطان کے دام فریب میں آ گئے۔ دونوں نے "درخت" کا پھل چکھ لیا۔ اس گھڑی دونوں کے جسم سے بہشتی لباس اترا اور دونوں برہنہ رہ گئے۔ ان دونوں کو اپنی اس عریانی پر ندامت ہوئی اور دونوں نے اللہ تعالیٰ سے عفو و درگزر کی التجا کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کا قصور تو معاف کر دیا مگر (یہ سزا ضرور دی) کہ دونوں کو بہشت سے نکال کر زمین پر اتارا جہاں ان کی نسل ایک دوسرے کی دشمن ہو گئی۔ ادھر یہ ہوا کہ شیطان اور اس کی ذریت ہمیشہ کے لئے اولاد آدم علیہ السلام کو ورغلانے پر تل گئی۔ اس سے کچھ تو راہ راست سے بھٹک گئے اور کچھ ان کی ریشہ دوانیوں کے باوجود کامیاب رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم علیہ السلام کو شیطان کی فریب کاریوں سے محفوظ رکھنے کے لئے انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ قائم کر دیا۔ ان انبیاء حضرات میں نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام ہیں جن پر انہی کی زبانوں میں آسمانی کتب کا نزول ہوا جو ان کی تصدیق بھی کرتی ہیں اور ان کتب سماویہ کی بھی جو ان سے پہلے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئیں جس طرح شیطان کی ذریت کے لئے شر و فساد کے ہنگامے مقدر ہیں (اور یہ فیصلہ ہے کہ وہ ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے) اسی طرح ملائکہ کے لئے یہ مقدر ہے کہ وہ ہر لحظہ اور ہر لمحہ رب قدوس کی حمد و ثناء میں مصروف ہیں (چنانچہ قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا) نسل آدم میں شیطان کے پجاری اور خدائے واحد کے پرستار دنیاوی زندگی میں ایک دوسرے سے قیامت تک دست و گریبان رہیں گے اور قیامت کا دن وہ دن ہے جب ہر شخص کو اس کے اعمال کی پوری جزاء ملے گی۔"

قرآن حکیم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کا تذکرہ تعظیم و تکریم کے ساتھ کیا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان شدید اختلافات کیوں ہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام اور مسیحیت میں بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ عہد نبوت میں بھی ان اختلافات نے بحث و تکرار کی شکل اختیار کی تھی لیکن یہ بات ضرور ہے کہ بحث و تکرار کی نوبت بغض و عداوت تک کبھی نہیں پہنچی تھی۔ نصاریٰ آنحضرت ﷺ کی نبوت کے منکر ہیں مگر مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کے قائل ہیں، اور یہ کہ نصاریٰ تثلیث پر یقین رکھتے ہیں اور مسلمان خدائے واحد کے ماسوا کسی کی کبریائی تسلیم نہیں کر سکتے۔ عیسائی ہیں

Marfat.com

کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت پر اعتقاد جمائے ہوئے ہیں اور اس کے جواز میں یہ دلائل پیش کرتے ہیں۔

۱۔ مسیح علیہ السلام نے گہوارہ میں گفتگو کی۔

۲۔ حضرت مسیح علیہ السلام کو قدرت نے جن معجزات سے نوازا، وہ کسی اور پیغمبر کو مرحمت نہیں کئے گئے۔

۳۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے اعمال وافعال کی نوعیت کے اعتبار سے الوہیت کے منصب پر فائز تھے۔

عہد نبوت کے نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جلالت شان کے بارے میں قرآن شریف سے استدلال کرتے اور مسلمانوں سے یہ کہتے تھے کہ دیکھئے قرآن یہ کہتا ہے:

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿۴۵﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِينَ ﴿۴۶﴾ قَالَتْ رَبِّ أَنّٰى يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ ۖ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ إِذَا قَضٰٓى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿۴۷﴾ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْإِنْجِيلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُولًا إِلٰى بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ۙ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ أَنِّيٓ أَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّينِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللّٰهِ ۖ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِ الْمَوْتٰى بِإِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ ۙ فِي بُيُوتِكُمْ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿۴۹﴾

(سورۂ آل عمران: ۴۵ تا ۴۹)

"جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریم! اللہ تعالیٰ تجھے اپنے کلمہ کی بشارت دیتا ہے اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) ہوگا۔ دنیا اور آخرت میں اسے وجاہت نصیب ہوگی۔ گہوارے میں اور ادھیڑ عمر میں لوگوں سے (رشد وہدایت) کی باتیں کرے گا اور اس کا شمار صالحین میں ہوگا۔ مریم (علیہا السلام) نے کہا، میرے پروردگار! میرے لڑکا کیسے ہوگا مجھے تو کسی مرد نے مس تک نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، ایسا ہی ہوگا اللہ چاہے تو اس طرح بھی پیدا کرسکتا ہے وہ جب کسی کام کا فیصلہ کرلیتا ہے تو حکم دیتا ہے کہ ہوجا، پس وہ ہوجاتی ہے (ظہور پذیر ہوجاتی ہے) اور اے مریم اللہ تعالیٰ اسے (مسیح علیہ السلام کو) کتاب وحکمت، تورات وانجیل کی تعلیم دے گا اور اسے بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے رسالت کے منصب پر فائز کرے گا (وہ اعلان کرے گا) میں تمہارے رب کی نشانی لے کر تمہارے پاس آیا ہوں (مجھے قدرت دی گئی ہے کہ) میں تمہارے لئے مٹی سے پرند جیسی چیز بناؤں، پھر اس میں روح پھونکوں اور وہ اللہ کے حکم سے اڑتا ہوا پرندہ ہو

Marfat.com

جائے (نیز یہ قدرت بھی مجھے دی گئی ہے کہ) میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو صحت مند کردوں اور مردوں کو زندہ اور جو کچھ تم کھاتے اور جو کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ کر رکھتے ہو اس سے تمہیں مطلع کروں اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو تو فی الواقعہ اس میں تمہارے لئے نشانی ہے۔"

عہد نبوت کے عیسائی مندرجہ بالا آیات قرآنیہ کی روشنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے دلائل یہی پیش کرتے تھے کہ حضرت مسیح علیہ السلام مردوں کو زندہ، مادرزاد نابیناؤں کو بینا، مبروص اشخاص کو صحت مند کرتے ہیں۔ مٹی سے پرندوں جیسی شکلیں بنا کر ان میں جان ڈالتے ہیں، تا آنکہ وہ اڑنے لگتے ہیں۔ مسیح علیہ السلام غیب کی جو جو باتیں فرماتے تھے وہ درست نکلتی تھیں۔ عیسائی کہتے کہ یہ کمالات خدا کے ماسوا اور کس میں ہوسکتے ہیں۔ عہد نبوت میں عیسائی جب مسلمانوں سے بحث و تکرار کرتے تو وہ دعویٰ کے ساتھ کہتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی خدا ہیں۔

بعض نصاریٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو بھی الوہیت کے دائرہ میں شامل کرلیا تھا اور وہ اس بنا پر کہ خدا نے بطن مریم میں اپنے کلمہ کا القا کیا تھا۔ اس زمانے کے مسیحی حضرت مریم علیہا السلام کو اقانیم ثلاثہ باپ، بیٹا، روح القدس میں سے ایک اقنوم مانتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ کو خدائی اوصاف سے منسوب کرنے والے نصاریٰ کی تعداد میں کافی اضافہ ہوگیا تھا اور کوئی مقام ایسا نہ تھا جہاں یہ آباد نہ ہوں۔ یہ مسیحی گاہے گاہے آنحضرت ﷺ سے بحث و مجادلہ بھی کیا کرتے تھے۔

نصاریٰ کا ایک گروہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا قائل تھا، دوسرے کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ ابن اللہ ہیں، تیسرا گروہ انہیں تین (باپ، بیٹا اور روح القدس) میں سے ایک مانتا تھا۔ الوہیت مسیح کے قائلین کے دلائل سے متعلق ہم سطورِ بالا میں بیان کر آئے۔ وہ گروہ جو اس بات کا قائل ہے اس کے دلائل کی تان ان امور پر ٹوٹتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے بیٹے ہیں اس لئے کہ ان کی ولدیت متحقق نہیں ہوسکی۔ ثانیاً یہ کہ گہوارۂ طفولیت میں ان کا گویا ہونا ایک ایسی امتیازی خصوصیت ہے جس میں کوئی بھی ان کا سہیم و عدیل نہیں ہے۔ قائلین تثلیث کا زور اس دلیل پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں حضرت عیسیٰؑ کی تخلیق سے متعلق متکلم مع الغیر کے صیغے اَمَرْنَا (ہم نے حکم دیا) خلقنا (ہم نے پیدا کیا) اور قضینا (ہم نے فیصلہ کیا) استعمال کئے ہیں اگر خدا کی ذات میں تعدد کو دخل نہ ہوتا تو یہ صیغے واحد متکلم کے ہوتے اور یوں کہا جاتا۔ اَمرتُ (میں نے حکم دیا)، خَلقتُ (میں نے پیدا کیا) اور قضیتُ (میں نے فیصلہ کیا)

آنحضرت ﷺ ان مسیحی مناظرین کی گفتگو سنتے اور نہایت خوش اسلوبی اور سلامت روی کے ساتھ ان سے مجادلہ کرتے۔ مشرکین اور صنم پرستوں کی طرح آپ ان مسیحی افراد سے سخت اور درشت لہجے میں کبھی گفتگو نہ فرماتے بلکہ جو کچھ ارشاد فرماتے، اس میں منطقی استدلال کا انداز ہوتا نیز کتب سماویہ اور قرآن حکیم کی تعلیمات کے مطابق دلائل پیش کرتے، مثلاً قرآن کریم کی یہ آیات:

Marfat.com

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰۗؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ ۭ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ (سورۃ المائدہ:۱۷،۱۸)

’’بے شک جنھوں نے یہ کہا مسیح ابن مریم خدا ہے انہوں نے کفر کا ثبوت دیا، (اے رسول) ان سے یہ کہہ دو کہ وہ کون ہے جو خدا کی مملکت میں اتنا دخل و اختیار رکھتا ہے کہ اسے مسیح ابن مریم، ان کی والدہ اور روئے زمین کی مخلوق کو تہس نہس کرنے سے باز رکھ سکے وہ جو چاہتا پیدا کرتا ہے اور اسے ہر چیز پر قدرت ہے۔ یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں ہم خدا کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں تم ان سے یہ کہہ دو کہ (اگر خدا سے تمہارے روابط ایسے ہی ہیں) پھر وہ تمہاری خطاؤں پر تمہیں عذاب کے شکنجے میں کیوں کستا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ تم بھی اس کی مخلوقات میں ہی ہو وہ جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب دے۔‘‘

یہ آیاتِ قرآنی بھی اس پہلو کی وضاحت کرتی ہیں:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

(سورۃ المائدہ: ۷۲، ۷۳)

’’بے شک انہوں نے کفر و طغیان کا ثبوت دیا جنھوں نے کہا ’’خدا، مسیح ابن مریم ہے‘‘ اور مسیح نے تو یہ پیغام دیا تھا کہ اے بنی اسرائیل! خدا کی بندگی کرو جو میرا، تمہارا اور سب کا رب ہے۔ بے شک جو شخص بھی کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرائے گا اس پر اللہ تعالیٰ جنت کے دروازے بند کر دے گا اور اس کا مقام جہنم میں ہوگا اور ظلم کرنے والوں کا کوئی حامی اور مددگار نہ ہوگا۔ بے شک جن لوگوں نے یہ کہا کہ خدا تین میں سے ایک ہے انہوں نے کفرِ صریح کا ارتکاب کیا اور (حقیقت یہ ہے) کہ خدائے واحد کے

ماسوا کوئی اور معبود نہیں ہے اور یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اگر اس سے باز نہ آئے تو ان لوگوں کو جنہوں نے کفر پر کمر باندھی ہے دردناک عذاب دیا جائے گا۔"

قرآن شریف میں مزید ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِن دُونِ اللّٰهِ ۖ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي ۚ بِحَقٍّ ۚ إِن كُنتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ۚ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ ۚ إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿١١٦﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿١١٧﴾ إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١١٨﴾

(سورۃ المائدہ: ۱۱۶ تا ۱۱۸)

"اور جب اللہ تعالیٰ کہے گا اے مریم کے بیٹے عیسیٰ کیا تو نے لوگوں کو یہ تعلیم دی تھی کہ خدا کے ماسوا مجھے اور میری والدہ کو معبود قرار دو۔ عیسیٰ جواب میں عرض کریں گے تیری ذات پاک ہے میں ایسی بات کیسے کہہ سکتا ہوں جس کا مجھے حق نہیں پہنچتا اگر میں نے ایسی بات کہی ہوگی تو ضرور تیرے علم میں ہوگی تو میرے دل کی بات جانتا ہے مگر مجھے تیرے ضمیر کا علم نہیں تو ہی غیب کی ساری باتیں جاننے والا ہے میں نے تو صرف وہی بات کہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو۔ میرا اور تمہارا سب کا پروردگار وہی ہے جب تک میں ان میں رہا مجھے بربنائے مشاہدہ ان کے قول و فعل کا علم رہا جب تو نے مجھے اٹھالیا تو پھر تو ہی ان کا نگران رہا اور تو ہر چیز کا نگران اور شاہد ہے اگر تو ان لوگوں کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں تجھے ان پر اختیار ہے اور اگر تو انہیں بخش دے تو بات یہ ہے کہ تو غالب حکمت والا ہے۔"

مسیحیت کا دارومدار عقیدۂ تثلیث پر ہے اور اس اعتقاد پر کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابن اللہ ہیں۔ اسلام میں اس عقیدے کے لئے کوئی گنجائش نہیں اس کی تعلیمات اس کی نفی کرتی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ سورۂ اخلاص ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ ﴿١﴾ اللّٰهُ الصَّمَدُ ﴿٢﴾ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ﴿٣﴾ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ﴿٤﴾ (سورۂ اخلاص: ۱ تا ۴)

"(اے رسول) دنیا کو یہ پیغام دے کہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا اس کا رشتہ ناطہ کسی سے نہیں ہے۔"

Marfat.com

مزید ارشاد ہوتا ہے۔

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ (سورۂ مریم:۳۵)

"یہ چیز اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں ہے کہ اس کے بیٹا بھی ہو (وہ قید ابنیت و ابوت سے بلند و بالا ہے۔)

قرآن شریف میں وارد ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾ (سورۂ آل عمران:۵۹)

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو عیسیٰؑ کی مثال آدمؑ جیسی ہے جسے اس نے مٹی سے پیدا کیا، پھر حکم دیا کہ ہو جا (ظہور میں آ جا) پس ایسا ہی ہو گیا۔"

اسلام حقیقت میں دین توحید ہے، نفاست و پاکیزگی کے اعتبار سے بھی اور شرح و بسط کے لحاظ سے بھی۔ ہر وہ نظریہ یا عمل جس سے توحید کی صورت یا حقیقت پر حرف آتا ہے اسلام اس کی نفی کرتا اور اسے کفر کے مترادف قرار دیتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ (سورۂ نسا:۴۸)

"اللہ تعالیٰ نہیں مغفرت فرماتا اس صورت میں کسی کی اگر اسؐ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے ہاں البتہ اس کے سوائے جس کی چاہے مغفرت فرما دیتا ہے۔"

مانا کہ مسیحیت کے تثلیثی عقائد کی تائید بعض قدیم مذاہب کے عقائد باطلہ سے بھی ہوتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے نزدیک ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے آپ اس عقیدہ کے حامل تھے کہ رب قدوس اپنی ذات میں وحدہ لاشریک لہ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴿۱﴾ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ﴿۲﴾ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ﴿۳﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (یعنی نہ اس کا باپ نہ بیٹا، نہ اس کا کوئی خاندانی شریک (کفو) ہے)۔ ان حالات میں اگر آنحضرت ﷺ کے ساتھ نصاریٰ کے مباحثے ہوئے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے لیکن آپ کے مباحثے کا انداز احسن ہوتا۔ آیات قرآنیہ سے آپ کی تائید ہوتی اور یہ بہت بڑی بات تھی۔

صلیب مسیح ایک دوسرا قضیہ ہے جو عہد نبوت میں اسلام اور مسیحیت کے مابین بحث و تکرار کا موضوع بنا۔ مسیحی اس بات پر جمے ہوئے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے مصلوب ہو کر تمام بنی نوع انسان کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا لیکن مسلمانوں کے عقیدہ کے بموجب از روئے قرآن اس کی نفی ہوتی تھی۔ قرآن میں صراحت کے ساتھ یہ وارد ہے:

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا

Marfat.com

لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۙ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (سورۂ نسا: ۱۵۷، ۱۵۸)

اور (نیز) ان کا یہ کہنا کہ ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو جو خدا کے رسول (ہونے کا دعویٰ کرتے) تھے (سولی پر چڑھا کر) قتل کر ڈالا، حالانکہ (واقعہ یہ ہے کہ) نہ تو انہوں نے انہیں قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھا کر ہلاک کیا بلکہ حقیقت حال ان پر مشتبہ ہوگئی (یعنی صورتِ حال ایسی ہوگئی کہ انہوں نے سمجھا کہ ہم نے مسیح کو مصلوب کر دیا، حالانکہ نہیں کر سکتے تھے) اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا (یعنی عیسائیوں نے، جو کہتے ہیں مسیح مصلوب ہوگئے لیکن اس کے بعد زندہ ہوگئے) تو بلاشبہ وہ بھی شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ ظن وگمان کے سوا کوئی علم ان کے پاس نہیں اور یقینا یہودیوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ سب پر غالب رہنے والا (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے۔[۵]

کفارۂ مسیح کا تخیل بادی النظر میں ایک ایسا تخیل ہے جسے شعری، ادبی، نفسیاتی اور اخلاقیاتی اعتبار سے ایک دلپذیر پیرائے میں موضوع سخن بنایا جاسکتا ہے لیکن جہاں تک روحِ اسلام کا تعلق ہے کوئی ایک شخص کسی دوسرے کے بار کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ (اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى) قیامت میں ہر شخص کو اس کے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی، نیکی کی جزا اور بدی کی سزا۔ لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْــــًٔا ۭ ۔ باپ بیٹے کے کام آئے گا، نہ بیٹا باپ کے (لقمان 33) اس سے اسلام اور مسیحیت میں جو اعتقادی تناقض پایا جاتا ہے، منطقی طور پر واضح ہوجاتا ہے، کہاں کفارۂ گناہ کا مسیحی تخیل اور کہاں جزائے اعمال کا اسلامی عقیدہ! دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عہد نبوت میں کسی عیسائی نے اصول اسلام اور مبادیٔ مسیحیت میں موافقت و مطابقت کی راہ ڈھونڈی اور ان دونوں میں کوئی موازنہ کیا؟ اس کا جواب اثبات میں دیا جاسکتا ہے اور وہ اس بنا پر کہ اسی توافق و ہم آہنگی کی بنا پر اس دور میں بہت سے عیسائیوں نے قبولِ اسلام کی سعادت حاصل کی تھی لیکن پاپایانِ روم نے اسلام کے بارے میں تحقیق کی زحمت گوارا نہیں کی اور اگر کبھی انہوں نے اس نئے دین کے بارے میں کچھ سوچا تو محض سیاسی زاویہ نگاہ سے، وہ یہ سوچتے تھے کہ اگر اس نئے دین کی بنیادیں استوار ہوگئیں تو ہماری سیادت پر کیا بیتے گی؟ یہی اندازِ فکر اور یہی تشویش تھی جس نے انہیں مسلمانوں کی مخالفت اور نئے دین سے اختلاف پر آمادہ کیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل ایک لشکر جرار مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ غزوۂ تبوک رومیوں کی اسی معرکہ آرائی کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہوا۔ اس غزوہ میں جس کی قیادت خود نبی کریم ﷺ فرما رہے تھے، رومیوں نے

Marfat.com

مقابلہ سے گریز کیا اور الٹے پاؤں لوٹ گئے۔

اس وقت سے مسلمانوں اور عیسائیوں میں کشیدگی کی بنیاد پڑی۔ ان کے درمیان جنگیں ہوئیں لیکن ان جنگوں اور معرکوں میں فتح و کامرانی مسلمانوں کے حصے میں آئی، ان معرکہ آرائیوں کے نتیجے میں اسلام کی سطوت وصولت کے جھنڈے گڑ گئے۔ مغرب میں اندلس اور مشرق میں ہند اور چین کی سرحدوں تک اسلام کا پرچم لہرایا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان وسیع و عریض ممالک میں جو قومیں آباد تھیں، ان میں سے اکثر و بیشتر حلقہ بگوش اسلام ہوگئیں جو ممالک مسلمانوں کے زیرنگیں آئے وہاں عربی زبان سرکاری اور قومی زبان قرار دی گئی۔ مغرب میں گردش لیل ونہار کی تاریخ نے پھر اپنے اوراق الٹے، اندلس دوبارہ عیسائیوں کے قبضہ میں آ گیا۔ مسلمان یہاں ٹھہر نہیں سکے، چارونا چار انہیں اس سرزمین کو خیرباد کہنا پڑا، اس کے بعد عیسائیوں کے غول کے غول یورپی ممالک سے آنے شروع ہوئے۔ غرض صلیبی جنگوں کا آغاز ہوگیا۔ اسلام اور ہادیٔ اسلام کے خلاف عیسائیوں نے طعن و تشنیع کی زبانیں دراز کیں، دروغ گوئی اور افترا پردازی میں بھی ان مخالفین نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ بغض و عداوت میں انہیں یہ بھی خیال نہ آیا کہ حضرت محمد مصطفی ﷺ نے خود احادیث ہی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقام نبوت کی تعظیم و تکریم نہیں کی ہے بلکہ اس قرآن میں بھی جو ان پر نازل ہوا، ان کے بارے میں کلماتِ تحسین استعمال کئے گئے ہیں۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں مسیحی مؤرخین نے رسول کریم ﷺ کے بارے میں جو زہر اگلا ہے فرہنگ لاروس فرانسہ میں اس کے متعلق یہ تحریر ہے۔

ا۔ ان خوبیوں کے باوجود آنحضرت ﷺ (نعوذباللہ) جادوگر، مفسدہ پرداز، رہزن اور کارڈینل (Cardinal) تھے جو پوپ کا منصب حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن جب یہ مقام حاصل نہ کر سکے تو انہوں نے اپنے ہم کاروں سے انتقام لینے کے لئے ایک نئے دین کی داغ بیل ڈالی جس میں انہوں نے خیالی داستانیں بھر دیں۔ (حضرت) محمد ﷺ کی سیرت پر جو کتابیں یورپ میں لکھی گئی ہیں، یہ حکایتیں ان میں بھی موجود ہیں۔

۲۔ آنحضرت ﷺ کی سیرت سے متعلق جو واقعات ۱۸۳۱ء میں اینو اور فرانسیسک مشیل نے شائع کئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرون وسطیٰ کے عیسائی آنحضرت ﷺ کے بارے میں کیا خیالات رکھتے تھے۔

۳۔ بیل نے سترہویں صدی میں آنحضرت ﷺ کے حالاتِ زندگی مؤرخانہ انداز میں قلمبند کئے اگرچہ اسے نبی کریم ﷺ سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں تھیں تاہم اس نے ایک جگہ یہ اعتراف کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو اخلاقی اور اجتماعی نظام پیش کیا ہے وہ قصاص اور تعددِ ازدواج سے قطع نظر مسیحیت کے اصول سے مختلف نہیں۔

Marfat.com

۴۔ فرانسیسی مؤرخ و مستشرق امیل درمنگھم نے رسول کریم ﷺ کے بارے میں جو کچھ سپردِ قلم کیا ہے اس میں اس نے کسی حد تک انصاف سے کام لیا ہے، وہ مسیحی مؤرخین کے نازیبا اور ناشائستہ کلمات کی نقل و روایت کے ساتھ لکھتا ہے۔"ایامِ جنگ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین مخالفین نے جلتی پر اور تیل چھڑکا۔ بازنطینی عیسائی اسلام کے خلاف کسی تحقیق و تدقیق کے بغیر زبان طعن و تشنیع کھولتے اور تحقیر و تذلیل کے اوچھے ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو (نعوذ باللہ) ڈاکو، ریاکار، عیاش، ہوس ناک اور جادوگر کہنے میں بھی انہیں کوئی تامل نہ تھا۔ بعض مسیحی معاندین انہیں (نعوذ باللہ) ڈاکوؤں کا سردار کہنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ بعض مغربی مورخین آنحضرت ﷺ کو کسی ایسے رومی راہب کے مشابہ قرار دیتے تھے جو پاپائیت کے منصب پر فائز نہ ہو سکنے کے باعث (نعوذ باللہ) مغلوب الغضبی کا بری طرح شکار ہو۔ بعض انہیں مدعی الوہیت سمجھتے اور یہ خیال کرتے کہ مسلمان ان کی خوشنودی کے لئے انسان کی بھینٹ دیتے ہیں۔"

چیرونوچن لکھتا ہے کہ (نعوذ باللہ) رسول اللہ ﷺ نے مستی و سرشاری کے عالم میں جان دی اور وفات کے بعد آپ کا جسم غلاظت کے ایک ڈھیر پر پایا گیا۔[۶]

بعض کتابوں میں آنحضرت ﷺ کو ایک طلائی بت کی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے اور دعوے کے ساتھ یہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کی مساجد میں بھی تصاویر اور مجسمے ہوتے ہیں۔

انطاکیہ کا ایک شاعر لکھتا ہے کہ "ماحوم" کے بت کو جو چاندی اور سونے سے بنایا گیا ہے، ہاتھی کے ہودج میں متمکن دکھایا گیا ہے۔

اولاں نے اپنی نظم میں یہ تحریر کیا ہے کہ شارلیمان کے سپاہیوں نے مسلمانوں کے بتوں کو تہس نہس کر دیا تھا نیز یہ بھی سپردِ قلم کیا ہے کہ مسلمانانِ اندلس جن تین خداؤں کے قائل ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ ترخاجان، ماحوم اور اپولون۔

مؤلف داستانِ محمد ﷺ (قصہ محمد ﷺ) لکھتا ہے کہ اسلام نے عورت کو اجازت دی ہے کہ وہ بیک وقت کئی شوہروں سے عقد کر سکتی ہے۔

اسلام کے خلاف افترا پردازی اور دروغ بافی عیسائیوں کے معمول میں داخل تھی۔ ردولف ولوہیم کے زمانے سے لے کر آج تک نکولادیس، وتیقس، مراتشی، ہوتنگر، ببلیاندر، پریدو اور دیگر عیسائی مصنفین نے حضور ﷺ کو (نعوذ باللہ) دجال، اسلام کو بدعات اور اعمالِ شیطانی کا ماحصل، مسلمانوں کو وحشی اور قرآن کریم کو لغویات و خرافات کا مجموعہ قرار دیا۔ ان مصنفین کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس قسم کی بیہودہ نویسی کرنے کے بعد انہوں نے معذرت بھی طلب کی۔

اپن پرونز ابل جس نے اسلام کے خلاف ایک رسالہ میں زہر اگلا۔ اس نے بارہویں صدی عیسوی میں

Marfat.com

قرآن کریم کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔

چودھویں صدی میں پر پاسکل نے مبادیٔ اسلام پر اپنا تحقیقی کارنامہ پیش کیا۔

انوسان ہشتم نے آنحضرت ﷺ کو دشمن مسیح قرار دیا۔

قرون وسطیٰ کے عیسائی آنحضرت ﷺ کو لادین قرار دیتے تھے۔

چودھویں صدی میں لیون، سولہویں صدی میں گیوم پاستل، اٹھارہویں صدی میں لرولان و زاینیہ اور انیسویں صدی میں کشیش و برگلی اور رنیان پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے دین کے بارے میں مختلف خیالات و نظریات رکھتے تھے۔

کاؤنٹ بولانویہ، شول، کوسن و برسوال، دوزی، سپرنگر، بارتلمی، سانگر، وکاستری، کارلائل اور دوسرے مصنفین نے ایک حد تک اسلام کے بارے میں انصاف کو ملحوظ خاطر رکھا ہے اور اس کے بارے میں انہوں نے جو کچھ بھی تحریر کیا ہے دلپذیر پیرایہ بیان میں تحریر کیا ہے لیکن ذروتی نے ۱۸۷۶ء میں آنحضرت ﷺ کو ہدف طعن بنایا اور آپ کے لئے نہایت برے القاب استعمال کئے، اب بھی ایسے عیسائی معاندین کی کمی نہیں جو کمال تعصب سے اسلام کے خلاف اپنی دریدہ دہنی کا ثبوت دیتے ہیں۔

مغربی مؤرخین کی اخلاقی پستی اور خباثت نفس کی کوئی انتہا ہے کہ انہوں نے سالہاسال سے بنی نوع انسان کا دامن تارتار کیا ہوا ہے اور ان میں گمراہی اور بغض وعداوت کے جراثیم انہی کی بدولت پرورش پاتے رہے ہیں۔ مقام حیرت ہے کہ ان مؤرخین نے یہ مذموم روش ایسے دور میں اختیار کی ہے جسے علم و تحقیق، حریت فکر اور مساوات کا دور کہا جاتا ہے ہاں البتہ کسی حد تک ان مصنف مزاج مصنفین کے شیوۂ حق پسندی سے غلط کار اور متعصب مورخین کی دروغ بافیوں کی تلافی ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مصنفین ہیں جن کی جانب ورنگھم نے اشارہ کیا ہے۔

بعض مصنفین اس حقیقت کے معترف ہیں کہ نبی کریم ﷺ اس رسالت پر جس کے لئے وہ منجانب اللہ مامور تھے پختہ اعتقاد اور کامل یقین رکھتے تھے، بعض ان کی روحانی عظمت اور اخلاقی فضیلت کی تعریف وتوصیف کرتے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ وہ ان کی (نبی کریم ﷺ) ذات گرامی کو جاذب توجہ اور جالب نظر تسلیم کرتے ہیں۔ بایں ہمہ مغرب میں ایسے کج باطن مسیحی بھی جنہیں آنحضرت ﷺ کی شخصیت ایک آنکھ نہیں بھاتی اور وہ اپنی جرأت وجسارت میں اس انتہا کو پہنچ گئے ہیں کہ وہ ممالک اسلامیہ میں اپنے مبلغین تبلیغ مسیحیت کے لئے بھیجتے ہیں جو ان کے مبتذل خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین جو خصومت اور ہمیشہ سے کشیدگی پائی جاتی ہے، ضرورت اس چیز کی ہے کہ اس کے اسباب کی کسی قدر صراحت کے ساتھ تحقیق کی جائے۔ ہمارے نزدیک مغرب کی اسلام دشمنی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام کی روح اور آنحضرت ﷺ کے حالات سے بے خبر ہیں اور اس

Marfat.com

حقیقت میں کسی کو بھی کلام نہیں کہ تعصب کا سرچشمہ یا نادانی ہوتی ہے یا حقیقت حال سے بے خبری۔ گزشتہ صدیوں میں یہ تعصب مسیحی معاندین کے دل و دماغ میں اتنا راسخ ہوگیا ہے کہ اس کے سدباب کے لئے زبردست جدوجہد کی ضرورت ہے۔ ایسی زبردست جدوجہد جو آغازِ اسلام کی نہ مغلوب ہونے والی طاقت کی یادتازہ کرتی ہو۔ اسلام کے خلاف مغربیوں کی ضد اور اس کے تعصب کے کچھ دوسرے اسباب بھی ہیں۔ اس موقع پر ذہن ان کے سیاسی اور استعماری عزائم کی جانب منتقل ہوتا ہے اور ہم انہیں بھی منجملہ اسباب سمجھ بیٹھتے ہیں حالانکہ ہمارے نزدیک یہ عزائم خواہ سیاسی ہوں خواہ استعماری، مغربیوں کے متعصبانہ رجحانات اور ضد و اصرار کا نتیجہ ہیں ہم انہیں اسباب قرار نہیں دے سکتے۔

اصل سبب یہ ہے کہ مسیحیت کے اصول یعنی زہد، عزلت گزینی، عفو و بخشش ایسے باطنی اوصاف ان مغربیوں کے مزاج سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے تھے جنہوں نے صدیوں ان گنت خداؤں کی پرستش کی اور جو جغرافیائی ماحول کے تقاضے سے سخت سردی، ناداری اور بے چارگی پر قابو پانے کے لئے سرگرداں رہے تھے۔ ایک زمانے میں تاریخی حالات نے انہیں مسیحیت اختیار کرنے پر مجبور کیا تو انہوں نے یہ کیا کہ اس کی صورت ہی مسخ کردی اور اس کے اصول کھینچ تان کر اپنے بدلے ہوئے حالات کے مطابق ڈھال لئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دین مسیح جو دراصل سلسلہ وحدتِ ادیان کی ایک کڑی تھا اور اپنے معنوی تناسب کے اعتبار سے اس سلسلہ کی آخری کڑی اسلام سے علاقہ رکھتا تھا، مسخ ہوکر رہ گیا۔ یہی وحدتِ معنوی ہے جو روح اور جسم کو ہم آہنگ رکھتی اور دونوں میں کشش و جاذبیت کا رنگ بھر دیتی ہے، دل و دماغ میں توافق و تطابق کی صورت بھی اسی وحدتِ معنوی کا نتیجہ ہے۔ فرد و ملت میں بھی ربط و ضبط کی جو صورت پائی جاتی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ ان کا شمار بھی اجزائے کائنات میں ہے اور زمان و مکان کے لامتناہی دائرہ میں جس طرح دوسرے اجزاء ترکیب و ترتیب پاتے ہیں اسی طرح فرد و ملت میں بھی نظم و تناسب کی صورت پیدا ہوتی ہے اور یہی صورت ہے جس کی بنا پر ترقی کی راہیں کھلتی ہیں اور عروج و کمال کے لئے زمین ہموار ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں اسلام سے مغرب کے تعصب کا اصل سبب یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں حبشہ کے عیسائیوں نے مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا لیکن اس کے مقابلے میں مغربی عیسائیوں نے بالکل مختلف طرزِ عمل اپنایا۔ اہل مغرب دینداری اور بے دینی میں افراط و تفریط سے کام لیتے رہے ہیں۔ اعتدال اور تسامح (سہل انگاری) کے درمیان وہ کبھی خط فصل کھینچنے کے عادی نہیں رہے۔

اگرچہ اہل مغرب میں ایسی مقدس ہستیاں بھی رہی ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی پیروی میں کوئی کوتاہی نہیں کی لیکن اس کے باوجود ان کی تاریخ بتاتی ہے کہ انہوں نے کبھی مذہب کے نام پر اور کبھی سیاست کے نام پر جنگ وجدل کے بازار گرم کئے۔ سالہا سال تک مذہبی پیشوا اور اربابِ اقتدار باہم دست و گریباں رہے، کبھی ایک فریق غالب آتا اور کبھی دوسرا۔ انیسویں صدی عیسوی میں جب اربابِ اقتدار کو غلبہ نصیب ہوا

Marfat.com

تو انہوں نے علوم وفنون کی اشاعت کے پردے میں مذہب کے اثرورسوخ کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا ارادہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کی روحانی زندگی میں علم، عرفان کا نعم البدل ہوسکتا ہے لیکن تجربہ نے سالہاسال کے بعد ان پر یہ حقیقت واضح کردی ہے کہ ایسا ممکن نہیں۔ آج مغرب کے ہر ملک سے ایک ہی آواز بلند ہورہی ہے کہ ''ہمیں اپنی متاع گم گشتہ ایمان وعرفان کے حصول کی جدوجہد کرنی چاہئے'' چنانچہ تھیوسوفی اور اسی قسم کے عقائد سے سکونِ دل اور اطمینانِ قلب حاصل کیا جارہا ہے۔ اگر دین مسیح، طبعی اور جغرافیائی تقاضوں کے مطابق عیسائیوں کی معاشی ومعاشرتی جدوجہد کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا تو اس وقت وہ مغربی جنہیں آج یہ احساس ہوگیا ہے کہ مادی افکار سکونِ دل کا باعث نہیں ہوسکتے، مجبوراً مسیحیت کا اقرار نہ کرتے اور انہیں سکونِ خاطر کی احتیاج دامن گیر نہ ہوتی۔ ہندوستان اور دوسرے ممالک میں روحانیت کو سکونِ قلب کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور وہاں کے لوگ اس کی ضرورت اسی طرح محسوس کرتے ہیں جیسے سانس لینے کے لئے ہوا کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی نظر میں روحانیت انسان کی فطرت اور اس کی ہستی کا جزو ہے۔

اہل مغرب کو استعماری مقاصد بھی اسلام کی مخالفت پر ابھارتے رہے ہیں اور ان میں سے بہت سے لوگ مشرکین مکہ کی طرح جو رومیوں کی شکست کو دینِ مسیح کی پیروی کا نتیجہ سمجھتے تھے، یہ کہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کے زوال کا باعث اسلام ہے اور اسلام ہی کے باعث مسلم اقوام دوسری قوموں کی محکوم بنی ہوئی ہیں لیکن جب یہ لوگ اس قسم کی سے بے سروپا باتیں منہ سے نکالتے ہیں تو یہ حقیقت فراموش کرجاتے ہیں کہ مسلم اقوام صدیوں تک، تہذیب وثقافت کی علمبردار اور دنیا کے ایک بہت بڑے رقبے پر حکمران رہی ہیں۔ کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ اسلامی ممالک صدیوں علم ودانش کا گہوارہ رہے، تہذیب وتمدن نے اگر کہیں فروغ پایا تو صرف انہی ممالک میں۔ پوری کائنات کو جن ممالک نے علم وحکمت کی دولت سے مالا مال کیا ہے وہ یہی اسلامی ممالک ہی تو ہیں۔ اہل مغرب تو سالہاسال بعد علوم وفنون سے آشنا ہوئے۔ ملت اسلامیہ کے بارے میں یہ کہنا کہ اسے اپنے دینی عقائد کی وجہ سے محکوم ومغلوب رہنا پڑا، کوئی زیادہ قرین انصاف نہیں اس لئے کہ اسلام نے عرب کے صحرانشینوں کو فلاکت وافلاس کی پستیوں سے نکال کر سعادت وسیادت کی مسند پر متمکن کردیا تھا۔

جو مسیحی ملت اسلامیہ کے زوال کا سبب اسلام کو قرار دیتے ہیں، ہم انہیں ایک حد تک معذور سمجھتے ہیں کیونکہ دوست نما دشمنوں اور دشمنوں سے بدتر دوستوں کی بدولت اسلام میں ایسی چیزیں راہ پاگئی ہیں کہ خدا ان سے بیزار ہے اور اگر آج پیغمبر خدا ﷺ اپنے دین کو ان بدعات سے داغدار دیکھیں تو اپنے دین کو مطلق نہ پہچان سکیں۔ حیرت کی بات ہے کہ بے خبر مسلمان حشو وزوائد کو بھی دین کا جزو سمجھتے ہیں اور جو ان سے انکار کرتا ہے تو اسے کافر وبے دین کہنے میں انہیں مطلق کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اب ہم اس موضوع سے قطع نظر

Marfat.com

رسول کریم ﷺ کی سیرت پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

افسوس ہے کہ سیرت کی بہت سی کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے حالات کچھ اس انداز سے بڑھا چڑھا کر پیش کئے گئے ہیں کہ عقل سلیم کو ان کی صحت میں شبہ ہوتا ہے اور وہ قطعاً ان پر صاد نہیں کرتی حالانکہ حضور ﷺ کی رسالت کے ثبوت کے لئے ہرگز اضافی امور کی ضرورت نہیں تھی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے حالات زندگی میں جن امور کا اضافہ کیا گیا ہے، انہی پر مغربی نکتہ چینیوں اور مستشرقین نے اعتراضات کی بوچھاڑ کی۔ یہی باتیں ہیں جن کی بنا پر انہیں طرح طرح کے اعتراضات کا موقع ملا۔ اسلام پر جن مخالفین نے حرف گیری کی ہے انہوں نے صرف تنقید ہی پر بس نہ کی بلکہ خود اپنی طرف سے بھی کچھ حاشیہ آرائیاں کیں۔ یہ سوانح نگار خیال کرتے ہیں کہ ہماری سیرت نویسی کا انداز تحقیقِ جدید کا رنگ لئے ہوئے ہے اور اس تحقیقِ جدید کا تقاضا یہ ہے کہ ہم جس موضوع پر اظہارِ خیال کریں، اس کی تصریح و تنقیح اس غیر جانبدار منصف عدالت کی حیثیت سے کریں جو پہلے معاملہ کی چھان بین کرتا ہے اور پھر غیر متعلق اجزاء سے قطع نظر اصل امر واقعہ اور اس کے متعلقات سے بحث کرتا ہے۔

مغربی مؤرخین کی کتابیں جب ہمارے زیر مطالعہ آتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نقد و بصر اور حجت و تکرار کے سوائے ان کا سرے سے اور کوئی مقصد ہی نہیں ہے لیکن یہ مؤرخین اپنے خیالات ایسے دیدہ زیب اور نظر فریب انداز میں صفحہ قرطاس پر لاتے ہیں کہ ان کے ہم مذہب قارئین یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ان مصنفین کا مقصود اگر کچھ ہے تو علمی تحقیق ہے یا تلاشِ حقیقت۔ انہی مسیحی مصنفین میں بعض روشن خیال مصنفین بھی ہیں جن کے دلوں میں سکون و اطمینان کی کیفیت پیدا ہو چکی ہے اور جو اسلام اور ہادیٔ اسلام کے بارے میں انصاف پسندانہ خیالات اور صالح جذبات رکھتے ہیں۔

متعصب مغربی مؤرخین نے اسلام پر جو الزامات عائد کئے اور ناروا تصورات قائم کئے تھے بعض دانشمندانِ اسلام نے ان کی تردید و تغلیط کی کوشش کی ہے۔ ان میں شیخ محمد عبدہٗ زیادہ ممتاز و معروف ہیں لیکن ان مسلمانوں نے اپنی تصانیف میں تحقیق جدید کی وہ روش اختیار نہیں کی جس کا دعویٰ مغربی مؤرخین کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حریفوں نے ان کے دلائل کو کوئی وزن اور کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ ان کے نزدیک ان کی کتابیں معتبر قرار پائیں۔ چونکہ ان مسلمان مصنفین کے خلاف جن کے سرخیل شیخ محمد عبدہٗ ہیں الحاد اور بے دینی کا الزام عائد کیا جاتا ہے اس وجہ سے دشمنانِ اسلام نے ان کی باتوں کو مطلق درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ دانشورانِ اسلام کے اس گروہ پر الحاد و بے دینی کے الزامات نے نئی پود کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ علمائے اسلام کے نزدیک عقلی مباحث اور منطقی استدلال سے مراد الحاد و بے دینی ہے اور ایمان و ایقان کا مفہوم ان کے نزدیک کورانہ تقلید یا جمود ہے۔ اس تذبذب اور اس انتشار ہی کا اثر ہے کہ نئی پود کے تعلیم یافتہ مسلمان مغربی مصنفین کی تصانیف کا مطالعہ ذوق وشوق سے کرتے ہیں، اس لئے کہ ان میں انہیں حقیقت کا

پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کا یہ پختہ خیال ہے کہ مسلمان مصنفین کی کتابیں حقیقت سے کوسوں دور ہیں۔ یہ طبقہ اکثر و بیشتر ایسی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے جن کا موضوع فلسفہ ہو اور اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے تجسس کی تسکین کا سامان فراہم کریں اور فلسفیانہ دلائل کے ذریعہ اس چنگاری کو جو ان کی روح میں چھپی ہوئی ہے اور جسے ہم ایمان سے تعبیر کرتے ہیں، بھڑکائیں۔ حقیقتِ کبریٰ یعنی خدا سے ربط وضبط کا ان کے خیال میں اگر کوئی وسیلہ ہے تو یہی فلسفہ اور اس کے دلائل ہیں ان لوگوں کو فلسفہ، ادبیات فلسفہ اور خالص مغربی ادبیات میں ایسے مطالب نظر آتے ہیں کہ ان کے بیان کی خوش اسلوبی، استدلال کی نزاکت اور اندازِ حق طلبی سے متاثر ہو کر وہ نہ صرف اسلام بلکہ تمام مذاہب سے بیزار ہو جاتے ہیں اور اسلام اور اس کے بانی کے متعلق قطعاً غور و خوض سے کام نہیں لیتے۔ اس اندیشہ سے کہ اگر ان کے اور بے عمل لوگوں کے درمیان مناظرہ کی صورت پیدا ہوئی تو وہ اس میں جیت نہیں سکیں گے۔ علاوہ بریں انہیں یہ بھی وثوق کے ساتھ علم نہیں کہ انسان اور کائنات کے مابین ایک معنوی رشتہ ہے اور اسی رشتہ کی بدولت اسے کمالات نصیب ہوتے ہیں اور یہی سبب ہے اس کی روحانی طاقت میں اضافے کا۔

اس بے یقینی کا نتیجہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان دین کے موضوع پر غور و فکر کرتے وقت اسلام اور ہادیٔ اسلام سے قطع نظر کر لیتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اکثر دینی مسائل مقتضیات عقل کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے اور علم و تحقیق کے اصول ان سے قطعاً کوئی مطابقت نہیں رکھتے، وہ مابعد الطبیعاتی مسائل بھی جو دینی مسائل میں گھل مل گئے ہیں ان کی نظر میں کوئی وزن اور کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ یورپ میں کلیسائی نظام کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر کسی عیسائی ملک میں مذہب کو حکومت میں دخل ہے تو صرف اس حد تک کہ کلیسا بھی حکومت کی تصدیق کرے، قطع نظر اس سے کہ وہ پروٹسٹنٹ ہو یا کیتھولک۔ اس کے علاوہ حکومت کے نظم و نسق میں پوپ کو مطلق کوئی دخل نہیں۔ غرض یہ سب کچھ رسم و تقریب کی حد تک ہے۔

یہ اسباب ہیں جن کے تحت مسلمان نوجوان اپنے دین سے صرف نظر کر کے مغربی علم و ادب اور فلسفہ و منطق کی جانب متوجہ ہو جاتے ہیں۔ تعلیم سے فراغت اور عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد کاروباری مشاغل ان مسائل کی طرف توجہ مبذول کرنے کی مہلت نہیں دیتے جن پر انہیں کبھی پہلے غور و فکر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اگر کبھی غور و فکر کرتے بھی ہیں تو عامیانِ دین کی بے عملی اور بے حسی سے ان کی طبیعت کھٹی ہو جاتی ہے۔ انہیں فلسفیانہ افکار و خیالات سے سرور حاصل ہوتا ہے چنانچہ پھر وہی مطالب ان کے دل و دماغ کا احاطہ کر لیتے ہیں جو آغازِ شباب میں ذہن نے قبول کئے تھے، اس میں مطلق کوئی کلام نہیں کہ اہل مشرق کو مغربی افکار اور علوم و فنون سے ضرور استفادہ کرنا چاہئے کیونکہ صدیوں کے جمود و تعطل نے مشرق کو روشن ماضی اور اس کے اثرات سے بیگانہ کر دیا ہے اور اس کے قدیم افکار جہالت، غفلت اور جمود کے پردے میں چھپ گئے ہیں۔ ان پردوں کو چاک کرنے کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ دنیا کے نئے افکار پر توجہ صرف کی

Marfat.com

جائے اور اس طرح حال کو درخشاں ماضی کی معنوی ثروت کی بنیاد پر استوار کیا جائے۔

علمائے مغرب اسلام اور مشرق سے متعلق جو تحقیق و تدقیق کر رہے ہیں اس نے فرزندانِ مشرق کے غور و فکر کے لئے ایک نیا باب کھول دیا ہے اور وہ یہ کہ اپنے اس فہم و شعور کی بنا پر جو انہیں اسلام اور مشرقی مسائل سے متعلق ہے ان مباحث میں حصہ لیں جن کا یورپ میں ازسرنو آغاز ہوا ہے۔ ان میں جو بے اعتدالیاں راہ پا گئی ہیں ان کی اصلاح کریں اور ان میں ایک نئی روح پھونک دیں۔ یہ کام بحث و مناظرہ کی شکل میں نہ ہو بلکہ محض اس نیت سے ہو کہ یہ معنوی میراث ہماری توجہ کی مستحق اور محتاج ہے۔ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ وہ حقائق جن پر گردشِ ایام نے پردے ڈال دیئے ہیں پھر روشنی میں آجائیں اور ایک نئی شان کے ساتھ۔

آج کل فرزندانِ مشرق میں سے بعض نے اس مہم کا آغاز کر دیا ہے اور وہ علم و تحقیق کی روشنی میں یہ خدمت جلیلہ سرانجام دے رہے ہیں۔ مغربی مستشرقین بھی ان کی اس خدمت سے استفادہ کر رہے ہیں۔ ایک طرف تو مشرقی محققین اور مغربی مستشرقین کے مابین علمی تعاون کی راہیں استوار ہو رہی ہیں اور دوسری طرف صاحبانِ کلیسا رسول کریم ﷺ کی عیب جوئی اور فردہ گیری پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ سلسلہ تنقید و تنقیص بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے اسی قسم کا ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ مغربی استعمار پسند بھی فکر و خیال کی آزادی کے پردے میں اس گروہ کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ یہی استعمار پسند بے عمل اور کوتاہ نظر مسلمانوں کی حمایت میں بھی پیش پیش ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ مغربی استعمار پسند ایک طرف تو اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لئے ان امور کی تائید و توثیق کرتے ہیں جنہیں آنحضرت ﷺ کے حالاتِ زندگی اور ان کی تعلیم سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور دوسری طرف ان حاشیہ آرائیوں پر صاد کرتے ہیں جو تعلیم اسلام اور سیرت رسول کریم ﷺ میں راہ پا گئی ہیں۔

میں نے اسلامی ممالک میں ان مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا اور یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ جو طاقتیں مسیحی مبلغین سے اپنے کام میں مدد لینا چاہتی ہیں آخر ان کا مقصد کیا ہے؟ آخر یہ لوگ حقیقت کے آئینے میں افسانوی رنگ کیوں بھر رہے ہیں؟ ان احساسات نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ میں اس غلط تلاش اور ان ناپاک عزائم کا پردہ چاک کروں کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ ان ناپاک عزائم سے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ پوری دنیا کو نقصان پہنچ سکتا ہے چنانچہ میں نے عزم و ارادہ کی پوری قوتوں کے ساتھ اقدامِ عمل کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ اس قوم کا مذہبی جمود جو صدیوں تہذیب و تمدن کی علمبردار رہی ہے تمام اقوامِ عالم کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ اس خیال سے کافی غور و خوض کے بعد میں نے آنحضرت ﷺ کی سیرت اور ان کے سوانحی حالات قلم بند کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس مقدس ہستی کو نہ صرف عیسائی طعن و تعریض کا ہدف بنا رہے ہیں بلکہ بے شعور و بے حس مسلمانوں نے بھی اس کے گرد حلقے کھینچ دیئے ہیں۔ یہ کتاب جو میں نے نئے اسلوب سے سپردِ قلم کی ہے اس کی تالیف سے میری مراد صرف حق و صداقت کی

Marfat.com

خدمت اور حقیقت کی حمایت ہے اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں۔

تالیفی نقطہ نظر سے میں نے سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد، مغازی واقدی، روح الاسلام مصنف سید امیر علی، نیز ورننگھم اور واشنگٹن ارونگ کی تصانیف کا مطالعہ کیا۔

۱۹۳۲ء میں بزمانہ قیام ازہر فرصت کو غنیمت سمجھتے ہوئے میں نے تالیف کتاب کا آغاز کر دیا۔ آغازِ کار میں مجھے اندیشہ تھا کہ مغربی خرافات کے طرفداروں اور اندھے مقلدوں کی نکتہ چینی اور ہنگامہ پروری کہیں مجھے اس کام کی تکمیل سے باز نہ رکھے لیکن یہ اندیشہ دور ہو گیا اس لئے کہ جامع ازہر کے بعض مشائخ نے مجھے اس کی ترغیب دی اور میری حوصلہ افزائی بھی کی۔ انہی بزرگوں میں سے بعض نے چند نکات بھی بتائے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس کام میں دلچسپی لے رہے ہیں چنانچہ مجھے اس ضرورت کا احساس اور بھی شدت کے ساتھ ہوا اور میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ میں علم و تحقیق کی روشنی میں آنحضرت ﷺ کی سیرت قلمبند کروں اور اظہارِ مطالب کے لئے وہ اسلوب اختیار کروں جو بہتر بھی ہو اور مناسب بھی۔

مجھے یہ باریک نکتہ معلوم ہو چکا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت کے سلسلہ میں اگر کوئی بہترین مرجع و ماخذ ہے تو وہ قرآن حکیم ہے کیونکہ آیاتِ قرآنی میں آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ سے متعلق اشارات پائے جاتے ہیں اور کوئی محقق اگر چاہے تو حدیث و سیرت کی کتابوں کی مدد سے اس ضمن میں تسلی بخش تحقیق کر سکتا ہے۔ اس خیال سے میں نے ان تمام آیات کو جو آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی سے متعلق ہیں، جمع کرنے کی ٹھانی۔ آقائے احمد لطفی رکن خانہ مصر نے اس کام میں مجھے مدد دی اور آیات بینات کا ایک کامل اور مرتب مجموعہ میرے حوالے کیا، اس کے بعد میں نے یہ کوشش کی کہ ان آیات کی شانِ نزول بھی معلوم کروں لیکن اس کوشش میں مجھے خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کتب تفاسیر میں کہیں کہیں تو آیات کا سبب نزول بیان کیا گیا ہے لیکن اکثر مقامات پر نہیں بھی کیا گیا۔ اسباب النزول (واقدی) اور الناسخ والمنسوخ (ابن سلامہ) میں اس موضوع پر کسی قدر اجمال کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ مجھے ان ہر دو کتب اور کتب تفاسیر میں ایسے مسائل سے سابقہ پڑا جن کی مدد سے کتب سیرت کے متعدد مسائل و مطالب کی تحقیق کی جا سکتی تھی۔ مذکورہ بالا ہر دو کتب اور اور کتب تفاسیر میں بعض ایسے نکات ہیں کہ علم قرآن و حدیث کے متبحرین کو ان کے بارے میں زیادہ کدوکاوش سے تحقیق کرنی چاہیے۔

کتاب کی تالیف کے سلسلے میں مجھے ہر جانب سے مشورے ملے۔ کتب خانہ مصر کے کارکنوں نے مجھے اس کام میں بڑی مدد دی اور بعض کتابیں میرے حوالے کر دیں۔ جن دشوار مشکل مسائل کی تہ تک میں خود نہیں پہنچ سکتا تھا، دانشمند احباب کی مدد و تعاون سے ان کی گرہ کشائی ہو گئی۔ مجھے اعتراف ہے کہ ان کے مشوروں سے مجھے چند در چند فوائد حاصل ہوئے۔ علاوہ بریں میں نے اپنے معاصرین کی جن کتب سے استفادہ کیا وہ یہ ہیں: فجر الاسلام (استاد احمد امین)، قصص الانبیاء (استاد عبدالوہاب نجار)، فی الادب الجاہلی

Marfat.com

(ڈاکٹر طہٰ حسین)، الیہود فی بلاد العرب (اسرائیل ونفنسن) ان کے علاوہ اکثر وہ کتب ہیں جن کا ذکر میں نے ماخذ ومراجع کی فہرست میں کر دیا ہے۔

جیسے جیسے میں اس مبحث پر غور وخوض کرتا تھا، نئے نئے مسائل میرے سامنے آتے تھے۔ سیرت وتفسیر کی کتابیں اور مغربی مستشرقین کی تالیفات اس سلسلہ میں میرے لئے مشعل راہ کا کام دے رہی تھیں۔ غور وخوض کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی تحریر کو سرگزشت رسول ﷺ تک محدود رکھوں اور ان مسائل سے قطع نظر کروں جو اس سے غیر متعلق ہیں اگر میں اس جلیل القدر شخصیت سے متعلق تمام سوانحی تفصیلات قلمبند کرتا تو کئی مجلدات تیار ہو جاتیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کوکوسان دی پرسوال نے کتاب بعنوان ''رسالہ در تاریخ عرب'' تین جلدوں میں تصنیف کی ہے۔ پہلی اور دوسری جلدوں میں قبائل عرب کے حالات ہیں اور تیسری جلد رسول کریم ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حالات سے متعلق ہے۔ طبقات ابن سعد کی کئی جلدیں ہیں۔ پہلی جلد میں آنحضرت ﷺ کی سرگزشت ہے اور باقی جلدوں میں اصحاب کبار کے حالات ہیں۔ کتاب کی تالیف کے آغاز میں، میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ موضوعِ کلام آنحضرت ﷺ کی سرگزشت تک محدود رکھوں گا چنانچہ دورانِ تالیف یہی چیز پیش نظر رہی ہے۔

سیرت رسول ﷺ کی حدود سے تجاوز نہ کرنے کا ارادہ اس بنیاد پر تھا کہ حضور ﷺ کی باعصمت حیات کے احاطے میں ہر چیز آ جاتی ہے۔ صحابہ کرامؓ اگرچہ ہر اعتبار سے عظمت ورفعت کے حامل تھے لیکن ہم نے محض اس خیال سے ان کے حالات قلمبند نہیں کئے کہ ان کی شخصیتیں آفتاب رسالت کے پرتو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دراصل وہ سیرت نگار جو آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ وحیات مطہرہ سے متعلق کچھ تحریر کرنا چاہتا ہے وہ اپنے موضوع سے ہٹ کر دیگر مطالب کی جانب اپنا ذہن منتقل نہیں کرسکتا۔ خصوصاً وہ مؤرخ جو میری طرح تحقیق جدید کی روشنی میں رسول کریم ﷺ کی سیرت مدون ومرتب کرنا چاہتا ہے، لامحالہ اس کے دل میں عزت واحترام کے جذبات موجزن ہوں گے کیونکہ یہ طریقہ تحقیق جدید ہر عام وخاص کے دل ودماغ میں آنحضرت ﷺ کی عظمت کا احساس پوری قوت کے ساتھ بیدار کر دیتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ذریعہ یقین وایمان کی بنیادیں بھی مستحکم ہو جاتی ہیں۔ یہ فیضانِ رسالت عام ہے، مسلم اور غیر مسلم دونوں اس میں برابر کے حصہ دار ہیں۔

ان احمق مبلغین کے علاوہ جو آنحضرت ﷺ سے خدا واسطے کا بیر اور بے وجہ کی دشمنی رکھتے ہیں، ایسے روشن دماغ مستشرقین بھی ہیں جنہوں نے ہر حال میں احترام رسول ﷺ کا پاس کیا ہے مثلاً۔

کارلائل نے اپنی کتاب، کتاب الابطال میں ایک فصل آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی سے متعلق رکھی ہے اور اس نے اس فصل میں نور مطلق کی قدوسیت کا ذکر کرتے ہوئے جو وحی والہام کا منبع بھی ہے اور مشکوٰۃ نبوت کی برق تجلی کا بھی، آنحضرت ﷺ کی عظمت وتقدیس کا واضح بیان بھی کیا ہے۔ میور، اروِنگ،

Marfat.com

اسپرنگر، ویل اور دوسرے تمام مستشرقین نے نبی کریم ﷺ کی عظمت کا بیان نہایت خوبصورتی اور خوش اسلوبی کے ساتھ کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی بعض مسائل میں انہوں نے آپ ﷺ کی ذات پر تنقید بھی کی ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے سیرت کے ان گوشوں پر جن سے یہ مسائل تعلق رکھتے ہیں، تحقیق و تدقیق کی قوت صرف نہیں کی اور ان ضعیف روایات پر اعتماد کر لیا جو تفاسیر اور سیرت کی کتاب میں بکھری پڑی ہیں۔ انہوں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ سیرت پر جو قدیم ترین تصانیف دستیاب ہوتی ہیں ان کا زمانہ تصنیف آنحضرت ﷺ سے دو صدی بعد کا ہے۔ اس اثناء میں یہودیوں کی من گھڑت اسرائیلیات بھی ان میں غلط ملط ہو گئی ہیں۔ ہزاروں جعلی احادیث اس دور میں وضع کی گئیں۔ مستشرقین اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے لیکن انہوں نے پھر بھی ایسی نامعتبر اور غیر محقق روایات پر انحصار کیا جن کی حقیقت تھوڑے سے تامل اور معمولی تحقیق سے بے نقاب ہو سکتی تھی۔ یہ ضعیف روایات ہیں (الف) داستان غرانیق (ب) مسئلہ زیدؓ و زینبؓ (ج) مسئلہ ازواجِ نبی ﷺ۔ میں نے اس کتاب میں انہی امور کی تنقیح و توضیح کی ہے۔

میں یہ ادّعا نہیں کرتا کہ میں نے سیرتِ رسول ﷺ سے متعلق جملہ مباحث پر فیصلہ کن انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ میں نے جدید علمی انداز میں ان مباحث پر تحقیقی نظر ڈالی ہے اور میرے خیال میں یہ انداز حقیقت سے بہت قریب ہے۔ میں نے جو اسلوبِ تحقیق اختیار کیا ہے اس ضمن میں میری جدوجہد کا محور اس موضوع کی عظمت کے پیش نظر علوم اسلامی اور ان کا علمی مزاج ہی ہو سکتا تھا۔ ماضی میں بعض ذکی و فہیم مصنفین نے کسی نہ کسی عہد کے حالات خصوصیت کے ساتھ قلمبند کئے ہیں۔ مثال کے طور پر اولار نے ''انقلاب فرانس'' کی تاریخ منضبط کی ہے۔ بعض دوسرے باخبر مصنفین نے ایک عہد یا چند عہود کی تاریخ لکھی ہے اور اس میں مختلف اقوام و ملل کے تاریخی حالات درج کئے ہیں۔ سیرت رسول ﷺ کی جامعیت کا تقاضا ہے کہ اس موضوع پر علمی انداز میں تحقیق کی جائے اور اس سلسلہ میں تاریخ عرب اور اس دور کی مختلف اقوام سے اس کے روابط کے گوشے اجاگر کئے جائیں۔ اس صورت میں اس سے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ دنیا کی تمام اقوام کو بصیرت و بصارت کے مفید سبق ملیں گے۔ اس تحقیقی بحث کے دائرہ میں بہت سے اخلاقی اور روحانی مسائل بھی تاریکی میں نہیں رہیں گے۔ دنیا کی اخلاقی، اجتماعی اور قانونی زندگی کے اکثر و بیشتر پہلو بھی اس تحقیق کے طفیل روشنی میں آ جائیں گے۔ علم تحقیق کی تردید و تغلیط کے بغیر بعض ایسے مسائل بھی عقدۂ لاینحل نہیں رہیں گے جن کی گرہیں ناخن تدبیر سے کھلتی اور سلجھتی نظر نہیں آتیں۔ اسی ضمن میں اسلام اور عیسائیت کے وہ مناظرے اور مسیحی مبلغین کی وہ تخریبی کوششیں بھی زیر بحث آتی ہیں جنہیں وہ مسلمانوں کو عیسائیت کے دائرہ میں لانے کے لئے صرف کرتے رہے ہیں۔ یہ کوششیں ایسی ہیں جن کے نامبارک اور قبیح نتائج نے اکثر اربابِ علم و دانش کو ذہنی تشویش میں مبتلا کیا ہے۔

مجھے تو اس حقیقت کے اظہار و اعلان میں بھی مطلق کوئی تامل نہیں ہے کہ یہ بحث انسانیت کے لئے

Marfat.com

جدید تمدن کی جستجو میں ممد و معاون ہو سکتی ہے۔ اگر مسیحیت کو اسلام سے ضد ہے اور وہ نہیں چاہتی کہ اس منبع سے کچھ فیضان حاصل کرے اور اس کے برخلاف اس کی نگاہیں تھیوسوفی اور مشرق کے دیگر مذاہب کی جانب ہیں تو مشرقی مفکرین کا یہ فرض ہے، خواہ وہ مسلمان ہوں یا یہود و نصاریٰ، کہ اس موضوع پر عدل و انصاف اور غیر جانبداری سے قلم اٹھائیں تا کہ کسی ایک راہ کا تعین ہو سکے۔ اسلامی افکار میں یہ کمال ہے کہ اگر انہیں تحقیق جدید کی روشنی میں پیش کیا جائے تو ان کی مدد سے ہمیں ان روابط کا علم ہو سکتا ہے جو کائنات اور خالق کائنات کے ساتھ بنی نوع انسان کے ہیں۔ علم اپنے گوناگوں ارتقائی مدارج کے باوجود بعض ایسے اخلاقی اور روحانی مسائل حل نہیں کر سکتا جن پر انسان کی سعادت اور اس کے خصائل کی بنیاد ہے۔ اسلامی نظریات کی روشنی میں یہ مسائل بوجوہ احسن حل ہو سکتے ہیں۔

زندگی کیا ہے؟ انسان اور کائنات کے مابین کیا رشتہ ہے؟ زندگی سے رغبت کی وجہ کیا ہے؟ وہ ملے جلے عقائد کیا ہیں جو معاشرتی زندگی میں روحانی قوت کی بیداری کا باعث ہوتے ہیں اور جن کے ضعف کے باعث روحانی قوت مضمحل ہو جاتی ہے؟ وجود کیا ہے؟ وحدت الوجود کی حقیقت کیا ہے؟ وجود اور وحدت الوجود سے انسان کا کیا علاقہ ہے؟ یہ مسائل فلسفہ مابعد الطبیعات یا منطق تجریدی سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہی مسائل سے دوسرے ان گنت مباحث نے جنم لیا ہے۔ سیرت رسول ﷺ اور پیغمبرانہ تعلیمات کے طفیل یہ محولہ بالا مسائل ایسے دل نشیں اور ایسے دلپذیر انداز میں حل ہوئے ہیں کہ سبحان اللہ، مابعد الطبیعات اندازِ فکر اس سلسلہ میں پیغمبرانہ بصیرت سے لگا نہیں کھا سکتا۔ آنحضرت ﷺ نے انسان کی سود و بہبود کے پیش نظر، ان مسائل میں عمومی افادیت کی روح پھونک دی ہے۔

مسلمان صدیوں تک مابعد الطبیعاتی مسائل کی موشگافیوں میں الجھے رہے۔ اہل مغرب بھی سولہویں صدی سے انیسویں صدی تک انہی مباحث کے چکر میں پھنسے رہے۔ ان مسائل و مباحث کے نتیجے میں دیگر علوم معرض وجود میں آئے لیکن یہ ظاہر ہے کہ تنہا کوئی علم اپنی افادی حیثیت کے اعتبار سے قابل اعتماد نہیں، اس سے کسی انسان کی خوش بختی کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ راحتِ روح اور سکونِ قلب کے لئے خالق و مخلوق کے درمیان رابطہ کی حقیقت علم و تحقیق کی روشنی میں جاننا چاہتے ہیں، اس سیرت میں ان کے لئے سبق ہے نیز ان اشخاص کے لئے بھی سیرت رسول ﷺ شمع ہدایت کا حکم رکھتی ہے جو فقر و سلوک کی باطنی استعداد اور روحانی صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ روحانیت کے اس باطنی سفر کی منزلیں خیر و خوبی اور سہولت سے طے ہو جائیں۔ ان محققین کے لئے بھی اس سیرت میں سبق ہے جو عملی حیثیت سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔

میرا عقیدہ ہے کہ اگر اس علمی و عملی تحقیق کے خاطر خواہ نتائج مرتب ہو جائیں تو ہماری یہ دنیا مادہ پرستی کی اضافی قید سے آزاد ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں یہ نتائج بالمشاہدہ نظر نہ آئیں لیکن وہ لوگ جن کی نظر

Marfat.com

واقعات عالم پر رہتی ہے انہیں یہ صاف نظر آ رہا ہے کہ مادہ پرستی اور بت پرستی کا سفینہ ڈوبنے ہی کو ہے۔ سیرت رسول ﷺ میں جو اسرار و حکم پوشیدہ ہیں اگر علم تحقیق کی سطح پر آ جائیں اور اس روحانی تحریک کا راز اگر ہویدا ہو جائے جس کی ایک جھلک ابھی دنیا کے تمدن کی تاریخ نے دیکھی ہے تو مادہ پرستی کے اضمحلال کے آثار اور بھی زیادہ نمایاں ہو جائیں گے اگر علمی و عملی تحقیق جو حقائق آفرینش کے ساتھ رابطہ انسان سے بحث کرتی ہے۔ انسان کی مخفی قوتوں کو بھی بروئے کار لے آئے تو پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے جدید تمدن کی بنیادیں استوار اور مستحکم کر لی ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا اس بحث و نظر کی منزل میں یہ پہلا قدم ہے۔ میرے لئے یہ اطمینان کافی ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے قارئین کو قدرے سکون نصیب ہوگا اور وہ اس کے مندرجات سے مطمئن ہو جائیں گے۔ ارباب علم و تحقیق پر اس کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ اس موضوع سے متعلق خاطر خواہ نتیجہ اخذ کرنے کے لئے تحقیق و تدقیق از بس مفید ہے۔ اگر اس کتاب سے ان ہر دو نتائج میں سے ایک نتیجہ بھی برآمد ہوا تو میں سمجھوں گا کہ میری کوشش برگ و بار لے آئی ہے اور مجھے میری کوشش کا صلہ مل گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نیکو کاروں کو ان کے نیک اعمال کا اجر ضرور دیتا ہے۔

محمد حسین ہیکل

حواشی

۱۔ اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

آج ہم نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت مکمل کر دی اور اسلام کو تمہارے دین کے طور پر پسند فرما لیا۔ (سورہ مائدہ: آیت ۳)

۲۔ یہاں سورۂ مریم کی آیات ۳۰ تا ۳۴ کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے:

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۝ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ۝ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ۝ ذٰلِكَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ ۝

(جناب عیسیٰ علیہ السلام نے) فرمایا میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے اپنا پیغمبر بنایا ہے۔ اور اس نے مجھے بابرکت کیا ہے جہاں بھی میں ہوں اور اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب تک بھی میں زندہ رہوں۔ اور اس نے مجھے اپنی والدہ کا خدمت گزار بنایا ہے اور مجھے سرکش اور بدبخت نہیں کیا، اور مجھ پر میری پیدائش کے دن اور میری موت کے دن اور جس دن کہ میں دوبارہ زندہ کیا جاؤں گا، سلامتی ہی سلامتی ہے، یہ ہے صحیح واقعہ عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کا، یہی ہے وہ حق بات جس میں لوگ شک وشبہ میں مبتلا ہیں۔

۳۔ ڈاکٹر بٹلر اپنی تالیف "فتح العرب لمصر" (ص ۳۵) میں لکھتے ہیں: "اس سپہ سالار کا نام "خوریام" ہے جس کے القاب مختلف کتابوں میں یہ ہیں: شہربز، شہر براز، شراوز یہ وغیرہ، مگر یہ تینوں الفاظ (القاب) فارسی لفظ "شہرورز" کی تحریف ہیں جس کے معنی "الخنزیر البری للملک" کے ہیں یعنی "جنگل کا بہادر خنزیر"۔ شاہان ایران کی مہر پر اسی وجہ سے خنزیر کی تصویر کندہ ہوتی۔ انہی کی اقتدا آرمینیا نے بھی کی۔"

۴۔ شریعت محمدی میں تب تک شرط لگانے کی ممانعت وارد نہیں ہوئی تھی (بحوالہ تفسیر معالم التنزیل)

۵۔ ترجمان القرآن، ابوالکلام آزاد۔

۶۔ اصل کتاب میں اس کے بعد جو افسانہ طرازی کی گئی ہے، اس کو نقل کرنا مسلمانوں کے ذوقِ ایمانی پر زیادتی کے مترادف ہوگا۔

✻

Marfat.com

مقدمہ

(جو کتاب کے تیسرے ایڈیشن میں شائع ہوا)

پہلا ایڈیشن اس تیزی کے ساتھ بک گیا کہ مجھے گمان بھی نہ گزرا تھا۔ یہ ایڈیشن کل دس ہزار کی تعداد میں شائع ہوا تھا، جن کا ایک تہائی تو چھپنے کے دوران ہی فروخت ہو گیا تھا۔ باقی نسخے بھی چھپنے کے تین ماہ کے اندر اندر فروخت ہو گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قارئین نے اس کتاب کے مباحث میں غیر معمولی دلچسپی لی ہے۔ ان حالات میں یہ بہتر معلوم ہوا کہ ایک نظر ثانی کے ساتھ اس کتاب کو ایک بار پھر شائع کیا جائے۔

اس کتاب کے قبولِ عام کا سبب اول تو موضوع ہے۔ ہو سکتا ہے کہ موضوع کے پہلو بہ پہلو اس کی مقبولیت میں اسلوبِ نگارش اور اندازِ بیان کو بھی کچھ دخل ہو۔ طبع ثانی پر غور و خوض کے وقت یہ سوال ذہن میں آیا کہ آیا طبع دوم بھی بلا اضافہ و تخفیف طبع اول کی طرح منظر عام پر آئے یا متن پر نظر ثانی اور تنقیح و تصحیح کے بعد اس میں کچھ اضافے بھی کئے جائیں۔ بعض اشخاص نے (جن کے مشورے میرے نزدیک قابل قدر ہیں) رائے دی کہ طبع دوم، طبع اول کا مثنیٰ ہو، دونوں میں مطلق کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے تا کہ جن لوگوں کے پاس طبع اول یا طبع دوم کے نسخے ہوں ان میں یکسانیت پائی جائے اور اس صورت میں طبع دوم کے بعد آپ کو (مصنف کو) متن کتاب کی تنقیح اور اس میں اضافات کے لئے کافی وقت مل جائے گا۔ پہلے تو میں اس رائے کو قبول کرنے اور اس پر عملدر آمد کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا تھا لیکن بعد میں قدرے تامل کے بعد چند وجوہ سے میں نے کتاب پر نظر ثانی کا تہیہ کر لیا۔ نظر ثانی کا ایک سبب وہ ملاحظات ہیں جو استاد بزرگ شیخ محمد مصطفی مراغی نے طبع اول کے اجزاء کی اشاعت سے قبل ہی مجھے مرحمت فرما دیئے تھے۔

کتاب کی اشاعت کے بعد اربابِ قلم اور اصحابِ دانش نے روزناموں، ماہناموں اور ریڈیو پر تبصرے کئے۔ بعض تبصروں میں میری اس کوشش کو سراہا گیا جو میں نے اس کتاب کی تالیف پر صرف کی ہے حالانکہ میں اپنے آپ کو اس تعریف کا مستحق نہیں سمجھتا۔ اصحاب قلم اور ارباب دانش نے اپنے ملاحظات میں اس چیز پر زور دیا ہے کہ یہ کتاب جو آنحضرت ﷺ کی سیرت سے متعلق تالیف کی گئی ہے اگرچہ اس کا اسلوب پسندیدہ ہے، مگر یہ ہر قسم کی لغزش اور ہر طرح کے شبہ سے مبرا ہونی چاہئے۔ ان حضرات کے تبصروں میں جن

Marfat.com

امور کی جانب میری توجہ مبذول کرائی گئی ہے، یہ ہیں:

☆ کتاب میں بعض ایسے مسائل بھی زیرِ بحث آئے ہیں جو موضوعِ کتاب اور ان روایات سے جو اس کتاب میں منقول ہیں، ربط نہیں رکھتے۔

☆ بعض مطالب وضاحت طلب ہیں۔

☆ حروفِ جار کے استعمال میں زیادہ دقتِ نظر سے کام لینا چاہئے تھا۔

☆ بعض ایسے الفاظ کے بجائے جن کے مفہوم میں کچھ گنجلک ہے، دوسرے واضح الفاظ کا استعمال ضروری تھا۔

البتہ بعض ملاحظات میں ان مسائل سے متعلق ذکر آیا ہے جو اس کتاب سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وہ ملاحظات ہیں جن پر مجھے زیادہ غور وفکر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مجھے امید ہے کہ طبع اول کی بہ نسبت طبع دوم اربابِ دانش کے اس گروہ کے معیارِ اخذ وقبول پر پوری اترے گی۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ کتاب آغازِ بحث اور نقطہ آغاز کی حیثیت رکھتی ہے یا اسے پہلا قدم کہہ لیجئے جو میں نے سیرت رسول ﷺ کی منزل میں اٹھایا ہے اور جس کا سلوب نگارش خالصتہً علمی ہے۔ مجھے طبع اوّل پر نظر ثانی کی ضرورت ان ملاحظات کے باعث محسوس ہوئی جو تکمیل طباعت کے بعد مجھے موصول ہوئے۔ ان میں سے اکثر تالیف کے وقت میری نظر سے گزر چکے تھے۔ ان تبصروں میں جن مطالب کی جانب اشارے تھے میں نے ان سے بحث کی تا کہ ناقدین کو میں اپنی صحت نظر اور قوت استدلال سے مطمئن کر سکوں، اس مقصد کے تحت میں نے جن کتب کا مطالعہ کیا ان سے مجھے بعض ایسے نکات کا علم ہوا جو اس قابل ہیں کہ ان پر غور کیا جائے۔ ہر وہ شخص جو سیرت رسول ﷺ پر قلم اٹھانا چاہتا ہے اسے ان نکات پر ضرور توجہ کرنی چاہئے۔ یہی میری خوش نصیبی ہے کہ جن نکات کی جانب دوسروں نے توجہ دلائی تھی وہ پہلے ہی سے میرے پیشِ نظر تھے۔ مجھے مسرت ہے کہ میں اب ان نکات کا بیان شرح وبسط کے ساتھ کر رہا ہوں۔ میرے نزدیک یہ تمہیدی بحث جو تاریخ کی بزرگ ترین شخصیت یعنی خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی حیات مبارکہ سے تعلق رکھتی ہے، نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ میں نے طبع دوم کے مقدمہ میں چند ملاحظات کو جو میرے اندازِ تحقیق پر کئے گئے ہیں موضوعِ بحث قرار دیا ہے اور کتاب کے آخر میں دو فصلوں کا اضافہ بھی کر دیا ہے۔ ان فصلوں میں ان مطالب کی شرح ہے جن کا ذکر اجمالاً طبع اول میں کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ نظر ثانی میں بعض تنقیدات کی رعایت سے کتاب کے چند مطالب کی تشریح بھی کی اور کچھ اضافے بھی کئے۔

پہلے میں ایک رسالہ کے سلسلہ میں کچھ عرض کرتا ہوں جو مصر کے ایک مصنف نے اس توضیح کے ساتھ میرے پاس بھیجا تھا کہ ''آپ کی کتاب پر جو تبصرہ کیا گیا ہے یہ اسی کا ترجمہ ہے، میں اسے جرمن مستشرقین کے رسالے میں اشاعت کے لئے بھیج رہا ہوں۔'' میں نے عربی روزناموں میں اس رسالہ کی اشاعت

Marfat.com

مناسب نہیں سمجھی، اس خیال سے کہ ان میں ناپسندیدہ قسم کی نکتہ چینیاں ہوتی ہیں میں نے انتظار کیا کہ مصنف خود ہی اس کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کرے، میں نے اس کے نام سے صرفِ نظر کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جب وہ شخص اپنے اعتراضات کا جواب اس کتاب میں پڑھے گا تو اسے اس رسالہ کو اپنے نام منسوب کرتے ہوئے شرم محسوس ہوگی۔

رسالہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ''حیاتِ محمد ﷺ'' میں میرا اسلوبِ تحقیق جدید اصول کے مطابق نہیں ہے۔ اس وجہ سے کہ میں نے عرب مصنفین پر اعتماد کیا اور انہی کی تصنیفات پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھی ہے۔ جرمن مستشرقین مثلاً ژیل، گلدزہر وغیرہ کو اور ان کے اخذ کئے ہوئے نتائج کو نظرانداز کر دیا۔ اس کے علاوہ مصنف نے قرآن کو تاریخی اور ناقابل تردید سند قرار دیا ہے حالانکہ جرمن مستشرقین کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد قرآن میں تحریف کی گئی ہے اور جن باتوں میں تحریف کی گئی، ان میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا نام بھی شامل ہے۔ قرآن میں قثم یا قثامہ نام تھا۔ اس میں تبدیلی کے بعد محمد ﷺ نام نے اس کی جگہ لی تاکہ اس آیت کو

وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ

دلیل ٹھہرا سکیں اور یہ دعویٰ کر سکیں کہ انجیل میں ان کا نام تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے ظہور کی خبر دی تھی۔ رسالہ کا مصنف کہتا ہے کہ مستشرقین کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر خدا (ﷺ) پر مرگی کے دورے پڑتے تھے اور جس چیز کے متعلق وہ کہتے تھے کہ یہ وحی کے طور پر نازل ہوئی ہے وہ مرگی کا اثر تھا۔ کبھی کبھی حضور ﷺ پر مرگی کے عوارض دباؤ ڈالتے تھے۔ غش آتا تھا اور جسم پسینے پسینے ہو جاتا تھا، ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگتے تھے اور منہ سے کف جاری ہو جاتا، انہیں جب ہوش آتا تھا تو کہتے تھے کہ خدا نے مجھ پر وحی بھیجی ہے اور جس چیز کو وہ وحی سمجھتے تھے، اپنے پیروؤں کو پڑھ کر سناتے تھے۔

اگر مذکورہ رسالہ کا مصنف مصری اور مسلمان نہ ہوتا تو میں اس کے اعتراضات کی جانب توجہ بھی نہ کرتا اور مجھے ان کی تردید کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوتی۔ اگر وہ کوئی مغربی مستشرق یا عیسائی مبلغ ہوتا تو میں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتا کہ جو چاہے سو کرے۔ میں نے اس کتاب کے مقدمہ میں اس گروہ سے متعلق جو کچھ لکھ دیا وہی کافی ہے لیکن رسالہ کا مصنف ایک مسلمان نوجوان ہے اور اس گروہ سے تعلق رکھتا ہے جو مستشرقین کی ہر بات کو بلاچون وچرا تسلیم کر لیتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اسے انکشافِ حقیقت اور تحقیقِ حق سے موسوم کرنے کی جرأت بھی کر بیٹھتا ہے۔ یہاں میرا روئے سخن اس گروہ کی طرف ہے۔ میں اسے ان غلطیوں سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں جو اس باب میں مستشرقین سے سرزد ہوتی رہتی ہے۔ ان مستشرقین میں سے بعض نے تحقیق میں بے غرضی اور بے نفسی سے بھی کام لیا ہے لیکن ان کی غلطیوں کا ایک سبب تو یہ ہے کہ یہ لوگ زبانِ عربی کے رموز سے پورے طور پر واقف نہیں ہیں۔ دوسرا یہ کہ یہ لوگ ایک دین یا تمام ادیان کے

Marfat.com

اصول کو متزلزل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ کام افراط اور مبالغہ کا ہے اور بہتر یہی ہے کہ دانشمند اس سے اجتناب کریں۔ اسی افراط کا نتیجہ ہے کہ بعض عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں اور بعض یہ ستم ڈھاتے ہیں کہ انہیں مجنوں قرار دیتے ہیں۔ یہ صورتحال نتیجہ ہے اس قضیے کا جو یورپ میں حکومت اور مذہب کے درمیان پایا جاتا ہے اور حکماء اور مذہبی پیشوا ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ اپنے حریف کا اثر و اقتدار ختم کر کے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تعمیر کریں لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ اس مخمصے سے کوسوں دور ہے۔ مسلمان محققین کو چاہئے کہ وہ کبھی ہوس اقتدار کے دام میں گرفتار نہ ہوں کیونکہ اس سے علمی تحقیق پر زد آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انہیں مغربی محققین کی اس تحقیق پر بھی نئے سرے سے نظر ڈالنی چاہئے جسے وہ اپنی دانست میں حق اور قولِ فصیل سے تعبیر کرتے ہیں۔ مغربی محققین کی تحقیق پر مذہب و سائنس کی کشمکش اور ان کے ذاتی وانفرادی رجحانات کا اثر غالب ہے اور وہ راہِ حق سے منحرف ہیں۔

رسالہ مذکورہ میں مصری نوجوان نے جو کچھ تحریر کیا ہے میں یہاں اجمالاً اس کا ذکر کرتا ہوں۔ اس سے یہ ظاہر ہوگا کہ مغربی محققین نے جو اندازِ تحقیق اختیار کیا ہے اسے مشتبہ اور مشکوک نگاہوں سے دیکھنا چاہئے۔ مصری نوجوان نے پہلا اعتراض مجھ پر یہ کیا ہے کہ میں نے عربی اور اسلامی تصانیف اور ان کے مآخذ پر اپنی کتاب کی اساس کیوں رکھی؟ مجھے اس سے انکار نہیں، تالیف کے دوران میں مستشرقین کی بعض کتب جو کتاب کے ماخذات کی فہرست میں درج ہیں، میری نظر سے گزریں، فی الجملہ عربی تصانیف ہی میرے کلام کی اساس ہیں۔ اس موقع پر اس چیز کی وضاحت ضروری ہے کہ مستشرقین نے بھی اپنے مباحث کے سلسلہ میں انہی عربی تصانیف سے استفادہ کیا ہے اور انہی پر ان کی کوششوں کا مدار ہے۔ عربی کتب کو ماخذ و منبع قرار دینا ایک قدرتی بات ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم وہ اولین کتاب ہے جس میں پیغمبر اسلام ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہر وہ شخص جو اس موضوع پر کچھ قلمبند کرنا چاہتا ہے، اس نے قرآن حکیم کو اپنے مباحث کی بنیاد قرار دیا ہے۔ نولاکی، گلدزہر، سپرنگر، میور اور دوسرے مستشرقین نے اپنی تصانیف میں کتب عربی سے استفادہ کیا ہے چنانچہ میری تالیف کی بنیاد بھی انہی عربی ماخذ پر ہے۔ میں نے ان کتب کے مضامین و مطالب پر مستشرقین کی روش کے مطابق آزادانہ بحث کی ہے اس کے ساتھ میں نے متعصب عیسائیوں کی ان کتب سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جو ان مستشرقین کے پیش نظر رہی ہیں۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص مجھ پر یہ اعتراض کرے کہ میں نے مستشرقین کے نتائج غور و فکر پر اعتماد کیوں نہیں کیا اور ان کی مخالفت پر کیوں کمر باندھی تو اس کا یہ اعتراض بے معنی، بے موقع اور بے بنیاد ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ معترض مجھے علمی جمود کی دعوت دے رہا ہے جو پستی اور بے وقعتی کے اعتبار سے کسی صورت میں بھی ذہنی و روحانی جمود سے کم نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مستشرقین جمودِ علمی کی دعوت کسی قیمت پر نہیں دیں گے کیونکہ اس صورت میں دینی جمود پیدا ہوگا جو کہ وہ مبتذل صفت ہے جسے میں ان اشخاص کے لئے جو علمی انداز پر تاریخی

مباحث قلمبند کرنا چاہتے ہیں، ہرگز مناسب نہیں سمجھتا۔

جس وقت بھی مجھے یہ اطلاع ملتی ہے کہ اس موضوع پر دوسروں کے مباحث بھی ہیں تو میں انہیں اپنی تحقیق و تدقیق کا موضوع قرار دیتا ہوں۔ میرے خیال میں دوسروں کے لئے بھی یہی روش مناسب اور موزوں رہے اگر دوسروں کی رائے کی اصابت اور تحقیق کی صحت، دلائل سے ثابت ہوجائے تو فبہا ورنہ خود اس سلسلہ میں دریافت و تحقیق کی طرح ڈالی جائے، اس حد تک کہ کوئی کور کسر باقی نہ رہے۔ میں ان نوجوانوں اور مسلمانوں کو جو مستشرقین کے اندازِ تحقیق پر دل و جان سے فریفتہ ہیں، یہی دعوت دیتا ہوں اور اسی پر میرا عمل بھی ہے اگر میں اس سلسلہ میں راہِ راست پر ہوں اور میں نے جو رائے قائم کی ہے وہ درست ہے تو مجھے اس کا اجر ملے گا اگر کسی جگہ مجھے راہ راست کی توفیق نصیب نہیں ہوئی اور مجھ سے کسی غلطی کا ارتکاب ہوا ہے تو میں اس میں معذور ہوں اس لئے کہ میں نے نیک نیتی کے ساتھ حق طلبی اور دریافت حقیقت کی کوشش کی ہے۔

اس دعوے کی دلیل کہ بعض مستشرقین اصولِ دین کی تخریب میں افراط کی راہ اختیار کرتے ہیں، رسالہ مذکور کے اس نکتہ سے ملتی ہے جو مصنف بیان کرتا ہے یعنی یہ کہ مستشرقین کی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن تاریخی سند اور ناقابل تردید دستاویز نہیں ہے۔ پیغمبر خدا ﷺ کی وفات کے بعد ابتدائے اسلام میں اس کے اندر تحریف کی گئی اور اس میں بعض آیات کا اضافہ محض دینی یا سیاسی اغراض سے ہوا ہے۔ میں دینی اعتبار سے رسالہ کے مصنف سے بحث میں الجھنا نہیں چاہتا اور اس بنا پر کہ وہ مسلمان ہے یہ بھی کہنا نہیں چاہتا کہ اصول اسلام کے مطابق:

لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ (سورہ حم: ۴۲)[1]

اس لئے کہ مصنف رسالہ مستشرقین کا اندھا معتقد ہے اور ان کی ہمنوائی میں اس عقیدہ کا حامل ہے کہ قرآن، محمد (ﷺ) کی تصنیف ہے لیکن اس کے باوجود اس مصنف قرآن (محمد مصطفی ﷺ) کو یہ یقین تھا کہ خدا نے اسے وحی کے ذریعہ اس پر نازل کیا ہے (جیسا کہ بعض مستشرقین کہتے ہیں) یا یہ کہ آنحضرت ﷺ کو قرآن کی منزل من اللّٰہی پر یقین تھا یا یہ کہ اس کے واسطے سے اپنی رسالت کا اثبات انہیں مقصود تھا (جیسا کہ بعض دوسرے مستشرقین کا بیان ہے) میں رسالہ مذکور کے مصنف سے خود اسی کی زبان میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں اس لئے کہ اس شخص کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے جو آزادئ افکار کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں اور صرف وہی بات تسلیم کرتے ہیں جو از روئے علم و تحقیق قطعیت کے ساتھ ثابت ہوجائے۔

رسالہ مذکور کا مصنف مستشرقین اور ان کی باتوں پر اعتماد رکھتا ہے۔ بعض مستشرقین قرآن کے متعلق وہی رائے رکھتے ہیں جس کا ذکر اس مصنف نے کیا ہے لیکن جن اغراض کے تحت اس نے یہ رائے قائم کی ہے ان سے کون ناواقف ہے! خود علم اس قسم کے اصحابِ اغراض کی دسیسہ کاری سے بیزار ہے۔ یہ لوگ اپنے زعم میں یہ کہتے ہیں کہ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنۢ بَعْدِي اسْمُهُۥٓ أَحْمَدُ[2] جو سورۂ صف کی چھٹی آیت ہے۔

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد قرآن میں شامل کی گئی ہے اور اس کا سوائے اس کے اور کوئی مقصد نہ تھا کہ جو کتب مقدسہ قرآن سے پہلے موجود تھیں ان سے آنحضرت ﷺ کی نبوت کا اثبات ہوجائے۔

اگر مستشرقین انصاف پسند اور بے غرض ہوتے تو وہ ایسی بات جس سے تورات و انجیل میں تحریف اور قرآن حکیم کی تشکیک کا پہلو نکلتا ہے، ہرگز نہ کہتے۔ اگر علم ہی مقصود بالذات ہوتا اور اس کے سوائے اور کوئی غرض نہ ہوتی تو کم از کم قرآن اور دیگر کتب مقدسہ کو ایک نظر سے دیکھتے اور قرآن کی تقدیس کے قائل بھی ہوتے۔ اس صورت میں جبکہ دوسری آسمانی کتب کا ذکر بھی قرآن حکیم میں تھا اس سے انکار کی وجہ بھی کیا ہوسکتی ہے! انہیں چاہئے تھا کہ وہ جو عقیدہ تحریف قرآن کے بارے میں رکھتے ہیں وہی دوسری آسمانی کتب کے بارے میں رکھتے اور فصاحت کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرتے کہ تورات و انجیل میں بھی سیاسی اور مذہبی اغراض کے تحت تحریف کی گئی ہے۔ اس سے اس امر کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ تحریف قرآن کے متعلق تورات و انجیل سے ان کا استدلال بے بنیاد ہے کیونکہ مسلمانوں کو اپنی سطوت کے دور میں جبکہ ان کی حکومت کی بنیادیں مستحکم ہوچکی تھیں اور قیصر روم کی گردن بھی اسلام کے آستانہ پر جھک گئی تھی، اس بات کی چنداں احتیاج نہ تھی کہ وہ تورات و انجیل سے اپنے دین کی صداقت پر حجت و برہان پیش کریں۔ اس مقصد کے لئے انہیں کیا ضرورت تھی کہ وہ قرآن میں تحریف پر اتر آئیں۔ منصفانہ علمی تحقیق کا تقاضا ہے کہ ہم یہ روش استدلال اختیار کریں اس کے برخلاف تورات و انجیل اور قرآن حکیم کے درمیان خطِ فصل کھینچنا اور تورات و انجیل کے مقابلہ میں قرآن کریم کی تقدیس کا قائل نہ ہونا ایسی بات ہے جسے اہل علم جائز نہیں سمجھتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ قرآن میں تحریف خود مسلمانوں نے کی تاکہ تورات و انجیل سے اسلام کی صحت پر دلیل قائم کریں تو یہ ایسی بات ہے جسے تاریخ قبول نہیں کرسکتی اور نہ یہ چیز منطق کی کسوٹی پر پوری اترتی ہے۔

اکثر متعصب مستشرقین نے بزعم باطل تحریف قرآن کی ہوائی اڑائی ہے اور بہت سوں نے دبی زبان سے اس امر کا اعتراف بھی کیا ہے کہ موجودہ قرآن وہی ہے جس کی تعلیم آنحضرت ﷺ نے اپنی زندگی میں مسلمانوں کو دی تھی اور اس میں کوئی تحریف یا تغیر نہیں ہوا۔ انہوں نے جمع قرآن اور سورتوں کی ترتیب سے متعلق بھی رائے زنی کی ہے لیکن یہ چیز ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

جن مسلمانوں کو علومِ قرآنی سے شغف ہے، انہوں نے ان تنقیدات کی تردید اور ان پر سختی کے ساتھ لے دے کی ہے۔ ہم یہاں قرآن کے بارے میں بعض مستشرقین کے اقوال نقل کرتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ اقوال رسالہ مذکور کے مصنف اور اس کے ہمنواؤں کے اطمینان کا موجب ہوں۔ اس بارے میں مستشرقین کے قلم نے بہت کچھ جولانیاں دکھائی ہیں لیکن ہم ان سے قطع نظر صرف سر ولیم میور کی کتاب ''حیاتِ رسول'' کے اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ قرآن کی تحریف وتغیر کے قائلین پر یہ حقیقت واضح ہوجائے کہ اس افترا پردازی سے انہوں نے نہ صرف اپنے اوپر بلکہ تاریخ پر بھی ظلم کیا ہے۔ میور عیسائی ہے اور عیسائی بھی غالی

Marfat.com

قسم کا۔ اگر اسے پیغمبر اسلام ﷺ اور قرآن کے بارے میں تنقید و تنقیص کا کوئی موقع ملتا ہے تو وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے اور اس سلسلہ میں حتی المقدور کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں رکھتا لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن سے متعلق سر ولیم میور نے اس رائے کا اظہار کیا ہے:

''مقدس وحی ارکان اسلام کی اساس ہے۔ اس کے کسی نہ کسی حصہ کی تلاوت پنج وقتہ نمازوں میں وجوب کا درجہ رکھتی ہے۔ نماز کے بعض ارکان میں اس مقدس وحی کی تلاوت کا التزام فرض ہے اور بعض میں مسنون۔ ابتدائے اسلام سے مسلمان اس کی قطعیت پر متفق رہے ہیں۔ احکام یعنی اوامر و نواہی کا استنباط و استخراج بھی وہ اسی سے کرتے ہیں۔

''تلاوت آیات، اجر و ثواب کا موجب بھی سمجھی جاتی ہے۔ سابقون الاوّلون میں حفظ قرآن کا جذبہ کارفرما تھا۔ ہر مسلمان کچھ نہ کچھ ازبر یاد کر لیتا اور یہی چیز شرف و امتیاز کی سند تھی۔ عرب میں جہاں اشعار، انساب اور روایات نوکِ زبان ہوتی تھیں اور ایامِ جاہلیت سے جہاں اس قسم کے حفاظ بکثرت تھے، آیاتِ قرآنیہ کا حفظ کر لینا کچھ دشوار نہ تھا۔ عربوں کی قوتِ حافظہ میں حیرت انگیز اضافے کا سبب یہ بھی تھا کہ نوشت وخواند سے ناآشنائی کے باعث انہیں سب کچھ ذہن میں محفوظ رکھنا ہوتا تھا۔ بعض صحابہ کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ انہیں آیاتِ قرآنیہ نزولی ترتیب کے ساتھ یاد تھیں اور وہ جب چاہتے، ان کا آسانی سے اعادہ کر سکتے تھے۔

''اس غیر معمولی قوت حافظہ کے باوجود ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ محض اس ایک قوت کی بدولت قرآن شریف کی تدوین عمل آئی۔ ہمارے پاس ایسے دلائل و شواہد بھی ہیں جن کی بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ صحابہؓ نے اپنے ہادی ﷺ کی حیات ہی میں قرآن کے متفرق اجزاء کی جمع و ترتیب کر لی تھی اور اس طرح پورے قرآن کو ضبط تحریر میں لے آئے تھے۔

''یہ بھی ثابت ہے کہ عہد نبوت سے قبل اہل مکہ نوشت وخواند سے اچھا خاصا مس رکھتے تھے۔ غزوۂ بدر میں مکہ کے جو لوگ اسیر ہوئے تھے، ان میں بعض ایسے نادار بھی تھے جو زرِ فدیہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے مگر تھے پڑھے لکھے۔ آنحضرت ﷺ نے ایسے اسیروں کی رہائی کی شرط یہ قرار دی کہ وہ زرفدیہ نہ دے سکنے کی صورت میں مدینہ کے مسلمانوں کو پڑھنے لکھنے کی تعلیم دیں چنانچہ اس صورت پر عمل کیا گیا۔ اس طرح بہت سے اہل مدینہ لکھ پڑھ گئے۔ مدینہ کے باشندے اہل مکہ سے تعلیم اور تہذیب و تمدن میں بڑھے ہوئے نہیں تھے تاہم یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ ان میں سے کثیر تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جو قبولِ اسلام سے قبل نوشت وخواند سے قطعاً بے بہرہ نہ تھے۔ اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ آیات جو انہیں حفظ تھیں، انہیں وہ ضبط تحریر میں بھی لائے ہوں گے۔

''علاوہ بریں یہ حقیقت ہے کہ آنحضرت ﷺ نومسلم قبائل میں چند اصحاب کو قرآن اور دینی مسائل کی تعلیم کے لئے مامور فرما دیا کرتے تھے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ جو اصحاب اس خدمت کے لئے متعین کئے

Marfat.com

جاتے تھے، ان کے پاس دینی مسائل تحریری شکل میں موجود ہوتے تھے۔ یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی وہ آیات جو ارکانِ اسلام سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کی تلاوت نمازوں میں کی جاتی ہے وہ بھی ان کے پاس مرقوم و مسطور ہوتی تھیں۔ قرآن کریم میں بھی اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ اس کا نسخہ کتابت شدہ صورت میں موجود تھا۔ نیز کتب سیر سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے مثلاً جہاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا واقعہ بیان کیا گیا ہے وہاں یہ بھی مذکور ہے کہ ان کی ہمشیرہ کے پاس سورۂ طٰہٰ کا ایک نسخہ بھی تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہجرت سے تین یا چار سال قبل اسلام قبول کیا تھا۔ یہ اس چیز کا ثبوت ہے کہ ہجرت سے قبل بھی جبکہ مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی اور انہیں کفار کی ایذا رسانیوں کا ہدف بھی بننا پڑ رہا تھا مسلمان کتابت سے ناآشنا نہ تھے پھر جب عہد نبوت میں دورِ عروج آیا تو اس وقت قرآن کریم کے کتنے کچھ نسخوں کی کتابت عمل میں نہ آئی ہوگی اور خصوصیت سے اس خیال کے تحت کہ قرآن کریم کی حیثیت ایک ضابطہ قانون کی بھی تھی اور یہ بھی ضروری تھا (تبلیغی نقطہ نظر سے) کہ اس کے نسخے دوسرے مقامات کو بھی بھیجے جائیں۔

''حضرت محمد مصطفی ﷺ کی حیات بابرکات میں قرآن کریم مسطور بھی رہا اور محفوظ بھی۔ آپ کی پردہ پوشی کے ایک سال بعد تک یہی صورت رہی کہ اس کے مختلف اجزاء کتابت شدہ موجود تھے اور ان کی مطابقت اس قرآن سے ہوتی تھی جو مسلمانوں کے سینوں میں محفوظ تھا۔ عہد نبوت میں یہ دستور تھا کہ کسی کو اگر متن میں کچھ شبہ عارض ہوتا تھا تو وہ براہ راست رسول کریم ﷺ سے رجوع کرتا اور اس کا شبہ رفع ہو جاتا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اس معاملہ میں آنحضرت ﷺ سے رجوع کیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد اگر کوئی بات پیدا ہوتی تو کتابت شدہ اجزاء سے یا صحابہ رضی اللہ عنہم اور کاتبین وحی سے رجوع کے بعد اطمینان کی صورت پیدا کر لی جاتی تھی۔

''غزوۂ یمامہ میں جو عہد صدیقی میں فتنہ ارتداد کے انسداد کے سلسلہ میں پیش آیا، کافی خونریزی ہوئی تھی۔ اس غزوہ میں بہت سے ایسے مسلمان جو حفاظِ قرآن تھے، شہید ہو گئے تھے۔ اس حادثہ سے متاثر ہو کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن کا مشورہ دیا تھا، اس خطرہ کے پیش نظر کہ مبادا رہے سہے حفاظ بھی کسی غزوہ میں جام شہادت نوش کر لیں تو قرآن اپنی الہامی ترتیب کے ساتھ باقی نہ رہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ قبول کیا اور کلام الٰہی کی جمع و ترتیب کی غرض سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا اور یہ اس لئے کہ عہد نبوت میں زید رضی اللہ عنہ کاتبان وحی کے سردار تھے۔ جب یہ آئے تو ان سے کہا کہ آپ رضی اللہ عنہ عقیل و فہیم انسان ہیں، ہم میں سے ہر ایک کو آپ رضی اللہ عنہ کی ذہانت پر اعتماد ہے۔ آپ نے عہد نبوت میں آنحضرت ﷺ کی ہدایات کے مطابق وحی الٰہی کی کتابت کی ہے اس لئے آپ کو چاہئے کہ آپ پورے حزم و احتیاط کے ساتھ قرآن کریم کی جمع و ترتیب فرمائیں۔

''حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہ بات سنی تو حیرت زدہ رہ گئے، ان کے ذہن میں یہ الجھن پیدا ہوئی

Marfat.com

کہ آیا یہ کام جو مجھے سپرد کیا جارہا ہے مشروع بھی ہے یا نہیں؟ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اپنے عہد میں اس کی تحریر و کتابت اور جمع و ترتیب کا اہتمام نہیں کیا تھا اور نہ کسی کو اس کام پر آمادہ کیا تھا، بہرحال حضرت زید رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اصرار سے اس کام پر آمادہ ہو گئے اور بکھرے ہوئے اجزاء کی ترتیب کا آغاز کیا۔ آیات اور سورتیں درختوں کے پتوں پر تھیں یا سنگ مرمر کی تختیوں پر، لوگوں کے حافظے میں تھیں یا چمڑوں اور ہڈیوں پر۔

''انہیں حضرت زید رضی اللہ عنہ نے خوش اسلوبی کے ساتھ یکجا کیا، دو تین سال میں یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس ترتیب کے بعد جو نسخہ تیار ہوا، یہ حقیقت میں وہی نسخہ ہے جس کی تلاوت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کے حضور بھی کی تھی۔

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ مرتبہ نسخہ اپنی بیٹی اُم المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی تحویل میں دے دیا تھا اور اس تحویل کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسے آئندہ کے لئے محفوظ رکھیں۔ عہد فاروقی میں یہ نسخہ صحیح اور مکمل سمجھا جاتا تھا۔

''حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اہتمام جمع و ترتیب سے قبل چند آیات میں کچھ تو اختلاف قرأت کے باعث تھا اور کچھ نسخ کے سبب۔ اس سے بعض مسلمانوں کو یہ شبہ گزرا کہ قرآن تو ایک ہی ہے پھر اختلاف کیا معنی؟ عہد عثمانی میں حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ آرمینیا اور آذربائیجان کے معرکوں میں شریک ہوئے تو انہیں پتہ چلا کہ بعض شامی اور عراقی مسلمان بعض آیات کی مختلف طریقوں سے قرأت کرتے ہیں۔ اس سے حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کو تشویش ہوئی۔ آپ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ اس بارے میں مسلمانوں کی نگہداشت ضروری ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی یہود و نصاریٰ کی طرح قرآن کریم میں تغیر و تحریف کے مرتکب ہونے لگیں۔

''اس پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی خدمات حاصل کیں اور ان کے ساتھ دو اور فہیم و عقیل اشخاص کو ان کی امداد کے لئے معین کیا۔ اس مقصد کے لئے وہ نسخہ جو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی تحویل میں دیا تھا، حضرت زید رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقائے کار کے سپرد کیا۔ نظرثانی کے وقت قریشی معاونین نے ایک ایک آیت کا پہلے نسخہ سے مقابلہ کیا جہاں حضرت زید رضی اللہ عنہ کو اپنے رفقاء سے اختلاف ہوتا تو بات حضرت زید رضی اللہ عنہ ہی کی مانی جاتی۔ نظرثانی کے لئے قریشیوں کے تقرر کا مقصد یہ تھا کہ قرآن انہی کے لب و لہجہ میں نازل ہوا تھا۔ اگرچہ یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ قرآن سات مختلف لہجوں اور قرأتوں[1] میں نازل ہوا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ نظرثانی کے بعد اس نسخہ کی نقلیں ان تمام ملکوں میں بھجوا دی گئیں جو اسلام کے زیرنگیں آچکے تھے۔ خلیفہ ثالث کے حکم سے قرآن کریم کے دوسرے تمام نسخہ جات نذرِ آتش کر دیئے گئے اور یہ اس لئے کہ ان میں اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے نسخہ میں اختلاف تھا۔[2] اس کارروائی کے بعد اصل نسخہ اُم المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو واپس کر دیا گیا۔

Marfat.com

''مختصر یہ ہے کہ یہی قرآن کریم کا نسخہ آج قائم و دائم ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے اتنا اہتمام کیا گیا ہے کہ دنیا میں آج جتنے بھی نسخے پائے جاتے ہیں، ان میں سر موفرق نہیں ہے حالانکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ عہد نبوت سے ۲۵ سال بعد جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جام شہادت نوش کیا تو اس کے نتیجہ میں جو حادثات رونما ہوئے، ان سے اسلامی وحدت کا شیرازہ منتشر ہو گیا تھا جس کے اثرات آج تک پائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود مختلف فرقے قرآن کریم کے بارے میں متفق رہے ہیں۔

''صرف اس بات سے کہ مسلمان صدہا سال سے قرآن کریم کے ایک ہی نسخہ پر اعتقاد جمائے ہوئے ہیں، یہ چیز قطعیت کے ساتھ ثابت ہو جاتی ہے کہ آج جو قرآن ہمارے پاس ہے، یہ وہی ہے جس کی جمع و ترتیب کا اہتمام عہد عثمانی میں ہوا تھا۔ مجھے وثوق ہے کہ قرآن کے ماسوا دنیا میں اور کوئی کتاب ایسی نہیں جس کا متن تیرہ سو سال سے ہر قسم کی تحریف اور ہر انداز کے الحاق سے مبرا رہا ہو۔ قرأت میں اختلاف شاذ ہی کہیں ہے۔ اگر کہیں کوئی اختلاف تھوڑا بہت ہے بھی تو وہ متحرک الفاظ کے تلفظ یا اوقاف تک محدود ہے اور یہ وجوہِ اختلاف وہ ہیں جو بعد کی پیداوار ہیں، عثمانی دور کے قرآن سے ان کا کوئی علاقہ نہیں۔

''جب یہ امر ثابت ہو گیا کہ جو قرآن آج ہمارے پاس ہے نسخہ عثمانی کا متن ہے اور اس میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا، دیکھنا یہ ہے کہ عثمانی نسخہ قرآن حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے نسخہ مدونہ سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ معتبر اور قدیم روایات سے کوئی ایسی بات نہیں نکلتی جس کی بنا پر یہ شبہ ہو کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے کسی ذاتی مفاد کے پیش نظر قرآن میں تحریف کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اہل تشیع کے ایک گروہ نے بعد میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ انہوں نے بعض وہ آیات جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب میں تھیں، خذف کر دی ہیں لیکن عقل سلیم اسے تسلیم نہیں کرتی کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ جمع قرآن کے وقت تک علویین اور امویین میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا تھا۔ اسلام کا شیرازہ بکھرا نہیں تھا اور نہ کوئی بات ایسی وقوع میں آئی تھی جس سے افتراق کے چشمے پھوٹ نکلیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی کسی قسم کا کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ ان حالات میں یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے کوئی ایسا قدم اٹھایا ہو جسے کسی صورت میں بھی مستحسن نہ قرار دیا جا سکے؟

''ایسے متعدد اصحاب اس وقت تک بقید حیات تھے جنہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کی زبانی قرآن کریم سنا تھا۔ اگر قرآن کریم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل سے متعلق کچھ آیات ہوتیں تو شیعیان علی رضی اللہ عنہ کو جن کی تعداد کچھ کم نہ تھی ان کا متن از بر یاد ہوتا۔ ان دونوں صورتوں میں ''حذف آیات در مناقب علیؑ'' کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے علاوہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد شیعیان علی رضی اللہ عنہ کا اثر و اقتدار تھا اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی حمایت میں بھی پیش پیش تھے۔ یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ شیعیان علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد اقتدار میں بھی ایسے قرآن کو صحیح تسلیم کر لیا ہو جس سے خود ان کے ممدوح و مقتداء کے فضائل

کا باب خارج کر دیا گیا ہو، واقعات تو یہ بتاتے ہیں کہ شیعیان علیؓ بھی وہی قرآن پڑھتے تھے جو ان کے مخالفین کی تلاوت و قرأت میں داخل تھا۔ ان میں سے کسی کو بھی قرآن کے متن پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں یہ حکم صادر کیا تھا کہ قرآن کریم کے نسخے زیادہ تعداد میں دیار و امصار میں بھیجے جائیں۔ یہ روایت بھی مشہور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود بھی قرآن کریم کے چند نسخوں کی کتابت فرمائی تھی۔

''حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے فسخ بیعت کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جمع قرآن کے بعد باقی نسخوں کے اتلاف کے احکام جاری کئے تھے لیکن یہ جو کچھ ہوا محض اس لئے ہوا کہ فسخ بیعت کے عاملین اپنی دانست میں قرآن کے نسخوں کے اتلاف کو ناجائز سمجھتے تھے۔ یہ کسی نے بھی نہیں کہا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم میں تحریف کی ہے کیونکہ اگر وہ اس قسم کا دعویٰ کرتے تو اس کا نقص ظاہر تھا البتہ بعد میں اہل تشیع نے اپنی مقصد برآری کے لئے یہ دعویٰ ضرور کیا۔

''مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر ہم قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کا نسخہ عثمانی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے مدونہ نسخہ کے مطابق تھا۔ اس نسخہ میں حضرت زید رضی اللہ عنہ نے قرأۃ کی مختلف صورتوں میں سے صرف قریش کے لہجے کی رعایت رکھی تھی۔

''بایں ہمہ یہ سوال غور طلب ہے کہ آیا حضرت زیدؓ نے جو قرآن جمع کیا تھا یہ اسی قرآن کے مطابق تھا جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوا تھا یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نسخہ زید رضی اللہ عنہ صحت و جامعیت کے اعتبار سے ہر حیثیت میں مکمل اور قابل اعتماد تھا۔ اس کی صراحت حسب ذیل امور سے ہوتی ہے:

''اولاً یہ کہ جمع قرآن کا سلسلہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سرپرستی اور نگرانی میں شروع ہوا (تمام صحابہ رضی اللہ عنہم ان سے اس بارے میں متفق تھے)۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے مخلص اور وفاشعار متبع تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ قرآن صحیفہ سماوی ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کامل بیس سال آنحضرت ﷺ کی صحبت کا شرف نصیب رہا تھا۔ ان کے طور طریق میں بلا کی سادگی، حکمت اور بے لوثی تھی۔ اپنے دورِ خلافت میں انہوں نے انہی خصوصیات کی روشنی میں فرائض منصبی سرانجام دیئے۔ ان کا پختہ ایمان تھا کہ قرآنی آیات منزل من اللہ ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس کی جامعیت میں کلام کیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اسی عقیدہ پر قائم تھے۔ ان کے عہد خلافت میں قرآن کی جمع و ترتیب کا کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس دور کے دیگر مسلمان بھی عقیدہ کی پختگی میں بڑھے چڑھے ہوئے تھے۔ یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ تمام لوگ جو آیات قرآنی کی جمع و ترتیب میں مدد دیتے، جو ہڈیوں اور درختوں کے پتوں پر لکھی ہوئی آیات حضرت زید رضی اللہ عنہ کے پاس لے جاتے، ایک ہی درجے میں آتے ہیں ان سب کی یہ دلی خواہش تھی کہ جو آیات آنحضرت ﷺ پڑھ کر سنایا کرتے تھے، انہیں احاطہ تحریر میں لے آئیں۔ انہیں قرآن سے خاص

Marfat.com

شغف تھا وہ ہمہ وقت قرآنی آیات کے حفظ و بقا سے سروکار رکھتے تھے۔ قرآن کریم سے زیادہ انہیں اور کوئی چیز عزیز نہ تھی۔ اس کا احترام وہ دل و جان سے کرتے تھے۔ قرآن کریم ان لوگوں کو جو خدا پر جھوٹ باندھتے اور وحی کے کسی حصہ کو پردۂ اخفا میں رکھتے ہیں عذابِ الٰہی سے ڈراتا ہے۔ یہ بات ذہن میں نہیں آ سکتی کہ قرنِ اوّل کے مسلمان اس تعلق کی بنا پر جو انہیں دین سے تھا کلامِ الٰہی کی خدمت پر مائل نہ ہوئے ہوں۔ یہ چیز اسلام کے مزاج اور منشائے ایمان کے منافی ہے۔

''ثانیاً یہ کہ قرآن کریم کی جمع و ترتیب کا کام آنحضرت ﷺ کی پردہ پوشی کے دو یا تین سال بعد تکمیل کو پہنچا۔ آنحضرت ﷺ کے پیروؤں میں بہت سے ایسے بھی تھے جنہیں قرآن کی تمام آیات ازبر اور حفظ تھیں۔ قریب قریب ہر مسلمان کو قرآن کریم کا ایک ایک جزو ازبر یاد تھا۔ علاوہ بریں حکومت وقت قرآن کے قاریوں کو ممالک محرور میں تعلیم و تلقین کے لئے بھیجتی تھی۔ یہ قاری شعائر دین اور دینی مسائل کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ ان قاریوں کے زمرہ میں خصوصیت کے ساتھ وہی حضرات شامل تھے جنہیں حضور ﷺ سے صحبت کا شرف حاصل رہا تھا۔ ان قاریوں کو پورا قرآن حفظ تھا وہ آیات جو مسلمانوں کو ازبر یاد تھیں اور وہ جن کی تعلیم قُرّا دیتے تھے حضرت زید رضی اللہ عنہ کے مدوّنہ نسخہ قرآن کی کسوٹی پر پرکھی جاتیں۔ یہ دیکھا جاتا کہ آیا ان آیات میں مطابقت بھی ہے یا نہیں، لہٰذا مسلمان جمع قرآن کے سلسلہ میں نہ صرف مخلص اور بے لوث تھے بلکہ جانچ پرکھ بھی کرتے رہتے تھے۔ ان وسائل کی موجودگی میں جو انہیں حاصل تھے جمع آیات قرآنیہ کے بعد وہ تحقیق و تدقیق بھی کر سکتے تھے۔

''ثالثاً جس چیز سے قرآن کریم کی جامعیت اور اکملیت کا ثبوت ملتا ہے، یہ ہے کہ عہد نبوت میں قرآن کے بعض حصے ضبط تحریر میں آ چکے تھے اور اس قسم کے نسخے جمع قرآن سے قبل کثیر تعداد میں موجود تھے۔ غالباً وہ تمام لوگ جنہیں قدرت نے نوشت و خواند کی صلاحیت عطا کی تھی آیات قرآنی کے یہ نسخے اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے اس کے علاوہ یہ چیز بھی ہمارے علم میں ہے حضرت زید رضی اللہ عنہ کا نسخہ قرآن جمع و ترتیب کے بعد عام ہو چکا تھا اور لوگ بالعموم اس کی تلاوت کرتے تھے اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تمام آیات جو مختلف نسخوں میں مرقوم و مکتوب تھیں رائج الوقت نسخہ قرآن میں بھی پائی جاتی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ قرآن نے ان تمام نسخوں کی جگہ لے لی جو پہلے مستعمل تھے۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ جامعین قرآن نے بعض اجزاء آیات یا الفاظ کی تسوید و کتابت نہیں کی۔ نہ کسی کی زبان پر یہ اعتراض آیا کہ پیشتر جو نسخے تھے ان کے اجزاء، آیات اور الفاظ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے مدوّنہ نسخہ قرآن سے مختلف ہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو لوگ اس کی جانب ضرور توجہ دیتے اور قدیم کتب میں جن کے صفحات آنحضرت ﷺ کی سیرت مطہرہ کی جزئیات تک کو بھی سموئے ہوئے ہیں، اس پہلو پر ضرور روشنی ڈالی جاتی۔

''رابعاً یہ کہ مندرجات پر مشمولات قرآن کی ترتیب سے واضح ہوتا ہے کہ اس کی جمع و ترتیب میں بھی

Marfat.com

کافی کدوکاوش سے کام لیا گیا ہے۔ مختلف اجزاء کے ربط وضبط میں تصنع نام کو بھی نہیں پایا جاتا اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی ترتیب میں کسی نے کوئی جدت کی ہے۔ اس سادہ ترتیب سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جامعین قرآن کو قرآن سے والہانہ عقیدت اور خلوص واخلاص کی نسبت تھی۔ جمع وترتیب کے کام میں یہی نسبت خصوصی کارفرما نظر آتی ہے۔ افراط وتفریط کا کوئی پہلو کہیں نظر نہیں آتا۔

''ان امور سے ہم پورے شرح صدر کے ساتھ یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کا نسخہ قرآن نہ صرف یہ کہ صحیح تھا بلکہ جامع و مانع بھی تھا۔ اس کے جامعین نے نہایت احتیاط کے ساتھ آیات کے جوڑ ملائے ہیں۔ ان میں انہوں نے نہ کوئی آیت حذف کی نہ نظر انداز۔ ان شواہد کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں آیاتِ قرآنیہ قرآن کریم میں الہامی ترتیب کے ساتھ محفوظ ہیں۔ یہی وہ قرآن ہے جس سے آنحضرت ﷺ نے کامل جزم واحتیاط کے ساتھ دنیا کو متعارف کیا۔''[۵]

سر ولیم میور کی کتاب ''حیات محمد ﷺ'' کے طویل اقتباس کی نقل کے بعد ہم ایک حد تک پادری لامفس اور وان ہامر ایسے مستشرقین کے خیالات نقل کرنے سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ ان مستشرقین کی متفقہ رائے یہ ہے کہ یہی قرآن وہ قرآن ہے جسے آنحضرت ﷺ نے دوسروں تک بکمال احتیاط پہنچایا تھا۔

معدودے چند مستشرقین ایسے بھی ہیں جو قرآن کی تحریف پر تو ادھار کھائے بیٹھے ہیں لیکن ان کے پاس سر ولیم میور اور ان کے ماسوا دوسرے ان لاتعداد مستشرقین کے دلائل و براہین کا کوئی توڑ نہیں جو مؤخر الذکر نے تاریخ اسلام اور علمائے اسلام کی وساطت سے اخذ کئے ہیں۔ اس قسم کے اصحاب الرائے کی تنگ نظر کا کسی کے پاس کیا علاج ہے جو اسلام اور ہادیٔ اسلام ﷺ کے خلاف محض بغض و عداوت کی بنا پر الزامات تراشتے ہیں۔ ان کے پاس علمی تحقیق کا سرمایہ نہیں ہے۔ عامۃ المسلمین ان کے دام فریب میں مبتلا نہیں ہو سکتے البتہ راستے سے بھٹکے ہوئے نئی پود کے نوجوان ان کے پھندے میں ضرور پھنستے ہیں۔ وہ قدیم ماضی کے انکار پر تلے ہوئے ہیں اور ان کا شیوہ یہ ہے کہ ہر اس شخص کی بات پر کان دھرتے ہیں جو ماضی میں سو کیڑے نکالتے ہیں خواہ اس کی بات میں علمی اور تاریخی حیثیت سے کچھ بھی وزن نہ ہو۔ ہم اس مقام پر میور اور دیگر مستشرقین کے وہ تمام دلائل نقل کر سکتے تھے جو انہوں نے تاریخ اسلام اور مسلمان مصنفین کی تصنیفات سے اخذ کئے ہیں اور ساتھ ہی ان تصنیفات کے حوالے بھی پیش کر سکتے تھے لیکن ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ ہم یہ دلائل ایک مستشرق کی زبان سے نقل کریں تاکہ نئی پود کے ان نوجوانوں سے ہم یہ کہہ سکیں (ان نوجوانوں سے جو مغربی مصنفین کی ہر بات بغیر کسی تحقیق کے درست تسلیم کر لیتے ہیں) کہ حسن نیت اور خلوص قلب ہی وہ خصوصیتیں ہیں جن کی بنا پر کوئی شخص کسی معاملہ کی تہہ تک پہنچ سکتا ہے۔ ہم ان نوجوانوں پر یہ حقیقت بھی واضح کریں گے کہ تحقیقی امور میں یہ ضروری ہے کہ ایک محقق حد درجہ مخلص بھی ہو۔ اخلاص کی بدولت ہی حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ ذاتی اغراض اور شخصی میلانات تحقیق کی راہ میں سنگ گراں ثابت

ہوتے ہیں۔ مستشرقین کبھی کبھی حقیقت کی تہہ تک پہنچے بھی ہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ انہوں نے بری طرح ٹھوکریں بھی کھائی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے بارے میں ان میں سے اکثر جادۂ مستقیم سے ہٹ کر بہت دور جا پڑے ہیں۔ ہم نے توفیق ایزدی سے ان تمام مسائل کی تحقیق کی ہے اور اپنی تحقیقات کا پورا سرمایہ اس کتاب میں سمو دیا ہے۔

یہ چیز محقق کے فرائض میں داخل ہے کہ جب تک کسی چیز کی حقیقت آشکارا نہ ہو، اس وقت تک کسی قضیئے یا مسئلے کی نفی یا اثبات نہ کرے۔ مؤرخ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بھی علوم کی تحقیق میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھے۔ مستشرقین کی تصانیف کے پہلو بہ پہلو اسے علمائے اسلام کی علمی کوششوں پر بھی توجہ صرف کرنی چاہئے۔ حق جوئی اور معرفت طلبی کا تقاضا یہ ہے کہ محققین اسلام اور مستشرقین طب، ہیئت، کیمیا اور دوسرے علوم میں جو ذخیرے چھوڑ گئے ہیں، انہی پر تحقیق و تدقیق کی بنیاد رکھنی چاہئے اور ان امور کا انکار کر دینا ضروری ہے جو تحقیق کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ تاریخ کے واقعات بھی تحقیق طلب ہوتے ہیں خواہ ان کا تعلق ہادی ﷺ کی سیرت اور تاریخ ہی سے کیوں نہ ہو۔ مؤرخ کا کام صرف نقل و روایت ہی نہیں بلکہ جرح و تعدیل اور نقد و بصر بھی ہے اور وہ اس لئے تاکہ مجاز و حقیقت کا فرض واضح ہو جائے۔ تنقید، تحقیق کا ذریعہ ہے اور علم و معرفت تنقید کا مدار علیہ۔

میور کی کتاب سے قرآن کی صحت و جامعیت سے متعلق جو اقتباس پیش کیا گیا ہے ہمیں یقین ہے کہ اس کے بعد اس مصری مسلمان کے رسالے کی ان نشان زدہ آیات پر بحث و تمحیص کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی جن کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ ان کا الحاق بعد کی چیز ہے۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار تحقیق کے طور پر نہیں بلکہ کسی خاص غرض سے کیا جاتا ہے۔

اب ہم اس مصری مسلمان کے آخری اعتراض کی تردید کرتے ہیں۔ یہ برخود غلط اندیش مصری کہتا ہے کہ:

> ''یورپ کے مستشرقین کی تحقیق کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو مرگی کا عارضہ لاحق تھا۔ ان کے احوال و واردات بھی انہی اثرات کا نتیجہ تھے جو مرگی کے سبب ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ آپ پر غشی طاری ہوتی، جسم پسینہ سے شرابور ہو جاتا، اعضاء پر تشنج کی سی کیفیت طاری ہوتی، منہ سے کف جاری ہوتا، آپ کے حواس بجا ہوتے تو فرماتے کہ یہ آیات جو میری زبان پر ہیں، وحی الٰہی یا الہام ربانی ہیں حالانکہ یہ سب کچھ مرگی کے اثرات تھے۔''

بات یہ ہے کہ نزول وحی کے موقع پر آنحضرت ﷺ پر جو کیفیات وارد ہوتی تھیں ان کی نوعیت ہرگز ایسی نہ تھی۔ مستشرقین کا بیان حقیقت سے بعید ہے۔ جن مستشرقین نے آثار وحی کو اس بھونڈی شکل میں پیش کیا ہے۔ علم تحقیق کی رو سے ان کا بیان درست ثابت نہیں ہوتا۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ جو شخص مرگی کے

Marfat.com

مرض میں مبتلا ہوتا ہے، اس کے حافظے میں ان حالات و واردات کے نقش کبھی محفوظ نہیں رہتے جو غشی یا دورہ کے اوقات میں پیش آتے ہیں۔ اس قسم کے مریض کو جب ہوش آتا ہے تو وہ بالکل خالی الذہن ہوتا ہے۔ اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ اس پر کچھ دیر پہلے کیا گزری یا بیتی۔ مرگی کے عارضہ میں حواس معطل اور احساسات مفقود ہو جاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ نزولِ وحی کے وقت آپ کے حواس اتنے درست اور احساسات اتنے بیدار رہتے تھے کہ کسی دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ وحی کے ذریعے جو پیغام ربانی آپ کو ملتا، اسے آپ من وعن اپنے پیروؤں کے گوش گزار کر دیتے تھے۔ یہ پیغام آپ کے نہاں خانہ دماغ میں بہ تمام و کمال محفوظ رہتا تھا۔ نزولِ وحی کے وقت ہمیشہ بے خودی کی سی کیفیت طاری نہیں رہتی تھی بعض اوقات عالم بیداری میں بھی وحی نازل ہوتی تھی۔ سورۂ فتح کا نزول اس کی بہترین مثال ہے یہ سورۃ صلح حدیبیہ کے بعد اس وقت نازل ہوئی جب مسلمان مکہ سے مدینہ کی جانب عازمِ سفر تھے۔

نبی کریم ﷺ کبھی مرگی کے مرض میں مبتلا نہیں ہوئے۔ یہ ایک صریح بہتان ہے بلکہ اگر ہم اسے علم کی توہین سے تعبیر کریں تو بے جا نہ ہوگا۔ مستشرقین کی جو جماعت تحریف قرآن کے خیالِ خام کو دل میں جگہ دیئے ہوئے ہے اس نے اس قسم کی افترا پردازی محض اس لئے کی ہے تاکہ مسلمانوں کی نظر میں ان کے ہادی ﷺ کی قدر و منزلت کے نقوش دھندلے پڑ جائیں اور وہ اس مغالطہ میں مبتلا ہو جائیں کہ وحی الٰہی صرع کا کرشمہ ہے۔ اگر ان مستشرقین نے اس بدنیتی سے یہ ڈھونگ رچایا ہے تو سخت غلطی کا ارتکاب کیا ہے، علم ان کی ذہنیت پر ماتم کرتا اور عقل سلیم اس تہمت کی نفی کرتی ہے۔

اگر مستشرقین کی نیت میں فتور نہ ہوتا تو وہ ہرگز علم کی بنیاد پر ایسی بے سروپا باتیں زبان پر نہ لاتے جو سراسر علم و تحقیق کے منافی ہیں۔ مستشرقین نے یہ چال ایسی چلی کہ وہ عوام جو ان کی ہر بات کو خوش فہمی سے حرفِ آخر سمجھتے ہیں، اطباء اور ماہرین فن سے رجوع کئے بغیر ان کے خیالات سے پورا پورا اتفاق کریں گے۔ عوام کو کیا خبر کہ مرگی کے اسباب و نتائج کی صورت کیا ہوتی ہے؟ اگر کہیں یہ خوش فہم عوام تحقیق و تدقیق سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت الم نشرح ہو جاتی کہ مستشرقین نے ان کی راہ میں کیسے کیسے جال بچھائے ہیں۔ انہیں (عوام کو) یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ جب کسی شخص پر مرگی کا حملہ ہوتا ہے تو نہ دل قابو میں رہتا ہے نہ دماغ، دونوں معطل ہو جاتے ہیں۔ اس مرض میں مریض پر جو عالم گزرتا ہے اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ حملہ سے ماقبل کے تاثرات کا بہکے بہکے الفاظ میں اعادہ کرنے لگتا ہے اور اگر حملہ کچھ شدت اختیار کر جائے تو دوسروں کو ایذا پہنچانے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسے یہ ہوش بھی نہیں ہوتا کہ اس سے کس قسم کے افعال سرزد ہو رہے ہیں۔ نہ حملہ مرض کے وقت اس کے حواس بجا ہوتے ہیں نہ ہوش آنے کے بعد اس کا حافظہ اس کی مدد کرتا ہے۔ اس مریض کی حالت اس نیند کے ماتے کی سی ہوتی ہے جو خواب کی نقل و حرکت کا تصور بیداری میں نہیں کر سکتا۔

Marfat.com

مرگی کے مریض کو دورہ ختم ہونے کے بعد کچھ یاد نہیں آتا اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اس کے حواس معطل رہے ہیں۔ مرض کی اس حالت کو اس روحانی فعالیت اور اس باطنی قوتِ استحضار سے کوئی نسبت نہیں دی جاسکتی جو انسان کو کامل شعور اور پختہ ادراک کی موجودگی میں عالم بالا سے پیوست کرتی ہے۔ آخر الذکر کیفیت جب کسی پر وارد ہوتی ہے تو وہ وحی کے ذریعہ جو پیغام سنتا ہے اس کی تبلیغ و بیان میں دیانت برتتا ہے۔

اس چیز کا امکان ہے کہ چند صدیوں کے بعد وحی والہام کے ان حقائق کا انکشاف علمی حیثیت سے بھی ہوسکے لیکن یہ چیز اس وقت تک ممکن نہیں جب تک دنیا کا یہ ارضی نظام ختم نہ ہو اور قیامت ہی برپا نہ ہوجائے۔ اربابِ ایمان پر ان حقائق کا کشف ہوتا ہے لیکن جن لوگوں کے دل و دماغ پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں ان کے ذہن کی اس مقام تک رسائی نہیں ہوسکتی۔ ممکن ہے، مستشرقین یہ حیلہ تراشیں کہ وحی ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی گتھیاں علومِ حاضرہ کی روشنی میں نہیں سلجھائی جاسکتیں اور نہ اس کی شرح و بسط پر علم قادر ہوسکتا ہے۔ اس کی توجیہہ ہم اس طرح کرسکتے ہیں کہ جب ہنوز علم کے اہم گوشے تاریکی میں ہیں اور ان کی تحقیق کے لئے وقت درکار ہے تو اس طرح وحی کی گرہ کشائی بھی سہل نہیں اس کے لئے بھی وقت چاہئے۔ اس سے علم کی تنقیص لازم نہیں آتی۔ خصوصیات کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارا علم، مشاہدات و موجودات کی حقیقت کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا، مثلاً علم کی روشنی میں سورج، چاند، آسمان اور ستاروں کی ماہیئت سے متعلق جو معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں ان کی حیثیت مفروضات و قیاسات کی سی ہے حالانکہ ہماری نظر آسمان کا احاطہ کرتی اور دوربین کے سہارے اس سے متعلق بعض اسرار کی عقدہ کشائی بھی کرتی ہے لیکن پھر بھی بہت کچھ صیغہ راز میں ہے۔

آج سے ایک صدی پیشتر عصر حاضر کی بہت سی ایجادات محض تصور کے خلوت کدہ تک محدود و محصور تھیں اور ان کی تجرباتی تحقیق کے لئے ہمارے پاس کوئی وسیلہ نہ تھا لیکن اب جبکہ ایجادات و اختراعات پوری تحقیق کے بعد منظر عام پر آچکی ہیں، ہم انہیں کوئی وزن نہیں دیتے مگر وہ مسائل جن کا تعلق محض قلبی واردات اور باطنی کیفیات سے ہے اور جن کے بارے میں غور وخوض کے بعد اربابِ علم و تحقیق نے یہ اعتراف کیا ہے کہ ان کی نوعیت ہنوز ایک سربستہ راز ہے، ابھی تک حل نہیں ہوسکے ہیں۔ وہ حکماء جو ان حقائق کی واقعیت سے مطمئن ہوچکے ہیں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکے کہ علم کی رو سے ہم ان حقائق کی تشریح و تفسیر کا حق ادا نہیں کرسکتے۔ قطع نظر ازیں، بہت سے علمی مباحث بھی اس قسم کے ہیں جن کے بارے میں قطعیت کے ساتھ نپے تلے اصول وضع نہیں کئے جاسکتے۔ اگر ہم زندگی کے تمام مسائل کی تحقیق کا بیڑا اٹھائیں تو علم اس کوشش میں ہماری دستگیری نہیں کرسکتا اور ہماری سعی، سعی لاحاصل رہے گی۔

نزولِ وحی کے دور میں جو مسلمان تھے، وحی سے ان کے ایمان و ایقان میں اضافہ ہوتا تھا۔ اس دور میں بعض اربابِ عقل و دانش بھی تھے، بعض ایسے علمائے یہود و نصاریٰ بھی تھے جو قبولِ اسلام سے قبل

Marfat.com

آنحضرت ﷺ سے بحث ومناظرہ کرتے تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے میں مطلق کوئی شبہ نہیں کیا اور نہ اس کی اس حیثیت سے انکار کی جرأت کی۔ شروع شروع میں جو افرادِ قریش آنحضرت ﷺ کو ساحر و مجنون قرار دیتے تھے، آخر میں انہیں بھی یہ تسلیم کرنا پڑا کہ قرآن کلام الٰہی ہے اور اس کا ایک ایک حرف سچ ہے۔ بالآخر انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ان کے لئے وحی الٰہی کو تسلیم کئے بغیر کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔ ان امور اور ان اسباب کے پیش نظر یہ کیسے ممکن ہے کہ علم، حقیقت وحی سے انکار کرے اور آنحضرت ﷺ کو ان صفات سے متصف کرے جو مقامِ رسالت کے شایانِ شان نہیں۔

زیادہ سے زیادہ اگر کوئی نیک نیت محقق کچھ کہہ سکتا ہے تو صرف یہ کہ علوم حاضرہ وحی کی شرح وتعبیر سے قاصر ہیں لیکن وہ اپنے علم کی بنیاد پر ان تصریحات کو غلط قرار نہیں دے سکتا جو صحابہ کبار رضی اللہ عنہم اور صدرِ اوّل کے مصنفین نے وحی والہام سے متعلق پیش کی ہیں۔ اگر کوئی کج فہم مدعی علم وتحقیق وحی کے انکار پر غلط سلط دلائل لائے تو یہ لجاجت نہیں تو اور کیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ علم ولجاجت دونوں یکجا نہیں ہوسکتے۔

دشمنانِ اسلام کی عجز سامانی نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ہر وہ وسیلہ اختیار کریں جس سے اسلام کی حقیقت مسخ ہوجائے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ اسلام ایک بلند، معقول اور واضح دین ہے، وہ اس کے ہادی ﷺ کی عیب جوئی پر اتر آئے اور بے تکی ہانکنے لگے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو دلائل پیش کئے، ان میں کچھ بھی جان نہ تھی۔ عاجز و درماندہ اشخاص کی عادت ہے کہ جب انہیں اکابر کے آثار واحوال میں کوئی نقص نظر نہیں آتا تو پھر وہ ان کی شخصیتوں کی عیب جوئی پر اتر آتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ آثار واحوال کی تبلیغ و اشاعت انہی کے ذریعے ہوتی ہے لیکن یہ حربہ اربابِ علم کی شان کے شایان نہیں، اسے عجز و درماندگی کا کھلا ثبوت کہا جاسکتا ہے۔ انسان کی فطرت کا قانون بھی اس کے جواز کا فتویٰ نہیں دے سکتا۔ فطرتِ انسانی کا تقاضا تو یہ ہے کہ اکابر کے آثار واحوال اور ان کے نتائج سے حتی الوسع استفادہ کرے، نظر اس شے پر رہنی چاہئے جس کی افادی حیثیت مسلم ہے نہ کہ اس شے کی اصل اور اس کے منبع پر! یہ تو نری دردِ سری ہے۔ اگر کبھی ہم کسی درخت پر کوئی پھل دیکھتے اور پسند کرتے ہیں تو ہم اس فکر میں نہیں پڑتے کہ اس کی اصل ونسل کیا ہے اور اس کی پرورش کس انداز پر ہوئی ہے۔

اس قسم کی دوسری مثال ہم یہ پیش کرسکتے ہیں کہ افلاطون کا فلسفہ، شیکسپیئر کا ڈراما اور رفائل کی فنکاری جن پر انسانیت فخر کرتی ہے، جب موضوع گفتگو ہوتے ہیں اور ہمیں ان میں کوئی نقص نظر نہیں آتا تو ہم ان کی شخصیتوں پر کبھی حرف گیری نہیں کرتے۔ اگر کوئی نکتہ چین اس چیز پر اتر آئے تو وہ ہرگز اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس روش سے خود اپنا بھرم اور اپنی ساکھ کھو بیٹھتا ہے۔ اگر حکمت ودانش کا غلاف بھی اس حرف گیری پر چڑھا دیا جائے تو بھی اس قسم کی تحریر کو قبولِ عام کی سند نہیں مل سکتی۔ اس معاندانہ روش سے حقیقت کا وجود معدوم نہیں ہوسکتا۔ حقیقت کا مقام اس سے کہیں بلند تر ہے کہ اس کی اساس کینہ پر رکھی

جائے۔ مستشرقین نے آنحضرت ﷺ پر جو نکتہ چینی کی ہے اس کی نوعیت کچھ ایسی ہے۔ یہ انداز کچھ اتنا پست اور مبتذل ہے کہ اسے کسی صورت میں بھی درخورِ اعتنا نہیں قرار دیا جاسکتا۔

مذکورہ بالا رسالے میں مصری مسلمان نے مستشرقین کے جو اقوال پیش کئے تھے، ان کی تغلیط و تردید کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تبصروں پر بھی ایک نظر ڈالی جائے جو اس کتاب ''حیاتِ محمد ﷺ'' کی طبع اوّل کے بعد ہمیں موصول ہوئے۔ خیال ہے کہ اس کے بعد اس قسم کی عیب جوئی اور نکتہ چینی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ اگر ان مستشرقین کی غرض و غایت صرف یہی ہوتی کہ وہ ان بے سروپا اعتراضات سے یورپ میں مسیحیت کی بنیادیں مستحکم کرنا چاہتے ہیں یا اپنے عقیدہ کے مطابق مذہبی یا علمی خدمات کی بجا آوری ان کا مقصود ہے تو انہیں معذور سمجھا جاسکتا تھا اور ہم ان کی خرافات پر کوئی دھیان بھی نہ دیتے لیکن اب جبکہ ریڈیو، پریس اور بجلی کی ایجاد سے دنیا کے مختلف حصوں میں ایک ربط سا پیدا ہو گیا ہے اور جو کچھ امریکہ اور یورپ میں کہا جاتا ہے اس کی صدائے بازگشت آنِ واحد میں مشرق کے گوشے گوشے میں سنائی دیتی ہے، ان ہر دو ممالک کے اربابِ قلم کو ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہئے کہ وہ لوگ ان کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے جو خود بھی علم و تحقیق کی دولت سے مالا مال ہیں اور ایسے لوگوں کی دنیا کے کسی خطے میں کمی نہیں، لہٰذا ضرورت اس چیز کی ہے کہ کسی رعایت اور کسی مصلحت کے بغیر اظہارِ حقیقت سے پہلوتہی نہ کی جائے۔ نسلی و ملی امتیازات سے قطع نظر انسانیت کی بنیاد پر تحقیق کی منزل میں قدم رکھا جائے تاکہ نسلِ انسانی کے مختلف افراد کے درمیان محبت و اخوت کے رشتے استوار اور محکم رہیں۔ یہی ایک ایسی روش اور یہی ایک ایسا طرزِ عمل ہے جو دائمی سعادت، کمالِ ہدایت اور رفعت و عظمت کی بلندیوں تک پہنچا سکتا ہے۔

وہ لوگ جنہیں مستشرقین کی باتوں پر حد سے زیادہ اعتماد ہے ہم پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہم نے عربی کے ماخذ پر کیوں اعتماد کیا؟ نیز وہ اربابِ قلم جو علومِ دینیہ پر گہری نظر رکھتے ہیں یہ نکتہ چینی کرتے ہیں کہ ہم نے مستشرقین کی جانب توجہ ہی کیوں کی؟ سیرت اور کتبِ احادیث میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے انہیں ہم نے بلاچون و چرا کیوں تسلیم نہیں کیا؟ ان کتب میں جو روش اختیار کی گئی ہے اس کا تتبع کیوں نہیں کیا گیا؟ اس بنا پر ان میں سے بعض اشخاص نے تبصرے بھیجے ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو حقیقت پر مبنی ہیں اور ان کا انداز بھی شائستگی لئے ہوئے ہے لیکن بعض تبصرے ایسے بھی ہیں جن سے جہالت ٹپکتی ہے اور جنہیں علم و تحقیق سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔

اوّل الذکر تبصروں میں اعتراض اس روش پر کیا گیا ہے کہ ہم نے وہ معجزات کیوں بیان کئے جن سے سیرت و حدیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ یہ اعتراض ہماری اس عبارت پر ہے:

> ''حضرت محمد مصطفی ﷺ انسانیت کے اس مقام پر فائز تھے جس کی بلندیوں تک ہر انسان کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ آنحضرت ﷺ کی یہ دلی آرزو تھی کہ مسلمان آپ کو ایک

Marfat.com

بشر مانیں جو لباسِ بشریت کے ساتھ ساتھ وحی الٰہی کی خلعت سے بھی مزین ہو، آپ یہ بھی پسند نہیں فرماتے تھے کہ آپ کی ذات کے ساتھ معجزات منسوب کئے جائیں۔ یہ حقیقت آپ ﷺ نے اپنے صحابہؓ پر واضح فرمادی تھی۔"[1]

اسی طرح ہم نے معجزۂ شق صدر کے بارے میں (طبع اوّل) یہ تحریر کیا تھا:

"اس داستان سے متعلق مستشرقین اور محققین اسلام کی تردید کا بڑا سبب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت ایسے واقعات سے پُر ہے جن میں کمالِ انسانیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کو دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح اپنی رسالت کے ثبوت میں معجزات دکھانے کی چنداں ضرورت نہ تھی اور مؤرخین اسلام بھی اس کے موید ہیں۔ وہ آنحضرت ﷺ کی ذات سے متعلق ایسے امور کی صحت سے انکار کرتے ہیں جو ایک طرف تو عقل کے منافی ہیں اور دوسرے قرآن کے اس دعویٰ پر بھی پورے نہیں اترتے کہ الٰہی قانون میں کسی قسم کی تبدیلی کا امکان نہیں۔ قرآن کریم مشرکین پر لعن طعن کرتا ہے کہ وہ عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے۔"[2]

مبصرین کے گروہِ اوّل نے نہایت نرم و شائستہ الفاظ میں ہم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ہم نے مستشرقین کے ان اعتراضات کو جو انہوں نے آنحضرت ﷺ پر کئے ہیں۔ اپنی کتاب میں جگہ ہی کیوں دی؟ اس مستشرقین کے گروہ کے نزدیک مستشرقین کے اقوال کی نقل بھی مقامِ رسالت کی توہین کے مترادف ہے۔

مبصرین کے گروہِ ثانی نے طبع اول کی اشاعت بلکہ تالیف کی تکمیل سے قبل ہی ہمارے خلاف یہ مہم شروع کردی تھی کہ ہم نے اس کتاب کا نام "حیاتِ محمد" کیوں رکھا اور اس کے ساتھ "ﷺ" کے متعارف کلمات شامل کیوں نہیں کئے؟ راقم نے متن میں رسول اللہ ﷺ پر بارہا درود و سلام سے اَجر دارین حاصل کیا اور طبع اول کے سرعنوان یہ آیہ شریفہ:

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٥٦﴾ (سورۃ الاحزاب:۵۶)

"اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں اے مومنو! تم ان پر درود و سلام بھیجتے رہو۔"

تحریر کردی تھی اور یہ خیال تھا کہ اس سے ہمارے معترضین مطمئن ہوجائیں گے اور انہیں ہم پر اعتراض کی ضرورت نہیں پیش آئے گی لیکن انہوں نے اس کے باوجود پھر اعتراض دہرایا اور اپنے رویہ سے یہ ثابت کردیا کہ وہ اسلام کی حقیقت سے کتنے بے خبر ہیں اور ان کا دین اپنے آباؤ اجداد کی کورانہ تقلید کے سوائے اور کچھ نہیں۔

سب سے پہلے ہم اس اعتراض کا رد کرتے ہیں تاکہ آئندہ کے لئے نکتہ چینی کا دروازہ بند ہوجائے۔

Marfat.com

اس بحث میں ہمارا مرجع اکابر اسلام کی تصانیف ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام لفظی قیود سے بالاتر ہے۔ اس بارے میں ذیل کی حدیث ملحوظ خاطر ہے۔

اِنَّ ھذا الدین متین فاوغل فیہ برفق فان المنبت لا ارضاً قطع ولا ظھراً ابقی

''بلاشک وشبہ یہ ایک دین قیم ہے اس میں داخلہ کی شرط رفق و اعتدال ہے کیونکہ افراط کی راہ پر گامزن ہونے سے کوئی شخص کسی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔''

ابوالبقا نے اپنی کلیات میں تحریر کیا ہے کہ پیغمبر اسلام پر صلوٰۃ وسلام کی کتابت کا رواج عہد عباسیہ میں شروع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ''بخاری'' اور دیگر کتب میں اس کا سراغ نہیں ملتا۔ اکثر بزرگان دین اس چیز پر متفق الخیال ہیں کہ صلوٰۃ وسلام کا ورد عمر میں ایک دفعہ کفایت کرتا ہے۔

ابن نجیم نے البحر الرائق میں لکھا ہے کہ پیغمبر پر درود ساری عمر میں نماز کے اندر یا باہر ایک بار واجب ہے۔ اس سلسلہ میں تکرار ضروری نہیں اور نہ یہ کوئی اختلافی مسئلہ ہے۔ امام شافعیؒ اور دیگر ائمہ میں صلوٰۃ وسلام کے وجوب سے متعلق جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کا تعلق نماز سے ہے، عام مواقع پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ صلوٰۃ بمعنی دعا مستعمل ہے لیکن آیہ ان اللہ...... الخ، میں مقصودِ الٰہی رحمت ہے یعنی خدا پیغمبر علیہ السلام پر رحمت بھیجتا ہے اور سلام۔ یہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے علما و ائمہ کے اقوال معتبرہ کا ماحصل ہے لہٰذا وہ لوگ جو یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہر موقع اور ہر محل پر جب بھی آنحضرت ﷺ کا اسم مبارک مذکور ہو یا اس کی کتابت کی جائے صلوٰۃ و سلام کی قرأت وکتابت واجب ہے، دین میں غلو کرتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو یہ علم ہوتا کہ بڑے بڑے محدثین نے بھی اپنی کتب کے آغاز میں صلوٰۃ وسلام کی کتابت کا التزام نہیں کیا تو انہیں ہم پر اعتراض کی ضرورت پیش نہ آتی۔

جن عوام کا یہ خیال ہے کہ مستشرقین کے اعتراضات کی نقل سے مقامِ رسالت کی توہین ہوتی ہے، اپنے ذاتی میلان اور مذہبی رجحان کے سوائے اپنی تائید میں کوئی حجت یا برہان پیش نہیں کرتے۔ علمی اعتبار سے اس بے دلیل دعویٰ کی کوئی حیثیت نہیں۔ قرآن مجید میں وہ باتیں نقل کی گئی ہیں جو مشرکین آنحضرت ﷺ کے بارے میں کہا کرتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی تردید بھی کی گئی ہے اگرچہ قرآن کریم، ادب کی اعلیٰ ترین کتاب ہے لیکن اس کے باوجود اس نے بین الفاظ میں یہ نقل کیا کہ قریش، آنحضرت ﷺ کو مسحور ومجنون کہا کرتے تھے چنانچہ ایک جگہ مشرکین کا قول بایں انداز نقل کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾ (سورۃ النحل: ۱۰۳)

''اور ہم جانتے ہیں جو کچھ کافر کہتے ہیں کہ جسے وہ (نبی ﷺ) کلام الٰہی کہتا ہے وہ اسے ایک عجمی شخص نے سکھایا ہے۔ قرآن جو فصیح عربی زبان میں ہے وہ غیر عرب کیسے بول

Marfat.com

سکتا ہے۔"

قرآن کریم میں اس کے علاوہ اور بہت سے اقوال نقل کئے گئے ہیں۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ علمی حیثیت سے کسی شخص کی دلیل کا بطلان اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسے صحت کے ساتھ نقل نہ کر دیا جائے۔ اس کتاب کی تالیف سے میرا مقصود اظہارِ حقیقت کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔ میرا منشا یہ تھا کہ اس کا مطالعہ مسلمان بھی کریں اور غیر مسلم بھی اس کے مطالب سے مطمئن ہوں۔ جس شخص کا نصب العین یہ ہو، وہ تمام دوسرے امور سے قطع نظر حقیقت اور صرف حقیقت پر اپنی توجہ مرکوز کرے گا اور یہی مناسب بھی ہے۔

اب ہم پہلے اعتراض پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں کہ ہم نے سیرت و حدیث کی کتب کے مشمولات پر بلا تامل اعتبار کیوں نہیں کیا؟ اور مختلف حالات و واقعات کے بیان کے سلسلہ میں ان کا تتبع کیوں نہیں کیا؟ اس اعتراض کے جواب میں یہ اظہارِ حقیقت ناکافی نہیں ہے کہ ہم نے اس تالیف میں جن مباحث پر قلم اٹھایا ہے، ان کی علمی حیثیت ہمارے پیش نظر رہی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ایک نیا اسلوب ہے۔ ہمارے معاصرین نے تاریخ اور دوسرے علوم کی تالیفات کے سلسلہ میں یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ نظر بظاہر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم علم و تحقیق کے اس نئے دور میں، قدیم کتب کی روش اختیار کریں؟ قدیم طرز اور عصر حاضر کے اسلوب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قدیم کتب میں مطالب پر تنقید کا دستور نہ تھا اور ان کتب کی تالیف و تصنیف کا مقصد خالصتاً دینی ہوتا تھا اور مصنف یا مؤلف پر یہ پابندی تھی کہ وہ مبادی و مقدمات کو اس انداز اور اس نہج پر مرتب کرے جس سے اس کی مقصد برآری ہو لیکن اس دور کا مصنف اصولِ تنقید اور علمی تحقیق پر کاربند ہے اور جو نتائج اس سے برآمد ہوں ان کے اخذ و قبول کے لئے وہ بڑی حد تک مجبور ہے۔ ہماری روش پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں اگرچہ ان کے رد و ابطال کے لئے یہی امور کافی ہیں لیکن پھر بھی ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے اور یہ واضح کیا جائے کہ ماضی و حال میں مسلمان مفکرین نے کتب سیرت و حدیث کے مندرجات کے اخذ و قبول میں کن وجوہ و اسباب کے تحت تامل کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس امر کی وضاحت بھی ہوجائے کہ لوگوں نے دوسرے محققین کی طرح اصول تنقید اور علمی تحقیق پر کس حد تک عمل درآمد کیا ہے۔

مذکورہ بالا اسباب میں سے ایک سبب وہ اختلاف ہے جو آنحضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ سے متعلق مسائل کے سلسلہ میں پایا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے دقتِ نظر اور تحقیق سے ان کتب کا مطالعہ کیا ہے ان پر یہ حقیقت روشن ہے کہ معجزات، خوارقِ عادات اور بہت سی روایات میں کمی بیشی ہے اور اس کی وجہ اس کے سوائے اور کچھ نہیں کہ ان کی تسوید و تالیف میں زمانی بعد ہے۔ قدیم ترین کتب میں ہمارے معاصرین کی تصانیف کی بہ نسبت معجزات سے متعلق روایات تعداد میں بہت کم ہیں اور علاوہ بریں ان کتب میں خرق عادت سے متعلق جو روایات ہیں انہیں عقل تسلیم کرتی ہے اور ان کے وقوع و ظہور کو کسی پہلو سے بھی غیر یقینی

نہیں کہا جا سکتا۔ ابوالفدا نے تاریخ میں اور قاضی عیاض نے 'شفا' میں جن معجزات کا بیان کیا ہے اور جنہیں متاخرین نے بھی اپنی تالیفات میں نقل کیا ہے، سیرت کی قدیم ترین کتاب سیرت ابن ہشام میں ان کا مذکور نہیں ہے۔ حدیث کی کتب میں بھی روایات کا اختلاف ہے۔ بعض احادیث میں ایک واقعہ کا ذکر ہے بعض میں نہیں، بعض احادیث کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بسند ضعیف مذکور ہے۔ اس بنا پر اگر کوئی شخص کتب احادیث کے ان مندرجات و مشمولات کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنا چاہے تو اسے روایات کی صحت اور عدم صحت کے جائزہ کے لئے ایک اصول متعین کرنا پڑے گا۔ پھر جو روایت اس اصول کے معیار پر پوری اترے گی اس کی صحت مسلم قرار دی جائے گی اور جو پایہ اعتبار سے ساقط ہوگی اسے نقد و بصر کے ترازو میں تولا جائے گا۔

متقدمین نے بعض مواقع پر یہ طریق اختیار کیا ہے اور بعض مقامات پر اس سے صرف نظر کیا ہے۔ ان میں سے ایک داستانِ غرانیق ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ اکابر قریش نے آنحضرت ﷺ کو تنگ کیا تو آپ ﷺ نے سورۂ نجم کی تلاوت کی۔ جب آپ اس آیت پر پہنچے:

أَفَرَءَيْتُمُ اللَّٰتَ وَالْعُزَّىٰ ﴿١٩﴾ وَمَنَوٰةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ ﴿٢٠﴾ (سورۃ النجم: ۱۹، ۲۰)

اس کے بعد آپ ﷺ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے۔

تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلَا إِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجَى

بعدازاں آپ نے سورۂ والنجم کی تلاوت آخر تک کی۔ جب آیت سجدہ پر پہنچے تو آپ ﷺ نے سجدہ کیا۔ مسلمانوں اور ان کے ساتھ مشرکین نے بھی سجدہ کیا۔

ابن سعد نے ''طبقات الکبریٰ'' میں یہ داستان تحریر کی ہے لیکن اس پر تنقید نہیں کی اور یہی داستان کتب حدیث کی صحیح روایات میں درج ہے لیکن ان روایات میں غرانیق سے متعلق اختلاف ہے۔

ابن اسحاق نے یہ داستان نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ روایت زنادقہ کی من گھڑت کہانیوں میں سے ہے۔

ابن کثیر نے یہ روایت اپنی کتاب ''البدایہ والنہایہ'' میں نقل کی ہے اور اس کے بارے میں یہ تحریر کیا ہے کہ اور لوگوں نے بھی داستانِ غرانیق نقل کی ہے۔ ہم اسے نظر انداز کر دینا چاہتے تھے اور وہ اس لئے کہ وہ لوگ جو تحقیق کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس سے لاعلم رہیں تو بہتر ہے لیکن اصل داستان صحیح روایات کے ضمن میں بیان کی گئی ہے بعدازاں بخاری کی ایک حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے لیکن بہ تمام و کمال نقل نہیں کیا۔ مجھے اس داستان کے انکار نہ کرنے اور ابن اسحاق کے اس قول کی تردید کی (کہ یہ داستان زنادقہ کی من گھڑت کہانی ہے) کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ میں نے صرف ان الفاظ پر قناعت نہیں کی کہ یہ داستان ابلاغ و تبلیغ کے سلسلہ میں انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے منافی ہے بلکہ یہ ضروری سمجھا کہ علمی انداز میں اصول تنقید کی رو سے اس کا بطلان کیا جائے۔

Marfat.com

دوسرا سبب جس کے تحت قدیم کتب کے مشمولات پر نقد و بصر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، یہ ہے کہ سیرت کی قدیم ترین کتاب آنحضرت ﷺ کی وفات سے ایک صدی بعد یا اس سے کچھ زیادہ مدت کے بعد تالیف کی گئی۔ یہ دور سیاسی نقطہ نظر سے پروپیگنڈے کا دور تھا اور اس سلسلہ میں جعلی احادیث کو اپنی مقصد برآری کے لئے کامیاب ترین حربہ سمجھا جاتا تھا۔ قیاس کیجئے، ان کتابوں کی کیا نوعیت ہوگی جو اس پُرآشوب دور کے بعد معرض تحریر میں آئیں۔ سیاسی خلفشار اور جعلی احادیث کے رواج سے جامعین احادیث کو صحیح احادیث کے انتخاب میں سخت ترین مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان جامعین احادیث کی کوشش یہ تھی کہ حتی الوسع تحقیق و تنقیح کے بعد احادیث کی جمع و ترتیب کی جائے تاکہ ان کی صحت میں کسی قسم کا شبہ نہ رہے۔ اس سلسلہ میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دنیائے اسلام کے طول وعرض میں سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ متداول احادیث کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ تھی اور میرے نزدیک ان میں سے چار ہزار احادیث ایسی تھیں جو معیارِ صحت پر پوری اترتی تھیں۔ اس حساب سے ۱۵۰ احادیث میں صرف ایک حدیث کی صحت مسلم تھی۔ ابوداؤد نے جن کا شمار مشہور و معروف محدثین میں ہوتا ہے، پانچ لاکھ احادیث میں سے صرف چار ہزار آٹھ سو احادیث کا انتخاب کیا۔ ان کے دیگر محدثین نے بھی انتخاب احادیث کے سلسلہ میں اسی قسم کی احتیاط برتی لیکن اس کے باوجود بہت سی ایسی احادیث جو محدثین کے اس گروہ کے نزدیک معیارِ صحت پر پوری اترتی تھیں، اربابِ علم و تحقیق کے خیال میں محل نظر ٹھہریں اور انہوں نے اپنے اصول تحقیق کی روشنی میں ان کی صحت سے انکار کر دیا۔ انہی میں داستانِ غرانیق سے متعلق حدیث بھی ہے۔ جامعین احادیث نے اسے صحیح قرار دیا ہے لیکن اربابِ علم و تحقیق کو اس کی صحت میں کلام ہے جب احادیث کے قدیم مجموعوں کا جن کی جمع و ترتیب میں محدثین نے صبر آزما صعوبتیں برداشت کی ہیں، یہ حال ہے تو متاخرین کی کتب سیر کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ ان کے مندرجات کسی تحقیق و تدقیق اور نقد و بصر کے بغیر کیسے معتبر قرار دیئے جا سکتے ہیں؟

صدرِ اوّل کے بعد مسلمانوں میں سیاسی نزاعات کا آغاز ہوا اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے بہت سی احادیث وضع کی گئیں۔ اموی دور کے اختتام تک کسی نے احادیث کی جمع و ترتیب پر توجہ مبذول نہیں کی۔ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عہد میں اس کام کا بیڑا اٹھایا اور احکام بھی جاری کئے لیکن عہد مامون الرشید تک تدوین احادیث کی مہم شروع نہیں ہوئی۔ دارقطنی کے الفاظ میں اس وقت درست اور جعلی احادیث میں کچھ اس قسم کی نسبت تھی جیسے سیاہ رنگ کی گائے کے جسم پر بکھرے ہوئے کچھ سفید بال ہوں۔ بہت ممکن ہے صدرِ اول میں لوگ جمع احادیث سے اس لئے مجتنب رہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ان کے پیش نظر تھا:

لا تکتبوا عنی شیئاً غیر القرآن ومن کتب شیئاً غیر القرآن فلیمحہ

"قرآن کے سوائے میری کوئی بات نہ لکھو اور اگر کسی نے قرآن کے سوائے کچھ لکھا ہو تو وہ مٹا دے۔"

Marfat.com

چنانچہ صدرِ اول میں اسی سبب سے احادیث نوکِ زباں تھیں لیکن ان کی روایات میں اختلاف تھا۔

اختلافِ روایات کا سلسلہ ختم کرنے کے لئے اپنے عہد خلافت میں عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے یہ سوچا کہ احادیث کو ضبط تحریر میں لایا جائے۔ اس سلسلہ میں آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ سب نے یہ رائے دی کہ کتابت بہتر رہے گی لیکن عمر الفاروق رضی اللہ عنہ نے کامل ایک ماہ تک استخارہ کیا، اس کے بعد ایک دن پختہ ارادہ کرلیا اور پورے وثوق کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ میں کتابت احادیث کے حق میں تھا لیکن بخدا اب میں استخارہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کتاب اللہ کو کسی چیز سے ملوث نہ کیا جائے چنانچہ اس بنا پر تدوین احادیث کا کام نظرانداز کردیا گیا اور ساتھ ہی بارگاہِ خلافت سے یہ احکام جاری ہوئے کہ جس کسی کے پاس کوئی حدیث لکھی ہوئی موجود ہے وہ اسے تلف کردے، لیکن اس کے باوجود احادیث کی تحریر و کتابت کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا حتیٰ کہ عہد مامون میں وہ احادیث ترتیب دی گئیں جو جامعین کے نزدیک صحیح تھیں۔ اگرچہ جامعین نے اپنی دانست میں کافی تحقیق و تدقیق سے کام لیا لیکن پھر بھی محققین نے ایسی بہت سی احادیث کو جو جامعین کے نزدیک معیارِ صحت پر پوری اترتی تھیں، رد کردیا۔

امام نووی اپنی شرح صحیح مسلم میں رقمطراز ہیں کہ مسلم و بخاری میں بعض لوگوں نے ایسی احادیث کا سراغ لگایا ہے جو خود مسلم و بخاری کے معیارِ صحت پر پوری نہیں اترتیں اور اس پائے سے ساقط ہیں جو صحت احادیث کے لئے ناگزیر قرار دیا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جامعین کے نزدیک کسی حدیث کے رد و قبول کا معیار، صحت نقل اور اعتماد روایت کے ماسوا اور کچھ نہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مذکورہ بالا معیار اپنے اندر کافی وزن رکھتا ہے لیکن اس پر حصر نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے نزدیک صحت احادیث کے تعین کے لئے وہ معیار زیادہ قابل ترجیح ہے جو اس حدیث میں پیش کیا گیا ہے۔

> انکم ستختلفون من بعدی فما جاء کم عنی فاعرضوہ علی کتاب اللہ فما وافقہ فمنی وما خالفہ فلیس عنی۔
>
> ''میرے بعد تمہارے درمیان اختلافات رونما ہوں گے۔ جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے اسے کتاب اللہ کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھو۔ اگر کتاب اللہ کے موافق ہے تو میرا قول ہے اور اگر مخالف ہے تو میرا قول نہیں۔''

یہی وہ معیار ہے جس پر صدر اول میں ائمہ اسلام نے عمل کیا اور آج بھی مسلمان مفکرین اسی پر اعتماد کرتے ہیں۔

ابن خلدون کا قول ہے کہ میں کسی ایسی حدیث کو جو بظاہر قرآن کے مزاج کے خلاف ہے، صحیح نہیں سمجھتا خواہ اس کے راوی کتنے ہی ثقہ اور قابل اعتماد کیوں نہ ہوں کیونکہ بہت سے راوی ایسے ہوسکتے ہیں

Marfat.com

جن کے ظاہر میں حسن اور باطن میں کھوٹ ہو، احادیث پر جس طرح نقل و روایت کے اعتبار سے تنقید کی جاتی ہے اگر مطالب کے لحاظ سے بھی ان کی چھان پھٹک ہو تو بہت سی وہ احادیث جن کی صحت پر ہمیں اعتماد ہے پایہ اعتبار سے ساقط ہو جائیں گی۔

جعلی احادیث کی علامت یہ ہے کہ وہ ظاہر قرآن، قواعد شرح، دلیل عقلی، محسوسات، مشاہدات اور تعلیمات کے منافی ہوں۔ وہ معیار جس کی جانب حدیث مذکورہ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے اور جس کی نشاندہی ابن خلدون نے بھی کی ہے، اصولِ تنقید سے مطابقت تامہ رکھتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد اختلافِ امت اس انتہا کو پہنچ گیا تھا کہ مختلف ممالک کے مبلغین نے ہزاروں حدیثیں وضع کر لیں۔ ابولولو کے ہاتھوں عمر الفاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب عثمان غنی رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو وہ خصومت جو ماقبل رسالت بنی امیہ اور بنی ہاشم کے درمیان تھی پھر تازہ ہو گئی۔ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ اُم المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرا ہوئے۔ شیعانِ علی رضی اللہ عنہ، اپنے ممدوح کی حمایت و نصرت کے لئے کیل کانٹے سے لیس ہو گئے۔ اس زمانے میں جعلی احادیث اس کثرت سے رواج پذیر ہوئیں کہ خود علی کرم اللہ وجہٗ نے ان کی صحت سے انکار کر دیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کا یہ قول مشہور ہے:

"ما عندنا کتابٌ نقرؤہ علیکم الا ما فی القرآن وما فی ھذہ الصیحفۃ اخذتھا من رسول اللہ فیھا فرائض الصدقۃ"

''ہمارے پاس قرآن کے سوائے اور جو کچھ اس صحیفہ میں ہے اور کوئی کتاب نہیں جو تمہیں سنائیں۔ اس میں فرائض و واجبات درج ہیں۔''

اس کے باوجود احادیث کے راوی، روایت حدیث سے دستبردار نہیں ہوئے۔ محدثین کا ایک گروہ ایسی احادیث کی جمع و ترتیب میں مصروف رہا جو صرف فضائل کے موضوع پر تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ہم فضائل سے متعلق کوئی حدیث وضع کریں گے اور اس کی نسبت آنحضرت ﷺ کی ذات سے ہو گی تو لوگ اسے ذوق و شوق سے گوشہ دل میں جگہ دیں گے۔ بنی امیہ برسر اقتدار آئے تو ان کے زیر اثر محدثین کا جو گروہ تھا اس نے ایسی احادیث کو کوئی اہمیت نہیں دی جن میں حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے فضائل کا بیان تھا۔ انہوں نے ایسی احادیث کو ضعیف قرار دیا۔ اسی زمانہ میں وہ محدثین جو حضرت علیؓ اور اہل بیت کے حامی اور خیر خواہ تھے، فضائل آمیز احادیث کے مجموعہ میں کچھ نہ کچھ اضافے کرتے رہتے تھے اور ان کی نشر و اشاعت کے طریقے مختلف تھے۔ یہ محدثین، اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مرویات کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ مشہور ہے جسے ابن عساکر نے ابوسعد اسماعیل بن مثنیٰ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مؤخر الذکر دمشق میں ایک جگہ وعظ فرما رہے تھے۔ اثنائے واعظ میں کسی شخص نے یہ سوال کیا

کہ آپ کی رائے اس حدیث کے بارے میں کیا ہے کہ ''میں علم کا شہر ہوں اور علی رضی اللہ عنہ اس کا دروازہ ہیں''؟ ابوسعد نے قدرے تامل کے بعد جواب دیا کہ ہاں یہ حدیث تو ہے لیکن اس کے بارے میں کچھ انہی لوگوں کو صحیح علم ہے جو اسلام میں بلند مقام شخصیتوں کے حامل ہیں۔ صحیح حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"انا مدینة العلم و ابوبکر اساسها و عمر حیطانها و عثمان سقفها و علی بابها"

''میں علم کا شہر ہوں، ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کی بنیاد، عمر رضی اللہ عنہ چہار دیواری، عثمان رضی اللہ عنہ چھت اور علی رضی اللہ عنہ دروازہ ہیں۔''

سامعین اس حدیث سے بے حد محفوظ و مسرور ہوئے اور ابوسعد سے یہ دریافت کیا کہ اس کے راوی کون کون ہیں لیکن اس کے جواب میں ابوسعد نے سکوت اختیار کیا جس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ ایجادِ بندہ ہے۔ اس طرح سیاسی مصالح کی بنا پر احادیث وضع کی جاتی تھیں۔ رفتہ رفتہ ان جعلی احادیث کی تعداد میں اتنا اضافہ ہوا کہ مسلمانوں کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہیں دین کا نقشہ ہی نہ بدل جائے کیونکہ اکثر جعلی احادیث سے قرآنی تعلیمات کی نفی ہوتی تھی۔

اموی دور میں جعلی احادیث کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ عہد عباسیہ میں جب عنانِ خلافت مامون الرشید نے سنبھالی یعنی عہد نبوت سے دو سو سال بعد تو اس وقت پتہ چلا کہ ہزاروں جعلی احادیث رواج پا چکی ہیں اور ان میں اتنا تخالف و تضاد ہے کہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس دور میں جامعین نے احادیث کی جمع و تدوین کا کام شروع کیا۔ مؤرخین نے آنحضرت ﷺ کی سیرت پر قلم اٹھایا۔ واقدی، ابن ہشام اور مدائنی مامون الرشید کے عہد میں بقید حیات تھے۔ ان کی تصانیف بھی اس زمانہ میں منظر عام پر آئیں لیکن ان میں اور اس عہد کے دیگر مصنفین میں جرأت نہ تھی کہ وہ خلیفہ وقت کے نظریات کے خلاف کچھ لکھ سکیں لہٰذا احادیث کا یہ معیارِ صحت کہ حدیث کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھا جائے، نظر انداز کر دیا گیا اگر وہ اس معیارِ صحت پر جمے رہتے تو ان کا انداز تحریر بدل جاتا کیونکہ جدید اسلوب میں یہی کچھ ہوتا ہے لیکن زمانے کا مزاج اور حالات کا تقاضا یہ تھا کہ اس دور کے مصنفین کہیں اس معیارِ صحت پر کاربند ہوں تو کہیں اس سے صرفِ نظر کریں۔ متاخرین نے بھی دیکھا دیکھی سیرت نگاری میں متقدمین کی روش اختیار کی۔ اگر یہ مؤرخ انصاف پسند ہوتے تو ان روایات کی نقل کے سلسلہ میں حدیث مذکورہ بالا ان کے پیش نظر ضرور رہتی جو رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ سے تعلق رکھتی ہے۔ انہیں چاہئے تھا کہ صرف ان روایات پر اعتماد کرتے جو قطعی دلائل سے ثابت ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ جو روایتیں ہیں انہیں کوئی اہمیت اور کوئی وزن نہ دیتے۔ ماضی میں بزرگانِ دین کی ایک جماعت نے اس نظریہ سے اتفاق کیا ہے اور حال میں بھی حکمائے اسلام نے اسے قبول کیا ہے۔ شیخ محمد مصطفی مراغی اس کتاب کے تعارف میں رقمطراز ہیں:

رسول کریم ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم کے سوائے اور کچھ نہ تھا اور یہ قرآن عقلی معجزہ ہے اور بوصیری (صاحب قصیدہ بردہ) نے کیا خوب کہا ہے:

لم يمتحنا بما تعيا العقول به
حرصاً علينا فلم نَرتَب ولم نهم

ہم کو کسی ایسی آزمائش میں نہیں ڈالا جس سے ہماری عقلیں عاجز و درماندہ ہوجائیں۔ یہ رعایت ہمارے ساتھ اس لئے برتی گئی ہے کہ ہم وہم و شک میں مبتلا ہوں نہ ششدر و حیران ہوں۔

مرحوم سید محمد رشید الرضا صاحب مجلہ المنار نے اس کتاب پر اعتراض کرنے والوں کے بارے میں یہ تحریر کیا ہے:

''ہیکل (مؤلف کتاب) پر اہل سلوک اور دیگر ارباب خبر و نظر نے سب سے بڑا جو اعتراض کیا ہے وہ معجزات اور خوارقِ عادات سے متعلق ہے۔ میں نے اپنی کتاب ''وحی محمدی'' میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے اور یہ ثابت کردیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی رسالت پر قرآن کریم تنہا ایک قاطع حجت ہے۔ تمام انبیاء کی نبوت اور ان کے معجزات کی شہادت صرف قرآن نے دی ہے۔ ان کے اثبات کے لئے اس کے سوائے اور کوئی وسیلہ نہیں۔ اربابِ فکر و نظر کے نزدیک خوارقِ عادات کی حیثیت، علامت کی ہے، اسے حجت نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ہمارے دور میں بھی زمانہ قدیم کی طرح اس کی مثالیں نظر آئی ہیں اور یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ معجزات و خوارقِ عادات پر اعتقاد رکھتے ہیں ان میں توہم پرستی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ میں نے جہاں معجزات سے عوام کی خوش عقیدگی کی وجہ ظاہر کی ہے وہاں وہ فرق بھی واضح کردیا ہے جو خوارقِ عادات اور حوادثِ کونیہ میں پایا جاتا ہے۔''

محتاط بزرگ شیخ محمد عبدہٗ اپنی تصنیف ''اسلام اور نصرانیت'' کے آغاز میں رقمطراز ہیں کہ:

''اسلام نے ایمان باللہ اور وحدانیت کی دعوت کے سلسلے میں عقلی دلائل کا سہارا لیا ہے، اس نے خوارقِ عادات کے بیان سے کسی کو مبہوت نہیں کیا، وہ نہیں چاہتا کہ عجائب کے مشاہدہ سے نگاہیں خیرہ ہوں یا آسمان سے اس زور کی کڑک سنائی دے کہ زبانیں گنگ ہوکر رہ جائیں یا خدا کی قدرت سے اس زناٹے کا شور ہو کہ غور و فکر کی صلاحیتیں جواب دے جائیں۔ معدودے چند مسلمانوں کے سوا جن کی تعداد درخورِ اعتناء نہیں، تمام مسلمان اس چیز پر متفق ہیں کہ ایمان باللہ کو ایمان بالرسالت پر فوقیت حاصل ہے۔ خدا

پر ایمان لائے بغیر پیغمبر پر ایمان نہیں لایا جاسکتا۔ اس بنیاد پر انبیاء کے ارشادات اور صحف سماویہ کو ایمان باللہ کی بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ بات عقل میں نہیں آسکتی کہ جب تک آپ کا ایمان خدا پر نہ ہو، آپ کی کتاب پر ایمان لے آئیں البتہ اگر خدا پر پہلے سے ایمان ہے تو اس کے رسول، اس کی کتاب پر بھی ایمان لایا جاسکتا ہے۔"

میرا خیال ہے کہ اگر متقدمین عصری تقاضوں سے مجبور نہ ہوتے اور متاخرین یہ فرض نہ کر لیتے کہ ان معجزات کے بیان سے جو قرآنِ حکیم میں مذکور نہیں، لوگوں کے ایمان تازہ ہوں گے اور اس میں اگر فائدہ ہے تو اتنا ہی نقصان بھی ہے تو یہ سیرت نگار مذکورہ بالا نظریہ کے پیش نظر معجزات کی نقل و روایت سے مجتنب رہتے۔ اگر آج یہ سیرت نگار بقید حیات ہوتے تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہوتی کہ دشمنانِ اسلام، اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں کس طرح ان کے بیان کردہ معجزات کی آڑ لے رہے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد یہ سیرت نگار حدودِ قرآن سے کبھی تجاوز کی جرأت نہ کرتے اور ہمیں امید ہے کہ غزالی، شیخ محمد عبدہٗ اور مراغی کے خیالات سے انہیں پورا پورا اتفاق ہوتا۔ یہ سیرت نگار علماء ہوتے تو دیکھتے کہ ان کی روایات سے ایمان و یقین کی بنیادیں تو کیا استوار ہوتیں دل و دماغ میں بھی تشویش و اضطراب کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ ان حالات میں یقیناً یہ سیرت نگار انہی شواہد و نظائر پر اکتفا کرتے ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ جن روایات کو بارگاہِ عقل و شعور میں سند قبول نہ مل سکے، ان کا بے فائدہ ہونا ظاہر ہے۔ ایسے شخص پر جو اپنی علمی تحقیق سے اسلام اور ہادیٔ اسلام ﷺ کی سوانحی خدمت سرانجام دینا چاہتا ہے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی سیرت ایسے دلپذیر انداز میں قلمبند کرے کہ بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے زمین ہموار ہو اور ایسے حقائق کا انکشاف ہو جن کی بنیاد پر تمدن و معاشرت کی صحیح اقدار کا تعین ہو سکے۔

اگر ہم روایات سیرت و حدیث کی تطبیق، آیات قرآنی سے کرتے تو معجزات کے بارے میں ہماری رائے بھی وہی ہوتی جس کا اظہار علمائے محققین نے کیا ہے۔ کفار مکہ، پیغمبر خدا ﷺ سے یہ کہتے تھے کہ اگر خدا یہ چاہتا ہے کہ ہم آپ کی تصدیق کریں تو بہتر یہ ہے کہ آپ کے ذریعہ معجزات کے ظہور کا اہتمام کرے۔ قرآن نے کفار مکہ کا مطالبہ قوی دلائل سے رد کر دیا جس قسم کے معجزات کا مطالبہ یہ کفار کرتے تھے ان کا ذکر قرآن کریم کی ان آیات میں کیا گیا ہے:

وَقَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿٩٠﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿٩١﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿٩٢﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٣﴾ (سورۃ الاسراء: ۹۰ تا ۹۳)

Marfat.com

"اور وہ کہتے تھے کہ ہم آپ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک آپ ہمارے لئے زمین سے چشمہ جاری نہ کردیں یا آپ کے لئے انگور اور کھجور کا ایک باغ ہو جس کے درمیان نہریں جاری ہوں یا جیسا کہ آپ کا ادعا ہے آسمان کے ٹکڑے ہم پر گرا دیجئے یا ایسا ہو کہ خدا اور فرشتے ہمیں آمنے سامنے دکھائی دیں یا آپ کے لئے سونے کا محل ہی ہم دیکھ سکیں یا آپ سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جائیں مگر صرف یہ چڑھائی کافی نہ ہوگی آپ ایک کتاب بھی وہاں سے اپنے ہمراہ لائیں جسے ہم پڑھ کر بھی دیکھ لیں، آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ پاک ہے میں بشر ہوں اور اس کا رسول ہوں۔"

ایک دوسرے مقام پر یہ آیات آئی ہیں۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠٩﴾ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١١٠﴾ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿١١١﴾ (سورۃ الانعام: ۱۰۹ تا ۱۱۱)

"اور (منکرین) نے خدا کے واسطے دے کر اور قسمیں کھا کھا کر کہا اگر ان کے پاس کوئی نشانی (یا واضح دلیل) آئے تو وہ ضرور ایمان لے آئیں گے، (اے رسول ﷺ) ان سے کہہ دیجئے علامات و نشانات تو اللہ کے پاس ہیں (یعنی صرف اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں) اور ہم ان کے دل اور ان کی آنکھیں الٹ دیں گے (دیدہ و دل کی فطری صلاحیتوں پر پردے ڈال دیں گے) اور ہم انہیں چھوڑے رکھیں گے سرکشی کے عالم سرگشتہ و برگشتہ۔ اگر ہم (ان کے یقین کے لئے) ان کے پاس فرشتے بھیجیں، مردے ان سے بولیں اور دوبارہ زندگی بخشیں ان کے سامنے ہر چیز کو تو یہ لوگ پھر بھی ایمان کہاں لانے والے ہیں مگر اس صورت میں ایمان لانے کا امکان ہے اگر اللہ چاہے لیکن ان میں اکثر جاہل ہیں۔"

قرآن حکیم کے سوائے کوئی ایسا معجزہ جسے مخلوق کی ابدی ہدایت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہو، معلوم و مذکور نہیں ہے حالانکہ قرآن ان معجزات کے ذکر سے خالی نہیں جو دیگر انبیائے علیہم السلام کی وساطت سے ظہور میں آئے نیز ان متعدد نعمائے ایزدی کا تذکرہ بھی قرآن میں ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو نوازا، پھر ان آیات میں خطاب بھی نبی کریم ﷺ ہی سے ہے جو امور قرآن کریم میں آنحضرت ﷺ سے

Marfat.com

متعلق مذکور ہے ان سے سنت تکوینی کی نفی نہیں ہوتی۔

جب خود قرآن کریم نے معجزات نبویہ کو کوئی اہمیت نہیں دی اور از روئے احادیث بھی ان کا کوئی مقام نہیں تو پھر مقام حیرت ہے کہ آیا وہ کون سے محرکات ہیں جن کے تحت مسلمانوں کے ایک گروہ نے اس چیز پر اصرار کیا کہ مادی معجزات آنحضرت ﷺ کے ہاتھوں بھی ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ اس کا سبب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ جب لوگوں کو قرآن کریم میں سابق انبیاء علیہم السلام کے معجزات سے متعلق علم ہوا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس قسم کے مادی معجزات اثباتِ رسالت کے لئے ناگزیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معجزات سے متعلق ان روایات کو بھی جو سرے سے قرآن کریم میں مذکور نہیں ہیں، اہمیت دیتے اور درست تسلیم کرتے ہیں وہ اپنی دانست میں یہ خیال جمائے ہوئے ہیں کہ خوارقِ عادات سے متعلق روایات کی کثرت اثبات رسالت کے لئے ممد و معاون ثابت ہوگی اور اس سے رسالت پر یقین و اعتماد کی بنیادیں اور مستحکم ہو جائیں گی۔ یہ لوگ اس چیز پر غور نہیں کرتے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی دیگر انبیائے کرام علیہم السلام سے مماثلت مناسب نہیں، آنحضرت ﷺ کی رسالت سابق انبیاء علیہم السلام کی نبوت و رسالت سے مختلف ہے۔ نبی کریم ﷺ ایک طرف تو خاتم النبیین ہیں اور دوسری طرف وہ اولین رسول ﷺ جو عالمین کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے۔ آپ کی رسالت کسی ایک قوم تک محدود و محصور نہیں ہے۔ اسی سبب سے منشائے ایزدی یہی تھی کہ آپ کے ذریعہ جو معجزہ ظہور میں آئے اس کی بنیاد عقل پر بھی ہو اور انسانیت پر بھی تاکہ جن وانس ایڑی سے چوٹی تک کا زور بھی لگائیں تو اس کی نظیر نہ لاسکیں۔ یہ معجزۂ قرآن ہے اور ان تمام معجزات پر اسے فوقیت حاصل ہے جن کی قرآنی آیات میں نشاندہی کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کی منشا یہ تھی کہ وہ اپنے پیغمبر ﷺ کی رسالت کا ثبوت ایسے واضح دلائل و براہین کی روشنی میں دے جن کا کسی کے پاس کوئی توڑ ہی نہ ہو نیز مقصودِ الٰہی یہ بھی تھا کہ وہ اپنے دین کو آنحضرت ﷺ کی حیات میں فروغ دے تاکہ لوگوں کے دل و دماغ پر اس کی قدر و منزلت اور اس کی رفعت وعظمت کا سکہ بیٹھے اور ان پر یہ واضح ہو جائے کہ اگر کوئی غالب دین ہے تو وہ اسلام ہی ہے اگر اللہ تعالیٰ مادی معجزات کے ذریعہ مسلمانوں کو راہ ہدایت دکھانی چاہتا تو اس کی قدرت سے یہ چیز بعید نہ تھی لیکن اس صورت میں لوگ کسی ایسی بات کو ہرگز تسلیم نہ کرتے جو ان کی عقل کی کسوٹی پر پوری اترتی نظر نہیں آتی۔ لوگ آنحضرت ﷺ کی رسالت پر اس چیز کی بنا پر ایمان لائے ہیں جسے دل و دماغ دونوں نے قبول کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو جہاں حجت قرار دیا وہاں اسے معجزۂ رسول ﷺ کی حیثیت بھی دی۔ غلبہ دین کا وسیلہ ایسے مسکت و قاطع دلائل قرار پائے جن کا جواب ہی نہ دیا جاسکے۔ تقویت ایمان کا سبب بھی یہی دلائل بنے۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ جس دین کی بنیادیں اتنی محکم اور استوار ہوں گی، اسی کا پیغام تاریخ کے ہر دور میں مختلف اقوام کے لئے قابل قبول ہوسکتا ہے۔

اگر آج کوئی گروہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو اور قرآن کے سوائے اور کسی معجزہ پر ایمان نہ لائے تو یہ نہیں

Marfat.com

کہا جاسکتا کہ اس کا ایمان ناقص اور اس کا اسلام ضعیف ہے۔ اس صورت میں جبکہ تمام معجزات کی تائید و تصدیق وحی الٰہی سے نہیں ہوتی اگر معجزات پر تنقید بھی کی جائے تو اس سے ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوسکتا۔ اگر کوئی شخص ان معجزات پر صاد کرتا ہے جو از روئے دلیل صحیح ثابت ہوتے ہیں اور باقی دیگر معجزات سے متعلق علم و تحقیق کی بنیاد پر اس کا مسلک جدا ہے تو وہ غالی نہیں ہے نہ ہم اسے معصیت کار کہہ سکتے ہیں۔ وجود باری پر ایمان کے لئے کسی معجزہ کی حاجت نہیں۔ کائنات پر غور و فکر کے بعد خدا کی خدائی اور اس کی ذات پر ایمان ضروری ہوجاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس آنحضرت ﷺ کی رسالت کی تصدیق کے لئے بھی قرآن کے سوائے اور کسی معجزہ کی ضرورت نہیں ہے، آپ نے بحکم الٰہی لوگوں کو اسلام و ایمان کی دعوت دی اور ان نواہی سے باز رکھا جو گمراہی کا باعث ہوسکتے تھے۔ ہر وہ شخص جو کثرت سے قرآن کی تلاوت کرے گا اس پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوجائے گی اور یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ رسالت پر ایمان نہ لائے۔ اگر آج کوئی غیر مسلم طبقہ معجزۂ قرآن کے علاوہ دیگر معجزات سے قطع نظر مشرف بہ اسلام ہوجائے تو یقینی امر ہے کہ اس کے افراد کسی ذہنی خلجان میں مبتلا نہیں ہوں گے کیونکہ انہوں نے ایک ایسی دعوت پر لبیک کہا ہے جس کا خمیر مایہ فطرت اور اس کے ازلی و ابدی قوانین ہیں۔ ان کے لئے معجزات میں کیا کشش ہوسکتی ہے؟ خدا پر ان کے ایمان کی اساس یہ وسیع و عریض کائنات اور اس کا نظم ہے۔ اس کائنات کے حدودِ زمان و مکان کے تصور سے عقل قاصر اور ذہن عاجز ہے لیکن اس کا نظام ایک ایسے نہج پر چل رہا ہے جس پر لیل و نہار کی گردشیں کبھی اثر انداز نہیں ہوسکیں نہ ہوسکتی ہیں۔

ہر دو گروہ کے نزدیک معجزات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ان کی نظر میں ان کا وجود عدم برابر ہے۔ ایک فریق معجزات پر کبھی غور کرتا ہے تو وہ اسے عنایت ایزدی کا مظہر قرار دیتا ہے لیکن بایں ہمہ وہ اسے شرطِ ایمان نہیں خیال کرتا۔ اکابر اسلام میں سے غالب اکثریت کا یہ خیال ہے کہ اس قسم کا ایمان کامل درجے کا ایمان ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ وہ ایمان جس کے دامن پر ثواب و عذاب کے خوف و طمع کی گرد نہ جمی ہو، اصل ایمان ہے۔ ان کی نظر میں مؤمن کی شان یہ ہے کہ جو امید و بیم کے احساسات کے بغیر خدا پر ایمان لائے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ مؤمن اپنے آپ کو تجلیاتِ ربانی میں گم کردے کیونکہ اسی کی ذات مرجع الامور ہے۔ ہمارا علاقہ اسی کی ذات سے ہے اور انجام کار ہماری بازگشت اسی کی جانب ہوگی۔

آج معجزات کے بغیر جن لوگوں کا ایمان خدا اور رسول پر ہے، ان کی مثال ان صحابہ رضی اللہ عنہم کی سی ہے جو عہد نبوت میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو کہ کوئی شخص معجزات سے متاثر ہو کر ایمان لایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لاتے تھے وہ یا تو برہانِ نبوت سے اثر پذیر ہوتے یا نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے۔ تمام کتب سیر میں یہ ذکر ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ خدا نے مجھے راتوں رات مسجد الحرام سے بیت المقدس تک سیر کرائی تو وہ لوگ بھی جو

آپ پر ایمان لاچکے تھے تذبذب میں پڑ گئے۔ جب آنحضرت ﷺ ہجرت کے ارادہ سے عازمِ مدینہ ہوئے تو اکابر قریش نے اعلان کیا کہ جو شخص آپ ﷺ کو زندہ یا مردہ لے آئے گا، اسے انعام سے نوازا جائے گا۔ ایک شخص سراقہ بن جعشم انعام کی طمع میں اس بات پر آمادہ ہوا اور اس نے آنحضرت ﷺ کا تعاقب کیا۔ کتب سیر میں مذکور ہے کہ اثنائے راہ میں سراقہ کے گھوڑے نے کئی بار ٹھوکر کھائی لیکن وہ پھر بھی ایمان نہ لایا۔ تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کوئی مشرک صرف معجزہ کی بنا پر کبھی ایمان لایا ہے۔ مشرکین کے لئے ایسے ایمان کا ثبوت نہیں ملتا جیسے فرعون کے جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز سے ایمان لائے تھے (یہ جادوگر اس وقت ایمان لائے تھے جب عصائے موسوی نے ان کے خودساختہ جادو کے سانپوں کو نگل لیا تھا۔)

علاوہ بریں سیرت و حدیث کی کتب میں جو معجزات مذکور ہیں، ان پر بھی نقد و بصر کے دروازے کھلے ہیں۔ ہم نے اس مقدمہ میں داستانِ غرانیق کی جانب اشارہ کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی تحریر کیا ہے کہ اس کا ذکر کتب احادیث میں آیا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی صحت میں کلام ہے۔ فصل ششم میں اس مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ شق صدر کی داستان بھی جس کی روایت آنحضرت ﷺ کی دایہ حلیمہ نے آمنہ بی بی سے کی، موردِ اختلاف ہے۔ نیز یہ مسئلہ بھی مابہ النزاع ہے کہ واقعہ شق صدر کے وقت آنحضرت ﷺ کی عمر کیا تھی۔ زید رضی اللہ عنہ اور زینب رضی اللہ عنہا کی داستان سے متعلق جو کچھ حدیث و سیرت کی کتب میں مذکور ہے اس کی بھی کوئی اصل نہیں۔ سفر تبوک میں جس معجزہ کے ظہور کا ذکر کیا جاتا ہے اس کے بارے میں بھی آراء میں اتفاق نہیں ہے۔ صحیح مسلم میں بروایت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ یہ نقل ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے رفقا سے فرمایا:

> ''ان شاء اللہ تم کل چشمہ تبوک تک جا پہنچو گے لیکن طلوع فجر سے قبل جو شخص بھی وہاں پہنچے وہ چشمہ کے پانی میں اس وقت تک ہاتھ نہ ڈالے جب تک میں نہ پہنچ جاؤں۔''

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ہم چشمہ پر پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ دو آدمی ہم سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔ اس وقت یہ چشمہ ایک لکیر سا تھا اور اس میں پانی کی مقدار بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ آنحضرت ﷺ نے ان ہر دو اشخاص سے پوچھا کہ آیا تم نے پانی میں ہاتھ ڈالے ہیں، انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے انہیں برا بھلا کہا۔ بعد ازاں لوگوں نے چلوؤں سے چشمہ کا پانی لے کر ایک جگہ جمع کر لیا لیکن آپ ﷺ نے اس پانی سے ہاتھ منہ دھوئے اور بچا ہوا پانی پھر چشمے میں ڈال دیا۔ فوراً پانی کا ریلا آیا۔ سب لوگوں نے سیر ہو کر پانی پیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ ''اے معاذ! اگر تمہاری عمر نے وفا کی تو تم یہاں ایک سرسبز و شاداب باغ دیکھو گے۔''[10]

کتب سیرت میں داستانِ تبوک کا بیان کسی اور انداز میں ہوا ہے۔ وہاں معجزہ کا کوئی ذکر نہیں ہے اور ان میں جو روایات مندرج ہیں، وہ بھی صحیح مسلم کی روایت سے مختلف ہیں۔ ابن ہشام اس داستان کی نقل کے

Marfat.com

بعد رقمطراز ہے۔

"ابن اسحاق کا بیان ہے کہ صبح کے وقت لوگوں کو پانی نہ ملا تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض معروض کی۔ آپ نے دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے بادل بھیجا جو اس زور سے برسا کہ لوگ سیراب ہو گئے۔ ضرورت کے مطابق پانی کا ذخیرہ کر لیا گیا۔ ابن اسحاق راوی ہے کہ محمود بن لبیر نے بنی عبدالاشہل کے بعض افراد سے سنا اور عاصم بن قتادہ نے محمود سے سن کر مجھ سے بیان کیا۔ عاصم کی روایت ہے کہ میں نے محمود سے پوچھا کہ آیا اس زمانہ میں لوگ جانتے تھے کہ نفاق کیا ہوتا ہے۔ اس نے جواب دیا، ہاں بخدا لوگ اپنے بھائی، باپ، چچا اور دوسرے قرابت داروں کے نفاق سے باخبر تھے لیکن وہ یہ بات ایک دوسرے سے مخفی رکھتے تھے۔ بعد ازاں محمود نے کہا، مجھ سے میرے رفقاء میں سے چند نے بیان کیا کہ چند اشخاص جن کی طینت میں نفاق رچا بسا تھا، سفر و حضر میں آنحضرت ﷺ کے ہمراہ رہتے تھے۔ جب سفر میں پانی کی ضرورت پیش آئی تو پیغمبر خدا ﷺ کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے مینہ برسا دیا اور لوگ سیراب ہو گئے۔ ہم نے کہا، تجھ پر حیف ہے کیا کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے؟ اس نے کہا کہ ایک ابر تھا جو موسلا دھار برستا ہوا نکل گیا۔"

اس روایت کا اختلاف علمی لحاظ سے واقعہ کو مشتبہ کر دیتا ہے اور اس کے اثبات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ان اربابِ علم و تحقیق کے لئے یہ لازم و مناسب ہے کہ وہ ایک روایت کو دوسری روایات پر محض ترجیح ہی نہ دیں کیونکہ اس سے راجح کی صحت اور مرجوح کی عدم صحت کا بین ثبوت نہیں ملتا۔ ضروری یہ ہے کہ جس روایت کی صحت نہ ملے اس سے قطع نظر کر لینا چاہئے۔ اگر بعد میں دوسروں کی تحقیق و تدقیق کے بعد کوئی قطعی دلیل مل جائے تو فبہا ورنہ بصورت دیگر اسے ظنی قرار دیا جائے گا۔

میں نے اپنی تالیف "حیات محمد ﷺ" میں تحقیق کا یہی انداز اختیار کیا ہے۔ آغاز ہی میں، میں نے اپنے دل میں یہ بات ٹھان لی تھی کہ حتی الوسع میں جدید اسلوب کی پیروی میں علم و تحقیق سے کام لوں گا چنانچہ میں نے اس پر عملدرآمد کیا۔ مقدمہ کتاب میں بھی میں نے ذکر کیا ہے اور آخر میں بھی کسی قدر وثوق کے ساتھ اس بات کی صراحت کی ہے کہ قدرت نے مجھے اس بات کی توفیق دی اور یہ صلاحیت بخشی کہ اس تالیف کا علمی معیار پست نہ ہونے دوں۔ بال آخر میں نے اپنا کام پایہ تکمیل کو پہنچایا اور مستقبل میں مزید تحقیقی مباحث کے لئے زمین ہموار کر دی۔ مجھے امید ہے بہت سے روحانی اور اخلاقی مسائل کی گتھیاں سلجھ جائیں گی اور انسانیت کو تمدنِ جدید کی شاہراہ پر گامزن ہونے کے مواقع نصیب ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے اس موضوع پر جو تحقیقی مواد جمع کیا ہے اس کی روشنی میں بہت سے عقدے حل ہو سکیں گے، ایسے عقدے جنہیں لوگ مدت

Marfat.com

سے چیستاں سمجھے ہوئے ہیں۔ انسان پر حقائق و معارف جتنے زیادہ منکشف ہوں گے اسی نسبت سے کائنات کے ساتھ اس کا رابطہ استوار ہوگا اور اس رابطہ کے نتیجے میں جو فوائد حاصل ہوں گے ان میں کوئی کلام نہیں کیا جاسکتا۔ آج اس سائنسی دور میں برق و ایثر (ایتھر) کی دریافت اور ان کے خواص کی تحقیق کے باعث انسان، مادی اسباب سے استفادہ کررہا ہے۔ اندریں حالات ہر وہ شخص جو اس قسم کے موضوعات پر تحقیقی مواد پیش کرے، اس کا مرکز نظر صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت ہونی چاہئے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس موضوع سے مقصود محض دینی مباحث نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ لوگ ان راہوں سے آشنا ہوں جو ترقی کی منزل کو قریب سے قریب تر کردیتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان راہوں کی نشاندہی کی ہے اگر انسان فہم وفراست اور نور بصیرت سے کام نہ لے تو اس مقصد کا حصول دشوار ہے جب تک فکر و تحقیق کی بنیاد علم وعرفان پر استوار نہ ہوگی اور اعلیٰ علمی صلاحیتیں بروئے کار نہیں آئیں گی، نہ صرف غلطی بلکہ حقیقت سے انحراف کا غالب احتمال ہے۔ انسان کے افکار وخیالات بالعموم مزاج کے تابع ہوتے ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ یکساں قابلیت کے ایسے اشخاص جن کی عملی سرگرمیاں بھی ایک ہی مرکز کے گرد گھومتی ہیں، اختلاف طبائع کے باعث مختلف الرائے ہوتے ہیں اور ان کی سرگرمیوں کے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں ان میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض لوگوں میں جودتِ طبع اور سرعت فکر ہوتی ہے اور اس کی بدولت وہ بعجلت تمام اپنے افکار و خیالات کو عملی جامہ پہنادیتے ہیں۔ بعض لوگ صوفی منش اور تجرد پسند ہوتے ہیں اور دنیا سے انہیں کوئی لگاؤ نہیں ہوتا، بعض اتنے مادہ پرست اور مادی اسباب سے اتنے اثر پذیر ہوتے ہیں کہ ان کے افکار، مادی حدود میں محصور رہتے ہیں، باوجود اس کے کہ وہ روحانی قوتوں کا احساس رکھتے ہیں لیکن ان کے افکار میں یہ قوتیں راہ نہیں پاتیں۔ علاوہ بریں بہت سے لوگ طبعاً اور مزاجاً ایک دوسرے سے اتنے مختلف واقع ہوئے ہیں کہ مسائل پر جن خیالات کا وہ اظہار کرتے ہیں ان میں کافی سے زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ اختلاف صنعت وحرفت اور عملی مسائل کے سلسلہ میں تو ایک نعمت غیر مترقبہ ہے لیکن علمی افکار وخیالات میں جن کا مقصود حقائق کی دریافت ہے مناسب نہیں کیونکہ جس شخص کا منصب تاریخی مسائل کی چھان پھٹک ہوتا ہے اسے اپنی طبیعت اور اپنے مزاج کے اثرات کا تابع نہیں ہونا چاہئے۔ اس کا فرض یہ ہے کہ وہ علمی تحقیق کے قواعد و ضوابط کی پوری پوری پابندی کرے۔ تاریخ و سیرت کے عملی مسائل پر ذاتی میلانات اور شخصی رجحانات کی چھاپ ہرگز نہیں ہونی چاہئے۔ اکثر مستشرقین نے علمی تحقیق میں اپنے ذاتی رجحات کو دخل دیا ہے اور بہت سے مسلمانوں نے بھی یہی روش اختیار کی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض نے ان مسائل کو جو دوسروں کے رجحانات کے نتائج ہیں اپنی تحقیق کی بنیاد ٹھہرایا اور ان پر اپنی اغراض کا لیپ بھی چڑھا دیا اگر یہ لوگ دوسروں کی تصانیف کے بارے میں تحقیق کرتے تو وہ مطالب جو مصنفین کے ذہنی اختراعات کا نچوڑ ہیں ان کی نگاہ میں اتنے اہم اور اتنے وقیع نہ ٹھہرتے۔ اس صورت میں ان کی تحریریں علمی اصول تحقیق کے مطابق

Marfat.com

ہوتیں اور دل و دماغ بھی ان کے اثرات قبول کرتے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کے آثار پر بقائے دوام کی مہریں ثبت ہو جاتیں۔ میں اس مقدمہ میں اجمالاً اس گروہ کے کچھ اشتباہات سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ توفیق ایزدی میرے شامل حال رہے گی تا کہ عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

حقیقت یہ ہے کہ مستشرقین کی نیت میں خواہ کتنا ہی خلوص کیوں نہ ہو اور وہ علم و تحقیق کی کتنی ہی رعایت کیوں نہ کریں پھر بھی وہ عدل و انصاف کو اپنا شعار نہیں بنا سکتے۔ عربی زبان کے اسرار و رموز پر یہ حاوی نہیں ہو سکتے۔ علاوہ بریں ان پر مسیحیت کا اتنا غلبہ ہے کہ دوسرے مذاہب ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتے، ان میں بعض عیسائیت کے پابند ہیں لیکن ان کے افکار پر اس کشمکش کا اثر غالب ہے جو یورپ میں عیسائیت اور علم کے درمیان جاری ہے مگر اس بنا پر انصاف پیشہ مستشرقین پر نکتہ چینی درست نہ ہوگی کیونکہ کوئی شخص اپنے ماحول کے اثرات سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ بہر حال یہ اثرات، اسلام کے بارے میں ان کی تحقیق کی راہ کج کر دیتے ہیں اور وہ حقیقت کی راہ سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ وہ دانشمند جو ممالک اسلامیہ میں سکونت پذیر ہیں عام اس سے کہ وہ علومِ دینی سے شغف رکھتے ہوں یا دیگر علوم سے، وہ اسلام کے متعلق مسائل پر تحقیقی نظر ڈالتے وقت دائرہ عدل و انصاف سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ اگر دنیائے اسلام کے ذی ہوش مصنفین جو عربی کے نکات اور عرب معاشرت کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ ہیں اس کام کا بیڑا اٹھائیں تو یقین ہے کہ ان کی تحقیق سے اگر تمام مستشرقین نہیں تو کم سے کم چند ضرور راہ راست پر آ جائیں اور ان کے اکثر نظریات کی اصلاح ہو جائے۔ اس صورت میں قوی امکان ہے کہ وہ دانشمندانِ اسلام کے اخذ کئے ہوئے نتائج پر بھی صاد کریں۔

اگرچہ ان نتائج کا اخذ و ترتیب اتنا سہل الحصول نہیں تاہم اگر بلند ہمتی اور عالی حوصلگی سے کام لیا جائے تو اس کام میں دشواری قطعاً پیش نہیں آ سکتی۔ بہر حال یہ کام چند در چند اہمیت کا حامل ہے۔ اسلام اور انسانیت کے مستقبل سے اس کا جو تعلق ہے۔ ظاہر ہے میرے نزدیک اسلام سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے بابِ اجتہاد بند ہونے تک دورِ اوّل میں مسلمان متحد و متفق تھے۔ خلافت، فتنہ، ارتداد اور سلسلہ فتوحات کے دروازے کھل گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہوا اور ایسے انقلابات رونما ہوئے جو کبھی ظاہر تھے اور کبھی پوشیدہ۔ سیاسی حالات و واقعات مذہبی زندگی پر اثرانداز ہونے شروع ہوئے۔ پہلے اور دوسرے دور کا فرق واضح کرنے کے لئے ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس خطبہ کا (جو موصوف نے بیعت خلافت کے بعد دیا تھا) منصور عباسی کے اس خطبہ سے موازنہ کرنا چاہتے ہیں جو آخرالذکر نے برسر اقتدار آنے کے بعد دیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا خطبہ یہ تھا۔

> "اے لوگو! میں تمہارا سربراہ بن گیا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں اگر میں راہ راست پر چلوں تو میری نصرت و اعانت کرو لیکن اگر میرے قدم غلط پڑیں تو متنبہ کرو تا کہ میں راہ راست پر چلوں۔ راستی امانت ہے اور دروغ خیانت۔ جو تم میں

Marfat.com

سے کمزور ہیں وہ میری نظر میں طاقتور ہیں۔ ان شاء اللہ میں ان کی حق تلفی نہیں ہونے دوں گا۔ تم میں سے جو قوی ہیں وہ میرے نزدیک ناتواں ہیں۔ انشاء اللہ، میں ان سے حقدار کا حق لئے بغیر نہیں رہوں گا۔ جس قوم نے بھی خدا کی راہ میں جہاد سے پہلوتہی کی ہے، خدا نے اسے ضرور رسوا کیا ہے اور جس قوم میں بھی بدکاری نے رواج پایا ہے وہ کسی نہ کسی بلائے عظیم میں ضرور مبتلا ہوئی ہے۔ جب تک میں خدا اور رسول کی اطاعت کروں، میری اطاعت کرو۔ اگر میں خدا اور رسول کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تمہارے لئے جائز نہیں، اٹھو اور نماز ادا کرو، خدا تم پر اپنی رحمت کرے۔"

منصور عباسی نے یہ خطبہ دیا تھا:

"اے لوگو! میں روئے زمین پر قدرت الٰہی کا مظہر ہوں، قادر و قیوم کی تائید و توفیق سے تمہاری رہنمائی کرتا ہوں، اس نے اپنے مال کی نگہداشت مجھے سونپی ہے جسے میں اس کی منشا اور مشیت کے مطابق صرف کرسکتا ہوں۔ خدا نے مجھے اپنے مال کا نگہبان بنایا ہے (میری حیثیت ایک قفل کی سی ہے) اس کی منشا ہوگی تو میں اس مال سے تمہیں نوازوں گا اور اس کی مرضی نہ ہوگی تو میں یہ مال روکے رکھوں گا۔"

جب ان دونوں خطبات کا موازنہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دو صدی سے کم مدت میں اسلامی معاشرے میں کتنا تغیر رونما ہو چکا تھا۔ یا تو خلافت راشدہ میں شورائی نظام حکومت یعنی جمہوریت تھی یا عہد عباسیہ میں اس نے آمریت اور مطلق العنانی کی شکل اختیار کرلی۔ اسلام کے سیاسی نظام میں جو تغیرات راہ پا رہے تھے ان کے سبب اسلامی نظام حکومت میں انحطاط و اضمحلال کے آثار نمایاں نظر آنے لگے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے دوسو سال بعد تک تمدن اسلام کی شان و شوکت میں فرق نہیں آیا اور تھوڑے ہی وقفہ کے بعد ترقی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ سلاطین خاندان مغلیہ اور سلاجقہ کے ہاتھوں بہت سے ممالک کی تسخیر عمل میں آئی جس سے اسلامی سلطنت کا دائرہ اور وسیع ہوگیا۔ دورِ اول میں جو شہادت خلیفہ سوم پر منتہی ہوا، اسلامی معاشرہ میں صحیح اسلامی اصول جاری و ساری تھے اس لئے یہی ایک ایسا دور ہے جس پر حقیقت حال کی دریافت کے لئے اعتماد کیا جاسکتا ہے لیکن اس دور کے بعد اگرچہ اموی اور عباسی ادوار میں علوم و معارف کو کافی سے زیادہ فروغ ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اسلام کی روح کے منافی تھے، عجمیوں، یہودیوں اور عیسائیوں نے جو نام کے مسلمان تھے، نئے اصول و قواعد کو رواج دیا اور ستم ظریفی یہ کہ انہوں نے اپنے مؤقف کی تائید و توثیق میں جعلی احادیث بھی وضع کیں۔ انہوں نے خلفائے راشدین سے ایسی ایسی باتیں منسوب کیں جو ان کی سیرت اور ان کے مزاج سے قطعاً کوئی دور کی مناسبت بھی نہیں رکھتی تھیں۔

اس دور میں احادیث کے جو مجموعے مرتب ہوئے، وہ تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔

Marfat.com

ہمیں چاہئے کہ جو احادیث، قرآن کریم کی تعلیمات کے مطابق نہیں ہیں انہیں ہرگز قبول نہ کریں لیکن اس کے برخلاف جو ذخیرۂ احادیث، دورِ اول سے خلافت عثمانی کے اختتام تک ہے اس پر کامل اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ مہم خلوص و اخلاص کے ساتھ سر کرلی جائے تو اسلام کے صحیح اصول اور اس کے نظام کی شرح و بسط کی صورت نکل سکتی ہے یہی وہ اسلامی نظام تھا جس کی بدولت عرب کے صحرا نشیں چند سال میں ساری دنیا پر چھا گئے تھے۔ اگر یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ جائے تو انسانیت کے عروج و ارتقاء کی راہیں کھل جائیں اور انسان پر کائنات کے اسرار و رموز منکشف ہوں۔ آسودہ روزگاری اور بلند اقبالی کے اسباب بھی اس صورت میں فراہم ہوسکتے ہیں چنانچہ یہ علم کے کرشمے ہی تو ہیں کہ انسان دنیا کے مادی منافع سے بہرہ اندوز ہورہا ہے۔ اگر ہمارے عزم و ارادہ پر توفیق ایزدی کی چھاپ ہوتو ہم پھر دنیا میں اسلام کی فضیلت کے جھنڈے گاڑ سکتے ہیں۔ عربوں نے شروع میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں آج بھی سرانجام دیئے جاسکتے ہیں۔

علم و تحقیق اور انسانیت کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ ہم آنحضرت ﷺ کی سیرت کی تحقیق کریں کیونکہ صرف اسی ایک وسیلہ سے انسانیت اس تمدن کا سراغ پاسکتی ہے جس کی اسے اس دور میں جستجو ہے۔ اس تحقیق میں قرآن حکیم سے مدد لی جاسکتی ہے کیونکہ یہ وہ کتاب ہے جس میں باطل راہ نہیں پاسکتا اور اس کے دلائل و براہین کی تردید بھی محالات سے ہے۔ تیرہ صدیوں سے اس کے مندرجات غیر متبدل ہیں۔ ان میں کسی قسم کی کوئی تحریف اور آمیزش نہیں ہوئی۔ رہتی دنیا تک قرآن کریم کے ایک شوشے اور ایک نقطے میں فرق نہیں آسکتا۔ قرآن محفوظ و مصؤن رہے گا اور اللہ تعالیٰ کے اس اعلان کی صداقت ثابت ہوکر رہے گی۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (سورۃ الحجر:۹)

ہم نے قرآن کریم کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ قرآن رسول کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔ ایسا معجزہ جو قیام قیامت تک بدستور سابق قائم و دائم رہے گا اس لئے یہ لازم ہے کہ جو واقعات آنحضرت ﷺ کی سیرت سے قریب کا تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی تطبیق قرآنی آیات کی روشنی میں کی جائے اگر ان میں قرآن سے مطابقت پائی جائے تو صحیح قرار دیا جائے۔ بصورت دیگر ان کی تغلیط کی جائے۔ میں نے اپنی تالیف میں حتی الامکان یہی چیز ملحوظ خاطر رکھی ہے۔ طبع اول کے بعد میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے اس کام کی توفیق مرحمت کی اور یہ دعا کی کہ اس علمی تحقیق کے قیام و دوام کے لئے ان اشخاص کے ذریعے اسباب فراہم کرے جنہیں اس نے توفیق و ہدایت سے نوازا ہے۔

رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (سورہ الممتحنہ:۴)

”اے ہمارے رب ہم نے تجھ پر بھروسہ کیا اور تیری جانب رجوع ہوئے اور تیری ہی جانب ہماری بازگشت ہے۔“

Marfat.com

حواشی

۱۔ ''اس (قرآن) کے اندر باطل کے در آنے کی کوئی گنجائش نہیں۔''

۲۔ مستشرقین کے لئے کہ مذہباً مسیحی عقائد پر ہیں، سورۂ صف کی آیت مافی المتن (یَأْتِی مِنْ بَعْدِی اسْمُهُ أَحْمَدُ) میں لفظ ''احمد'' وہ سمندر بن گیا جسے پار کرنا ناممکن ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اسے الحاقی آیت کہہ کر اپنی سلامتی کے لئے رخ دوسری طرف پھیر لیا۔

اس لفظ (احمد) کا پس منظر انجیل مقدس کی وہ آیت ہے جس میں مسیح علیہ السلام نے اپنے بعد آنے والے نبی کی پیشین گوئی فرمائی جو انجیل کی اپنی زبان میں ''فارقلیط'' اور اس کے قدیم عربی ترجمہ میں ''احمد'' ہے۔ اگر مسیحی مستشرقین اسی طرح تسلیم کر لیتے تو جس طرح ان کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جناب مسیح علیہ السلام پر ایمان لانا ضروری تھا، اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد ''احمد'' کو بھی نبی تسلیم کرنا لازم قرار پاتا۔ مگر ان کا ایسا تسلیم کر لینا اسلام کا اقرار کرنا تھا جس سے پر ان کا دل آمادہ نہیں ہوتا۔ قارئین کی سہولیت کے لئے عرض گزار ہوں کہ ''فارقلیط'' یعنی ''احمد'' کی بحث سرسید مرحوم کی کتاب ''الخطبات الاحمدیہ'' کے دسویں خطبہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

۳۔ سرسید مرحوم نے (''الخطبات الاحمدیہ'' میں بضمن عنوان ''نازل ہونا قرآن کا سات قرأتوں یا قرائت مختلفہ میں'') اس کی جو مناسب وضاحت کی ہے، اسے مختصراً لکھا جاتا ہے: اس دور میں عربی حروف پر نقطے نہ لگائے جاتے تھے۔ عربی کے مضارع کے بعض صیغوں کے اول میں ت (تفعلون و تحکمون) آتی ہے، بعض میں ی (یفعلون و یحکمون) آتی ہے۔ نقطے نہ ہونے کی وجہ سے ان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اسی طرح مثلاً بعض حروف کے مخارج میں اختلاف ہے، جیسے اردو میں اہل پنجاب ''ق'' بھی ''ک'' کے مخرج سے ادا کرتے ہیں یعنی قول کو کول کر کے بولیں گے۔ اسی طرح بعض الفاظ کے حرف آخر کی اعرابی شکل میں بھی اختلاف تھا اور سب کو معلوم ہے کہ عربی لفظوں کا یہ اعراب ہر لفظ کے پہلے لفظ یا حرف کا نتیجہ ہو سکتا ہے مثلاً واؤ ایسا حرف ہے جو اسم کو جر بھی دیتا ہے اور اسم پر کوئی اعرابی اثر نہیں بھی ڈالتا۔ اوّل الذکر حرف جر اور دوسرا حرف عاطفہ ہے۔ اس مسئلہ میں بحث پر عبور کے لئے سرسید ہی کی زبان سے ''خطبات الاحمدیہ'' میں پڑھ لیا جائے تو اردو دان طبقے کے لئے زیادہ مفید ہوگا۔

۴۔ یہ واقعہ صحیح بخاری میں ابواب فضائل القرآن کے باب ''جمع القرآن'' میں تقریباً اسی طرح منقول ہے الا یہ کہ (۱) حضرت عثمانؓ نے زیدؓ کی اعانت کی، (۲) قریش کا تقرر فرمایا، (۳) ان کے اسمائے مبارک جناب عبداللہ بن زبیرؓ و سعید بن العاصؓ و عبدالرحمن بن الحارث بن ہشامؓ ہیں۔

حضرت ابوحذیفہؓ سے لے کر آخر تک یہ واقعات مزید شرح و بسط کے ساتھ ''شمس التواریخ'' جلد ۴ مؤلفہ حکیم محمد مظہر الحق مطبوعہ آگرہ کے دو مقامات پر منقول ہیں (زیر عنوان ''جمع قرآن'')۔ بہ عنوان ''طعن یازدہم متعلق بہ قرآن مجید متضمن بر مباحث متعددہ''

۵۔ از کتاب ''حیاتِ محمد'' مؤلفہ سر ولیم میور، صفحہ ۱۴ تا ۲۹۔

۶۔ ''حیاتِ محمد ﷺ'' مقدمۂ مؤلف، طبع ثانی، صفحہ ۴۵

۷۔ ایضاً۔

۸۔ ترجمہ: تم نے ان کے معبودانِ باطل میں لات و عزیٰ اور ان کے تیسرے رکن مناۃ کو بھی دیکھا ہے۔

۹۔ ''امید ہے کہ ان پرشکوہ اصنام کی شفاعت بھی عنداللہ مقبول ہو سکے گی!''

۱۰۔ صحیح مسلم، باب فی معجزات النبی ﷺ، جلد اول۔

Marfat.com

باب 1

تاریخ عرب کا پس منظر

دنیا میں تہذیب و تمدن کا گہوارہ

زمانہ قدیم سے تمدنِ انسانی کی تاریخ موضوعِ بحث بنی رہی ہے۔ نیز یہ سوال کہ اس تمدن نے اول اول کس گہوارہ میں نشوونما پائی ہے، بارہا زیرغور آیا ہے۔ عصر حاضر میں بھی یہ سلسلہ بحث ونظر جاری ہے۔ غوروفکر کے بعد یہ طے پایا ہے کہ کچھ اوپر چھ ہزار سال قبل مصر کی آغوش میں اس تمدن نے پرورش پائی اور اس سے پہلے جو زمانہ گزرا ہے اسے ازمنہ ماقبل تاریخ کے سلسلہ کی ایک کڑی قرار دے کر یہ بات مان لی گئی ہے کہ اس دور سے متعلق علم کی زبان پر مہر سکوت ثبت ہے۔ البتہ عصر حاضر میں ماہرین آثار قدیمہ عراق و شام میں قدیم آثار کی ٹوہ لگا رہے ہیں اور اس تجسس میں ہیں کہ آشوری اور فینقی آثار کی دریافت سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ سکے کہ آیا یہ آخرالذکر آثار قدیم ہیں یا مصری تمدن کے آثار۔ ان ماہرین کی کدوکاوش کا حاصل کچھ ہی کیوں نہ ہو، یہ بات اٹل ہے کہ قدیم ترین گہوارۂ تمدن کا تعلق بحیرۂ روم سے تھا اور یہ حقیقت عالم آشکارا ہے کہ مصر ہی دراصل وہ مرکز تھا جہاں سے تمدن کے سورج کی شعاعیں یونان و روم تک پہنچیں۔ یہ بھی ایک امر مسلمہ ہے کہ عصر حاضر میں جو تمدن پایا جاتا ہے اس کے ڈانڈے قدیم تمدن سے ملے ہوئے ہیں۔ مشرق بعید کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے تمدن نے کسی بھی زمانے میں مصر، یونان اور آشور کے تمدنی آثار پر کوئی اثر نہیں ڈالا اور نہ اس کے خدوخال میں کوئی تغیر رونما ہوا۔ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ یہ تمدن، اسلامی تمدن سے گھل مل گئے پہلے ان کا کچھ اثر اسلامی تمدن پر پڑا۔ بعد میں ان پر اسلامی تمدن کی کچھ ایسی چھاپ پڑی کہ یہ اس کے تابع ہوکر رہ گئے۔ حقیقت میں دنیا کا موجودہ تمدن اسی تاثیر و تاثر کی یاد تازہ کرتا ہے۔

مصری تہذیب پر اسلامی تمدن کا اثر

چند ہزار سال پیشتر بحیرۂ روم کے ساحل پر یا اس سے متصل جو تمدن منظرعام پر آیا اس کی شان کچھ ایسی تھی کہ آج بھی دنیا انگشت بدنداں ہے۔ اس تمدن کی عظمت کا سبب یہ تھا کہ اس تمدن کے پیرو صنعت و حرفت، تجارت و زراعت اور اسلحہ سازی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انہوں نے انسانی تمدن کے ان شعبوں میں

Marfat.com

حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ اس تمدن کا سارا دارومدار دینی تقاضوں پر تھا اور ظاہر ہے تمدن کی جڑیں دین سے مضبوط ہوتی ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مصر میں دین نے ترقی کی تو تثلیث کا لباس پہن کر اور یونان میں اس کے فروغ کا سبب بت پرستی کے مشاغل تھے۔ زمانہ مابعد میں اس کے سانچے تبدیل ہوتے رہے۔ مختصر یہ ہے کہ دین نے ہمیشہ ایسے تمدن کی تخلیق کی ہے جس پر کائنات کی وضع و ہیئت اور تعمیر و تشکیل کا انحصار رہا ہے اور آج بھی دین ہی دنیا کے ہر تمدن پر غالب ہے۔ عصر حاضر کا تمدن اپنے کاندھوں سے مذہب کا جوا اتار پھینکنا چاہتا ہے اور اس کے عزائم یہ ہیں کہ دین کے مقابلہ میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ تعمیر کرے، ابھی آہستہ آہستہ جذب واثر کے حربے استعمال کئے جارہے ہیں تاکہ مستقبل قریب یا بعید میں اسے اپنے اندر ضم کر لے۔

اس خطۂ ارض میں جہاں چند ہزار سال قبل دین کی بنیاد پر قصر تمدن کی تعمیر عمل میں آئی تھی۔ متعدد انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے، ایسے انبیاء علیہم السلام جن کے لائے ہوئے ادیان و مذاہب تاریکی میں نہیں ہیں، کون نہیں جانتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر میں خود فرعون کی زیر سرپرستی تربیت پائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کاہنوں اور دینی پیشواؤں سے جو ارکانِ سلطنت تھے، وحدتِ حق اور اسرارِ تخلیق کائنات سے متعلق ابتدائی معلومات حاصل کیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں قوم کی ہدایت کے لئے مامور کیا تو فرعون اور اس کے جادوگروں سے مقابلہ و مجادلہ کی صورت پیش آئی لیکن کچھ حالات ایسے پیش آئے کہ آپ نے بنی اسرائیل کی معیت میں فلسطین کی جانب ہجرت کی۔ فلسطین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مولد و منشا ہے۔ آپ نے بھی مخلوق کو حق کی دعوت دی۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اٹھالیا تو آپ کے حواری مسیحیت کی تبلیغ میں مصروف ہوئے۔ پیروانِ مسیح علیہ السلام نے دین کی اشاعت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور صبر آزما مصائب و آلام کے شکار ہوئے، آخر وہ وقت آیا کہ مشیت الٰہی نے مسیحیت کے فروغ کی راہیں کھولیں۔ قیصر روم نے جو اپنے دور کی متمدن دنیا کے نصف حصہ پر حکمران تھا، دین مسیح قبول کرلیا۔ اس کے اثر و نفوذ سے روم نے بھی عیسائیت کی آغوش میں پناہ لی۔ روم سے اس دین کے سورج کی کرنیں مصر، شام اور یونان میں بھی پھوٹ نکلیں۔ مصر سے اس دین کے اثرات حبش تک منتقل ہوئے۔ بعد ازاں مسیحیت کا دائرۂ اثر و قبول اتنا وسیع ہوگیا کہ شہنشاہِ روم کی باجگزار اور حلیف اقوام بھی مسیحی ہوگئیں۔

مسیحیت اور دین زرتشت میں نبرد آزمائی

حکومت روم کے اثر و اقتدار اور اس کی تائید و حمایت سے مسیحیت کو کافی سے زیادہ فروغ حاصل ہوا لیکن اس عرصہ میں دین زرتشت ایران ہی میں محدود و مقید رہا۔ مشرق کی مذہبی اور ہندوستان کی روحانی طاقت نے اس کی دستگیری ضرور کی۔ سالہا سال تک مصر و آشور کا تمدن اور مذہب ان کے درمیان حائل رہا، اس نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہونے دیا لیکن جب مصر اور فنیقیہ نے بھی مسیحیت اختیار کرلی تو جو

Marfat.com

پردہ درمیان میں حد فاصل بنا ہوا تھا، ہٹ گیا اور مسیحیت اور دین زرتشت ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوگئے۔ صدیوں تک ان میں باہمی کشاکش رہی اور ان کے متبعین میں جنگ و پیکار تک بھی نوبت پہنچی لیکن اس کے باوجود ان میں سے ہر ایک، ایک دوسرے کے مذہب کا احترام اپنا فرض سمجھتا تھا۔ طبعاً گو ان میں اختلاف رہا لیکن انہوں نے اس اختلاف کو مخاصمت کی بنا کبھی قرار نہیں دیا۔ اپنے اپنے حلقہ اثر اور اپنی اپنی مملکت میں انہوں نے کامل رواداری کا ثبوت دیا اور انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ دوسروں کو اپنے مذہب اور تمدن کی دعوت دیں۔

جب ایران نے روم پر غلبہ پالیا اور شام و مصر دونوں شہنشاہ ایران کے زیر نگیں آ گئے نیز قسطنطنیہ تک اس کے اقتدار کا سلسلہ دراز ہوا تو اس وقت بھی شہنشاہ ایران نے مسیحی ممالک میں دین زرتشت کی تبلیغ سے پہلوتہی کی۔ علاوہ بریں شہنشاہ ایران نے یہ کیا کہ محکوم اقوام کے عقائد کا احترام کرتے ہوئے عیسائیوں کو عبادت گاہوں کی دوبارہ تعمیر کے لئے مالی امداد دی جو جنگ میں مسمار ہوگئی تھیں۔ ایرانی دور اقتدار میں عیسائیوں کو مذہبی رسوم ادا کرنے کی پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ ایرانیوں نے یہ ضرور کیا کہ عیسائیوں کی بڑی صلیب اپنی تحویل میں لے لی تھی جسے بعد میں (اپنے اقتدار میں) رومی واپس لے گئے تھے۔ غرض مغرب کی روحانی سرگرمیاں مغرب تک اور مشرق کی مشرق تک محدود رہیں۔ ان دونوں دینوں کے مابین تصادم مادی بنیادوں پر تو بے شک ہوا لیکن ایک دوسرے کے روحانی تصورات سے کبھی تعرض نہیں کیا گیا۔

طاقت روم سے قسطنطنیہ منتقل ہوگئی

چھٹی صدی عیسوی تک واقعات کی رفتار یہی رہی لیکن اس اثناء میں روم و قسطنطنیہ کی کشیدگی میں اضافہ ہوگیا۔ روم کا اقتدار جس کی چھاپ دور و نزدیک کے ممالک پر پڑ چکی تھی اور جسے اپنے جاہ و جلال پر سو سو ناز تھے، رفتہ رفتہ روبہ انحطاط ہوتا گیا اور شدہ شدہ اس کی عظمت و سطوت کی جڑیں کھوکھلی ہوگئیں۔ ان حالات میں روم کی وسیع سلطنت کی باگ ڈور قسطنطنیہ کے ہاتھوں میں آ گئی۔ روم کا زوالِ اقتدار اس انتہا کو پہنچ چکا تھا کہ وحشی اقوام نے اس سے عنانِ اقتدار چھین لی۔ سلطنت روم کے زوال کے ساتھ ساتھ مسیحیت پر بھی جس نے اس کے اقتدار کے زیر سایہ ترقی کی تھی زوال کے آثار نمایاں ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ دین اثر پذیر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا، قدرت کا اٹل قانون کیسے بدل سکتا ہے؟

عیسائیوں میں فرقہ بندیاں

امتدادِ زمانہ کے ساتھ ہی ساتھ مسیحیت کے پیرو مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ دین اور اصول دین سے متعلق ان میں سے ہر ایک کی رائے مختلف اور نظریہ جدا تھا۔ یہ فرقے ایک دوسرے کے عقائد کی کھلے بندوں تردید و تغلیط کرتے تھے ان کے خیالات اکثر و بیشتر ذاتی عناد اور شخصیت خصومت کا باعث بن جاتے

Marfat.com

تھے اور اس حقیقت سے کون نا آشنا ہے کہ کسی فرقہ کے ضعف نفس اور انحطاط اخلاق کی دلیل اسی قسم کے خیالات ہوا کرتے ہیں۔ ذاتی عناد بڑھتے بڑھتے تعصب کا چولا پہن لیتا تھا اور اس سے جمود کی جڑیں اور مضبوط ہوتی تھیں۔ ان فرقوں میں بعض کا عندیہ یہ تھا کہ حضرت مسیح کی شخصیت عام مخلوق کے برعکس پیکر نور اور مجسمہ لطافت ہے۔ بعض کے غلو کا یہ عالم تھا کہ وہ کہتے تھے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے جسم و روح میں ایک روحانی رابطہ پایا جاتا ہے، ایسا روحانی رابطہ جس کا تصور بھی ہمارے بس کی بات نہیں۔ بعض حضرت مریم علیہا السلام کی پرستش کرتے تھے اور بعض کا قول یہ تھا کہ ولادت مسیح کے بعد حضرت مریم علیہا السلام کی دوشیزگی قائم نہیں رہی تھی۔
عیسائی فرقوں میں اس طرح لاطائل مباحثے اور لایعنی مناظرے جاری رہتے تھے اور کسی ملت کے زوال کا وقت قریب آتا ہے تو یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ لوگ الفاظ و اعداد کی رسمی قیود کو محبت کا مرکز قرار دے کر ان کے اردگرد معانی و مطالب کا ایسا طلسماتی حصار کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے تصور سے عقل عاجز و درماندہ رہتی ہے۔ ایک قسیس اسی عہد کے بارے میں لکھتا ہے:

> ''شہر میں شور و شر کا ہنگامہ برپا رہتا تھا۔ لوگ آڑھتیوں، صرافوں اور بقالوں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت مذہبی بحثیں چھیڑ دیتے تھے۔ اگر ریزگاری لینا چاہتے تھے تو اس مسئلہ پر بحث شروع ہو جاتی کہ کس چیز کی تخلیق عمل میں آئی ہے اور کس کی نہیں؟ روئی کی قیمت دریافت کی جاتی تو اس کے جواب میں کہا جاتا کہ باپ بیٹے سے بزرگ تر ہے اور بیٹے کا کام اس کی فرمانبرداری ہے۔ اگر یہ پوچھا جاتا کہ حمام میں پانی گرم ہے تو حمام کا نوکر جواب دیتا۔ اس نے بیٹے کو نیست سے ہست کیا ہے۔''

مسیحیت کے دینی اختلافات عیسائی شہنشاہیت کی سیاسی حیثیت پر اثر انداز نہیں ہوئے تھے۔ روم کی شہنشاہیت کے اقتدار اور اس کی شان و شوکت میں تو کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن یہ بات ضرور تھی کہ اس کے زیر سایہ مختلف فرقوں کے درمیان ایک دائمی کشمکش جاری رہتی تھی مگر یہ کشمکش لفظی بحث و تکرار کی حدود سے متجاوز نہیں ہو پاتی تھی۔ کبھی کسی دینی مسئلے میں یقین وادغان کی خاطر کسی نہ کسی لاہوتی موتمر کا انعقاد عمل میں آتا تھا لیکن کوئی ایک فرقہ بھی اتنا زیادہ بااثر و اقتدار نہ تھا کہ دوسرے فرقوں کو اپنا ہم نوا بنا سکے۔ شہنشاہ روم نے مختلف فرقوں کو اپنی زیر سرپرستی مناظرہ و مجادلہ کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس طرزِ عمل سے شہنشاہ کے اثر و اقتدار کا طوطی بولتا تھا اور دینی اعتبار سے اس کی شخصیت کا کچھ ایسا رعب نہ تھا۔ ہر ایک فرقہ کا یہ پختہ خیال تھا کہ شہنشاہ کی ہمدردیاں اسی کے ساتھ ہیں اور یہ چیز بھی بعید الامکان نہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہوں کہ شہنشاہ کا رجحانِ طبع ہماری جانب ہے اور ہماری نصرت و اعانت کے لئے وہ ہر لحظہ آمادہ ہے۔
روم کے شاہی اقتدار نے مسیحیت کی نشر و اشاعت کے لئے ایک نئی سبیل اختیار کی اور وہ یہ کہ مصر سے حبش اور حبش سے ساحل بحیرۂ احمر کا رخ کیا تا کہ اس علاقے کو بھی بحیرہ روم کے ساحلی مقامات کی طرح اپنے

Marfat.com

زیر تسلط لے آئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ شام و فلسطین سے ساحل دریائے فرات تک پیش قدمی کر کے اہل حیرہ اور ان عرب قبائل کو بھی مسیحیت کی آغوش میں لے آئے جو صحرا سے ہجرت کے بعد اس نواح میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اہل حیرہ اور قبائل لخم و مناذرہ[1] کو بھی عیسائیت قبول کرنے میں ہی عافیت نظر آئی۔

دین زرتشت بھی اختلاف کا شکار

انہی ایام میں نہ صرف مسیحیت بلکہ مجوسیت (دین زرتشت) میں بھی اختلافات راہ پا گئے تھے۔ یزدان و اہرمن کے پیروؤں نے دین زرتشت میں اتنے فرقوں کی داغ بیل ڈال دی تھی کہ ان کی تفصیل اچھی خاصی صبر آزما ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دینی اختلاف کے باوجود سیاسی اعتبار سے حکومت ایران کی میخیں گڑی ہوئی تھیں، فرقہ وارانہ اختلافات حکومت اور اس کے استحکام پر مطلق اثرانداز نہیں ہوتے تھے، دولت ایران کی سرپرستی میں مختلف فرقے امن و عافیت سے اپنے اپنے اصول و عقائد کی تبلیغ کرتے اور اس سے حکومت کی بنیادیں اور مستحکم ہوئیں۔

دو طاقتوں کے درمیان

چھٹی صدی عیسوی میں عرب، مسیحیت اور دین زرتشت (مجوسیت) ایسی دو طاقتوں کے درمیان محصور تھا۔ ان دونوں زبردست طاقتوں نے جنہیں روم و ایران کی سرپرستی حاصل تھی، دیگر تابع حکومتوں کے پہلو بہ پہلو عرب کو بھی اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ مسیحیت و مجوسیت کے مبلغین اپنے عقائد و مزعومات کی تبلیغ و اشاعت میں منہمک اور سرگرم عمل رہتے تھے، دونوں حکومتوں، روم و ایران کو بھی ہر وقت یہی فکر دامن گیر رہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح ان کے اثر و اقتدار کے دائرے وسیع ہوں لیکن ان ہر دو مذاہب کے مبلغین کی سر توڑ کوششوں کے باوجود جزیرہ نمائے عرب (چند نواحی طاقتوں کو مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے) نہ تو مسیحیت سے اثر پذیر تھا اور نہ مجوسیت سے۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات ہے تو کچھ عجیب سی لیکن اگر ہم عرب کے طبعی حالات، طرز معاشرت اخلاق و اطوار وغیرہ پر غور کریں تو اس کے اسباب دریافت کئے جا سکتے ہیں۔

جزیرہ نمائے عرب کا جغرافیائی محل وقوع

جزیرہ نمائے عرب ایک غیر متوازی الاضلاع جزیرہ نما ہے۔ اس کے شمال میں فلسطین و شام، مشرق میں حیرہ، دجلہ و فرات اور خلیج فارس، جنوب میں بحیرہ اوقیانوس، ہند اور خلیج عمان اور مغرب میں بحیرۂ احمر واقع ہیں۔ جنوب و مغرب میں دریا اور شمال و مشرق میں صحرا اور خلیج فارس نے اس کے اردگرد ایک قدرتی حصار کھینچ دیا ہے۔

جزیرہ نمائے عرب اپنی ہمسایہ حکومتوں کے استعمار اور مذہبی اثرات سے محض اس لئے محفوظ و مصئون نہیں رہا کہ دشت و دریا اسے اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں بلکہ اس سلسلہ میں عرب کی غیر معمولی وسعت کو

بھی بڑی حد تک دخل ہے۔ جزیرہ نمائے عرب کا طول دو ہزار پانچ سو کلومیٹر اور عرض دو ہزار کلومیٹر ہے۔ علاوہ بریں اس کی بے آبی و بے گیاہی نے بھی اس پر ہمسایہ ممالک کے دین و سیاست کو اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ اس وسیع و عریض ملک میں ایک دریا بھی نہیں ہے۔ بارشیں بھی کسی نظام کے ماتحت نہیں ہوتیں کہ ان سے کھیت سیراب ہو سکیں۔ جنوب میں یمن کی وادی زرخیز ہے اور یہاں بارشیں بھی خوب ہوتی ہیں۔ باقی کوئی علاقہ ایسا نہیں جو بے آب و گیاہ پہاڑوں، خشک دروں اور ریگستانوں سے گھرا ہوا نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا علاقہ نہ سکونتی نقطہ نظر سے مفید ہو سکتا ہے اور نہ تمدنی زاویہ نگاہ سے اس میں کوئی افادیت کا پہلو ہے۔ یہ جغرافیائی حالات صرف انہی باشندوں کے لئے کچھ موافق ہو سکتے ہیں جو خانہ بدوش زندگی کے عادی ہوں۔ اس خشک اور بے آب و گیاہ صحرا میں جہاں تا حد نظر ریت کے تودے ہی تودے نظر آتے ہوں، اونٹ کی سواری کام دیتی ہے۔ جہاں چراگاہ نظر آئے، یہ خانہ بدوش عرب وہیں کچھ عرصہ کے لئے خیمے نصب کر لیتے ہیں۔ جب اونٹ سیر ہو لیتے ہیں اور چراگاہ میں بھی کچھ نہیں رہتا تو ان کا رخ کسی دوسری چراگاہ کی جانب ہوتا ہے۔ عرب میں اونٹوں کی یہ چراگاہیں اکثر چشموں کے آس پاس ہوتی ہیں جو بارش کے بعد ریگزار میں پھوٹ نکلتے ہیں اور ان کے اردگرد سبزہ اُگ آتا ہے۔

ایسی خشک اور غیر زرخیز سرزمین غیر آباد رہتی ہے جیسا کہ افریقہ کے صحرائے اعظم کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ کوئی شخص بھی یہ نہیں چاہتا کہ ایسی سرزمین کے کسی گوشہ میں سکونت پذیر ہو۔ ظاہر ہے کہ جو شخص بھی اس ریگستان میں قدم رکھتا ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ جلد سے جلد اسے عبور کر کے کسی پر امن مقام پر بسیرا کرے۔ عرب میں گنتی کے کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں کچھ روئیدگی ہوتی ہے اور جو لوگ ایسے علاقوں سے گزرتے ہیں ان کے دل نہال اور ان کی طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ اس بے آب و گیاہ خطہ کا حال بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ شاذ و نادر ہی کوئی اس صحرا کو عبور کرنے کی جرأت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے میں یمن سے تو لوگ ناواقف نہ تھے البتہ عرب سے متعلق ان کی معلومات صفر تھیں۔

جغرافیائی محل وقوع نے عرب کو تباہی و بربادی کی زد سے بچا لیا۔ غنیمت ہے کہ لوگ اس سرزمین میں آباد ہوئے۔ بات یہ ہے کہ قدیم زمانے میں دریائی سفر کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی۔ لوگ اس سفر کو خطرہ سے خالی نہیں سمجھتے تھے لہٰذا تجار و سیاح ہمیشہ بحری راستے پر بری راہ کو ترجیح دیتے تھے اور اسی راستے سفر کے عادی تھے۔ عرب کی قدیم ضرب الامثال سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم ایام میں بحری سفر کو ہولناک موت سے تعبیر کرتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ مجبوراً تجارت و سیاحت کے لئے خشکی کی راہ اختیار کرتے تھے۔ اس زمانے میں روم، ہندوستان اور ان کے نواحی ممالک کے مابین وسیع پیمانے پر تجارت ہوتی تھی۔ مشرق و مغرب کے درمیان تجارت عرب کے راستے ہوتی اور جو مال خلیج فارس سے آتا عرب ہی کے راستے گزر کر جاتا تھا۔

Marfat.com

ظاہر ہے کہ عرب کے خانہ بدوش بدوی باشندے صحرا کے فرمانروا تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے بعد میں کشتی رانی کے رواج کے بعد دریائی سفر کرنے والے لوگ دریا یا سمندر کے فرمانروا کہلائے۔ ملاح اور جہاز راں جس طرح دریا اور سمندر کے خطرناک مقامات سے بچنے کے لئے کشتی کی راہ متعین کرتے ہیں، اسی طرح صحرا کے فرمانروا قافلوں کی آمدورفت کیلئے صحرا میں راستوں کا تعین کرتے ہیں۔ اس بارے میں ہیرن کہتا ہے:

> ''کاروانی راہ تک لوگوں کی پہنچ نہ تھی۔ اس راہ کا تعین بتقاضائے حالات ہوا، فطرت نے خشک صحرا کے قلب میں متعدد مقامات پر طویل مسافت کے پیش نظر چند سہولتیں مہیا کردی تھیں تا کہ مسافر کچھ دیر ٹھہر کر ستا سکیں، سہولتیں یہ تھیں کہ راستے میں پڑاؤ پڑتے تھے جہاں تاجر اور ان کے چوپائے کھجوروں کے درختوں کے نیچے آرام کرتے تھے، چشموں کا پانی پی کر وہ اپنے سفر کی تکان دور کرتے تھے۔ یہی مراحل (پڑاؤ) رفتہ رفتہ خرید وفروخت کے مرکز بن گئے۔ بعض مقامات پر عبادت گاہیں بھی تعمیر کرلی گئیں، تاجر یہاں تجارت کرتے اور زائرین اپنے فائدے کی خاطر وہاں پہنچتے تھے۔''[1]

قافلوں کے لئے دو راہیں

عرب میں قافلوں کی آمدورفت کے لئے راہیں تو بہت سی تھیں لیکن ان دو راہوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ ایک راہ وہ جو خلیج فارس اور دجلہ سے گزر کر صحرائے شام کی راہ فلسطین پہنچتی ہے اور دوسری وہ جو بحیرۂ احمر کے قریب سے گزرتی ہے۔ ان دونوں راہوں سے (مشرقی ومغربی راہوں سے) مغربی مصنوعات مشرق کی جانب اور مشرقی سامان مغرب کی طرف جاتا تھا اور اس سے صحرا نشین لوازمِ زندگی حاصل کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود مغرب کے باشندے اس سرزمین سے (جس سے ان کی تجارت کی راہ گزرتی تھی) ناواقف اور بے خبر تھے چنانچہ ان میں سے بہت کم لوگ صحرائے عرب کو عبور کرنے کی زحمت گوارا کرتے تھے۔ یہ کام (عبورِ صحرائے عرب) آسان نہ تھا۔ اس کی مشکلات پر وہی لوگ قابو پاسکتے تھے جن کا لڑکپن جزیرہ نمائے عرب میں گزرا ہو یا پھر وہ لوگ یہ مہم سر کر سکتے تھے جو زندگی کو چنداں اہمیت نہیں دیتے تھے اور جو صحرا میں ریت کے تودوں کے نیچے دب کر ہمیشہ کے لئے عدم کی راہ لیتے تھے۔ وہ لوگ جو شہری زندگی کی آسائشوں کے خوگر ہوں، ایک ایسے علاقے میں سفر کی صعوبتیں کیسے جھیل سکتے تھے جہاں بے آب وگیاہ پہاڑیوں، خشک درّوں اور ریگزاروں سے گزرنے کے لئے اونٹ کے سوائے اور کوئی ذریعہ موجود نہ ہو۔ شہری زندگی کی آسودگیوں کے عادی انسان کیسے صحرا کی زحمت طلب زندگی بسر کرسکتے تھے اور کس طرح وہ اندازِ معیشت اختیار کرسکتے تھے جو ضبط ونظم سے ناآشنا رہا ہے۔ صحراؤں میں جو قبائل، خانوادے اور افراد مستقل سکونت رکھتے ہیں ان میں نظم وضبط کی صورت یہ تھی کہ وہ قبائل یا خاندانی عصبیت پر جان دیتے تھے، باہمی عہد وپیمان کا ہر قیمت پر لحاظ رکھتے تھے یا حق ہمسائیگی جس کے باعث ایک کمزور انسان کو طاقتور کی پناہ مل

Marfat.com

جاتی ہے، ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ اگر ان کے پاس کوئی قانون تھا تو لے دے کے بس ایک یہی قانون تھا۔

صحرا کی بدوی زندگی اور شہری زندگی میں ہمیشہ نمایاں فرق رہا ہے، صحرا نشینوں کی عادت میں یہ چیز داخل رہی ہے کہ وہ دشمن سے قصاص لیتے اور طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ جو لوگ اس طرزِ معاشرت کے خوگر ہوں ان کی جانب کوئی بھی توجہ نہیں کرتا اور کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ ان کے انداب و رسوم کے سلسلے میں تحقیق کی زحمت گوارا کرے، یہی اسباب تھے جن کی بنا پر اس عہد میں عرب کو نہ اتنی شہرت حاصل تھی، نہ اتنی اہمیت۔ اس ملک میں نبی کریم ﷺ کی بعثت عمل میں آئی تو عرب اور اس کے حالات کو درخورِ اعتنا سمجھا گیا، بعثت کے بعد ہی سے لوگوں کو یہ علم ہوا کہ عرب کیا ہے اور اس کی تاریخ کیا ہے؟

تمدنِ یمن

اس عہد میں بھی جب متمدن ممالک کی فہرست میں عرب کا نام نہ تھا، یمن اور خلیج فارس کے قرب و جوار میں کچھ ملک اچھے خاصے مشہور تھے۔ یہ شہرت محض خلیج فارس، بحر ہند اور بحیرۂ احمر کے باعث نہ تھی بلکہ اس کے اسباب مندرجہ ذیل تھے:

۱۔ یمن، عرب کے دیگر نواحی علاقوں کی طرح بنجر اور بے آب و گیاہ نہ تھا کہ اس کی جانب ہمسایہ ممالک کی نگاہیں نہ اٹھتیں اور پاس پڑوس کے ملک اس سے دوستی کی پینگیں بڑھانے یا اسے اپنے اندر جذب کر لینے کی جستجو نہ کرتے۔

۲۔ یمن کا علاقہ زرخیز تھا۔ یہاں بارشیں خوب ہوتی تھیں، اس کے شہر بھی آباد تھے۔ شہروں میں عبادت گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں کے باشندے ہوشیار، ذہین و فہیم تھے اور اس علاقہ میں کچھ ایسی موزونیت تھی کہ کبھی نہ کبھی مرکزِ تمدن کی حیثیت حاصل کر جائے۔

۳۔ اہل یمن نے بارش کے پانی سے استفادہ اور ناگہانی سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچاؤ کی خاطر "سد مآرب"[۳] کے نام سے ایک بند تعمیر کیا تھا۔ اس بند کی تعمیر سے قبل پہاڑوں پر ہونے والی بارش کا پانی، شہر مآرب کے مشرقی درّوں میں دو پہاڑوں کے درمیان سے گزرتا تھا اور کچھ دور بہہ کر ضائع ہو جاتا تھا۔ اہل یمن نے انہی دونوں پہاڑوں کے مابین پتھروں سے ایک بند[۴] تعمیر کیا اور اس میں دروازے بھی رکھے تاکہ زائد پانی ان دروازوں سے نکل کر کھیتوں کو سیراب کرے۔

۴۔ یمن کے قدیم تمدن کے جو آثار موجود ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس خطے کا تمدن کسی زمانے میں بڑی اہمیت رکھتا تھا اور جو گردش لیل و نہار کے باوجود عرصہ دراز تک قائم رہا۔ آج یہ شہر مآرب[۵] اور اس کا مشہور بند دونوں حوادثِ زمانہ کے شکار ہو چکے ہیں اور ماہرین اس کے کھنڈروں میں غوطے کھا رہے ہیں۔ تھوڑے بہت حالات کی تحقیق ہو سکی ہے اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ ان

Marfat.com

کتبوں سے قبیلہ حمیر کے جوہر تہذیب و تمدن کی تابانی نے اہل علم کو حیران کر رکھا ہے۔

یمن میں یہود و نصاریٰ

تمدن یمن جیسے ملک کی آبادی اور زمین کی زرخیزی کا حاصل قرار دیا جاتا ہے عرب اور اس کے تمام علاقوں کے لئے دارالامن اور بیت السلام ثابت ہوا ہے۔ یمن کی سلطنت مدتوں اہل حمیر کے ہاتھوں میں رہی یہاں تک کہ ذونواس حمیری تخت شاہی پر بیٹھا۔ یہ بادشاہ بت پرستی سے نالاں اور دین موسوی کی جانب مائل تھا۔ اس نے دین موسوی کے اصول ان یہودیوں سے معلوم کئے تھے جو دوسرے مقامات سے ترکِ وطن کے بعد یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اصحابِ اخدود کا قصہ جس کی طرف قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی ذونواس سے تعلق رکھتا ہے:

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ﴿۴﴾ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ﴿۵﴾ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ﴿۶﴾ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ﴿۷﴾ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ﴿۸﴾ (سورۃ البروج: ۴ تا ۸)

خندق والے ہلاک ہو گئے اس حالت میں کہ اوپر سے ان پر آگ جلا دی گئی آگ جلانے والا طبقہ خندق کے کنارے پر کھڑا ہوا ان کے جلنے کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ مومنوں کے ساتھ انہوں نے جو بے رحمانہ سلوک کیا، اس سے خود ان کے دل بھی متاثر تھے دشمنوں کا ان مومنوں پر الزام یہ تھا کہ وہ عزیز و حمید خدا پر ایمان کیوں لے آئے؟

اس قصہ کا نچوڑ یہ ہے کہ ایک پاکباز مسیحی "فیمیون" روم سے ہجرت کر کے نجران میں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔ نجران کے باشندوں پر اس کی پارسائی کا یہ اثر پڑا کہ وہ مسیحیت کی طرف مائل ہو گئے، رفتہ رفتہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور ان کی طاقت بڑھتی رہی۔ ذونواس کو جب اس چیز کا علم ہوا تو وہ نجران پہنچا اور اس نے لوگوں کو دین موسوی کی دعوت دی لیکن کسی نے بھی اس پر لبیک نہیں کہا لہٰذا اس نے انتقاماً خندق کھودنے کے احکام صادر کئے۔ جب اس کام سے فراغت ہوئی تو خندق آگ سے بھر دی گئی، بعدازاں ذونواس کے حکم سے ایک ایک عیسائی کو گرفتار کر کے آگ کے الاؤ میں جھونک دیا جو عیسائی آگ میں جلنے سے بچ گئے انہیں بیدردی سے تہ تیغ کیا گیا۔ کتب تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جو عیسائی نذر آتش یا تہ تیغ ہوئے ان کی تعداد کسی صورت میں بھی بیس ہزار سے کم نہ تھی۔[1] ایک عیسائی جو اتفاق سے بچ نکلا تھا، اس نے راہِ فرار اختیار کی اور سیدھا شہنشاہ روم جستین (جستینان، ژوستینان، یا جوستینان) کے دربار میں فریادی ہوا، ساتھ ہی اس نے شہنشاہ سے یہ التجا کی اسے ذونواس سے انتقام لینے کے لئے مدد دی جائے۔ یمن، روم سے فاصلے پر واقع تھا اس لئے شہنشاہ روم نے شاہِ حبش (نجاشی) کو فرمان بھیجا کہ بادشاہِ یمن سے انتقام لیا جائے۔

Marfat.com

چھٹی صدی عیسوی میں حبش، نجاشی کے حسن انتظام کی بدولت بڑے عروج پر تھا، اس کی بحری تجارت زوروں پر تھی اور اس نے اپنی بحری طاقت کے بل بوتے پر آس پاس کے علاقوں پر اپنے اثر و اقتدار کا سکہ بٹھا دیا تھا، روم کی سلطنت سے حبش کے دوستانہ مراسم تھے اور اس دوستی کا نتیجہ تھا کہ اگر ایک طرف بحیرہ روم کے سواحل پر مسیحیت کا پرچم لہرا رہا تھا تو دوسری طرف حبش نے بحیرہ احمر کے ساحل پر اس دین کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔

شہنشاہ روم کا فرمان پہنچا تو اس کی تعمیل میں نجاشی نے اس یمنی قاصد کی معیت میں (جو فرمانِ شاہی لے کر آیا تھا) ایک سالار ارباط کی زیر سرکردگی یمن پر چڑھائی کے لئے ایک فوج روانہ کردی۔ اس فوج میں ابرہۃ الاشرم نام کا ایک شخص بھی شامل تھا۔ ارباط نے شاہِ یمن کی فوج کو شکست دی اور اس پر امیر حبش کے نام سے قبضہ کرلیا۔[7] کچھ عرصہ تک یمن کی زمامِ حکومت ارباط کے ہاتھوں میں رہی۔ یہاں تک کہ اسے ابرہہ نے ہلاک کردیا اور خود اس کی جگہ یمن کی عنانِ حکومت سنبھال لی، ابرہہ اصحابِ فیل کا قائد تھا جس نے کعبہ کے انہدام کی نیت سے مکہ مکرمہ پر چڑھائی کی تھی لیکن اس کی آرزو دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ اس واقعہ کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی۔[8]

ابرہہ کے بعد یمن کی حکومت اس کے بڑے بیٹوں کو منتقل ہوئی لیکن انہوں نے عدل و انصاف کی جگہ جور و ستم پر کمر باندھی۔ جب اہل یمن پر عرصہ حیات تنگ ہوگیا تو ایک شخص سیف بن ذی یزن ان کے ترجمان کی حیثیت سے شہنشاہ روم کے دربار میں پہنچا اور شہنشاہ سے التجا کی کہ یمن کی حکومت کی باگ ڈور کسی شریف النفس شخص کے حوالے کی جائے لیکن شاہ حبش سے شہنشاہ روم کا جو معاہدہ تھا اس کے پیش نظر یہ التجا قبول نہ ہوئی۔ سیف بن ذی یزن نے مایوسی کے عالم میں نعمان بن منذر کے دربار میں حاضری دی جو شہنشاہ روم کی طرف سے حیرہ اور عراق کا والی تھا۔

یمن ایرانی تسلط میں

اسلام سے قبل صنعتی شروع

نعمان بن منذر، شہنشاہ ایران خسرو پرویز کے دربار میں حاضر ہوا تو اپنی معیت میں سیف بن ذی یزن کو بھی لے گیا۔ خسرو پرویز تخت شاہی پر متمکن تھا اور اجزائے تخت دارا بھی اس کے اطراف میں دعوت نظارہ دے رہے تھے جس پر کہکشاں کی تصویر کڑھی ہوئی تھی، حسب معمول موسم سرما میں جب شہنشاہ ایران تخت شاہی پر رونق افروز ہوتا تھا تو بیش قیمت پوستینی پردے تخت کے اردگرد آویزاں کردیئے جاتے تھے۔ ایک بڑے حجم کا تاج تھا جس پر یاقوت، زمرد و مروارید اور سیم و زر سے مینا کاری کی گئی تھی۔ یہ تاج ایک سنہری زنجیر کے حلقہ میں اٹکا ہوا تخت شاہی پر سایہ فگن ہوتا تھا۔ شہنشاہ لباس زربفت میں ملبوس اور طلائی زیورات سے آراستہ و پیراستہ رہتا تھا جو نووارد بھی شہنشاہ کے دربار میں حاضر ہوتا، وہ اس ٹھاٹھ سے مرعوب سا ہوجاتا تھا۔ سیف بن ذی یزن نے دربار کا یہ شکوہ دیکھا تو وہ بھی مبہوت ہو کر رہ گیا جب اس کے حواس

Marfat.com

درست ہوئے تو شہنشاہ نے اس سے حاضری کی غرض دریافت کی۔ سیف نے کہا کہ حبشہ نے یمن کو فتح کرلیا ہے اور اس کے والی یمن پر انسانیت سوز مظالم ڈھا رہے ہیں، ہم اہل یمن آپ سے حبشیوں کے خلاف مدد چاہتے ہیں۔ خسرو پرویز نے قدرے تامل کے بعد ایک بہادر ایرانی سردار ''وہرز'' کی سرکردگی میں یمن پر چڑھائی کے لئے ایک فوج روانہ کردی، جنگ ہوئی اور اس جنگ میں ایرانیوں نے حبشیوں کو شکست فاش دی، یمن پر حبشیوں کے اقتدار کی مدت ۷۲ سال بتائی جاتی ہے۔ ظہورِ اسلام تک یمن پر عرب کے دوسرے علاقوں کی طرح ایران کا تسلط رہا۔

ایران میں شیرویہ کی حکومت

جس ایرانی فوج نے یمن پر قبضہ کیا تھا وہ ایران کے تابع فرمان نہ تھی۔ خصوصیت کے ساتھ جب شیرویہ اپنے باپ پرویز کو قتل کرنے کے بعد تخت نشین ہوا تو یمن پر قابض ایرانی فوج کی سرکشی اور بغاوت میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔ شیرویہ نے حکومت کے فرائض سے پہلوتہی برتی اور عیش و راحت کے ہوس کارانہ مشاغل نے اسے کہیں کا نہ رکھا جب شیرویہ، شکار کے لئے جاتا تو اس کی سواری بڑے ٹھاٹھ باٹھ کی ہوتی تھی، اس کے جلو میں درباری نوجوان سرخ، زرد اور بنفشی وردیوں میں ملبوس رہتے۔ مرکب ہمایونی کے عقب میں وہ دستے ہوتے تھے جن کے ہاتھوں پر شکاری باز ہوتے، ان کے بعد کچھ خدام ایسے ہوتے جن کی سپردگی میں ریشمی ڈوریوں سے بندھے ہوئے چیتے ہوتے، شہنشاہ کے خاصہ دار عطر سے بھرے ہوئے بلوری باسن ہاتھوں میں لئے ہوتے تھے ان کے علاوہ اربابِ نغمہ وسرود بھی ہوتے (جن کی نغمہ بیزیوں سے فرحت ونشاط کا سامان بہم پہنچایا جاتا) شہنشاہ، موسم سرما میں بہار کے مزے لوٹنے کے لئے ایک بڑے فرش پر بیٹھ جاتا تھا جس پر گلہائے رنگ رنگ، سبزہ زاروں، باغیچوں وغیرہ کے بولتے ہوئے نقوش ابھرے ہوئے ہوتے، چاندی جیسی صاف و شفاف نہروں کی تصویریں بھی اس پر کڑھی ہوتیں۔ شہنشاہِ ایران کی اس عیش کوشی کے باوجود سلطنت ایران کے دبدبے میں مطلق کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اسے مشرقی روم کا مدمقابل اور مسیحیت کی اشاعت میں سنگ گراں تصور کیا جاتا تھا لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ شیرویہ کی عیش پسند حکمرانی دولت ایران کے زوال کا پیش خیمہ تھی اور مبالغہ نہ ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ اس کے دورشاہی میں غلبہ اسلام کے لئے زمین ہموار ہورہی تھی۔

چوتھی صدی عیسوی کے بعد یمن میں جو سلسلہ جنگ شروع ہوا اس سے جزیرہ نمائے عرب کی تاریخ پر بھی اثر پڑا اور یہی وجہ تھی کہ یمن کے کچھ باشندے عرب میں بھی سکونت پذیر ہوگئے۔ مآرب کا بند جسے حمیریوں نے کھیتوں میں آبیاری کے لئے تعمیر کیا تھا، ایک سیلاب میں دریا کی تلاطم خیز موجوں کی نذر ہوگیا۔ اس کی تباہی کا سبب یہ ہوا کہ مسلسل معرکہ آرائیوں کی وجہ سے لوگوں کو اس کی مرمت کی مہلت نہیں ملی تھی۔

اس کے اندر جو درزیں پڑ گئیں تھیں وہ پُر نہیں کی جاسکیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ سیلاب آیا تو یہ بند اس کی ٹکر نہ سنبھال سکا۔

یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے جب شہنشاہ روم کو پتہ چلا کہ ایران نے یمن پر قبضہ کرلیا ہے اور اس قبضہ کے سبب روم کی تجارت کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے تو اس نے یہ احکام صادر کئے کہ تجارتی اغراض کے پیش نظر کچھ کشتیاں بحیرہ احمر میں مصر اور مشرق کے دور افتادہ ممالک کے درمیان چلائی جائیں اور ان کشتیوں کے ذریعہ سامان لایا جائے جو مشرقی روم کے لئے ناگزیر ہے۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ روم کو کاروانی گزرگاہ کی احتیاج نہ رہے، شہنشاہ روم کے اس اقدام سے یمن کی اقتصادی زندگی پر بہت برا اثر پڑا۔ بہر حال مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یمن کے جنوب سے ایک گروہ نے شمال کی جانب ہجرت کی تھی لیکن جہاں اسباب ہجرت کا تعلق ہے کہ ان میں اختلاف ہے، بعض کا خیال ہے کہ راہ تجارت مین تبدیلی کے باعث، یمن کے بہت سے شہر غیر آباد ہوگئے تھے۔ اس علاقے کے باشندوں نے شمال کی جانب ہجرت کی تھی اس کا سبب یہی تھا۔ بہر صورت یمن کے کچھ باشندے عرب میں آ کر آباد ہوئے اور اہل عرب سے گھل مل گئے۔

جزیرہ نمائے عرب کا اجتماعی نظام

یمن کا نظام، سیاسی بحران اور مسلسل حملہ آرائیوں کے باعث درہم برہم ہوگیا تھا، رہا عرب، یہاں کوئی سیاسی نظام سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ عوام خانہ بدوش صحرائی تھے، شہری زندگی سے انہیں دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ یہ لوگ کبھی ایک مقام پر سکونت اختیار نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ نئی نئی چراگاہوں کی جستجو میں سرگرم عمل رہتے تھے، ان کا روزمرہ کا معمول یہی تھا اور اسی سے ان کے ذوق صحرا نوردی کی تسکین ہوتی تھی چنانچہ آج تک صدیاں گزر جانے کے بعد ان میں سے اکثر تمدن نا آشنا ہیں اور خانہ بدوشی ان کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ صحرا نشینی کا دارومدار قبائلی انداز زندگی پر ہے اور جن قبائل کو خانہ بدوشی کا لپکا پڑ جاتا ہے وہ کسی نظم اور قانون کے پابند نہیں ہوتے۔ افراد ہوں یا قبائل، سب اپنی دھن میں لگے رہتے ہیں۔

متمدن اشخاص زندگی کے آرام و آسائش کی خاطر اپنے کچھ اختیارات سے دستبردار ہوجاتے ہیں اور اپنے اوپر برضا و رغبت نظم و قانون کی گرفت گوارا کرلیتے ہیں اور وہ اس لئے تاکہ انہیں دوسروں کے مظالم سے پناہ مل سکے۔ اس کے برخلاف صحرا نشین قبائل جنہیں زندگی کی آسودگی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، کسی ضابطے اور کسی قانون کی پابندی کسی قیمت پر برداشت نہیں کرتے، وہ اگر کچھ چاہتے ہیں تو صرف یہ کہ افراد اور قبائل مساوات کی سطح پر رہیں۔

جزیرہ نمائے عرب کی زندگی کا انداز بھی وہی ہے جیسا کہ دنیا کی دیگر اقوام کا ہے یعنی زندگی کی محبت جان کی حفاظت اور خطرات کی زد سے محفوظ رہنے کی کوشش لیکن ضرورت اس چیز کی ہے کہ یہ جوہر کارفرما ہوں

Marfat.com

تو اصولِ شرافت کے مطابق ہوں۔ عرب کے باشندوں نے کچھ ایسا مزاج پایا تھا کہ وہ دوسروں کے ظلم و تعدی پر صبر و ضبط سے کام نہیں لیتے تھے اور جب تک وہ اپنی پوری طاقت صرف کر کے جور و ستم کا انسداد نہیں کر دیتے تھے انہیں اطمینان نصیب نہیں ہوتا تھا اگر انہیں یہ احساس ہو جاتا کہ ہم بے بس و بے کس ہیں تو نہ صرف ایک مقام کو بلکہ پورے عرب کو خیر باد کہہ دیتے تھے اگر کوئی ایسا قضیہ پیش آتا جس کا تصفیہ اصولِ شرافت کے ماتحت نہ ہو سکتا تو جنگ کا سلسلہ شروع کر دیتے تھے۔

بدوی معاشرت

عرب قبائل میں کریم النفسی، شجاعت، پامردی، اعانت ہمسایہ، انتقام پر قدرت کے باوجود عفو و درگزر کی عادت اور اسی قسم کی دوسری خصوصیات جو شہری زندگی میں قریب قریب عنقا ہوتی ہیں، پیدا ہو گئی تھیں، ان عادات و خصائل کی بنا پر ایران اور مشرقی روم نے یمن کے علاوہ عرب کے دوسرے علاقوں پر دست درازی نہیں کی تھی۔ عرب قبائل کسی ایک جگہ قیام پذیر نہیں ہوتے تھے، کسی کی اطاعت ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ عرب دوسروں کی غلامی پر ترکِ وطن کو ترجیح دیتے تھے۔

قافلوں کی گزرگاہ ہونے کے سبب عرب میں چند شہر آباد ہو گئے تھے، ان میں جو عرب رہتے تھے وہ اپنے اخلاق سے لوگوں کے دل اپنی مٹھی میں لے لیتے تھے، ان چھوٹے چھوٹے شہروں میں تاجروں کو ہر قسم کی پناہ ملتی تھی اور وہ مقامی عبادت گاہوں میں خدا کا شکر ادا کرتے تھے کہ خدا خدا کر کے انہوں نے امن و عافیت کے ساتھ صحرا کی پرہول منزلیں طے کیں اور وہ اپنی منزل مقصود پر آ پہنچے۔ مکہ مکرمہ، طائف، یثرب (مدینہ منورہ) وغیرہ ان شہروں میں شامل تھے جو پہاڑوں کے درمیان یا صحرا کی آغوش میں واقع تھے۔ ان شہروں پر صحرا نشینوں کا اثر غالب تھا۔ رفتہ رفتہ ان شہروں کے باشندوں نے کسی ایک مقام پر آباد ہو کر صحرا نشینی ترک کر دی تھی اور ان میں اور شہریوں میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ ان شاء اللہ اس پہلو پر آئندہ صفحات میں روشنی ڈالی جائے گی۔

بت پرستی

ماحول کا اثر جس طرح عرب کی اخلاقی، سیاسی اور اجتماعی حیثیت پر پڑا تھا، اسی طرح اس کی دینی حالت بھی اس سے اثر پذیر ہوئی۔ کیا روم و ایران سے تعلق کی بنا پر یمن نے مسیحیت و مجوسیت کے اثرات قبول کر لئے تھے اور رفتہ رفتہ یمن سے عرب کے طول و عرض میں بھی کیا یہ اثرات پہنچ چکے تھے؟ ذہن کی سطح پر یہ سوالات ابھرتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ عرب قبائل میں مسیحیت کے اخذ و قبول سے متعلق تو بات یہ ہے کہ جس طرح آج عصر حاضر میں مسیحی مبلغین اپنے دین کی نشر و اشاعت اور اس کی تبلیغ کے لئے بے تاب رہتے ہیں۔ اسی طرح زمانہ قدیم میں بھی وہ مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کے لئے ہر جگہ پہنچ جاتے تھے۔ یہ

Marfat.com

مبلغین اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ صحرانشین قبائل پر مذہب کے اثرات بہت جلد غالب آ سکتے ہیں اور وہ اس لئے کہ کھلی فضا میں زندگی بسر کرنے والوں کو قدرت کے ان لامتناہی مظاہر پر غور وخوض کا بڑی سہولت سے موقع مل جاتا تھا جن کی بساط چار سو بچھی ہوئی ہے۔ اس کے برخلاف جن لوگوں پر شہری طرز زندگی مسلط ہوتی ہے وہ اجتماعی نظام اور سیاسی ادھیڑ بن کے چکر میں اس بری طرح پھنسے ہوتے ہیں کہ انہیں کبھی اس پہلو پر سوچ بچار کی توفیق ہی نصیب نہیں ہوتی کہ مظاہر قدرت سے باعتبار تخلیق ہمارا رشتہ کیا ہے۔ طبیعی قوا کو حیات انسانی میں بہت زیادہ دخل ہوتا ہے لیکن شہری ماحول میں اس حقیقت کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مظاہر قدرت سے صحرانشینوں کی بہ نسبت شہریوں کا رابطہ قائم نہیں رہتا۔ کسی صحرانشین کی زندگی میں ایسی حدود و قیود نہیں ہوتیں جن سے اس کے غور وفکر کی فطری صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ جائیں۔ غور طلب امر یہ ہے کہ آیا مسیحی مبلغین نے اشاعت و تبلیغ کی ان سہولتوں سے کوئی فائدہ اٹھایا جن کے اسباب عرب میں مہیا تھے؟ حالات و واقعات کی قدرتی رفتار بھی ان مبلغین کے حق میں تھی لیکن جہاں تک تاریخ بتاتی ہے صورت یہ پیش آتی کہ مسیحی مبلغین کو اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود عرب میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ معدودے چند قبائل کے ماسوا عرب قبائل اپنے آبائی دین یعنی بت پرستی پر قائم رہے۔

مسیحیت اور یہودیت

اس عہد میں بحیرہ روم اور بحیرہ احمر کے ساحلی علاقے تہذیب و تمدن کے اہم مراکز تھے۔ مسیحیت اور یہودیت دونوں کے پیرو پہلو بہ پہلو زندگی بسر کر رہے تھے۔ لوگوں کے تعلقات نہ زیادہ کشیدہ تھے نہ ان میں ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ یہودیوں کے دلوں میں بغض و عناد کی آگ ابھی تک سلگ رہی تھی اور پس پردہ ان کی کوشش یہ رہتی تھی کہ مسیحیت کہیں جڑ نہ پکڑنے پائے۔ عرب میں یہودی تعداد میں کچھ زیادہ تھے اور ان کی آبادی کا غالب عنصر یمن میں ہی تھا یا یثرب (مدینہ منورہ) میں۔ دوسری طرف مجوسیت بھی یہ نہیں چاہتی تھی کہ مسیحیت، بہ عبور فرات، سرحد ایران میں داخل ہو نیز یہ مذہب یہ گوارا نہیں کرتا تھا کہ بت پرستی کی اشاعت کا دائرہ وسیع ہو۔ روم کے اقتدار کی بساط الٹی اور مرکز تمدن یہاں سے قسطنطنیہ منتقل ہوا تو مسیحیت پر بھی اس کا اثر پڑا۔ عیسائی فرقوں کے درمیان اختلافات کی خلیج پہلے سے بھی زیادہ ناقابل عبور ہو گئی۔ ان فرقوں کے مباحث بالعموم یہ ہوتے تھے۔

(الف) مریم علیہا السلام کی عفت کا معیار (ب) مریم علیہا السلام کو عیسیٰ علیہ السلام پر تقدم حاصل ہے (ج) عیسیٰ علیہ السلام کو مریم علیہا السلام پر تقدم حاصل ہے۔ جب لفظی کج بحثیوں کا دروازہ کھل جائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ جس موضوع پر سلسلہ کلام جاری ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ لفظی بحث سے حقیقت پر پردے پڑ جاتے ہیں اور الفاظ کے قالب میں معانی کی روح کچھ ایسی مستور ہو جاتی ہے کہ نظر ہی نہیں آتی۔

Marfat.com

شام، حیرہ اور حبش میں ہمیشہ نئے نئے مسائل زیر بحث آتے رہتے تھے۔ یہودی اپنے دیرینہ بغض و عناد کی بنا پر یہ نہیں چاہتے تھے کہ بحثیں ختم ہوں۔ عرب کے جو لوگ شام و یمن اور حبش میں تجارت کی غرض سے جاتے تھے، وہ مقامی عیسائیوں کو کج بحثیوں میں مبتلا پاتے تو اپنے آبائی مذہب (بت پرستی) پر ان کا عقیدہ اور بھی زیادہ مستحکم ہو جاتا تھا۔

عرب میں بت پرستی کو فروغ عیسائیوں کی باہمی آویزش سے ہوا۔ نجران کے عیسائی اور یثرب کے یہودی بھی جن سے عربوں کے تجارتی تعلقات تھے، بت پرستی کا شکار ہو گئے تھے۔ بہر حال بنیادی طور پر یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ عرب محض اس وجہ سے بت پرستی پر قائم رہے کہ عیسائیوں کے درمیان کشمکش رہتی تھی کیونکہ جن اقوام نے عیسائیت قبول کر لی تھی ان میں بھی قدیم بت پرستی کی بو پائی جاتی تھی، مصر و یونان کی بت پرستی کے آثار عیسائیوں میں نمایاں نظر آتے تھے۔ اسکندریہ میں یونانیوں کا وہ نظری اقتدار جسے عیسائیت کی ابتداء میں فروغ حاصل تھا باقی نہیں رہا تھا تاہم طبائع پر اس کی جو چھاپ تھی بدستور باقی تھی۔ اسکندریہ کے یونانی مدرسہ خیال کی تعلیم سادہ لوح عوام کو فریب میں مبتلا رکھتی تھی۔ اس نے تعدّدِ الٰہ (بہت سے خداؤں) کے عقیدہ کی پرزور تبلیغ کی تھی۔ چونکہ ان خداؤں میں بہت سی باتیں انسانوں سے ملتی جلتی تھیں اس لئے لوگ اس مدرسہ فکر کے مبلغین کے دام فریب میں آسانی کے ساتھ پھنس جاتے تھے۔ میرے نزدیک ضعیف اشخاص کو یہی عقیدہ بت پرستی کی جانب مائل کرتا ہے۔ ضعیف ارواح یعنی وہ انسان جو روحانیت کی سطح سے نیچے ہوتے ہیں، آرزوؤں اور تمناؤں کے جال میں پھنس کر رہ جاتے ہیں ان کے خیال میں جزو کا کل سے ربط اور ذات الٰہی میں وحدت کی جلوہ گری محالات سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مظاہر، آگ، سورج، چاند وغیرہ میں سے کسی ایک کے آگے ان کا سر تسلیم خم ہو جاتا ہے اور وہ اسی کو اپنا معبود تسلیم کر لیتے ہیں۔ ان کے اندر یہ جرأت و حوصلہ نہیں کہ وحدت الوجود (جس کے مظاہر کا ایک جزو یہ فنا آشنا کائنات بھی ہے) کے حقائق کی تہہ تک پہنچیں۔ ضعیف روحیں ایک ناچیز بت کی معبودیت پر اکتفا کرتی ہیں حالانکہ اس بت میں وحدت کی جلوہ گری کہاں؟ مختلف ذرائع و وسائل سے ان بتوں کی تقدیس کا پرچار کیا جاتا ہے۔ روم میں جن لوگوں کو سینٹ پیٹر کے کلیسا جانے اور اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کا چشم دید بیان ہے کہ سینٹ پیٹر کے مجسمے کا پاؤں بوسوں کی کثرت سے گھس گیا ہے۔ اس کلیسا کے متولی ایک مقررہ مدت کے بعد سینٹ پیٹر کا نیا مجسمہ پرانے مجسمے کی جگہ رکھ دیتے ہیں۔

بت پرستی کے سلسلے میں عربوں کے طریقے مختلف تھے۔ آج ان کا تعین دشوار ہے کیونکہ ظہور اسلام کے بعد پیغمبر خدا ﷺ نے بتوں کو مسمار کرا دیا تھا اور اپنی امت کو ہدایت فرما دی تھی کہ جہاں کہیں بھی کوئی بت نظر آئے، اسے منہدم کر دیا جائے، مسلمان، بت شکنی کے بعد بتوں کے متعلق تحقیق سے بھی پرہیز کرتے رہے۔ البتہ قرآن مجید کی چند آیات اور دوسری صدی ہجری کی روایات سے دستور بت پرستی کا کچھ سراغ ملتا ہے۔

Marfat.com

تقدیس و تکریم کے اعتبار سے بتوں کے مختلف مدارج تھے، ہر قبیلہ کا بت جدا تھا، عربوں میں تین قسم کے بتوں کی پرستش کا رواج تھا اور وہ تین قسمیں یہ تھیں صنم، وثن اور نصب۔ صنم انسانی صورت میں پتھر یا دھات سے بنتا تھا۔ وثن ترشے ہوئے پتھروں سے بنا ہوتا تھا، نصب ایک پتھر ہوتا تھا جس کی کوئی شکل معین نہیں ہوتی تھی اور ایک قبیلہ اس کی پرستش کرتا تھا، نصب جس پتھر سے بنتا وہ چقماق یا اسی قسم کا کوئی پتھر ہوتا تھا۔ لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ بت (نصب) آسمان سے نازل ہوا ہے۔

اہل یمن بہترین اور نہایت خوشنما بت تراشتے تھے، حجاز، نجد اور کندہ کے سنگتراش صنعتکارانہ کمال میں یمنی انداز بت گری کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ جو کتابیں بتوں سے متعلق تصنیف کی گئی ہیں، ان میں بتوں کی شکلیں وضاحت کے ساتھ نہیں دی گئی ہیں البتہ ہبل کی شکل کسی قدر واضح نظر آتی ہے۔ یہ بت عقیق سے بشکل انسان بنایا گیا تھا۔ ایک بار اس بت کا ہاتھ ٹوٹ گیا تو قریش نے سونے کا ہاتھ اس کی جگہ نصب کر دیا۔ ہبل عرب کے تمام بتوں سے بڑا بت تھا، اس کی زیارت گاہ مکہ میں تھی جہاں ہزاروں آدمی عرب کے مختلف حصوں سے اس کی زیارت کے لئے آتے تھے۔ عرب صرف انہی بتوں کی پرستش پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ہر عرب کے گھر میں ایک صنم یا ایک نصب ہوتا تھا۔ لوگ گھر میں آنے اور گھر سے جانے کے اوقات میں ان بتوں کا طواف کیا کرتے۔ جب کبھی عازم سفر ہوتے تو انہی بتوں سے اجازت طلب کی جاتی۔ سفر میں بھی یہ بت ساتھ ہی رہتے تھے۔

مکہ اور اطراف کعبہ کے بت اور وہ تمام بت جو قبائل کے پاس تھے خدا اور بندگان خدا کے درمیان واسطہ سمجھے جاتے تھے۔ عربوں کا عقیدہ تھا کہ یہ بت بارگاہ الٰہی میں قرب کا ذریعہ ہیں لیکن یہ عرب بت پرستی میں کچھ ایسے کھو گئے تھے کہ انہیں کبھی خدا پرستی کا خیال تک بھی نہیں آتا تھا، واسطہ اور وسیلہ ہی کو انہوں نے مقصود قرار دے لیا تھا۔

*

حواشی

۱۔ ظہورِ اسلام کے وقت ایرانیوں کے ماتحت ایک عرب خاندان مناذرہ یہاں کا فرمانروا تھا۔اس کا پایہ تخت کوفہ کے متصل شہر حیرہ میں تھا۔

۲۔ بحوالہ ''حیاتِ محمد ﷺ'' از سر ولیم میور۔

۳۔ سد مآرب کا دوسرا نام ''سدعرم'' ہے۔سد مآرب کیا ہے؟ اسی سلسلہ عمارت میں ایک چیز ''بند آب'' ہے جس کو عرب حجاز ''سد'' اور عرب یمن ''عرم'' کہتے ہیں۔عرب کے ملک میں کوئی دائمی دریا نہیں،صرف سلسلہ کوہستان ہے۔ پانی پہاڑوں سے بہ کر ریگستانوں میں خشک اور ضائع ہو جاتا ہے اور زراعت کے مصرف میں نہیں آتا۔اہل سبا مختلف مناسب موقعوں پر پہاڑوں اور وادیوں کے بیچ میں بڑے بڑے بند باندھ دیتے تھے تاکہ پانی رک جائے اور بقدرِ ضرورت زراعت کے مصرف میں آئے۔مملکت سبا میں اس قسم کے سینکڑوں بند تھے۔ان میں سب سے زیادہ مشہور سد مآرب تھا جو خود دارالحکومت کے اندر واقع تھا۔(ارض القرآن از سید سلیمان ندوی جلد اول،ص ۲۵۵)

۴۔ شہر مآرب کے جنوب میں داہنے بائیں دو پہاڑ ہیں جن کا نام کوہ ابلق ہے۔دونوں پہاڑوں کے بیچ میں وادیٔ اذنیہ ہے۔پہاڑوں سے اور نیز ادھر ادھر سے پانی جمع ہو کر وادیٔ اذنیہ میں ایک دریا جاری ہو جاتا ہے۔سبا نے ان دونوں پہاڑوں کے بیچ میں تقریباً ۸۰۰ قبل مسیح سد مآرب کی تعمیر کی تھی۔یہ بند تقریباً ۱۵۰ فٹ لمبی اور ۱۰۰ فٹ چوڑی ایک دیوار ہے۔اس کا اکثر حصہ تو اب افتادہ ہے تاہم ایک ثلث دیوار اب بھی باقی ہے۔

(ارض القرآن از سید سلیمان ندوی جلد اول ص ۲۵۵)

۵۔ قرآن مجید کی سورۂ سبا، آیت ۱۴، ۱۰ میں شہر مآرب، اس کی شادابی اور تباہی کے تذکرہ میں لفظ ''سیل العرم'' مسطور ہے۔

۶۔ یہ واقعہ عرب روایات اور رومی بیانات میں ۵۲۵ء (۶۴۰ حمیری) کا ہے۔

(ارض القرآن از سید سلیمان ندوی جلد اول، ''حمیری کا زمانہ'')

۷۔ یہ روایت بہت سی کتابوں میں ہے، انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا، ''Historian's History of the World'' اور مشہور مستشرق درمنگھم نے بھی اپنی تالیف ''حیاتِ محمد'' میں تاریخ طبری کی اس روایت کی مبنیٰ قرار دیا ہے جو کہ ہشام بن محمد سے مروی ہے: ''یمنی عیسائی پہلے نجاشی سے فریادی ہوا اور اسے انجیل کے سوختہ اوراق دکھائے۔نجاشی نے کہا یہ چڑھائی کشتیوں کے بغیر نہیں ہو سکتی۔میں قیصر روم سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ کشتیاں مہیا کر دیں۔نجاشی نے سوختہ انجیل کے اوراق بھیج کر قیصر سے درخواست کی اور روم سے کشتیوں کا ایک بیڑا آ گیا۔'' مؤلف لکھتے ہیں کہ طبری نے ہشام بن محمد کی روایت میں یہ اضافہ بھی کیا ہے۔''یہ بیڑا آنے پر نجاشی نے اپنی فوجیں روانہ کر دیں جو ساحل المندب پر اتریں۔'' (بحوالہ طبری، المطبعہ الحسینیہ، جز ۲، صفحہ ۱۰۶ و ۱۰۸)

۸۔ کتب تاریخ میں حبشہ اور یمن کی آویزش کا ایک اور سبب بھی بیان کیا گیا ہے۔نوآبادکاران عرب اور یمن و حبشہ تینوں

Marfat.com

میں تجارتی کاروبار جاری رہتا مگر ان میں حبشہ کے بحیرۂ قلزم کے طویل ساحلوں پر قابض ہونے سے اس کا پلہ بھاری تھا۔ ادھر قیصر روم عرصہ سے تاک میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح یہ بہترین زمین اس کے قبضے میں آ جائے۔ ایک مرتبہ قیصر نے مصر کے ماتحت حکمران ایلیاس جالس کو یمن پر چڑھائی کا حکم بھی دیا جس نے سمندری بیڑا لے کر نجران پر حملہ کیا مگر اس کی فوجیں نجران کے طبعی امراض کا مقابلہ نہ کر سکیں اور جالس وہاں سے ناکام لوٹ آیا۔ اب نجاشی کی نگاہ یمن پر للچائی اور اس نے یمن کے ساتھ عرب کے دوسرے صوبوں سے بھی جنگیں شروع کر دیں لیکن ان لڑائیوں کا نتیجہ جالس گورنر مصر سے مختلف ثابت نہ ہوا۔ اب آ کر یمن کو زیر نگیں کرنے کے لئے یہودیت وعیسائیت کے مناقشہ کا بہروپ بھرا گیا۔ نجاشی کے سپہ سالار ارياط کو یمن پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا گیا جس نے اسے فتح کر لیا اور وہ برسوں یمن میں حکومت کرتا رہا لیکن کچھ عرصہ بعد ارياط کو ایرانیوں نے یمن سے دھکیل کر اس پر اپنا قبضہ کر لیا۔

Marfat.com

مکہ مکرمہ

کعبۃ اللہ اور قریش

مکہ کی اہمیت

اگرچہ یمن زرخیزی اور سرسبزی کے اعتبار سے تمدن میں سارے عرب کا پیشرو تھا لیکن عرب اس کی جانب کچھ زیادہ دھیان نہیں دیتے تھے یہاں تک کہ اس کی عبادت گاہوں کی زیارت کے لئے بھی نہیں جاتے تھے ان کی زیارت گاہ صرف کعبہ تھا جسے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے (اپنے والد محترم حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی معیت میں) تعمیر کیا تھا اور ملک کے گوشے گوشے سے لوگ اس کی زیارت کے لئے آتے تھے، خصوصاً ان چار مہینوں[1] میں جن میں باہمی جنگ وجدال حرام سمجھا جاتا تھا۔

تجارت کے سبب مکہ کو جو اہمیت حاصل تھی اس کی بنا پر اسے عرب کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ مشیت الٰہی مکہ کو رسول اللہ ﷺ کے مولد کی حیثیت سے پہلے ہی منتخب کر چکی تھی اور یہ بھی قدرت کا فیصلہ تھا کہ مکہ تمام عالم کی توجہ کا مرکز بنے، اس کا قدیم گھر ہمیشہ مقدس رہے اور قریش اپنی حیثیت متعین کریں۔ یہ حقیقت ہے کہ قریش نے اپنی سادہ اور بدوی زندگی کو اسی حالت پر برقرار رکھا جیسی کہ صدیوں پہلے تھی۔

محل وقوع

بحیرۂ احمر کے بالمقابل یمن اور فلسطین کے مابین جو تجارتی شاہراہ گزرتی ہے، اس کے وسط میں ساحل سے ۸۰ کلومیٹر (تقریباً پچاس میل) کے فاصلے پر چند پہاڑیاں واقع ہیں۔ انہی پہاڑیوں میں ایک تنگ و تاریک درّہ ہے جسے بیرونی دنیا سے تین راہیں ملاتی ہیں۔ ایک راہ وہ جو یمن سے آتی ہے، دوسری راہ بحیرۂ احمر کے قریب تجارتی شاہراہ سے متصل ہو جاتی ہے اور تیسری راہ وہ ہے جو فلسطین سے رشتہ جوڑتی ہے۔ انہی پہاڑیوں سے گھرے ہوئے درّہ میں مکہ مکرمہ واقع ہے۔

مکہ کا سنگ بنیاد کب رکھا گیا؟ مورخین اس سوال کے جواب میں خاموش ہیں۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ اس کی بنیاد کئی ہزار سال قبل پڑی ہوگی، بہر حال یہ بات مانی ہوئی ہے کہ بنائے مکہ سے قبل اس درّے میں قافلے

پانی کے چشموں کی وجہ سے پڑاؤ کیا کرتے تھے۔ یمن سے فلسطین اور فلسطین سے یمن آنے والے قافلے اس مقام پر اپنے خیمے نصب کرتے اور کچھ وقت کے لئے تازہ دم ہوتے تھے۔ غالباً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ جگہ اپنے قیام کے لئے منتخب کی۔ اس سے قبل مکہ ان قافلوں کا مستقر تھا جو عرب کے شمال و جنوب میں تجارت کی غرض سے آمدورفت رکھتے تھے۔

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے قیامِ مکہ سے قبل کی تاریخ تاریکی میں ہے، قیاس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے قیام سے قبل بھی مکہ، عبادت گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ورودِ مکہ سے متعلق کچھ بیان کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ ہم ان کے والد محترم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات کسی قدر اختصار کے ساتھ قلمبند کر دیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق میں متولد ہوئے، آپ کے والد کا پیشہ نجاری اور سنگ تراشی تھا۔ بت پرستی سے ان کی گزراوقات ہوتی تھی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سن رشد و تمیز کو پہنچے تو انہوں نے یہ دیکھا کہ میرا باپ جو بت بناتا ہے لوگ ان کے سامنے ماتھا ٹیکتے اور انہیں معبود سمجھتے ہیں گویا لکڑی کے ٹکڑے بت بنتے ہی احترام و تقدیس کے قابل بن جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال سے انہیں کچھ ذہنی الجھن ہوئی تو اپنے باپ سے پوچھا کہ آپ خودساختہ بت کیوں پوجتے ہیں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مسئلہ پر بعض لوگوں سے بھی تبادلہ خیال کیا۔ ان کے باپ کو یہ خدشہ لاحق ہوا، کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے بیٹے کی باتوں سے میرے پیشہ کو نقصان پہنچے، لہٰذا اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس قسم کی باتیں زبان پر لانے سے روکا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اس انداز کے انسان تھے جنہیں اپنی بات کے سچ اور اپنی رائے کی پختگی کا قوی احساس ہوتا ہے نیز ان کا شمار ان لوگوں میں کیا جاسکتا تھا جو دلائل و براہین کے بل بوتے پر دوسروں کو اپنا ہم خیال بنا لینے کی صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے ہیں۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے موقع پا کر بت پرستوں کے بنائے ہوئے تمام بتوں کو توڑ پھوڑ ڈالا البتہ بڑے بت سے تعرض نہیں کیا۔ جب اس واقعہ سے متعلق ان سے بازپرس ہوئی اور یہ پوچھا گیا کہ تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ گستاخی کیوں کی ہے؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا، یہ کارستانی بڑے بت کی ہے۔ اسی سے جواب طلب کیجئے اگر اس کے اندر قوت گویائی ہے تو جواب دے دے گا۔ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ (سورۃ الانبیاء: ٦٣)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت پرستوں کی بے راہ روی پر غور و فکر کے بعد یہ قدم اٹھایا تھا، ان کے غور و فکر کا انداز کیا تھا؟ اس کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ

Marfat.com

الْاٰفِلِيْنَ ۞ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۞ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۞ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۞ (سورۃ الانعام: ۷۶ تا ۷۹)

''پس جب رات چھا گئی تو انہوں (حضرت ابراہیم علیہ السلام) نے آسمان پر ایک ستارہ چمکتا ہوا دیکھا تو انہوں نے کہا، یہ میرا رب ہے جب وہ ستارہ ڈوب گیا تو بولے، میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور جب انہوں نے چاند کو طلوع ہوتے دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے، وہ بھی روپوش ہو گیا تو انہوں نے کہا میرا رب میری رہنمائی نہیں کرے گا تو میں راستے سے بھٹک جاؤں گا جب انہوں نے سورج کو کرنیں پھینکتے دیکھا تو انہوں نے کہا (غالباً) یہی میرا رب ہے کیونکہ حجم میں زیادہ ہے لیکن جب وہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو یہ بولے لوگو! میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے خداؤں سے بیزار ہوں۔ میں اپنا منہ اس ذات کی جانب موڑتا ہوں جس نے آسمان و زمین پیدا کئے اور میں کسی کو بھی اس کا شریک ٹھہرانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور سارہ علیہا السلام مصر میں

قوم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک نہیں مانی بلکہ الٹے آگ بگولا ہو گئے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہی کر سکتے تھے کہ اس داعی الی الحق کو ہلاک کر ڈالیں چنانچہ انہوں نے اپنے بادشاہ اور مدعی الوہیت نمرود کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو درست عقائد کی تبلیغ کے جرم میں نذر آتش کر دیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل علیہ السلام کو اس سے نجات دی یعنی اس آگ سے جلا ڈالنے کی خاصیت ہی سلب کر لی جس میں نمرودیوں نے انہیں ڈالا تھا۔

آخر آپ نے اپنی رفیقہ حیات حضرت سارہ علیہا السلام کی معیت میں فلسطین کی راہ لی۔ پھر فلسطین سے عازمِ مصر ہوئے۔ مصر ان ایام میں بنی عمالقہ کے زیر نگیں تھا۔ حضرت سارہ علیہا السلام خوبصورت تھیں اور بنی عمالقہ کا دستور یہ تھا کہ کوئی حسین عورت ان کی زد سے بچ نہیں سکتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان لوگوں سے کہا، سارہ علیہا السلام میری بہن ہے اور یہ اس لئے کہ انہیں خطرہ تھا کہ سارہ علیہا السلام کو قبضہ میں لے آنے کے بعد مجھے ہلاک کر دیا جائے گا۔

شاہِ مصر نے حضرت سارہ علیہا السلام کو اپنی ازواج میں شامل کرنے کی خواہش کی تو ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ حضرت سارہ علیہا السلام بن بیاہی نہیں ہیں۔ اس خواب کے بعد اس نے چند تحفے تحائف کے

ساتھ جن میں ہاجرہ نامی ایک کنیز تھی حضرت سارہ علیہا السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سپرد کر دیا۔ حضرت سارہ علیہا السلام لاولد تھیں لہٰذا ایک دن انہوں نے اپنے شوہر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہاجرہ سے عقد زوجیت کی ترغیب دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مشورہ پر عمل کیا، زیادہ عرصہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے بطن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام متولد ہوئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام ابھی عنفوان شباب کی منزل میں تھے کہ حضرت سارہ علیہا السلام کے بطن سے حضرت اسحاق پیدا ہوئے۔

''ذبیح'' سے متعلق جو روایات ہیں، ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس موضوع پر کہ آیا یہ واقعہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت سے ماقبل رونما ہوا یا مابعد؟ واقعہ ذبح کا ظہور فلسطین میں ہوا یا حجاز میں؟ اسرائیلی مؤرخین کا بیان ہے کہ ذبیح حضرت اسحاق علیہ السلام تھے، حضرت اسماعیل علیہ السلام نہ تھے۔ یہاں اس متنازعہ فیہ مسئلہ پر تبصرہ کی گنجائش نہیں ہے۔ شیخ عبدالوہاب نجار اپنی تصنیف قصص الانبیاء میں رقمطراز ہیں کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے اور وہ اپنے اس دعویٰ کی دلیل تورات سے پیش کرتے ہیں۔ اس بنا پر کہ تورات میں یہ بتایا گیا ہے کہ ذبیح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اکلوتا بیٹا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش سے قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی تھے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام جن کی ولادت بعد میں ہوئی اکلوتے کیسے ہو سکتے ہیں؟ قرینہ یہی کہتا ہے کہ داستان ذبح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی سے علاقہ رکھتی ہے اگر بفرض محال حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ماننی پڑے گی کہ ذبح کا واقعہ فلسطین میں رونما ہوا کیونکہ حضرت اسحاق علیہ السلام اپنی والدہ کی معیت میں فلسطین میں رہے، کبھی حجاز نہیں آئے۔ اس روایت کی بنا پر کہ ذبح وفدا کا واقعہ منیٰ میں ظہور پذیر ہوا یقیناً حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ذبیح قرار دیئے جا سکتے ہیں چونکہ قرآن کریم میں ذبیح کے نام کی صراحت و وضاحت نہیں کی گئی ہے اس لئے مؤرخین نے اس موضوع پر مختلف آراء پیش کی ہیں۔

واقعہ ذبح قرآن حکیم میں

ذبح وفدا کا قصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ مجھے حکم دیتا ہے کہ میں اپنے بیٹے کو اس کی راہ میں قربان کر دوں چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام صبح سویرے اپنے بیٹے کو ہمراہ لے کر نکلے۔ (قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے)

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ؗ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴿۱۰۳﴾ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ﴿۱۰۶﴾ وَفَدَيْنٰهُ

Marfat.com

بِذِبۡحٍ عَظِيۡمٍ ۝ (سورۃ الصّٰفّٰت: ۱۰۲ تا ۱۰۷)

"پس جب حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے کو ہمراہ لئے ہوئے مقام "سعی" پر پہنچے تو انہوں نے کہا، اے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ اس بارے میں تیری کیا رائے ہے؟ حضرت اسماعیلؑ نے کہا، اے میرے باپ! آپ کو حکم ملا ہے آپ اس کی تعمیل کریں، ان شاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔ پس جب دونوں نے خدا کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کیا تو باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل زمین پر لٹایا (اس وقت) ہم نے آواز دی، اے ابراہیمؑ! تو نے خواب کی تصدیق کردی اور ہم نیکوکاروں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یہ ایک آزمائش تھی اور ہم نے فدیہ کے طور پر ذبح عظیم سے اسے نوازا۔"

تاریخ میں واقعہ ذبح و فدا سے متعلق جو روایات آئی ہیں۔ ان کے نقل و بیان میں شاعرانہ تخیلات سے مدد لی گئی ہے اگرچہ اہل مکہ کا اسلوب بیان اس قسم کا نہیں ہوتا تاہم محض دلچسپی اور دل آویزی کی خاطر ہم ذیل میں انہیں پیش کرتے ہیں مثلاً یہ کہ:

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں تو یقین آ گیا کہ یہ حکم الٰہی ہے چنانچہ آپ نے اپنے بیٹے سے کہا، بیٹا! رسی اور چھری لے چلو، ہم جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لائیں گے، بیٹے نے اس حکم کی تعمیل کی اور باپ کے ہمراہ ہولیا، ان کے چلے جانے کے بعد شیطان انسان کی صورت میں اس کی ماں کے پاس آیا اور کہا:

شیطان: کچھ تمہیں خبر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تمہارے بیٹے کو کہاں لے گئے ہیں؟

ماں: لکڑیاں جنگل سے لانے کے لئے۔

شیطان: نہیں یہ بات نہیں ہے، وہ اسے قتل کرنے کے ارادہ سے لے گئے ہیں۔

ماں: نہیں وہ مہربان اور شفیق باپ ہے اور اسے اپنے بیٹے سے محبت ہے۔

شیطان: ابراہیم علیہ السلام کا یہ خیال ہے کہ اسے خدا نے ذبح پسر کا حکم دیا ہے۔

ماں: اگر خدا نے حکم دیا ہے تو پھر تو اس کی تعمیل واجب ہے۔

شیطان حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے پاس سے مایوس ہو کر بیٹے کے قریب پہنچا اور وہی باتیں کہیں جو اس کی ماں سے کہی تھیں۔ بیٹے نے بھی اسی قسم کے جوابات دیئے جیسے اس کی ماں نے دیئے تھے غرض شیطان کچھ ناامید ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آیا اور کہنے لگا، تمہارا خواب سچا نہیں ہے۔ یہ کیا کہ آپ بیٹے کو قتل کردیں اور بعد میں پشیمان ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شیطان پر لعنت بھیجی اور اپنے پاس سے دھتکار دیا، غرض شیطان ندامت و شرمساری کے عالم میں رخصت ہوا۔ اس کا داؤ نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر چلا اور نہ ان

Marfat.com

کے زن وفرزند پر۔

بعدازاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے اپنا خواب بیان کیا اور اس کی رائے طلب کی، بیٹے نے کہا، اللہ نے آپ کو جو حکم دیا ہے اس کی تعمیل بلا پس وپیش کیجئے، اس کے بعد کسی راوی نے شاعرانہ انداز میں تحریر کیا ہے:

''بیٹے نے کہا، پدرِ محترم! ذبح کرنے سے قبل آپ میرے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیں تاکہ میں تڑپ نہ سکوں، میرے خون کے چھینٹے آپ کے کپڑوں پر نہ پڑیں اور میرے اجروثواب میں کمی نہ آئے۔ موت سخت تکلیف دہ حالت ہوتی ہے ہوسکتا ہے، میں بے قابو ہوجاؤں اور میرا جسم تڑپنے لگے، چھری کو تیز کرلیجئے تاکہ جلد ہی میرا کام تمام ہوجائے اور جب آپ مجھے ذبح کرنے کے لئے لٹائیں تو منہ کے بل لٹائیں، پہلو کے بل نہ لٹادینا، مجھے خوف ہے کہیں منہ پر نظر پڑنے سے پدری محبت جوش میں نہ آجائے اور آپ کے حکم الٰہی کی تعمیل میں کوئی کوتاہی ہوجائے۔ ذبح کے بعد میرے (خون آلود) کپڑے میری والدہ کو دے دینا تاکہ ان کے دل کو تسلی ہوجائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا، بیٹے کیا خوب! تم حکم الٰہی کی تعمیل میں میری مدد کررہے ہو، یہ کہہ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹے کے گلے پر چھری پھیرنے کے لئے تیار ہوگئے، اس کے ہاتھ باندھ دیئے اور منہ کے بل زمین پر لٹادیا۔ چھری پھیرنا چاہتے تھے کہ آواز آئی، تم نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا ہے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے پاس کھڑا ہوا ایک مینڈھا نظر آیا جسے آپ نے اپنے بیٹے کی جگہ ذبح کیا۔''

اس داستان ذبح وفدا سے تسلیم ورضا اور سمع واطاعت کی شان نمایاں ہوتی ہے۔

جب حضرت اسحاق علیہ السلام بھی کچھ بڑے ہوگئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح ان سے بھی محبت ہوگئی۔ حضرت سارہ علیہا السلام پر یہ شفقت پدری جس میں دونوں بیٹے شریک تھے ناگوار گزری۔ سمندِ ناز کو ایک اور تازیانہ ہوا کہ ایک بار حضرت سارہ علیہا السلام نے کھلی آنکھوں دیکھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام کو پیٹ رہے ہیں، اس وقت انہوں نے قسم کھائی کہ میں ہاجرہ اور اس کے بیٹے کو اپنے پاس نہیں رہنے دوں گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی اس کشیدگی سے یہ احساس ہوا کہ اگر یہ دونوں عورتیں یک جا رہیں تو میرے لئے زندگی عذاب ہوجائے گی چنانچہ اس خیال سے وہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ساتھ لے کر جنوب کی طرف چل دیئے یہاں تک کہ اس درّہ میں پہنچے جہاں آج مکہ مکرمہ آباد ہے، یہ درّہ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، یمن اور فلسطین کے درمیان آنے جانے والے قافلوں کا مستقر تھا۔ مستقلاً یہاں کوئی ایک متنفس بھی سکونت پذیر نہ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام

Marfat.com

کو تھوڑے سے سامانِ خورونوش کے ساتھ اسی جگہ ٹھہرا دیا۔ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے وقتی طور پر ایک سائبان بنالیا اور اپنے بیٹے کے ساتھ اس میں پناہ لی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ماں بیٹے سے رخصت ہو کر اپنے وطن لوٹے۔ یہاں جب سامانِ خورونوش ختم ہو گیا تو تشویش ہوئی۔ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں، آخر دوڑتی ہوئی دڑے کے نیچے تک پہنچیں، اس طرح سات دفعہ انہوں نے صفا و مروہ کے درمیان دوڑ لگائی۔ ساتویں بار مایوسی کے عالم میں بیٹے کے پاس گئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ بیٹے نے پاؤں کی ایڑی سے زمین کھوج دی ہے اور اس جگہ سے پانی ابلنے لگا ہے۔ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے خود بھی پانی پیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی پلایا، پھر انہوں نے اس چشمے کی ڈال باندھ دی تا کہ ریت سے اٹ نہ جائے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ اسی جگہ مقیم رہے۔ کارواں اس طرف سے آتے جاتے تھے اور ہر کارواں سے انہیں خورونوش کی اشیاء مقدار میں مل جاتی تھیں کہ دوسرے کارواں کے آنے تک ان کی ضروریات پوری ہوتی رہتیں۔ [ت]

بنی جرہم کی آبادکاری

چشمہ زمزم نمودار ہونے کے بعد چند عرب قبائل نے وہاں سکونت اختیار کرلی۔ انہی میں سے ایک قبیلہ، بنی جرہم بھی تھا بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قبیلہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کی آمد سے قبل وہاں مقیم تھا لیکن ان کے برخلاف کچھ روایات ایسی بھی ہیں جن سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ قبیلہ بنی جرہم اس وقت یہاں آباد ہوا جب چشمہ زمزم پھوٹ نکلا تھا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آمد کا واقعہ

حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان ہوئے تو قبیلہ بنی جرہم کی ایک لڑکی سے ان کا عقد ہو گیا اور اس مقام پر جہاں بعد میں کعبہ کی تعمیر ہوئی، سکونت اختیار کرلی، مشہور ہے کہ ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہؓ سے کہا کہ میں ہاجرہ علیہا السلام اور اسماعیل علیہ السلام سے ملنے کے لئے جانا چاہتا ہوں۔ حضرت سارہؓ نے انہیں اجازت دے دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گھر پہنچے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام موجود نہ تھے، آپ نے ان کی بیوی سے دریافت کیا، گھر میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہے؟ اس نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا جب تمہارے شوہر آجائیں تو ان سے میرا اسلام کہنا اور یہ پیغام دینا کہ گھر کی چوکھٹ بدل، حضرت اسماعیل علیہ السلام گھر آئے تو بیوی نے یہ پیغام دیا، اس کی تعمیل میں حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بیوی کو طلاق دے دی اور اسی قبیلہ کی کسی دوسری لڑکی سے نکاح کرلیا، اتفاق سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پھر ان سے ملنے کے لئے آئے اس روز بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام گھر پر نہ تھے۔ ان کی بیوی نے بڑے سلیقے اور بڑے ادب و احترام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خیر مقدم کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وقت رخصت انہیں بھی پیغام دیا اور وہ یہ کہ جب تمہارے شوہر آئیں تو سلام کے بعد بعد انہیں یہ پیغام دے دینا کہ تمہارے گھر کی چوکھٹ

خوب ہے۔ [56]

جب اسماعیل علیہ السلام واپس لوٹے تو بی بی نے تمام واقعہ حرف بہ حرف عرض کیا۔ فرمایا، "یہ میرے والد (ابراہیم) تھے اور تم میرے گھر کی چوکھٹ ہو۔ میرے والد نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں سدا اپنی زوجیت میں رکھوں۔" [57]

اس دوسری بیوی سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے ہوئے جو عرب "مستعربہ" کے مورثین قرار دیئے جاتے ہیں۔ مادری سلسلہ سے عرب یعرب بن قحطان کی اولاد سے منسوب ہیں۔ ان کے والد حضرت اسماعیل علیہ السلام ماں کی طرف سے مصر سے [58] اور باپ کی طرف سے عراق، فلسطین اور ان مقامات سے منسوب ہیں جہاں جہاں وہ مقیم رہے۔

مندرجہ بالا داستان کے اس بنیادی حصہ پر سب متفق ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام مکہ مکرمہ گئے تھے لیکن جزئیات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ محققین کی رائے ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اس مقام پر لے گئے تھے، جہاں آج مکہ آباد ہے جہاں چند چشمے تھے اور قبیلہ بنو جرہم کے افراد ان چشموں کے آس پاس سکونت پذیر تھے۔ قبیلہ بنی جرہم حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے جب حضرت اسماعیل علیہ السلام نے منزل شباب میں قدم رکھا تو بنی جرہم کے قبیلہ کی ایک لڑکی سے آپ کا عقد ہوگیا جس کے بطن سے کئی لڑکے پیدا ہوئے۔ عرب نسل سے عبرانی و مصری حضرت اسماعیل علیہ السلام کا یہ رشتہ ان کی اولاد کی قوت وعزیمت کا سبب بن گیا اور ان کی اولاد میں عربوں، عبرانیوں اور مصریوں کی تمام خصوصیات جمع ہوگئیں۔ محققین کے نزدیک وہ تمام روایات جو حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی سعی بین الصفاء والمروا، چشمہ زمزم کی نمود اور اس سے متعلق امور کے بارے میں پیش کی جاتی ہیں، بے بنیاد ہیں۔

سر ولیم میور کی رائے ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ حجاز کبھی نہیں گئے۔ یہ روایت جو سفر حجاز سے متعلق ہے سراسر غلط اور بے بنیاد ہے، یہودیوں نے ظہور اسلام سے کئی سو سال پیشتر یہ داستان وضع کی تھی اور اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ عربوں سے اپنے نسلی تعلق کی وجہ جواز پیش کریں کیونکہ حضرت اسحاقؑ یہودیوں کے مورث اعلیٰ ہیں تو یہودیوں اور عربوں کے مابین رشتہ اتحاد قائم ہوجاتا اور اس صورت میں عربوں کے لئے یہ لازم ہوجاتا کہ وہ یہودیوں کے ساتھ خاص مراعات روا رکھیں، عرب میں یہودیوں کی تجارت کے لئے بھی راہ کھل جاتی۔ سر ولیم میور کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عبادت کا انداز عرب کے طریق عبادت سے قطعاً مختلف تھا کیونکہ عرب بت پرست تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا پرست۔

ہمارے خیال میں کسی تاریخی واقعہ سے انکار کے لئے صرف یہی بات کافی نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور سے صدیوں بعد عربوں کی بت پرستی اس امر کا ثبوت ہرگز نہیں کہ عرب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت

Marfat.com

اسماعیل علیہ السلام کے حجاز آنے کے وقت بھی بت پرست تھے لیکن اس سے بھی سرولیم میور کے دعویٰ کی صحت کا ثبوت نہیں ملتا کیونکہ خود حضرت ابراہیمؑ کی قوم بت پرست تھی اور وہ اسے اپنی تبلیغ سے خدا پرستی کا قائل کرنا چاہتے تھے اگر عربوں کو بھی خدا پرستی کی دعوت دی گئی ہو اور انہوں نے اس دعوت پر لبیک نہ کہا ہو تو اس سے حضرت ابراہیمؑ کے سفر مکہ کی تردید نہیں ہوتی، عقل سلیم بھی تاریخی روایات کی تائید کرتی ہے اور وہ اس بنا پر کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق سے فلسطین پہنچے تھے اور مکہ اور فلسطین کے مابین قدیم زمانے سے قافلوں کی آمدورفت تھی، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام ایسے سفر دوست اور صحرانورد شخص سے یہ بعید نہ تھا کہ وہ ان اسفار کے دوران حجاز بھی جا پہنچے ہوں۔ ؎

مؤرخین اس واقعہ سفر حجاز پر متفق ہیں اس لئے اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔

سرولیم میور اور ان کے ہم خیال کہتے ہیں کہ یہ بات قرین قیاس ہے کہ بعد میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد فلسطین سے عرب پہنچی ہو اور ان کی نسل عربوں سے مل جل گئی ہو، مقامِ حیرت ہے اگر یہ صورت اولادِ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے لئے ممکن قرار دی جاسکتی ہے تو خود ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کے لئے یہ امکان کیوں نہیں؟ جب تاریخ اس واقعہ کی صحت پر صاد کرتی ہے اور قرآن کے علاوہ دوسری کتب میں بھی اس واقعہ کی تفصیل موجود ہے تو اس سے انکار کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی معیت میں کعبہ کے بام و در کی تعمیر کی۔ قرآن کریم میں اس سے متعلق یہ تصریحات ہیں:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ (سورۂ آل عمران: ۹۶، ۹۷)

"بیشک سب سے پہلا گھر جو خلوق کے لئے (بغرضِ عبادت) تعمیر کیا گیا وہ مکہ میں ہے، تمام جہانوں کے لئے برکت اور ہدایت کا سرچشمہ ہے، اس میں روشن نشانیاں ہیں اور وہ مقام بھی ہے جہاں ابراہیم علیہ السلام عبادت کیا کرتے تھے جو شخص بھی اس گھر میں داخل ہوجاتا ہے مامون و محفوظ ہوجاتا ہے۔"

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ

Marfat.com

السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۲۷﴾ (سورۃ البقرہ: ۱۲۵ تا ۱۲۷)

"اور جب ہم نے اس گھر کو عبادت گاہ اور لوگوں کے لئے مامن قرار دیا اور ہم نے یہ حکم دیا کہ مقام ابراہیم علیہ السلام میں نماز پڑھو اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام کو عہد و پیمان کے ساتھ اس کام پر مامور کیا کہ طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے اس گھر کو ہر طرح پاکیزہ رکھیں اور جب کہا ابراہیمؑ نے، اے رب اس شہر کو دارالسلام بنائے رکھ اور ان میں سے ان لوگوں کے لئے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، پھلوں کی روزی دے تو (رب نے) کہا جو شخص کفر پر آمادہ ہو گا ہم اسے کم حصہ دیں گے اور آخر اسے عذابِ جہنم میں دھکیل دیا جائے گا جو بہت برا ٹھکانہ ہے اور جب ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کی معیت میں کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے، دونوں کی زبان پر یہ دعائیہ کلمات تھے اے ہمارے رب محنت قبول فرما تو سننے والا اور دانا بینا خدا ہے۔"

کعبہ میں بت پرستی

جیسا کہ مندرجہ بالا آیات سے ظاہر ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر زیارت کے خیال سے کی تھی اور اسے مخلوق کے لئے عبادت گاہ قرار دیا تھا، سوال یہ پیدا ہوتا ہے پھر وہ گھر بت خانہ اور بت پرستی کا مرکز کیسے بن گیا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد خدا کے اس گھر میں عبادت کا کیا دستور رہا؟ اور اس دستور نے رفتہ رفتہ بت پرستی کی شکل کیسے اختیار کر لی؟ ان امور سے متعلق تاریخ قطعاً خاموش ہے۔ بعض لوگ اس تغیر کے اسباب کی وضاحت کے لئے کچھ مفروضات قائم کرتے ہیں اور پھر انہی مفروضات کی روشنی میں حالات کی الجھی ہوئی گرہیں سلجھاتے ہیں۔

ستارہ پرستی کا زور

اس زمانے میں عرب کے اندر ستارہ پرستی بڑے زوروں پر تھی۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ شروع شروع میں لوگ ستاروں کی پرستش نہیں کرتے تھے بلکہ مظاہر ربوبیت قرار دے کر ان کی تعظیم و تکریم میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ مخلوق خدا کی غالب اکثریت الوہیت کے مفہوم سے ناآشنا تھی اس لئے رفتہ رفتہ شدہ شدہ ستارہ پرستی کو فروغ نصیب ہوا۔ کبھی کبھی ان لوگوں کو آتش فشانی پتھر مل جاتے تھے تو یہ سمجھتے تھے کہ یہ پتھر آسمان سے گرے ہیں اور ستاروں سے آئے ہیں۔ اسی گمان کی بنا پر اول اول انہیں ستاروں کے مظاہر سمجھ کر لوگوں نے پوجا اور بعد میں بت پرستی کا سلسلہ چل نکلا۔ آخر کار بات یہاں تک پہنچی کہ کوئی عرب سنگ اسود کی پرستش پر اکتفا نہیں کرتا تھا بلکہ کعبہ کا ایک پتھر سفر میں ساتھ رکھتا تھا اور سفر و حضر کے سلسلہ میں اس سے

Marfat.com

اجازت طلب کی جاتی تھی اور اس پتھر کی پوجا بھی کی جاتی تھی۔ اس طرح رفتہ رفتہ بت پرستی کا رواج عام ہوگیا اور ابتداء میں وہ رسوم جو ستاروں اور ان کے خالق کی پرستش کے سلسلہ میں ادا کی جاتی تھیں، انہیں پتھر کے بتوں سے منسوب کر دیا گیا اور ان کے لئے نذر و قربانی بھی معمولات میں داخل ہوگئیں۔ عرب میں معکوس دینی انقلاب سے متعلق مؤرخین کا یہ ایک مفروضہ ہے۔ مشہور قدیم مؤرخ ہیروڈوٹس نے عرب میں ''لات'' کی پرستش کا ذکر کیا ہے۔ دیودورسل نے خانہ کعبہ کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ عرب اسے بربنائے تقدس بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جزیرہ نمائے عرب میں قدیم ایام سے بت پرستی کا رواج تھا اور ظاہر ہے کہ دین ابراہیمؑ کی ترویج عرصہ دراز کی بات نہیں۔

پیغمبروں کی آمد

عرب میں یکے بعد دیگرے انبیاء علیہم السلام کا ظہور ہوا جنہوں نے مخلوقِ خدا کو عبادت کی دعوت دی لیکن لوگوں نے اس دعوت پر لبیک نہیں کہا اور اپنے عقیدۂ بت پرستی پر جمے رہے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے قوم عاد کو جو حضرموت کے شمال میں آباد تھی، دعوتِ حق دی لیکن ان پر گنتی کے لوگ ایمان لائے اور اکثر و بیشتر نے غرور و تکبر سے دعوت کی تردید کی اور یہ کہا:

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ (سورۂ ہود: ۵۳)

''اے ہودؑ! آپ کے پاس بت پرستی کے خلاف نہ کوئی دلیل ہے نہ حجت پھر ہم آپ کی باتوں میں آکر اپنے خداؤں سے کیسے روگردانی کریں اور کیسے آپ کی نبوت پر ایمان لے آئیں۔''

حضرت صالح علیہ السلام نے قوم ثمود کو جو حجر میں سکونت پذیر تھی، صراط مستقیم کی جانب بلایا لیکن اس دعوت سے کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی اور دعوت حق پر کسی نے بھی لبیک نہیں کہا۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے اہل مدین کو اسلام کی دعوت دی لیکن لوگوں نے ان کی دعوت پر کان نہیں دھرے اور اس جرم میں انہیں ہلاکت سے دوچار ہونا پڑا۔ غرض اس قوم کا انجام بھی ایسا ہی ہوا جیسا کہ قوم عاد و ثمود کا ہوا تھا۔ قرآن کریم میں دوسرے انبیاء علیہم السلام کے واقعات بھی مذکور ہیں جن کا نصب العین دعوت الی الحق کے سوائے اور کچھ نہ تھا لیکن ان کا روئے سخن جن اقوام سے تھا ان پر غرور و تکبر کا جنون سوار تھا اور بت پرستی ان کی زندگی کا جزو بن چکی تھی۔ یہ قومیں سال میں ایک بار عرب کے مختلف گوشوں سے بتوں کی زیارت کے لئے مکہ جایا کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (سورۂ الاسراء: ۱۵)

''اور ہم کسی پر عذاب نازل نہیں کرتے جب تک (پہلے اس کی ہدایت کے لئے) ہم

رسول نہ مبعوث کریں۔"

کعبہ اور مختلف مناصب

قصی بن کلاب [۱۰] وہ پہلے شخص ہیں جنہیں تعمیر کعبہ سے لے کر ان کی مکہ پر سیادت کے ساتھ مندرجہ ذیل اعزازات حاصل ہوئے۔ نصف صدی پنجم عیسوی ان کا زمانہ ہے یعنی تقریباً ۴۴۰ عیسوی۔ [۱۱] ان مناصب کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ حجابت: اس سے مراد کعبہ کی تولیت اور کلید برداری تھی۔
۲۔ سقایت: حجاج کے لئے اکل وشرب کا اہتمام اس منصب سے متعلق تھا۔
۳۔ رفادت: مفلس و نادار حجاج کی دعوت اور ان کی مراجعت پر انہیں زادِراہ کی پیشکش۔
۴۔ صدارت: اہل مکہ کی قومی مجلس کی سربراہی۔
۵۔ لوائ: یہ وہ علم تھا جو دشمنوں سے تصادم کے وقت بلند کیا جاتا تھا۔
۶۔ قیادت: افواج کی سپہ سالاری قیادت کے نام سے موسوم تھی۔

اہل مکہ ان مناصب ہی سے ہر منصب کا احترام کرتے تھے۔ ہمارے نزدیک یہ جملہ مناصب تعمیر کعبہ کے پہلو بہ پہلو ظہور میں نہیں آئے بلکہ ان کا تعین یکے بعد دیگرے عمل میں آیا تھا۔ ان میں سے بعض مستقل تھے اور کعبہ کی دینی منزلت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے البتہ ان میں سے بعض کا مکہ کے ساتھ علاقہ تھا۔

قصی سے پہلے کعبہ

بنائے کعبہ کے وقت مکہ کو چنداں اہمیت حاصل نہ تھی جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے یہاں سکونت اختیار کی اور اپنے والد ماجد کے ہمراہ کعبہ کی تعمیر میں حصہ لیا تو مکہ کی ہیئت کذائی کی تبدیلی سے یہ مقصود تھا کہ اس مقام کی شہری حیثیت مسلم ہو جائے۔ اہل مکہ برسوں بدوی اخلاق کے علمبردار رہے تھے اور جن کے آثار آج بھی ان کی اجتماعی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ بعض مؤرخین کی رائے ہے کہ پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں قصی کے دورِ سیادت تک مکہ پر بدویت کا خول چڑھا ہوا تھا لیکن یہ بات قیاس میں نہیں آتی کہ کعبہ کی اہمیت اور منزلت کے باوصف مکہ کی بدویت کیسے برقرار رہی۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد کعبہ کی تولیت برسوں قبیلہ بنی جرہم کے ہاتھوں میں رہی، علاوہ بریں اپنے محل وقوع کے اعتبار سے مکہ اس کاروانی شاہراہ پر واقع تھا جہاں سے یمن، حیرہ اور شام کے قافلے گزرتے تھے نیز بحیرۂ احمر کے واسطے مکہ کا تعلق بیرونی ممالک کی تجارت سے بھی تھا۔ ان حالات میں یہ بات کیسے ممکن ہے کہ مکہ نے شہرت کے مدارج طے نہ کئے ہوں اور اس پر بدویت کی چھاپ رہی ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے حق میں امن و سلامتی کی جو دعا کی تھی اس میں مکہ کو شہر سے تعبیر کیا ہے۔ ان جملہ امور کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مکہ، قصی

Marfat.com

سے صدیوں قبل تمدن کا گہوارہ بن چکا تھا جس میں ''تقریباً دو ہزار قبل مسیح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے گرامی قدر فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لا کر آباد کیا۔''[21]

غلبۂ قریش

مضاض بن عمرو کے زمانہ تک مکہ کے نظم و نسق کی باگ ڈور اسی قبیلہ کے ہاتھوں میں رہی تھی۔ اس عرصہ میں مکہ کی تجارت عروج کو پہنچ چکی تھی اور اس کے باشندے آسودہ روزگاری کے باعث یہ حقیقت قطعاً فراموش کر چکے تھے کہ ہم وادی غیر ذی زرع کے باشندے ہیں۔ عیش و راحت کی زندگی نے ان کی قوتِ عمل سلب کر لی اور ان کی عاقبت نااندیشی اس انتہا کو پہنچ گئی کہ چشمہ زمزم کی حفاظت سے بھی انہوں نے بے توجہی برتنی شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس چشمے کے سوت سوکھ گئے۔

ان حالات میں قبیلہ خزاعہ نے مکہ اور اس کے اعزازی مناصب پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اس خطرہ کے سد باب کے لئے مضاض بن عمرو نے اپنی قوم کو بیدار کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن اس باسی کڑھی میں ابال نہیں آ سکا۔ جب مضاض بن عمرو کو قطعیت کے ساتھ یہ یقین ہو گیا کہ مکہ سے بنو جرہم کے اقتدار کی بساط الٹ جائے گی تو اس نے بر بنائے احتیاط کچھ بیش قیمت سامان اور وہ دو طلائی ہرن جو لوگ ہدیہ کے طور پر کعبہ کے لئے لائے تھے چشمہ زمزم کھود کر اس میں دفن کر دیئے، اس خیال سے کہ جب مکہ پر دوبارہ ان کا قبضہ ہو تو ان سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اس کام سے فارغ ہو کر مضاض نے اپنے قبیلہ اور بنو اسماعیل سمیت مکہ کو خیر باد کہا اور مکہ پر بنی خزاعہ کے اثر و اقتدار کا پرچم لہرانے لگا۔ یہ حالت قصی بن کلاب کے دور سیادت تک قائم رہی۔

قصی بن کلاب

سعد بن سہیل کی بیٹی فاطمہ کی شادی کلاب سے ہوئی تھی۔ اس کے بطن سے کلاب کے دو بیٹے زہرہ اور قصی متولد ہوئے۔ ابھی قصی ایام شیر خوارگی ہی میں تھے کہ ان کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا، فاطمہ نے ربیعہ بن حرام کے ساتھ عقد ثانی کر لیا اور اس کے ہمراہ شام چلی گئی۔ وہاں اس کے بطن سے درّاج نام کا ایک اور بیٹا ہوا۔ قصی سن رشد و تمیز کو پہنچ چکے تھے اور وہ ربیعہ کو اپنا باپ ہی سمجھتے تھے۔ ایک دن قصی اور خاندان ربیعہ کے درمیان کچھ تکرار ہو گئی۔ اس موقع پر ربیعہ کے رشتہ داروں نے طنز و تعریض کے انداز میں قصی سے کہا کہ تو ہم میں سے نہیں ہے۔ قصی نے اپنی والدہ سے اس بات کی شکایت کی تو اس کی والدہ نے کہا کہ خدا کی قسم! تو حسب و نسب میں ان لوگوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ تیرا باپ کلاب بن مرہ تھا اور تیرے خاندان کے افراد مکہ میں آباد ہیں چنانچہ قصی چند روز بعد مکہ چلے آئے اور اسی جگہ سکونت اختیار کر لی۔ اہل مکہ اور قصی کے افرادِ خاندان قصی کی بلند حوصلگی اور عالی دماغی کے باعث ان کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

ان ایام میں بنو خزاعہ کا ایک فرد حلیل بن حبشیہ کعبہ کا متولی تھا، قصی نے اس کی دختر حُبّی سے عقد کی

Marfat.com

درخواست کی جسے شرف قبول حاصل ہوا۔ شادی کے بعد قصی نے اعلیٰ پیمانے پر تجارت کا سلسلہ شروع کیا جس کی بدولت تھوڑی مدت میں دولت کے انبار لگ گئے۔ اس اثناء میں قصی کئی بیٹوں کے باپ بن چکے تھے، مال وعیال کی کثرت کے ساتھ ساتھ ان کی قدرومنزلت میں بھی روز بہ روز اضافہ ہورہا تھا۔ حلیل کا آخری وقت قریب آیا تو اس نے وصیت کی کہ کلید کعبہ میری بیٹی حبّی کے حوالے کردی جائے لیکن حبّی نے یہ ذمہ دارانہ عہدہ قبول نہ کیا اور اپنے اختیار سے کعبہ کی کلید ابوخیقان خزاعی کو سونپ دی۔ ابوخیشان کو شراب کی لت تھی۔ ایک دن اس نے مجبوراً ایک جام شراب کے عوض کلید قصی کے ہاتھ فروخت کردی۔ بنوخزاعہ کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ اگر کلید کعبہ قصی کے قبضے میں رہی تو آہستہ آہستہ ہم سے وہ تمام اعزازی مناصب چھن جائیں گے جن کا تعلق کعبہ سے ہے۔ قصی دولت مند شخص ہے اور قریش اس کی حمایت کررہے ہیں۔ اس خیال سے وہ قصی کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے۔ ان کی خواہش تھی کہ کعبہ سے متعلق کوئی منصب بھی دوسروں کو منتقل نہ ہو۔ قصی نے قریش سے مدد طلب کی، قریش کے علاوہ دوسرے قبائل بھی جو قصی کو اعلیٰ درجے کا انسان سمجھتے تھے اس کی حمایت کے لئے بسروچشم آمادہ ہوگئے، یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ قبیلہ خزاعہ کو مکہ سے شہر بدر کرکے قصی نے تمام مناصب سنبھال لئے اور ہوتے ہوتے حکومت مکہ کی باگ ڈور بھی ان کے ہاتھوں میں آگئی۔ [۱۳]

جیسا کہ پیشتر مذکور ہو چکا ہے بعض مؤرخین کی رائے ہے کہ قصی بن کلاب کے زمانے سے قبل مکہ میں کعبہ کے سوائے کوئی مکان نہ تھا کیونکہ بنوجرہم اور بنوخزاعہ اپنے خداؤں کے گھر کے نزدیک اپنے گھر بنانا ادب کے منافی خیال کرتے تھے چنانچہ ان کا معمول تھا کہ وہ رات کے وقت حرم میں نہ رہتے بلکہ حرم سے دور چلے جاتے تھے جب مکہ کی حکومت قصی کے ہاتھوں میں آئی تو انہوں نے قریش کا ایک جلسہ طلب کیا اور اس میں یہ احکام صادر کئے کہ مکہ میں مکانات تعمیر کرنے چاہئیں چنانچہ انہوں نے خود ایک مکان تعمیر کرایا جسے دارالندوہ کہتے تھے اور جہاں مکہ کے معززین صلاح ومشورہ کے لئے جمع ہوتے تھے۔ یہ لوگ مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ ازدواجی مسائل سے متعلق گفت وشنید بھی اسی دارالندوہ میں ہوا کرتی تھی۔ قریش نے قصی کے ایما سے اطراف کعبہ میں مکانات تعمیر کئے۔ حجاج کے طواف کے لئے کافی سے زیادہ جگہ چھوڑ دی گئی تھی اور دو مکانوں کے درمیان طواف گاہ تک جانے کے لئے ایک راستہ بھی رہنے دیا گیا۔

اگرچہ عبدالدار قصی بن کلاب کے فرزند اکبر تھے لیکن ان کے بھائی عبدمناف کی شخصیت کا لوگ زیادہ احترام کرتے تھے۔ جب قصی کو پیرانہ سالی میں یہ احساس ہوا کہ میں اپنے فرائض منصبی سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ نہیں ہوسکتا تو انہوں نے کعبہ کی تولیت عبدالدار کو سونپ دی اور کلید کعبہ بھی اسی کے حوالے کی۔ ان مناصب کے ساتھ ہی ساتھ لواء، سقایت اور رفادت کے عہدے بھی عبدالدار کو منتقل ہوئے۔

عبدالدار کے بعد کعبہ سے متعلق جملہ مناصب اس کے بیٹوں کو منتقل ہوئے۔ عبدمناف کے بیٹے ان سے زیادہ عزت واحترام کے مالک تھے اس لئے انہوں نے (ہاشم، عبدشمس، مطلب اور نوفل) یہ کوشش کی کہ

Marfat.com

یہ مناصب اپنے عم زادوں سے لے لیں۔ اس سلسلہ میں قریش دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ نے پسرانِ عبدمناف کی حمایت کی اور دوسرے نے عبدالدار کے بیٹوں کی پشت پناہی پر کمر باندھی۔ قریب تھا کہ یہ اختلاف جنگ کی صورت اختیار کر لے لیکن خیریت ہوئی کہ بات صلح صفائی سے طے ہوگئی۔ فیصلہ اس پر ٹھہرا کہ سقایت و رفادت کے عہدے عبدمناف کے بیٹوں کو ملیں اور تولیت کعبہ، علمبرداری اور ندوہ کی صدارت عبدالدار کے فرزندوں کے ہاتھوں میں رہے۔ فریقین نے اس فیصلہ سے اتفاق کیا چنانچہ ظہورِ اسلام تک یہی صورتِ حال رہی۔

ہاشم

ہاشم رئیس قوم اور صاحب ثروت تھے۔ سقایت و رفادت کے عہدے جب انہیں سونپے گئے تو انہوں نے قصی بن کلاب کی طرح اپنی قوم سے کہا کہ "اپنے مال کا ایک حصہ حجاج کی خوراک کے لئے وقف کر دیں کیونکہ زائرین کعبہ خدا کے مہمان ہوتے ہیں اور یہ مہمان تمام مہمانوں سے زیادہ تعظیم کے مستحق ہیں۔"

چنانچہ جب تک حجاج مکہ میں رہتے تھے ان کے نان و نفقہ کا بار ہاشم برداشت کرتے تھے۔ ہاشم کی فیاضی کا دائرہ صرف حجاج ہی تک محدود نہ تھا بلکہ ان کی اس شان جود و سخا سے اہل مکہ بھی بہرہ یاب ہوتے تھے۔ ایک دفعہ مکہ میں قحط پڑا۔ ہاشم نے خوراک کا ایسا انتظام کیا کہ لوگوں کو قحط سے متعلق کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ ہاشم کا معمول تھا کہ موسم گرما میں یمن اور موسم سرما میں شام کا سفر کرتے تھے۔ مختصر یہ ہے کہ اسی طرح مکہ کی اجتماعی زندگی روبہ اصلاح اور بارونق ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ عرب میں مکہ نے مرکزی اور امتیازی حیثیت حاصل کر لی۔ اس روز افزوں ترقی کے طفیل عبدمناف کے فرزندوں نے اپنے ہمسایوں سے دوستانہ معاہدے قائم کر لئے۔ ہاشم نے شہنشاہِ روم اور والی غسان کے ساتھ معاہدہ کیا اور شہنشاہ سے یہ وعدہ لیا کہ اہل مکہ کے سفر شام میں کسی قسم کی مزاحمت نہ کی جائے۔ اہل مکہ جب چاہیں شام کا سفر بے خوف و خطر کر سکیں۔ عبدشمس نے نجاشی سے تجارتی معاہدہ کیا۔ نوفل اور عبدالمطلب نے ایران اور یمن کے ساتھ معاہدات کئے، ان کی بنیاد بھی تجارت پر تھی۔ غرض مکہ کی اہمیت روز بہ روز بڑھتی گئی اور اس کی دولت و ثروت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اہل مکہ کو تجارت میں اتنی مہارت حاصل ہوگئی تھی کہ اطراف و جوانب میں کوئی بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہر طرف سے تجارتی قافلے مکہ آتے تھے اور سال میں دوبار مکہ سے دوسرے مقامات کی جانب ان کا کوچ ہوتا تھا۔ مکہ میں خرید و فروخت کے لئے منڈیاں قائم ہوگئی تھیں اور اس طرح اہل مکہ کو زندگی کے بہت سے شعبوں میں مہارت و واقفیت حاصل ہوگئی تھی۔

پیرانہ سالی میں بھی بدستور سابق ہاشم رئیس مکہ تھے اور کسی شخص کے اندر یہ ہمت اور یہ حوصلہ نہ تھا کہ وہ یہ منصب ان سے چھینے، البتہ امیہ بن عبدالشمس نے کچھ اسی قسم کا منصوبہ باندھا تھا لیکن اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس ناکامی سے خجل و نادم ہو کر امیہ نے دس سال شام میں گزارے۔

Marfat.com

ہاشم ایک دفعہ سفر شام سے واپس آتے ہوئے یثرب (مدینہ) میں عمرو خزرجی کی بیٹی سلمہ سے ملے۔ یہ ایک شریف النفس اور نجیب الطرفین خاتون تھی اور ان لوگوں کو اس کی سرپرستی حاصل تھی جو اس کے لئے تجارت کرتے تھے۔ ہاشم نے سلمہ سے عقد کی خواہش میں اس کے حالات دریافت کئے تو پتہ چلا کہ اس نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی ہے اور دوسری شادی صرف اس شرط پر کرنا چاہتی ہے کہ اس کا شوہر اس کے اختیارات سلب نہ کرے۔ غرض ہاشم نے شادی کا پیغام دیا جسے سلمہ نے ہاشم کی عزت وعظمت کے پیش نظر قبول کرلیا۔ ایک مدت تک وہ مکہ میں ہاشم کے ساتھ رہی۔ اس کے بعد مدینہ میں اس نے سکونت اختیار کرلی۔ وہیں اس کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام شیبہ رکھا گیا۔

چند سال بعد ایک سفر میں ہاشم کی وفات ہوگئی۔ مطلب اپنے بھائی عبدشمس سے عمر میں چھوٹے تھے لیکن عوام میں ان کی شرافت وفضیلت کا اعتراف ہر ایک کو تھا، لوگ ان کے جود وسخا کے سبب انہیں "الفیض" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ ان اوصاف وخصوصیات کی بنا پر ان کا کوئی مدمقابل نہ تھا۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے مطلب کو ان کے مرحوم بھائی ہاشم کی یاد نے ستایا۔ وہ اپنا غم غلط کرنے کے لئے یثرب پہنچے اور اپنی بھاوج سلمہ سے کہا کہ شیبہ کو (جو اب بلوغ کی منزل میں تھے) میرے ہمراہ بھیج دو۔ واپسی پر شیبہ کو مطلب اپنے ساتھ لائے تو لوگوں نے یہ خیال کیا کہ مطلب کوئی غلام لائے ہیں، لہٰذا اس خیال سے عوام میں شیبہ کا نام عبدالمطلب مشہور ہوگیا۔ مطلب نے عوام کا شک رفع کیا اور انہیں یہ بتایا کہ یہ (غلام نہیں) بلکہ میرا بھتیجا شیبہ ہے جسے میں یثرب سے لایا ہوں لیکن اس کے باوجود لوگ شیبہ کو عبدالمطلب ہی کہتے رہے اور ان کا اصل نام گم ہوکر رہ گیا۔

عبدالمطلب

مطلب چاہتے تھے کہ ہاشم کا مال اپنے بھتیجے کے حوالے کردیں لیکن نوفل نے مزاحمت کی۔ آخر عبدالمطلب نے یثرب میں اپنے قرابت داروں سے رجوع کیا کہ وہ اس معاملہ میں ان کی مدد کریں تاکہ ان کا چچا ان کا حصہ غصب نہ کرے۔ اس طلب امداد پر ۸۰ خزرجی سوار یثرب سے عبدالمطلب کی مدد کے لئے آپہنچے، نوفل نے مجبوراً ہاشم کا مال عبدالمطلب کے حوالے کردیا۔

مطلب کی وفات کے بعد ہاشم کا منصب عبدالمطلب کو ملا اور وہ سقایت اور رفادت کے فرائض بھی سرانجام دیتے۔ شروع میں سقایت کی خدمت ان پر گراں گزرتی تھی اس لئے کہ حارث کے سوائے ان کا کوئی اور بیٹا اس وقت تک نہ تھا۔ زمزم خشک ہوچکا تھا اس لئے زائرین بیت اللہ کے لئے پانی کا انتظام آس پاس کے کنوؤں سے کرنا پڑتا تھا۔ شہر کے نزدیک حوضوں میں وہ پانی جمع کرلیتے تھے۔ اگر عبدالمطلب کے کئی فرزند ہوتے تو یہ مہم بہ سہولت سر ہوسکتی تھی۔ دن رات عبدالمطلب کو یہ فکر لاحق رہتی تھی کہ کسی طرح یہ دشوار مرحلہ طے ہوجائے۔

چند صدی پیشتر مضاض بن عمرو جرہمی کے زمانے میں زمزم کے سوت خشک ہوئے تھے لیکن اس کا محل وقوع عربوں کے ذہن میں محفوظ رہا اور یہ تمنا ان کے پہلو میں چٹکیاں لیتی رہتی تھی کہ کاش پھر وہ وقت آئے کہ اس کے سوت پھوٹیں اور یہ چشمہ بہہ نکلے۔ عبدالمطلب کو سقایت حجاج کے سلسلے میں جو دشواریاں پیش آرہی تھیں، ان کا تقاضا بھی یہی تھا کہ زمزم پھر جاری ہو۔ آخر ہاتف غیبی نے انہیں خواب میں زمزم کی کھدائی کی ترغیب دی۔ عبدالمطلب نے زمزم کے محل وقوع کا تعین کر کے اپنے بیٹے حارث کی مدد سے ایک مقام پر اتنی کھدائی کی کہ پانی برآمد ہوگیا، اس چشمہ سے دو طلائی ہرن اور مضاض جرہمی کی تلواریں بھی نکلیں، قریش یہ سمجھتے تھے کہ جو مال چشمے سے برآمد ہوا ہے اس میں ہم سب حصہ دار ہیں لہٰذا اس کی تقسیم ہونی چاہئے لیکن عبدالمطلب اس تقسیم پر رضامند نہ تھے۔ آخر یہ بات طے ہوئی کہ تیروں کے ذریعہ قرعہ اندازی کی جائے، دو تیر قریش کی طرف سے دو عبدالمطلب کی جانب سے اور دو کعبے کے نام پر ہوں۔ جس کا تیر جس چیز کے نام پر نشانہ پر بیٹھے گا وہ اس کی ملکیت ہوگی جس کا تیر بے نشانہ رہے گا، اسے کوئی چیز حصہ میں نہیں ملے گی، مدعی اس فیصلہ پر متفق ہوگئے اور قرعہ اندازی کا سلسلہ شروع ہوا، قریش کے دونوں تیر نشانے پر نہیں بیٹھے لہٰذا تلواریں عبدالمطلب کے حصے میں آئیں اور دو طلائی ہرن کعبہ کے حصے میں۔ عبدالمطلب سقایت کے فرائض، جن سے عہدہ برآ ہونا زمزم کے پھوٹ پڑنے کے بعد زیادہ دشوار نہ رہا تھا، پوری سرگرمی کے ساتھ ادا کرتے رہے۔

عبدالمطلب کو اس بات کا قوی احساس تھا کہ قوم کی نگاہوں میں میری واقعی قدر و قیمت اور خاطر خواہ اثر و رسوخ نہ ہونے کی وجہ اس کے سوائے اور کچھ نہیں کہ مکہ میں کثیر الاولاد نہیں ہوں لہٰذا آپ نے منت مانی کہ اگر خدا مجھے دس بیٹے اور دے اور زمزم کی کھدائی ایسے کاموں کا بوجھ مجھے نہ اٹھانا پڑے تو میں اپنے ایک بیٹے کی نذر دوں گا چنانچہ کچھ مدت کے بعد ان کے فرزندوں کی تعداد دس تک پہنچ گئی۔ آپ نے ایک دن ان سب بیٹوں کو طلب کیا اور ان سے اپنی نذر کا قصہ بیان کیا، ان سب نے بالاتفاق جواب دیا، ہم تعمیل حکم کے لئے حاضر ہیں۔ عبدالمطلب نے اپنے بیٹوں میں سے ہر ایک کا اور اپنا نام ایک ایک تیر پر لکھا اور تیربان کے پاس لے گئے (''تیربان'' صاحب قدح کا فارسی ترجمہ ہے یعنی کعبہ کا وہ خادم جو تیر چلانے کی خدمت پر مامور تھا) عرب کا قدیم دستور تھا کہ جب کوئی دشوار مہم پیش آتی تھی تو وہ تیربان کے وسیلے سے بتوں کی مرضی دریافت کرتے تھے۔

عبدالمطلب کے بیٹوں میں عبداللہ کم عمر اور (اپنے حسن و جمال کے باعث) سب سے زیادہ عزیز تھے۔ تیربان نے اس غرض سے کہ ہبل کی قربان گاہ پر عبدالمطلب کا کوئی ایک بیٹا چڑھے تیر چلایا تو قرعہ میں عبداللہ کا نام نکلا چنانچہ عبدالمطلب، عبداللہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے قربان گاہ پر لے گئے لیکن قریش میں سے چند اشخاص نے مزاحمت کی اور کہا، عبداللہ کی بھینٹ نہ دیجئے اور ہبل سے عذر معذرت کر دیجئے۔ ان کے اصرار سے عبدالمطلب سردست اپنے ارادے سے باز رہے، آپ نے دریافت کیا کہ خداؤں کی خوشنودی

Marfat.com

حاصل کرنے کے لئے کیا صورت اختیار کرنی چاہئے۔ ایک شخص (مغیرہ بن عبداللہ مخزومی) نے کہا، اگر عبداللہ کے عوض مال کی قربانی منظور کی جاسکتی ہے تو میں اس کے حق میں اپنے مال کے ایک حصہ سے دستبردار ہونے کے لئے بسر و چشم آمادہ ہوں۔ مشورہ کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ یثرب کی مشہور کاہنہ عرافہ سے رجوع کیا جائے، یہ کاہنہ اپنے فن میں طاق اور بالغ نظر ہے، غرض متعلقین اس کاہنہ کے پاس پہنچے، کاہنہ نے جواب کے لئے ایک دن کی مہلت طلب کی۔ اگلے دن اس کاہنہ نے دریافت کیا، اچھا یہ بتاؤ تمہارے یہاں خون بہا کی کیا شکل ہے؟ لوگوں نے یہ جواب دیا، ہم خون بہا میں کم از کم دس اونٹ دیتے ہیں۔ اس پر کاہنہ نے کہا، اچھا تو پھر تم اپنے شہر واپس جاؤ اور دس اونٹوں اور اس شخص کے نام سے جس کی قربانی کی منت مانی تھی، قرعہ اندازی کرو۔ اگر قرعہ اندازی میں پھر اسی شخص کا نام نکلے تو اونٹوں کی تعداد میں اضافے کے بعد پھر قرعہ ڈالو اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہے جب تک خدا راضی نہ ہو۔ چنانچہ عبدالمطلب اور ان کے رفقاء نے کاہنہ کی ان ہدایات پر عمل کیا۔

پہلا قرعہ عبداللہ کے نام نکلا۔ جب اونٹوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے سو تک پہنچ گئی تو قرعہ اونٹوں کے نام نکلا۔ اس اثناء میں عبدالمطلب کھڑے ہوئے خدا سے دعائیں مانگ رہے تھے۔ جب لوگوں نے ان سے کہا کہ خدا نے اونٹوں کی قربانی منظور کرلی ہے تو آپ نے کہا ابھی نہیں تین بار قرعہ اندازی پھر کرو، قرعہ اندازی کی گئی اور تینوں بار اونٹوں کے نام قرعہ نکلا۔ جب عبدالمطلب کو خدا کی رضامندی کا پورا پورا تیقن ہوگیا تو آپ نے اونٹ ذبح کرکے وہیں پڑے رہنے دیئے اور جیسا کہ دستور تھا، انسانوں اور حیوانوں میں سے کسی کو بھی ان کا گوشت کھانے سے نہیں روکا۔

تاریخ میں یہ واقعات محفوظ ہیں۔ ان سے عرب کی رسوم اور ان کے عقائد کا تھوڑا بہت حال علم میں آسکتا ہے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی آشکار ہوجاتی ہے کہ مکہ کو عرب میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ طبری نے اس پورے واقعہ کی تائید و توثیق میں ایک اور واقعہ تحریر کیا ہے اور وہ یہ کہ ایک مسلمان عورت نے منت مانی کہ اگر ایسی صورت پیش آئے تو میں اپنے بیٹے کو قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دوں گی۔ جب اس کی مراد پوری ہوگئی تو یہ عورت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی اور ان سے منت کی تعمیل کے سلسلہ میں فتویٰ طلب کیا، انہوں نے جو فتویٰ دیا اس سے وہ مطمئن نہ ہوئی اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آخر الذکر نے فرمایا تو سو اونٹوں کی قربانی دے دے کیونکہ عبداللہ کا خون بہا یہی سو اونٹ تھے لیکن والیٔ مدینہ مروان کو اس واقعہ کا علم ہوا تو اس نے کہا کہ گناہ و معصیت پر منت ماننا ہی ناجائز ہے اس لئے اس کی تعمیل و تکمیل کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اصحاب الفیل

مکہ کی اہمیت اور اس کی مرکزی حیثیت کی دوڑ میں بعض لوگوں نے دوسرے شہروں میں بھی عبادت

Marfat.com

گاہیں تعمیر کیں۔ اس اقدام سے ان کا منشاء یہ تھا کہ ان کے شہروں میں بھی لوگ جوق در جوق زیارت کے لئے آئیں اور مکہ کی بجائے ان کے شہر مرجع عوام وخواص بن جائیں۔ غسانیوں نے حیرہ میں اور ابرہہ نے یمن میں عبادت گاہیں تعمیر کیں لیکن پھر بھی لوگوں کی عقیدت مکہ سے وابستہ رہی اور انہوں نے نئی عبادت گاہوں کو قطعاً درخور اعتنا نہیں سمجھا۔

ابرہہ الاشرم نے یمن کی عبادت گاہ کو ہر ممکن طریقے سے آراستہ و پیراستہ کیا، اس کی تزئین کے لئے ابرہہ نے بیش قیمت اور نادر اشیاء فراہم کیں، یہ سب کچھ اس نے اس توقع پر کیا کہ لوگوں کے دل اس عبادت گاہ کی جانب مائل ہوں گے لیکن جب اسے یہ پتہ چلا کہ لوگوں کا میلان اس عبادت گاہ کی جانب نہیں ہے اور وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ کعبہ کے سوائے اور کسی جگہ حج کا ثواب نہیں مل سکتا تو اس نے (ابرہہ نے) کعبہ کے انہدام کا ناپاک ارادہ کیا۔

غرض ابرہہ نے کعبے کے انہدام کی نیت سے مکہ پر چڑھائی کے لئے ایک فوج ترتیب دی اور ایک بڑے ہاتھی پر سوار ہوکر اس فوج کے قائد کی حیثیت سے اس نے مکہ کا رخ کیا۔ عربوں کو اس فوج کشی کی اطلاع ملی تو انہیں سخت تشویش ہوئی، وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ حبشیوں کے ہاتھوں ان کی یہ عبادت گاہ مسمار ہو۔ یمن کے ایک شخص ذانفر نے ابرہہ سے مقابلہ کے لئے ایک جماعت تیار کی۔ اس جماعت کا مقصد یہ تھا کہ ابرہہ کو کعبہ کے انہدام سے باز رکھے لیکن ہوا یہ کہ یہ جماعت مقابلہ میں نہ ٹھہر سکی اور ابرہہ کی فوج نے اس کے جملہ افراد کو اپنی حراست میں لیا۔ اسی طرح نفیل بن حبیب خثعمی نے شہران اور ناہس کے قبیلوں کے کچھ لوگ اپنے ہمراہ لے کر ابرہہ سے ٹکر لی، بدقسمتی سے انہیں بھی شکست ہوئی اور اس کے ساتھ ہی انہیں بھی قید کرلیا گیا۔ ابرہہ کی سرکردگی میں ان اصحاب الفیل کا لشکر طائف کے قریب پہنچا تو اہل طائف ابرہہ سے ملے اور کہا کہ ہماری عبادت گاہوں میں تو لات کی پرستش ہوتی ہے، آپ جس عبادت گاہ کو مسمار کرنا چاہتے ہیں وہ مکہ میں واقع ہے چنانچہ اہل طائف میں سے بعض اس لشکر کی رہنمائی کے لئے ساتھ ہولئے جب یہ لشکر مکہ مکرمہ کے قریب پہنچا تو ابرہہ نے چند فوجیوں کو یہ حکم دیا کہ وہ مکہ کی حدود میں داخل ہوں اور اہل تہامہ کے مال واسباب میں سے جو کچھ ملے لوٹ لائیں۔ اس لوٹ میں عبدالمطلب کے سو اونٹ بھی حبشیوں کے ہاتھ لگ گئے۔

قریش اور اہل مکہ شروع شروع میں مقابلہ کے لئے کیل کانٹے سے لیس ہوگئے لیکن پھر یہ غور کیا کہ حملہ آوروں کا مقابلہ ہمارے بس کی بات نہیں، اس اثناء میں ابرہہ کی فوج کا ایک سپاہی قاصد کی حیثیت سے امیر قریش کے پاس آیا۔ جب عبدالمطلب کے پاس یہ قاصد پہنچا تو اس نے کہا، ہمارا مقصد جنگ نہیں بلکہ انہدام کعبہ ہے اگر اہل مکہ مقابلہ میں نہ آئیں تو ہم بھی ان پر حملہ آور نہیں ہوں گے۔ عبدالمطلب نے جواب دیا، ہم مقابلہ کرنا نہیں چاہتے۔ یہ فرما کہ آپ (عبدالمطلب) اپنے فرزندوں اور اہل مکہ میں سے چند معتبر اشخاص کو

Marfat.com

اپنے ہمراہ لے کر ابرہہ کے لشکر میں پہنچے۔ ابرہہ نے عبدالمطلب کی تعظیم و تکریم کی اور ان کے اونٹ بھی واپس کر دیئے لیکن یہ وعدہ نہیں کیا کہ میں کعبہ کو منہدم نہیں کروں گا۔ اہل مکہ نے پیشکش کی تھی کہ اگر کعبہ کو ویران نہ کیا جائے تو ہم اپنا ایک تہائی مال آپ کی نذر کر دیں گے لیکن ابرہہ نے ان کی یہ پیشکش قبول نہ کی اور اپنے ارادے سے باز نہ آیا۔ عبدالمطلب اہل مکہ کے ہمراہ واپس آ گئے اور لوگوں سے کہا کہ پہاڑوں کے دامن میں پناہ لے لو، کہیں ایسا نہ ہو کہ ابرہہ کی فوج کے ہاتھوں کوئی گزند پہنچے۔

شب کی تاریکی میں جب اہل مکہ شہر سے رخصت ہونے کی فکر میں تھے، عبدالمطلب کعبے کے قریب پہنچے اور زنجیر پکڑ کر دعا کی۔ جب اہل مکہ شہر سے نکل گئے اور وہ وقت آیا کہ ابرہہ خائب المرام ہو کر یمن کی راہ لے تو اچانک اس کی فوج میں چیچک کی وبا پھوٹ پڑی اور اس میں اتنے سپاہی لقمہ اجل بنے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ غالباً یہ ہوا سمندر کی طرف سے آئی تھی۔ ابرہہ بھی اس وبا میں مبتلا ہو گیا اور اس نے خوف و دہشت کے عالم میں اپنی فوج کو حکم دیا کہ یمن کا رخ کرے۔ فوج کے کچھ رہنما اس اثناء میں فرار ہو چکے تھے اور کچھ وبا کی زد میں گھرے ہوئے تھے، وبا کی شدت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور ابرہہ کی فوج میں موت پھیلی ہوئی تھی۔ ابرہہ بدحواسی میں صنعا تک جا پہنچا۔ تب تک اس کا جسم بھی اس وبا سے چھلنی چھلنی ہو چکا تھا۔ غرض اس حال میں اس نے جان دی اور کیفر کردار کو پہنچا۔ اہل مکہ نے اس سال کو عام الفیل کے نام سے موسوم کیا اور اپنی تاریخ کا مبداء بھی یہی سال قرار دیا۔ قرآن کریم میں اس باب میں ارشاد فرماتا ہے:

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ﴿١﴾ أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي
تَضْلِيلٍ ﴿٢﴾ وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ﴿٣﴾ تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ﴿٤﴾
فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ﴿٥﴾ (سورۃ الفیل:۱تا۵)

"کیا (اے رسول) آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا معاملہ کیا اس نے ان کے مکروفریب کا طلسم پاش پاش نہیں کر ڈالا اور ان پر ایسے اڑتے ہوئے ابابیل نہیں بھیجے جو ان پر سنگریزوں کی بوچھاڑ کرتے تھے، پس اس نے انہیں ایسا کر دیا جیسے کھایا ہوا بھوسا ہوتا ہے۔"

اس عجیب و غریب واقعہ سے مکہ کی اہمیت میں چند در چند اضافہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی تجارتی نقطہ نگاہ سے بھی اس کا مقام کہیں سے کہیں پہنچ گیا، اب اہل مکہ کے سامنے وقت کا اہم مسئلہ اس کے سوائے اور کوئی نہ تھا کہ اپنے شہر کے عزت و وقار کے دامن پر داغ نہ آنے دیں اور جو قوم یا ملک تنقیص و اہانت پر آمادہ ہو اس سے دلیری و پامردی کے ساتھ مقابلہ کریں۔ جس جذبے کے تحت اہل مکہ اپنے شہر کی حفاظت کے لئے پیش پیش رہتے تھے وہ اس شہر کی پرسکون زندگی کی بقا کا جذبہ تھا۔

ایک ایسے خشک اور بے آب و گیاہ ریگزار میں زندگی کی آسائشوں کا مہیا ہونا کچھ عجیب سی بات تھی۔

Marfat.com

اہل مکہ شراب کے رسیا اور کھجوروں کے دلدادہ تھے۔ شراب کی مستی اور کھجوروں کے نشے نے ان کی جنسی خواہشات کی باگ ڈھیلی کر دی تھی۔ زرخرید لونڈیوں اور غلاموں سے وہ اپنے حظِ نفس کی خاطر اختلاط کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں اپنے شہر کی بقا اور خود مختاری کے تحفظ کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں پیش کرنی پڑتی تھیں۔ وہ اتنے عیاش تھے کہ کعبے کے گرد جمع ہو کر شراب پیتے اور اول فول بکتے رہتے تھے۔ اکابر قریش کعبے کے نزدیک (جو تین سو باسٹھ بتوں کا تیرتھ بنا ہوا تھا) آ کر بیٹھتے اور صحرا، یمن، حیرہ اور شام کے بارے میں جو ان کی معلومات تھیں پیش کرتے نیز قافلے والوں سے سنے ہوئے حالات و واقعات کے تذکرے بھی رہتے تھے اور اس کے ساتھ اپنے ہمسایوں اور دوستوں کے واقعات بھی سناتے تھے۔ یہ واقعات جن کے تذکرے ان کی زبانوں پر رہتے تھے، قبیلہ در قبیلہ منتقل ہوتے تھے۔ ہر قبیلے کی حیثیت ایک لاسلکی آلہ خبر رساں کی سی تھی۔

بت اپنی جامد نگاہوں سے یہ رنگ رلیاں دیکھتے اور اہل مکہ یہ سمجھتے کہ ہمیں ان بتوں کی حمایت حاصل ہے، غالباً اس خیال سے کہ بت سب کچھ دیکھتے ہیں لیکن ہمارے کسی فعل پر حرف گیری نہیں کرتے، ان بت پرستوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ہمیں بتوں کی خوشنودی حاصل ہے اور جو افعال بھی ہم سے سرزد ہوتے ہیں، یہ بت ان سے بیزار نہیں ہیں۔ بیت اللہ کے سبب مکہ کو دارالامن سمجھا جاتا تھا اور یہ چیز نہ صرف اہل مکہ بلکہ بتوں کے حق میں بھی مفید تھی۔ کسی اہل کتاب کو مکہ میں داخلے کی عام اجازت نہ تھی، صرف وہی اشخاص آ جا سکتے تھے جو صرف محنت مزدوری کرتے اور اپنے دین و آئین کے بارے میں بھولے سے بھی کوئی بات نہ چھیڑتے۔ یہی وجہ تھی کہ مکہ میں نہ یہودی تھے، نہ عیسائی۔ کعبہ کی حیثیت مقدس حرم کی تھی جس کی چہار دیواری میں بت پوجے جاتے تھے، اس حیثیت کے پیش مکہ پر کسی کو جارحانہ پیش قدمی کی جسارت نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح مکہ خود مختار تھا اور وہ تمام عرب قبائل بھی خود مختار تھے جن کی عقیدتیں کعبے سے وابستہ تھیں۔ یہ عرب قبائل کسی کی اطاعت نہیں کرتے تھے بلکہ انہیں اگر کسی چیز کی دل و جان سے زیادہ خواہش تھی تو وہ صرف آزادی تھی۔ ان کی انتہائی آرزو یہی تھی کہ بتوں کی پناہ اور ان کی سرپرستی میں آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہیں۔ تمام قبائل ان رسوم پر کاربند تھے جنہیں صحرا کی خانہ بدوش زندگی نے جنم دیا تھا۔ وہ چراگاہوں سے بھی مستفید ہوتے تھے۔ اگرچہ ان کی زندگی کی راہیں اچھی خاصی دشوار تھیں تاہم خود مختاری اور آزادی کی بدولت وہ خوشحال بھی تھے اور مطمئن بھی۔

اہل مکہ کے مکانات کعبہ کے اطراف میں واقع تھے، کعبہ سے ان مکانات کا قرب یا بُعد ان اشخاص کے جاہ و منصب اور فضیلت و منزلت کے لحاظ سے ہوتا تھا جو ان میں سکونت پذیر ہوتے تھے۔ قریش دوسروں کی بہ نسبت کعبہ سے زیادہ قریب آباد تھے۔ تولیت کعبہ، سقایت زمزم اور کعبہ سے متعلق جملہ مناصب ان سے متعلق تھے۔ ان مناصب کے لئے جنگیں چھڑ چکی تھیں اور جنگ و جدل کے بعد جو عہد و پیمان ہوئے تھے، کعبہ کی دیواروں پر آویزاں تھے تاکہ بت بھی ان کی شہادت دیں اور ان لوگوں پر اپنا عتاب نازل کریں جو

Marfat.com

کبھی خلاف ورزی پر آمادہ ہوں۔ قریش کے بعد دوسرے درجے پر ان لوگوں کے مکانات تھے جو عزت و وجاہت کے اعتبار سے قریش کے علاوہ باقی سب پر فوقیت رکھتے تھے۔ ان کے بعد ان سے کم رتبہ لوگوں کی سکونت گاہیں تھیں، آخر میں غلاموں اور ناداروں کے مکانات تھے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، عیسائی اور یہودی مکہ میں صرف مزدوروں اور محنت کشوں کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے گھر کعبے سے دور جنگل کے قریب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ مسیحیت اور یہودیت سے متعلق جو روایات بیان کرتے تھے وہ اکابر قریش کے گوش گزار نہیں ہو سکتی تھیں اور کبھی گوش گزار ہو بھی جاتیں تو انہیں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی کیونکہ ایسی روایات انہوں نے اثنائے سفر میں یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہوں کے قریب سے گزرتے وقت بھی سنی تھیں۔

عرب میں ایک پیغمبر کی بعثت اور اس کے ظہور سے متعلق جو تذکرے زبانوں پر تھے بعض لوگ ان پر زیادہ دھیان دینے لگے تھے چنانچہ ایک دن ابوسفیان نے امیہ بن ابی الصلت کو سخت وست کہا اور یہ بات بھی کہی کہ تم راہبوں کی کہی ہوئی باتیں دہراتے رہتے ہو حالانکہ راہب یہ باتیں صرف اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں اپنے دین سے کوئی واقفیت نہیں ہے، انہیں پیغمبر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے لیکن ہم نے تو بتوں کو بارگاہ الٰہی میں قرب وتقرب کا ذریعہ و وسیلہ تسلیم کر لیا ہے۔ ہمیں کسی پیغمبر کی احتیاج نہیں، ایسی باتیں جہاں کہیں بھی سنی جائیں ان کی تردید کر دینی چاہئے۔

ابوسفیان نے یہ بات بر بنائے تعصب اور بت پرستی کے غرور میں کہی تھی اور وہ یہ نہیں سمجھ سکے تھے کہ سرور کونین ﷺ کی نبوت کے ظہور کا وقت قریب آ پہنچا ہے اور عرب میں جو بت پرستی کا مرکز بنا ہوا ہے عنقریب شمع توحید کی لو سے نور کے قمقمے فروزاں ہوں گے اور اس روشنی سے تمام عالم بقعہ نور بن جائے گا۔

نبی کریم ﷺ کے والد حضرت عبداللہ

حضرت عبداللہ جوان رعنا اور وجیہہ شکل انسان تھے مکہ کی لڑکیاں ان کے حسن و جمال پر والا و شیفتہ تھیں۔ اس واقعہ نے ان کی فریفتگی و شیفتگی میں اور اضافہ کر دیا تھا کہ ہبل نے ان کی بھینٹ کے عوض سو اونٹوں سے کم کی قربانی منظور نہیں کی۔ قضا و قدر نے یہ طے کیا تھا کہ تاریخ کی بزرگ ترین ہستی کا چراغ ان سے روشن ہو چنانچہ عبداللہ نے آمنہ بنت وہب سے شادی کی اور اس کے چند ماہ بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ عبداللہ کی وفات کے چند ماہ بعد رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے اور ابھی آپ بچے ہی تھے کہ ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

Marfat.com

حواشی

۱۔ ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، رجب۔
۲۔ اس تقدم و تاخر میں بخاری کی حدیث قابل ترجیح ہے "لیس یومئذ بمکۃ احد لیس بہا ماء" (''صحیح بخاری'' کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی) (جب اسماعیل کی والدہ انہیں اپنے ہمراہ لے کر اس درہ میں آباد ہوئیں تو اس مقام پر نہ تو آبادی ہی تھی اور نہ پانی)۔
۳۔ اس سعادت مند خاتون نے عرض کیا کہ ہم بڑی اچھی زندگی بسر کر رہے ہیں اور عمدہ پیرائے میں رحمت الٰہی کو سراہا۔ حضرت نے دریافت فرمایا، کھانے میں کیا دستیاب ہوتا ہے؟ عرض کیا، گوشت۔ فرمایا، پینے کے لئے؟ عرض کیا، پانی! یہ سن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: اللھم بارك لھم فی الطعام و الماء۔ (''صحیح بخاری'' کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی)
۴۔ ''صحیح بخاری'' کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی۔
۵۔ جناب ہاجرہ علیہا السلام کے مصری النسل ہونے کی وجہ سے۔
۶۔ بفحوائے آیہ درواقعہ حضرت ابراہیم "وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ" (سورۃ الصّٰفّٰت: ۹۹)
۷۔ حضر موت ساحل بحر ہند پر واقع ہے۔ یہ نہایت قدیم آبادی ہے۔ قحطان یا یقطان جو یمن کا مورث اعلیٰ تھا، اس کے بارہ بیٹوں میں سے ایک کا نام تورات نے حضرت ماوت بتایا ہے۔ اس بنا پر اہل تاریخ یقین کرتے ہیں کہ یہ خطہ اپنے باشندۂ اول حضر ماوت ابن قحطان کے نام سے منسوب ہے۔ اہل حضر موت نے ایک مستقل حکومت بھی قائم کر لی تھی جس کی مختصر تاریخ ابن خلدون (جلد دوم) میں بیان کی ہے۔ عاد و ثمود کا اصلی مسکن بھی یہی تھا۔ بالفعل حضر موت مستقل خطے کی حیثیت سے ایک مستقل امام کے ماتحت ہے۔ (ارض القرآن از سید سلیمان ندوی، جلد اول، ص ۹۵۔ ۹۴)
۸۔ ثمود کے ملک کا دارالحکومت حجر تھا۔ یہ شہر اس قدیم راستہ پر واقع ہے جو حجاز سے شام کو جاتا ہے۔ اس راستہ پر ثمود کا ایک دوسرا مقام ''فج الناقہ'' ہے جس کا تلفظ یونانیوں نے Badncila کیا ہے۔ لیکن اصل شہر حجر ہی تھا۔ اب عموماً اسی شہر کو ''مدائن صالح'' کہتے ہیں۔ (ارض القرآن از سید سلیمان ندوی، جلد اول، ص ۸۸)
۹۔ ملاحظہ ہو حاشیہ ۸۔
۱۰۔ قصی بن کلاب آنحضرت ﷺ کی پانچویں پشت میں ہیں۔ حضرت محمد ﷺ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب۔ (سیرۃ ابن ہشام)۔
۱۱۔ ''رحمۃ للعالمین'' از قاضی سلیمان منصور پوری جلد دوم بر حاشیہ (تذکرہ) قصی۔
۱۲۔ ارض القرآن از سید سلیمان ندوی، جلد اول، ص ۹۸ در تذکرۂ حجاز۔
۱۳۔ یہاں یہ تذکرہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مناقشے میں دونوں جانب سے کچھ جانیں ضائع ہوگئیں۔ آخر یعمر بن عوف کو فریقین نے اپنا منصف بنایا۔ یعمر نے فیصلہ کیا کہ بنوخزاعہ کے جتنے آدمی مارے گئے ہیں، قصی ان سب کا خون بہا ادا کریں، اور بنوخزاعہ شہر کی حکومت چھوڑ کر مکہ سے باہر چلے جائیں۔ آئندہ حکومت قصی کی ہو۔ اسی فیصلہ پر عمل ہوا۔
(بحوالہ ''رحمۃ للعالمین'' از قاضی سلیمان منصور پوری جلد دوم تذکرۂ قصی)۔

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ
عَلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی
اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰٓی
اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝

Marfat.com

باب 2

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ
ولادت سے نکاح تک

حضور ﷺ کے والدین کا عقد

مکہ پر ابرہہ کی فوج کشی کے وقت عبدالمطلب اپنی عمر کی سترویں منزل میں تھے۔ان ایام میں عبداللہ نے ابھی اپنی عمر کی صرف چوبیس بہاریں دیکھی تھیں۔عبدالمطلب نے سوچا کہ اپنے بیٹے کا کہیں عقد کریں۔ اس سلسلہ میں ان کی نظر انتخاب آمنہ بنت وہب بن عبدمناف بن زہرہ سید بنی زہرہ پر پڑی۔ باپ بیٹے دونوں بنی زہرہ کی قیام گاہ پر پہنچے اوراس خاندان کے معزز شیخ وہب بن عبدمناف سے ملاقات کے دوران عبدالمطلب نے اپنے بیٹے کے ساتھ ان کی بیٹی آمنہ کے عقد کی درخواست کی۔بعض مؤرخین کا بیان یہ ہے کہ عبدالمطلب نے عقد کی درخواست آمنہ کے چچا وہب سے کی تھی اس لئے کہ آمنہ کے والد وہب وفات پا چکے تھے اور وہ اپنے چچا کی کفالت میں تھیں۔جس روز آمنہ بنت وہب کا عبداللہ بن عبدالمطلب سے عقد ہوا، اسی دن عبدالمطلب نے آمنہ بنت وہب کے چچا اہیب کی بیٹی ہالہ سے خود اپنی شادی کی، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اسی ہالہ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔

حضرت عبداللہ کی وفات

شادی کے بعد عبداللہ تین دن تک آمنہ بی بی کے گھر رہے۔عرب میں دستور تھا کہ یہ ابتدائی ایام دلہن کے گھر بسر ہوں۔ جب آمنہ بی بی عبداللہ کے گھر آئیں تو عبداللہ کچھ روز بعد تجارت کی غرض سے شام تشریف لے گئے۔ چند ماہ سفر میں گزارے، واپسی میں اپنے رشتہ داروں سے ملے اور تازہ دم ہونے کے لئے مدینہ میں ٹھہر گئے۔اس قیام کے دوران وہ بیمار پڑ گئے۔ان کی بیماری کی اطلاع ان کے رفقائے سفر کے ذریعہ مکہ مکرمہ پہنچی تو عبدالمطلب نے اپنے بڑے بیٹے حارث کو مدینہ منورہ بھیجا کہ وہ عبداللہ کو روبصحت ہونے کے بعد اپنے ہمراہ لے آئیں جب حارث مدینہ پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ عبداللہ کارواں کی آمد سے ایک ماہ بعد انتقال فرما گئے تھے اور یہیں انہیں سپرد خاک کر دیا گیا تھا۔حارث فوراً مکہ واپس آ گئے اور انہوں نے عبداللہ

Marfat.com

کے انتقال کی خبر باپ اور دوسرے رشتہ داروں کو سنائی۔ آمنہ بی بی کا کلیجہ شوہر کی جوانمرگی کی خبر وحشت اثر سے دھک سے ہو گیا اور عبدالمطلب جو اپنے بیٹے کی جاں بخشی کے لئے معقول خون بہا پیش کر چکے تھے وحشت زدہ سے ہو گئے۔

عبداللہ کا ترکہ پانچ اونٹوں، چند بھیڑوں اور ایک کنیز پر مشتمل تھا، کنیز کا نام اُم ایمن تھا جو بعد میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہیں۔ اگرچہ یہ مختصر سا ترکہ عبداللہ کی خوشحالی کی دلیل نہیں تاہم عرب کی معاشرت اور معیشت کے لحاظ سے ہم اسے بے سروسامانی پر بھی محمول نہیں کہہ سکتے۔ علاوہ بریں عبداللہ ابھی شباب کی منزل میں تھے۔ اگر ان کی عمر وفا کرتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ جدوجہد اور کسب وسعی کی بدولت صاحب ثروت نہ ہوتے۔ مزید برآں اپنے والد کی حیات میں ان کا انتقال ہوا اور انہیں ابھی آبائی ورثہ میں سے کچھ نہیں ملا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کی ولادت

انقضائے مدت حمل کے بعد بطن آمنہ سے اس نور کا ظہور ہوا جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ جگمگا اٹھا۔ کسی نے عبدالمطلب کے پاس پہنچ کر یہ مژدۂ جانفزا سنایا۔ وہ فرحت وشادمانی کے عالم میں اسی وقت اٹھے اور آمنہ بی بی کے گھر پہنچے، بچے کو گود میں لئے ہوئے کعبہ میں داخل ہوئے اور ''محمد ﷺ'' نام تجویز کیا۔ یہ نام عرب میں رواج پذیر تو نہ تھا البتہ مشہور ضرور تھا۔ بعدازاں دادا نے اپنے پوتے کو آمنہ بی بی کے حوالے کیا۔ اس موقع پر بات قابل ذکر ہے کہ اس زمانے میں یہ معمول تھا کہ اشراف عرب اپنے شیرخوار بچوں کے لئے کسی نہ کسی دایہ کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ بنی سعد کی وہ خواتین جو دایہ گری کا کام کرتی تھیں، آتیں اور بچوں کو دودھ پلانے کے لئے اپنے ہمراہ لے جاتیں۔

آنحضرت ﷺ کے سالِ ولادت، مہینے اور دن سے متعلق مؤرخین کی رائیں مختلف ہیں۔ اکثر و بیشتر کی رائے یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت عام الفیل ۵۷۰ء میں ہوئی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ آپ ﷺ کا یومِ ولادت، یوم الفیل ہے، بعض کا خیال ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت عام الفیل سے چند روز، چند ماہ یا چند سال (تیس سے ستر سال تک) کے بعد وقوع میں آئی۔ اکثر مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت ربیع الاول میں ہوئی۔ بعض کے نزدیک محرم، صفر، رجب یا رمضان ولادت کے مہینے ہیں۔ اول الذکر مؤرخین کا اتفاق اس چیز پر ہے کہ تاریخ ولادت ربیع الاول کی دوسری یا آٹھویں یا نویں تاریخ ہے لیکن اکثریت ۱۲ ربیع الاول پر متفق ہے اور یہ قول ابن اسحاق وغیرہ کا ہے۔

اس بارے میں کہ ولادت دن میں ہوئی یا رات کو نیز اس سلسلے میں کہ مکہ کے کس حصے میں ولادت ہوئی، بہت کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ کوسان دی پرسفال CAUSSINDE PERCEVAL تاریخ

Marfat.com

عرب میں اس قول کو ترجیح دیتا ہے کہ رسول کریم ﷺ ۲۰ اگست ۵۷۰ء کو یعنی عام الفیل میں بمقام مکہ اپنے جدامجد عبدالمطلب کے گھر متولد ہوئے۔ ولادت باسعادت کے ساتویں دن امیر قریش عبدالمطلب نے ایک اونٹ ذبح کیا اور اکابر قریش کو دعوت طعام پر مدعو کیا۔ جب مدعوئین نے یہ بات سنی کہ مولود کا نام عبدالمطلب نے محمد ﷺ تجویز کیا ہے تو انہوں نے دریافت کیا کہ اس بچے کا نام آباؤاجداد کے نام پر کیوں نہیں رکھا، عبدالمطلب نے جواب دیا۔ میری خواہش یہ ہے کہ یہ بچہ خدا و مخلوق کے نزدیک آسمان پر بھی محمود ہو اور زمین پر بھی۔

رضاعت حلیمہ سعدیہ

اشراف عرب کے دستور و رواج کے مطابق بی بی آمنہ اس انتظار میں تھیں کہ بنی سعد کی کوئی دایہ آئے تو بچہ اس کی تحویل میں دے دوں (اکابر قریش میں یہ دستور ابھی تک باقی ہے کہ اپنے بچوں کو ولادت کے آٹھویں روز صحرا میں بھیج دیتے تھے اور جب تک وہ آٹھ، دس یا بارہ سال کے نہیں ہو جاتے تھے انہیں شہر میں واپس نہیں بلاتے تھے)۔ اس زمانے میں بعض قبائل کی عورتیں دایہ گری میں مشہور تھیں۔ انہی میں ایک قبیلہ بنی سعد بھی تھا۔

سردست بی بی آمنہ نے اپنے بچے کو ابولہب کی کنیز ثویبہ کے سپرد کر دیا تھا۔ ثویبہ نے چند روز بچے کو دودھ پلایا، بعدازاں یہی خاتون اس بچے کے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ کو کافی دنوں تک دودھ پلاتی رہی (اس تعلق سے آنحضرت ﷺ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ رضاعی بھائی بن گئے تھے) اگرچہ ثویبہ نے آنحضرت ﷺ کو صرف چند روز ہی دودھ پلایا تھا لیکن حضور ﷺ ہمیشہ اس خاتون کا ذکر ادب و احترام سے کرتے اور جب تک وہ بقید حیات رہیں ان کے ساتھ لطف و کرم اور حسن سلوک کے ساتھ پیش آتے رہے۔

ہجرت کے ساتویں سال جب ثویبہ کا انتقال ہوا تو آنحضرت ﷺ نے اس بی بی کے فرزند کو جو آپ ﷺ کا رضاعی بھائی تھا، تلاش کیا تاکہ آپ اس کے ساتھ مسلوک ہوں لیکن پتہ چلا کہ اس کے فرزند کا انتقال اپنی والدہ سے قبل ہو چکا ہے۔

آخر بنی سعد کی کچھ مستورات جو دایہ گری کا کام کرتی تھیں شیرخوار بچوں کی تلاش میں مکہ مکرمہ آئیں لیکن وہ یتیم بچوں کا بار رضاعت برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھیں اور وہ اس لئے کہ انہیں بیوہ خواتین سے کسی مالی منفعت کی توقع نہ تھی، غالباً یہی وجہ تھی کہ کوئی دایہ حضور ﷺ کو لینے کیلئے نہیں آئی اور ان بچوں کو ان مستورات نے اپنی تحویل میں خوشی سے لے لیا جن کے والدین سے ان کی کچھ توقعات وابستہ تھیں۔

حلیمہ بنت ابوذویب بھی بنی سعد سے تھیں اور پہلی بار آنحضرت ﷺ کی رضاعت کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر چکی تھیں لیکن جب انہیں ضعف و لاغری کی بنا پر کوئی بچہ نہ ملا اور بنی سعد کی مستورات نے

Marfat.com

واپسی کی ٹھانی تو حلیمہ نے اپنے شوہر حارث سے کہا، یہ بات کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتی کہ میں خالی ہاتھ لوٹوں، میں اس یتیم بچے (حضور ﷺ) ہی کو لے آتی ہوں۔ حارث نے کہا، اس میں کوئی قباحت نہیں، ہوسکتا ہے، خدا اس کے طفیل ہمارے دن پھیر دے، غرض حلیمہ آنحضرت ﷺ کو ہمراہ لے کر قافلہ کے ساتھ صحرا کی جانب روانہ ہوئیں۔ حلیمہ سعدیہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ جب سے میں اس بچے کو لے کر آئی ہوں، برکت ہی برکت نظر آتی ہے، بکریاں موٹی تازہ ہوگئی ہیں اور دودھ سے ان کے تھن پھٹے پڑتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ دو سال تک صحرا میں رہے، بی بی حلیمہ دودھ پلاتیں اور ان کی بیٹی شیما گود میں کھلاتی تھیں۔ صحرا کی آب و ہوا اور یہاں کی سادہ زندگی کے ماحول میں آنحضرت ﷺ کے نشو ونمو کی رفتار اچھی خاصی تیز تھی۔ اسی تناسب سے جسم کی خوبصورتی اور زیبائش میں اضافہ ہوتا رہا۔ دو سال کے بعد بی بی حلیمہ حضور ﷺ کو آپ کی والدہ بی بی آمنہ کے پاس لے گئیں۔ بعدازاں خود ان کی (یا بروایت دیگر حلیمہ کے اصرار پر) خواہش سے حضور ﷺ کو پھر اپنے ہمراہ صحرا میں لے گئیں۔ مزید دو سال صحرا کی آزاد اور صحت بخش آب و ہوا میں بسر ہوئے۔

شق الصدر کا واقعہ

آنحضرت ﷺ کے ایامِ رضاعت میں جبکہ آپ ﷺ اپنی عمر کی تیسری منزل میں تھے، یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز حضور ﷺ اپنے رضاعی بھائی کے ہمراہ مکان کے عقب میں کھیل رہے تھے کہ اس اثناء میں ان کا رضاعی بھائی دوڑا دوڑا اپنے ماں باپ کے پاس آیا اور کہا دو سفید پوش اشخاص نے میرے بھائی کو اپنے بازوؤں میں تھام کر زمین پر لٹایا اور اس کے پیٹ کو چاک کر ڈالا۔ اس سلسلہ میں حلیمہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ:

> ”میں اور میرا شوہر حارث موقع واردات پر پہنچے، کیا دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کھڑے ہیں اور ان کا رنگ اڑا ہوا ہے، میں نے دریافت کیا، کیا بات ہے؟ آپ نے جواب دیا، دو سفید پوش آدمی آئے تھے۔ انہوں نے مجھے زمین پر لٹا کر میرا پیٹ چاک کر ڈالا۔ معلوم نہیں میرے پیٹ میں وہ کیا چیز تلاش کر رہے تھے۔“

حلیمہ اپنے شوہر کے ہمراہ خیمے میں واپس آ گئیں، حارث کو اندیشہ تھا کہ شاید حضور ﷺ پر جنات کا اثر ہے اس لئے انہوں نے مناسب یہی سمجھا کہ حضور ﷺ کو ان کی والدہ کے پاس پہنچا دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ابن اسحاق اس سلسلہ میں بعثت نبوی ﷺ کے بعد کی ایک روایت نقل کرتا اور کہتا ہے کہ:

> ”آنحضرت ﷺ کی مکہ میں آمد (بیابانِ بنی سعد سے) دو فرشتوں کی داستان (شق صدر) کا نتیجہ نہ تھا بلکہ جیسا کہ بی بی حلیمہ نے آمنہ بی بی سے کہا، سبب یہ تھا کہ حبش کے

Marfat.com

چند عیسائیوں نے حضور ﷺ کو حلیمہ بی بی کے یہاں دیکھ کر یہ بات کہی تھی کہ اس بچے کا مستقبل درخشاں نظر آتا ہے ہم اسے اپنے ہمراہ لے جانا چاہتے ہیں چنانچہ حلیمہ بی بی نے اس واقعہ کے بعد آنحضرت ﷺ کو مکہ پہنچا دیا۔"

مؤرخ طبری نے بھی یہ داستان بیان کی ہے لیکن رنگ "تردیدی" ہے۔ آغازِ داستان میں یہ مؤرخ لکھتا ہے کہ یہ واقعہ حضور ﷺ کی زندگی کے تیسرے سال کا ہے لیکن بعد میں خود ہی یہ تحریر کیا ہے کہ اس واقعہ کا ظہور بعثت کے بعد ہوا جبکہ آپ ﷺ کی عمر چالیس کی تھی۔

مستشرقین اور بعض مسلمان مصنفین کے نزدیک اس واقعہ کی صحت مشتبہ ہے۔ ان کی نظر میں اس کی روایت میں ضعف پایا جاتا ہے۔ یہ واقعہ آنحضرت ﷺ کے ایام شیرخوارگی کے کچھ بعد یا کچھ قبل کا ہے یعنی اس وقت جبکہ آپ ﷺ کی عمر دو سال سے بھی کچھ کم ہی تھی۔ دوسری تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پانچ سال کی عمر تک بنی سعد میں رہے۔ اگر یہ واقعہ اڑھائی سال کی عمر میں پیش آیا اور اس کے بعد فوراً ہی آپ ﷺ کو مکہ پہنچا دیا گیا تو دونوں روایات میں تضاد کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مؤرخین نے یہ تحریر کیا ہے کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم تین بار حلیمہ سعدیہ کے ہمراہ صحرا گئے۔

سر ولیم میور دو سفید پوش اشخاص کے واقعہ سے متعلق لکھتا ہے کہ:

"اگر حلیمہ اور اس کے شوہر کو یہ شک ہوا کہ بچے کو، کوئی مرض لاحق ہوا ہے تو پھر کسی اعصابی مرض کا دورہ ہوگا لیکن آنحضرت ﷺ کی صحت پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔"

ایک جماعت کا خیال ہے کہ:

"جب خدا نے رسول کریم ﷺ کو نبوت و رسالت کے لئے منتخب کر لیا تھا تو شق صدر کی حاجت ہی نہ تھی۔"

ایمل درمنگھم (EMIL DERMENGHEM) کی رائے ہے کہ اس داستان کا خلاصہ ان آیات کے سوائے اور کچھ نہیں ہے:

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ﴿١﴾ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ﴿٢﴾ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ﴿٣﴾ (سورۃ الانشراح: ۱ تا ۳)

"کیا ہم نے آپ کا شرح صدر نہیں کیا (سینے کو نہیں کھولا) اور وہ بھاری بوجھ نہیں ہٹا دیا جس نے آپ کی کمر توڑ دی تھی۔"

ان قرآنی آیات سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے قلب میں تطہیر و انشراح کے بعد اتنی وسعت پیدا کی کہ آپ فرائض رسالت سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکیں۔

مستشرقین اور مسلمان محققین اس داستان کی تردید اس بنا پر کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی حیات

Marfat.com

مبارکہ ایسے واقعات کے مجموعے کا نام ہے جن سے کمال انسانیت کی آئینہ داری ہوتی ہے، آپ کو دیگر انبیاء علیہم السلام کی طرح اپنی رسالت کے ثبوت میں معجزات کے ظہور کی احتیاج ہرگز نہ تھی۔ مؤرخین اسلام بھی اس نظریے کی تائید اور ان تمام واقعات کی جن سے عقل سلیم اباء کرتی ہے، تردید کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں جو روایات مشہور ہیں وہ ان کے نزدیک قرآن کریم کی آیات بینات کے منافی ہیں۔ قرآن یہ تعلیم دیتا ہے کہ کسی صورت میں بھی لوگوں کو غور وفکر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے، اس کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ فطرتِ الٰہیہ میں تغیر یا تبدل رونما نہیں ہوتا، اس نے مشرکین کی مذمت اس بنیاد پر کی ہے کہ وہ دل ودماغ کی قدرتی صلاحیتوں سے کام نہیں لیتے اور ان کی ہر بات اور ہر فعل سے حماقت ٹپکتی ہے۔

آنحضرت ﷺ پورے پانچ سال بنی سعد کی کفالت میں صحرا کی آزاد فضا اور صحت بخش آب و ہوا میں آزادی اور مستقل مزاجی کے ساتھ رہتے اور درست عربی لہجہ سیکھتے رہے چنانچہ کبھی کبھی آپ اپنے اصحاب سے فرمایا کرتے تھے کہ میں تم سے زیادہ عربی جانتا ہوں۔ میں قریشی ہوں اور میں نے قبیلہ بنی سعد کے ماحول میں پرورش پائی ہے۔ صحرا میں چند سال رہنے سہنے سے آپ کی طبیعت اور آپ کی صحت پر خوشگوار اثر پڑا تھا۔ آپ ہمیشہ بی بی حلیمہ اور ان کے افراد خاندان کے ساتھ حسن خلق اور تعظیم وتکریم سے پیش آتے تھے چنانچہ ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے عقد کے ایک سال بعد مینہ نہ برسنے کی وجہ سے قحط پڑ گیا تھا، بی بی حلیمہ آنحضرت ﷺ کے پاس آئیں اور جب واپس جانے لگیں تو آپ ﷺ نے ایک اونٹ اور چار بکریاں انہیں مرحمت فرمائیں۔ بعدازاں جب کبھی بی بی حلیمہ آتیں، آپ ﷺ ان کی عزت افزائی کے لئے اپنی عبا کا دامن ان کے بیٹھنے کے لئے پھیلا دیا کرتے تھے۔

محاصرۂ طائف کے بعد بنی ہوازن کے جو اسیرانِ جنگ آپ ﷺ کے حضور پیش کئے گئے تھے ان میں بی بی حلیمہ کی بیٹی شیما بھی تھیں۔ جب وہ حضور ﷺ کے سامنے آئیں تو آپ ﷺ ان کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آئے اور ان کی خواہش کے مطابق انہیں قبیلہ بنی ہوازن کے پاس پہنچا دیا گیا۔

آنحضرت ﷺ پانچ سال کے بعد اپنی والدہ ماجدہ کے پاس پہنچے، روایت ہے کہ راستہ میں (جب آپ بی بی حلیمہ کے ہمراہ مکہ آرہے تھے) آپ کہیں گم ہو گئے تھے، بی بی حلیمہ نے ہر چند آپ ﷺ کی تلاش کی لیکن آپ ﷺ کا سراغ نہ مل سکا۔ آخر بی بی حلیمہ نے عبدالمطلب کے پاس جا کر صورتحال بیان کی چنانچہ عبدالمطلب نے کسی شخص کو آنحضرت ﷺ کی جستجو کے لئے بھیجا اور آخر وہ شخص (ورقہ بن نوفل) آپ ﷺ کو ڈھونڈ کر عبدالمطلب کے پاس لے آیا۔

عبدالمطلب کو اپنے پوتے سے اتنی محبت تھی کہ وہ ان کا ہر قسم کا خیال رکھتے تھے اور حتی الامکان حضور ﷺ کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ عبدالمطلب رئیس مکہ بھی تھے اور امیر قریش بھی۔ ان کے لئے کعبہ کے نزدیک مسند بچھتی تھی اور وہ اپنے فرزندوں سمیت اس پر بیٹھا کرتے تھے۔ جب

Marfat.com

آنحضرت ﷺ وہاں پہنچتے تو عبدالمطلب اپنے بیٹوں کے پاس سے اٹھ کر آپ ﷺ کو اپنے پہلو میں بٹھا لیتے اور محبت و شفقت کا اظہار فرماتے تھے۔

حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کی وفات

اسی دور میں منزلِ حیات کے ایک نازک ترین موڑ نے آنحضرت ﷺ کو اپنے دادا کی نظر میں اور زیادہ محبوب کر دیا۔ صورت یہ پیش آئی کہ آمنہ بی بی حضور ﷺ کو اپنے ہمراہ لے کر اپنے اعزہ و اقرباء سے ملنے جلنے کے لئے مدینہ روانہ ہوئیں۔ اس سفر میں اُم ایمن بھی ان کے ساتھ تھیں۔ جب رسول کریم ﷺ نے اپنی عمر میں پہلی بار وہ مکان دیکھا جہاں آپ کے والد محترم نے وفات پائی تھی تو آپ ﷺ کو اپنی یتیمی کا احساس دامن گیر ہوا۔ غالباً بی بی آمنہ نے آپ ﷺ کو حضرت عبداللہ کے حالات سنائے ہوں گے۔ آنحضرت ﷺ ہجرت کے بعد اس سفر کے واقعات صحابہ کو سنایا کرتے تھے۔

آمنہ بی بی نے تقریباً ایک ماہ یثرب میں قیام کیا۔ مکہ کو واپسی پر ابواء کے مقام پر بیمار ہوئیں اور اسی بیماری میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اُم ایمن، حضور ﷺ کو جو اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال پر آب دیدہ تھے، اپنے ہمراہ مکہ واپس لے گئیں۔ آنحضرت ﷺ کو یتیمی کا یہ دوسرا داغ اور بھی زیادہ محسوس ہوا۔ آپ ﷺ نے کبھی کبھی اپنی والدہ ماجدہ کو اپنے والد ماجد کے غم میں آنسو بہاتے دیکھا تھا لیکن اب جبکہ آپ ﷺ کی والدہ بھی آپ ﷺ کو داغ جدائی دے گئیں تو یتیمی کا دوگنا بوجھ آپ ﷺ کے نازک کاندھوں پر آ پڑا۔

حضرت عبدالمطلب کی سرپرستی

اس حادثہ جانکاہ نے آنحضرت ﷺ کو عبدالمطلب کی نظر میں اور بھی زیادہ محبوب کر دیا تھا لیکن ان کی محبت و شفقت کے باوجود آپ پر غم کا جو پہاڑ ٹوٹا تھا اس کے بوجھ تلے آپ پھر بھی دبے ہی رہے۔ قرآن میں بھی آپ کی یتیمی کا ذکر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی نعمت اور اپنے احسان کا ان الفاظ میں تذکرہ کرتا ہے:

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۝٦ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝٧ (سورۃ الضحیٰ: ۶، ۷)

"کیا (اے رسول ﷺ) اللہ تعالیٰ نے آپ کو یتیمی میں پناہ نہیں دی؟ (دی اور ضرور دی) اور آپ ﷺ کو (عالم رنج والم میں) سرگشتہ و حیران پایا تو اسی نے آپ ﷺ کا غم غلط کیا۔"

حضرت عبدالمطلب کا انتقال

اگر عبدالمطلب اس حادثہ جانکاہ کے بعد (جو بی بی آمنہ کی وفات کی شکل میں پیش آیا) چند سال اور بقید حیات رہتے تو ممکن تھا کہ آنحضرت ﷺ کے غم کا بار ہلکا ہو جاتا لیکن ان کی عمر نے بھی وفا نہ کی اور ۸۰ سال کی عمر میں جبکہ آنحضرت ﷺ آٹھ سال کے تھے، آپ نے اس دنیائے فانی کو خیرباد کہا، رسول

Marfat.com

کریم ﷺ جو پہلے اپنے والدین کی جدائی کے غم میں دلبرداشتہ تھے، اپنے دادا کے جنازے کے ہمراہ آنسو بہاتے ہوئے قبرستان تک گئے۔

امیر قریش عبدالمطلب کے بعد آپ کے چچا ابوطالب نے آپ ﷺ کو اپنی سرپرستی میں لیا اور آخر تک کفالت کا حق پوری شفقت کے ساتھ ادا کیا تاہم آنحضرت ﷺ کے دل سے عبدالمطلب کی یاد کا نقش محو نہیں ہوا تھا۔ بنی ہاشم کے لئے عبدالمطلب کی رحلت ایک ناقابل تلافی نقصان تھا کیونکہ ان کے فرزندوں میں سے کوئی اتنا بااثر ورسوخ نہ تھا کہ قبائل عرب پر اس کی شخصیت کی دھاک بیٹھتی۔

عبدالمطلب جب تک بقید حیات رہے، زائرین بیت اللہ کے اکل وشرب کا اہتمام خود ہی فرماتے تھے حالانکہ اہل مکہ نے ہمیشہ آپ کو اذیتیں پہنچائی تھیں تاہم ان کا سلوک اہل مکہ سے اچھا ہی رہا۔ عبدالمطلب کے فرزندوں میں سے کسی کے اندر بھی اپنے والد ماجد کی جانشینی کی صلاحیت نہیں تھی۔ ان میں سے جو نادار تھے، وہ کچھ خرچ نہیں کر سکتے تھے اور جن کے پاس سرمایہ تھا وہ اتنے فراخ حوصلہ نہ تھے کہ عوام کی خاطر کچھ خرچ کرتے۔ یہی اسباب تھے کہ بنی امیہ نے عبدالمطلب کی وفات کے چند روز بعد ہی ان منصوبوں پر عملدرآمد شروع کر دیا جن کے لئے وہ مدت سے تیاریاں کر رہے تھے۔

حضرت ابوطالب کی کفالت

ابوطالب، عبدالمطلب کے سب سے بڑے بیٹے نہ تھے تاہم عبدالمطلب نے اپنی زندگی ہی میں نبی کریم ﷺ کی کفالت انہیں سونپ دی تھی، حارث سب سے بڑے تھے مگر صاحب دولت وثروت نہ تھے۔ عباس کے پاس دولت تھی لیکن ان پر اس کی محبت اتنی غالب تھی کہ کچھ خرچ کرتے ہوئے ان کی جان جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کعبہ سے متعلق صرف سقایت کا منصب انہوں نے اپنی تحویل میں لیا تھا۔ رفادت کا عہدہ قبول کرنے سے انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اندریں حالات اگر عبدالمطلب نے ابوطالب کو آنحضرت ﷺ کی سرپرستی کے لئے منتخب کیا تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں۔ ابوطالب بے سروسامانی کے باوجود قریش کی نگاہ میں عزت کا مقام رکھتے تھے۔

شام کا پہلا سفر

عبدالمطلب کی طرح، ابوطالب بھی اپنے بھتیجے پر جان چھڑکتے اور اپنے بیٹوں پر انہیں ترجیح دیتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی بے پناہ صلاحیتیں چچا اور بھتیجے کے تعلق کی بنیادیں اور بھی زیادہ استوار کر رہی تھیں جب آنحضرت ﷺ کی عمر بارہ سال کی ہوئی تو ابوطالب نے تجارت کی غرض سے شام کا قصد کیا۔ سفر کی صعوبتوں کے پیش نظر ان کا خیال تھا کہ بھتیجے کو ہمراہ نہ لے جائیں لیکن حضور ﷺ نے اصرار کیا تو انہوں نے آپ ﷺ کا دل نہیں توڑا اور بات مان لی۔ آنحضرت ﷺ بصریٰ (یہ مقام شام کے جنوب میں واقع ہے)

تک قافلے کے ہمراہ گئے۔

کتب تاریخ میں مذکور ہے کہ اس سفر میں آنحضرت ﷺ سے بحیرا نامی ایک راہب نے بات کی۔ راہب نے آپ میں وہ تمام علامات پائیں جو عیسائیوں کی کتب میں مندرج تھیں۔ بعض کتب تاریخ میں یہ بیان ملتا ہے کہ راہب مذکورہ موصوف نے اہل قافلہ کو یہ نصیحت بھی کی تھی کہ وہ آپ ﷺ کو شام نہ لے جائیں مبادا وہاں کے یہودی علاماتِ نبوت دیکھنے کے بعد آپ ﷺ کو کوئی گزند پہنچائیں۔

اس سفر میں نبی کریم ﷺ نے مناظر قدرت کا مشاہدہ کچھ قریب سے کیا۔ آپ ﷺ کی آنکھیں چمکتے ہوئے ستاروں اور صاف شفاف آسمان سے کچھ مانوس سی ہوگئیں۔ آپ ﷺ کا گزر مدین[1]، وادی القریٰ[2] اور دیارِ ثمود سے ہوا۔ آپ ﷺ نے اقوامِ سابقہ کے حشر و انجام سے متعلق بہت کچھ سنا اور یہ ذخیرۂ معلومات اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا۔ اس سفر میں آپ ﷺ نے شام کے سرسبز و شاداب باغات دیکھے، ایسے باغات جن کے مقابلہ میں طائف کے باغات کی بھی کوئی حقیقت نہ تھی۔ مکہ کے خشک صحرا اور بے آب و گیاہ پہاڑوں کے مقابلے میں شام کی سرزمین بہشت بریں کا منظر پیش کرتی تھیں۔ ارضِ شام میں آپ ﷺ نے مسیحی پیشواؤں سے ملاقاتیں بھی کیں اور ان سے صحف سماویہ، مجوسیت (دین زرتشت) اور مسیحیت کے بارے میں بہت کچھ سنا۔ اگرچہ آپ ﷺ کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی لیکن دل و دماغ کی پاکیزگی، کمال ہوشمندی، بالغ نظری اور ان تمام اوصاف و کمالات کا جو قدرت نے آپ ﷺ کے اندر ودیعت کئے تھے، یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ مشاہدات و مسموعات پر ہی قانع نہیں ہوجاتے تھے بلکہ آپ ﷺ کا ذوقِ تجسس اور شوقِ تحقیق آپ ﷺ کو دل میں یہ سوچنے پر آمادہ کرتا تھا کہ ان کی تہہ میں کیا حقیقت مضمر ہے؟

ابوطالب کو غالباً اس سفرِ تجارت میں کوئی نفع نہیں ہوا۔ اس لئے پھر دوبارہ انہوں نے قصد سفر نہیں کیا۔ قسمت پر قناعت کی اور مکہ کی حدود میں محصور ہو کر ہی زندگی بسر کرتے رہے۔ تھوڑی بہت دولت جو ان کے پاس تھی اس سے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالتے تھے۔ حضور ﷺ اپنے چچا کے ساتھ رہتے اور اپنی طاقت و استطاعت کے مطابق گھر کے کام کاج میں بھی اپنے چچا کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ اشہرحرم (وہ مہینے جن کا قریش اور اہل مکہ احترام کرتے تھے) میں اپنے اعزہ و اقرباء کے پاس مکہ میں رہتے تھے یا اس کے آس پاس عکاظ[3]، مجنہ اور ذی المجاز[4] کے بازاروں میں چلے جاتے۔ یہاں مشہور عرب شعراء کا کلام سنتے اور اپنے ذوق کے مطابق ان کے کلام کا موازنہ کرتے اور اس کے حسن واقع کا جائزہ لیتے تھے۔ علاوہ بریں یہودی اور مسیحی خطیبوں کی تقریریں بھی آپ ﷺ نے اکثر و بیشتر یہیں سنی تھیں۔ یہ خطیب بت پرستی پر اعتراضات کا پتھراؤ کیا کرتے اور اپنے دعویٰ کی حمایت میں تورات و انجیل کے حوالے دیا کرتے تھے (ان کی تقاریر کی غرض و غایت یہ ہوتی تھی کہ عربوں کو اپنے دین کی دعوت دیں)۔ آنحضرت ﷺ ان تقاریر پر غور و خوض کیا کرتے تھے اور ان کے دین کو بت پرستوں کے مشرب سے کہیں بہتر سمجھتے تھے لیکن آپ ﷺ

کو ان پر کامل اعتماد نہ تھا۔ غرض اس نہج پر قدرت آپ ﷺ کو ایامِ طفولیت ہی میں منصب رسالت کے لئے تیار کر رہی تھی۔

حرب الفجار

نبی کریم ﷺ نے سفر شام میں کاروانوں کی تجارتی گزرگاہ بچشم خود دیکھ لی تھی نیز "اشہر حرم" میں عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کے بازاروں میں شعرائے عرب اور خطباء کا کلام اور تقریریں بھی سن لی تھیں۔ آخر حرب الفجار میں شرکت کے سبب جنگ کے طور وطریق بھی سیکھ لئے۔ اس جنگ کا نام حرب الفجار اس لئے مشہور ہوا کہ یہ اشہر حرم میں واقع ہوئی۔ عرب کا دستور تھا کہ مقدس مہینوں میں یعنی رجب، شعبان، رمضان وغیرہ میں جنگ نہیں کرتے تھے بلکہ عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کے بازاروں میں خرید وفروخت کرتے یا نسلی تفاخر کے مظاہرے کرتے تھے، بعد ازاں بتوں کی زیارت کے لئے کعبہ میں جاتے تھے۔ عکاظ عرب کا مشہور ومعروف بازار تھا۔ شعرائے عرب اپنے چیدہ چیدہ قصائد اس بازار میں پڑھتے اور سامعین سے داد لیتے تھے۔ عرب کا مشہور خطیب قیس بن ساعدہ تقریریں کیا کرتا تھا، اس بازار میں یہودی، عیسائی اور بت پرست امن وسکون کی فضا میں اپنے عقائد کی تبلیغ کیا کرتے تھے، اسی بازار میں بتوں کے پجاری اپنے عقائد کے مطابق بتوں کے کمالات وتصرفات بڑھا چڑھا کر بیان کرتے اور اہلِ کتاب کو مات دینے کی کوشش کرتے اور عکاظ میں یہ سارے اختلافات پر مبنی مباحث اس لئے گوارا کر لئے جاتے تھے کہ ان مہینوں میں آپس میں لڑائی تکرار حرام تھی۔

لیکن براض بن قیس (کنانی) نے حرمت والے مہینے کی حرمت کو نظر انداز کر کے عروہ بن عتبہ ہوازنی کو قتل کر دیا۔ اس واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ نعمان بن منذر ہر سال حیرہ سے ایک قافلہ کو مشک دے کر عکاظ روانہ کیا کرتا تھا اور اسے یہ ہدایات ہوتی تھیں کہ واپسی میں اس کے عوض یمن سے پوست، رسیاں اور زربفت لے آئے۔ براض کنانی نے یہ پیشکش کی کہ میں آپ کے قافلے کو اپنے قبیلے کی حمایت میں منزل مقصود تک پہنچا دوں گا، دوسری طرف عروہ ہوازنی نے یہ وعدہ کیا کہ میں قافلہ کو نجد کی راہ سے حجاز لے جاؤں گا چنانچہ نعمان بن منذر نے قافلہ کی قیادت کے لئے عروہ کو منتخب کر لیا۔ یہ بات براض کنانی کو ناگوار گزری اس نے بہ نیت انتقام عروہ کا تعاقب کیا اور ایک مقام پر اسے تہ تیغ کر کے قافلہ کا مال واسباب لوٹ لیا۔ اس واقعہ کے بعد ایک شخص بشر بن ابوحازم نے قریش کو اطلاع دی کہ قبیلہ ہوازن اپنے مقتول کا انتقام لینے کی فکر میں ہے۔ اس سے پہلے کہ قریش حرم کی حدود میں داخل ہوں ہوازنی ان پر آ ٹوٹے اور لڑائی چھڑ گئی۔ قریش کسی نہ کسی جتن سے حرم کی حدود میں داخل ہو گئے، اس لئے ہوازنیوں کو مجبوراً جنگ سے باز رہنا پڑا لیکن بھی انہوں نے قریش کو متنبہ کیا کہ اگلے سال عکاظ میں جنگ کے لئے تیار رہیں۔ مختصر یہ ہے کہ یہ جنگ

Marfat.com

سال برابر جاری رہی۔ آخرکار اس شرط پر صلح ٹھہری کہ جس فریق کا جانی نقصان کم ہوا ہے وہ فریق ثانی کے اتنے آدمیوں کا خون بہا ادا کرے جو مقابلتہً زیادہ کام آئے ہیں چنانچہ قریش نے بنو ہوازن کے بیس اشخاص کا خون بہا ادا کر دیا۔ اس جنگ کے نتیجے میں براض سنگدلی اور بے رحمی میں ضرب المثل ہو گیا۔

تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حرب الفجار کے زمانہ وقوع میں آنحضرت ﷺ کی عمر کیا تھی، بعض کا خیال ہے کہ آپ ﷺ پندرہ سال کے تھے اور بعض کی رائے یہ ہے کہ آپ ﷺ کا سن بیس سال تھا۔ اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ یہ جنگ چار سال کی مدت تک چھڑی رہی اور یہ ظاہر ہے کہ آغازِ جنگ میں جس شخص کی عمر پندرہ سال ہوگی، اختتامِ جنگ تک وہ ضرور بیس سال کے لگ بھگ پہنچ جائے گا۔

یہ امر متنازعہ فیہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حرب الفجار میں کیا کردار ادا کیا؟ بعض کا بیان ہے کہ آپ ﷺ فریق مخالف کے چھوڑے ہوئے تیر اٹھا اٹھا کر اپنے چچاؤں کے حوالے کر دیا کرتے تھے، بعض کی رائے ہے کہ آپ ﷺ نے ایک جنگجو کی حیثیت سے حرب الفجار میں شرکت کی تھی اور دشمنوں پر تیر بھی چلائے تھے۔ جنگ چار سال جاری رہی تھی اس لئے ہر دو روایات کی صحت کا امکان ہے اور وہ بایں طور کہ جنگ کے آغاز میں جبکہ آپ کی عمر پندرہ سال تھی آپ دشمنوں کے چلائے ہوئے تیر اٹھا اٹھا کر اپنے چچاؤں کو دیتے ہوں گے لیکن جنگ کے آخری مرحلہ پر جب آپ ﷺ بلوغت کی منزل تک پہنچ چکے تھے تو کوئی تعجب نہیں کہ آپ ﷺ نے تیر بھی چلائے ہوئے۔ رسالت کے منصب پر فائز ہوئے جب چند سال گزر چکے تھے تو ایک دن آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

> ''میں اس جنگ میں اپنے چچاؤں کے دوش بدوش شریک جنگ تھا، میں نے تیر بھی چلائے۔ میں اس پر نادم نہیں ہوں۔''

حلف الفضول

حرب الفجار کے بعد قریش کو احساس ہوا کہ ہاشم اور عبدالمطلب کی وفات کے بعد ہمارے قبیلہ کے اتحاد کا شیرازہ اتنا بکھر چکا ہے اور اس کے افراد پر جاہ طلبی کا بھوت اس بری طرح سوار ہے کہ عرب کے دیگر قبائل مکہ پر تسلط کا خواب دیکھ رہے ہیں حالانکہ اس سے قبل کسی نے کبھی مکہ کی طرف اس نیت سے نہیں دیکھا تھا۔ اس احساس کے پیش نظر بنی ہاشم، بنی زہرہ اور بنی تیم عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے اور خدا کو حاضر و ناظر کر یہ عہد کیا کہ ہم ہمیشہ مظلوموں کی حمایت کریں اور (ظالم سے) ان کا حق دلائیں گے۔[۵]

اس معاہدہ میں آنحضرت ﷺ بھی شامل تھے، آپ ﷺ نے بعد کے ایام میں اس معاہدہ سے متعلق خود یہ ارشاد فرمایا ہے:

> ''میں نے ابن جدعان کے ہاں جس معاہدہ میں شرکت کی تھی اگر مجھے سرخ اونٹوں کا

Marfat.com

ریوڑ دے کر اس میں شمولیت سے روکا جاتا تو میں اسے قبول نہ کرتا اگر آج بھی اس قسم کا معاہدہ ہو اور مجھے دعوت شرکت دی جائے تو میں قبول کرنے میں تامل نہیں کروں گا۔"

حرب الفجار سال بھر میں دو چار روز سے زیادہ نہیں ہوتی تھی، باقی ایام میں عرب اپنے دوسرے مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ یہ جنگ اور اس کے خطرات انہیں تجارت، سود خوری، بادہ نوشی اور عیش پرستی سے نہیں باز رکھتے تھے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا دوسرے عرب نوجوانوں کی طرح آنحضرت ﷺ بھی ان تفریحی مشاغل سے لطف اندوز ہوتے تھے یا اپنی ناداری اور بے زاری کے سبب مایوس الحال اور حرماں نصیب اشخاص کی طرح دور ہی سے عیش پرستی کے ان مناظر پر حیرت و حسرت سے نظر ڈالتے اور دل مسوس کر رہ جاتے تھے؟ تاریخ شاہد ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی ان مشاغل میں دلچسپی نہیں لی۔ تعیشات سے یہ اجتناب بے سروسامانی کے باعث نہ تھا کیونکہ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ اطراف مکہ میں رہنے بسنے والے نادار اور تہی دست اشخاص بھی اپنے ذوق وشوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچا لیتے تھے بلکہ ان میں سے بعض تو عیش پرستی کی اس انتہا کو پہنچے ہوئے تھے کہ امرائے قریش بھی ان کی برابری نہیں کر سکتے تھے۔ آنحضرت ﷺ ان گریز پا تعیشات کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ آپ ﷺ کی دلچسپی کا مشغلہ اگر کوئی تھا تو صرف یہ کہ جو حالات و واقعات آپ ﷺ کے علم، مشاہدہ اور تجربے میں آتے، آپ ﷺ ان پر غور وفکر کیا کرتے تھے۔

امرائے قریش جتنی تعلیم کا اپنے فرزندوں کے لئے اہتمام کرتے تھے، آنحضرت ﷺ کو اس سے بھی بہرہ یابی کا موقع نہیں ملا تھا، آپ ﷺ شبانہ روز غور وخوض فرماتے اور قدرت نے دل و دماغ کی جو صلاحیتیں آپ ﷺ کو عطا کی تھیں، ان سے کام لیتے تھے۔ آپ ﷺ کی مقدس روح جس کے انوار کی شمعیں ظہورِ بعثت کے بعد پوری تابانی سے فروزاں ہوئیں اور جس سے آج بھی ایک عالم کسب ضیا کر رہا ہے۔ ان ایام میں (ایام شباب میں) مدارج کمال طے کر رہی تھی، آپ ﷺ ان تمام اسباب عیش و راحت سے قطع نظر جو اہل مکہ کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنے ہوئے تھے ان انوار و تجلیات کا مشاہدہ کیا کرتے تھے جو مظاہر حیات اور مناظر قدرت سے آشکارا ہوتی ہیں۔ ان پر غور وخوض آپ کی زندگی کا اہم ترین مشغلہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایام طفولیت سے آپ کی شخصیت میں مجد وشرف، صدق و امانت اور مروت وشجاعت کے جوہر نمایاں تھے حتیٰ کہ اہل مکہ ایسے سرکش لوگ بھی آپ کو صادق و امین کے القاب سے یاد کیا کرتے تھے۔

گلہ بانی

آنحضرت ﷺ کو شغل گلہ بانی میں غور وخوض کے لئے کافی وقت ملتا تھا۔ آپ ﷺ کئی سال تک اپنے خاندان اور مکہ کے بعض دیگر اشخاص کی بکریاں چراتے رہے، بعد میں آپ ﷺ اپنے اس شغل کا ذکر تحدیث نعمت کے طور پر کیا کرتے اور فرمایا کرتے تھے کہ:

Marfat.com

"نبوت کے لئے گلہ بانی شرط ہے، گلہ بانی کے بغیر منصب نبوت حاصل نہیں ہوتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام گلہ بان تھے، حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی گلہ بانی کی ہے۔ میں بھی اپنے خاندان کی بکریاں چراتا رہا۔"

ایک گلہ بان کا اندازِ معاشرت کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ وہ دن چڑھے وسیع و عریض فضائے کائنات پر اور رات پڑے چمکتے ہوئے ستاروں کی آب و تاب پر دلجمعی کے ساتھ غور و خوض کرتا ہے۔ اس کے دل میں رہ رہ کر یہ تمنا چٹکیاں لیتی رہتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح مجھ پر اسرارِ قدرت ہویدا ہوں۔ اگر وہ صاحب عقل و شعور ہے تو اسے یہ فکر دامن گیر رہے گی، کیا میں ہوا میں سانس نہیں لے رہا ہوں؟ کیا ہوا کے بغیر میری ہلاکت یقینی نہیں ہے؟ کیا مہر و ماہ کے نور کی تیرتی ہوئی کرنیں میری رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے نہیں ہیں؟ کیا میرا وجود آسمانوں اور ان جہانوں سے جو فضائے کائنات میں موجود اور باہم دیگر مربوط ہیں، کوئی ربط و ضبط نہیں رکھتا؟ چونکہ ایک گلہ بان کو ہر ممکن صورت میں اپنے گلہ کی حفاظت کرنی پڑتی ہے اور یہ خیال رہتا ہے کہیں کوئی بکری گم یا ضائع نہ ہو جائے اس لئے جب وہ نظام کائنات اور اس کی نگہداشت پر غور کرتا ہے تو یہی نقشہ اس کے ذہن میں اتر آتا ہے یعنی یہ کہ اس نظام کائنات کا کوئی محافظ ضرور ہے اور یہ محافظ ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ اس کے نظام میں کسی قسم کا اختلال رونما نہ ہونے پائے۔ اسی قسم کے افکار و خیالات کا عادی جو انسان بھی ہوتا ہے دنیا کی ناپائیدار اور گریز پا لذتیں اس کی نظر میں کوئی وزن نہیں رکھتیں، کبھی بھولے سے بھی اس کا دامن ان آلودگیوں سے ملوث نہیں ہوتا۔ جب اس پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا اور اس کی مرغوبات میں کوئی خوبی نہیں ہے تو اس کی روح فضائے قدس کی سیر کرتی اور عالم بالا تک پرواز کی سکت اس میں آ جاتی ہے۔ یہی اسباب تھے جن کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے آپ ﷺ کی صداقت و امانت پر حرف آتا ہو۔ گلہ بانی کے دور کے متعلق آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ:

"ایک دن مجھے ہنگامِ عیش و عشرت کا خیال آیا تو میں نے دوسرے گلہ بان سے کہا کہ میں مکہ جانا اور رات وہیں گزارنا چاہتا ہوں تم میری غیر حاضری میں میری بکریوں کی دیکھ بھال کرتے رہنا۔ جب میں مکہ پہنچا تو وہاں لوگ جشن شادی منا رہے تھے، میں اسی جگہ ٹھہر گیا لیکن مجھ پر ایسی نیند طاری ہوئی کہ پتہ ہی نہ چلا کہ اس جشن میں ہوا کیا، اسی طرح ایک دفعہ اور رات کو اسی مقصد سے مکے گیا۔ یکا یک میرے کانوں میں گانے کی آواز آئی، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یہ کوئی آسمانی نغمہ ہے۔ میں نے تھوڑی دیر تک یہ نغمہ سنا لیکن پھر اسی جگہ مجھے نیند نے آ گھیرا اور صبح تک میری آنکھ نہ کھل سکی۔"

مکہ کی تعیش پسند زندگی اور اس کی دلکشی اس مقدس روح پر کیسے اثر انداز ہو سکتی تھی جس کی غذا غور و فکر ہو یا فکر و تامل! بات یہ ہے کہ یہ ظاہر فریب دلچسپیاں پیغمبر خدا کا تو ذکر ہی کیا بعض دوسرے کم رتبے کے

Marfat.com

انسانوں کو بھی متاثر نہیں کرسکتی تھیں۔ رسول کریم ﷺ ان خرافات کی جانب بھلا کیسے مائل ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ عہد شباب میں عیش و عشرت کی زندگی سے بیزار اور غور وفکر کے عادی رہے۔

گلہ بانی اور تفکر مادی حیثیت سے انسان کے لئے چنداں سودمند نہیں۔ نبی کریم ﷺ اس چیز کے احساس کے باوجود اپنی روش پر قائم رہے اور ان کی نظر میں مادی حیثیت کوئی وزن نہیں رکھتی تھی۔ دنیا کے مادی وسائل سے آپ ﷺ کی زندگی کا کوئی علاقہ نہ تھا۔ دولت وتمول کے کسب وحصول پر آپ ﷺ نے کبھی اپنی توجہ مبذول نہیں کی۔ یکسوئی اور پرہیزگاری سے آپ ﷺ کو فطری لگاؤ تھا، قوت لایموت کے سوائے اور کسی کی احتیاج آپ کو مطلق نہ تھی۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

"ہم پر جب تک اشتہا غالب نہیں ہوتی، ہم خورونوش سے دست کش رہتے ہیں اور ابھی کچھ اشتہا باقی رہتی ہے کہ ہم کھانے پینے سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔"

آپ ﷺ نے تمام عمر سادہ اور سختی کی زندگی بسر کی اور لوگوں کو بھی اسی نہج کی زندگی گزارنے کی دعوت دی، مال و زر کی خواہش انسان کو اس لئے دامن گیر ہوتی ہے کہ اس کی زندگی پھولوں کی سیج بن جائے۔ حضور ﷺ اس قسم کی خواہش سے کوسوں دور تھے۔ اس کے برعکس آنحضرت ﷺ غور وفکر کے عادی تھے اور یہ ایک ایسی معنوی لذت ہے جو اس فرحت کے نتیجے میں انسان کو حاصل ہوتی ہے جو اسرار کائنات کی عقدہ کشائی کا ماحصل ہے۔ اکثر اشخاص اس لذت سے قطعاً ناآشنا ہیں۔ اس لذت کے حصول کے لئے دنیاوی دولت کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ دراصل کمالِ روحانیت کا یہ تقاضا ہے کہ تاوقتیکہ کسی انسان پر اپنی حقیقت منکشف نہ ہو، وہ آخرت کے لئے رخت سفر نہ باندھے، لہٰذا یہ ناگزیر ہے کہ وہ دنیاوی لذات سے منہ موڑ کر انسانیت کے مدارجِ عالیہ طے کرے۔

رسول کریم ﷺ ابتداء ہی سے غور وفکر کے عادی تھے۔ ایامِ طفولیت میں آپ ﷺ کو پے در پے روح فرسا اور جاں گسل صدمات سہنے پڑے، والد ماجد کا انتقال تو آپ ﷺ کی ولادت سے قبل ہی ہو چکا تھا، والدہ ماجدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا، ان حوادث نے آپ ﷺ کے دل و دماغ پر انمٹ نقوش چھوڑے تھے اور یہی انمٹ نقوش تھے جن کی بدولت آپ کی زندگی میں صلاح وتقویٰ اور غور وفکر کی بنیادیں استوار ہوگئی تھیں۔ اگر آپ ﷺ کو اس حال پر رہنے دیا جاتا تو آپ ﷺ ہرگز دنیا اور اس کی متاعِ قلیل کی جانب متوجہ نہ ہوتے اور آپ ﷺ کی زندگی بھی انہی گلہ بانوں کی طرح امن وسکون سے گزرتی جن کی قوتِ متخیلہ نے یہ بات ان کے ذہن میں بٹھا دی ہے کہ ان کی روح کائنات کی وسعتوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

شام کا دوسرا سفر

آنحضرت ﷺ کے عم محترم عیالدار تھے اور ان کی زندگی عسرت سے بسر ہوتی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ اپنے بھتیجے کے لئے کوئی ایسا روزگار مہیا کریں جو گلہ بانی سے کہیں زیادہ منفعت بخش ہو۔ چنانچہ ایک دن

Marfat.com

انہیں یہ پتہ چلا کہ خدیجہ بنت خویلد قریش کے چند اشخاص سے اجرت و معاوضہ پر اپنے کاروبار میں خدمت لینا چاہتی ہیں۔ خدیجہ ؓ ایک دولت مند اور شریف النفس خاتون تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنے تجارتی کاروبار کے سلسلہ میں لوگوں سے اجرت پر خدمت لیا کرتی تھیں اور جو منافع ہوتا تھا اس میں سے ایک حصہ انہیں دے دیا کرتی تھیں۔ ان کی دو شادیاں ہو چکی تھیں (دونوں شوہر وفات پا چکے تھے) اور ہر شوہر کے ترکے میں سے انہیں بہت کچھ ملا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا شمار مکہ کے اہالیانِ دولت و ثروت میں ہوتا تھا، ان کا دستور تھا کہ اپنا مال اپنے باپ خویلد اور دوسرے معتمدین کو تجارت کے لئے دے دیا کرتی تھیں، ان کی دولت مندی کے پیش نظر کئی بار اکابر قریش نے ان کے پاس شادی کے پیغام بھی بھیجے تھے لیکن انہوں نے یہ کہہ کر یہ پیغام رد اور مسترد کر دیئے تھے کہ میں ان سے شادی کرنا نہیں چاہتی، یہ لوگ میرے مال کے خواہشمند ہیں۔ انہوں نے اپنے دل میں یہ بات ٹھان لی تھی کہ میں حتیٰ الامکان اپنی ساری کوششیں تجارت پر صرف کروں گی۔

جب ابوطالب کے علم میں یہ بات آئی کہ خدیجہ ؓ کچھ لوگوں کو تجارت کے لئے شام بھیجنا چاہتی ہے۔ آپ نے رسول کریم ﷺ سے جن کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ پہنچ چکی تھی، کہا میرے پاس سرمایہ نہیں ہے اور میری زندگی کے دن معاشی بدحالی میں گزر رہے ہیں۔ میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ فلاں شخص کو خدیجہ ؓ نے دو اونٹوں پر اجیر مقرر کیا ہے لیکن میں تمہارے لئے اتنی اجرت پر رضامند نہ ہوں گا۔ اگر تم چاہو تو میں تمہارے لئے خدیجہ ؓ سے بات چیت کروں۔ آنحضرت ﷺ نے جواب دیا کہ آپ میرے حق میں جو کچھ بہتر سمجھتے ہیں، ضرور کریں۔ غرض ابوطالب خدیجہ ؓ کے پاس پہنچے اور کہا، کیا تم میرے بھتیجے (حضرت محمد ﷺ) کو اجرت کی شرط پر کچھ مال دینا چاہتی ہو؟ میں نے سنا ہے کہ تم نے فلاں شخص کو دو اونٹوں پر اجیر مقرر کیا ہے لیکن حضرت محمد ﷺ کے سلسلہ میں، میں چار اونٹوں سے کم پر نہیں مانوں گا۔ خدیجہ ؓ نے کہا اگر آپ کسی غیر شخص کے لئے بھی فرماتے تو مجھے قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہوتا، بھلا اس شخص کے لئے جو آپ کا عزیز و قریب ہے میں کیسے آپ کی بات نہیں مانوں گی۔ ابوطالب خدیجہ ؓ سے یہ بات چیت کر کے اپنے بھتیجے کے پاس گئے اور کہا، یہ سلسلہ معاش ہے جس کا بندوبست خدا نے تمہارے لئے گھر بیٹھے کیا ہے۔

آغازِ سفر

آنحضرت ﷺ خدیجہ ؓ کے غلام، میسرہ کے ہمراہ مکہ سے عازمِ سفر ہوئے۔ آپ ﷺ کے چچا نے میسرہ سے کہا کہ ذرا آپ کا خیال رکھنا۔ قافلہ تجارت وادی القریٰ، مدین، دیارِ ثمود اور ان مقامات سے جہاں سے حضور ﷺ اپنے چچا ابوطالب کے ہمراہ بارہ سال پیشتر گزرے تھے، شام کی جانب روانہ ہوا۔ اس سفر میں آنحضرت ﷺ کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں وہ تمام دبے ہوئے نقوش ابھر آئے جو پہلے سفر میں

Marfat.com

جاگزیں ہوئے تھے لہٰذا آپ ﷺ کو ان حالات و واقعات پر جو شام کے پہلے سفر یا مکہ کے گردو پیش میں آپ ﷺ کے علم مشاہدہ میں آئے تھے، پھر غور کرنے کا موقع ملا۔ شام پہنچے تو آپ ﷺ کو عیسائیوں سے سابقہ پڑا اور آپ ﷺ نے ان کے راہبوں اور قسیسوں سے مسیحیت کے بارے میں گفتگو کی۔ نسطوری مذہب کا ایک راہب آپ ﷺ سے ملا اور آپ ﷺ نے اس سے ایک دوسرے راہب کی معیت میں مسیحیت سے متعلق بحث و مذاکرہ کیا (ان ایام میں نصاریٰ مختلف گرہوں میں بٹے ہوئے تھے۔)

آنحضرت ﷺ کو اس سفر میں اپنی امانت اور سابقہ تجربہ کی بنا پر دوسروں کی بہ نسبت کاروبار میں زیادہ نفع ہوا۔ میسرہ پر بھی آپ ﷺ کے اخلاق کا اچھا اثر پڑا اور اس کے دل میں آپ ﷺ کے لئے عزت و احترام کے جذبات بیدار ہوئے۔ قافلہ کی واپسی پر شام کے مالِ تجارت میں جو چیز بھی نبی کریم ﷺ نے پسند کی، اسے خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لئے خرید لیا۔ جب قافلہ مکہ کی حدود میں پہنچا تو میسرہ نے حضور ﷺ سے کہا کہ اولین فرصت میں خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس جایئے اور جو خدمات آپ نے خدا کے فضل و کرم سے ان کے لئے سرانجام دی ہیں ان سے انہیں مطلع کیجئے، وہ آپ سے بہت خوش اور راضی ہوں گی۔ حضور ﷺ ظہر کے وقت مکہ پہنچے۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنے مکان کے بالاخانے پر تھیں، فوراً اتریں اور آنحضرت ﷺ کا خیر مقدم کیا، آنحضرت ﷺ نے سفر شام اور تجارتی منافع سے متعلق دلپذیر پیرایۂ بیان میں گفتگو کی۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کامل انہماک اور پوری توجہ سے آپ ﷺ کا بیان سنا، بعدازاں میسرہ نے خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت ﷺ کے اخلاق و عادات کی تعریف و توصیف کی اور یہ عرض کیا کہ مکہ کے نوجوانوں میں سے کوئی بھی اس شخص کی برابری نہیں کرسکتا۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے نکاح

چند روز بعد خدیجہ رضی اللہ عنہا کی یہ خوشنودی، محبت کے سانچے میں ڈھل گئی اور اس چہل سالہ خاتون نے جو اکابر قریش کے پیغام مسترد کرچکی تھی، ایک ایسے نوجوان سے عقد کی خواہش کی جس کی باتیں اس کے دل میں گھر کرچکی تھیں۔ ایک روایت کے مطابق خدیجہ رضی اللہ عنہا نے یہ خواہش اپنی بہن سے اور دوسری روایت کی رو سے اپنی سہیلی نفیسہ سے ظاہر کی۔ نفیسہ نے آنحضرت ﷺ سے ملاقات کی اور یہ دریافت کیا کہ آپ ﷺ شادی کیوں نہیں کرلیتے۔ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ میرے پاس شادی بیاہ کے لئے مال و دولت نہیں ہے۔ نفیسہ نے کہا کہ اگر یہ مشکل پیش نہ آئے اور ایک خوبصورت، دولتمند اور صحیح النسب خاتون سے رشتہ کا امکان ہو تو کیا آپ اس رشتہ کو قبول نہیں کریں گے؟ آنحضرت ﷺ نے دریافت کیا، آخر ایسی خاتون کون ہے؟ نفیسہ نے جواب میں کہا، خدیجہ! آپ ﷺ نے فرمایا، یہ کیسے؟ آپ کے ذہن میں خدیجہ رضی اللہ عنہا کی شخصیت کا نقش تو بے شک تھا لیکن آپ ﷺ کو یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ ان سے آپ کا عقد ہوسکتا ہے اور وہ اس لئے کہ یہ بات آپ سے بھی پوشیدہ نہ تھی کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اکابر قریش کے پیغام رد کر

Marfat.com

چکی ہیں۔ نفیسہ نے جب یہ بات کہی تو آپ ﷺ نے اس پر صاد کر دیا۔ بعد ازاں خدیجہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے پیغام ملا کہ فلاں وقت آپ اپنے رشتہ داروں سمیت آ جائیں، میرے رشتہ دار بھی موجود ہوں گے عقد کی رسوم ادا ہو جائیں گی۔

خدیجہ رضی اللہ عنہا کے والد کا انتقال حرب الفجار سے قبل ہو چکا تھا لہٰذا شادی کی رسم ان کے چچا کی موجودگی میں ادا ہوئی۔ یہ روایت کہ نکاح کے وقت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے والد شریک تھے لیکن وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ آنحضرت ﷺ سے ان کی بیٹی کا عقد ہو اور اس لئے خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اپنے باپ کو شراب پلا کر اسی بات پر راضی کیا تھا، غلط اور بے بنیاد ہے۔

خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کے بعد آنحضرت ﷺ کی کتابِ زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔

Marfat.com

حواشی

۱۔ یہ شہر زیادہ تر اپنے پیغمبر صالح علیہ السلام کے نام سے مدائن صالح کہلاتا ہے۔(ارض القرآن از سید سلیمان ندوی جلد اول ص ۱۰۰)

۲۔ مدینہ سے کچھ آگے بجانب شمال وہ میدان واقع ہے جہاں ثمود کا قبیلہ آباد تھا۔ یہ ''جوف'' اور ''وادی القریٰ'' کے نام سے مشہور ہے۔ پایۂ تخت کا نام حجر تھا جس کا قرآن میں بھی ذکر آیا ہے۔(ارض القرآن از سید سلیمان ندوی جلد اول ص ۱۰۰)

۳۔ منتہا الادب۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ اس معاہدہ کے عنوان (الفضول) کی وجہ تسمیہ میں دو قول ہیں۔ اول یہ کہ قریش سے پہلے بھی قبیلہ جرہم اور قطورا نے مل کر اس قسم کا معاہدہ کیا تھا جس میں تین ایسے اشخاص شریک تھے جن کے ناموں میں لفظ ''فضل'' کا کوئی ایک صیغہ پایا جاتا تھا یعنی فضل بن حرب، فضل بن واعہ اور مفضل۔ دوم یہ کہ قریش کے اس معاہدہ میں ہر شخص کی اصل فضیلت اس کے لئے محفوظ کی گئی۔ (ملخص از سیرۃ النبی: شبلی نعمانی جلد اول)

۶۔ نفیسہؓ (بنت منیہ) بھی نعمت ایمان سے بہرہ مند ہوئیں۔ (اصابہ جلد ۸ ص ۱۰۵۸)

۷۔ شام سے واپس آنے کے تقریباً تین مہینے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے پاس شادی کا پیغام بھیجا۔ ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا لیکن ان کے چچا عمرو بن اسد زندہ تھے۔ عرب میں عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ شادی بیاہ کے متعلق خود گفتگو کر لیں اور اس میں بالغہ نابالغہ کی قید نہ تھی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے چچا کے ہوتے ہوئے خود براہِ راست تمام مراتب طے کئے۔ (سیرۃ النبی از شبلی نعمانی جلد اول در عنوان تزویج خدیجہ)

*

Marfat.com

باب 3

عقد سے بعثت تک

نبی کریم ﷺ سے حضرت خدیجہ ؓ کے عقد کی رسم خیروخوبی سے پایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔ مہر، بیس اونٹ قرار پایا۔ عقد مناکحت کے بعد آنحضرت ﷺ نے خدیجۃ الکبریٰ ؓ کے یہاں سکونت اختیار کرلی۔ اب کتابِ زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ اہلی اور عائلی زندگی کا باب آپ نے پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہ ؓ کی نذر اپنا وہ شباب کیا جس پر بدمستیوں اور وحشت سامانیوں کی گرد نہیں بیٹھنے پائی تھی۔ حضرت خدیجہ ؓ کے بطن سے بیٹے بھی پیدا ہوئے اور بیٹیاں بھی۔ بیٹے قاسم اور عبداللہ (جنہیں طیب و طاہر کے القاب سے بھی یاد کیا جاتا ہے) عہد طفلی ہی میں والدین کو داغ مفارقت دے گئے۔[1] بیٹیاں زندہ رہیں جن پر والدین خصوصی شفقت فرماتے۔

شمائل وخصائل

آنحضرت ﷺ ایسے خوش منظر تھے کہ آپ کے چہرے سے وجاہت کے آثار نمایاں تھے۔ آپ متوسط القامت تھے، نہ درازقد تھے نہ کوتاہ قامت۔ سر بڑا تھا اور اس پر گھنے سیاہ بال، پیشانی کشادہ تھی اور بھنویں جڑی اور گتھی ہوئی، آنکھوں کی پتلیاں کالی کالی، پتلیوں کے اردگرد کی سفیدی میں تیرتے ہوئے سرخ ڈورے، لمبی اور کالی پلکیں، ستواں ناک، داڑھی کے بال گھنے، بلند اور خوشنما گردن، سینہ کشادہ، نکھرا ہوا رنگ، دست و بازو قوی اور مضبوط قدم۔ جب آپ ﷺ چلتے تو قدم تیزی سے اٹھاتے، پیر جما کر زمین پر رکھتے تھے، آپ کے چہرے سے غوروفکر کی علامات ٹپکتی تھیں۔ آپ کی نگاہوں میں اس قیامت کی جاذبیت تھی کہ ہر شخص اطاعت پر آمادہ ہوجاتا۔ ازدواجی زندگی کے بعد اگر حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ نے اس خیال سے اپنی جائیداد کی نگرانی کا بار آپ ﷺ پر نہیں ڈالا کہ رسول کریم ﷺ کو غوروفکر کے لئے اطمینان بخش وقت مل سکے تو اس میں کوئی حیرت واستعجاب کی بات نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ سے شادی کے بعد اقتصادی اعتبار سے مطمئن ہوگئے تھے۔ اہل مکہ اس امتیازی حیثیت کے پیش نظر آپ ﷺ کو قدرومنزلت کی نگاہوں سے دیکھتے اور آپ ﷺ کا بے حد احترام کرتے تھے لیکن آپ ﷺ کی نظر میں یہ باثروت زندگی درخور اعتنا نہ تھی۔ آپ

Marfat.com

بفضل ایزدومتعال شان استغنار کھتے تھے،عوام سے میل جول میں آپ کو مطلق کوئی تامل نہ تھا۔جس سے بھی ملتے خندہ پیشانی سے ملتے۔ اہل مکہ کی نظر میں آپ ﷺ کا مقام روز بروز بلند ہوتا جاتا تھا لیکن آپ ﷺ اس کے باوجود ہر ایک سے تواضع اور انسانیت سے پیش آتے تھے،کمال ذہانت اور بلند شخصیت کے باوصف عوام کی باتیں پورے انہماک سے سنتے اور ان پر غور بھی کرتے تھے، آپ ﷺ نے کبھی کسی سے بے رخی نہیں برتی۔ جب کوئی آپ ﷺ سے مخاطب ہوتا تو آپ ہمہ تن گوش ہوجاتے تھے، بولتے کم تھے اور سنتے زیادہ تھے۔خوش طبعی فرماتے تھے اور ایسی باتیں بھی سنتے جن میں مزاح کی چاشنی ہوتی لیکن کبھی آپ کی زبان سے کوئی ایسی بات سننے میں نہیں آئی جو حقیقت کے منافی اور خلاف واقعہ ہو۔کبھی آپ اس بے تکلفی کے ساتھ ہنستے کہ سامنے کے دانت نمودار ہوجاتے اور کبھی خفا ہوتے تو پیشانی پر پسینے کے قطرات جھلکنے لگے۔غصہ پی جاتے اور خفگی کی حالت میں کوئی نازیبا لفظ آپ کی زبان پر نہ آتا، آپ کے اندر غضب کی حوصلہ مندی، بلا کی عالی ہمتی اور بے پناہ نیکوکاری تھی،عزم راسخ اور حسن خلق دونوں آپ کی فطرت میں داخل تھے۔ ان تمام خصائل کا آپ کے ہمسایوں، دوستوں،عزیزوں غرض سب کو اعتراف تھا،سبھی کو ان سے نوازا جاتا تھا، کوئی شخص ایسا نہ تھا جو آپ کی عزت اور آپ کا احترام نہ کرتا ہو۔جس کو بھی آپ سے سابقہ پڑتا تھا وہ آپ کا مداح اور ثناخواں بن جاتا تھا۔ان اخلاق و اوصاف اور ان عادات و خصائل سے آپ ﷺ کی رفیقۂ حیات اُم المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا خصوصاً بہت ہی زیادہ متاثر تھیں۔

کعبہ کی دوبارہ تعمیر

آنحضرت ﷺ معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں اہل مکہ کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے،کبھی کبھی آپ کو کعبہ اور اس کی موجودہ حالت کا خیال دامن گیر رہتا تھا اور وہ اس لئے کہ سیلاب سے اس کی بیرونی دیواروں کو نقصان پہنچا تھا اور ان میں جگہ جگہ درزیں اور شگاف پڑ گئے تھے۔اس سے پہلے بھی قریش نے کعبہ کی تعمیر اور اس کی مرمت کا قصد کیا تھا، اس خیال سے کہ اس کے اندر قیمتی اور نفیس آثار کی حفاظت کے لئے حجرے نہ تھے اور یہ تھا کہ ربِ کعبہ اس اقدام سے غضب آلود نہ ہوجائے اور انہیں کوئی سزا نہ ملے۔ یہ خوف دراصل ایامِ جاہلیت کے دیومالائی تصورات کا نتیجہ تھا۔اس کی بنا پر اہل مکہ کو کعبہ کی مرمت اور اس کی تعمیر جدید کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا لیکن سیلاب نے فصیل کعبہ کو کچھ اتنا نقصان پہنچایا تھا کہ عمارت کے زمین بوس ہوجانے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ اتفاق کی بات کہ اس زمانے میں باقوم نامی ایک رومی تاجر کی کشتی جدہ کے نزدیک طوفان کی زد میں آکر ٹوٹ پھوٹ گئی۔ باقوم معمار بھی تھا اور نجار بھی۔ اہل مکہ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے چند اشخاص کو جن میں ولید بن مغیرہ بھی تھا، جدہ بھیجا تا کہ باقوم کی ٹوٹی ہوئی کشتی خرید لیں اور اس سے کعبہ کی تعمیر و مرمت کے بارے میں گفت وشنید بھی کریں۔ مکہ کے اس وفد نے باقوم کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ مکہ چل

Marfat.com

کر کعبہ کی تعمیر ومرمت کا کام شروع کرے، باقوم کی مدد کے لئے مکہ کے ایک قبطی کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔ یہ قبطی بھی نجاری ومعماری میں خاصی مہارت رکھتا تھا۔

حجرِ اسود کی تنصیب

قبائل قریش نے کعبہ کی حدود تقسیم کرلیں، طے یہ پایا کہ ہر قبیلہ اطراف کعبہ میں سے ایک ایک طرف کی دیوار مسمار کرے لیکن ان میں سے کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ آخر ولید بن مغیرہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور اپنے خداؤں کا نام لے کر رکن یمانی کے ایک حصہ کو منہدم کیا، قریش رات بھر اس ادھیڑ بن میں رہے کہ دیکھیں ولید بن مغیرہ کو قدرت سے کیا سزا ملتی ہے لیکن صبح کو جب انہوں نے کھلی آنکھوں سے یہ دیکھا کہ ولید بن مغیرہ زندہ اور صحیح وسلامت ہے تو ان کی ہمت بھی بندھ گئی اور انہوں نے دھڑادھڑ دیواریں ڈھانی شروع کردیں۔ آنحضرت ﷺ بھی اس کام میں شریک تھے، درودیوار کے انہدام کے بعد ایک بہت بڑا پتھر نمودار ہوا جس پر کدال کا اثر بھی نہیں ہوتا تھا، اس پتھر کو سنگ بنیاد قرار دیا گیا، آس پاس کے پہاڑوں سے نیلے پتھر جمع کر کے کعبہ کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا جب دیواریں قدآدم تک پہنچ گئیں تو یہ خیال آیا کہ حجرِ اسود کی تنصیب کا شرف کسے حاصل ہو؟ اس بحث نے طول کھینچا یہاں تک کہ بنی عبدالدار اور بنی عدی نے یہ عہد کرلیا کہ وہ کسی اور قبیلے کو حجرِ اسود نصب کرنے نہیں دیں گے، بنی عبدالدار نے صرف زبانی عہد پر قناعت نہ کی بلکہ وہ خون سے بھرا ہوا ایک برتن لائے اور اس میں ہاتھ ڈال کر اپنے عہد کی توثیق وتحکیم کی۔ اس واقعہ کے بعد سے بنی عبدالدار کا لقب "لعقۃ الدم" یعنی خون چاٹنے والے پڑ گیا۔

ابواُمیہ بن مغیرہ مخزومی قبائل قریش میں ایک معمر اور محترم شخص تھے۔ جب انہیں یہ علم ہوا کہ قریش میں پھوٹ پڑ گئی ہے تو وہ آئے اور یہ کہا کہ اس قضیے کے تصفیے کے لئے اس شخص کو ثالث تسلیم کرو جو صفا کے دروازے سے سب سے پہلے کعبہ میں داخل ہو، قریش نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ جب رسول کریم ﷺ صفا کے دروازے سے سب سے پہلے کعبہ میں داخل ہوئے تو قریش نے بیک آواز کہا:

هذا الامين رضينا بحكمه

"یہ امین ہے، ہم اسے برضا ورغبت اپنا حکم تسلیم کرتے ہیں۔"

یہ کہا اور اکابر قریش آپ ﷺ کے پاس آئے اور صورتحال بیان کی۔ لوگوں کے تیور یہ کہہ دے رہے تھے کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہوئی تو تلواریں میانوں سے باہر نکل آئیں گی۔ آنحضرت ﷺ نے موقع کی نزاکت کا احساس کیا اور یہ فرمایا کہ ایک چادر لاؤ، اسی وقت ایک چادر مہیا کی گئی آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے سنگ اسود اس کے وسط میں رکھ کر فرمایا کہ ہر قبیلے کے چند افراد اس چادر کے ایک ایک گوشے کو اٹھائیں۔ غرض اس تدبیر سے حجرِ اسود کو اٹھا کر نصب کر دیا، اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ اختلاف بھی رفع ہو گیا

Marfat.com

اور کام میں بھی رکاوٹ نہیں پڑی۔ قریش نے کچھ عرصہ میں کعبہ کی تعمیر کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ دیواریں اٹھارہ گز بلند رکھی گئیں اور اس کا دروازہ سطح زمین سے اونچا اٹھایا گیا تا کہ کعبہ میں داخلے کے وقت ہر شخص پر نظر رہے۔ جسے چاہیں داخل ہونے دیں اور جسے چاہیں روک لیں۔ اندرون کعبہ دو قطاروں میں چھ ستون بنائے گئے اور رکن شامی کی جانب اندرونی حصہ میں چند سیڑھیاں تعمیر کی گئیں جن کے ذریعے چھت تک پہنچنے میں آسانی ہو، ہبل اور اس کے علاوہ دیگر بیش قیمت اور نادر اشیاء جن کی چوری کا اندیشہ تھا کعبہ میں بحفاظت تمام رکھے گئے۔

کعبہ کی تعمیر جدید اور حجر اسود کی تنصیب کے وقت رسول کریم ﷺ کی کیا عمر تھی؟ اس بارے میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک آپ ﷺ کی عمر پچیس سال تھی۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ آپ ﷺ اپنی عمر کی ۳۵ ویں منزل میں تھے۔ بہر حال یہ واقعہ اپنی جگہ درست ہے کہ قریش نے حجر اسود کے قضیے میں آپ ﷺ کو ثالث قرار دیا تھا۔ اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ اہل مکہ کی نظر میں آپ ﷺ کا مقام کیا تھا۔ سب آپ ﷺ کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

قریش میں اختلافات کا ظہور

حجر اسود کی تنصیب سے متعلق اختلاف، بنی عبدالدار کے عہد خوں لیسی (خون چاٹنے کا عہد) اور رسول کریم ﷺ کی ثالثی سے یہ حقیقت آشکارا ہے کہ مکہ میں حالات دگرگوں ہو چکے تھے اور پہلے کی طرح اس شہر کا کوئی ایک فرد برسر اقتدار اور معتمد علیہ نہیں تھا۔ اختلاف کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ بنی امیہ اور بنی ہاشم اپنے اپنے اقتدار کے لئے کوشاں تھے اور اس سلسلہ میں ہر ممکن تدابیر اختیار کر رہے تھے۔ کسی ایک رئیس کے برسر اقتدار نہ ہونے سے مکہ کی سالمیت خطرہ میں پڑ سکتی تھی مگر کعبہ کے تقدس اور اس کی حرمت کے پیش نظر عرب جارحانہ اقدام کے لئے تیار نہ تھے۔ بہر حال اس باہمی اختلاف نے یہودیوں اور عیسائیوں کی زبانیں کھول دیں جو کھلم کھلا بت پرستی کی مذمت کرنے لگے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ اہل مکہ اور قریش کی ایک بڑی تعداد یہود و نصاریٰ کی ہم خیال ہوگئی اور اسے بتوں سے شدید نفرت ہوگئی۔ بت پرستی کا رواج صرف اکابر قریش تک محدود ہو کے رہ گیا اور وہ بت پرستی پر اس لئے زور دیتے تھے کہ ان کے نزدیک ان کی تنظیم کا یہی واحد ذریعہ اور مکہ کی تجارتی و مذہبی حیثیت کے تحفظ کا وسیلہ یہی بت پرستی تھی۔ اس زمانے میں بھی مکہ کو اپنے محل وقوع کے اعتبار سے تجارتی و مذہبی فوائد حاصل تھے اور اس کے باشندے آسودگی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے لیکن بت پرستی سے متعلق ان کے عقائد کی بنیادیں متزلزل ہوگئی تھیں۔

مشہور ہے کہ ایک روز عید کی تقریب پر قریش ایک نخلستان میں مجتمع ہوئے تھے۔ چار اشخاص، زید بن عمر، عثمان بن حویرث، عبیداللہ بن جحش اور ورقہ بن نوفل مجمع سے الگ ہٹ کر یہ کہنے لگے:

Marfat.com

''خدا کی قسم! یہ لوگ (بت پرست) بے خبر اور گمراہ ہیں، یہ پتھر کیا ہیں جن کا یہ لوگ طواف کرتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں نہ نفع و ضرر پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان بتوں کے لئے قربانی کی جاتی ہے آؤ ہم ان سے کٹ کر الگ اپنے دین کی بنیاد ڈالیں۔''

ان میں سے ورقہ بن نوفل نے دین مسیحی قبول کر لیا، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اناجیل کے بعض حصص کو عربی کا لباس بھی پہنایا تھا، عبیداللہ بن جحش ذہنی کشمکش میں مبتلا رہے۔ ظہورِ اسلام کے بعد انہوں نے اسلام قبول کیا اور ان مسلمانوں کے ہمراہ حبشہ کی راہ لی جنہیں مکہ سے ہجرت کی اجازت مل گئی تھی لیکن انہوں نے مسیحیت قبول کی اور اسی حال میں انتقال کیا۔ ان کی اہلیہ اُم حبیبہ بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہا جو اسلام پر قائم تھیں، بعد میں آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات میں شامل ہوئیں۔ زید بن عمر اپنی بیوی سے ناراض ہو کر کچھ مدت کے لئے مکہ سے باہر چلا گیا۔ عراق و شام کی خاک چھانی لیکن اس نے نہ یہودیت قبول کی نہ عیسائیت البتہ اسے اپنے آبائی مذہب سے نفرت ضرور ہو گئی تھی، آخر پھر اس کی واپسی مکہ کو ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کعبہ کے پاس جا کر یہ کہا کرتا تھا:

''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تجھے فلاں طریق عبادت پسند ہے تو میں اسی طریقہ سے تیری عبادت کیا کرتا۔ میں اس طریقہ سے بے خبر ہوں۔''

رہا عثمان بن حویرث، یہ شخص اُم المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے اعزہ و اقارب میں سے تھا، اس نے قسطنطنیہ جا کر مسیحیت قبول کر لی اور رفتہ رفتہ قیصر روم کے دربار میں ایک امتیازی مقام اسے حاصل ہو گیا تھا۔ اس نے قیصر روم کو یہ مشورہ دیا تھا کہ مکہ کو روم کی سلطنت میں شامل کر لیا جائے اور سلطنت کی جانب سے مجھے یہاں کا عامل مقرر کر دیا جائے لیکن اہل مکہ نے (اسے اپنا عامل تسلیم نہیں کیا اور) اسے مکہ سے دیس نکالا دے دیا۔ ابن حویرث نے شام میں غسانیوں کے پاس پناہ لی۔ یہاں اس نے یہ منصوبہ سوچا کہ مکہ کی تجارتی راہ مسدود کر دی جائے۔ اہل مکہ کو اس کے عزائم کا علم ہوا تو انہوں نے غسانیوں کے پاس تحفے تحائف بھیجے اور اسے انہی کے ہاتھوں زہر دلوا دیا۔

آنحضرت ﷺ کی اولادِ مبارک

رسول کریم ﷺ کی ازدواجی زندگی امن و سکون اور راحت و آرام سے بسر ہو رہی تھی۔ اُم المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ایک مطیع اور فرمانبردار رفیقہ حیات کی حیثیت سے اپنے شوہر کی خدمت دل و جان سے کرتی تھیں اور ان کی انتہائی کوشش یہ رہتی تھی کہ آنحضرت ﷺ کی اطاعت میں کوئی کسر نہ رہنے پائے۔ اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کے بطن سے دو فرزند عبداللہ رضی اللہ عنہ اور قاسم رضی اللہ عنہ (طیب و طاہر یہ دونوں لقب عبداللہ کے تھے) اور چار بیٹیاں زینب رضی اللہ عنہا، رقیہ رضی اللہ عنہا، اُم کلثوم رضی اللہ عنہا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔ قاسم رضی اللہ عنہ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ سے متعلق

Marfat.com

صرف اتنی معلومات بہم پہنچ سکی ہیں کہ ایامِ جاہلیت میں بزمانہ طفلی ان کا انتقال ہوا۔ اگرچہ صفحہ ہستی سے ان کے نقوش ناپید ہو گئے تاہم یہ حقیقت ہے کہ والدین کو ان کی موت سے بے حد قلق ہوا۔ خصوصاً اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کو ان بچوں کی وفات کا صدمہ اور بھی زیادہ ہوا۔ وہ ان کی بیماری میں بتوں سے مخاطب ہو کر کہا کرتی تھیں کہ تم ان بچوں پر ترس کیوں نہیں کھاتے؟ اور مجھے کیوں داغ جدائی دینا چاہتے ہو؟ رسول کریم ﷺ کو بھی اپنے فرزندوں کی وفات کا بہت غم تھا اور کبھی ان کی یاد آپ ﷺ کے دل سے فراموش نہیں ہوتی تھی۔ اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کے چہرہ پر آثارِ حزن وملال دیکھ کر آنحضرت ﷺ کے داغ بھی تازہ ہو جاتے تھے۔ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور اُم المؤمنین پر قاسم رضی اللہ عنہ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ کی موت کتنی شاق گزری ہوگی اور یہ واقعہ اس غم کی روشن دلیل ہے کہ جب زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ایک غلام کی حیثیت سے فروخت ہونے کے لئے آئے تو آنحضرت ﷺ نے اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا سے بہ اصرار کہا کہ اسے خرید لو چنانچہ اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا نے ارشاد کی تعمیل کی اور زید رضی اللہ عنہ کا سودا ہو گیا۔ آپ ﷺ نے زید رضی اللہ عنہ کو آزاد کر کے متبنیٰ بنالیا، بعدازاں لوگوں میں ان کا نام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی بجائے زید رضی اللہ عنہ بن محمد ﷺ مشہور ہو گیا اور ان کا شمار آنحضرت ﷺ کے محبوب ترین صحابہؓ میں ہونے لگا۔

بعدازاں ظہورِ اسلام کے بعد آنحضرت ﷺ نے قرآنی احکام کی روشنی میں یہ امتناعی حکم صادر فرمادیا کہ اپنی بیٹیوں کو کوئی زندہ درگور نہ کرنے پائے، آپ ﷺ نے خود بھی ایک موقع پر یہ ارشاد فرمایا کہ جنت تمہاری ماؤں کے قدموں تلے ہے، اس ارشاد سے اسلام میں عورت کا درجہ اور بھی زیادہ بلند ہو گیا۔

آنحضرت ﷺ اپنے تیسرے فرزند ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات سے بھی بے حد غمگین ہوئے تھے۔ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اولادِ نرینہ کی وفات کا غم نبی کریم ﷺ کی زندگی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوا۔ آپ ﷺ نے یہ بھی دیکھا کہ قاسم رضی اللہ عنہ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ کی بیماری کے زمانے میں اُم المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے (ایام جاہلیت میں) جو قربانیاں کی تھیں ان سے کچھ بھی فائدہ نہ ہوا اور یہ تمام نذریں بچوں کی جاں بخشی نہ کرا سکیں۔

بناتِ رسول ﷺ

آنحضرت ﷺ نے اپنی بیٹیوں کی شادیاں ان لوگوں میں کیں جو ان کے ہم کفو اور خاندانی نقطہ نظر سے صحیح النسب تھے، حضرت زینب رضی اللہ عنہا تمام بیٹیوں میں بڑی تھیں، ان کی شادی ابوالعاص بن ربیع سے ہوئی، ابوالعاص، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے، کامیاب تجارت اور دولت وثروت کے اعتبار سے اپنے قبیلہ میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ رشتہ ہر لحاظ سے درست اور مناسب تھا لیکن ظہورِ اسلام کے بعد جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے مدینہ کو ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو دونوں میں جدائی ہو گئی۔

Marfat.com

اس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی شادی عتبہ سے اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی عتیبہ سے ہوئی۔ یہ دونوں ابولہب کے بیٹے تھے۔ ظہورِ اسلام کے بعد ابولہب نے اپنے دونوں بیٹوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی بیویوں کو طلاق دے دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ طلاق کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے یکے بعد دیگرے حضرت رقیہؓ اور حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا سے عقد کیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کم عمر کی تھیں۔ ظہورِ اسلام کے بعد ان کی شادی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوئی۔

غارِ حرا میں عزلت گزینی

اس زمانے میں نبی کریم ﷺ کی زندگی راحت و آرام سے بسر ہو رہی تھی۔ اگر قاسم رضی اللہ عنہ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ کی وفات کا غم ہوتا بھی تو اُم المومنین رضی اللہ عنہا کی محبت اور وفاکیشی آپ کے دل پر کبھی گردِ ملال نہ بیٹھنے دیتی، اس آسودہ روزگاری کے عالم میں غور وفکر کی عادت بدستور باقی تھی۔ بت پرستی کے بارے میں یہودیوں اور عیسائیوں کی باتیں آپ دھیان دے کر سنا کرتے اور ان پر اپنے انداز میں غور بھی فرمایا کرتے تھے۔ قدرت جس کی منشاء یہ تھی کہ آپ کے اندر رسالت کے اعلیٰ اوصاف سمو دے نیز آپ میں قابلیت کے ایسے جوہر پیدا کرے جن کی بنا پر آپ ﷺ مخلوق خدا کو راہ ہدایت دکھا سکیں وہ ہرگز یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ آپ ﷺ کو دوسروں کی طرح تاریکی میں چھوڑ دے۔

نبی کریم ﷺ کی افتادِ طبع کچھ ایسی تھی کہ جویائے حقیقت رہتے تھے اور انہیں وہ فرض ادا کرنے کی آٹھوں پہر فکر رہتی تھی جو قدرت نے ان پر عائد کیا تھا۔ روحانی اور معنوی زندگی کے ربط وضبط کا نتیجہ ہی تھا کہ آپ ﷺ کبھی کاہنوں اور ورقہ بن نوفل ایسے داناؤں کے پاس نہیں بیٹھتے تھے بلکہ خود ہی حقیقت کی جستجو میں رہتے اور اپنے افکار وخیالات سے دوسروں کو کم مطلع کرتے تھے۔

اس عہد میں یہ رواج تھا کہ مفکرین ہر سال لوگوں سے یکسو ہو کر عبادت و ریاضت میں مشغول ہوتے تھے اور اسی طریق کو خدا کی بارگاہ میں قرب کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ رسول کریم ﷺ بھی خلوت کو فکر و تامل کا بہترین ذریعہ قرار دیتے تھے اور اس حالت میں آپ ﷺ کی روح سکون پذیر ہوتی تھی۔ آپ ﷺ کو ہمیشہ خدا آگاہی کی جستجو رہتی تھی اور یہ جستجو روز بروز ترقی پر تھی۔

مکہ سے دو فرسخ کے فاصلے پر غارِ حرا ریاضت و عبادت کے لئے بہترین مقام تھا۔ نبی کریم ﷺ رمضان المبارک کا مہینہ اسی غار میں بسر کرتے تھے۔ تھوڑا سا توشہ آپ ﷺ کے پاس ہوتا تھا۔ آپ ﷺ اسی پر قناعت کرتے ہوئے غور وفکر اور عبادت و ریاضت میں مصروف ہو جایا کرتے تھے۔ دنیا کی ہماہمی اور اہل دنیا کی چہل پہل سے الگ تھلگ رہ کر جستجوئے حق میں مصروف رہتے، کبھی محویت و استغراق کا یہ عالم ہوتا کہ دنیا و مافیہا ہی سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو جاتے اور کھانے پینے کے طبعی تقاضے بھی

Marfat.com

آپ ﷺ کی توجہ اپنی جانب مبذول نہ کر سکتے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر، تنہائی میں آپ ﷺ پر یہ حقیقت منکشف ہوتی کہ حقیقت پر مجاز کے تاریک غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ غور و فکر کے بعد یہ حقیقت اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی کہ عوام نے اپنے اوہام و ظنون پر حق و صداقت کا خول چڑھایا ہوا ہے۔

آنحضرت ﷺ جویائے حقیقت تھے لیکن یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتب کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ کائنات کی وسعت، صاف و شفاف آسمان، چمکتے ہوئے ستارے، چاند اور سورج، وسیع و عریض صحرا (جہاں دن میں آفتاب کی آتش بار کرنیں ذرہ ذرہ کو شعلہ جوالہ کا روپ دیتیں اور رات میں چاند ستاروں کی ٹھنڈی روشنی کافور چھڑکتی اور گردوپیش کی فضا کو چار چاند لگا دیتی)، سمندر اور اس کی لرزتی ہوئی لہریں اور وہ تمام اشیاء جن سے وحدت الوجود کی حقیقت آشکارا ہوتی ہے، آپ ﷺ کے غور و فکر کا موضوع بنی ہوئی تھی، عزلت و خلوت کے عالم میں آپ ﷺ کی نگاہوں کے سامنے سے حجابات اٹھ جاتے اور آپ ﷺ کی روحِ مقدس کے آئینے میں تخلیق کائنات کے اسرار و رموز پوری آب و تاب کے ساتھ انعکاس پذیر ہوتے، یہ بات کہ لوگ راہ راست سے بھٹک گئے ہیں۔ آپ ﷺ سے پوشیدہ نہ تھی۔ آپ ﷺ کو اس پہلو پر چنداں غور و فکر کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی مثلاً یہ سوالات جواب طلب نہ تھے۔

(الف) یہ بت کیا ہیں؟ نہ کسی کے نفع و ضرر پر قدرت رکھتے ہیں، نہ کسی کی تخلیق کر سکتے ہیں اور نہ کسی کو رزق بہم پہنچا سکتے ہیں۔ یہ بت کسی چیز پر بھی قادر نہیں۔ ہبل، لات، عزیٰ اور دوسرے بت جو کعبہ کے اندر اور اس کے اطراف میں ہیں ایک مکھی کو بھی لباسِ وجود نہیں پہنا سکتے۔ ان بتوں سے بھلا اہل مکہ کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

(ب) حق کیا ہے؟ اس وسیع و عریض کائنات، ارض و سماء اور اجرام سماویہ میں حق کہاں مستور ہے؟ ہم اس کی تلاش کہاں کریں؟ کیا حق ان چمکتے ہوئے ستاروں میں مستور ہے جو روشنی کا منبع اور حرارت کا سرچشمہ ہیں اور جو نزولِ بارانِ رحمت کا باعث ہوتے ہیں؟ کیا یہ ستارے خود ہماری زمین کی طرح گردش میں ہیں؟ کیا حقیقت سماوی طبقات سے وراء الورا اثیر کی لامحدود وسعتوں میں روپوش ہے؟

(ج) اثیر کیا ہے؟ ہماری زندگی جو موجِ صرصر و صبا کی طرح گریزپا اور ناپائیدار ہے، کس طرح ظہور میں آئی؟ کیا زمین کسی حادثے کے نتیجے میں پیدا ہوگئی ہے؟ لیکن زمین اور ہماری زندگی میں ایک کامل نظام موجود ہے جو تغیر ناآشنا ہے اور حادثات کسی نظم اور کسی آئین کے پابند نہیں ہوا کرتے۔ لوگ جو نیک و بد کام کرتے ہیں آیا وہ ان کاموں میں خود مختار ہیں یا بتقاضائے فطرت ان کی سرانجام دہی میں مجبور ہیں؟

آنحضرت ﷺ غارِ حرا میں عبادت و ریاضت کے دوران اکثر و بیشتر ان مسائل پر غور و خوض کیا کرتے تھے اور یہ محویت کبھی کبھی اس انتہا کو پہنچ جاتی تھی کہ اپنے آپ کی خبر بھی نہیں رہتی تھی۔ آپ کو یہ بھی احساس نہ

Marfat.com

ہوتا تھا کہ پو کب پھٹی اور دن کب ڈھلا؟ رمضان المبارک کے بعد حضرت خدیجہ ؓ کے مکان پر واپس آتے تو آپ کے چہرے پر غور وفکر کے آثار ہویدا ہوتے حتیٰ کہ بعض اوقات اُم المومنین حضرت خدیجہ ؓ کو طبیعت کی ناسازی کا شبہ ہوتا اور وہ مزاج پرسی کرتیں۔

رسول کریم ﷺ عبادت و ریاضت میں کس طریقے کی پیروی کرتے تھے؟ یہ مسئلہ ارباب دانش کے نزدیک متنازعہ فیہ ہے۔ ابن کثیر نے اس موضوع پر اپنی تاریخ میں مختلف نظریات نقل کئے ہیں۔ بعض کی رائے ہے کہ آپ ﷺ ان ایام میں حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت پر کاربند تھے، بعض نے ابراہیمی، موسوی یا مسیحی شریعتوں کا نام لیا ہے۔ ایک گروہ کی رائے ہے کہ آپ اس شریعت کی پیروی کرتے تھے جس کی حقانیت آپ ﷺ پر ثابت ہوگئی تھی۔ یہ رائے دوسری آراء کی نسبت حقیقت سے کچھ زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے اور رسول کریم ﷺ کو غور وفکر کی جانب جو میلان تھا اس سے موافقت رکھتی ہے۔

رویائے صادقہ

رسول کریم ﷺ ہر سال رمضان المبارک کے آغاز میں غار حرا کا رخ کرتے اور وہاں مصروف عبادت ہوجاتے، اس معمول سے آپ ﷺ کے افکار میں پختگی آ گئی تھی اور یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ روح ان سے اثر پذیر ہورہی ہے، مسلسل غور وفکر کے بعد آخر وہ وقت آیا جب عالم رویا میں آپ پر حقائق کا انکشاف ہونے لگا، یہ بات بھی آپ کے ذہن میں نقش فی الحجر ہوگئی کہ دنیا کی زندگی ناپائیدار اور بے حقیقت ہے۔ انہی ایام آپ پر یہ چیز بھی روشن ہوگئی کہ عوام گمراہی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اور بت پرستی نے ان کی اخلاقی اور روحانی زندگی کی روح قبض کرلی ہے۔ آپ ﷺ سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ تھی کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی تعلیمات عوام کو راہ راست پر نہیں لاسکتیں اور وہ اس لئے کہ ان کی تعلیمات میں حقیقت کی جانب میلان کے باوجود بت پرستی کا رنگ جھلکتا تھا۔ حقیقت مطلق سے ان تعلیمات کو کوئی سروکار نہ تھا۔ حقیقت مطلق سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو کائنات کا خالق ہے اور جس کے سوائے اور کوئی معبود نہیں۔ وہی رحمان ہے اور وہی رحیم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ اپنے اعمال کا صلہ پاتے ہیں، جو ذرّہ بھر نیکی کرتا ہے اس کی جزا پاتا ہے اور جس سے تھوڑی بدی کا ارتکاب بھی ہوتا ہے وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچتا ہے۔ بہشت بھی حقیقت ہے اور دوزخ بھی حقیقت۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ماسوا کسی دوسرے کی پرستش کرتے ہیں ان کی ابدی قرارگاہ جہنم ہے۔ (سورۃ الزلزلہ آیات ۷ تا ۸)

سن مبارک زندگی کی چالیسویں منزل پر گامزن ہوا اور حرا میں عبادت و ریاضت کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ رویاء یعنی خوابوں میں جو مکاشفات ہوتے ان سے ایمان میں اور بھی بالیدگی ہوتی۔ باطل پہلے سے کہیں زیادہ نظر میں حقیر ہوگیا۔ اتنے میں پروردگار کی طرف سے اصلاح و تربیت میں توجہ خاص کا زمانہ بھی آ ہی

Marfat.com

گیا۔ یہ اسی تربیت کے اثرات ہیں کہ دل ہمہ تن ایک حقیقت دائمی کی طرف متوجہ ہے۔ اسی کیف میں اللہ سے اپنی قوم کے ضلالت میں سے نکلنے کی التجا کی۔ اسی لگن میں رات بھر خدا کے حضور کھڑے ہوئے ذہن و قلب کو ان تصورات پر لگا دیتے۔ دن میں روزہ سے رہتے اور اس کے یمن و برکت کے سہارے فکر و تامل کا دامن وسیع کرتے۔ کبھی کبھی غار سے نکل کر صحرا میں چہل قدمی فرماتے اور پھر غار میں روپوش ہو جاتے تاکہ جو باتیں ذہن میں آئی ہیں یا جو کچھ خواب میں دیکھا ہے اسے تجربہ میں لائیں، انہیں معمولات میں چھ ماہ گزر گئے اور آپ ﷺ کو اپنے انجامِ کار سے متعلق خدشات لاحق ہونے لگے۔ آخر آپ ﷺ نے اس اندیشہ پر اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو مطلع کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا، مجھے ڈر ہے کہ مجھ پر جنات کا اثر نہ ہو جائے۔ وفا شعار اور اخلاص مند رفیقہ حیات نے آپ ﷺ کو ان الفاظ میں تسلی دی:

"آپ ﷺ امین ہیں، جنات آپ ﷺ کے پاس آنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔"

اس وقت کسی کے خیال و خواب میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ رب قدوس نے اس معنوی ریاضت کے ذریعے اپنے برگزیدہ بندے کو ایک اہم ترین فرض یعنی رسالت کے لئے تیار کیا ہے۔

آغازِ وحی

ایک دن آنحضرت ﷺ غار حرا میں محوِ خواب تھے۔ اس اثناء میں ایک فرشتہ آیا جس کے ہاتھ میں ایک ورق تھا۔ فرشتے نے آپ ﷺ سے کہا، پڑھیے! آپ ﷺ نے عالم اضطراب میں جواب دیا، کیا پڑھوں؟ اس وقت آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ فرشتے نے آپ ﷺ سے معانقہ کیا اور پھر کہا، پڑھیے! آپ ﷺ نے پھر جواب دیا، کیا پڑھوں؟ بعد ازاں فرشتہ پھر آپ ﷺ سے بغل گیر ہوا اور کہا، پڑھیے! آپ ﷺ کو یہ اندیشہ ہوا کہ مبادا فرشتہ پھر معانقہ کرے۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا، کیا پڑھوں؟ فرشتے نے ان آیات کی تلاوت کی۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝١ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝٢ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝٣ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝٤ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝٥

(سورۃ العلق: ۱ تا ۵)

"اپنے پروردگار کے نام سے پڑھیے جس نے جہاں کی تخلیق کی اور انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، ہاں پڑھیے! آپ کا پروردگار صاحب کرم ہے جس نے قلم کے ذریعہ انسان کو ایسی تعلیم دی جس سے وہ پہلے بے بہرہ تھا۔"

تھوڑی دیر کے بعد آپ ﷺ اضطراب کے عالم میں بیدار ہو گئے تو آپ ﷺ نے دل ہی دل میں سوچا کہ میں نے یہ کیا دیکھا؟ کیا وہی بات جس کا کھٹکا تھا، پیش آئی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھ پر

Marfat.com

جنات کا اثر ہو؟

تھوڑے سے غور و تامل کے بعد شدتِ خوف سے آپ کا جسم لرز اٹھا اور آپ ﷺ کے دل پر اضطراب غالب ہوا، غار میں خوف سا محسوس ہونے لگا، باہر نکل آئے۔ آپ ﷺ حیران تھے کہ جو کچھ دیکھا ہے اس کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔ اس پریشانی اور اضطراب کے عالم میں آپ ﷺ غار سے اپنے دولت خانے کی جانب چلے، یہ سوال بار بار ذہن میں ابھرتا تھا کہ وہ کون تھا جس نے مجھے پڑھنے کے لئے کہا؟ اس سے قبل ریاضت و خلوت میں آپ ﷺ حقائق کا بے پردہ مشاہدہ کر چکے تھے اور ظلمت کے وہ پردے جو قریش کو بت پرستی پر مائل کئے ہوئے تھے، آپ ﷺ کی نگاہوں سے اٹھ چکے تھے۔ وہ نور خدا ہی کا تھا اور وہی راہ راست دکھاتا تھا لیکن یہ کون شخص تھا جس نے کہا، خدا کی یاد کا نقش تازہ رکھو اور جس نے یہ کہا کہ ''خدا نے انسان کو قلم کے واسطے سے وہ باتیں سکھائیں جو اسے پہلے معلوم نہ تھیں'' آپ ﷺ اسی اضطراب کے عالم میں چلے جا رہے تھے کہ ایک آواز کانوں میں آئی جیسے کوئی پکارتا ہو، اس آواز نے آپ ﷺ کے خوف میں اور اضافہ کر دیا، آپ ﷺ نے آسمان کی طرف دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک فرشتہ بصورت انسان آپ ﷺ کو آواز دے رہا ہے، آپ ﷺ پر اس سے اور بھی زیادہ دہشت غالب ہو گئی، آپ اس جگہ کھڑے ہو گئے، فرشتے کی طرف سے منہ موڑ لیا لیکن جس طرف بھی آپ ﷺ کی نظر گئی، آپ ﷺ نے اسی فرشتہ کو موجود پایا۔ آپ ﷺ کبھی آگے قدم بڑھاتے اور کبھی پیچھے مڑتے لیکن فرشتے کی صورت نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتی تھی، دیر تک آپ ﷺ پر یہ کیفیت طاری رہی، آخر حضرت خدیجہ ؓ نے کسی کنیز کو آپ ﷺ کی تلاش میں پہاڑ پر بھیجا، فرشتے کی روپوشی کے بعد آپ ﷺ وحشت و اضطراب کے عالم میں گھر واپس آئے اور حضرت خدیجہ ؓ سے کہا مجھے کپڑا اوڑھا دو چنانچہ حضرت خدیجہ ؓ نے آپ ﷺ کو ایک کمبل اوڑھا دیا، آپ ﷺ کا جسم اس طرح کانپ رہا تھا جیسا کسی کے دورہ پر کانپتا ہے جب قدرے زائل ہو گیا تو حضرت خدیجہ ؓ سے پوچھا: کچھ بتاؤ تو سہی مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اس کے بعد سارا واقعہ از اول تا آخر سنایا اور کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ یا کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کاہن بن جاؤں۔ اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ نے حسب معمول آپ ﷺ کو تسلی دلاسا دیا اور بصد ادب و احترام آپ ﷺ مخاطب ہو کر عرض کیا:

> آپ ﷺ تا دیر زندہ و سلامت رہیں۔ اس خدا کی قسم جس کے قبضے میں خدیجہ ؓ کی جان ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ ﷺ کو اس امت کی پیغمبری کے منصب پر فائز کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے وقار میں فرق نہیں آنے دے گا۔ آپ ﷺ صلہ رحمی کرتے ہیں، صدق مقالی آپ کا شیوہ ہے، دوسروں کے لئے تکلیفیں برداشت کرنا آپ کی عادت میں داخل ہے، مہمانوں کی خاطر مدارت اور تواضع میں آپ ﷺ سے کبھی

Marfat.com

کوتاہی نہیں ہوتی، آپ ﷺ حق و صداقت کی راہ میں مصائب و آلام مردانہ وار برداشت کرتے ہیں۔

اس گفتگو سے آنحضرت ﷺ پر خوف و ہراس کی جو کیفیات طاری تھیں، زائل ہو گئیں۔ آپ ﷺ نے اُم المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی طرف شکر و امتنان میں ڈوبی ہوئی نظر ڈالی، پھر اپنے جسم کی تکان کا بار ہلکا کرنے کے لئے آپ ﷺ کچھ دیر کے لئے محو خواب ہو گئے۔ یہ خواب ایک ایسی حیات کا پیش خیمہ تھا جو بیک وقت تمام روحانی کمالات کا مرقع ہو اور جن کی مدد سے آپ ﷺ رسالت کے فرائض خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیں۔ خدا کی خوشنودی کے لئے بھی آپ ﷺ کوشاں ہوں اور انسانیت کی بقا کے لئے بھی خدمات پیش کریں۔ دعوت الی الحق آپ ﷺ کا نصب العین ہو اور رسالت کی تبلیغ آپ ﷺ اس خوبصورتی سے کریں کہ مخلوق کی ہدایت میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔

وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (سورۃ الصف: ۸)

"اور اللہ تعالیٰ اپنا نور (پوری تابانیوں کے ساتھ) عام کرنے کو ہے، خواہ کفار پر یہ بات گراں ہی کیوں نہ گزرے۔"

حواشی

۱۔ بعض ارباب انساب سے تین اور بعض سے چار فرزندوں کی روایت بھی ہے۔

*

Marfat.com

باب 4

بعثت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام تک

رسول کریم ﷺ محوِ خواب تھے اور اُم المؤمنین حضرت خدیجتہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ان کے پاس بیٹھی انہیں لطف وکرم سے دیکھ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد جب آپ کو یقین ہو گیا آنحضرت ﷺ گہری نیند سو گئے ہیں تو اٹھ کر باہر چلی آئیں۔ آپ ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھیں، کبھی یہ امید بندھتی کہ مستقبل میں ان کے شوہر کے لئے نبوت کا اعزاز مقدر ہے اور گمراہ قوم کو ہدایت آپ ﷺ ہی کے طفیل نصیب ہوگی اور کبھی یہ خدشہ لاحق ہوتا کہ ان کے نیکوکار اور پاکباز شوہر کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ آنحضرت ﷺ نے انہیں جو واقعہ سنایا تھا، اُم المؤمنینؓ نے اپنے ذہن میں اس کا نقش تازہ کیا، ساتھ ہی اس فرشتے کا تصور باندھا جو پیغام رسانی کے بعد دیر تک آسمان پر جلوہ گر رہا، انہیں وہ کلمات بھی یاد آئے جو نبی کریم ﷺ نے انہیں پڑھ کر سنائے تھے۔ ان تصورات وخیالات کے سلسلہ میں کبھی امید چہرے پر تبسم کی لہریں بکھیر دیتی اور کبھی خوف نگاہوں کے سامنے مستقبل کا بھیانک منظر پیش کرتا۔ امید وبیم کی اس ادھیڑبن سے جب اُم المؤمنینؓ کچھ اکتا سی گئیں تو انہوں نے ایک ایسے شخص سے تبادلہ خیال کا ارادہ کیا جس کی فراست میں انہیں کوئی شبہ نہ تھا۔

حضرت خدیجتہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور ورقہ بن نوفل

اس مشکل مسئلہ کے حل کے لئے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنے چچا زاد ورقہ بن نوفل کے پاس پہنچیں۔ ورقہ بن نوفل نے مسیحیت قبول کرنے کے بعد انجیل کے بعض حصوں کا عربی میں ترجمہ بھی کیا تھا، آپ نے سارا ماجرا ورقہ بن نوفل کے گوش گزار کیا، ورقہ بن نوفل نے پوری توجہ سے یہ تمام باتیں سنیں اور کہا:

> ''مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر تم سچ کہتی ہو تو یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ یہی ناموس (حضرت) محمد ﷺ پر نازل ہوا ہے، وہ اس امت کے پیغمبر ہیں، ان سے کہہ دو کہ خوف کی کوئی بات نہیں ہے۔''

اُم المؤمنین خدیجتہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ورقہ بن نوفل سے یہ امید افزا پیغام سن کر گھر واپس آئیں۔ رسول کریم ﷺ ابھی تک سو رہے تھے۔ حضرت خدیجتہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نزدیک ہی بیٹھ گئیں اور آپ ﷺ کے جسد اطہر پر مہر والفت کے جذبات میں ڈوبی ہوئی نگاہیں جما دیں۔ اسی حالت میں آپ ﷺ کے جسم پر کپکپی سی

طاری ہوئی، سانس کی رفتار کچھ مدھم سی ہوگئی، پیشانی پر پسینے کے قطرات جھلکنے لگے، آپ ﷺ یکا یک اٹھ بیٹھے، اس وقفہ اضطراب میں فرشتہ نے ان آیات کی وحی کی:

يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ① قُمْ فَأَنذِرْ ② وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ③ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ④ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ⑤ وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ ⑥ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ⑦ (سورۂ المدثر: ۱ تا ۷)

اے چادر اوڑھے ہوئے! اٹھ اور لوگوں کو عذابِ خدا سے ڈرا اور اپنے رب کی کبریائی بیان کر اور اور اپنے کپڑے پاک صاف رکھ اور آلودگی سے دوری اختیار کر اور کسی پر احسان نہ جتا، بسیار طلب نہ بن اور اپنے رب کی خوشنودی کی خاطر شیوۂ صبر اختیار کر۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ پر یہ کیفیت طاری دیکھی تو جوشِ محبت میں ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ ﷺ بستر پر لیٹ جائیں اور آرام سے سوئیں۔ آنحضرت ﷺ نے جواب دیا، راحت و آرام کے دن گزر گئے، مجھ پر یہ وحی نازل ہوئی ہے کہ میں لوگوں کو عذابِ الٰہی سے ڈراؤں اور خدائے واحد کی پرستش کی دعوت دوں۔ میں کسے دعوت حق دوں، میری دعوت پر کون لبیک کہے گا؟ اُم المومنین رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کی حوصلہ افزائی کی اور یہ عرض کیا کہ آپ ﷺ اپنا دل قوی اور اپنی خاطر جمع رکھیں، ساتھ ہی وہ گفتگو بھی دوہرائی جوان سے ورقہ بن نوفل نے کی تھی، بعدازاں اُم المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے کہا، مجھے یقین ہے کہ آپ ﷺ خدا کے پیغمبر ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی نبوت پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا فوری ایمان قدرتی بات اور فطری امر تھا۔ سالہا سال آنحضرت ﷺ کی صحبت میں رہ کر ان پر یہ حقیقت واضح ہوچکی تھی کہ صدق، امانت، تقویٰ اور نیکوکاری کے اوصاف آپ ﷺ میں بدرجہ کمال موجود ہیں۔ اُم المومنین رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو اکثر مصروف عبادت و ریاضت پایا تھا، انہیں یہ بھی علم تھا کہ آپ ﷺ کی توجہ کا مرکز حق ہے اور صرف حق، یہ بھی انہیں معلوم تھا کہ آپ ﷺ بت پرستوں کے اوہامِ باطلہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ غارِ حرا سے واپسی اور آغاز بعثت میں انہیں یہ بھی اندازہ ہوا کہ آپ ﷺ کو ذمہ داری کے منصب نے کتنا مضطرب کیا ہوا ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے یہ عرض کیا کہ جب آپ ﷺ کے پاس فرشتہ آئے تو مجھے باخبر کردیجئے گا۔ چنانچہ جب فرشتہ آیا تو آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو پہلے اپنے دائیں زانو بٹھایا پھر بائیں زانو پر اور آخر میں پہلو میں جگہ دی، تینوں حالتوں میں فرشتہ آپ ﷺ کے ساتھ رہا لیکن جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے سر سے دوپٹہ ہٹایا تو فرشتہ روپوش ہوگیا اس سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو یہ پختہ یقین ہوگیا کہ میرے شوہر کے پاس جو وحی لاتا ہے، فرشتہ ہے، شیطان نہیں۔

ورقہ بن نوفل سے ملاقات

ایک دن نبی کریم ﷺ طواف کعبہ کے لئے گئے تو کعبہ کے نزدیک ورقہ بن نوفل سے ملاقات ہوئی۔ آپ ﷺ نے اسے اپنے واقعات سنائے۔ ورقہ بن نوفل نے کہا:

Marfat.com

''خدا کی قسم! آپ ﷺ اس امت کے پیغمبر ہیں اور جو ناموس موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا، وہی آپ ﷺ پر نازل ہوا ہے، لوگ آپ ﷺ کی تکذیب کریں گے، اذیتیں پہنچائیں گے، اپنے شہر سے جلاوطن کر دیں گے، آپ ﷺ کے ساتھ ان کی لڑائیاں ہوں گی اگر میں اس وقت تک بقید حیات رہا تو حق کی حمایت کروں گا۔''

یہ کہا اور آگے بڑھ کر ورقہ بن نوفل نے آنحضرت ﷺ کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

آنحضرت ﷺ نے ورقہ بن نوفل کی باتیں سنیں تو انہیں یہ احساس ہوا کہ ان میں صداقت ہے۔ واقعی مجھ پر ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوگئی ہے، آپ ﷺ اس سوچ میں پڑ گئے کہ قریش کو کس طرح اپنے دین کی دعوت دوں؟ یہ خیال اس لئے پیدا ہوا کہ قریش اپنے عقائد باطلہ پر اس بری طرح جمے ہوئے تھے کہ ان کو کسی نئے دین کی دعوت دینے کے یہی معنی ہو سکتے تھے کہ ان سے لڑائی مول لی جائے۔ یہ آنحضرت ﷺ نے سوچا کہ قریش گمراہ ہیں، میں انہیں دعوت حق دوں گا، ان الفاظ میں:

اپنے دل و دماغ پر اوہام کو غالب نہ آنے دو، اس خدائے واحد کے آگے سر تسلیم خم کرو جس نے تمہیں اور تمہارے اسلاف کو پیدا کیا ہے، آئینہ دل سے گناہ و معصیت کا غبار دور کر کے خلوص و اخلاص کے ساتھ پروردگار کی عبادت میں مصروف ہو جاؤ۔

میں ان پر یہ حقیقت واضح کروں گا کہ:

نیکی، صلہ رحمی، نادار مسافروں کی مدد وغیرہ سے خدا کا قرب حاصل ہو سکتا ہے۔

میں انہیں یہ بات سمجھاؤں گا کہ:

پتھر کے بت بخشش گناہ کا وسیلہ نہیں بن سکتے، ان کی پرستش سے دستبردار ہو جاؤ، بت پرستی روح کو تاریک اور دل کو پتھر سے زیادہ سخت کر دیتی ہے۔

میں انہیں یہ دعوت دوں گا کہ:

زمین و آسمان میں خدا کی جو مخلوق ہے اسے عزت کی نظر سے دیکھو۔ اس کے اسرار سمجھنے کی کوشش کرو اور اس وسیلے سے اپنی روح کو بلندیوں تک پہنچاؤ، خدائے واحد کی عبادت سے نظر کا معیار بلند کرو، گمراہوں پر ترس کھاؤ اور نہایت شفقت سے انہیں راہ راست پر لاؤ، یتیموں، ناداروں اور ضعیفوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔

خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں لوگوں کو ان متذکرہ بالا امور کی دعوت دوں لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کیا یہ اہل مکہ جن کے دل و دماغ کی صلاحیتیں بت پرستی نے قریب قریب سلب کر لی ہیں اور جن کا خیال یہ ہے کہ ہماری کاروباری زندگی کی گرم بازاری میں اسی بت پرستی کو دخل ہے، اپنے آبائی دین سے دستبردار ہونے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے؟ کیا وہ اپنے شہر کی اس اہم مرکزی حیثیت سے صرف نظر کر سکیں گے جسے وہ بت

Marfat.com

پرستی کا ایک اہم سبب قرار دیتے ہیں۔ میں (رسول کریم ﷺ) انہیں یہ پیغام دوں گا کہ اپنی آرزوئیں، امنگیں اور حسرتیں پامال کردیں کیونکہ صرف یہی ایک ایسی صورت ہے جس کی تہ میں حقیقت کا راز مضمر ہے۔ کیا یہ آلودہ روحیں ان خواہشوں اور شیطانی رجحانات سے آزاد ہو جائیں گی، جو انہیں حیوانات کی صف میں لا چکی ہیں؟ اگر ان لوگوں نے میری نہ سنی اور ایمان نہ لائے تو میں کیا راہ عمل اختیار کروں گا؟ اصل مسئلہ یہ ہے۔

نزولِ وحی میں خلل

آنحضرت ﷺ کو یہ انتظار تھا کہ اس سلسلہ میں وحی سے میری دستگیری کی جائے گی۔ لیکن ہوا یہ کہ نزولِ وحی کا سلسلہ ہی منقطع ہو گیا۔ جبریل امین کوئی پیغام لے کر نہیں آئے۔ اس انقطاع سے پھر آپ ﷺ کے دل و دماغ پر وہی کیفیت اضطراب طاری ہوئی جو نزول وحی سے قبل آپ پر مسلط ہو چکی تھی۔ روایت ہے کہ اس ذہنی کشمکش کے عالم میں اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کے اس فقرہ سے آپ کی تشویش میں اور اضافہ ہو گیا کہ جب انہوں نے آپ کو پریشان دیکھا تو فرمایا: کیا آپ یہ گمان کرتے ہیں کہ پروردگار نے ناراض ہو کر آپ کو بھلا دیا ہے؟ آپ کی تشویش اور بڑھ گئی چنانچہ آپ نے غارِ حرا میں جا کر پھر بکمال خشوع و خضوع خدا سے دعا کی کہ "اے خدا! تو نے پہلے ہی مجھے کیوں اعزاز و اکرام سے نوازا تھا، اب اس بیزاری کا کیا سبب ہے؟"

اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا بھی پریشان اور افسردہ خاطر تھیں۔ آنحضرت ﷺ ان ایام میں کبھی کبھی موت کی دعا بھی مانگتے لیکن جب آپ کو اپنے فرائض کا احساس ہوتا تو پھر اپنی جانب متوجہ ہوتے اور پروردگار سے دعائیں مانگتے۔ اسی حالت دہشت و اضطراب میں آپ ﷺ نے یہ بھی چاہا کہ اپنے آپ کو کوہِ حرا یا جبل ابوقبیس سے نیچے گرادیں۔ چونکہ عمل کی عزیز ترین آرزو پوری ہوتی نظر نہیں آتی تھی اس لئے آپ پر زندگی بار گذر رہی تھی۔

سورۂ والضحیٰ کا نزول

آخر اس حزن و ملال میں ان آیات کا نزول ہوا:

وَالضُّحٰی ① وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ② مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ③ وَلَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّکَ مِنَ الۡاُوۡلٰی ④ وَلَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی ⑤ اَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی ⑥ وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَہَدٰی ⑦ وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغۡنٰی ⑧ فَاَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡہَرۡ ⑨ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡہَرۡ ⑩ وَاَمَّا بِنِعۡمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثۡ ⑪

(سورۂ والضحیٰ: ۱ تا ۱۱)

"قسم ہے دھوپ چڑھتے وقت کی اور رات کی جب چھا جائے، نہ چھوڑا تجھے تیرے رب نے اور نہ بیزار ہوا اور البتہ آپ کی اب کی حالت، پہلی حالت سے کہیں ارفع و

Marfat.com

اعلیٰ ہے، ابھی تو تیرا رب (دنیا و آخرت میں) اتنا کچھ عطا کرے گا کہ تو مطمئن اور راضی ہو جائے گا۔ کیا نہیں پایا تجھے یتیم پھر اس نے تجھے پناہ دی اور تجھے (جوشِ طلب میں) میں سرگرداں پایا پھر (تجھ پر اصلاحِ خلق کی) راہیں کھول دیں۔ اور تجھے پایا بے سرو سامان پھر غنی کر دیا۔ پس جو یتیم ہو اسے مت ڈانٹ اور جو سائل ہو اسے مت جھڑک اور تیرے اوپر تیرے رب کے جو احسانات ہیں ان کا ذکر کیا کر۔"

اس سے زیادہ مسرت و بہجت کا پیغام اور کیا ہو سکتا تھا؟ نبی کریم ﷺ کی پریشانی دور ہو گئی اور خوف و دہشت کی گھٹائیں چھٹ گئیں۔ آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی، زبان پر خدا کی حمد و ثناء اور شکر و امتنان کے کلمات جاری ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ اور اُم المؤمنین حضرت خدیجہ الکبریٰ ؓ دونوں کو سکونِ دل نصیب ہوا اور یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ خدا رسول کریم ﷺ سے بیزار نہیں ہوا بلکہ اس نے انہیں اپنی رحمت و رافت کے سائے میں جگہ دے رکھی ہے۔

دعوت و تبلیغ کا آغاز

اب نبی کریم ﷺ کو موت کی تمنا نہیں رہی بلکہ یہ آرزو پہلو میں گدگدی لینے لگی کہ زندہ رہوں اور لوگوں کو خدائے واحد کے آستانہ پر سجدہ ریزی کی دعوتِ عام دوں۔ وہی ایک خدا ہے، اس کے سوائے کوئی معبود نہیں، قلوب کا مرکزِ رجوع اور ارواح کا محورِ التفات اسی کی ذات ہے۔ دوسرا جہان (یعنی دارالبقاء جہاں انسان کی لطیف روح زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر اور اس ناپائدار زندگی سے ترکِ تعلق کے بعد اپنی خداداد طاقت کے سہارے وحدتِ وجود سے آشنا ہوتی ہے)۔ یقیناً اس جہان سے بلند و بالا اور زیادہ قابلِ التفات ہے وہ عالم، جہاں مادی قیود ٹوٹ جاتی ہیں، جہاں نسبی اعتبارات اور نسلی امتیازات کے تمام حجابات چاک ہو جاتے ہیں، جہاں روزِ روشن، شب تاریک، آسمان، ستارے زمین اور پہاڑ سب ایک سطح پر آ جاتے ہیں۔ وہ ارواح جو کمالِ انسانیت کی بلندیوں تک پہنچتی ہیں، اس عالم کی پراسرار فضاؤں میں پرواز کرتی ہیں۔ مناسب یہی ہے کہ اس حقیر اور پرشور و شر زندگی کا مقصود وہی عالم ہو جو جملہ محاسن کا حامل ہے۔ حقیقت یہی ہے اور اس کے سوا جو کچھ بھی ہے اس کی بنیاد اوہامِ باطلہ پر ہے۔ یہ حقیقت تھی جس کے پرتو نے آنحضرت ﷺ کی روح پرفتوح کو نور کی دولت بخشی اور جس نے آپ کے دل کو دعوتِ حق کے لئے ازسرنو آمادہ کیا۔ اس دعوت کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ اپنے لباس کو آلودہ نہ ہونے دیا جائے۔ بدی سے پرہیز بھی اس دعوت کی شرائط میں سے ہے۔ دعوتِ حق کے سلسلہ میں کسی پر احسان کا بار بھی نہ ڈالا جائے، لوگوں پر یہ واضح کیا جائے کہ حکمت و معرفت کی راہیں کیا ہیں؟ کسی بے نوا اور سائل کے ساتھ ناروا سلوک روا نہ رکھا جائے۔ کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کا معاملہ نہ کیا جائے۔ نبی کریم ﷺ کے لئے یہی بخشش کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پیغمبری کے منصب پر فائز کیا، آنحضرت ﷺ یتیم تھے، خدا نے عبدالمطلب اور ابوطالب کو آپ

Marfat.com

کی کفالت سونپی۔ آپ بے نوا اور بے سروسامان تھے، پروردگار نے آپ کو دولت سے نوازا اور اُم المؤمنین حضرت خدیجتہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو آپ کی رفیقۂ حیات کی حیثیت سے منتخب کیا، سرگشت وسرگرداں تھے، الٰہ العالمین نے پیغمبری کے وسیلے سے آپ کی مشکلات حل کیں۔ آپ ﷺ کے لئے یہ نعمتیں کافی ہیں اس لئے یہ چاہئے کہ آپ دوسروں پر احسان جتائے بغیر انھیں خدا کی طرف دعوت ہدایت دیں۔ یہ تھا الٰہی فرمان جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے برگزیدہ پیغمبر ﷺ پر نازل کیا۔

نماز اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کو نماز کی تلقین بھی کی چنانچہ آپ ﷺ اُم المؤمنین حضرت خدیجتہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی معیت میں نماز ادا کرنے لگے۔ ان ایام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نابالغ تھے اور آنحضرت ﷺ کی سرپرستی میں شب و روز بسر کر رہے تھے۔ ابوطالب عیالدار تھے اور ان کی زندگی عسرت سے گزر رہی تھی ایک دن رسولِ کریم ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے جو بنی ہاشم میں سب سے زیادہ دولتمند تھے کہا: آپ کے بھائی ابوطالب صاحب اہل وعیال ہیں اور آج کل جیسا کہ آپ پر بھی روشن ہے بڑی تنگی ترشی سے گذر بسر کر رہے ہیں، آؤ ہم ان کے پاس چلیں اور ان کا بوجھ ہلکا کر دیں۔ ان کے ایک بیٹے کو میں اپنی کفالت میں لے لیتا ہوں، ایک کو آپ لے لیں، غرض حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی کفالت کا ذمہ لے لیا اور نبی کریم ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئے، بعثت کے ایام میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شانہ نبوت میں تھے۔ ایک دن آنحضرت ﷺ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نماز ادا کر رہے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ باہر سے آ گئے، آنحضرت ﷺ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو رکوع وسجود کرتے اور آیاتِ قرآنی کی تلاوت کرتے دیکھا تو حیرت زدہ ہوئے اور چپ چاپ پاس ہی کھڑے ہو گئے۔ نماز ختم ہوئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا آپ کس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے جواب دیا سجدہ اس خدا کے لئے ہے جس نے مجھے نبوت کے منصب پر فائز کیا اور حکم دیا کہ لوگوں کو حق کی دعوت دوں۔ اس تشریح کے بعد آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدائے واحد کی پرستش اور بت پرستی سے اجتناب کی دعوت دی اور چند آیاتِ قرآنی کی تلاوت بھی کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ان آیات کا بہت زیادہ اثر ہوا اور انہوں نے یہ عرض کیا کہ مجھے اپنے والدین سے مشورہ کی اجازت دے دیجئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رات تو عالم اضطراب میں گزاری اور صبح ہوئی تو آپ نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کیا کہ اس معاملہ میں والدین سے استصواب کی مطلق ضرورت نہیں ہے، میں اسلام قبول کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے جب میری پیدائش کے سلسلہ میں ابوطالب کا مشورہ نہیں لیا تو میں خدا کی پرستش کے بارے میں ابوطالب سے رائے کیوں لوں۔ مردوں میں سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا۔ ان کے بعد زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اس وقت پوری دنیائے اسلام صرف چار نفوس تک محدود تھی یعنی خود رسول

Marfat.com

کریم ﷺ، حضرت خدیجہ ؓ، حضرت علی ؓ اور زید بن حارثہ ؓ۔ آنحضرت ﷺ کو یہ معلوم تھا کہ قریش کے دل میں بتوں کی محبت رچی بسی ہے۔ ان پر دعوتِ اسلام کا اثر کافی دیر بعد ہوگا۔ اس لئے آپ اس الجھن میں تھے کہ قریش کو اسلام کی دعوت دی جائے تو کس طرح۔

حضرت ابوبکر ؓ دائرہ اسلام میں اور سابقون الاولون

حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ ؓ آنحضرت ﷺ کے نزدیک ترین احباب میں شامل تھے اور انہیں حضور ﷺ کی نیک نیتی پاکبازی، امانتداری اور راست گوئی پر کامل اعتماد تھا۔ اس تعلق کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے انہیں اسلام کی دعوت اور بت پرستی سے نفرت کا پیغام دیا۔ ساتھ ہی ان پر یہ حقیقت واضح کی کہ میں نبی ﷺ ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے بلا تامل دعوتِ حق پر لبیک کہا اور ایمان لے آئے۔ ایک جویائے حق کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ جب اس کے سامنے حقیقت آشکار ہو تو وہ اسے تسلیم کرنے میں پس وپیش سے کام لے اور خدائے واحد کی پرستش کی بجائے بتوں کی پوجا پر ڈٹا رہے یعنی ایسی دعوت کو قبول نہ کرے جس کی بنیاد لباس کی پاکیزگی، قلب کی طہارت، بے نوا کی اعانت اور یتیم پروری پر ہو، حضرت ابو بر ؓ خوش خلق، نیک سیرت اور تجارت پیشہ انسان تھے۔ قریش کی طبائع پر بھی ان کی نظر تھی، لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ ابوبکر صدیق ؓ تجربہ کار اور معاملہ فہم واقع ہوئے ہیں۔ ان اوصاف کی بنا پر لوگ ان کی بے حد قدر ومنزلت کرتے تھے، قبولِ اسلام کے بعد انہوں نے اپنے حلقہ احباب میں اسلام کی تبلیغ کی اور جس جس پر بھی اعتماد تھا انہیں قبول حق کی دعوت دی، چنانچہ حضرت عثمان بن عفان ؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوف ؓ، حضرت طلحہ بن عبید اللہ ؓ، حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ اور حضرت زبیر بن عوام ؓ نے آپ کی تبلیغ سے اسلام قبول کیا۔

بعد ازاں حضرت ابوعبیدہ بن جراح ؓ اور مکہ کے اور بہت سے اشخاص نے دعوتِ حق پر لبیک کہا۔ ہر نومسلم آنحضرت ﷺ کے پاس آتا اور آپ ﷺ سے اپنے اسلام کے اعلان کے بعد کچھ دینی معلومات حاصل کرتا۔ چونکہ ان لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ جو شخص بھی مشرف بہ اسلام ہوتا ہے، قریش اس کے ساتھ دشمنوں کا سا برتاؤ کرتے ہیں اس لئے شروع شروع میں نومسلم اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھتے تھے، نماز کا وقت آتا تو اطرافِ مکہ کے دروں میں جا کر خفیہ نمازیں پڑھتے تھے، اسی عالم میں تین سال گزر گئے۔ مکہ میں اسلام پھیلا اور مسلمان ان آیات کے باعث جو رسول ﷺ پر نازل ہوئی تھیں اپنے عقائد میں اور زیادہ پختہ ہو گئے۔ اسلام کی تبلیغ واشاعت کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ ہر ایک کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ پیش آتے تھے، آپ کے اخلاق وعادات کا نفسیاتی اثر ہر ملاقاتی پر پڑتا تھا اور یہ اثر کچھ اتنا گہرا ہوتا تھا کہ لوگ اسلام قبول کئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ آپ نیکوکار، کریم النفس، متواضع، اولوالعزم، خوش گفتار اور انصاف پسند تھے، ہر شخص کو دعوتِ حق دیتے اور ضعیفوں، یتیموں، مجبوروں اور ناداروں کے ساتھ پدرانہ شفقت سے پیش

Marfat.com

آتے تھے، شب بیدار رہتے اور آدھی رات کے وقت جب اہل مکہ خواب غفلت میں مدہوش ہوتے تھے، آپ عبادت کے لئے اٹھتے اور قرآنی آیات کی تلاوت فرماتے تھے۔ زمین و آسمان اور ساری کائنات کو عبرت بیں نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ہمیشہ آپ کی لو خدا سے لگی رہتی تھی۔ اپنے باطن پر غور کرتے اور سب کچھ اپنے آپ سے طلب کرتے تھے۔ آپ کے یہی اخلاق و اعمال ان لوگوں کے لئے جو دین حق سے کچھ لگاؤ رکھتے، ایمان کی تقویت اور اعتقاد کی مضبوطی کا باعث تھے۔ تجار اور اشراف مکہ کی ایک جماعت دائرہ اسلام میں داخل ہو چکی تھی اور ان کا یہ معمول تھا کہ یہ ایسے مسلمانوں کی جو حاجت مند اور نادار تھے مالی امداد کرتے رہتے تھے۔ غرض مکہ میں تبلیغ اسلام کا کام زور و شور سے شروع ہو گیا اور مرد و زن جوق در جوق مشرف بہ اسلام ہونے لگے۔

اہل مکہ کا ردِ عمل

مکہ میں آنحضرت ﷺ کی شخصیت اور ان کا دین موضوعِ گفتگو بن گیا تھا لیکن زیادہ سنگ دل اور قسی القلب لوگ جن کے قلوب پر غفلت کی مہریں لگی ہوئی تھیں شروع شروع میں اسلام کی طرف چنداں ملتفت نہ تھے اور ان کا یہ خیال تھا کہ نبی کریم ﷺ کی باتیں بھی قس، امیہ اور ورقہ کی باتوں کی طرح راہبوں اور مسیحی عالموں کے کلام سے ملتی جلتی ہیں جو سننے والوں پر دیرپا نقوش نہیں چھوڑتیں اور جو لوگ ان کی طرف مائل ہوتے ہیں وہ جلد اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہبل، لات، عزیٰ، مناف اور نائلہ کا اثر آخر کار ان باتوں پر غالب آ جائے گا۔ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ ایمان کی طاقت پر کسی کی قوت غالب نہیں آ سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے دینِ حق کی قسمت میں سربلندی و سرفرازی کا فیصلہ صادر کر دیا ہے۔

اعزہ و اقربا کو دعوتِ اسلام

بعثت کے بعد تین سال گزر چکے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ دین حق کی دعوت عام کر دو، اور اب ضرورت ہے کہ تبلیغ بالاعلان کی جائے۔ اس سلسلہ میں ان آیات کا نزول ہوا۔

(الف) وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

(سورہ الشعراء: ۲۱۴ تا ۲۱۶)

"(اے رسول) اپنے قرابت داروں کو عذابِ الٰہی سے ڈرایئے اور مومنوں میں ان لوگوں کے لئے جو آپ کے پیرو ہیں تواضع سے پیش آیئے، جو لوگ آپ سے سرتابی کریں تو فرما دیجئے کہ میں تمہارے اعمال و افعال سے بیزار ہوں۔"

(ب) فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (سورہ الحجر: ۹۴)

Marfat.com

''جس کام پر آپ کو مامور کیا گیا ہے اس کی سرانجام دہی کے لئے زحمت گوارا کیجئے اور مشرکین سے روگردانی کیجئے۔''

آنحضرت ﷺ نے اپنے قرابت داروں کو دعوت حق دی لیکن بات یہ ہوئی کہ ابھی آپ نے سلسلہ کلام کا آغاز ہی کیا تھا کہ ان کے چچا ابولہب نے درمیان میں لقمے دینے شروع کیے اور یونہی باتیں بنا کر حاضرین کو منتشر کر دیا۔ نبی کریم ﷺ نے دوبارہ ان لوگوں کو دعوت دی، طعام سے فراغت کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا، میں تمہارے واسطے ایسا تحفہ لایا ہوں کہ اس سے پہلے کوئی نہیں لایا، میں تمہیں دنیا و آخرت کی سود و بہبود کا پیغام دیتا ہوں۔ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں دعوتِ حق دوں۔ تم میں سے کون ہے جو اس کام میں میرا معاون، وصی اور خلیفہ بننے کے لئے آمادہ ہے، لوگ منہ پھیر کر اپنی اپنی راہ لینا چاہتے تھے کہ حضرت علی علیہ السلام جو اس وقت طفلِ نابالغ تھے۔ کھڑے ہوئے اور یہ تقریر شروع کی:

''اے پیغمبر خدا! میں آپ کا معاون، آپ کے دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن ہوں۔''

بنی ہاشم حضرت علی علیہ السلام کی اس بات پر ہنس پڑے اور کبھی ابوطالب کی طرف دیکھتے اور کبھی حضرت علی علیہ السلام کی جانب نگاہیں اٹھاتے ہوئے ہنستے اور قہقہے لگاتے چلے گئے۔

آنحضرت ﷺ اپنے قرابت داروں کو دعوت اسلام دینے کے بعد اہل مکہ کو دین کی دعوت دینے لگے۔ ایک روز آپ ﷺ صفا تک گئے اور وہاں پہنچ کر آواز دی: ''اے گروہ قریش!'' قریش نے کہا۔ حضرت محمد ﷺ صفا پر آواز دے رہے ہیں، چنانچہ وہ صفا کے دامن میں پہنچے اور جب آنحضرت ﷺ کے آمنے سامنے ہوئے تو دریافت کیا آپ نے کس لئے ہمیں آواز دی ہے؟ آنحضرت ﷺ نے اس سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا:

اَرَاَيْتُمْ لَوْ اَخْبَرْتُكُمْ اَنَّ خَيْلًا بِسَفْحِ هٰذَا الْجَبَلِ اَكُنْتُمْ تُصَدِّقُوْنَ؟ قَالُوْا نَعَمْ! اَنْتَ عِنْدَنَا غَيْرُ مُتَّهمٍ وَمَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ كِذْبًا قَطُّ - قَالَ فَاِنِّيْ نَذِيْرٌ لَكُمْ بَيْنَ يَدَىْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ۔ يَا بَنِيْ عَبْدِ الْمُطَّلِب. يَا بَنِيْ عبد مناف. يَا بَنِيْ زُهْرَةَ يَا بَنِيْ تِيْم. يَا بَنِيْ مَخْزُوْم. يَا بَنِيْ اَسَد. اِنَّ اللهَ اَمَرَنِيْ اَنْ اُنْذِرَ عَشِيْرَتِيَ الْاَقْرَبِيْنَ وَاِنِّيْ لَا اَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ الدُّنْيَا منفعة وَلَا مِنَ الْاٰخِرَةِ نَصِيْبًا اِلَّا اَنْ تَقُوْلُوْا: لَا اِلٰهَ اِلَّا الله. اَوْ كَمَا قَالَ

''تمہارا کیا خیال ہے؟ اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں ایک لشکر پڑاؤ ڈالے پڑا ہے تو کیا تم میری بات کی تصدیق کرو گے؟ قریش نے جواب میں کہا، ہم کیوں نہیں مانیں گے۔ ہم نے آج تک آپ کی زبان سے کوئی غلط بات نہیں سنی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، میں تمہیں ایک سخت عذاب سے ڈراتا ہوں۔ اے بنی

Marfat.com

عبدالمطلب، اے بنی عبدمناف، اے بنی زہرہ، اے بنی تیم، اے بنی مخزوم، اے بنی اسد، خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ اپنے اقارب کو ڈراؤ، میں تم سے اس کے سوائے اور کچھ نہیں چاہتا (خواہ وہ دنیاوی منفعت ہو خواہ اخروی) کہ تم لا الہ الا اللہ کہو۔"

یہ الفاظ سن کر ابولہب جو تنومند و توانا اور مغلوب الغضب تھا اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے بآواز بلند کہا:

تَبًّا لَكَ سَائِرَ هٰذَا الْيَوْمِ! أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا

"تو ہمیشہ ہلاکت و رسوائی کا منہ دیکھے۔ کیا تو نے اسی غرض سے ہم کو جمع کیا تھا؟"

آنحضرت ﷺ نے اپنے چچا پر ایک اچٹتی ہوئی سی نظر ڈالی (اور خاموش رہے)۔

کچھ دنوں بعد یہ آیات نازل ہوئیں۔

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ ① مَا أَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ② سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ③ (سورۃ اللھب: ۱ تا ۳)

"(اے پیغمبر!) ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹے اور وہ ہلاک ہوا۔ نہ اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی جدوجہد۔ عنقریب وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالا جائے گا۔"

تبلیغ و اشاعت اسلام

ابولہب کا غیظ و غضب اور قریش کا عناد اسلام کی اشاعت کی رفتار نہ روک سکے۔ ہر روز ایک نہ ایک جماعت آتی اور مشرف بہ اسلام ہوتی۔ جن لوگوں کی فطرت میں تھوڑی بہت بھی صالحیت تھی اور جن کی نظر میں دنیا اور اس کی مرغوبات کے لئے کوئی خاص کشش نہ تھی، بلا تامل اسلام قبول کر لیتے تھے، تجارتی مشاغل اور دنیا کے دوسرے مشاغل انہیں قبول حق اور اختیار اسلام سے نہیں روکتے تھے[1]۔ دوسرے وہ یہ بات بھی جانتے اور سمجھتے تھے کہ نبی کریم ﷺ دولت سے چنداں رغبت نہیں رکھتے، ان کا پیغام، پیغامِ محبت ہے، یہی پیغام ہے جس کی بنیاد پر وہ دعوت اسلام دیتے ہیں۔ مزید برآں انہیں وحی کے ذریعہ یہ تعلیم دی گئی ہے کہ دولت کی کثرت روح کے لئے ایک قسم کی لعنت ہے۔

أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ① حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ② كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ③ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ④ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ⑤ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ⑥ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ⑦ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ⑧ (سورہ التکاثر: ۱ تا ۸)

"مال و متاع کی کثرت (کی طلب) نے تمہیں غافل کر دیا۔ (یادِ الٰہی اور خیال آخرت سے) یہاں تک کہ موت کا وقت آ پہنچا، تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا تم بہت جلد جان لوگے کاش تم پہلے ہی یقینی طور پر بات جان لیتے کہ (غفلت کی پاداش میں) تمہیں دوزخ دیکھنی پڑے گی اور پھر یہ دیکھنا یقین کی آنکھ سے ہوگا پھر تم سے خدا کی نعمتوں

Marfat.com

سے متعلق باز پرس ہوگی۔"

جن لوگوں کا اسلام کی جانب میلان ہوتا تھا وہ یہ کہتے تھے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ حریت کی دعوت دیتے ہیں، ایسی حریت مطلقہ کی دعوت جس کی حدود متعین نہیں کی جاسکتیں، ایسی حریت کی دعوت جسے عرب اپنی عزت نفس کا سہارا اور زندگی کا آسرا سمجھتے رہے ہیں۔ یہ لوگ یہ بات بھی جانتے تھے کہ رسول کریم ﷺ بنی نوع انسان کو ایسی قیود سے آزاد کردینا چاہتے ہیں جو غیراللہ کی عبادت نے ان پر عائد کر دی ہیں۔ ان کی تعلیمات کی رو سے عبد و معبود کے درمیان ہبل، لات، عزیٰ، آتش، آفتاب، نجوم، انسان اور فرشتے وغیرہ میں سے کوئی بھی حائل نہیں ہوسکتا۔ بے ہمتا و لاثانی خدا کی بارگاہ میں صرف انسان کے نیک و بد اعمال کی پرستش ہوگی اور اعمال کے سوائے اور کسی شفیع، اور کسی واسطے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ انسان کا وجدان بھی اس کے اعمال کی میزان ہے۔ بروزِ جزا ہمارے تمام اعمال کا وزن ہوگا۔ اس سے بہتر اور برتر حریت اور کیا ہوسکتی ہے؟ آنحضرت ﷺ مخلوق کو اس حریت سے نوازنا چاہتے ہیں۔ کیا ابولہب اور اس کے رفقا بھی لوگوں کو اسی قسم کی تعلیم دیتے ہیں؟ یا یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ہمیشہ ان خرافات کے دام میں گرفتار رہیں جو ان کے اور حقیقت حال کے درمیان حجاب بن گئی ہیں؟

شعرائے قریش اور معجزات مانگنے والے

ابولہب، ابوسفیان اور دوسرے اشراف و اکابر قریش کو، جن کی عظمت کا دار و مدار مال و منال کی کثرت اور ہوس جاہ و منصب پر تھا، رفتہ رفتہ یہ احساس دامن گیر رہنے لگا کہ نبی کریم ﷺ کی دعوت سے ہماری قدر و منزلت میں کمی آرہی ہے۔ اس خطرہ کے پیش نظر انہوں نے آنحضرت ﷺ کی ہجو و مذمت پر کمر باندھی اور دل میں یہ بات ٹھانی کہ نبوت کے سلسلہ میں آپ جن خیالات کا اظہار فرماتے ہیں ان کی کھلم کھلا تکذیب کی جائے۔ اس خیال سے انہوں نے ابوسفیان بن حارث، عمرو بن عاص، اور عبداللہ بن زبعری کو ہجو طرازی پر آمادہ کیا۔ شعرائے اسلام نے ان کی ہجویات کے ترکی بہ ترکی جواب دیئے، رسول کریم ﷺ نے اس نزاع میں مطلق کوئی حصہ نہیں لیا۔

انہی ایام میں کچھ لوگ آپ ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ سے اسی قسم کے معجزات کا مطالبہ کیا جس قسم کے معجزات کا ظہور حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام سے ہوا تھا۔ بعض نے یہ مطالبہ کیا کہ صفا و مروہ کو سونے میں تبدیل کر دیجئے۔ بعض نے سوال کیا کہ قرآنی آیات لکھی لکھائی کیوں نازل نہیں ہوتیں اور جبرئیل علیہ السلام دوسروں کو نظر کیوں نہیں آتے؟ آپ مردوں کو زندہ کیوں نہیں کرتے؟ پہاڑ آپ کے حکم سے حرکت میں کیوں نہیں آتے؟ اگر ایسا ہوجائے تو مکہ ان کے حصار سے نکل جائے۔

اہل مکہ آپ سے یہ بھی کہتے تھے کہ جب آپ کو معلوم ہے کہ مکہ کو پانی کی بے حد ضرورت ہے تو آپ یہ کیوں نہیں کرتے کہ زمزم سے خوشگوار پانی کے چشمے جاری کر دیں۔ مشرکین کے مطالبات صرف انہی چند

Marfat.com

سوالات پر ختم نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ خدا آپ کو اجناس کی شرحیں اور قیمتیں پہلے سے کیوں نہیں بتا دیتا تاکہ تجارت میں زیادہ منافع کی صورت نکل آئے۔ جب اہل مکہ کا اصرار انتہا کو پہنچ گیا اور ان کے تمسخر و استہزا کی کوئی حد نہ رہی تو وحی نازل ہوئی اور انہیں ان لفاظ میں جواب دیا:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ؁ (سورہ الاعراف: ۱۸۸)

"کہہ دیجئے میں اپنے نفع وضرر کا مالک نہیں مگر وہ جو خدا کو منظور ہو۔ اگر مجھے علم غیب ہوتا تو میں نفع کثیر حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کسی خرابی سے سابقہ نہ پڑتا۔ میں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے ہیں، ڈرانے اور خوشخبری سنانے والا ہوں۔"

اس میں کوئی کلام نہیں کہ نبی اکرم ﷺ بشیر و نذیر ہیں، پھر لوگ ان سے خلاف عقل سوالات کیوں کرتے ہیں؟ حضور ﷺ سے جس چیز کا مطالبہ کرتے ہیں وہ خلاف عقل نہیں بلکہ عقل اس کی تائید اور اس کا اثبات کرتی ہے۔ یہ لوگ کیوں ایسے امور کا تقاضا کرتے ہیں جو ذوقِ سلیم پر گراں گزرتے ہیں؟ آنحضرت ﷺ کی دعوت بھی تو ہے کہ وحی والہام کے ذریعہ جو احکام نازل ہوتے ہیں ان کی صحت تسلیم کرلو، قرآن کریم ترجمانِ حقیقت ہے اور اس سے بڑا اور کوئی معجزہ نہیں لیکن لوگ ہیں کہ اس کے باوجود بھی معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مشرکین مکہ چاہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اپنی نبوت کا ثبوت خوارقِ عادات کی صورت میں دیں تاکہ تردد کی راہیں کھلی رہیں۔ پتھر اور لکڑی کے گھڑے ہوئے بت پوچ ہیں لیکن اس کے باوجود بت پرست ان کی پرستش کرتے ہیں اور کبھی انہیں یہ خیال نہیں آتا کہ ان بتوں سے ان کی الوہیت پر دلیل و حجت طلب کریں اور طلب کریں بھی تو کیا حاصل! یہ بت بے جان و حرکت ہیں۔ کسی کام کے نہیں، نہ یہ بت نفع وضرر پر قادر ہیں اور اگر کوئی انہیں توڑے پھوڑے تو یہ اپنے بچاؤ کے لئے کوئی تدبیر نہیں کر سکتے۔

ایک ہاتھ پر چاند، ایک ہاتھ پر سورج

رسول کریم ﷺ پہلے بتوں کے متعلق کچھ نہیں کہا کرتے تھے لیکن اب آپ نے کھلے بندوں ان کی مذمت شروع کر دی۔ اس سے بات بڑھ گئی، قریش آگ بگولا ہو گئے اور پیغمبر ﷺ کو ہدف تضحیک بنانے کے منصوبے باندھے، اس سے پہلے بھی کفار مکہ استہزا کیا کرتے تھے۔ کبھی دارالندوہ میں اور کبھی اطراف کعبہ میں بیٹھ کر نبی کریم ﷺ پر آوازے کستے اور قہقہے لگاتے تھے، جب رسول کریم ﷺ نے لات وعزیٰ، ہبل اور تمام بتوں کو برا کہنا شروع کیا تو معاملہ نے دوسری صورت اختیار کر لی اور تحقیر و تمسخر کی حدود سے کچھ اور آگے ان کے قدم بڑھے۔ قریش کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر نبی کریم ﷺ نے اہل مکہ کو قریش کے خلاف برانگیختہ کر دیا اور انہیں بتوں کی پرستش نہ کرنے دی تو مکہ کی تجارت اور اس کی مذہبی وقعت کہاں رہے گی

ابوطالب نے خود اسلام تو قبول نہیں کیا تھا لیکن اپنے بھتیجے رسول کریم ﷺ کی حمایت کرتے تھے اور ان کی حفاظت کے لئے آمادہ تھے۔ ان حالات میں اشرافِ قریش، ابوسفیان کی معیت میں ابوطالب کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ کا بھتیجا ہمارے معبودوں کی مذمت اور ہمارے دین پر اعتراض کرتا ہے یہی نہیں بلکہ وہ ہماری عقل پر ہنستا اور ہمارے بزرگوں کو گمراہ کہتا ہے۔ اسے سمجھا دیجئے کہ ہم سے تعرض نہ کرے یا پھر اسے ہمارے حوالے کر دیجئے ہم خود اس سے نبٹ لیں گے۔ ابوطالب نے مناسب الفاظ میں انہیں جواب دیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

ادھر رسول کریم ﷺ بڑی گرم جوشی سے دعوت و تبلیغ میں مصروف رہے اور ان کے حلقہ میں توسیع ہوتی گئی۔ قریش نے پھر مجتمع ہو کر صلاح مشورہ کیا اور ایک جماعت کو جس میں ولید بن مغیرہ کا نہایت حسین و جمیل بیٹا عمارہ بھی تھا، ابوطالب کے پاس بھیجا۔ اس وفد نے ابوطالب سے یہ اصرار کیا کہ عمارہ کو اپنی فرزندی میں قبول کر لیجئے اور محمد ﷺ کو ہمارے حوالے کر دیجئے۔ ابوطالب نے ان کی فرمائش رد کر دی۔ اس اثنا میں نبی کریم ﷺ بدستورِ سابق ''دینِ حق'' کی دعوت دیتے رہے۔ قریش نے تیسری بار ابوطالب کے پاس ایک وفد اور بھیجا ارکان وفد نے کہا، آپ معمر، شریف اور محترم بزرگ ہیں، ہم نے آپ سے درخواست کی تھی کہ اپنے بھتیجے کو منع کر دیں لیکن آپ نے ہماری بات نہیں مانی۔ ہم یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ (حضرت) محمد (ﷺ) ہمارے اسلاف کی توہین کرے، ہماری عقل پر ہنسے اور ہمارے معبودوں کی مذمت کرے۔ ہم پھر آپ سے کہتے ہیں کہ اپنے بھتیجے کو روک لیجئے ورنہ ہم آپ سے اور آپ کے بھتیجے سے جنگ کریں گے تاکہ ایک فریق رہے اور ایک ختم ہو جائے۔ ابوطالب کو ایک طرف تو یہ بات پسند نہ تھی کہ قریش سے ان کا تصادم ہو اور دوسری طرف وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ اپنے بھتیجے کو دشمنوں کے حوالے کریں۔ آپ نے کسی شخص کو بھیجا کہ رسول کریم ﷺ کو بلا لائے، آپ ﷺ آئے تو ابوطالب نے آپ کو قریش کے عزائم سے مطلع کیا اور کہا کہ مجھ پر اور اپنے اوپر ترس کھاؤ اور مجھے تکلیف میں نہ ڈالو۔

یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے تھوڑی دیر سکوت اختیار کیا۔ اس وقفہ سکوت میں تاریخ دوراہے پر انگشت بدنداں تھی، اسے کیا خبر تھی کہ حالات کا دھارا کس رخ بہتا ہے؟ دنیا کی تقدیر کا فیصلہ ان کلمات پر موقوف تھا جو آنحضرت ﷺ کی زبان وحی ترجمان پر جاری ہونے کو تھے۔ یہ سوالات درپیش تھے کہ آیا دنیا پر تاریکی بدستور مسلط رہے گی؟ آیا مجوسیت، مسیحیت پر غالب آئے گی؟ کیا بت پرستی اور اس کے اوہامِ باطلہ کی قسمت میں سربلندی ہے یا توحید کی بدولت عقل کو اوہام کی قید سے نجات نصیب ہو گی؟ اور پھر اس کے باعث روحِ انسانی خرافات کی پستیوں سے نکل کر ملاءِ اعلیٰ سے متصل ہو گی۔ ابوطالب حضور ﷺ کی حمایت نہیں کر سکتے تھے۔ مسلمان اتنے طاقتور نہ تھے جو کفارِ مکہ سے ٹکر لے سکتے۔ قریش اصحابِ مال و منال اور اربابِ ثروت تھے۔ ان حالات میں ایمان کی قوت کے سہارے کے علاوہ کوئی اور سہارا اور کوئی دوسرا آسرا نہ تھا۔ یہی ایک

Marfat.com

قوت تھی جس کے ہوتے ہوئے مشکلات، مشکلات نظر نہیں آتی تھیں، یہ تصور بھی کچھ کم خوش آئند نہ تھا کہ جہانِ باقی، جہان فانی سے بدرجہا اولیٰ ہے اس لئے بہر صورت فرائض رسالت کی بجا آوری ضروری ہے اور یہ بھی ناگزیر ہے کہ دعوت اسلام کا سلسلہ پوری گرم جوشی کے ساتھ جاری رہنا چاہئے۔ حق کی راہ میں جان دے دینا تردد و تامل سے بہتر ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان تمام نشیب و فراز پر غور و خوض کے بعد پورے عزم اور پورے وثوق سے اپنے چچا سے ان الفاظ میں خطاب کیا۔

يَا عَمِّ! وَاللهِ لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِي يَمِيْنِي وَالْقَمَرَ فِي يَسَارِي عَلٰى اَنْ اَتْرُكَ هٰذَا الْاَمْرَ حَتّٰى يُظْهِرَهُ اللهُ اَوْ اُهْلَكَ فِيْهِ مَا تَرَكْتُهٗ۔

"اے چچا! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں میں چاند رکھ کر یہ کہیں کہ میں تبلیغ رسالت سے باز آجاؤں تو میں اس سے دستبردار نہیں ہوں گا۔ یہاں تک کہ خدا میرے دین کو رائج کرے یا میں اس کوشش میں ہلاک ہو جاؤں۔"

حق پر ایمان کی یہ کتنی روشن مثال ہے، پاک دلِ ابوطالب نبی کریم ﷺ کے اس جواب سے لرز اٹھے اور انھیں آپ کے عزم راسخ اور غیر متزلزل ارادہ سے حیرت ہوئی۔ ابوطالب کی زبان سے غیر متوقع کلمات سن کر آپ کا دل بھر آیا تھا لہٰذا آپ اٹھ کر باہر تشریف لے گئے۔ ابوطالب ایک دو لمحے تک کشمکش میں مبتلا رہے، قریش ان سے ناخوش تھے اور آنحضرت ﷺ کا ارادہ اٹل تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے آنحضرت ﷺ کو پکارا۔ آپ ان کے پاس آئے تو کہا۔

"اچھا جو تم چاہتے ہو کہو خدا کی قسم میں تمہیں کسی تکلیف میں مبتلا نہیں ہونے دوں گا۔"

بنو ہاشم کی حمایت

ابوطالب نے رسول کریم ﷺ کی باتیں بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کو سنائیں اور ان سے کہا کہ آپ ﷺ کی حمایت میں کمی نہ کرنا۔ سب نے ابوطالب کی بات مان لی لیکن ابولہب نے کھلم کھلا مخالفت شروع کر دی اور دشمنوں سے جا ملا۔ بنی ہاشم نے کسی تامل و تردد کے بغیر رسول اللہ ﷺ کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس میں قومی تعصب اور بنی اُمیہ کے ساتھ دیرینہ عداوت کو بھی بہت بڑا دخل تھا لیکن محض قبائلی عصبیت اور قدیم عداوت بنی ہاشم کو قریش کے مقابلہ کے لئے آمادہ نہیں کر سکتی تھی۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ نیا دین ان کے آبائی عقائد کی تحقیر و تذلیل کا موجب ہے لیکن ایک طرف اپنے دین کی اشاعت و تبلیغ پر نبی کریم ﷺ کے اصرار اور دوسری طرف عرب کے اس عام خیال نے کہ خدا کا دین ہمارے دین سے جدا ہے بنی ہاشم کو اس بات پر آمادہ کیا کہ امیہ بن ابی صلت، ورقہ بن نوفل اور اس قبیل کے دوسرے لوگوں کی طرح رسول کریم ﷺ کو بھی اپنے عقائد کی تبلیغ کا حق دے دیا جائے اور وہ بھی علی الاعلان اپنے دین کی اشاعت کر سکیں۔ اگر وہ حق بجانب ہیں (لیکن بنی ہاشم کو اس بات کا یقین نہ تھا) تو صداقت چھپی نہیں رہ سکتی

اور بنی ہاشم بھی شرف و امتیاز کے اس مقام سے محروم نہیں رہیں گے جو نبی کریم ﷺ کو حاصل ہوگا۔ بصورت دیگر پیروانِ محمد مصطفی علیہ السلام جلد منتشر ہو جائیں گے جس طرح ان سے پہلے دوسرے مبلغین کے پیرو متفرق و منتشر ہو چکے ہیں۔ اس بنا پر رسول کریم ﷺ کی دعوت اتنی اہم نہیں کہ اصولِ کہن اور قبائلی تعصب کو نظر انداز کر کے پیغمبر اسلام ﷺ کو دشمنوں کے حوالے کر دیا جائے۔

مسلمانوں پر ابتلا

غرض آنحضرت ﷺ اپنے قبیلہ کی پناہ و سرپرستی میں قریش کے آزار سے محفوظ تھے۔ گھر میں اُم المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی محبت آپ کے لئے موجب راحت و آرام تھی۔ اگر کبھی دشمنوں کی اذیت و مخالفت سے آپ کی طبیعت متاثر ہو جاتی تھی تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا محبت آمیز برتاؤ اس اثر کو زائل کر دیتا تھا۔ قریش پہلے کی طرح خوش باش، عیش پسند اور بے فکر نہیں رہے تھے۔ وہ مسلمانوں کی ایذا رسانی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ تکلیفیں دے دے کر انہیں دین حق سے منحرف کر دیں، قریش میں سے ایک شخص اپنے حبشی غلام حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو چلچلاتی دھوپ میں تپتی ہوئی ریت پر لٹا دیتا اور ایک گرم اور بھاری پتھر ان کے سینے پر رکھ دیتا تا کہ وہ تڑپ تڑپ کر جان دے دیں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس کی سخت مصیبت اور جانکاہ تکلیف میں بھی احد، احد کہتے اور تمام شدائد کو صبر و تحمل سے برداشت کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اس حال میں دیکھا تو انہیں خرید کر آزاد کر دیا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور بھی چند غلام ایسے تھے جنہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے مالکوں سے خرید کر آزاد کیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے (بزمانہ کفر) بھی ایک کنیز خرید کر آزاد کی تھی۔ اس زمانے میں ایک خاتون جو مشرف بہ اسلام ہو چکی تھی، دشمنانِ اسلام کی سختیاں سہتے سہتے شہید ہو گئیں۔ آزاد مسلمانوں پر بھی قریش نے عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا حتیٰ کہ خود آنحضرت ﷺ بھی بنی ہاشم کی سرپرستی کے باوجود قریش کے مظالم سے محفوظ نہ تھے۔ ابولہب کی بیوی ام جمیل اپنے گھر کا کوڑا کرکٹ آپ ﷺ پر پھینک دیتی اور آپ ﷺ چپ چاپ اسے برداشت کر لیتے، ایک دن نبی کریم ﷺ نماز ادا کر رہے تھے کہ ابوجہل نے ایک بکری (جسے بتوں پر قربان کیا گیا تھا) کی اوجھڑی آپ ﷺ کے اوپر پھینک دی۔ آپ گھر پہنچے اور آپ نے اپنا لباس دھو کر پاک صاف کیا۔ مسلمان اکثر مخالفین کی زبان سے سخت وسست اور نازیبا باتیں سنتے رہتے تھے لیکن ان گوناگوں تکالیف نے ان کے ایمان کی بنیادیں مضبوط کر دی تھیں، دراصل ان ایذاؤں سے انہیں ایک طرح کی روحانی مسرت محسوس ہوتی تھی۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی کا یہ دور تاریخ انسانی کا اہم ترین باب ہے۔

مظالم پر صبر

پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے پیرو مال و زر کے طالب نہ تھے بلکہ انہیں حق و صداقت سے رغبت اور

Marfat.com

ایمان سے تعلق خاطر تھا۔ نبی کریم ﷺ ان لوگوں کو جو مسلمانوں پر مظالم ڈھا رہے تھے، صراطِ مستقیم پر گامزن اور بت پرستی سے متنفر دیکھنا چاہتے تھے اس بلند مقصد اور اس اعلیٰ نصب العین کی خاطر وہ طرح طرح کی اذیتیں برداشت کرتے تھے۔ شاعر آپ کی ہجو و مذمت میں اشعار کہتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ قریش نے آپ کے خلاف ایک منظم سازش کا جال بچھایا تھا۔ ایک شخص نے آپ ﷺ کو کعبہ کے نزدیک ہلاک کر ڈالنے کا ناپاک قصد کیا۔ بعض مخالفین نے چھپ چھپ کر آپ کے مکان پر سنگ باری کی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مخالفین کی یہ ناشائستہ اور ناروا حرکات آپ کے صبر و تحمل کی بنیاد متزلزل نہیں کر سکیں۔ ان پیہم مخالفتوں سے آپ ﷺ کے عزائم میں اور بھی زیادہ پختگی آ گئی۔ آپ ﷺ کے ان کلمات نے کہ اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند رکھ کر کہا جائے کہ تم دعوتِ حق سے باز رہو تو میں ہرگز اس سے دست بردار نہیں ہوں گا تا آنکہ خدا میرے دین کو فروغ دے یا میں جدوجہد میں جان دے دوں، مسلمانوں کے حوصلے بلند کر دیئے تھے اور جاں بازی و فداکاری کی راہیں ان پر آسان ہو گئی تھیں۔ شاید بعض لوگوں کو تعجب ہو کہ جبکہ ابھی دین اسلام کی تکمیل نہیں ہوئی تھی اور ابھی قرآن کریم کی صرف چند سورتیں ہی نازل ہوئی تھیں، مسلمان اپنے ایمان میں اتنے پختہ اور عقیدہ میں اتنے راسخ کیسے ہو گئے تھے، غالباً بعض کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں کی فداکارانہ ذہنیت اور اولوالعزمی کا سبب آنحضرت ﷺ کی بلند اخلاقی، اولوالعزمی اور صداقت شعاری کی خصوصیات تھیں۔ اس میں مطلق کوئی کلام نہیں کہ مسلمانوں کے عقائد کی پختگی میں پیغمبر اسلام ﷺ کے اخلاق حسنہ کو بڑا دخل تھا لیکن اس کے علاوہ کچھ اور بھی اسباب تھے۔

آنحضرت ﷺ ایک ایسے ملک میں زندگی بسر کر رہے تھے جس کا نظامِ معاشرت جمہوری تھا۔ اس نظام کی رو سے آپ کا مقام کچھ کم بلند نہ تھا، اقتصادی حیثیت سے بھی آپ کے حالات اطمینان بخش تھے۔ علاوہ بریں آپ کا خاندانی تعلق بنی ہاشم سے تھا جن کے پاس کعبہ کی تولیت اور حجاج کی سقایت کے عہدے تھے اور اس لحاظ سے دینی معاملات میں انہیں جو امتیاز حاصل تھا وہ بھی کم باعث فخر نہ تھا۔ آنحضرت ﷺ سے پیشتر جو انبیاء علیہم السلام ہوئے ہیں ان کا حال کچھ مختلف تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر میں پیدا ہوئے جہاں لوگ فرعون کی خدائی کے قائل تھے اور فرعون کا یہ اعلان کہ انا ربکم الاعلیٰ (میں تمہارا بہت بڑا رب ہوں) ان کی نظر میں بہت کچھ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خواہش تھی کہ فرعون اور غریب باشندے دونوں خدا کے سامنے ایک مقام پر کھڑے ہوں لیکن ملک مصر میں تب تک یہ نوبت نہیں آ سکتی تھی جب تک کہ فرعون کے اقتدار کا طلسم پاش پاش نہ ہو جاتا۔ اس کے خلاف سیاسی انقلاب برپا کرنا ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فرعون نے شروع شروع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا سختی سے مقابلہ کیا۔ اس مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معجز نمائی نے مدد دی، انہوں نے اپنا عصا زمین پر پھینکا جس نے اژدھے کی شکل اختیار کر لی اور ساحرانِ فرعون نے جو سانپ سنپولیے بنائے تھے اس اژدھا نے ان کا کام تمام کر دیا لیکن اس معجزہ کے باوجود حضرت

Marfat.com

موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ مؤثر اور کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ آپؑ نے بہ حالت مجبوری وطن سے ہجرت اختیار کی۔ اس موقعہ پر دوسرے معجزہ خلق البحر نے آپ کی دستگیری کی اور اس طرح آپ اور آپ کے رفقا کو نجات کی راہ مل گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ناصرہ میں (جو مضافاتِ فلسطین میں سے ہے) متولد ہوئے۔ فلسطین ان ایام میں شہنشاہِ روم کے زیر نگیں تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو صبر و تحمل اور عفو و درگزر کی دعوت دی لیکن ان کی تعلیم اربابِ اقتدار کے رجحانات کے موافق نہ نکلی۔ روح القدس نے تبلیغ دین میں آپ کی دستگیری کی۔ آپ نے مردوں کو زندہ اور لاعلاج مریضوں کو صحت مند کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت نبی کریم ﷺ کی تعلیم کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں۔ اگر کچھ اختلاف ہے تو صرف جزئیات میں ہے (یہاں ان اختلافات پر تفصیلی تبصرہ کی گنجائش نہیں) بہر حال حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی پیغمبرانہ دعوتیں مختلف اسباب و علل کے ماتحت (جن میں سیاسی وجوہ کو دخل ہے) مختلف اثرات پر منتج ہوئیں لیکن نبی کریم ﷺ کی رسالت (اس ملک میں جس کا بیان اوپر گزر چکا ہے) محض معنوی رسالت تھی اور ان کی بنیاد دعوت الی الحق پر تھی۔ چونکہ آپ ﷺ کی دعوتِ حق سیاسی میلانات کے دائرے سے خارج تھی اس لئے اس نظام معاشرت میں جو جمہوری انداز کا تھا اور اہل مکہ جس کے پیرو تھے آپ کی دعوت سے کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔

دعوتِ محمدیہ اور جدید علمی تجزیہ

یہ بات کہ نبی کریم ﷺ کی دعوت علمی تحقیق کی کسوٹی پر پوری اترتی ہے اور اسے اس تحقیق سے بہت کچھ مناسبت ہے، موجب حیرت ہے۔ تحقیق جدید کا علمی طریق یہ ہے کہ جب کسی امر کی تحقیق مطلوب ہوتی ہے تو ان تمام نظریات سے قطع نظر جو اس سے تھوڑا بہت علاقہ رکھتے ہیں مشاہدات و تجربات سے تحقیق کا آغاز کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں مشاہدات و تجربات کا جائزہ لیا جاتا اور انہیں منطقی اسلوب سے ترتیب دیا جاتا ہے پھر ان مرتبہ مقدمات سے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ اس صورت میں علمی تحقیق کی رو سے جو نتائج برآمد ہوں گے وہ اس وقت تک قابل اعتماد رہیں گے، جب تک دوسرے کی تحقیق سے ان کی غلطی ثابت نہ ہو جائے انسان کو ان نظریات اور اوہام کی قید سے رہا کرنے کے لئے، جو تحقیق کے بغیر خود بخود یا ماحول کے اثر سے اس کے دماغ میں راہ پا گئے ہیں، اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں۔ آنحضرت ﷺ کی دعوت کا طریق بھی یہی رہا ہے۔ لوگوں نے کس طرح اور کس صورت میں آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا؟ بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے قدیم عقائد سے قطع نظر نئے دین کی خصوصیات پر غور و خوض کیا۔ قبائل عرب میں سے ہر قبیلہ کا بت جدا تھا۔ ان میں سے کون حق پر ہو سکتا تھا؟ عرب اور اس کے متصل جو ممالک تھے ان میں کواکب پرستی، آتش پرستی اور آفتاب پرستی کا رواج تھا، ان میں کون راہ راست پر قرار دیا جا سکتا تھا؟ ان سب سے قطع نظر اور اپنے اپنے تصورات سے خالی الذہن ہو کر تحقیق کی نظر سے دیکھنا چاہئے کہ حقیقت کہاں ہے؟

Marfat.com

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہے اس کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ اقوام وملل میں ہم آہنگی اور یک جہتی پائی جاتی ہے۔ انسان، نباتات، جمادات اور حیوانات سے ربط رکھتا ہے، زمین، آفتاب، ماہتاب اور آسمان سے پیوستہ و وابستہ ہے، کائنات کا یہ ربط باہم ایک ایسے قانون کے تابع ہے جس میں کبھی تغیر رونما نہیں ہوتا۔ چاند، سورج اور ستارے خط پرکار کی طرح اس دائرہ میں گھومتے ہیں اور اس فضائے بسیط میں ہر ایک کی سیر اور روش کی ایک راہ اور ایک وضع مقرر ہے۔ نظام عالم میں ربط وضبط کی نوعیت کا انداز یہ ہے کہ اگر موجودات میں سے کوئی ایک چیز اپنی وضع پر قائم نہ رہے تو کائنات زیروزبر ہو کر رہ جائے۔ اگر آفتاب عالم تاب زمین کو حرارت اور روشنی نہ پہنچائے تو زمین و آسمان کا نقشہ بدل جائے۔ یہ حقیقت کسی تشریح کی محتاج نہیں کہ کائنات ایک نظم، ایک نظام اور ایک آئین کے تابع ہے اور اس کا رخ منزل کمال کی جانب ہے۔ اس کی حرکات میں انتشار کو مطلق دخل نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ساری کائنات ایک ایسی روح کے تابع ہے جو اسے اور تمام اشیاء کو تفریق و انتشار کی دستبرد سے محفوظ رکھتی ہے۔ یہ جہان اسی روحِ لازوال کے پرتو سے وجود میں آیا ہے اور اس کی سرپرستی میں مدارجِ کمال طے کر رہا ہے اور آخر میں اس قطرہ کی مانند جو دریا میں مل کر اپنی ہستی گم کر دیتا ہے، اسی کے جلوؤں میں روپوش ہو جائے گا۔ انسان پر اسی ابدی، سرمدی اور جاودانی روح کی اطاعت فرض ہے کیونکہ ساری کائنات اسی کی درگاہ میں سربسجود رہتی ہے۔ انسان، کائنات اور زمان و مکان اگرچہ باعتبارِ صورت مختلف ہیں لیکن بلحاظ خلقت ان میں ایک ربط پایا جاتا ہے اور وہ روحِ لازوال ان کا سرچشمہ اور مبداء ہے، اس بنا پر ہر قسم کی پرستش اور ستائش اسی ابدی و سرمدی روح کو سزاوار ہے۔ قدرت نے انسان کے دل و دماغ کو جو صلاحیتیں مرحمت کی ہیں ان کا مرکز بھی یہی روح ہے، کائنات اور اس کی حقیقت پر جب ہم غور وخوض کرتے ہیں تو یہ امر مستحکم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا، اصنام (بت)، ملوک، فراعنہ، آتش اور آفتاب جنہیں لوگوں نے معبود قرار دیا ہے، لغو اور باطل ہیں اور ان کی پرستش عظمتِ انسانیت کی کھلی توہین ہے، عقل سلیم ان کی معبودیت کو کوئی وزن نہیں دیتی۔

دعوتِ رسالت کی یہی حقیقت تھی جس سے سابقون الاولون روشناس ہوئے۔ رسول کریم ﷺ کی زبان وحی ترجمان سے انہوں نے جو آیات سنیں ان میں بلاغت کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی اور یہ ایک ایسا معجزہ تھا جس پر ابدیت کی مہر ثبت تھی۔ دعوت رسالت کی حقیقت ان بلیغ آیات سے بڑی خوبصورتی وخوش اسلوبی کے ساتھ آشکارا ہوگئی۔ ان آیات کی بدولت سابقون الاولون کی روحانیت کا معیار اتنا بلند ہو گیا کہ وہ اس روح کریم سے قریب ہو گئے (جس کے دست قدرت میں ان کے خلق و امر کی زمام ہے) آنحضرت ﷺ نے انہیں نیکی ونیکوکاری کی شاہراہ پر گامزن کیا اور ساتھ ہی ان پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ بارگاہِ الٰہی میں قرب و وصول کی یہی سبیل ہے۔ اگر ان کی زندگی اصلاح وتقویٰ کے معیار پر پوری اتری تو انہیں اس خیر کی جزا ملے گی، بروز جزا ہر شخص کو اس کے اعمال کا وہ صلہ ملے گا جس کا وہ مستحق ہے۔

فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ۞ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۞

(سورہ الزلزال: ۷۔۸)

''پس ہر انسان جو ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ بھی اس کی آنکھوں کے سامنے ہوگا اور جو ذرہ برابر بدی کا مرتکب ہوگا وہ بھی اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ ہوگا۔''

روحِ انسانی کے لئے اس سے اونچا مقام اور کیا ہوسکتا ہے۔ اگر انسان اس سادہ تعلیم سے فیض یاب ہو کر ایمان لائے اور اس کے مطابق عمل کرے تو اسے انسانیت کی معراج نصیب ہوسکتی ہے، اس مقصدِ اعلیٰ کے حصول کے لئے مصائب پر صبر سے کام لینا اور حق کے لئے جان لٹانے پر آمادہ رہنا ان لوگوں کے لئے کچھ زیادہ دشوار نہیں جن کے دل و دماغ کے شبستانوں میں ایمان و ایقان کی شمعیں فروزاں ہیں۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام

آنحضرت ﷺ اور ان کے رفقاء کی پامردی نے بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کو ان کی حمایت کے لئے اور بھی زیادہ آمادہ کر دیا تھا۔ ایک دن ابوجہل نے نبی کریم ﷺ کے پاس آ کر آپ کے اور آپ کے دین کے بارے میں نازیبا الفاظ کہے اور حقارت آمیز انداز میں گفتگو کی۔ آپ ﷺ نے اس سے منہ پھیر لیا اور جواب دیئے بغیر اس کے پاس سے چلے گئے۔ آپ کے رضاعی بھائی اور چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) قوی اور بارعب نوجوان تھے۔ آپ کو شکار کا بہت شوق تھا، آپ کی عادت تھی کہ جب شکار سے واپس آتے تو پہلے کعبہ کا طواف کرتے پھر گھر جاتے۔ اس روز شکار سے واپس آئے تو آپ نے سنا کہ ابوجہل نے رسول کریم ﷺ کی توہین کی ہے اور ان کی دل آزاری بھی، اس بات سے انہیں بڑا غصہ آیا۔ آپ سیدھے کعبہ پہنچے، راستے میں جو لوگ آپ کو ملے آپ نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ کعبے میں ابوجہل بھی موجود تھا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اس کے قریب پہنچ کر اس زور سے اس کے سر پر کمان دے ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ بنی مخزوم کے کچھ لوگ ابوجہل کی مدد کے لئے اٹھنا چاہتے تھے لیکن ابوجہل نے انہیں روکا اور یہ اعتراف کیا کہ واقعی میں نے (حضرت) محمد (ﷺ) سے نازیبا سلوک کیا ہے۔ اس کے بعد حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ایمان لے آئے اور آنحضرت ﷺ سے عہد کیا کہ میں آپ ﷺ کی نصرت و حمایت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھوں گا۔

عتبہ بن ربیعہ کی سفارت

قریش اپنی سازشوں اور منصوبوں میں ناکام رہے۔ آنحضرت ﷺ کے پیروؤں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا کسی مصیبت اور کسی تکلیف نے مسلمان کو دینِ حق سے برگشتہ نہیں کیا۔ وہ بدستور نمازیں ادا کرتے اور آنحضرت ﷺ کی ہدایات پر عمل پیرا رہتے تھے۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر،

قریش نے ارادہ کیا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کو دعوتِ حق سے باز رکھنے کے لئے دوسرے طریقہ سے آمادہ کیا جائے۔ قریش کو یہ معلوم نہ تھا کہ دعوتِ رسالت کا ایک واضح نصب العین اور مفید مقصد ہے اور اسے سیاسی یا مادی اغراض سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ بہر حال عتبہ بن ربیعہ نے جو امرائے عرب میں سے تھا ایک اجتماع میں قریش سے کہا میں (حضرت) محمد (ﷺ) سے براہ راست گفتگو کرنا چاہتا ہوں، ان کے سامنے میں چند چیزیں پیش کروں گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی ایک چیز پر رضا مند ہو جائیں اور جو چیز انہیں پسند ہو وہ انہیں دے دی جائے۔ اس صورت میں قریش کو اس کشمکش سے نجات مل سکتی ہے۔

عتبہ بن ربیعہ آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچا اور اس نے کہا کہ آپ حسب ونسب کے اعتبار سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ آپ کی دعوت سے لوگوں میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں، اس پر آپ ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں میں چند چیزیں پیش کرتا ہوں، بہت ممکن ہے آپ ان میں سے کسی ایک پر مطمئن ہو جائیں، سنئے۔

(الف) اگر اس دعوت سے آپ کا مقصد، حصولِ دولت ہے تو ہم اپنے اموال میں سے آپ کو اتنا کچھ دینے کے لئے تیار ہیں کہ آپ سب سے زیادہ متمول انسان شمار کئے جائیں گے۔

(ب) اگر قیادت مطلوب ہے تو ہم آپ کو اپنا قائد تسلیم کیے لیتے ہیں اور کوئی کام آپ کی رائے اور آپ کے مشورہ کے بغیر نہیں کریں گے۔

(ج) اگر آپ ہم پر حکمران بننا چاہتے ہیں تو ہم اس حیثیت سے بھی آپ کی سربراہی تسلیم کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔

(د) اگر وہ شخص جو آپ کے پاس آتا جاتا ہے ہم زاد (جن) ہے اور آپ خود اس کے پنجے سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے تو ہم علاج معالجے اور اس سلسلہ میں مصارف علاج برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں تاکہ آپ کو شفا ہو جائے۔

آنحضرت ﷺ نے عتبہ بن ربیعہ کی پوری گفتگو سننے کے بعد سورۃ حم السجدہ کی ابتدائی ۳۸ آیات تلاوت فرمائیں۔[1] عتبہ نے ہمہ تن گوش ہو کر قرآنی آیات سنیں اور ان سے اس پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ رسول کریم ﷺ ایک ایسے انسان ہیں جنہیں مال و منال، جاہ و منصب اور قیادت و حکومت کی خواہش نہیں ہے، انہیں کوئی عارضہ بھی لاحق نہیں۔ جو بات کہتے ہیں اس کی تہ میں حقیقت چھپی ہوئی ہے۔ نیکی کی دعوت اور حق کی حمایت ان کے معمولات میں داخل ہے اور اس کلام کی تلاوت کرتے ہیں جو بلاغت میں اپنی مثال آپ ہے۔ کلام کا کلام اور معجزہ کا معجزہ۔

عتبہ بن ربیعہ قرآنی آیات سننے کے بعد قریش کے پاس آیا۔ اس عالم میں کہ اس پر آنحضرت ﷺ کی شخصی عظمت اور آپ ﷺ کی سحر بیانی کا اثر تھا۔ قریش عتبہ کے اس اقدام سے خوش نہ ہوئے اور نہ انہیں

Marfat.com

عتبہ کی یہ رائے پسند آئی کہ

"ہم (حضرت) محمد (ﷺ) کو عرب کے حوالے کیے دیتے ہیں۔ اگر وہ مغلوب ہو گئے تو ہمیں ان سے نجات مل جائے گی اور اگر ان کو غلبہ نصیب ہوا تو مجد و شرف کا جو مقام انہیں نصیب ہوگا ہم بھی اس میں برابر کے شریک ہوں گے۔"

غرض قریش نے مسلمانوں کی ایذا رسانی پر از سر نو کمر باندھی لیکن خود رسول کریم ﷺ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کی حمایت کے سبب ان کے آزار اور ستم کوشیوں سے محفوظ تھے۔

ہجرتِ حبشہ

قریش نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا اور ان کے انسانیت سوز مظالم اس انتہا کو پہنچے کہ کسی مسلمان کو بھی امن و سکون کی زندگی نصیب نہ تھی اور قریش سے ہر وقت خطرہ تھا۔ ان حالات میں آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو ہجرت کی اجازت مرحمت فرمائی۔ مسلمانوں نے آپ سے دریافت فرمایا کہ ہم کس مقام کی جانب ہجرت کریں، ارشاد ہوا کہ حبشہ کا رخ کیا جائے، وہاں کا حاکم انصاف پسند ہے۔ اس کے قلمرو میں امن و عافیت کا امکان ہے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس مستقل عذاب سے نجات دے دے۔ غرض مسلمانوں کی ایک جماعت نے حبشہ کی جانب ہجرت کی۔

ہجرتِ حبشہ کی نوبت دوبار آئی۔ پہلی بار جس جماعت نے ہجرت کی تھی وہ گیارہ افراد پر مشتمل تھی جن میں چار خواتین بھی تھیں، یہ جماعت کچھ دنوں بعد یہ سن کر کہ مسلمان قریش کے مظالم سے محفوظ ہو گئے ہیں مکہ واپس آ گئی تھی (اس کی تفصیل آئندہ آئے گی) یہاں آ کر اس نے دیکھا کہ قریش کے مظالم میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو چکا ہے۔ بعد ازاں ایک اور جماعت جس میں بچوں اور عورتوں کے علاوہ اسی افراد شریک تھے، عازم حبشہ ہوئی اور ہجرتِ مدینہ کے آغاز تک اس کا قیام حبشہ ہی میں رہا۔ ہجرتِ حبشہ سب سے پہلی ہجرت تھی۔

حیاتِ محمد ﷺ پر جو شخص مؤرخانہ بصیرت سے غور و خوض کرتا ہے، اسے اس سوال کا حق پہنچتا ہے کہ آیا ہجرتِ حبشہ کے حکم سے آنحضرت ﷺ کا مقصد محض یہ تھا کہ مسلمان قریش کے مظالم سے محفوظ رہیں یا اس کے سوائے کوئی اور غرض بھی تھی۔ نبی کریم ﷺ کی سیرت کے مطالعہ سے یہ چیز آشکار ہو جاتی ہے کہ آپ منصب رسالت اور روحانی عظمت کے باوصف ایک دقیقہ رس مدبّر اور ایک بالغ نظر سیاستدان بھی تھے۔ اس بنا پر ہم آسانی سے اس حقیقت کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مسلمانوں کو ہجرتِ حبشہ کا حکم کیوں دیا تھا۔

دربارِ نجاشی میں قریش کے قاصد

ہجرتِ حبشہ کے سلسلہ میں جو صورتِ حال پیش آئی اس سے اس سوال کی تائید ہوتی ہے۔ قریش نے

Marfat.com

مہاجرین حبشہ کے اس اقدام کو بڑی اہمیت دی اور فوراً یہ کیا کہ دو شخصوں کو بیش قیمت تحفے تحائف دے کر نجاشی کی خدمت میں بھیجا، اس خیال سے کہ بادشاہ مسلمانوں کو ان کے حوالے کر دے۔ ان ایام میں اہل حبشہ مسیحی تھے اس لئے قریش کو یہ مطلق اندیشہ نہ تھا کہ حبشی اسلام قبول کر لیں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر قریش نے اپنے قاصد کس مقصد اور کس غرض سے روانہ کیے تھے؟ کیا انہیں یہ اندیشہ تھا کہ نجاشی مسلمانوں کی باتوں سے متاثر ہو کر ان کی حمایت پر کمر بستہ ہو جائے گا، اور پھر اس سے نبی کریم ﷺ کو اتنی قوت حاصل ہو جائے گی کہ وہ عرب میں اپنے دین کی تبلیغ وسیع پیمانے پر کر سکیں گے یا یہ خطرہ تھا کہ مسلمان، حبشہ میں رہ کر طاقت حاصل کر لیں گے اور کچھ مدت کے بعد نبی کریم ﷺ کی مدد کے لئے کافی ساز و سامان کے ساتھ مکہ کو ان کی واپسی ہو گی۔

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ (بزمانہ کفر) اور عبداللہ بن ابی ربیعہ قریش کی طرف سے پیغام لے کر نجاشی کے دربار میں پہنچے اور تحفے تحائف پیش کرنے کے بعد یہ درخواست کی کہ مہاجرین اسلام کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ ان قاصدوں نے کہا کہ

> ''اے بادشاہ! چند گمراہ نوجوان ہمارے یہاں سے فرار ہو کر تیرے ملک میں آ بسے ہیں۔ یہ لوگ ہمارے دین سے منہ موڑ بیٹھے ہیں اور انہوں نے تیرا دین بھی قبول نہیں کیا ہے بلکہ ایک نیا دین گھڑ لیا ہے جس سے نہ ہم آشنا ہیں نہ تو۔ اکابر قوم نے ہمیں بھیجا ہے کہ ان لوگوں کو اپنے ہمراہ واپس لے جائیں اور وہی اس کی مصلحت سمجھتے ہیں۔''

قریشی قاصدوں نے نجاشی کے درباریوں سے وعدہ لیا تھا کہ وہ مہاجرین کی حوالگی کے مطالبے کی حمایت کریں گے اور نجاشی کو ان کی باتوں کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیں گے لیکن نجاشی اس بات پر رضامند نہ ہوا۔ اس نے کسی کو بھیج کر مسلمانوں کو دربار میں طلب کیا۔ جب مسلمان دربار میں حاضر ہوئے تو نجاشی نے ان سے پوچھا کہ تمہارا ایسا کون سا دین ہے جو میرے اور دوسروں کے دین سے میل نہیں کھاتا؟

حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی تقریر

قاصدانِ قریش نے مسلمانوں کے دین سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان کے جواب میں مسلمانوں کی ترجمانی کے فرائض ادا کرتے ہوئے حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے یہ تقریر کی:

> ''بادشاہ! ہم پر ایک تاریک دور گذرا ہے۔ اس وقت ہماری جہالت کا یہ عالم تھا کہ ایک خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے تھے اور خود ساختہ پتھروں کی پوجا ہمارا شعار تھا۔ مردار خواری، زنا کاری، قتل و غارت، قطع رحمی ہمارا آئے دن کا مشغلہ تھا۔ ہمسایوں کے حقوق سے ہم بیگانہ تھے، رحم و انصاف سے ہم ناآشنا تھے اور حق و باطل کے امتیاز پر

Marfat.com

ہماری نظر نہ تھی۔ غرض ہماری زندگی سرتاسر درندوں کی سی زندگی تھی، قوی، ضعیف کو کچلنے اور توانا، ناتوانوں کو ہضم کر لینے کو اپنے لیے باعث فخر اور طغرائے امتیاز سمجھتا تھا۔

رحمت خدا کا کرشمہ دیکھیے کہ اس نے ہم میں ایک عظیم الشان پیغمبر مبعوث کیا جس کے نسب سے ہم واقف ہیں، جس کی صداقت، امانت، عصمت پر دوست و دشمن دونوں گواہ ہیں جس کی قوم نے اسے محمد الامین کا لقب دیا۔ وہ آیا اور اس نے ہم کو خدا کی توحید کا درس دیا، خدائے واحد کی جانب بلایا۔ اس نے بتایا کہ خدا کا کوئی سہیم وعدیل نہیں ہے، وہ شرک سے پاک ہے، بت پرستی جہالت کا شیوہ ہے، اس لئے قابل ترک ہے اور صرف خدائے واحد کی عبادت، حق عبدیت ہے۔ اس نے ہم کو حق گوئی اور صداقت شعاری کی تلقین کی اور صلہ رحمی کا حکم فرمایا، ہمسایوں اور کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی۔ قتل وغارت کی رسم بد کا خاتمہ کیا، زنا کاری کو حرام اور فاحش کہہ کر اس ننگ انسانیت عمل سے ہم کو نجات دلائی۔ نکاح میں محارم اور غیر محارم کا فرق بتایا، جھوٹ بولنے اور ناحق مالِ یتیم کھانے کو حرام قرار دیا، نماز اور خیرات وصدقات کی تعلیم دی اور ہر حیثیت سے ہم کو حیوانیت کے قعرِ مذلت سے نکال کر انسانیت کبریٰ کے مرتبہ و مقام پر پہنچایا۔

بادشاہ! ہم نے اس مقدس تعلیم کو قبول کیا اور اس پر صدقِ دل سے ایمان لائے۔ یہ ہے ہمارا قصور جس کی بدولت مشرکین کا یہ وفد تجھ سے مطالبہ کرتا ہے کہ تو ہمیں ان کے حوالے کر دے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم توحید سے منہ موڑ کر بت پرستی اختیار کر لیں اور برے کاموں کو اچھا جانیں۔ مکہ میں جب ان لوگوں کی زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو ہم نے اے بادشاہ تیرے ملک کا رخ کیا اور یہاں پناہ لی۔

نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر سننے کے بعد یہ فرمائش کی کہ تمہارے پیغمبر ﷺ پر جو کچھ نازل ہوا ہے۔ اس میں سے کچھ مجھے بھی سناؤ۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے سورۂ مریم کی تلاوت شروع کی، یہاں تک کہ وہ اس مقام پر پہنچے:

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝۲۹ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝۳۰ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝۳۱ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ ۫ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۝۳۲ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ۝۳۳ (سورۂ مریم: ۲۹ تا ۳۳)

Marfat.com

"پس حضرت مریمؑ نے حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا کہ ہم اس بچے سے جو ابھی گہوارے میں ہے کس طرح بات کریں؟ حضرت عیسیٰؑ نے کہا میں اللہ کا بندہ ہوں، خدا نے مجھ پر کتاب نازل کی ہے اور مجھے پیغمبری سے نوازا ہے، میں جہاں کہیں بھی ہوں مجھے مبارک کیا ہے اور جب تک میں زندہ رہوں نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے اور اپنی والدہ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ مجھے ظالم اور شقی نہیں ٹھہرایا۔ سلامتی ہے میرے لیے اس روز جب میں پیدا ہوا اور اس روز جب میں مروں گا اور اس روز جب مجھے دوبارہ زندہ کیا اور اٹھایا جائے گا۔"

نجاشی اور درباریوں کا جواب

جب نجاشی کے درباریوں نے یہ آیات جو آیات انجیل کے موافق و مطابق تھیں سنیں تو وہ کہنے لگے کہ اس کلام کا سرچشمہ وہی ہے جہاں سے حضرت عیسیٰؑ پر کلام نازل ہوا تھا۔ نجاشی نے کہا: یہ کلام اسی کلام سے نازل ہوا ہے جہاں سے حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوا تھا۔ بعد ازاں سفیرانِ قریش سے کہا، تم لوگ واپس جاؤ، خدا کی قسم میں ان مسلمانوں کو تمہارے حوالے ہرگز نہیں کروں گا۔ دوسرے دن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ (بزمانہ کفر) پھر نجاشی کے پاس آئے اور کہا کہ مسلمان حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کے بارے میں عجیب باتیں کہتے ہیں، کسی کو بھیج کہ مسلمانوں کو طلب کیجئے اور ان سے دریافت کیجئے کہ وہ کیا کہتے ہیں جب مسلمان نجاشی کے پاس آئے تو اس کے سوال پر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کے بارے میں وہی کچھ کہتے ہیں جو ہمارے پیغمبر ﷺ نے کہا ہے، ہمارے پیغمبر ﷺ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں، روح اللہ اور وہ کلمۃ اللہ ہیں جس کا القا حضرت مریمؑ کو بحالت دوشیزگی ہوا۔ یہ بات سن کر نجاشی بہت خوش ہوا اور اس نے ایک چھڑی اٹھا کر زمین پر لکیر کھینچی اور کہا: میرے اور تمہارے دین میں اس سے زیادہ فرق نہیں۔ اس واقعہ کے بعد نجاشی پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ مسلمان حضرت عیسیٰؑ اور ان کے دین کے قائل ہیں اور خدا کی پرستش ان کا شعار ہے۔

مسلمان نجاشی کے پاس امن وسکون سے رہے یہاں تک کہ انہیں یہ پتہ چلا کہ قریش کی آتش غیظ و غضب سرد پڑ گئی ہے۔ انہوں نے یہ مناسب خیال کیا کہ پھر مکہ واپس ہوں چنانچہ جب یہ مہاجرین مکہ آئے تو آنحضرت ﷺ ابھی مکہ ہی میں مقیم تھے۔ ان مہاجرین نے جب یہ دیکھا کہ قریش ابھی اپنے ظلم وستم سے باز نہیں آئے تو انہوں نے پھر حبشہ کا رخ کیا۔ اس مرتبہ عورتوں اور بچوں کے علاوہ مہاجرین کی یہ جماعت اسی افراد پر مشتمل تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا دونوں ہجرتیں قریش کے جور وستم سے بچنے کے لئے تھیں یا ان کی تہ میں کوئی اور مقصد تھا؟

Marfat.com

ہجرتِ حبشہ کے حوالے سے خدشات کی حقیقت

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو یہ اطمینان کیسے ہو گیا کہ حبشہ میں مہاجرین پر عیسائیت کا کوئی اثر نہ ہوگا (ان ایام میں اہل حبش عیسائیت کے پیرو تھے اور سرزمین حبش، حجاز کے مقابلے میں زیادہ زرخیز تھی) اور یہ کہ اہل حبش کے طرز معاشرت کی ان پر پرچھائیں نہیں پڑے گی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مسلمان مہاجر نے حبش میں جا کر عیسائیت قبول کر لی تھی۔ اس لئے دوسرے مسلمانوں کے بارے میں بھی یہ سوال قرین قیاس تھا۔ مزید برآں اس زمانے میں آنحضرت ﷺ کو دشمنوں کے مقابلے میں اپنے پیروؤں کی حمایت کے لئے کافی وسائل حاصل نہ تھے۔ بہر حال قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال آپ کے ذہن میں پیدا ہوا ہوگا لیکن آپ نے اس احتمال کو چنداں اہمیت نہیں دی اور اپنی جگہ مطمئن رہے کہ عیسائیت کی چھاپ مسلمانوں کے عقائد پر نہیں پڑے گی۔ ان ایام میں اسلام ایک نوشگفتہ پھول کی مانند پاک اور نسیم سحر کی طرح بے آلائش تھا۔ اس کے برعکس عیسائیت کا حال حبش میں بھی عرب سے کچھ مختلف نہ تھا۔ اس کے عقائد مابہ النزاع بنے ہوئے تھے۔ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی خدائی کے قائل اپنے عقیدہ کے مخالفین سے دست و گریبان رہتے تھے۔ لہٰذا یہ اندیشہ نہ تھا کہ وہ مسلمان جو رسالت کے صاف و شفاف چشمے سے سیراب ہو چکے ہیں ان لوگوں کا اثر قبول کریں گے جنہیں اختلافی مباحث، مناظرات و مناقشات کے سوائے اور کوئی کام نہیں۔

اکثر مذاہب، مرورِ ایام کے ساتھ اوہام سے آلودہ ہو کر بت پرستی کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں، ہر چند وہ بت پرستی واضح اور روشن نہیں ہوتی تاہم ہر صورت بت پرستی ہوتی ہے۔ اسلام بت پرستی کا دشمن اور سخت مخالف تھا۔ اس زمانے میں عیسائی بعض پیشوایانِ دین کو اس قدر بڑھا چڑھا رہے تھے کہ اسلام اس سے سخت بیزار تھا کیونکہ اسلام کا مقصود روح انسانی کو اوہام اور عقائد خام کی قید سے نکال کر انسانیت کی بلندیوں تک پہنچانا تھا۔ مسلمانوں کا عقیدہ تھا کہ انسان اور خدا کے درمیان نیکو کاری اور پرہیز گاری کے سوائے کوئی اور واسطہ نہیں، اسلام نے بتوں، کاہنوں اور غیب کی خبر دینے والوں کی ہمہ دانی کی قلعی کھول دی۔

روح انسانی اور وجودِ کلی کے اختلاط میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ روح ایک نور ہے اور اس لیے زمان و مکان کی حدود و قیود اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ اگر بندہ صالح ہے تو اس کے اور خدا کے درمیان قرابت قریبہ کا رشتہ ہے اور خدا کے سوائے کوئی اور طاقت ایسی نہیں ہے جو بندے پر اختیارِ کلی رکھتی ہو۔ اصحابِ دولت و ثروت زیادہ سے زیادہ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں یہی کر سکتے ہیں کہ جسم کو کسی تکلیف میں مبتلا یا لذتوں سے محروم کر دیں یا انتہا یہ ہے کہ ہلاک کر ڈالیں لیکن یہ بات کسی متمول، قوی اور بدکردار کے بس کی نہیں کہ وہ کسی کی روح پر بھی دست اندازی کر سکے۔ روح کے مالک و خالق کا منشا یہ ہے کہ روح مادی ماحول اور زمان

Marfat.com

و مکان کی قیود سے آزاد ہو کر وجودِ کلی سے وابستہ و پیوستہ ہو جائے۔ انسان بروزِ حساب اپنے اعمال کی جزا یا سزا پائے گا۔ اس روز نہ بیٹا کوئی فائدہ پہنچا سکے گا نہ باپ، اُخروی زندگی میں کسی کی دولت، طاقت اور فصاحت سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ البتہ نیکوکار کو نیکی کی جزا اور بدکار کو بدی کی سزا ملے گی۔ اس دن تمام انسان اول سے آخر اور ابتدا سے انتہا تک جمع ہوں گے، وہ دن عدل و انصاف اور حساب و کتاب کا دن ہوگا۔ کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ہر شخص اپنے اپنے اعمال کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ ان امور کے پیش نظر یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ آنحضرت ﷺ ان مسلمانوں کے بارے میں فریب خوردگی کا احتمال کرتے جنہیں آپ ﷺ بلند اور روشن حقائق سے آگاہ کر چکے تھے۔ علاوہ ازیں آپ کی محبوب شخصیت اور ایمانی طاقت ہمیشہ مسلمانوں کے پیش نظر رہتی تھی۔ ایمان، حکمت، عدالت، صلاح و تقویٰ اور حق و صداقت کی جو خصوصیتیں آپ کی شخصیت میں ضم تھیں ان کی روشنی میں آپ کے پیرو صراطِ مستقیم پر گامزن رہتے تھے۔ انہی اسباب کی بنا پر آپ ﷺ کو یہ یقین اور یہ اعتماد تھا کہ آپ کے پیرووں کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہیں آئے گی۔

نجاشی کی قلمرو میں مسلمانوں کو مذہبی رسوم کی بجاآوری میں پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ مزید برآں ان کی زندگی بھی امن وسکون سے بسر ہو رہی تھی۔ قریش کو جب اس صورت حال کا علم ہوا تو آہستہ آہستہ انہوں نے بھی اپنی روش بدلی اور مسلمانوں کی ایذا رسانی میں بھی کمی کر دی۔ مسلمانوں کی یہ شان تھی کہ وہ مصائب پر صبر و تحمل کے نہ صرف عادی تھے بلکہ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ بارگاہ الٰہی میں قرب کا وسیلہ بھی یہی شیوۂ صبر ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام

ظہورِ اسلام کے وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی عمر ۳۵ سال تھی، آپ کو اس عمر میں شراب سے لگاؤ اور ہر قسم کی تفریحات و تعیشات سے اُنس تھا، زور آور، اولوالعزم، تند خو اور تیز مزاج تھے۔ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ مہر و مروت سے پیش آتے تھے اور مسلمانوں کو ستانے میں انتہا پسند واقع ہوئے تھے لیکن جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت نے حبشہ کو ہجرت کی اور نجاشی کے ملک میں پناہ لی ہے تو آپ کو مسلمانوں کی غربت اور دور افتادگی کا دلی صدمہ ہوا۔

ایک دن نبی کریم ﷺ صفا کے قریب (دار بنی ارقم میں) ایک مکان میں رونق افروز تھے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے۔ حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ کو اس بات کا پتہ چلا تو اس ارادہ سے آپ نے اس مکان کا رخ کیا کہ آج میں رسول کریم ﷺ کو (نعوذ باللہ) قتل کر کے قریش کی خوشنودی حاصل کروں گا۔ راستہ میں آپ کی ملاقات نعیم بن عبداللہ سے ہوئی، انہوں نے قرائن سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارادہ معلوم کر کے یہ کہا، آپ کیا نادانی کر رہے ہیں، کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ

Marfat.com

کریم ﷺ کے قتل کے بعد بنی عبد مناف آپ کو زندہ چھوڑیں گے۔ اپنے قرابت داروں کو کیوں نہیں روکتے؟ انہی ایام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت خطاب اور ان کے شوہر حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نعیم بن عبداللہ کی زبانی اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ نے اپنے بہنوئی کے مکان کا رخ کیا، ان کے مکان میں داخل ہونے سے پہلے کوئی شخص اندر قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا۔ اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قدموں کی آہٹ جو پائی تو تلاوت کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے قرآن کریم کا صحیفہ کہیں چھپا دیا۔

حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ نے گھر میں داخل ہوتے ہی کڑکتی ہوئی آواز میں اپنی بہن سے دریافت کیا، یہ کیا پڑھا جا رہا تھا؟ حضرت فاطمہ اور ان کے شوہر حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے کہا۔ یہاں تو کوئی بھی کچھ نہیں پڑھ رہا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر کہا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ تم لوگ (حضرت) محمد (ﷺ) کے پیرو ہو گئے ہو۔ یہ کہہ کر حضرت سعید پر حملہ کرنا چاہا لیکن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے شوہر کی حمایت کے لئے سامنے آ گئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا۔ آخر حضرت سعید رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا، آپ جو چاہیں کریں، ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے بہن اور بہنوئی کی یہ استقامت حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ پر اثر کیے بغیر نہ رہ سکی۔ آخر آپ نے اپنی بہن سے کہا کہ اچھا جو کچھ پڑھا جا رہا تھا مجھے بھی دکھاؤ۔ حضرت فاطمہ نے قرآن کا صحیفہ ان کے حوالے کر دیا۔ اس کے پڑھتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا اور آپ اپنے اقدام پر بے حد نادم ہوئے۔ قرآنی آیات نے ان کے دل و دماغ کی کیفیتیں بدل دیں، جسم، ان تصورات سے جو پہلے ان کے ذہن میں جاگزیں تھے، لرز اٹھا۔ مؤثر الفاظ میں اپنی بہن اور بہنوئی کی تالیف قلب کر کے ان کے گھر سے باہر نکلے، اس عالم میں کہ آپ کے دل میں سوز و گداز اور روح میں کیف و سرور کے کوندے لپک رہے تھے۔

حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ اس عالم کیف و مستی میں وہاں پہنچے جہاں ایک مجلس میں آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب موجود تھے۔ آپ نے مجلس میں شرکت کی اجازت طلب کی اور اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ آپ کے قبولِ اسلام سے مسلمانوں کی قوت میں چند در چند اضافہ ہو گیا۔ قریش کے بازو ٹوٹ گئے اور انہیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ اب ہمیں کیا راہِ عمل اختیار کرنی چاہئے۔ آج سے قریش اور مسلمانوں کے مؤقف میں تبدیلی آ گئی۔ ہر دو جانب حالات نے پلٹا کھایا۔ ایک فریق (قریش) کے زوال کے محضر پر قدرت نے مہر ثبت کر دی اور دوسرے فریق کے لئے غلبہ و اقتدار کا وثیقہ تحریر کیا۔ گویا یہ کہنا چاہئے کہ ہجرت مدینہ کے بعد اسلام کو جو سیاسی اقتدار نصیب ہوا اس کا پیش خیمہ حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام ہی ہے۔

Marfat.com

حواشی

۱۔ یہاں ان آیات قرآنی (سورہ النور ۳۶۔۳۷) کی طرف اشارہ ہے:

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ ۙ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝

ان گھروں میں جن کے بلند کرنے اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، وہاں صبح وشام اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرو۔ ایسے لوگ جنہیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ پلٹ ہو جائیں گی۔

۲۔ بحوالہ سیرت ابن ہشام۔

*

باب 5

داستانِ غرانیق

مہاجرینِ حبشہ کی واپسی

مسلمان مہاجرین حبشہ میں تین ماہ مقیم رہے۔ اس اثناء میں حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ حبشہ میں مسلمانوں کو یہ پتہ چلا کہ قریش نے نبی کریم ﷺ اور ان کے پیروؤں کی ایذا رسانی ترک کر دی ہے۔ ایک روایت کے مطابق اکثر مہاجرین اور دوسری کے مطابق تمام مہاجرین نے مکہ کا دوبارہ رخ کیا لیکن جب انہیں یہاں آ کر معلوم ہوا کہ قریش کے مظالم پہلے سے بھی زیادہ ہیں تو ان میں سے کچھ لوگوں نے پھر حبشہ کے لئے رخصت سفر باندھا اور بعض نے مکہ میں مخفی طور پر رہائش اختیار کر لی۔ بعض کی روایت یہ ہے کہ مہاجرین اپنے ہمراہ کچھ اور مسلمانوں کو لے کر حبشہ چلے گئے تھے اور ہجرتِ مدینہ تک ان کا قیام حبشہ میں رہا۔ ان حالات میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قریش کی مسلم آزاری میں کمی اور حبشہ سے مسلمانوں کی واپسی کا کیا سبب تھا؟

اسے سمجھنے کے لئے ایک نظر ہم داستانِ غرانیق پر ڈالتے ہیں جسے ابن سعد نے طبقات الکبریٰ میں اور طبری نے تاریخ الرسل والملوک میں اور ان کے علاوہ متعدد مؤرخینِ اسلام اور سیرت نگاروں نے نقل کیا ہے۔ مستشرقین نے بھی اپنی تصانیف میں اس داستان کا حوالہ دیا اور اس کی تائید کی ہے۔

داستانِ غرانیق کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے: جب آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھا کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان مغائرت کی خلیج وسیع ہوتی جا رہی ہے اور پیروانِ اسلام پر ان کے مظالم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے تو آپ نے اپنے دل میں یہ آرزو کی، کاش مجھ پر کوئی ایسی آیت یا سورۃ نازل نہ ہو جو قریش کو ناگوارِ خاطر گذرے، اس کے بعد سے آپ ﷺ قریش سے ملنے جلنے لگے اور قریش بھی ان سے قریب سے قریب تر ہوتے گئے۔ ایک دن کعبہ کے قریب ایک صحبت میں آپ نے قریش کو سورہ ''والنجم'' پڑھ کر سنائی جب آپ اس آیت پر پہنچے۔

أَفَرَءَيْتُمُ ٱللَّٰتَ وَٱلْعُزَّىٰ ﴿١٩﴾ وَمَنَوٰةَ ٱلثَّالِثَةَ ٱلْأُخْرَىٰٓ ﴿٢٠﴾ (سورۂ نجم: ۱۹، ۲۰)

''تم نے لات وعزیٰ اور وہ جو تیسری دیوی منات ہے، ان کی بے بسی پر بھی غور کیا۔''

Marfat.com

اس کے بعد یہ الفاظ آپ کی زبان سے نکلے: تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلَا وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى (یہ حسین اور بلند مرتبہ بت ہیں اور ان کی شفاعت کی امید کی جا سکتی ہے)۔

ان الفاظ کے بعد آپ ﷺ نے سورۃ والنجم آخر تک پڑھی اور جب اختتام پر سجدہ کیا تو جتنے بھی حاضرین تھے سربسجود ہو گئے۔ کسی نے بھی سجود میں تامل نہیں کیا۔ نبی کریم ﷺ نے جو کچھ پڑھا تھا اس سے قریش بے حد مسرور اور خوش ہوئے اور یہ کہنے لگے کہ ہم بھی اس بات کے قائل ہیں کہ خدا زندہ کرنے والا اور مارنے والا ہے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ہمارے معبود اس کی بارگاہ میں سفارش کرتے ہیں۔ مگر اب آپ ﷺ بھی ایک حد تک اس بات کے قائل ہو گئے ہیں لہٰذا ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ اس طرح آنحضرت ﷺ اور قریش کے درمیان جو اختلاف تھا ختم ہو گیا اور اس بات کی شہرت عام ہو گئی، یہاں تک کہ حبشہ میں بھی لوگوں کو اس بات کا پتہ چلا۔ اس خیال سے کہ قریش اور مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں رہا ہے مسلمان مہاجرین جو وہاں مقیم تھے مکہ کو واپس ہوئے۔ جب مکہ کے نزدیک ان کا قافلہ پہنچا تو چند کنانیوں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ان سے مکہ کے حالات دریافت کیے۔ کنانیوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے قریش کے معبودوں کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا تو قریش ان کے پیرو ہو گئے تھے لیکن جب وہ اپنے کہے ہوئے الفاظ سے پھر گئے اور پھر ان کے معبودوں کو برا بھلا کہنے لگے تو قریش نے بھی پھر مسلم آزاری کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ ان حالات سے مسلمانوں کو تردد ہوا اور انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب کیا صورت اختیار کرنی چاہیے۔ چونکہ انہیں اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کا بے حد اشتیاق تھا اس لئے انہوں نے مجبوراً مکہ کا رخ کیا۔

اس چیز کا سبب کہ آنحضرت ﷺ اپنے میں مفروضہ قول سے جو معبودانِ قریش سے متعلق کہا تھا، کیوں پھر گئے، داستانِ غرانیق کی مختلف روایات میں طرح طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ قریش کی یہ بات کہ اب جبکہ آپ ہمارے معبودوں کے قائل ہو گئے ہیں، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ نبی کریم ﷺ پر شاق گذری اس کے بعد آپ اپنے مکان ہی میں رہے یہاں تک کہ رات کے وقت حضرت جبرئیل امین آئے آنحضرت ﷺ نے سورہ والنجم پڑھ کر سنائی۔ جب آپ تلک الغرانیق العلا کے جملہ پر پہنچے تو جبرئیل امین نے کہا کہ یہ جملے میں نہیں لایا ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے کہا کہ میں نے ان دو جملوں کو خدا سے منسوب کیا ہے۔ اس کے بعد وحی نازل ہوئی۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ۝ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝ (سورۃ الاسراء: ۷۳ تا ۷۵)

''(اے رسول) قریب تھا کہ یہ لوگ (مشرکین) اس سے جو ہم نے آپ پر نازل کیا برگشتہ کر دیتے تا کہ آپ اس کے سوا کوئی بات ہم سے منسوب کریں اور وہ لوگ آپ کو اپنا دوست بنالیں۔ اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ آپ ان کی طرف مائل ہو جاتے۔ اس صورت میں ہم دونوں جہاں کا دو چند عذاب آپ کو چکھاتے اور ہمارے مقابلہ میں کوئی بھی مددگار آپ کو نہ ملتا۔''

ان آیات کے نزول کے بعد آنحضرت ﷺ پھر اپنے مسلک کے مطابق معبودانِ قریش کی مذمت کرنے لگے اور قریش نے پھر مسلم آزاری کا وطیرہ اختیار کیا۔

حقیقت کیا ہے؟

یہ ہے داستانِ غرانیق جسے مفسرین اور مصنفین سیرت نے اپنے اپنے انداز میں نقل کیا ہے اور مستشرقین نے بھی اس پر اپنا زورِ بیان صرف کیا ہے لیکن یہ داستان اتنی غیر مربوط اور اتنی مبہم ہے کہ ذرا سے غور سے اس کی بے سروپائی ظاہر ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں عصمت انبیا کی قرآنی حقیقت کی بھی اس سے نفی ہوتی ہے حالانکہ یہ چیز منجملہ لوازمِ نبوت و رسالت ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ کہ مسلمان مفسرین اور مصنفین نے بھی اس داستان کو اہمیت دی البتہ ابن اسحاق سے جب اس داستان کے بارے میں استفسار کیا گیا تو اس محدث و مفسر نے بلا تامل کہا کہ یہ داستان زنادقہ کی من گھڑت ہے، مگر جو لوگ اس داستان کی صحت کے قائل ہیں وہ محولہ بالا آیت کے علاوہ مندرجہ ذیل آیات اپنے موقف کی تائید میں پیش کرتے ہیں:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۝ (سورۃ الحج: ۵۲، ۵۳)

''اور ہم نے آپ سے پہلے جس قدر رسول اور نبی بھیجے سب کا معاملہ یکساں رہا۔ جونہی انہوں نے لوگوں کی ہدایت کے لئے کچھ فرمایا، شیطان نے ان کی اس تمنا میں لوگوں کے دلوں میں وسوسہ پیدا کر دیا مگر اللہ نے ابلیس کی دراندازی کا اثر مٹا کر اپنی نشانیوں کو اور زیادہ ابھار دیا کہ وہ تو سب کچھ جاننے والا اور صاحب حکمت ہے۔ شیطان کی وسوسہ اندازی میں یہ مصلحت تھی کہ وہ ایسے لوگوں کی آزمائش کا ذریعہ ثابت ہو سکے جو قبولِ صداقت کے لحاظ سے سنگدل واقع ہوئے ہیں اور بلاشبہ ایسے لوگ بڑی گہری مخالفت پر اترے ہوئے ہیں۔''

Marfat.com

بعض مفسرین نے تمنّٰی کے معنی قرأ کے لیے ہیں (یعنی پڑھا)۔ بعض کے خیال میں یہ لفظ اپنے معروف معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مفسرین کے یہ دونوں گروہ اور ان کی تائید میں مستشرقین بھی یہ کہتے ہیں کہ مشرکین مکہ نے جب پیروان اسلام پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا اور انہیں حد درجہ اذیتیں پہنچانے لگے یہاں تک کہ بعض مسلمانوں کو قتل کرنے سے بھی نہیں چوکے اور بعض کو چلچلاتی دھوپ، گرمی سے تپے ہوئے پتھروں پر بھی لٹایا جیسا کہ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا تو ان حالات میں آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو ہجرت حبشہ کی اجازت دے دی چونکہ آپ دل وجان سے اپنی قوم کی ہدایت کے خواہاں تھے اور آپ کو یہ فکر بھی دامن گیر رہتی تھی کہ انہیں کسی نہ کسی طرح بت پرستی کی قید سے آزاد کیا جائے۔ اس لیے جب آپ نے قریش کے مجمع میں سورۂ والنجم پڑھ کر سنائی تو غرانیق سے متعلق دو جملوں کا اضافہ کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب آپ نے سجدہ کیا تو تمام حاضرین جن میں قریش بھی تھے، آپ کی پیروی کے لئے بھی آمادہ ہو گئے کیونکہ آپ نے ان کے معبودوں کو ایک حد تک تسلیم کرلیا تھا۔

کتب سیرت وتفسیر میں جو روایت منقول ہے، سر ولیم میور نے اس کی تائید وتوثیق میں ایک دلیل پیش کی ہے جس سے اس کے نزدیک داستانِ غرانیق کی صحت مخدوش نہیں رہتی۔ وہ دلیل یہ ہے کہ ہجرت حبشہ کو ابھی تین ماہ سے زیادہ نہیں گذرے تھے اور مسلمان حبشہ میں نجاشی کی زیر سرپرستی امن وسکون سے زندگی بسر کر رہے تھے، اگر ان مہاجرین حبشہ کو یہ اطلاع نہ پہنچتی کہ آنحضرت ﷺ اور قریش میں میل جول ہو گیا ہے تو وہ محض اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کی خاطر مکہ کو واپسی کا اعادہ ہرگز نہ کرتے کیونکہ قریش زیادہ قوی تھے اور وہ مسلمان جو آپ ﷺ پر جان چھڑکتے تھے، اس قابل نہ تھے کہ اپنے آپ کو قریش کے ظلم وستم سے بچا سکتے اس لیے یہ ماننا پڑتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خود صلح کی طرح ڈالی اور یہی چیز داستانِ غرانیق کا سبب ہے۔

وہ اشخاص جو داستانِ غرانیق کی صحت کے قائل ہیں ان کے تمام دلائل بے بنیاد اور پادر ہوا ہیں۔ سر ولیم میور کی دلیل کے توڑ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حبشہ سے مسلمانوں کی مراجعت کے دو سبب تھے۔

(الف) مسلمانوں کی ہجرتِ حبشہ کے بعد حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے اور وہ بڑے جری اور حوصلہ مند تھے، اس بنا پر انہوں نے اپنے اسلام کو معرضِ اخفا میں نہیں رہنے دیا بلکہ کھلم کھلا اعلان کر دیا اور ہر اس شخص سے جو ان سے تعرض کرے، لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

(ب) مسلمانوں نے بھی ان کی تائید کی اور نماز جو پہلے کہیں دور جا کر پڑھا کرتے تھے، کعبہ کے قریب ادا کرنے لگے۔ قریش کو مسلمانوں کی روز افزوں طاقت اور شیرازہ بندی سے سخت تشویش لاحق ہوئی۔ اس وقت تک مختلف قبائل کے افراد، دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور یہ اندیشہ تھا کہ اگر انہیں ایذا دی گئی تو قبائل دینی اختلاف سے قطع نظر محض خاندانی عصبیت کی بنا پر جنگ کے لئے آمادہ ہو جائیں گے۔ اس اندیشہ نے قریش کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ رسول کریم ﷺ سے

Marfat.com

مقابلہ کے لئے کوئی ایسی راہ اختیار کریں جس میں خطرات کم سے کم ہوں۔ اسی کشمکش میں انہوں نے مسلمانوں کو ستانے کا سلسلہ ترک کر دیا چنانچہ جب مہاجرین حبشہ کو اس صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے مکہ کو واپسی کا ارادہ کیا۔

ان جملہ اسباب کے باوجود یہ ممکن تھا کہ مسلمان حبشہ سے واپسی میں متامل ہوتے لیکن انہی ایام میں ایک واقعہ اور پیش آیا جس کی بنا پر مہاجرین حبشہ کی مراجعت وطن ناگزیر تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ حبشہ میں بغاوت کی آگ پھوٹ پڑی۔ اس بغاوت کے بہت سے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ ایک گروہ نے نجاشی پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ اس نے مسلمانوں کی سرپرستی کے پردے میں اپنے دین سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ مسلمانوں کی یہ دلی خواہش تھی کہ نجاشی باغیوں پر غالب آئے لیکن وہ حبشہ میں نو وارد تھے، اس لئے بغاوت فرو کرنے میں حکومت کو مدد نہیں دے سکتے تھے۔ لہٰذا جب انہیں یہ پتہ چلا کہ قریش نے آنحضرت ﷺ سے صلح کر لی ہے تو انہوں نے بہتر یہی سمجھا کہ بغاوتِ حبش کی بھڑکتی ہوئی آگ سے بچ کر مکہ مکرمہ کا رخ کریں۔ اس سبب سے تمام مہاجرین یا ان میں سے بعض نے مکہ کی راہ لی۔ لیکن یہ ابھی منزلِ مقصود تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ قریش نے فیصلہ کیا کہ ہم نبی کریم ﷺ اور ان کے رفقا سے دوستانہ روابط قائم نہیں رکھیں گے۔ نیز یہ عہد بھی کیا کہ بنی ہاشم سے ہم ہر قسم کے معاشرتی تعلقات قطع کر دیں گے۔ اس عہد کی جو تحریر میں تھا، شرطیں یہ تھیں کہ ہم بنی ہاشم سے نہ تو نکاح بیاہ کریں گے اور نہ کسی قسم کا تجارتی لین دین ان سے ہوگا۔ اس طرح قریش کا یہ نیا اقدام پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا۔ مہاجرین حبشہ نے یہ نقشہ دیکھا تو حبشہ کو الٹے لوٹ گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دوسرے مسلمان بھی جو سفر کی طاقت و استطاعت رکھتے تھے ان کے ہمراہ ہو لئے، اس بار مہاجرین کی واپسی میں قریش نے شدید مزاحمت کی۔ اس لئے مہاجرین کو قریش کے ہاتھوں سخت ترین تکالیف پہنچیں۔

ان وجوہ و اسباب کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ مہاجرین حبشہ کی مراجعت وطن کا سبب قریش سے محض رسول کریم ﷺ کی صلح نہ تھی جیسا کہ سر ولیم میور کا خیال ہے بلکہ اس کا سبب عارضی صلح تھی جو مسلمانوں کی حمیت اور استقامت کے باعث ظہور میں آئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا دلیل سے داستانِ غرانیق کی صحت ثابت نہیں ہوتی۔

جن مسلمان مصنفین اور مفسرین نے آیات وَاِنْ كَادُوْ (الخ) اور وَمَآ اَرْسَلْنَا (الخ) سے مذکورہ بالا داستانِ غرانیق کی صحت پر صاد کیا ہے ان کے دلائل سر ولیم میور کی دلیل سے بھی زیادہ ضعیف ہیں۔ اول الذکر آیت کے ضمن میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ...... "اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ کرتے تو قریب تھا کہ آپ ﷺ ان کی جانب مائل ہو جاتے، اس صورت میں ہم دونوں جہاں کا دو چند عذاب آپ کو چکھاتے۔" اس مفہوم کے پیش نظر آیت مذکورہ سے مقصد کی وضاحت نہیں ہوتی۔ داستانِ غرانیق کا نچوڑ تو یہ ہے کہ رسول

Marfat.com

کریم ﷺ قریش کی جانب مائل ہو گئے تھے، قریش نے آپ کو فریب میں مبتلا کیا اور نبی کریم ﷺ نے ان کی رضامندی اور خوشنودی کے لئے تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ کا جملہ جو آیاتِ قرآن کا جزو نہ تھا خدا سے منسوب کردیا۔ آیت مذکورہ سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو ثابت قدم رکھا اور آپ قریش کی طرف مائل نہیں ہوئے۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ بعض کتب تفسیر میں ان آیات کی شانِ نزول کچھ اور بیان کی گئی ہے تو اس صورت میں بھی یہ ماننا پڑے گا کہ ان سے ایک ایسے مسئلے میں استدلال، جو عصمتِ انبیاء سے مناسبت نہیں رکھتا اور نبی کریم ﷺ کے حالات کے منافی ہے، درست نہیں۔

آیت وَمَا اَرْسَلْنَا (الخ) کا داستانِ غرانیق سے مطلق کوئی تعلق نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ان آیات میں تصریح موجود ہے کہ شیطان جو کچھ القا کرتا ہے خدا اس پر خطِ تنسیخ پھیر دیتا ہے اور اسے ان لوگوں کی آزمائش کا ذریعہ بنا دیتا ہے جن کی روحیں بیمار اور دل سخت ہو چکے ہیں۔ خدا اپنی آیات کو محکم کرتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔

داستانِ غرانیق کا علمی و تنقیدی محاکمہ

اب ہم اس داستان پر علمی تحقیق کی روشنی میں تنقید کرتے ہیں تاکہ اس کی نادرستی واضح ہو جائے۔ داستان کی بے سروپائی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس سلسلہ میں جن کلمات کا رسول کریم ﷺ کی زبان پر جاری ہونا ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں مختلف روایات میں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، کلمات یہ منقول کئے گئے ہیں۔ تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلَا اِنَّ شَفَاعَتُهُنَّ لَتُرْتَجٰى. بعض روایات کی رو سے یہ کلمات لفظی اختلافات کے ساتھ بایں طور نقل کیے گئے ہیں:

(۱) اَلْغَرَانِقَةُ الْعُلَا وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ تُرْتَجٰى

(۲) اِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ تُرْتَجٰى (تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ یا تِلْكَ الْغَرَانِقَةُ کا ذکر نہیں کیا گیا)

(۳) وَاِنَّهَا لَهِيَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلَا

(۴) وَاِنَّهُنَّ الْغَرَانِيْقُ الْعُلَا وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَهِيَ الَّتِي تُرْتَجٰى

بعض کتب احادیث میں ان کے علاوہ دوسری روایات بھی منقول ہیں، روایات کے اختلاف اور ان کے تعدد سے یہ چیز پایہ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے جیسا کہ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ یہ روایت بے دینوں نے وضع کی ہے اور اس سے ان کا ناپاک مقصد یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کی رسالت مشتبہ اور آپ کے اوپر نازل شدہ کلام کی صحت مخدوش ہو جائے۔

سورۂ والنجم کا سیاق و سباق

ایک اہم ترین دلیل جو اس داستان کی تردید میں پیش کی جاسکتی ہے، وہ سورۂ والنجم کا سیاق و سباق

Marfat.com

ہے۔ سورۂ والنجم کی آیات یہ ہیں۔

لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ⑱ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ⑲ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ⑳ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ㉑ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ㉒ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ㉓ (سورۂ نجم: ۱۸ تا ۲۳)

"بے شک اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ اور اے مشرکین تم تو صرف لات وعزیٰ کے مجسمے اور زیادہ سے زیادہ منات دیوی دیکھ کر ان کی خدائی پر تکیہ لگا بیٹھے ہو، اور تم نے یہ تقسیم بھی تو عجیب کی ہے کہ خدا کی جھولی میں تو بیٹیاں ڈال دیں اور اپنے لئے بیٹے پسند کر لئے۔ ارے! تمہارے ان لات وعزیٰ اور منات کی خدائی بھی کوئی حقیقت رکھتی ہے جسے تم نے اور تمہارے بزرگوں نے خود پر واجب کر رکھا ہے۔ کیا اللہ نے بھی ان کی خداوندی کی سند ارشاد فرمائی! (اے پیغمبر!) یہ لوگ یا تو ظن وگمان کے بندے ہیں یا اپنے نفس کے پجاری، باوجودیکہ ان کے پاس ان کے پروردگارِ حقیقی نے ہدایت (قرآن) نازل فرما دی۔"

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لات وعزیٰ صرف نام ہیں جو مشرکین اور ان کے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کوئی سند جواز نازل نہیں کی۔ جب یہ ایک حقیقت ہے تو پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ اس سورہ کے ضمن میں یہ بھی کہا گیا ہوگا۔

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلَا ○ اِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ یہ قضیہ عقل سلیم کے منافی ہے۔ اس بھونڈی ترتیب سے آیات میں تناقض آ جاتا ہے، یہ بات عقل تسلیم نہیں کرتی کہ آنحضرت ﷺ نے پہلے لات وعزیٰ اور منات کی مدح کی اور بعد کی آیات میں مذمت۔ ربط آیات کی روشنی میں قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ داستانِ غرانیق من گھڑت ہے اور بے دینوں نے اپنے مفاد کے پیش نظر اسے وضع کیا ہے اور اس کی صحت محض ان لوگوں نے تسلیم کی ہے جو طبعاً خلاف عقل اور حیرت انگیز باتوں پر یقین لے آتے ہیں۔

شیخ محمد عبدہٗ نے داستانِ غرانیق کی تردید میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ اصنام کے لئے غرانیق کے لفظ کا استعمال عربی نظم ونثر میں کبھی نہیں کیا گیا اور نہ کبھی یہ سننے میں آیا ہے کہ عرب میں کسی نے اپنے معبودوں کے متعلق غرانیق کے لفظ کا استعمال کیا۔ غرنوق یا غرنیق عربی میں سفید یا سیاہ فام مرغابی یا سفید فام جوان رعنا

Marfat.com

کے لئے مستعمل ہوا ہے اور ان میں سے کوئی معنی بھی معبودیت کے مفہوم سے مناسبت نہیں رکھتا۔

نبی کریم ﷺ کی صداقت شعاری

داستانِ غرانیق کی بے سروپائی کی واضح دلیل ہم آنحضرت ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے بھی پیش کر سکتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ایامِ طفلی اور عہدِ شباب میں کبھی جھوٹ نہیں بولا اور ابھی آپ نے اپنی عمر کی ۲۵ بہاریں بھی نہ دیکھی تھیں کہ لوگ آپ کو صادق و امین کہنے لگے تھے، آپ کی صدق مقالی مسلم تھی۔ جب بعثت کے بعد آپ ﷺ نے قریش سے فرمایا کہ ''اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں ایک فوج ہے تو کیا تم اسے باور کرلو گے؟'' قریش نے کہا، ہاں کیوں نہیں؟ ہم نے آج تک آپ کی زبان سے کوئی جھوٹ بات نہیں سنی۔ ایسا شخص جو ایامِ طفولیت سے دورِ کہولت تک راست گوئی میں مشہور رہا ہے، وہ کس طرح لوگوں کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لئے ایک غلط بات خدا سے منسوب کرسکتا ہے اور وہ لوگ جو عظیم القدر نفوس قدسیہ کی منزلت سے آشنا اور اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ بلند مرتبہ انسان ایسی خفیف حرکت نہیں کر سکتے اس کی تصدیق کریں گے۔ یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ وہ شخص جس نے یہ اعلان کیا ہو کہ اگر آفتاب کو میرے دائیں ہاتھ پر اور ماہتاب کو بائیں ہاتھ پر رکھ دیا جائے تو پھر بھی میں دعوت حق سے باز نہیں رہوں گا، خدا پر بہتان باندھے اور ایک ایسی بات کہہ دے جو اس کے دین کی بنیاد کو متزلزل کردینے والی ہو۔

داستانِ غرانیق کا ماحصل یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نے قریش سے صلح کے لئے سلسلہ جنبانی اور ان کے معبودوں کی مدح کی۔ یہ واقعہ کس وقت ظہور میں آیا؟ بعثت سے دس سال کے بعد جب نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کفارِ قریش کی ایذا رسانی کے شکنجے سے قریب قریب نجات پا چکے تھے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام سے اسلام کو کافی تقویت پہنچی تھی۔ مسلمان ہر اعتبار سے اتنے قوی ہو چکے تھے کہ وہ قریش کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے قابل تھے۔ عرب کے علاوہ حبش اور دوسرے ممالک میں بھی آفتابِ اسلام کی شعاعیں پھوٹ نکلی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کی ثابت قدمی اور آپ کے جانثاروں کی ایثار پیشگی کے نتائج قریب قریب آشکارا ہو چکے تھے، وہ وقت آ پہنچا تھا کہ اسلام کے دبے ہوئے نقوش ابھریں اور ہر چار طرف اس کی حقانیت کا پرچم بلند ہو۔ ایسے حالات میں یہ کیسے ممکن تھا کہ آنحضرت ﷺ خود بنا بنایا کھیل بگاڑ کر بت پرستوں سے مصالحت کریں اگر بغرض محال آنحضرت ﷺ کی یہی منشا تھی کہ آپ بتوں کی مذمت سے دستبردار ہو کر قریش سے صلح و آشتی کی پینگیں بڑھائیں تو پھر آپ نے پہلے سے یہ روش کیوں اختیار نہیں کی۔ اس صورت میں آپ کے پیرو مصائب آلام کے شکنجوں میں نہ کسے جاتے اور خود آپ بھی کفار کی ایذا رسانیوں سے محفوظ رہتے۔ مختصر یہ ہے کہ یہ داستان غیر معتبر اور ناقابل اعتماد ہے۔ اس کی پادر ہوائی اور بے سروپائی میں کسی شبہ کی مطلق کوئی گنجائش نہیں۔ اس دروغِ بے فروغ کو جن لوگوں نے ہوا

Marfat.com

دی ہے وہ خود یہ بات خوب سمجھتے تھے کہ اس کی قلعی جلد از جلد کھل جائے گی۔ ان برخود غلط واضعین نے اپنے بیان کی لغویت پر پردہ ڈالنے کے لئے دوسرا جھوٹ یہ بولا کہ آنحضرت ﷺ نے قریش کے معبودوں کا حق شفاعت تسلیم کر لیا اور قریش اس روش سے مطمئن اور مسرور ہو گئے تو ان کی باتیں آنحضرت ﷺ پر ناگوار گذریں۔ چنانچہ ایک رات آپ اپنے گھر میں اداس بیٹھے تھے کہ حضرت جبرئیل امین آئے۔ جھوٹ پر جھوٹ کی تہ جمانے سے دروغ گو داستان طرازوں کا مقصد یہ ہے کہ داستانِ غرانیق کا تھوڑا بہت بھرم رہ جائے۔ لیکن اس رویہ سے یہ داستان اور بھی زیادہ بے وزن و بے وقر ہو جاتی ہے۔ اگر حقیقت یہی ہے کہ قریش کی باتیں آنحضرت ﷺ کو ناگوار گذریں تو آپ ﷺ نے اسی وقت وحی و الہام سے رجوع کیوں نہیں کیا اور وحی اپنی پوری صحت کے ساتھ نازل کیوں نہیں ہوئی؟ بات یہ ہے کہ ظہورِ اسلام کی ابتدا میں داستانِ غرانیق ان لوگوں نے وضع کی جو اپنے دل میں دین حق سے بیر اور اسلام سے کدر رکھتے تھے۔

حیرت کا مقام ہے کہ اس داستان کے واضعین نے اسلام کی بنیاد پر حملہ کیا ہے اور اس کے ضمن میں توحید پر بھی افترا پردازی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ توحید کی نشر و اشاعت کے لئے مبعوث ہوئے تھے اور اس فرض کی بجا آوری میں آپ نے کبھی ایک لمحہ اور ایک لحظہ کے لئے بھی تساہل نہیں برتا۔ قریش نے مال و منال اور جاہ و منصب کا لالچ دیا لیکن اس سے آپ کے پائے ثبات میں سر مو لغزش نہیں آئی۔ ان ایام میں معدودے چند افراد مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور مخالفین انہیں بے اندازہ اذیتیں دے رہے تھے لیکن اس کے باوجود آنحضرت ﷺ کے عزم میں فرق نہیں آیا، آپ کی سیرت اور آپ کے حالاتِ زندگی سے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ آپ نے توحید کی تبلیغ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں رکھا۔ جب حالات کی نوعیت یہ ہو تو کیا داستانِ غرانیق کے واضعین کی جرأت موجب حیرت نہیں ہے، جن لوگوں نے اس کی صحت تسلیم کی ہے وہ بھی سخت مغالطے میں ہیں۔ داستان غرانیق کی لغویت میں کسی شے کی مطلق کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مہاجرین حبشہ کی مراجعت کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ان کی مراجعت کے بعض دیگر اسباب تھے، جن کی وضاحت اوپر کی جا چکی ہے۔ مہاجرین حبشہ کی مراجعت کے فوراً بعد قریش نے پھر ایذا رسانیوں کا دروازہ کھول دیا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ آنحضرت ﷺ ان مہاجرین کی وجہ سے اپنی سرگرمیوں میں اور بھی زیادہ اضافہ کر دیں گے چنانچہ انہوں نے ایک جلسے میں یہ عہد کیا کہ:

> ''ہم بنی ہاشم سے رشتے، ناطے، لین دین اور دوسرے مقامات برقرار نہیں رکھیں گے، اور اگر بس چلے گا تو آنحضرت ﷺ کو (نعوذ باللہ) ہلاک کر ڈالنے میں بھی پس و پیش نہیں کریں گے۔''

*

Marfat.com

باب 6

قریش کی ایذا رسانیاں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام سے کفارِ قریش کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام کی حمایت میں بھی اس حمیت کا ثبوت دیا جس کا مظاہرہ وہ ایامِ جاہلیت میں کر چکے تھے۔ آپ نے اپنے اسلام کو مخفی نہیں رہنے دیا بلکہ یہاں تک حوصلہ مندی کا ثبوت دیا کہ اکابر قریش کے اجتماعات میں برملا یہ اعلان کرنے لگے کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اگر کچھ لوگوں نے کبھی مزاحمت کی جرأت کی تو آپ نے ان سے مردانہ وار مقابلہ بھی کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو بھی اپنے اسلام کے اخفا سے روکا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پہلے وہ مکہ کی گھاٹیوں میں آبادی سے دور نمازیں ادا کرتے تھے۔ لیکن اب انہیں اتنی جرأت ہو گئی کہ وہ کعبہ کے سامنے کھلم کھلا عبادت کرنے لگے۔ ان حالات میں کفارِ قریش نے یہ سوچا کہ اگر ہم نے آنحضرت ﷺ اور ان کے رفقا پر ظلم و ستم کی مشق جاری رکھی تو نتیجہ یہ ہو گا کہ لوگ دھڑا دھڑ حلقۂ اسلام میں داخل ہونے لگیں گے، ہو سکتا ہے کہ مسلمان عمر رضی اللہ عنہ اور حمزہ رضی اللہ عنہ کی پشت پناہی میں ہم سے متصادم ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حبشہ سے انہیں امداد مل جائے اور یہ بھی بعید نہیں کہ ان کے قریبی رشتہ داران کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو جائیں۔

غرض مشرکین مکہ نے اتفاقِ رائے سے ایک معاہدہ ترتیب دیا اور اس کی رو سے یہ طے کیا ہم بنی ہاشم و بنی عبدالمطلب کے ساتھ معاشرتی تعلقات قطع کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ نہ ہمارے نکاح بیاہ ہوں گے اور نہ تجارتی لین دین۔ مشرکین مکہ نے ترکِ موالات اور عدم تعاون کا یہ تحریری معاہدہ کعبے کے دروازے پر آویزاں کر دیا تھا کہ پیروانِ نبی کریم ﷺ پر ظلم و ستم روا رکھنے کی بہ نسبت، یہ منفی سیاست زیادہ مؤثر اور کارگر ثابت ہو گی۔ لیکن ایذا رسانی کا سلسلہ پھر بھی کسی نہ کسی شکل میں باقی رہا۔ اس عالم میں دو یا تین سال بیت گئے۔ قریش یہ سمجھتے تھے کہ ترکِ موالات سے تنگ آ کر نبی کریم ﷺ سے ان کے پیرو علیحدگی اختیار کر لیں گے لیکن صورت یہ پیش آئی کہ اس اثناء میں آنحضرت ﷺ نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں میں اور بھی زیادہ مستعدی سے کام لیا، آپ کے پیرو، احباب اور قرابت دار دینِ حق کی پیروی اور آپ کی حمایت میں پورے جوش و خروش کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ اسلام کا دائرہ، اثر و نفوذ روز بروز بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ مکے کی

Marfat.com

حدود سے بھی آگے اس کے اثرات پہنچے۔ دین برحق نے جو آج تک مکے کے پہاڑوں اور اس کی گھاٹیوں میں محدود و محصور رہا تھا قبائل عرب میں شہرت پائی، قریش کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ قبائل عرب کو دین اسلام کی پیروی سے کیسے اور کس طرح باز رکھا جائے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر قبائل عرب نے آنحضرت ﷺ کے دین کو قبول کر لیا تو قریش کی امتیازی حیثیت اور ان کی تجارت خطرے میں پڑ جائے گی۔

کفار، قریش نے آنحضرت ﷺ کی مخالف میں جو کوششیں کیں، احاطہ بیان میں نہیں آ سکتیں۔ انہوں نے آپ کی تحقیر و تذلیل کی۔ آپ کے جانثاروں پر آوازے کسے اور اشعار میں ان کی ہجو بھی کی۔ قریش نے مسلم آزاری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ مخالفت سے بات نہیں بنتی تو انہوں نے حرص وطمع کے سبز باغ بھی دکھائے، مال و منال اور جاہ و منصب کے جال بھی بچھائے، تا کہ اس صورت میں سلسلۂ دعوت منقطع ہو جائے۔ لیکن ان کی کوئی چال کامیاب نہیں ہوئی۔ آخر انہوں نے نبی کریم ﷺ اور ان کے رفقا کو اس بات کے لئے مجبور کیا کہ وہ اپنے وطن کو خیر باد کہہ دیں۔ جنگ وجدل کی دھمکیاں بھی دیں، اس اقدام میں بھی ناکامی ہوئی تو انہوں نے مسلمانوں کا محاصرہ بھی کیا اور ان سے تمام تعلقات منقطع کر لئے تا کہ مسلمان بھوک اور پیاس کے مارے ہلاک ہو جائیں یا اپنے دین سے برگشتہ ہو جائیں لیکن ان تمام مصائب و آلام کے باوجود آنحضرت ﷺ دینی دعوت کے اہتمام میں اور بھی زیادہ ثابت قدم ہو گئے۔ آپ نے لوگوں کو خدائے واحد کی عبادت پر آمادہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں رکھا۔

غور طلب امر یہ ہے کہ آیا قریش نے جنگ وجدل سے دستبردار ہو کر آنحضرت ﷺ کی تصدیق کی اور اس شہرت کی بنا پر جو آپ کو صدق وامانت کے سلسلہ میں پہلے ہی حاصل تھا، آپ کا مقام رسالت تسلیم کر لیا یا مقابلہ و مزاحمت کے لئے کوئی دوسری تدبیر سوچی تا کہ انہیں آنحضرت ﷺ پر غلبہ حاصل ہو، وہ اپنے بتوں کی قدر و منزلت برقرار رکھ سکیں اور شہر کی مرکزی اہمیت میں بھی فرق نہ آنے پائے؟

اس کا جواب نفی میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ قریش اجتماعی طور پر مشرف بہ اسلام ہوں۔ ان کی اسلام دشمنی اور مسلم آزاری کی روش میں مطلق کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ انہیں یہ قوی اندیشہ تھا کہ رسول کریم ﷺ کا دین جس کی اشاعت مکہ میں ہو رہی ہے، قبائل عرب میں بھی اس کے قبول عام کی راہیں کھلیں گی۔ اسلام کی طاقت میں روز افزوں اضافہ ہو جائے گا اور ہماری مشکلات بھی کئی گنا بڑھ جائیں گی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی مخالفت کے لئے قریش کے پاس ایک اور حربہ بھی تھا جسے وہ شروع سے استعمال بھی کر رہے تھے اور انہیں یہ امید بھی تھی کہ یہ حربہ ضرور کارگر ہوگا۔ یہ حربہ تبلیغ کا حربہ تھا۔ ان ایام میں مناظرہ، استدلال، دشمن کے بارے میں توہین آمیز خبروں کی اشاعت اور اس کے عقائد کی تردید کے ہتھکنڈے حریف پر غلبہ پانے کے لئے کامیاب اور موثر حربے سمجھے جاتے تھے۔ قریش اس فکر میں تھے کہ قبائل عرب میں اشاعت اسلام کی روک تھام کے لئے حربہ تبلیغ سے کام لیا جائے کیونکہ مسلم آزاری اور مسلم کشی کا حربہ زیادہ

Marfat.com

سے زیادہ مکہ مکرمہ کی حدود میں کچھ مؤثر ہو سکتا تھا۔ لیکن ان ہزاروں اشخاص پر جو ہر سال تجارت اور زیارت کے لئے مکے آتے اور کعبہ میں بتوں کی قربان گاہوں پر بھینٹ چڑھاتے تھے ان کا کوئی اثر نہ تھا۔ اس خیال سے کفار قریش نے یہ تدبیر سوچی کہ جب نبی کریم ﷺ زائرین بیت اللہ کو اپنے دین کی دعوت دیں تو ان کے خلاف تبلیغی مہم شروع کر دی جائے۔ آنحضرت ﷺ نے بعثت سے کئی سال بعد زائرین کو دین حق کی دعوت دینے کا ارادہ کیا تھا کیونکہ بعثت کے بعد وحی کے ذریعہ آپ کو یہ حکم ملا تھا کہ آپ پہلے اپنے رشتہ داروں کو دعوت دیں اس حکم کی تعمیل میں آپ نے قریش کو دعوت دی تو ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ کفر پر جمے رہے۔ بعد ازاں حکم الٰہی کے تحت آنحضرت ﷺ نے تمام عرب کو اسلام کی دعوت دی۔[1] در اصل یہ دعوت تمہید تھی اس عالمگیر دعوت کی جس کے لئے آپ ﷺ کی بعثت عمل میں آئی تھی۔

دعوت کا توڑ کرنے کے حربے

غرض جب آنحضرت ﷺ نے مختلف عرب قبائل کو جو زیارت کعبہ کے لئے مکے آئے تھے، دعوت دینے کا ارادہ کیا تو قریش کا ایک وفد ولید بن مغیرہ کے پاس پہنچا اور اس سے دریافت کیا کہ حج کے موقعہ پر جمع ہونے والے عرب قبائل میں آنحضرت ﷺ کے خلاف ہم کیا پراپیگنڈا کریں۔ ہم جو بات بھی کریں اس کی بنیاد اور اس کا محور ایک ہونا چاہیے۔ اگر ہماری باتیں مختلف ہوں گی تو ان پر کوئی دھیان نہیں دے گا۔ بعض نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم کو چاہیے کہ ہم آپ ﷺ کو کاہن مشہور کریں، ولید بن مغیرہ نے اس تجویز پر صاد نہیں کیا اور یہ کہا کہ (حضرت) محمد (ﷺ) جو کچھ کہتے ہیں اس میں اور کاہنوں کی باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، بعض نے کہا کہ آپ کو مجنوں کہا جائے۔ ولید نے یہ تجویز بھی پسند نہ کی اور اس کی تردید میں یہ کہا کہ آپ ﷺ کے طور و طریق کچھ ایسے ہیں کہ ان سے دیوانگی ظاہر نہیں ہوتی۔ بعض نے یہ کہا کہ ہم آپ ﷺ کو جادوگر کیوں نہ مشہور کریں، ولید بن مغیرہ نے اس پر یہ کہا کہ آپ جادوگر نہیں ہیں۔ جادوگری آپ کا شیوہ نہیں۔

طویل بحث و مذاکرہ کے بعد ولید بن مغیرہ نے یہ تجویز پیش کی کہ زائرین عرب کے ذہن میں یہ بات بٹھائی جائے کہ آنحضرت ﷺ کی زبان اور ان کے بیان میں جادو ہے۔ ان کی باتیں باپ، بھائی، بیوی اور دوسرے رشتہ داروں میں پھوٹ ڈال دیتی ہیں۔ حاضرین نے ولید بن مغیرہ کی اس رائے سے اتفاق کیا کیونکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے بیان کی تائید میں یہ کہیں کہ اہل مکہ کے اختلاف اور ان کی باہمی کشاکش کا سبب یہی ہے۔ تم آنحضرت ﷺ کی باتوں پر دھیان نہ دینا۔ مبادا تم پر بھی ان کے بیان کا جادو چل جائے اور پھر تمہارے سحر زدہ ہونے سے پورے عرب میں فتنہ و فساد کی آگ کے شعلے بھڑک اٹھیں۔

کفار قریش کا یہ پروپیگنڈا جس کی حیثیت بازیچہ اطفال سے زیادہ نہ تھی، اس قوت کے مقابلہ میں کیسے

Marfat.com

کامیاب ہوسکتا تھا جسے مخالفین اسلام جادو بیانی سے تعبیر کرتے تھے؟ اگر اظہارِ حقیقت میں جادو بیانی سے کام لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کو اس کے اخذ وقبول میں کیا تامل ہوسکتا ہے۔ اپنے عجز اور حریف کی عظمت کا اعتراف مؤثر پروپیگنڈا کیسے ہوسکتا ہے؟ لہٰذا کفار نے یہ محسوس کیا کہ انہیں کوئی مختلف حربہ اختیار کرنا چاہیے۔ ایک دانشمند شخص نضر بن حارث نے قریش کی یہ مشکل حل کر دی۔ یہ شخص حیرہ سے آیا تھا اور ایران میں عبادت کے جو طریقے رائج تھے ان سے اور عناصر کائنات سے متعلق ایرانیوں کے عقائد سے بخوبی واقف تھا۔ جب آنحضرت ﷺ کسی جگہ بیٹھ کر قریش کو دین برحق کی دعوت دیتے اور پہلی قوموں کا حال سنا کر جنہوں نے خدا کی عبادت سے روگردانی کی تھی، انہیں انجام سے ڈراتے تو نضر بن حارث بھی قریب آ بیٹھتا اور کہتا، میری اور (حضرت) محمد (ﷺ) کی باتوں میں کیا فرق ہے؟ کیا آپ بھی میری طرح پہلے لوگوں کے قصے نہیں بیان کرتے؟ کفار قریش بھی آپ ﷺ کے مقابلے میں نضر بن حارث کی باتیں نقل کرتے تھے۔

جبر نصرانی

آنحضرت ﷺ مروہ کے قریب ایک مسیحی غلام جبر کے مکان کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ قریش کا یہ خیال تھا کہ آپ ﷺ مسیحی غلام کی باتیں سن کر اپنے الفاظ میں دہرا دیتے ہیں اور یہ کہا کرتے کہ اگر ہمیں اپنا آبائی دین ترک بھی کرنا پڑا تو بہتر یہ ہوگا کہ ہم مسیحی دین اختیار کریں۔ قریش نے اس قسم کے تذکرے عام کیے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾ (سورۃ النحل: ۱۰۳)

"اور ہم جانتے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں کہ ایک شخص آپ کو آیات قرآنی کی تعلیم دیتا ہے لیکن جس شخص کی جانب یہ لوگ اشارہ کرتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور یہ (قرآن) واضح عربی زبان میں ہے۔"

قریش اس انداز میں آنحضرت ﷺ کی مخالفت میں پروپیگنڈا کرتے اور سمجھتے تھے کہ تسلیم کی بہ نسبت یہ طریقہ زیادہ نتیجہ خیز اور موثر ہوگا لیکن وہ سادہ اور روشن حقیقت جو آنحضرت ﷺ کی باتوں میں پوشیدہ تھی۔ ان کے پروپیگنڈے کا اثر زائل کر دیتی تھی اور اس کا دائرہ اثر روز بہ روز بڑھتا جاتا تھا۔

طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ

طفیل بن عمرو دوسی ایک دانش مند، شریف اور سخن سنج انسان تھا، مکہ آیا تو قریش کے کچھ لوگ اس کے پاس گئے اور اسے یہ کہہ کر آنحضرت ﷺ سے خوف زدہ کیا کہ ان کی باتوں میں جادو ہے، ایسا جادو جو آدمی کو

اس کے رشتہ داروں بلکہ اپنے آپ سے بھی جدا کر دیتا ہے، تم ان کے پاس نہ جانا ورنہ اہل مکہ کی طرح تمہاری قوم میں بھی افتراق کی وبا پھوٹ نکلے گی۔ بہتر یہی ہے کہ ان کی باتیں نہ سننا اور نہ ان سے کلام کرنا۔

ایک روز اتفاق سے طفیل بن عمرو دوسی کا گذر کعبہ کی جانب ہوا۔ وہاں آنحضرت ﷺ بھی رونق افروز تھے۔ اس نے ان کی کچھ باتیں سنیں تو اسے لطف آ گیا۔ اس نے اپنے دل میں کہا، میں صاحب عقل رائے ہوں اور شعر گوئی میں مجھے کمال حاصل ہے، حسن و قبح میں تمیز کی صلاحیت میرے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ میں اس شخص (رسول کریم ﷺ) کی باتیں نہ سنوں۔ باتوں میں کوئی خوبی ہوگی تو تسلیم کرنے میں کیا مضائقہ ہے اور اگر کوئی نقص یا خرابی ہے تو ان سے اعراض و اجتناب کیا جا سکتا ہے۔

اس خیال سے کچھ دیر بعد طفیل بن عمرو دوسی آنحضرت ﷺ کے پیچھے پیچھے آپ کے خانہ مبارک پر پہنچا اور دل میں جو خیال تھا اس کا اظہار کیا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے سامنے قرآن کی تلاوت کی [۱] اور اسلام کی دعوت دی جس پر اس نے لبیک کہا۔ واپس جا کر انہوں نے اپنے قبیلہ (دوس) میں اسلام کی تبلیغ کی۔ کچھ لوگ ایمان لے آئے اور کچھ متامل رہے۔ طفیل نے تبلیغ کا عمل مسلسل جاری رکھا۔ آہستہ آہستہ پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا اور فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ [۲]

نصرانیوں پر تبلیغ کا اثر

آنحضرت ﷺ تبلیغ اسلام کا علم بلند کیے ہوئے تھے۔ صرف بت پرست ہی اسلام کے دائرہ میں داخل نہیں ہو رہے تھے بلکہ اہل کتاب بھی حلقہ بگوش اسلام ہوتے جاتے تھے۔ انہی ایام میں بیس مسیحی جنہوں نے آنحضرت ﷺ کی دینی دعوت کا آوازہ سنا تھا، آئے اور حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر انہوں نے اپنے اطمینان کے لئے بعض شکوک و شبہات رفع کیے۔ انہیں اسلام کی تعلیم کچھ ایسی پسند آئی کہ اسلام قبول کیے بغیر نہ رہ سکے۔ قریش کو اس واقعہ سے صدمہ بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ انہوں نے نومسلموں سے کہا تم کیسے خراب آدمی ہو کہ تمہیں دوسرے عیسائیوں نے آنحضرت ﷺ کے بارے میں دریافت حال کے لئے بھیجا تھا لیکن یہاں تم نے ابھی ان کی چند ہی باتیں سنی تھیں کہ اپنا دین چھوڑ بیٹھے اور ان کی باتوں کی تصدیق پر آمادہ ہو گئے۔ ان نومسلموں پر قریش کی ملامت کا مطلق کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ اس سے ان کے ایمان میں کچھ اور پختگی اور استواری آ گئی کیونکہ قبولِ اسلام سے قبل بھی وہ خدا کی پرستش کرتے تھے اور بت پرستوں کی بہ نسبت انہیں اسلام سے بہت زیادہ قریب کی نسبت تھی۔

قریش کے تین بڑوں کا طرزِ عمل

آنحضرت ﷺ کی دینی دعوت کا دائرہ اور بھی زیادہ وسیع ہو گیا۔ جو لوگ آپ کے مخالف تھے وہ بھی اپنے دل میں سوچنے لگے کہ آیا (حضرت) محمد (ﷺ) ہمیں صراط مستقیم کی دعوت دے رہے ہیں؟ آیا وہ جو

Marfat.com

وعدہ ہم سے کرتے ہیں درست اور صحیح ہے؟ اس خیال سے ابوسفیان، ابوجہل اور اخنس نے رات کو الگ الگ آنحضرت ﷺ کے دولت خانے کا رخ کیا، یہ تینوں ایک دوسرے سے بے خبر تھے اور یہ چاہتے تھے کہ چوری چوری آنحضرت ﷺ کی باتیں سنیں۔ غرض تینوں اشخاص آنحضرت ﷺ کے دولت کدے کے متصل مختلف گوشوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ آنحضرت ﷺ نے رات کا بیشتر حصہ بیداری اور قرآن خوانی میں گذارا۔ صبح سویرے ابوسفیان، ابوجہل اور اخنس اپنے اپنے گھروں کو واپس جاتے ہوئے راستے میں ایک دوسرے سے ملے۔ تینوں خوب شرمندہ ہوئے اور دل میں سوچا کہ اگر کسی کوتاہ فہم نے ہمیں اس سمت آ جاتے جاتے دیکھ لیا تو اپنے دل میں کیا خیال کرے گا۔ اس خیال سے انہوں نے عہد کیا کہ دوبارہ کوئی اس طرف نہ آئے گا۔ اس عہد کے باوجود دوسری رات کو پھر کوئی جذبہ ان تینوں کو کشاں کشاں آنحضرت ﷺ کے دولت کدہ کے قریب لے آیا۔ یہ تینوں آنحضرت ﷺ کی زبان سے قرآن سننا چاہتے تھے۔ صبح کی واپسی پر پھر تینوں کی ملاقات ہوئی اور پھر ایک نے دوسرے کو ملامت کی، تیسری رات کو پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ آخر یہ سوچ سمجھ کر کہ وہ نبی کریم ﷺ کی دعوت کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتے یہ پختہ عہد کیا کہ آئندہ ہم ان کے مکان کے آس پاس بھی نہیں پھٹکیں گے لیکن دل میں یہ بھی سمجھ گئے کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کے مقابلہ میں ہم اپنے دین کی عظمت برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔ قوم بھی اس دعوت کے آگے سپر انداز ہوگی اور رفتہ رفتہ سب آپ ﷺ کی پیروی پر آمادہ ہوں گے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ خود مشرف بہ اسلام کیوں نہیں ہوئے تھے؟ آنحضرت ﷺ کو ان سے نہ مال ومنال کی طمع تھی نہ جاہ ومنصب کی۔ آپ بیحد متواضع تھے۔ اپنی قوم سے آپ کو دلی محبت تھی اور آپ یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح آپ کی قوم راہ راست پر آ جائے۔ آپ کے دل میں کسی کی طرف سے کوئی عناد نہ تھا، بلکہ آپ کی شان تو یہ تھی کہ دوسرے بھی اگر آپ ﷺ کے ساتھ دشمنی سے پیش آتے تھے تو آپ عفو درگذر سے کام لیتے تھے۔ عفو درگذر کو آپ سکون قلب اور اطمینان روح کا سبب خیال کرتے تھے۔

ابن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ کا قصہ

ایک روز آنحضرت ﷺ ولید بن مغیرہ کے پاس کھڑے تھے۔ ولید اکابر قریش میں سے تھا اور سرورِ کونین ﷺ کو یہ امید تھی کہ وہ مشرف بہ اسلام ہو جائے گا۔ اس اثناء میں عبداللہ بن ام مکتومؓ (نابینا) آپ کے پاس سے گذرے اور بہ صد اصرار یہ درخواست کی کہ قرآن کی کچھ آیات سنایئے۔ ان کا حد سے بڑھا ہوا اصرار آنحضرت ﷺ کو ناگوار گذرا کیونکہ اس سے ولید کے ساتھ سلسلۂ کلام منقطع ہو گیا تھا۔ آپ نے ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ سے منہ پھیر لیا اور اس جگہ سے چلے گئے، تنہائی میں آپ ﷺ کو یہ خیال آیا کہ میں نے اس معاملے میں کہیں غلطی تو نہیں کی۔ اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں۔

Marfat.com

عَبَسَ وَتَوَلّٰۤی ① اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی ② وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی ③ اَوْ یَذَّکَّرُ
فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی ④ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ⑤ فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی ⑥ وَمَا عَلَیْکَ
اَلَّا یَزَّکّٰی ⑦ وَاَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی ⑧ وَھُوَ یَخْشٰی ⑨ فَاَنْتَ عَنْہُ تَلَھّٰی ⑩ کَلَّاۤ
اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ ⑪ فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَہٗ ⑫ فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ ⑬ مَّرْفُوْعَۃٍ مُّطَھَّرَۃٍ ⑭
بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ ⑮ کِرَامٍ بَرَرَۃٍ ⑯ (سورہ عبس: ۱ تا ۱۶)

"تیوری چڑھائی اور منہ موڑا اس بات سے کہ آیا آپ کے پاس نابینا اور آپ کو کیا خبر ہے کہ شاید اس کا تزکیہ ہو جاتا یا وہ سوچتا سمجھتا تو آپ کی نصیحت کی بات اسے فائدہ پہنچا دیتی۔ اور جو شخص آپ کی باتوں کی پرواہ نہیں کرتا آپ پر اس کا کوئی الزام نہیں اور وہ جو آیا آپ کے پاس دوڑتا ہوا اور وہ خدا سے ڈرتا ہے سو آپ اس سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ سنئے، یہ تو نصیحت (قرآن) ہے جس کا جی چاہے اس سے کام لے (پڑھے) یہ نصیحت لکھی ہوئی ہے معزز، بلند مرتبہ اور صاف ستھرے اوراق میں جنہیں بڑے درجے والے اور نیکوکار اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں۔"

اللہ تبارک وتعالیٰ آنحضرت ﷺ کی اس روش پر کہ آپ نے ایک دولت مند آدمی کی ہدایت کی توقع میں ایک نابینا کی درخواست کو قابل پذیرائی نہیں سمجھا، اعتراض کرتا ہے ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام وہ دین ہے جس نے مساوات واخوت کی تعلیم دی ہے اور اس نے اعلیٰ وادنیٰ، صغیر وکبیر اور امیر وغریب کے درمیان کوئی خط تمیز نہیں کھینچا۔ پھر کیا بات تھی کہ یہ قریش آخر آنحضرت ﷺ کے دین کی پیروی کیوں نہیں کرتے اور کیوں دینی دعوت کی نشر واشاعت کے سلسلہ میں آپ کے ساتھ تعاون سے گریز کرتے تھے؟ خصوصاً اس عالم میں کہ مرور ایام اور استبداد زمانہ سے ان کی بے حسی اور قدامت پرستی کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اور ان کے دل بھی اتنے سخت نہیں رہے تھے، مزید براں انہیں یہ بھی احساس ہو چکا تھا کہ آنحضرت ﷺ جس دین کی جانب دعوت دیتے ہیں وہ عظمت وجلال اور رفعت وکمال کا حامل ہے۔

قریش کے قبول اسلام میں مانع اوامر

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مرور ایام سے بے حسی اور قدامت پرستی کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ صرف دانشمند اور جویائے کمال اشخاص ہی بے حسی سے محفوظ رہ سکتے ہیں اور جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا ہے، بوسیدگی اور کہنگی کے نقوش ان کے دل ودماغ کی سطحوں سے ناپید ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ان تمام حقائق کا، جن کی تصدیق وہ پہلے کر چکے ہیں، جائزہ لیتے رہتے ہیں تا کہ اوہام وخرافات کی سیاہی جو حقائق کے گرد مکڑی کے جالے کی طرح جم جاتی ہے، دور ہو جائے۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ ان کی روح ایک کٹھالی

Marfat.com

ہے جس میں نئے نئے حقائق پگھلتے، ڈھلتے اور صاف ستھرے ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی طبیعتیں حسن پسند واقع ہوئی ہیں ان کی بارگاہ میں وہی افکار سند قبول پاتے ہیں جن میں کوئی حسن یا خوبی ہو، یہ لوگ متعصب اور خود پسند نہیں ہوتے بلکہ ان کے ضمیر میں حقیقت پسندی کا جوہر ہوتا ہے۔ وہ اپنے گم شدہ جوہر کو ہر جگہ، ہر چیز اور ہر شخص کی گفتگو میں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے اشخاص ہر قوم اور ہر ملت میں معدودے چند ہوتے ہیں۔

با اقتدار اور اصحاب ثروت ہمیشہ افکار تازہ سے خائف رہتے ہیں اور انہیں یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ مبادا نئے افکار اور نئے عقائد سے معاشرت کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں اور انقلاب کے بعد ان کی حیثیت وہی رہ جائے جو عوام کی ہے۔ اس اندیشے کا سبب یہ ہے کہ ان کے نزدیک جہاں میں اس دولت کے ماسوا جو انہوں نے حاصل کی ہے اور کوئی چیز قابل وقعت نہیں ہے۔ ان کی نظر میں جاہ و منصب اور دولت و ثروت کے سوائے اور کوئی شے درخور اعتنا اور لائق التفات نہیں ہے۔ دنیا کی ہر شئے کو یہ لوگ جاہ و منصب اور دولت کی ترازو میں تولتے اور اسی عینک سے دیکھتے ہیں۔ اگر کسی سبب سے ان کے مال و منال میں چند در چند اضافہ ہو جائے تو وہ سبب ان کی نظر میں ایک روشن حقیقت سے کم نہیں۔ اگر ان کی حیثیت اور قدر و منزلت میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو تو پھر حقیقت بھی انہیں وہم و پندار کے مترادف نظر آتی ہے۔ ان اشخاص کی نگاہوں میں جو مال ہی کو دین کا مآل سمجھتے ہیں، صرف وہی حقیقت عدیم المثال قرار پا سکتی ہے جس سے مال و دولت میں اضافہ ہو۔ اگر اس حقیقت کا تقاضا یہ ہے کہ مال کی محبت دل سے نکال دی جائے یا اس سے قطع نظر کیا جائے تو پھر یہ حقیقت بھی انہیں ایک واہمہ اور خیال خام سے ملتی جلتی دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح دین اگر ان کے رجحان طبع اور میلان نفس کی پیروی کا نام ہے تو اس دین سے زیادہ ان کی نظر میں کوئی حقیقت نہیں لیکن اگر یہ دین ان کے اور ان کے ہوا و ہوس کے درمیان حائل ہوتا اور ان کی آرزوؤں کا طلسم پاش پاش کر دیتا ہے تو پھر وہ اس سے فرار و گریز کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اسے باطل، لغو اور ہیچ سمجھتے ہیں۔ جاہ پسند اشخاص بھی اصحاب ثروت کی مانند ہوتے ہیں وہ نئے افکار اور نئے عقائد کو اپنے جاہ و منصب کی ترازو میں تولتے ہیں۔ یہ اصحاب ثروت ایسے عوام کو جو ان کے دست نگر ہوتے ہیں اور جن کا نہ کوئی نظریہ ہوتا ہے نہ عقیدہ۔ دین حق کے خلاف ابھارتے اور ان کے سہارے پرانے کھنڈروں کو جن کی بنیادوں میں زمانے کے بے پناہ سیلاب نے رخنے ڈال دیئے ہیں، نئے سرے سے آراستہ کرتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف تو اپنے زیر دستوں کو دم دیتے ہیں اور دوسری طرف لوگوں کے ذہن پر یہ نقش بٹھاتے ہیں کہ حقیقت کی روح انہی ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں کی شکستہ و ریختہ چہار دیواری میں مستور ہے۔ عوام کو کیا خبر کہ حقیقت کی روح ان کھنڈروں سے کبھی کی پرواز کر چکی ہے، البتہ کچھ توہمات ہیں جنہیں حقائق اور حقائق کی روح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عوام خود غور نہیں کر سکتے اور نہ ان پر یہ حقیقت منکشف ہو سکتی ہے کہ حقائق عبادت گاہوں کی چہار دیواری میں مقید نہیں رہ

Marfat.com

سکتے اور اگر ان کے دامن پر اوہام باطلہ کی گرد نہ جمی ہو تو ان کی شمعیں فروزاں ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ حقائق سے ارواح مسخر اور قلوب منور ہوتے ہیں۔ ان کا فیض عام ہوتا ہے جس طرح آفتاب کی کرنیں ناقص و کامل اور حسن و قبح میں تمیز نہیں کرتیں۔ اسی طرح حقائق سے بھی سبھی بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ کوئی شے ان کے ظہور اور ان کے اثر و نفوذ کی راہیں مسدود نہیں کرسکتی۔

ان حالات میں یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ لوگ جو راتوں کو اٹھ اٹھ کر قرآن کریم کی آیات سننے کے لئے کاشانۂ نبوت کا طواف کرتے تھے اپنے ذاتی مفادات اور شخصی منفعت کو پس پشت ڈال کر ایمان لے آتے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ قرآن کریم کی رو سے ان کے بہت سے افعال غلط ٹھہرتے ہیں اور ساتھ ہی ان کے جاہ و منصب کی عمارتیں متزلزل ہوتی ہیں۔ قرآن کی تعلیمات نے امتیازات بھی مٹا دیئے ہیں اور یہ عام اعلان کر دیا ہے کہ

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (سورۃ الحجرات: ۱۳)

''تم میں سے جو شخص زیادہ پرہیز گار ہے وہی پروردگار کے نزدیک زیادہ معزز و مکرم ہے۔''

اگر ابوسفیان اور اس کے ہم نوا اپنے آبائی دین پر جمے ہوئے تھے تو اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ اس کی صداقت پر یقین رکھتے تھے یا اس کی تہ میں انہیں کوئی حقیقت مضمر نظر آتی تھی بلکہ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنے آبائی دین کی بدولت کثیر دولت اور بلند مراتب حاصل کیے تھے اور وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اگر ہم مال و دولت سے تہی دامن ہو جاتے ہیں تو پھر ہمارے لئے زندگی میں کوئی کشش اور دلچسپی باقی نہیں رہتی۔

مال و دولت کی ہوس اور جاہ و منصب کی خواہش کے علاوہ قریش کے دل میں حسد و رقابت کی آگ کے شعلے بھی بھڑک رہے تھے اور وہ قبولِ اسلام کو اپنی توہین سمجھے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ابھی تک وہ اسلام کے دائرہ میں داخل نہ ہو سکے تھے۔ امیہ بن ابی صلت ان لوگوں میں سے تھا جو ظہور اسلام اور بعثت نبوی سے قبل عرب میں کسی پیغمبر کی بعثت کے آثار اور اس کے امکانات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اسے یہ امید ہو گئی تھی کہ جس پیغمبر کی بعثت وقوع و ظہور میں آنے والی ہے شاید وہ میں ہی ہوں لیکن جب نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تو اس کے دل میں آتش حسد بھڑک اٹھی۔ باوجود اس کے کہ وہ اپنے اشعار میں حکیمانہ خیالات کا اظہار کیا کرتا تھا، اس نے آنحضرت ﷺ کو پیغمبر تسلیم نہیں کیا اور وہ اس لئے کہ اس نے آپ کو اپنا حریف اور رقیب سمجھا۔ مشہور ہے کہ جب ایک دفعہ امیہ بن ابی صلت کے اشعار آنحضرت ﷺ کے حضور میں پڑھے گئے تو آپ نے فرمایا کہ امیہ کے اشعار تو مسلمان ہو گئے ہیں لیکن وہ خود ابھی کافر ہے یعنی اس کا دل ابھی مسلمان نہیں ہوا۔ ولید بن مغیرہ یہ کہا کرتا تھا کہ قریش کی سیادت و قیادت کی سند میرے لئے ہے اور بنی ثقیف کی پیشوائی اور سربراہی ابو معوذ ثقفی کے لئے۔ ہمارے ہوتے ہوئے

Marfat.com

(حضرت) محمد (ﷺ) پر وحی کا نزول کیوں ہوتا ہے۔ آیات ذیل میں اس امر کی جانب اشارہ ہے:

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ ﴿٣١﴾ أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۚ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

(سورۂ الزخرف: ۳۱، ۳۲)

"اور انہوں نے کہا کہ یہ قرآن ان دو شہروں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا۔ کیا وہ آپ کے رب کی رحمت تقسیم کرتے ہیں حالانکہ ہم نے ان کی روزی دنیاوی زندگی میں تقسیم کر دی ہے۔"

جب ابوسفیان، ابوجہل اور اخنس تین رات برابر قرآنی آیات سن چکے (جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے) تو ایک دن اخنس ابوجہل کے مکان پر گیا اور اس سے کہا کہ آنحضرت ﷺ کی زبان سے جو کچھ سنا اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ ابوجہل نے جواب دیا، کیا سنا؟ ہم میں اور بنی عبد مناف میں شرافت اور نجابت کے مسئلہ پر نزاع ہوا۔ ہم نے ان کے ساتھ رقابت کی اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے مختلف ذرائع اور وسائل اختیار کیے۔ جب وہ اور ہم ایک سطح پر آ گئے تو انہوں نے یہ شاخ نکالی کہ ہم میں ایک پیغمبر مبعوث ہوا ہے اور اس پر آسمان سے وحی کا نزول ہوتا ہے، خدا کی قسم ہم اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔

بدویوں میں حسد، رقابت اور ذاتی کشمکش کے جذبات کچھ اس پیمانے پر ہوتے ہیں کہ ہم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے اگر ہم ان سے متعلق کچھ بیان کرتے وقت ان کے جذبات اور ان کے اثرات کو ملحوظ خاطر نہ رکھیں تو یقیناً ہم کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہیں پہنچ سکیں گے اور یہ پست جذبات صرف بدویوں سے مخصوص نہیں بلکہ کم و بیش تمام انسانوں میں پائے جاتے ہیں اور ان سے نجات کی صورت صرف اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ تصفیہ روح اور تزکیہ طلب کی منزلیں طے کی جائیں۔ جو لوگ ان مبتذل رجحانات سے نجات کے خواہشمند ہیں ان کے لئے یہ لازم و مناسب ہے کہ وہ ہوا و ہوس پر قابو پائیں اور عقل و خرد کی ان صلاحیتوں سے کام لیں جو قدرت نے ان کے اندر ودیعت کی ہیں۔ دل و دماغ کی تطہیر و تقدیس اس شان سے ہونی چاہئے کہ ان کا کعبہ مقصود صرف حق طلبی ہو اور وہ حق کی جستجو میں دوست اور دشمن کے درمیان بھی کوئی تمیز نہ کریں۔ انہیں یقین محکم کے ساتھ اپنے ذہن میں یہ بات بٹھا لینی چاہئے کہ دنیا کی ان تمام اشیاء پر جن کی جانب انسان کا دل مائل ہوتا ہے، صرف حق کو فوقیت حاصل ہے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جس کا تصور تو ہم آسانی سے کر سکتے ہیں لیکن اس مقام تک رسائی سہل نہیں اس بلند و بالا مقام تک صرف انہی اشخاص کی رسائی ہو سکتی ہے جو ہوا و ہوس سے اپنی انسانیت کا دامن آلودہ نہیں ہونے دیتے اور اغراض و مقاصد سے بے نیاز ہو کر انسانی فضیلت کی ان بلندیوں تک پہنچ جاتے ہیں جہاں حقیقت کے جلوے ان کی نگاہوں کو دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔ جو اشخاص اس بلند مقام تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں ان کی روحیں نورِ حقیقت سے متحد ہو جاتی ہیں۔ لیکن اکثر و

Marfat.com

بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ کوتاہ بین اور تنگ نظری کا شکار ہوتے اور مادی منافع کے لالچ کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں اور ان کی یہ روش انہیں انسانیت کبریٰ کے بلند مقام سے محروم کر دیتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہیں حق کی جستجو بے تاب ضرور کر دیتی ہے لیکن جب ان کی ذاتی اغراض ان کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں تو وہ نہ حقیقت کو خاطر میں لاتے ہیں نہ حقیقت کو کوئی اہمیت دیتے ہیں۔ کفارِ قریش کھلی آنکھوں یہ دیکھ رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ کے پیروؤں اور دوستوں کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہم پر غالب آ جائیں اور تمام عرب ان کے زیر اثر آ جائے۔ اس خطرہ کے پیش نظر کفار قریش نے آنحضرت ﷺ اور دین برحق کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے مختلف تدبیریں اختیار کی تھیں۔
یہ قریش مسلم آزاری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں ناروا و نامناسب باتوں کی تشہیر سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔

روزِ قیامت کے عذاب کا خوف

آنحضرت ﷺ قیامت سے متعلق دہشت انگیز آیات میں ایسے حقائق کا اظہار فرماتے تھے جن کے تصور سے لرزہ طاری ہوتا تھا، مثلاً آپ ﷺ قریش سے کہتے تھے کہ خدا گنہ گاروں کی گھات میں ہے یا یہ کہ موت کے بعد تم پھر (حساب و کتاب کی غرض سے) زندہ کئے جاؤ گے اور تمہارا شفیع تمہارے اعمال کے سوائے اور کوئی نہیں ہوگا۔ وہ قرآنی آیات جو آپ تلاوت فرمایا کرتے تھے، یہ ہیں۔

فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ ﴿٣٣﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ﴿٣٤﴾ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ﴿٣٥﴾
وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ﴿٣٦﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ﴿٣٧﴾ وُجُوهٌ
يَوْمَئِذٍ مُسْفِرَةٌ ﴿٣٨﴾ ضَاحِكَةٌ مُسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾
تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿٤٢﴾ (سورۂ عبس: ۳۳ تا ۴۲)

"پس جب کانوں کو بہرا کرنے والا شور قیامت برپا ہوگا اور انسان اپنے بھائی، ماں، باپ اور اپنے زن و فرزند سے بھاگے گا اور اس روز بس ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ اس دن بعض چہرے شگفتہ، ہنستے اور خوشیاں مناتے ہوئے ہوں گے، بعض چہرے گرد سے اٹے ہوں گے اور ان پر کالک پھری ہوگی۔ (یہ کون ہوں گے؟) کافر اور بدکار۔"

يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ ﴿٨﴾ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ﴿٩﴾ وَلَا يَسْأَلُ
حَمِيمٌ حَمِيمًا ﴿١٠﴾ يُبَصَّرُونَهُمْ ۚ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ
يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ﴿١١﴾ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ﴿١٢﴾ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ﴿١٣﴾ وَمَنْ فِي
الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ ﴿١٤﴾ كَلَّا ۖ إِنَّهَا لَظَىٰ ﴿١٥﴾ نَزَّاعَةً لِلشَّوَىٰ ﴿١٦﴾ تَدْعُو
مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ ﴿١٧﴾ وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ ﴿١٨﴾ (سورۃ المعارج: ۸ تا ۱۸)

Marfat.com

''جس روز آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا اور پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی مانند ہوں گے۔ کوئی دوست اپنے دوست کا طلبگار نہ ہوگا۔ یہ حال ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھیں گے اس روز مجرم یہ چاہے گا کہ فرزند و زن اور خویش و پیوند کا فدیہ دے کر عذاب سے چھوٹ جاؤں۔ نہیں یہ جہنم کی آگ ہے جو بدن سے کھال اکھاڑ پھینکے گی۔ (یہ جہنم کی آگ) ان لوگوں کو جنہوں نے حق سے منہ پھیرا اور ان لوگوں کو جو مال و دولت جمع کرنے میں مشغول ہوگئے اپنی طرف بلاتی ہے۔''

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿١٨﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴿١٩﴾ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿٢٠﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿٢١﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿٢٢﴾ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ﴿٢٣﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿٢٤﴾ (سورۃ الحاقۃ: ۱۸ تا ۲۴)

''جس روز تمہیں حساب و کتاب کے لئے پیش کیا جائے گا۔ تم سے کوئی چیز مخفی نہیں رہے گی۔ وہ شخص جس کے دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال ہوگا کہے گا آؤ اور میرے نامۂ اعمال کو پڑھو میں جانتا تھا کہ مجھے حساب و کتاب سے سابقہ پڑے گا۔ یہ شخص بڑے مزے میں ہوگا۔ اونچے (درختوں کے) باغ میں جس کے پھل جھکے ہوئے ہوں گے (اور کہنے والے کہہ رہے ہوں گے) خوب مزے سے کھاؤ پیو یہ ان اعمال کا صلہ ہے جو تم نے گزشتہ زمانے میں سرانجام دیئے ہیں۔''

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴿٣٠﴾ (سورۃ ق: ۳۰)

''اس روز ہم جہنم سے پوچھیں گے کہ آیا تیرا پیٹ بھر گیا۔ جہنم کہے گی اور بھی ہے!''

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ

(سورۃ نساء: ۵۶)

''جب ان کے جسم کی کھال گل کر پھٹ جائے گی تو اس کی جگہ ہم دوسری کھال بدل دیں گے اور ان سے کہیں گے لو عذاب چکھو۔''

کیا ان دہشت انگیز آیات کی تلاوت یا سماعت سے کوئی رعب طاری یا کوئی خوف دامن گیر نہیں ہوگا؟ قارئین کرام اس کا اندازہ خود کر سکتے ہیں۔ یہ جو کچھ ہم نے نقل کیا ہے ان آیات کا عشر عشیر بھی نہیں جو آنحضرت ﷺ قریش کو سنایا کرتے تھے۔ ہمارے قارئین آیات کی تلاوت بارہا کر چکے ہیں لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جب بھی ان کا اعادہ کیا جاتا ہے، جہنم کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے (آخر الذکر دو آیتیں پڑھ کر دیکھ لیجئے) قیامت اور عذاب جہنم کے ذکر سے جب آپ ایسے حلقہ بگوشان اسلام پر

Marfat.com

کیفیت اضطراب طاری ہو سکتی ہے تو پھر آپ خود ہی سوچیں کہ کفار قریش اور خصوصاً اس جماعت کے ان اشخاص پر کیا گذری ہوگی جن کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا عیاشی اور تعیش پسندی تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ بتوں کی پرستش ہمیں ہر قسم کے عذاب وعتاب اور حساب و کتاب کی ہولنا کیوں سے محفوظ و مامون رکھے گی۔ جب انہوں نے یہ سنا کہ قیامت کا یہ نقشہ اور وہاں عذاب کی یہ نوعیت ہے تو وہ سیخ پا ہو گئے۔ نبی کریم ﷺ سے مخالفت کا سبب بھی یہی تھا۔ اپنے تصورات کے برخلاف قیامت کا حال سن کر ان کی بوکھلاہٹ انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ یہ لوگ قیامت سے بے خبر تھے اور اس کے بارے میں جو کچھ سنتے تھے، اس پر انہیں یقین نہیں آتا تھا۔ ان پر یہ تصور بھی گراں گذرتا تھا کہ موت کے بعد اعمال کے سلسلہ میں باز پرس ہوگی۔ اگر انہیں کوئی خوف دامن گیر تھا تو صرف آخرت کا تھا۔ وہ نقصانِ مال، زن و فرزند اور مرض وغیرہ سے خوفزدہ رہتے تھے، ان کا خیال تھا کہ یہ دنیا اور اس کی زندگی ہمارا مقصود ہے، اس زندگی کے لئے وسائل فراہم کرنا اور اس کی ناخوشگواریوں سے بچنا ان کی زندگی کا اہم ترین نصب العین تھا۔ آخرت کا تصور ان کے یہاں مفقود تھا۔ اگر کبھی خیال بھی آتا کہ ہم نے جو گناہ کیا ہے ہے شاید بعد میں اس کی سزا بھگتنی پڑے تو اس تردد اور ذہنی کشمکش سے بچنے کے لئے وہ قرعہ اندازی کرتے، تیر پھینکتے، بتوں سے فال لیتے، پرندوں کی حرکات وسکنات اور ان کی پرواز سے آئندہ واقعات سے متعلق شگون لیتے تھے۔ مستقبل کے لئے ان کی تیاریاں کچھ اسی قسم کی تھیں۔ حیات بعد الممات، قیامت، حساب و کتاب، اعمال کی جزا وسزا، جنت و دوزخ کے بارے میں وہ کبھی اپنے دماغ پر زور نہیں ڈالتے تھے۔ اگرچہ اس قسم کی باتیں انہوں نے یہودیوں اور عیسائیوں سے سنی تھیں لیکن وہ اتنی واضح، روشن اور ہولناک نہ تھیں۔ آنحضرت ﷺ آیات بینات کی روشنی میں قریش کو برے کاموں کے برے انجام سے ڈراتے اور ان سے یہ کہتے تھے کہ اگر زندگی غفلت اور ہولنا کی میں گذرے گی اور جمع مال وزر کی غرض سے کمزوروں پر ظلم وستم روا رکھو گے، یتیموں کا مال کھاؤ گے، محتاجوں اور ناداروں سے بے اعتنائی برتو گے اور سود خوری کی لعنت میں پھنسے رہو گے تو تمہارے لئے دوزخ کا عذاب ہے جو تم سے اتنی قریب ہے کہ زندگی کی منزل ختم ہونے کے بعد پہلا قدم اسی کے کنارے پر رکتا ہے۔ [1]

اللہ تعالیٰ نے پرہیز گاروں کو جس بہشت کی بشارت دی ہے اس کی وسعت ارض وسما کی وسعت سے کم نہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بیہودہ کلامی قطعاً نہ ہوگی۔ قلب ونظر کے تقاضے پس پشت نہیں ڈالے جائیں گے جس چیز کے حصول کی تمنا اور جس شے کے مشاہدہ کی آرزو ہوگی اس کی فراہمی اور بہم رسانی کا فوری بندوبست کیا جائے گا۔ کفار کو بہشت سے متعلق ان تمام باتوں میں کلام تھا اور یہ کلام اس لئے تھا کہ ان کا مفاد صرف اسی دنیا سے وابستہ تھا اور وہ اس دنیا میں بہشت کے مزے لوٹنا چاہتے تھے، انہیں یہ بات پسند نہ تھی کہ قیامت تک زحمت انتظار گوارا کریں۔

مقامِ حیرت ہے کہ عرب میں قیامت اور حساب و کتاب کا تصور کیوں نہیں تھا؟ حالانکہ اس دنیا میں خیر

Marfat.com

وشر کی کشمکش ہمیشہ سے چلی آتی ہے اور ایک لمحے کے لئے بھی اس کشمکش میں فرق نہیں آیا۔ قدیم مصری بعثت نبوی سے ہزار ہا سال قبل عالم آخرت کے قائل تھے۔ وہ مرنے والوں کے ساتھ اخروی زندگی کے لئے توشہ رکھ دیا کرتے تھے، مردے کے کفن پر کتاب رکھنے کا رواج بھی تھا۔ یہ مصری اپنی عبادت گاہوں کے بام و در پر میزان، حساب و کتاب، توبہ اور عذاب کی خیالی تصویریں کندہ کرتے تھے۔ ہندوؤں کا عقیدہ تھا (اور ہے) کہ نیکو کاروں کی روحیں نروان حاصل کر لیتی ہیں اور بدکاروں کی روحیں اپنے اعمال کی پاداش میں دوسری جون بدل لیتی ہیں، پھر ہزار ہا سال عذاب میں مبتلا رہ کر اپنی اصل کی جانب رجوع کرتی اور پاک ہو جاتی ہیں۔ پھر نروان کے حصول کے لئے ان کا میلان نیکی اور نیکوکاری کی جانب ہوتا ہے۔ زرتشت کے پیرو بھی کشمکش خیر و شر اور یزدان واہرمن کی پیکار کا ذکر کرتے ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں حیات جاوداں کا تصور بھی ہے اور یہ عقیدہ بھی کہ انسان اپنے اعمال کے سبب رضائے الٰہی کے مستحق بھی ہوتے ہیں اور غضب الٰہی کے مستوجب بھی، عرب جو تجارت کے سلسلے میں سفر کرتے اور مختلف اقوام کے افراد سے ملتے جلتے رہتے تھے، ان تمام عقائد سے کیسے بے خبر رہ سکتے تھے؟ یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے عالم آخرت اور اخروی زندگی سے متعلق کچھ بھی نہ سنا ہو اور حیات بعد الموت کے بارے میں انہوں نے کبھی غور ہی نہ کیا ہو؟ صحرا نشین اور خانہ بدوش عرب طبعاً اور مزاجاً اس لامتناہی وجود سے بہت ہی زیادہ قریب تھے (جو کائنات کا خالق و رازق ہے) نیک و بد ارواح کی حقیقت ان سے زیادہ اور کس پر ہویدا ہو سکتی تھی، دن میں منہ جھلسا دینے والی دھوپ سے اور رات کو فضائے بسیط پر چھائے ہوئے سناٹے سے انہیں سابقہ پڑتا رہتا تھا (گویا وہ جانتے تھے کہ روح کو کن قدرتی حالات میں سکون ہوتا ہے اور کن حالات میں اضطراب) فرق یہ تھا کہ وہ سب کچھ بتوں سے منسوب کرتے تھے۔ بہر حال یہ یقینی امر ہے کہ عرب نظر نہ آنے والے عالم سے متعلق کوئی نہ کوئی تصور رکھتے تھے۔ لیکن چونکہ ان کا پیشہ تجارت تھا اس لئے وہ ایسے حقائق کو زیادہ اہمیت دیتے تھے جو محسوسات کے دائرے میں آ سکیں۔ عرب میں شراب خواری اور عیاشی عام تھی۔ قیامت اور روزِ حساب سے انہیں انکار تھا وہ یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں خیر و شر کے جو نتائج نگاہوں کے سامنے آتے رہتے ہیں، اعمال کی جزا و سزا کا مدار انہی پر ہے، مرنے کے بعد جزا و سزا اور حساب و کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن کریم کی بیشتر آیات جو وعدہ وعید پر مشتمل ہیں، مکے ہی میں نازل ہوئیں تا کہ وہ لوگ جن کی ہدایت کے لئے آنحضرت ﷺ کی بعثت عمل میں آئی تھی راہ راست پر آئیں اور بت پرستی سے منہ موڑ کر خدا پرستی کی راہ اختیار کریں۔

اس مقصد عظمیٰ کے پیش نظر یعنی قریش اور ان کے ہم خیال لوگوں کو گمراہی کی قید سے آزاد کرنے کی غرض سے آنحضرت ﷺ اور آپ کے پیروؤں نے قریش کے ہاتھوں شروع شروع میں جسمانی اذیتیں بھی برداشت کیں اور صدمے بھی سہے، وطن کو بھی چھوڑنا پڑا اور اپنوں کی دشمنی بھی سہی (جیسا کہ اس سے پہلے ذکر

Marfat.com

کیا جا چکا ہے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو کفار جتنی زیادہ اذیتیں دیتے تھے آپ اتنی ہی زیادہ پامردی اور استقلال کے ساتھ اپنے مخالفین کو راہِ ہدایت دکھانے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ کی خواہش یہ تھی کہ مشرکین، بت پرستی اور نازیبا افعال سے تائب ہو کر قیامت اور حساب و کتاب کے تصور کو اپنے ذہن میں جگہ دیں۔ یہی وجہ ہے کہ شروع میں چند سال تک اسی مضمون کی آیات کا نزول ہوا۔ ایسی آیات جن میں مشرکین کو روز حساب اور اس کی ہولناکیوں سے ڈرایا گیا تھا لیکن قریش تھے کہ برابر انکار کیے جاتے اور سنی ان سنی ایک کر دیتے تھے۔ اس سبب سے آنحضرت ﷺ اور ان کے مابین ایک سخت کشمکش جاری تھی یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ اسلام نے غلبہ پایا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو تمام ادیان پر فوقیت بخشی۔

*

حواشی

۱۔ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ۔ (سورہ الانعام: ۹۲)
"اور یہ بابرکت کتاب ہے جو پہلی آسمانی کتابوں کی بھی مصدق ہے (اور اس لئے نازل ہوئی ہے) کہ تم وادیٔ مکہ اور اس کے تمام نواح کو عذابِ آخرت سے ڈراؤ۔"

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے طفیل کے سامنے سورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھیں۔ (اصابہ در تذکرہ طفیل بن عمرو بن طریف نمبر ۴۲۴۷)

۳۔ صحیح بخاری باب حصہ دوس۔

۴۔ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِیًّا ﴿۷۱﴾ (سورہ مریم: ۷۱)
"تم میں سے ہر ایک وہاں ضرور وارد ہونے والا ہے، یہ تیرے پروردگار کے ذمے قطعی، طے شدہ امر ہے۔"

*

Marfat.com

باب 7

مقاطعے کے خاتمے سے (اسرا) معراج تک

حرمت کے مہینوں میں دعوتِ اسلام

قریش نے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے معاشرتی مقاطعہ کا جو عہد کیا تھا وہ اس پر تین سال تک عمل پیرا رہے۔ اس اثناء میں آنحضرت ﷺ اور ان کے پیروؤں نے ایک گھاٹی میں پناہ لے رکھی تھی اور طرح طرح کے مصائب و آلام برداشت کر رہے تھے۔ ان ایام میں انہیں قوتِ لایموت بھی بمشکل میسر آتی تھی۔ رسول کریم ﷺ اور ان کے پیرو حرمت کے چار مہینوں کے سوا، اور کسی مہینے میں کے میں داخل نہیں ہو سکتے تھے نہ لوگوں سے کوئی لین دین اور بات چیت کرنے کی انہیں اجازت تھی۔ ان مقدس مہینوں میں آنحضرت ﷺ قبائل سے ملتے تو انہیں دین اسلام کی دعوت دیتے اور ساتھ ہی نیک اعمال پر ثواب کی بشارت اور بدکرداری پر عذاب کی وعید سناتے تھے۔ آپ ﷺ نے دین حق کی تبلیغ کے سلسلے میں جو تکالیف برداشت کی تھیں ان کی بنا پر اکثر و بیشتر لوگوں کے دل آپ کی جانب مائل ہو گئے تھے اور ان میں سے اکثر آپ کی دعوت پر لبیک کہنے میں بھی متامل نہیں ہوتے تھے۔ آپ کی محصوری اور جفاکشی کی بدولت ان اشخاص کے دل میں جو ابولہب اور ابوسفیان کی طرح سنگدل نہ تھے آپ کے لئے راہ پیدا ہو چلی تھی۔

محصوری کے ایام

آنحضرت ﷺ اور آپ کے پیروؤں نے محصوری کے عالم میں بے پناہ تکالیف برداشت کی تھیں۔ اس سے قریش میں سے بعض رحم دل اشخاص کو یہ احساس ہوا کہ آپ پر اور آپ کے پیروؤں پر ایسے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں جن کی مثال نہیں مل سکتی چنانچہ انہیں ان لوگوں کے طرزِ عمل سے، جنہوں نے ترکِ موالات کی صورت میں سنگ دلی اور بے دردی کا ثبوت دیا تھا، سخت قلق ہوا۔ اگر ہم غور کریں تو بات یہ ہے کہ اگر کے کے بعض اشخاص جن کا میلان مسلمانوں کی جانب تھا، ان کی مدد نہ کرتے تو مسلمان فاقوں مر جاتے۔ اس تنگی اور بے سروسامانی کے عالم میں ہشام بن عمرو نے سب سے زیادہ مسلمانوں کی امداد کی۔ وہ یہ کرتا تھا کہ گندم اور دوسری اجناس اونٹوں پر لاد کر رات گئے گھاٹی کے قریب پہنچاتا اور اپنے اونٹوں کو گھاٹی کی طرف ہانک دیتا تھا، اونٹ تھوڑی دور چلنے کے بعد گھاٹی میں داخل ہو جاتے تھے اور مسلمانوں کو اشیائے

Marfat.com

خوردنی مل جاتی تھیں۔ ہشام بن عمرو قریش کی اس مسلم آزاری سے تنگ آ گیا تھا۔ ایک دن یہی احساسات دل میں لیے ہوئے وہ زہیر بن ابی امیہ (جس کی والدہ عبدالمطلب کی بیٹی تھی) کے پاس پہنچا اور اس سے کہا کہ آیا تم یہ بات ٹھیک سمجھتے ہو کہ خود تو کھاؤ پیو، کپڑے پہنو اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ اطمینان سے وقت گذارو لیکن تمہارے رشتہ دار ان تمام آسائشوں سے محروم رہیں۔ میں قسم سے کہتا ہوں کہ اگر تم یہ سلوک ابو الحکم (ابوجہل) کے رشتہ داروں کے ساتھ روا رکھتے تو وہ ہرگز اس پر راضی نہ ہوتا۔ غرض ترکِ موالات کے ظالمانہ عہد کو توڑنے کے لئے چند اشخاص کے مابین گفتگو ہوئی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ دوسروں کو بھی اس گفت و شنید سے مطلع کر دیں اور ان سے تعاون و تائید کی درخواست بھی کریں۔ چنانچہ مطعم بن عدی، ابوالبختری، اور زمعہ بن اسود اسی جماعت کے خیال سے متفق ہو گئے اور انہوں نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں سے ترکِ موالات کے عہد کو نابود کر دیا جائے۔

زہیر بن ابی امیہ نے اگلے دن کعبے کا سات بار طواف کیا اور بلند آواز سے پکار کر کہا:

> "اے اہل مکہ! کیا یہ بات جائز ہے کہ ہم مزے سے کھاتے پیتے اور لباس پہنتے رہیں اور بنی ہاشم پر فاقوں پر فاقے گذرتے رہیں۔ خدا کی قسم میں اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لوں گا جب تک یہ ظالمانہ عہد نہیں توڑا جائے گا۔"

ابوجہل نے زہیر کی یہ بات سن کر جواباً کہا: خدا کی قسم! یہ عہد ہرگز نہیں توڑا جائے گا۔ زرعہ ابن اسود ابوالبختری، ہشام بن عمرو اور مطعم بن عدی نے بالاتفاق ابوجہل کے جواب کی تغلیط اور زہیر کی تائید کی۔ اس سے ابوجہل پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ مسلمانوں کے خلاف ہم نے جو سازش کی تھی اس کے تار و پود بکھر چکے ہیں اور ہم میں سے کچھ افراد نقضِ عہد پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اس نے سوچا اگر میں نے اپنی مخالفت پر اصرار کیا تو اغلب ہے کہ فتنہ برپا ہو جائے اس لئے وہ خاموش ہو رہا۔ مطعم بن عدی اس عہد نامے کو جو کعبے کی دیوار پر آویزاں کیا گیا تھا چاک کرنے کے لئے بڑھا تو دیکھتا کیا ہے کہ بسمک اللّٰھم یعنی عہد نامے کے افتتاحی کلمات کے علاوہ عہد نامے کے باقی تمام الفاظ دیمک چاٹ چکی ہے۔ اس عہد نامے کی منسوخی کے بعد آنحضرت ﷺ اور آپ کے پیرو شعب ابی طالب سے نکل کر مکے میں آباد ہوئے اور آپ کے اور قریش کے درمیان حسب سابق تعلقات استوار ہو گئے لیکن اس کے باوجود غلبہ پانے کے لئے فریقین میں جو کشمکش پہلے سے جاری تھی بدستور قائم رہی۔

بعض سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ ان اشخاص میں سے چند افراد جنہوں نے معاہدۂ ترکِ موالات کی خلاف ورزی کی تھی، آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچے اور آپ سے کہا کہ دفع شر کے لئے مناسب یہ ہے کہ آپ قریش کے ساتھ صلح اور ان کے معبودوں کو تسلیم کر لیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور اپنے دل میں سوچا کہ اگر میں بتقاضائے مصلحت یہ قدم اٹھاؤں تو اس میں قباحت ہی کون سی ہے! خدا علیم ہے

Marfat.com

کہ میرے مقصد میں کوئی پھیر اور میری نیت میں کوئی فتور نہیں ہے۔

بعض مصنفین سیرت کہتے ہیں کہ بت پرستوں کی ایک جماعت شام سے صبح تک آنحضرت ﷺ سے مصروف گفتگو رہی اور اس نے اپنی گفتگو کے دوران میں آپ ﷺ کی تعریف و توصیف بھی کی۔ ان کے پیہم اصرار کی بنا پر قریب تھا کہ آپ ان کے بعض مطالبات کو مان لیتے اور وہ مشورہ بھی قبول کر لیتے جو انہوں نے پیش کیا تھا کہ اس اثناء میں یہ آیات نازل ہوئیں:۔

وَاِنۡ كَادُوۡا لَيَفۡتِنُوۡنَكَ عَنِ الَّذِىۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ لِتَفۡتَرِىَ عَلَيۡنَا غَيۡرَهٗ ‌ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوۡكَ خَلِيۡلًا ۝ وَلَوۡلَاۤ اَنۡ ثَبَّتۡنٰكَ لَقَدۡ كِدْتَّ تَرۡكَنُ اِلَيۡهِمۡ شَيۡـئًا قَلِيۡلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقۡنٰكَ ضِعۡفَ الۡحَيٰوةِ وَضِعۡفَ الۡمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيۡنَا نَصِيۡرًا ۝ (سورۃ الاسراء: ۷۳ تا ۷۵)

(اے رسول) قریب تھا کہ وہ (مشرکین) آپ کو دھوکا دے کر اس مقصد کی تبلیغ سے روک لیتے جس کی ہم نے آپ کی جانب وحی کی تھی تا کہ آپ ہم سے وحی کے علاوہ کچھ اور منسوب کریں اپنی طرف سے گھڑ کر اور اس صورت میں وہ آپ کو اپنا دوست بنا لیتے اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ ان کی جانب تھوڑے بہت مائل ضرور ہو جاتے۔ اس وقت ہم آپ کو دوگنا مزہ چکھاتے اس زندگی میں اور دوگنا مزہ موت پر (دوسری زندگی میں) پھر آپ ہمارے مقابلہ میں اپنا کوئی حامی و مددگار نہ پاتے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے بعض اشخاص کے نزدیک یہ آیات، داستانِ غرانیق سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن سعید بن جبیر اور قتادہ نے انہیں واقعہ نقض عہد یعنی مقاطعے کے خاتمے سے متعلق قرار دیا ہے۔ عطاء نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ان آیات کا تعلق بنو ثقیف کے قاصدوں سے ہے۔ ان لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی تھی کہ ہمارے علاقے کو بھی مکہ کی طرح حرم قرار دیا جائے تا کہ اس کے درخت، پرند، چرند لوگوں کی دستبرد سے محفوظ رہیں، آنحضرت ﷺ اس بارے میں متامل تھے کہ متذکرہ بالا آیات نازل ہوئیں۔

آیات کی شانِ نزول خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، ان سے آنحضرت ﷺ کی روحانی عظمت آشکارا ہوتی ہے اور ان سے آپ کے اخلاص اور نیک نفسی کا ثبوت ملتا ہے۔ سورۂ عبس میں بھی یہی مضمون دوسرے پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔ مزید برآں نبی کریم ﷺ کی زندگی کے حالات بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔ ان حالات سے مراد و مقصود یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ہمیشہ لوگوں سے یہ فرماتے تھے کہ میں بھی تمہاری طرح بشر ہوں۔ خدا لوگوں کی ہدایت کے لئے مجھ پر وحی نازل کرتا ہے۔ اگر خدا میری حفاظت نہ کرتا تو میں بتقاضائے بشریت غلطی میں مبتلا ہو جاتا۔ چنانچہ ایسا ہی معاملہ اس وقت پیش آیا جب ابن ام مکتوم سے آپ

Marfat.com

نے منہ پھیرا تھا، اور اس موقعہ پر جب کہ سورۂ اسرا کی آیات کا نزول ہوا تھا قریب تھا کہ آپ سے لغزش ہو جاتی اور وہ وحی سے تجاوز کر جاتے لیکن وحی نے آپ ﷺ کو قریش کے فریب سے آگاہ کر دیا۔ آپ نے کمال جرأت سے یہ تمام آیات بلاکم و کاست لوگوں کے گوش گذار کیں۔ خود پسندی کے احساس اور اپنے وقار کے تحفظ کے خیال سے، جیسا کہ اکثر بڑے لوگوں کی عادت ہوگئی ہے، آنحضرت ﷺ نے اس حقیقت کے اظہار میں مطلق تامل نہیں کیا جو خود آپ کی ذات سے متعلق تھی۔ اس چیز سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ آپ کی رسالت کی بنیادیں استوار تھیں اور ان کی تہ میں صداقت کے جوہر پوشیدہ تھے۔ دنیا کے جلیل القدر انسانوں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ لوگوں کی چیرہ دستیوں کے باعث انہوں نے راہِ راست سے قدم نہیں ہٹایا اور نہ ان کے پائے ثبات میں لغزش آئی۔ لیکن یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ انہوں نے اپنی کمزوری کا اعلان ڈنکے کی چوٹ کبھی نہیں کیا بلکہ وہ اس سے وہ ہمیشہ پہلو تہی کرتے رہے۔ ایسے الفاظ کبھی ان کی زبان پر نہیں آئے جو مندرجہ بالا آیات میں خود آپ ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے استعمال کیے ہیں اور جن کا اعلان آپ ﷺ نے خود اپنی زبان سے کیا۔ دنیا کے عظیم المرتبت انسان اس قسم کی باتوں پر پردے ڈال دیا کرتے ہیں اور ان کا راز طشت از بام نہیں ہونے دیتے۔ اگر اتفاق سے یہ عظیم المرتبت انسان حقیقت کے طالب ہوتے ہیں تو وہ ایسے امور سے متعلق صرف اپنے نفس سے محاسبے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر وہ شخص جو اپنے متعلق حقیقت کا اظہار بے باکی اور آزادی کے ساتھ کر دیتا ہے، مجد و شرف اور فضل و کمال میں دنیا کے تمام گرامی قدر انسانوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ دراصل اس سے مقام نبوت کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ مقامِ نبوت ہی کا تقاضا تھا کہ آپ ﷺ نے خود کاری اور بے نفسی کا عملی ثبوت اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں پیش کیا۔ معاہدہ ترکِ موالات کی تنسیخ کے بعد جب آنحضرت ﷺ اپنے پیروؤں سمیت مکہ میں واپس آئے تو آپ ﷺ نے قبائل عرب میں تبلیغ کا سلسلہ پھر شروع کر دیا تھا۔ اگرچہ قبائل عرب میں نبی کریم ﷺ کی دعوت کے تذکرے عام تھے اور بہت سے قبیلے اس دعوت پر لبیک کہہ چکے تھے تاہم مکہ کے مسلمان کفار قریش کے ظلم و ستم سے محفوظ و مامون نہ تھے۔

ابوطالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات اور ظلم و ستم میں مزید اضافہ

معاہدہ ترکِ موالات کی منسوخی سے چند ماہ بعد آنحضرت ﷺ پے در پے دو جانکاہ صدموں سے دو چار ہوئے۔ ایک صدمہ ابوطالب کی رحلت کا تھا اور دوسرا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات حسرت آیات کا۔ ابوطالب کی عمر اتنی ہو چکی تھی کہ جب انہیں مرض الموت لاحق ہوا اور قریش کو اس کی اطلاع ملی تو وہ ڈرے، مبادا ابوطالب کی وفات کے بعد ہمارے اور رسول کریم ﷺ کے پیروؤں کے مابین مسلسل جنگ چھڑ جائے، چنانچہ انہوں نے اس خیال سے چند امرائے قریش کو ابوطالب کے پاس بھیجا۔ اس وفد کے ارکان نے

Marfat.com

ابوطالب سے کہا، آپ کی جو منزلت ہماری نگاہوں میں ہے اس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ اب اس حالت میں کہ ہم آپ کو (بستر مرگ پر) دیکھ رہے ہیں، ہمیں اندیشہ ہے کہ آپ کے بعد ہمارے اور آپ کے بھتیجے کے درمیان تلخیاں زیادہ بڑھ جائیں گی۔ اس لئے مناسب ہے کہ آپ اپنے بھتیجے کو بلا کر ہم سے اور اس سے یہ عہد لیں کہ ہم ایک دوسرے سے تعرض نہ کریں وہ ہمارے دین پر حرف گیری نہ کرے اور نہ ہم اس کے دین پر۔ ابوطالب نے آنحضرت ﷺ کو بلوایا۔ آپ ﷺ تشریف لائے تو دیکھا کہ امرائے قریش وہاں بیٹھے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے معاملہ کی نوعیت جان لینے کے بعد فرمایا۔ ''تم سب صرف ایک کلمہ پر متفق ہو جاؤ اور پھر دیکھنا کہ عرب و عجم تمہارے تابع ہو جائیں گے۔'' ابوجہل نے کہا کہ ایک نہیں ہم دس کلموں پر متفق ہونے کے لئے تیار ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، اگر یہ بات ہے تو لا الہ الا اللہ کہو اور بت پرستی سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو جاؤ۔ امرائے قریش میں سے کسی نے کہا۔ آپ تو سب خداؤں کو ایک کر دینا چاہتے ہیں اور اس کے بعد امرائے قریش آپس میں کہنے لگے خدا کی قسم! یہ شخص وہ عہد ہرگز نہیں کرے گا جو تم چاہتے ہو اور یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ آئے۔ ابوطالب آخرت کو سدھارے۔

ان کی وفات کے بعد کفار کا برتاؤ آپ کے اور مسلمانوں کے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو گیا۔

ابوطالب کی وفات کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بھی آخرت کی راہ لی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے عمر بھر مہر و اخلاص، محبت و مروت، پاک نفسی اور قوت ایمانی سے آنحضرت ﷺ کی تائید اور آپ کی نصرت کی تھی۔ جب مشکلات پیش آتیں تو یہ خدیجہ رضی اللہ عنہا ہی تھیں جو آپ کی ہمت بندھاتی رہتی تھیں۔ جب کبھی آنحضرت ﷺ کی طبیعت پر اضطراب کی کیفیت طاری ہوئی تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنی محبت و خلوص میں ڈوبی ہوئی باتوں سے آپ ﷺ کا غم غلط کر دیا کرتی تھیں۔ مرحومہ کی شخصیت آنحضرت ﷺ کے لئے بہت کچھ تھی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی رفاقت اور وہ تعلق خاطر جو آپ ﷺ کو ان سے تھا، اہم امور اور بڑے بڑے معاملات میں آپ کو ثابت قدم رکھتا تھا۔ جب آپ ﷺ ان کے محبت و ایمان کے نور سے جھلکتے اور دہکتے ہوئے چہرے پر نظر ڈالتے تو آپ ﷺ کا دل شیر ہو جاتا تھا۔ آخر اس رفیقہ حیات نے بھی آپ ﷺ کو داغ مفارقت دیا، ان دو صدموں سے آپ کا قلب کتنا متاثر ہوا ہوگا، تصور کیا جا سکتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جب اس قسم کے حادثات کسی بڑے سے بڑے انسان کی زندگی میں پیش آتے ہیں تو دنیا و مافیہا کا ہوش نہیں رہتا۔ عقل و خرد کی صلاحیتیں جذبات و احساسات کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتی ہیں۔

ابوطالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی رحلت کے بعد قریش نے اپنے ناخن پنجے اور تیز کر لئے، انہوں نے مسلم آزاری کا سلسلہ اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ شروع کر دیا۔ ایذا رسانی کی ایک ادنیٰ ترین مثال یہ ہے کہ ایک بدکردار راستے میں بیٹھ جاتا اور نبی کریم ﷺ پر کوڑا کرکٹ پھینکتا اور آپ نہایت وقار کے ساتھ اس جگہ سے گذر جاتے۔ گھر پہنچتے تو آپ ﷺ کا گرد و غبار میں اٹا ہوا چہرہ اور سر آپ کی نور عین حضرت

فاطمہ ؓ دھوتیں اور آپ کو اس حال میں دیکھ کر رونے لگتیں۔ اولاد اور خصوصیت کے ساتھ بیٹی کا رونا بہت ہی زیادہ درد انگیز ہوتا ہے۔ بیٹی کے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسو انگاروں کا کام کرتے ہیں اور انسان چاہتا ہے کہ بے اختیار دھاڑیں مار کر روئے۔ آنحضرت ﷺ دنیا کے تمام والدین سے زیادہ اپنی بیٹیوں پر مہربان تھے۔ جب آپ ﷺ نے اپنی بیٹی کو روتے دیکھا (جس کی والدہ کو وفات پائے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے) تو آپ ﷺ خدا کی جانب اور بھی زیادہ متوجہ ہو گئے اور آپ ﷺ کو اپنی کامیابی کا اور بھی زیادہ یقین ہو گیا۔ آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ ؓ سے فرمایا: بیٹی رو نہیں، خدا تیرے باپ کی حفاظت کرے گا۔ آپ نے فرمایا: بخدا جب تک ابوطالب بقید حیات تھے قریش مجھے کوئی آزار نہیں پہنچا سکتے تھے۔

سفر طائف

قریش کے مظالم کی کوئی انتہا نہیں رہی اور انہوں نے نبی کریم ﷺ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ ایک دن آپ ﷺ کسی کو اطلاع دیئے بغیر طائف چلے گئے۔ آپ نے قبیلہ بنی ثقیف سے مدد چاہی اور انہیں اسلام کی دعوت دی۔ لیکن جب آپ نے دیکھا کہ ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تو آپ نے ان سے کہا کہ میری طائف میں آمد اور دعوت کا واقعہ مخفی رکھو تا کہ میں قریش کی زبان طعن و تشنیع سے محفوظ رہوں لیکن بنی ثقیف نے یہ بات نہیں مانی۔ بنی ثقیف کے دریدہ دہن لوگوں نے آپ پر آوازے کسے اور نازیبا باتیں کہیں (آپ پر پتھر بھی برسائے جن سے آپ زخمی اور لہولہان ہو گئے تھے)۔ آنحضرت ﷺ وہاں سے چلے آئے اور آپ ﷺ نے ایک باغ میں پناہ لی جو فرزندان ربیعہ، عتبہ و شیبہ کی ملکیت تھا، نبی کریم ﷺ انگور کی بیل کے سائے میں بیٹھے تھے اور باغ کے مالک آپ ﷺ کو دور سے دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر ستا لینے کے بعد آپ ﷺ نے آسمان کی جانب منہ اٹھایا اور اس درماندگی اور زخم خوردگی کے عالم میں بھی اللہ تعالیٰ سے مدد کی دعا مانگی۔

فرزندانِ ربیعہ دیر سے آپ ﷺ کو دیکھ رہے تھے۔ آخر انہیں آپ پر ترس آیا اور عداس نامی ایک مسیحی غلام کو ایک برتن میں کچھ انگور دے کر آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ آنحضرت ﷺ نے انگور کھانے سے پیشتر بسم اللہ کہا۔ عداس حیرت سے آپ کا منہ تک رہا تھا اور دل ہی دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس علاقے کے دوسرے لوگ تو بسم اللہ کہتے نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے عداس سے اس کے دین اور وطن سے متعلق پوچھ گچھ کی اور یہ جان لینے کے بعد کہ وہ عیسائی ہے اور نینوا سے اس کی وطنی نسبت ہے، آپ ﷺ نے عداس سے پوچھا کہ آیا تم نیک و پارسا بزرگ یونس بن متی کے خاندان سے ہو؟ عداس نے کہا آپ کو کیا معلوم یونس بن متی کون ہے؟ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، یونس میرا بھائی اور پیغمبر تھا اور میں بھی پیغمبر ہوں۔ یہ بات سن کر عداس آپ ﷺ کے سر اور ہاتھوں کو بوسے دینے لگا۔ فرزندانِ ربیعہ اس واقعہ سے حیرت زدہ تو بے شک

ہوئے لیکن رہے اپنے مذہب پر قائم۔ عداس واپس آیا تو اس سے کہا، ایسا نہ ہو کہ یہ شخص تجھے تیرے دین سے برگشتہ کردے۔ تیرا دین اس کے دین سے بہتر ہے۔ آنحضرت ﷺ کو بنی ثقیف کے کمینہ لوگوں کے ہاتھوں جو اذیت پہنچی، اگرچہ اس سے ان کے دل نرم ضرور ہو گئے تھے لیکن بے حسی بدستور باقی رہی اور وہ آپ ﷺ کی پیروی کے لئے آمادہ نہیں ہوئے۔ آخر قریش کو بھی پتہ چل گیا کہ نبی کریم ﷺ طائف گئے تھے۔ اس سے ان کا پارہ اور تیز ہو گیا اور انہوں نے اپنی ایذا رسانیوں میں اور بھی زیادتی کر دی۔

ایامِ زیارت میں قبائل عرب مکے آئے تو آنحضرت ﷺ انہیں دین برحق کی دعوت دیتے اور یہ فرماتے کہ میں پیغمبر ہوں لیکن آپ ﷺ کا چچا ابولہب ہر جگہ سائے کی طرح آپ کے ساتھ رہتا کہ اس شخص کی باتیں نہ سننا، نبی کریم ﷺ نے کندہ، کلب، بنو حنیفہ اور بنی عامر کو دین کی دعوت دی لیکن ان میں سے کسی قبیلے نے بھی آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک نہیں کہا بلکہ بڑے حقارت آمیز انداز میں اسے رد کیا۔ بنی عامر کی خواہش تھی کہ ہم رسول کریم ﷺ کو اس شرط پر مدد دیں کہ آپ کے بعد عنانِ اقتدار ہمارے ہاتھوں میں رہے لیکن جب آپ نے ان سے کہا کہ ہر کام کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں ہے تو ان لوگوں نے بھی دوسروں کی طرح آپ سے بے رخی برتی۔

اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ قریش کس سبب سے دعوتِ اسلام پر لبیک نہیں کہتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا تمام قبائل بھی انہی اسباب کے تحت دعوتِ اسلام سے بے اعتنائی برت رہے تھے۔ بنی عامر کو توقع تھی کہ رسول کریم ﷺ کے بعد انہیں سیادت و قیادت کا منصب مل جائے گا لیکن جب انہیں اس سے مایوسی ہوئی تو انہوں نے دعوت رد کر دی۔ بنی ثقیف کا وطن طائف خوشگوار آب و ہوا کے باعث جہاں اہل مکہ کی سیرگاہ تھا وہاں لات کے معبد کی حیثیت بھی اسے حاصل تھی۔ اس کے علاوہ وہاں ایک بت اور بھی تھا جس کی زیارت کے لئے طائف میں لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ مگر اہل طائف مسلمان ہو جاتے تو لات کی قدر و منزلت اور طائف کی اہمیت برقرار نہ رہ سکتی۔ مزید برآں یہ کہ اہل مکہ اور اہل طائف کے درمیان اس مسئلہ پر تکرار کی صورت پیدا ہو جاتی اور اس سے طائف کی اقتصادی حالت پر برا اثر پڑتا۔ مختصر یہ ہے کہ حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ عرب کا ہر قبیلہ اقتصادی اور مقامی وجوہ و اسباب کے تحت دعوتِ اسلام پر لبیک کہنے کے لئے آمادہ نہ تھا اور ان قبائل کے افکار و عقائد میں آبائی دین سے تعلق کی بہ نسبت ان اسباب کو زیادہ دخل تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عقد

قبائل عرب کی سرکشی اور قریش کی مسلم آزاری نے آنحضرت ﷺ کو افسردہ خاطر کر دیا تھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی ازدواجی زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا اسے پر کرنے کے لئے آپ ﷺ نے دوسری شادی کا قصد کیا، اس خیال سے کہ شاید اس صورت میں آپ ﷺ کے قلب پریشان کو

Marfat.com

کچھ سکون واطمینان حاصل ہو۔ اس کے ساتھ آپ یہ بھی سوچتے تھے کہ یہ رشتہ ازدواج ان گھرانوں میں سے کسی گھرانے سے ہو جو قبولِ اسلام میں پیش قدمی کا ثبوت دے چکے ہیں۔ اسی بناء پر آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دختر نیک اختر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے عقد کا پیغام دیا لیکن چونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر ابھی سات سال کی تھی اس لئے عقد تو ہو گیا لیکن وہ بدستور سابق نو (۹) سال کی عمر تک اپنے والد ماجد کے یہاں رہیں۔ اس اثناء میں آپ ﷺ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے عقد کر لیا تھا جو ایک مسلمان کی بیوہ تھیں، ان کے شوہر کا حبشہ سے واپسی پر مکہ میں انتقال ہو گیا تھا۔ ان میں دو ازدواجی تعلقات پر غائر نظر ڈالنے سے نبی کریم ﷺ کے باقی ازدواجی تعلقات کے وجوہ واسباب بھی واضح ہو جاتے ہیں۔

معراج

انہی ایام میں واقعہ معراج ظہور میں آیا۔ آنحضرت ﷺ شب معراج میں اپنی عم زاد بہن ام ہانی (جو ابوطالب کی دختر نیک اختر تھیں) کے مکان میں مقیم تھے۔ اس واقعہ سے متعلق ام ہانی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ اس رات میرے مکان پر تھے۔ آپؐ نماز عشاء کے بعد سو گئے۔ ہم بھی سو رہے، سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے قبل آپ ﷺ نے ہمیں بیدار کیا اور نماز فجر ادا کرنے کے بعد فرمایا: میں نے نماز عشاء جیسا کہ تم نے دیکھا یہیں ادا کی تھی لیکن اس کے بعد میں بیت المقدس گیا اور وہاں نماز ادا کی پھر نماز فجر تمہارے ساتھ ادا کی۔ میں نے کہا آپ یہ بات اہل مکہ سے نہ کہیں۔ وہ آپ ﷺ پر دروغ گوئی کا الزام عائد کریں گے اور طرح طرح کی اذیتیں دیں گے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، خدا کی قسم میں یہ بات کہے بغیر نہیں رہوں گا۔

معراجِ روحانی یا معراجِ جسمانی

معراجِ روحانی کے قائلین ام ہانی کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کو بھی اپنے نظریے کی تائید و توثیق میں پیش کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کا جسم غائب نہ ہوا تھا اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح کو معراج کی سعادت بخشی۔ معراج کے بارے میں معاویہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ یہ ایک رویائے صادقہ تھی۔ علاوہ بریں وہ قرآن کریم کی اس آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں:۔

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (سورۂ اسراء: ۶۰)

"(اے نبی) ہم نے آپ کے رویا کو لوگوں کے لئے امتحان کا ذریعہ قرار دیا ہے۔"

دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ مکے سے بیت المقدس تک سیر جسمانی تھی اور وہ اپنی دلیل میں آنحضرت ﷺ کا وہ قول پیش کرتے ہیں جس میں آپ نے ان مشاہدات کا ذکر کیا جو سیر صحرا کے دوران

Marfat.com

ہوئے تھے (اس کی تفصیل آگے آتی ہے) لیکن آسمان تک سیر معراج روحانی تھی۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ سیر اور معراج دونوں جسمانی تھیں۔ متکلمین نے اس موضوع سے متعلق طویل و عریض بحثیں کی ہیں اور ہزاروں صفحات سیاہ کر ڈالے ہیں۔

معراج کے بارے میں ہمارا نظریہ سب سے جداگانہ ہے اور ہمیں معلوم نہیں کہ آیا اس سے پیشتر کسی اور نے بھی یہ نظریہ پیش کیا ہے یا نہیں لیکن اس سے پیشتر کہ ہم یہ نظریہ پیش کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معراج کا وہ واقعہ نقل کریں جو ہر ایک سیرت میں منقول ہے۔

کتب سیرت میں معراج کا واقعہ

درمنگھم (Dermenghem) نے اس واقعہ کو مختلف کتب سیرت سے جمع کر کے نہایت حسین و جمیل الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

> آدھی رات گئے ساری کائنات پر سکوت طاری تھا۔ چرند، پرند اور درندے چپ چاپ میٹھی نیند لے رہے تھے۔ فضا میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہوا کی حرکت محسوس ہوتی تھی اور نہ پانی کی روانی کا شور سنائی دیتا تھا، اٹھو! اٹھو!! کی آواز سے آنحضرت ﷺ بیدار ہوئے اور اٹھ بیٹھے۔ آپ کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام موجود ہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی پیشانی چمک رہی تھی اور وہ رنگ روپ میں برف کی طرح سفید براق نظر آتے تھے۔ موتیوں سے جڑا ہوا زربفت کا لباس ان کے زیب تن تھا اور ان کے سر پر گھنگریالے بال لہریں لے رہے تھے۔ ان کے بازوؤں سے رنگ رنگ کے پر جڑے ہوئے تھے۔ ایک عجیب الخلقت مرکب براق پر کھولے ہوئے ان کے ساتھ تھا۔ براق آپ ﷺ کی سواری کے لئے جھکا اور آپ ﷺ اس کی پشت پر جم کر بیٹھ گئے۔ پھر اس براق نے نہایت سبک رفتاری کے ساتھ شمال کی جانب پرواز کی۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس سفر میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے۔ براق وادیٔ مکہ سے گذر کر وادیٔ سینا کے پاس اس جگہ ٹھہرا جہاں خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا۔ بعد ازاں بیت اللحم پر جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مولد ہے، براق کے قدم ٹھہرے۔ پھر وہاں سے بھی اس نے پرواز کی۔ اس پرواز کے دوران آنحضرت ﷺ نے کچھ غیبی آوازیں سنیں جن کا مقصد آپ کو سفر سے باز رکھنا تھا لیکن آپ ﷺ نے براق کے روکنے کا خیال تک نہیں کیا بلکہ یہ سوچا کہ جہاں خدا چاہے گا یہ براق مجھے وہیں لے جائے گا۔ آخر آپ بیت المقدس پہنچے۔ یہاں آپ نے براق کو باندھ دیا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام، وغیرہم کی معیت میں بیت المقدس میں نماز ادا

کی۔ اس کے بعد آپ سنگ یعقوب پر بیٹھ گئے اور آسمان کی جانب پرواز کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلا آسمان خالص چاندی کا تھا اور ستارے طلائی زنجیروں کے ساتھ اس سے بندھے اور جڑے ہوئے تھے۔ ہر ایک ستارے پر ایک فرشتہ نگران تھا تاکہ شیطان اس سے قریب تر نہ ہونے پائے اور جنات اسرارِ آسمانی سے خبردار نہ ہوں۔
آسمانِ اول پر نبی کریم ﷺ نے حضرت آدم علیہ السلام کو سلام کیا (اور مختصر سی ملاقات ہوئی)۔ دوسرے آسمان پر آپ ﷺ نے حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت ادریس علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقاتیں کیں۔ آپ ﷺ نے اس اثناء میں حضرت عزرائیل علیہ السلام کو دیکھا جن کی ہیئت دہشت انگیز اور ہولناک تھی۔ ایک لاکھ فرشتے ان کے تابع فرمان تھے جو پیدا ہونے اور مرنے والوں کے نام ایک بہت بڑی بیاض میں لکھتے جاتے تھے۔ آپ نے پھر ایک ایسے فرشتے کو دیکھا جو ہمہ وقت لوگوں کے گناہوں پر روتا رہتا ہے۔ بعد ازاں ایک فرشتے کو دیکھا جس کا رنگ تانبے کا تھا اور ایک آتشیں تخت پر متمکن تھا۔ آگ پر اس کا تصرف تھا۔ ایک فرشتہ دیکھنے میں آیا جس کا آدھا جسم برف کا اور آدھا آگ کا تھا۔ کچھ فرشتے اس کے گرد جمع تھے اور رب قدوس کی حمد وثنا میں مصروف تھے۔ ساتویں آسمان پر جو انصاف پسند مخلوق کا نشیمن ہے، زمین کے حجم سے بڑھے ہوئے جسم کا ایک فرشتہ نظر آیا جس کے ستر ہزار سر تھے، ہر سر میں ستر ہزار منہ، ہر منہ میں ستر ہزار زبانیں تھیں، ہر زبان ستر ہزار زبانوں میں بولتی اور اپنا مفہوم ستر ہزار لہجوں میں ادا کرتی تھی۔ یہ سب زبانیں خدا کی حمد وثنا کر رہی تھیں۔
ان عجائبات کا نظارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ سدرۃ المنتہیٰ پر تشریف لائے جو عرش کی دائیں طرف ہے اور عرش پر اربہا فرشتوں کا سایہ پڑ رہا ہے۔ بعد ازاں آپ بلندی کی طرف مصروفِ پرواز ہوئے۔ بڑے بڑے دریاؤں، نور وظلمت کے جہانوں اور آتشیں آب و ہوا کے لاکھوں حجابات سے کہ ان میں سے ہر ایک کے درمیان پانچ سو برس کی راہ ہے۔ ایک لمحے سے کم وقت میں گذر گئے۔
آنحضرت ﷺ پردۂ جمال سے ہو کر گزرے، کمال کا حجاب اٹھا کر دیکھا، چہرے سے نقاب ہٹا، اسی طرح جلال اور سب سے آخر میں وحدت کی چلمن ہٹا کر نظارہ کیا۔
ان سے پرے فرشتوں کے ستر ہزار گروہ سربسجود اور استغراق میں دیکھے جن سب کو اذنِ کلام نہ تھا۔ اس کے بعد آپ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ حریم کبریا قریب ہے۔ اس

Marfat.com

سے آپ کو کچھ اضطراب سا ہوا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین و آسمان مل گئے ہیں اور مشکل سے نظر آتے تھے گویا فضا کی تاریکیوں میں گم ہو رہے ہیں۔ ساری کائنات کی مثال ایک دانے کی سی نظر آ رہی تھی جو ایک بڑے کھیت میں پڑا ہو۔ انسان کو بھی خدا کے حضور ایسا ہی ہونا چاہیے۔

بعد ازاں نبی کریم ﷺ عرش سے آگے بڑھے جو آپ سے دو کمانوں کے برابر یا اس سے کم تر فاصلے پر تھا۔ آپ ﷺ نے دیدۂ بصیرت سے نورِ الٰہی کا مشاہدہ کیا اور ایسی چیزیں بھی دیکھیں جن کی تعبیر سے زبان عاجز ہے اور وہ فہم انسانی کی حدود سے باہر ہیں۔ رب کریم نے آنحضرت ﷺ کے سینے اور آپ کی پشت پر ہاتھ رکھا۔ آپ کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میری پشت اور میرے سینے میں برف کی ڈلیاں گھول دی گئی ہیں۔ اس عمل سے آپ کو کچھ سکون محسوس ہوا اور آنِ واحد میں مقام فنا کی سیر کی۔

اس گفتگو کے بعد جس کی صحت کے بارے میں معتبر کتب خاموش ہیں، خدا نے آپ کو حکم دیا کہ ہر مسلمان کو روزانہ پچاس نمازیں پڑھنی چاہئیں۔ جب آنحضرت ﷺ واپس ہوئے تو نیچے کے آسمانوں سے گذرتے ہوئے آپ ﷺ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نماز سے متعلق حکم کا علم ہوا تو بولے: کیا آپ کو امید ہے کہ آپ کے پیرو دن میں پچاس نمازیں ادا کرسکیں گے؟ میں لوگوں کو آزما چکا ہوں۔ میری بات مانئے اور خدا کے پاس جا کر نمازوں کی تعداد میں تخفیف کرا لیجئے۔ ابھی موقعہ ہے، نبی کریم ﷺ واپس گئے تو آپ کی درخواست پر ان میں دس نمازیں کم کر دی گئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ ﷺ کو پھر بارگاہِ خداوندی میں تخفیف کے لئے بھیجا۔ غرض اسی طرح کئی بار آئے اور گئے اور نمازیں کم ہوتے ہوتے پانچ رہ گئیں۔ اس کے بعد حضرت جبرئیل امین علیہ السلام آپ کو بہشت کی جانب لے گئے۔ پھر زمین کی جانب آپ کی واپسی ہوئی۔ براق کھول کر اس پر سوار ہو گئے اور بیت المقدس سے مکہ واپس آئے۔

ابن ہشام کی روایت

جیسا کہ ہم نے اوپر نقل کیا ہے یہ واقعہ معراج سے متعلق اس بیان کا چربہ ہے جو درمنگھم نے سیرت کی مختلف کتابوں سے اخذ کر کے ترتیب دیا ہے لیکن یہ واقعات کم و بیش تمام کتب سیرت میں موجود ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے آسمان پر نبی کریم ﷺ کی جو ملاقات ہوئی اس کے بارے میں ابن ہشام نے

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کا یہ قول نقل کیا ہے:۔

"میں نے دیکھا کہ کچھ لوگوں کے منہ اونٹ کے منہ سے ملتے جلتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں انگارے ہیں اور وہ انہیں پھانک رہے ہیں۔ وہ انگارے دوسری راہ سے نکل جاتے تھے۔ میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں، کہا یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال ناحق کھاتے تھے۔ اس کے بعد کچھ لوگ نظر آئے کہ ان کے پیٹ عجیب ہیئت کے تھے اور لوگ مست و سرکش اونٹوں کی طرح ان پر سے گذرتے تھے اور یہ بڑے پیٹے حرکت تک بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں، جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا۔ یہ سود خور ہیں۔ اس کے بعد کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کے سامنے تازہ و فربہ، لاغر و بدبودار گوشت رکھا ہوا تھا اور وہ تازہ و فربہ گوشت چھوڑ کر لاغر اور بدبودار گوشت کھا رہے تھے میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا یہ وہ لوگ ہیں جو ان عورتوں کو چھوڑ کر جو ان پر حلال کی گئی تھیں حرام کے پیچھے جاتے تھے، اس کے بعد میں نے کچھ عورتوں کو دیکھا جن کی چھاتیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ میں نے حضرت جبرئیل سے پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا یہ وہ عورتیں ہیں جنہوں نے دوسرے کی اولاد کو اپنے شوہر سے منسوب کیا تھا۔ اس کے بعد مجھے بہشت لے جایا گیا، وہاں میں نے ایک کنیز کو دیکھا اور اس سے پوچھا کہ تو کس کے لئے ہے؟ اس نے جواب دیا، میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے لئے وقف کر دی گئی ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو یہ مژدہ سنایا۔"

سیرت ابن ہشام کے علاوہ سیرت اور تفسیر کی دوسری کتابوں میں اس کے علاوہ بھی بہت سے واقعات منقول ہیں۔ ایک مؤرخ کو یہ سوال کرنے کا حق حاصل ہے کہ اس واقعہ کے مختلف پہلوؤں کی تحقیق کس حد تک کی گئی ہے اور ان میں سے کسے آنحضرت ﷺ سے نسبت دی جا سکتی ہے اور کتنی باتیں ایسی ہیں جو گروہِ صوفیہ اور بعض دوسرے خوش عقیدہ مسلمانوں نے وضع کی ہیں۔ یہاں اس موضوع پر غور اور فیصلے کی گنجائش نہیں۔ علاوہ بریں ہمیں اس بات میں بھی گفتگو کی مجال نہیں کہ سیر جسمانی اور معراجِ روحانی سے متعلق حقیقت کیا ہے؟ متکلمین کا ہر گروہ جداگانہ رائے رکھتا ہے اور اپنی تائید میں دلائل بھی پیش کرتا ہے۔ ہم ان میں سے ایک رائے کی تائید اور باقی دوسری آراء کی تردید کیسے کر سکتے ہیں؟ جو لوگ معراج کو سیر روحانی قرار دیتے ہیں وہ منجملہ دیگر دلائل کے اس آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں:

إِنَّمَآ أَنَا۠ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰٓ إِلَىَّ أَنَّمَآ إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَٰحِدٌ ۖ (سورۂ کہف: ۱۱۰)

"بے شک میں بھی تم جیسا بشر ہوں (اگر فرق ہے تو صرف یہ ہے) کہ میری جانب وحی

Marfat.com

کی جاتی ہے۔ بے شک تمہارا معبود ایک ہی ہے۔"

اور اس امر سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ آپ کا زندہ و پایندہ معجزہ قرآن کریم ہی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ (سورۂ نساء: ۴۸)

"بے شک اللہ تعالیٰ کے یہاں اس شخص کی بخشش نہیں ہے جو اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے اور اس کے سوائے وہ جس کی چاہے بخشش کر سکتا ہے۔"

اس نظریے کے حامل پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ معراج اور اسرا کی حکمت سے متعلق تحقیق کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم یہاں اپنے نظریے کی توضیح کرتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس سے پہلے بھی کسی نے اس پہلو پر اظہار خیال کیا ہے یا نہیں۔

معراج اور وحدتِ وجود

آنحضرت ﷺ کی روحانی زندگی میں سیر و معراج کا مفہوم عوام کے حیطۂ ادراک میں نہیں آ سکتا۔ اس مفہوم سے متعلق اقل قلیل معلومات متکلمین کے خیالات سے اخذ کی جا سکتی ہیں۔ آپ ﷺ کی عظیم المرتبت روح جو پوری کائنات کی ہدایت پر مامور تھی، سیر و معراج کے دوران میں مادی قیود سے آزاد ہو کر کائنات پر چھا گئی تھی۔ زمان و مکان کے تمام حجابات اور وہ تمام پردے جو ہماری روح کے ادراک کا دائرہ محدود کر دیتے ہیں، ان مخصوص لحات میں آپ ﷺ کی نگاہوں سے اٹھ گئے تھے۔ ازل سے ابد تک جو کچھ بھی ہے وہ آپ ﷺ کی روح کے آئینے میں منعکس ہو گیا تھا۔ اس آئینے میں آپ ﷺ نے مشاہدہ کر لیا کہ نیکوکاری، فضیلت اور حقیقت کی صفات انسان کو مقامِ کمال کی سیر کراتی ہیں اور ان کے برعکس رذالت اور خباثت کی راہیں پستی کی طرف لے جاتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس کشمکش کا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس حقیقت کی تہ تک صرف وہی نفوسِ قدسیہ (یعنی انبیا علیہم السلام) پہنچ سکتے ہیں جنہیں قدرت نے مافوق البشر صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ اس بناء پر وہ لوگ جو نبی کریم ﷺ کے پیرو تھے، اگر آپ کے کمال کی انتہا تک نہیں پہنچ سکے تو اس میں تعجب ہی کیا ہے۔ منتخب اور برگزیدہ اشخاص بھی اپنے مرتبے اور اپنے منصب کے لحاظ سے ایک سطح پر نہیں ہوتے۔ ہر ایک کا مقام جدا اور ہر ایک منصب مختلف ہوتا ہے۔ حقیقت کی راہ میں ہم سے لغزش کا امکان ہے۔ اگرچہ پھر بھی ہم اپنی استعداد کے مطابق قدم بڑھاتے ہیں لیکن ہم ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتے جو ہمارے لئے مقرر کر دی گئی ہیں۔ اس موضوع کی مزید وضاحت کے لئے ہم ان اندھوں کا قصہ بیان کرتے ہیں جو ہاتھی کو شناخت کرنا چاہتے تھے اگرچہ ہمارے موضوع سے اس داستان کی نسبت دور کی ہے۔ تاہم اگر ہم اسے مثال کے طور پر پیش کریں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

داستان یہ ہے کہ اندھوں کی ایک ٹولی ایک ہاتھی کے گرد جمع ہو گئی۔ ان میں سے ایک کا ہاتھ دم پر پڑا تو

Marfat.com

کہنے لگا کہ ہاتھی ایک لمبی رسی کی مانند ہے۔ دوسرے کے ہاتھ پاؤں کو لگے تو وہ بول اٹھا کہ ہاتھی کی مثال ایک بڑے درخت کی سی ہے۔ تیسرے اندھے کے ہاتھ دانتوں سے مس ہوئے تو پکارا کہ ہاتھی نیزے کے مشابہ ہے، چوتھے اندھے نے ٹٹول کر سونڈ پکڑی اور بڑے دعوے کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ ہاتھی ایک گول پیچیدہ اور لرزنے والی مخلوق ہے۔ اندھوں نے ہاتھی سے متعلق جو آراء قائم کی تھیں وہ ہمارے ان قیاسات سے ملتی جلتی ہیں جن کا اظہار ہم حقیقت معراج سے متعلق کرتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ حقیقت وجود سے آشنا ہو گئے۔ آپ نے زمان و مکان کے فاصلے چشم زدن میں طے کر لیے، ازل و ابد کا فاصلہ تعیین سے آزاد ہو کر معدوم ہو گیا جب کہ آنحضرت ﷺ نے مکان کی حد سے آزاد ہو کر سدرۃ المنتہیٰ پر سے اس طرح دیکھا کہ کائنات کی کوئی شے نظر سے اوجھل نہ رہ سکی۔ یہ حقائق آپ کو معراج میں پیش آئے لیکن عوام کور چشموں کی نظر ان کی حقیقت کو نہ پا سکی۔

رہی معراجِ روحانی کے ان مدرکات اور ان کے بالمقابل جسمانی معراج کے محسوسات میں باہمی تفاوتِ درجات کی نوعیت؟ تو جیسے ایک بڑا جثہ ہے جس میں روح سرسرا رہی ہو، حرکت قلب کی وجہ سے اس کی نبض موجزن ہو، یہ روحانی معراج کی مثال ہے جس کے مقابلہ میں جسمانی معراج جیسے ذرۂ بے مقدار ہو۔

یہی اسراء کا مرتبہ ہے جسے رفعت منزلت، جمال صورت و کمال معنی اور جلالِ حقیقت کے اعتبار سے معراجِ روحانی ہی کا مبتدا کہیے جو ازل سے لے کر ابد تک ایسے کمالات کی مکمل تصویر اور ازل سے لے کر ابد تک عالم کون و مکان پر محیط ہیں۔ ازاں جملہ اسی اسراء میں رسول اللہ ﷺ کا کوہِ سینا پر گزرنا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرفِ ہم کلامی نصیب ہوا، اسی طرح مولد مسیح یعنی بیت اللحم پر ہو کر آگے بڑھ جانا! اور اسی طرح صاحب اسراء جناب کا حضرت عیسیٰ و موسیٰ علیہما السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مل کر ادائے صلوٰۃ جن انبیائے کرام کی وحدت ایک ہی دین میں منسلک ہے، اس لئے کہ ان سب حضرات کے ادیان کا قوام ایک ایسا جوہر ہے جو ہمہ وقت کمال کی طرف گامزن ہے۔

معراج اور علوم حاضرہ

علومِ حاضرہ سے بھی روحانی معراج کی صحت کا ثبوت ملتا ہے جب مختلف قوتیں مقابل ہو جاتی ہیں تو حقیقت کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ مارکونی نے مادی ذرائع سے برقی موج وینس سے آسٹریلیا تک پہنچائی اور نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ سڈنی میں روشنی پھوٹ نکلی۔ علومِ جدیدہ سے یہ امر بھی پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ ذہنی افکار بھی اسی طرح مطالعہ میں آ سکتے ہیں جس طرح ایک ملک سے دوسرے ملک تک ایثر (ایتھر) میں ملی جلی برقی لہروں کے ذریعے آوازیں منتقل کی جاتی ہیں بلکہ تحریری خطوط اور تصویریں بھی دیکھی جا سکتی ہیں حالانکہ اس

Marfat.com

سے پیشتر یہ باتیں خام خیالی پر محمول کی جاتی تھیں۔ یہ عجیب و غریب نتائج مادی قوتوں کی تحقیق سے منظر عام پر آئے ہیں اور آئے دن نئی نئی مخفی قوتوں کا انکشاف ہوتا رہتا ہے جن سے لوگوں کی حیرت میں چند در چند اضافہ ہوتا ہے۔ ان امور کے پیش نظر علم کی روشنی میں یہ چیز بعید از قیاس نہیں کہ آنحضرت ﷺ کی عظیم و بلند مقام روح نے ایک رات میں کیسے بیت اللہ سے بیت المقدس تک کی سیر کی ہو اور اس پر وحدت کائنات کی حقیقت اور زمان و مکان کی بے قیدی کا راز ہویدا ہو گیا ہو۔ اگر کوئی انسان اس ناپائیدار اور مستعار زندگی کے اوہام سے بلند و بالا ہو کر حقیقت آشنا ہو اور پھر اس ربط پر غور کرے جو اس کے اور موجودات کے مابین ہے تو اس کے ذہن میں کوئی گنجلک باقی نہیں رہ سکتی اور وہ آسانی سے حقیقت کا ادراک کر سکتا ہے۔

''اسراء'' پر عرب کے تصورات

عرب معراج کی حقیقت سے آشنا نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب نبی کریم ﷺ نے واقعہ معراج بیان کیا تو انہوں نے اسے مادی حیثیت دی اور اس کے امکانات پر بحث کرنے لگے یہاں تک کہ بعض مسلمانوں کو بھی اس واقعہ کی صحت تسلیم کرنے میں تردد و تامل ہوا۔ بعض نے کہا بخدا یہ مسئلہ واضح ہے۔ کارواں ایک ماہ میں شام پہنچتا اور پھر ایک ماہ میں وہاں سے اس کی واپسی ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ اپنے بیان کے موجب یہ مسافت ایک رات میں طے کر کے واپس آ جاتے ہیں۔ متعدد مسلمان دین سے برگشتہ ہو گئے اور جنہیں کچھ تردد تھا انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے اس واقعہ کا ذکر کیا اور پھر اس سے متعلق ان کی رائے دریافت کی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تم ان باتوں کو غلط قرار دیتے ہو؟ انہوں نے کہا، ہاں، ابھی نبی کریم ﷺ لوگوں سے مسجد نبوی میں یہی گفتگو کر رہے ہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، بخدا اگر وہ کہتے ہیں تو پھر یہ سب کچھ درست ہے۔ جب وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ میرے پاس آسمان سے وحی آتی ہے تو میں اس کی تصدیق کرتا ہوں اور یہ بات اس سے بھی زیادہ عجیب ہے جس نے تمہیں حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ اس کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچے اور بیت المقدس کے سفر سے متعلق آپ ﷺ کی باتیں سنیں۔ اس سے پہلے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بیت المقدس کی زیارت کر چکے تھے۔ جب آنحضرت ﷺ نے سلسلۂ کلام ختم کیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا، یا رسول اللہ ﷺ آپ نے جو کچھ بیان فرمایا ہے اس میں صداقت ہے، اسی روز بارگاہِ نبوت سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو صدیق کا خطاب عطا ہوا۔

اسراء بہ جسد

اسراء بہ جسد یعنی معراجِ جسمانی کے قائلین یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جب قریش نے یہ واقعہ سنا تو چند مسلمانوں سے کہا کہ آنحضرت ﷺ اس کے ثبوت میں کیا نشانی پیش کرتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں خاموشی کچھ مناسب نہ تھی ...... نبی کریم ﷺ نے ان کا تردد دور کرنے کے لئے فرمایا، میں راستہ میں ایک

Marfat.com

قافلے کے قریب سے گزرا تھا۔ اس میں سے کسی کا اونٹ گم ہو گیا تھا۔ میں نے اس اونٹ کا سراغ بتایا، میں دوسرے کارواں کے قریب سے گذرا اور اہل قافلہ سے پانی لے کر پیا اور پانی کے برتن کو ڈھک دیا۔ قریش نے ان واقعات کی تحقیق کی۔ دونوں قافلوں نے آنحضرت ﷺ کے بتائے ہوئے واقعات کی تصدیق کر دی۔

اگر اس سیر کو روحانی سمجھ لیا جائے تو بھی یہ واقعہ ممکن الوقوع ہے۔ عہد حاضر میں مقناطیسی خواب کے ذریعہ بعید او ر دور دراز فاصلوں اور وہاں کی موجود اشیاء سے متعلق اطلاعات دی جا سکتی ہیں۔ اگر ایسی روح جو کائنات کی معنوی وحدت کی سیر کر چکی ہو ایسا کارنامہ سرانجام دے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟

*

Marfat.com

باب 8

بیعت عقبہ دو (۲) معاہدے

معراج کے بعد

صرف قریش ہی ان لوگوں میں شامل نہ تھے جو معراج کے حقیقی ہونے کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کر رہے تھے، بہت سے مسلمان بھی اس کی تہ تک نہ پہنچ سکے، اور ان میں سے کئی ایک دین سے منحرف ہو گئے۔ ان کے ارتداد کے بعد قریش کی ایذا رسانیوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ نبی کریم ﷺ کو قبائل عرب سے کسی تعاون کی توقع نہ تھی کیونکہ ان میں سے بعض کو جب دینی دعوت دی گئی تھی تو انہوں نے اس پر لبیک نہیں کہا تھا۔ قریش سے بھی قبولِ اسلام کی امیدیں قریب قریب منقطع ہو چکی تھیں۔ اطراف مکہ سے جو قبائل تجارت یا زیارت کے لئے آتے تھے انہیں رسول کریم ﷺ کی گوشہ گیری اور قریش کی مسلم آزاری سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ جو شخص بھی آنحضرت ﷺ کی تائید ونصرت کا ارادہ کرتا ہے قریش اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں اس لئے قبائل آپ ﷺ سے کنارہ کش رہتے تھے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے اور بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب بھی آنحضرت ﷺ کی حمایت سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو کبھی کبھی یہ خیال ستاتا تھا کہ میری رسالت چند اشخاص کے دائرے میں محدود ومحصور ہو کر رہ گئی ہے اور وہ بھی کم زور ہیں۔ اگر خدا انہیں فتح ونصرت عطا نہ کرے تو غالب امکان یہ ہے کہ یہ سب ہلاک ہو سکتے یا دین سے برگشتہ ہو سکتے ہیں۔ آپ دیر تک اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور خوض کرتے رہے۔ گوشہ گیری اور اس کے ساتھ ہی قریش کی عداوت کا سلسلہ دراز ہوتا گیا لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ آیا اس گوشہ گیری اور قریش کی اس ایذا دہی آزاری سے آپ کے پائے ثبات میں لغزش آئی؟

حقیقت یہ ہے کہ مصائب وآلام سے جن میں مبتلا ہو کر بڑے بڑوں کے حوصلے پست اور قدم متزلزل ہو جاتے ہیں، آپ ﷺ کو اپنے دین کی صداقت کا پختہ یقین ہو گیا تھا اور آپ ﷺ کو یہ امید تھی کہ رب قدوس میری دستگیری ضرور فرمائے گا اور اس کی تائید ونصرت سے اسلام دنیا کے تمام ادیان پر غلبہ پا کر رہے گا۔ کفار قریش کے بغض وعناد کی طوفان خیزیاں آپ ﷺ کی ہمت پست نہ کر سکیں۔ آپ ﷺ کا قیام مستقلاً مکہ میں رہتا تھا۔ اس عرصے میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی دولت بھی (جس سے آغازِ اسلام میں آپ ﷺ کو

Marfat.com

بڑی مدد ملی تھی) ختم ہو چکی تھی۔ لیکن آپ ﷺ اس سے بے غم تھے۔ آپ ﷺ کو اپنی تنگدستی اور بے سرو سامانی کا مطلق خیال نہ تھا۔ نصرتِ الٰہی پر آپ ﷺ کو پورا یقین تھا۔ زیارت کے ایام میں قبائل عرب مکہ میں آئے تو آپ ﷺ نے حسب معمول انہیں اپنے دین کی دعوت دی اور اس کے ردو قبول کے متعلق آپ ﷺ کو مطلق کوئی فکر یا خدشہ لاحق نہیں ہوا۔ قریش کے مفسدہ پردازوں نے حسب معمول تمسخر اور ایذا رسانی پر کمر باندھی لیکن ان کی بدزبانی اور دریدہ دہنی سے آپ ﷺ کی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ ﷺ کو یہ محکم یقین تھا کہ جس خدا نے مجھے دینی دعوت پر مامور کیا ہے وہ ضرور میری تائید کرے گا۔ خدا نے آپ ﷺ کی جانب یہ وحی بھیجی تھی کہ آپ ﷺ لوگوں سے احسن انداز میں مجادلہ کریں۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۴﴾

(سورۂ حم السجدہ: ۳۴)

"احسن طریق سے جواب دیجئے۔ اس سے دشمن بھی آپ کا دلی ہمدرد ہو جائے گا۔"

مخالفین کے ساتھ نرمی اور ملایت سے گفتگو کیجئے، شاید وہ خدا کو یاد کریں اور ڈریں، اور ان کی اذیت پر صبر کیجئے اس لئے کہ خدا صبر کرنے والوں کا حامی و ناصر ہے۔

یثرب کی جانب سے نصرت

اسی طرح نبی کریم ﷺ چند سال حالات میں آسانی پیدا ہونے کے منتظر رہے یہاں تک کہ افق پر نصرت کے آثار نمایاں ہوئے اور یثرب کی جانب سے مدد آ پہنچی۔ یثرب سے آپ ﷺ کا تعلق قرابت دارانہ بھی تھا۔ بنو نجار کے قبیلے سے آپ ﷺ کے جدا مجد عبدالمطلب کی رشتہ داری تھی۔ یثرب ہی میں آپ ﷺ کے والد ماجد کی قبر تھی جہاں آپ ﷺ کی والدہ اور عبدالمطلب بھی، ہر سال زیارت کے لئے جایا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ چھ سال کی عمر میں اپنی والدہ کے ہمراہ یثرب گئے تھے اور اپنے والد ماجد کی قبر کی زیارت کی تھی۔ آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ نے یثرب ہی سے واپسی پر جہانِ فانی کو خیر باد کہا تھا اور وہ وصیت کی تھی جس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے۔ ان حالات میں یہ تعجب کی بات نہیں کہ یثرب ہی کی طرف سے اقبال و فیروز مندی کے آثار نمایاں کیوں ہوئے؟ یثرب سے آپ ﷺ کو ایک خاص تعلق تھا اور ان ایام میں جب آپ ﷺ بیت المقدس کی جانب منہ کر کے نماز ادا کرتے تھے تو طبعاً آپ ﷺ کی عنانِ التفات یثرب کی جانب بھی مڑ جاتی تھی۔ آخر قدرت نے یثرب ہی کو آنحضرت ﷺ کی فتح و نصرت اور اشاعت اسلام کے مرکز کی حیثیت سے منتخب کیا۔

یثرب کے قبائل اوس و خزرج دیگر عرب قبائل کی طرح بت پرست تھے اور ان کی زندگی یہودیوں کی ہمسائیگی میں بسر ہو رہی تھی۔ یہودیوں کے ساتھ ان کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ کبھی کبھی یہ عداوت کھلی ہوئی جنگ کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شام کے مسیحی جو روم کی حکومت کے

Marfat.com

ماتحت تھے یہودیوں کے سخت ترین دشمن تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انہی یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دے کر ہلاک کر دیا تھا۔ ان مسیحیوں نے یثرب کے یہودیوں پر ایک دفعہ چڑھائی بھی کی تھی لیکن وہ ان پر غالب نہ آ سکے تھے۔ آخر انہوں نے اوس وخزرج سے مدد طلب کی اور ان کی مدد سے انہوں نے بہت سے یہودیوں کو تہ تیغ کیا۔ اس واقعے کے بعد یثرب میں یہودیوں کا اثر و اقتدار زائل ہو گیا تھا اور اس سے عربوں کو بہتر زندگی بسر کرنے کے مواقع میسر آ گئے تھے۔

کچھ عرصے کے بعد عربوں نے پھر یہودیوں پر چڑھائی کرنے کا ارادہ کیا تا کہ یثرب کی دولت سے انہیں حصہ مل سکے۔ یہودیوں کو بھی ان کے عزائم کا علم ہو گیا اور اس سبب سے یہودیوں اور عربوں کے درمیان اختلافات کی ناقابل عبور خلیج حائل ہو گئی۔ ہر فریق دوسرے کی دشمنی پر تل گیا۔ یہودیوں نے سوچا کہ اگر عربوں سے ہماری جنگ چھڑ گئی اور انہوں نے دوسرے قبائل سے مدد طلب کی تو ہم ہلاک اور تباہ ہو جائیں گے۔ اس خیال سے انہوں نے جنگ کی ایک اور سبیل نکالی۔ انہوں نے اوس وخزرج کے درمیان بغض و عداوت کے بیج بو دیئے اور ایک کو دوسرے کے خلاف آمادۂ پیکار کر دیا۔ اس حکمت عملی سے یہودی عربوں کی دشمنی سے محفوظ ہو گئے اور انہیں اپنی کاروباری زندگی میں مشغولیت کے مواقع ملے۔ یہودی تجارتی مشغولیت کے پردے میں پچھلی جنگ کے نقصانات کی تلافی کرنا چاہتے تھے اور ان کا ارادہ یہ بھی تھا کہ جو علاقے ان کے قبضے سے نکل چکے ہیں ان پر دوبارہ ان کا قبضہ ہو جائے۔

یثرب میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان جنگ اقتدار تو بے شک چھڑی ہوئی تھی لیکن ایک دوسرے کی ہمسائیگی بھی اپنے اثرات ڈال رہی تھی۔ یہودی اہل کتاب تھے اور لوگوں کو خدائے واحد کی پرستش کی دعوت دیتے تھے، بت پرستی کی مذمت کرتے اور بت پرستوں کو اس بات سے ڈراتے تھے کہ عرب میں ایک ایسے پیغمبر کا ظہور ہونے والا ہے جو عربوں کے دین کو صفحہ ہستی سے نابود کر کے ہمارے دین کو رواج دے گا۔ عربوں پر یہودیوں کی دعوت مطلق اثر انداز نہیں ہوئی کیونکہ ان ایام میں یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین سخت کشمکش جاری تھی لیکن یہودی صرف اس بات پر قانع رہنا چاہتے تھے کہ دوسروں کی دست درازی سے محفوظ رہیں اور آزادی سے اپنے کاروبار میں مصروف رہیں۔ انہیں یہ امید نہ تھی کہ عرب ان کا دین قبول کر لیں گے۔ وہ اپنے آپ کو خدا کی برگزیدہ ملت سمجھتے تھے اور یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ جو شرف و امتیاز انہیں حاصل ہے کوئی دوسرا بھی اس میں ان کا شریک ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ یہودیت بنی اسرائیل کے دائرے سے تجاوز نہ کرے۔

مذہبی اختلاف کے باوجود یثرب کے عرب یہودیوں کی ہمسائیگی کی بدولت دوسرے عربوں کی بہ نسبت دینی مسائل سے زیادہ باخبر تھے اور وہ ان مسائل میں بڑی عمدگی کے ساتھ گفتگو کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دوسرے عرب قبائل کی بہ نسبت یثرب میں رہنے والے عربوں نے دعوت اسلام پر آسانی سے لبیک کہا اور

Marfat.com

بہت جلد حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

سوید بن صامت اور ایاس بن معاذ رضی اللہ عنہ کا قصہ

سوید بن صامت امرائے یثرب میں سے تھا اور شرافت اور شجاعت کے باعث اس کا لقب کامل پڑ گیا تھا۔ اس زمانے میں جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے سوید بن صامت مکہ کی زیارت کے لئے آیا۔ آنحضرت ﷺ نے اسے دعوتِ اسلام دی۔ سوید نے کہا: آپ کے پاس جو چیز ہے شاید ایسی ہی میرے پاس بھی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے پوچھا: بھلا تمہارے پاس کیا چیز ہے؟ سوید نے جواب میں کہا: حکمت لقمان! آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اس حکمت میں سے کچھ سناؤ۔ سوید نے لقمان کے چند مقولے سنائے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: واقعی یہ باتیں بہت اچھی ہیں لیکن میرے پاس جو کچھ ہے وہ اس سے بھی بہتر ہے۔ وہ قرآنِ حکیم ہے جو خدا نے مجھ پر نازل کیا ہے۔ وہ ہدایت اور نور ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے سوید کو کچھ قرآنی آیات سنائیں اور اسلام کی دعوت دی۔ سوید بن صامت کے دل پر ان قرآنی آیات کا بہت زیادہ اثر ہوا اور اس نے اقرار کیا کہ یہ میرے کلام سے بہتر ہے۔ یہ کہہ کر کچھ سوچتا ہوا چلا گیا۔ بعض کا خیال ہے کہ جب خزرجیوں نے اسے ہلاک کیا تو وہ مسلمان تھا۔

عرب کی طبائع پر یہودیوں کی ہمسائیگی نے جو اثرات چھوڑے تھے رسول کریم ﷺ سے گفتگو کے دوران صرف سوید بن صامت ہی نے ان کا اظہار نہیں کیا بلکہ دوسرے عربوں پر بھی یہودیوں کی اس قربت کا اثر تھا جیسا کہ پیشتر ذکر کیا جا چکا ہے۔ اوس و خزرج اور یہود کے مابین سخت قسم کی عداوت تھی اور ہر فریق عرب قبائل سے مدد طلب کرتا تھا۔ اسی زمانے میں انس بن رافع اپنے چند رشتہ داروں سمیت جن میں ایاس بن معاذ بھی شامل تھے، مکے آیا تاکہ قریش کو اپنے قبیلے خزرج کی ہم نوائی اور ہم خیالی پر آمادہ کرے۔ آنحضرت ﷺ کو ان کی آمد کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ ان کے پاس گئے اور اسلام کی دعوت دی اور کچھ قرآنی آیات بھی پڑھ کر سنائیں۔ ایاس بن معاذ نے جوان ایام میں نوجوان تھے، یہ آیات سن کر کہا کہ یہ کلام اس مقصد سے جس کی خاطر ہم آئے ہیں زیادہ بہتر ہے۔ انس بن رافع اور اس کے ساتھی یثرب واپس چلے گئے اور ان میں سے ایاس بن معاذ کے ماسوا کوئی بھی مسلمان نہ ہوا۔ کیونکہ یہ لوگ قریش کو جنگ بعاث میں اپنا حلیف بنانے کی کوشش کر رہے تھے اور گفت و شنید میں مصروف تھے۔ بہر حال آنحضرت ﷺ کی باتوں نے ان لوگوں پر اثر ضرور کیا تھا اور اس واقعے کے بعد اوس و خزرج حضور ﷺ کو اپنا ہم پیمان اور پیشوا بنانے پر آمادہ ہو گئے۔

جنگِ بعاث

انس اور اس کے رفقا کی واپسی کے چند روز بعد جنگ بعاث چھڑ گئی۔ بغض و عداوت کے جذبات نے اوس و خزرج کو اس ہولناک اقدام پر آمادہ کر دیا تھا کہ جس کا بس چلے وہ اپنے حریف کا نام و نشان صفحۂ ہستی

سے ناپید کر دے۔ ابو اسید حضیر نامی ایک شخص قبیلۂ اوس کا سردار تھا اور اسے خزرج سے سخت عناد تھا۔ لڑائی میں اوس کو شکست ہوئی اور وہ مسجد کی جانب بھاگنے لگے تو خزرج نے مفرورین پر آوازے کسے۔ جب ان کی جلی کٹی باتیں ابو اسید حضیر نے سنیں تو اپنے پاؤں یا ران میں نیزہ مار کر زمین میں گاڑ دیا اور چلا کر کہا کہ میں گر پڑا ہوں لیکن خدا کی قسم جب تک دشمن کے ہاتھوں مارا نہ جاؤں اپنی جگہ سے قدم نہیں ہٹاؤں گا۔ اگر تم مجھے دشمنوں کے حوالے کر دینا چاہتے ہو تو تمہیں اختیار ہے۔

اوس کے نوجوان ابو اسید حضیر کے یہ الفاظ سن کر لوٹے اور بڑی بے جگری سے دشمن پر حملہ آور ہوئے۔ ان کا یہ مایوسانہ حملہ اتنا شدید تھا کہ خزرج کے پاؤں میدانِ جنگ سے اکھڑ گئے اور انہوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ اوس نے ان کا تعاقب کیا اور ان کے نخلستانوں اور مکانوں کو نذر آتش کر دیا۔ سعد بن معاذ اشہلی نے خزرج کے شکست خوردہ لوگوں کو پناہ دی۔ ابو اسید حضیر خزرج کے تمام لوگوں کو تہ تیغ اور ان کے گھروں کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا تھا لیکن ابوقیس بن اسلت نے اسے اس اقدام سے روکا اور کہا اپنے لوگوں کو ہلاک نہ کرو، بہر حال ان کی ہمسائیگی لومڑیوں کی ہمسائیگی سے بہتر ہے (یعنی یہودیوں سے)۔

جنگ بعاث کے بعد یہودیوں نے یثرب میں اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کر لیا۔ اوس و خزرج کی غلط فہمیوں کے بادل بھی چھٹ چکے تھے اور اب انہیں اپنے انجام کا خوف دامن گیر تھا۔ وہ کسی کو اپنا سردار بنانا چاہتے تھے۔ سرداری کے لئے انہوں نے عبداللہ بن محمد خزرجی کا انتخاب کیا تھا لیکن حالات نے ایسا نہ ہونے دیا۔

مدینہ میں اسلام کا ورود

خزرج کی ایک جماعت حج کے موسم میں مکہ آئی۔ آنحضرت ﷺ نے اس جماعت کے افراد سے ملاقات کی۔ ان کے حالات سے آپ ﷺ نے اندازہ کیا کہ ان لوگوں کے یہودیوں سے تعلقات ہیں۔ یثرب کے یہودیوں کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی قضیہ پیش آتا تھا تو عربوں سے کہتے تھے کہ عنقریب ایک پیغمبر کی بعثت عمل میں آنے والی ہے، ہم اس کی پیروی کریں گے اور تمہارا قلع قمع کر کے رکھ دیں گے۔ جب نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔ خدا کی قسم! یہ وہی پیغمبر ﷺ ہیں جن کی بعثت کی پیش گوئی یہودی کیا کرتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہودی ہم سے پہلے ان کے پیرو ہو جائیں۔ اس خیال سے انہوں نے بلا تامل اسلام قبول کر لیا اور آنحضرت ﷺ سے کہا کہ ہماری قوم یعنی اوس و خزرج کے مابین اتنا سخت نفاق اور اتنی سخت عداوت ہے کہ شاید ہی کسی دوسری قوم میں ہو۔ خدا کرے کہ آپ ﷺ کی برکت سے ہماری قوم ان نفرت انگیز احساسات سے نجات پا جائے۔ اگر آپ ﷺ نے اوس و خزرج کو اتحاد و اتفاق کی لڑیوں میں پرو دیا تو پھر ہماری اور ان کی نظر میں آپ ﷺ

Marfat.com

سے زیادہ اور کوئی عزیز نہ ہوگا۔ یہ خزرجی افراد قبولِ اسلام کے بعد مدینہ واپس چلے گئے۔ ان میں سے دو شخص عبدالمطلب کے رشتہ دار تھے۔ مدینہ پہنچ کر انہوں نے اپنے قبولِ اسلام کا واقعہ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو سنایا۔ انہوں نے سب کو ایسا دین قبول کرنے کے لئے آمادہ پایا جس سے اتحاد و اتفاق کی بنیادیں استوار ہوں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اوس و خزرج کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں نبی کریم ﷺ کے تذکرے نہ ہوتے ہوں۔

عقبہ کی پہلی بیعت

اس واقعہ پر ایک سال کی مدت بیت گئی پھر زیارت مکہ کا موسم آیا تو یثرب سے بارہ اشخاص مکہ پہنچے اور آنحضرت ﷺ سے عقبہ میں ملاقات کے بعد عہد کیا۔ یہ عقبہ کا پہلا معاہدہ تھا۔ عہد یہ تھا کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے، چوری اور زنا سے پرہیز کریں گے، اپنے بچوں کو ہلاک نہ کریں گے، کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے اور اچھے اور جائز کاموں میں آنحضرت ﷺ کے احکام کی پیروی دل و جان سے کریں گے۔ اس عہد کو پورا کریں گے تو صلے میں بہشت ملے گی، ورنہ ان کا کام خدا کے حوالے، چاہے تو بخش دے اور چاہے تو عذاب دے۔

آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کے ہمراہ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ بن عمیر کو بھیج دیا تا کہ انہیں عہد کی یاد دہانی کراتے رہیں اور ساتھ ہی اسلام کے ارکان و مسائل کی تعلیم بھی دیں۔ اس کے بعد یثرب میں اسلام کی اشاعت برق رفتاری سے ہونے لگی۔ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ وہیں مقیم ہو گئے۔ نو مسلموں کو تعلیم دیتے تھے اور یہ دیکھ کر انہیں خوشی ہوتی تھی کہ فرزندانِ توحید کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ جب وہ مہینے آئے جن میں جنگ و جدل ممنوع تھی یعنی شہر حرم تو حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے مکے پہنچ کر مسلمانانِ مدینہ کی جمعیت و طاقت کا حال نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں اب کے سال راسخ العقیدہ مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت لے کر مکہ آؤں گا۔

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ بن عمیر نے یہ خبر دی تھی کہ مدینہ میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے ساتھ ساتھ ان کا اقتدار بھی روز افزوں ترقی پر ہے اور یہاں اس قسم کے مظالم نہیں ڈھائے جاتے جیسے کہ مکہ میں کفار مسلمانوں پر ڈھاتے رہے ہیں۔ مدینہ میں وسائل زندگی کی فراوانی بھی ہے۔ کھیتی باڑی ہوتی ہے اور انگوروں کے باغات بھی ہیں۔ یہ اطلاعات پا کر آنحضرت ﷺ اس سوچ میں پڑ گئے کہ آیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کر جائیں تا کہ وہاں مخالفین بھی ہم پر دست درازی نہ کر سکیں۔ غور و فکر کے دوران میں آپ ﷺ کو مدینہ کے ان پہلے نو مسلموں کی بات یاد آئی جنہوں نے یہ کہا تھا کہ اگر خدا آپ ﷺ کے ذریعے ہمیں متحد کر دے تو ہمیں آپ ﷺ سے زیادہ عزیز اور کوئی نہیں ہوگا۔ آپ ﷺ نے

Marfat.com

اپنے دل میں سوچا کہ اب تو اوس وخزرج متحد ہو گئے ہیں۔ کیا ان حالات میں ہجرت مدینہ کا اقدام مستحسن نہ ہوگا؟ مکہ میں قریش کو ان کی ستم رانیوں اور ایذا رسانیوں سے روکا نہیں جا سکتا۔ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب صرف اتنی ہی مدد کرتے ہیں کہ دوسروں کو مجھ پر زیادتی نہیں کرنے دیتے لیکن ان کے مقابلے میں میری مدد کے لئے وہ بھی آمادہ نہیں ہیں۔ قریش کو مسلم آزاری سے بھی نہیں روکتے۔ اگرچہ ایمانی طاقت ہر تکلیف آسانی سے برداشت کر لیتی ہے اور دین کی راہ میں جو مصائب و آلام برداشت کئے جاتے ہیں ان سے یقین کی بنیادیں اور بھی زیادہ محکم ہو جاتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تکالیف کا سلسلہ دراز اور غیر منقطع ہو جائے تو روح مضمحل اور قلب مائل بہ ضعف ہو جاتا ہے، اور ایک مومن کو اتنی فرصت اور اتنا موقع نہیں ملتا کہ وہ سکون واطمینان سے اپنے ذہن کو ادراکِ حقیقت کے لئے آمادہ کر سکے۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے پیشتر مسلمانوں کو اس یقین دہانی کے ساتھ ہجرت حبشہ کی اجازت دی تھی کہ وہاں کا حاکم عادل اور وہ سرزمین گہوارۂ امن وسکون ہے، اس لئے کیا ہی اچھا ہو کہ مکہ کے مسلمان مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کر جائیں اور وہاں اپنے دینی بھائیوں کے تعاون اور ان کی نصرت سے اتنی طاقت حاصل کر لیں کہ دشمن ان کا بال بیکا نہ کر سکے۔ اس تعاون سے وہ اپنے مخالفین کے مقابلے میں ایک دوسرے کی مدد بھی کر سکیں گے۔ وہاں پہنچ کر وہ اپنے امور اور بھی آزادی اور اور بیبا کی کے ساتھ سرانجام دے سکیں گے۔ مدینہ میں وہ علی الاعلان دینی رسوم کی ادائیگی بھی کر سکیں گے۔ وہاں انہیں یہ بھی موقع ملے گا کہ وہ اپنے دین کے دائرے میں توسیع کا اہتمام کر سکیں۔

عقبہ کی دوسری بیعت

اس سال یعنی ۶۲۲ء میں یثرب سے جو زائرین مکہ مکرمہ آئے ان کی تعداد پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ ان زائرین میں دو عورتیں اور تہتر (۷۳) مرد شامل تھے۔ نبی کریم ﷺ کو ان کی آمد کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے سوچا کہ ان مسلمانوں سے ایک عہد اور لے لیا جائے جو سلامت روی اور نرم مزاجی سے اسلام کی دعوت دینے اور تکالیف و مصائب کو صبر وسکون سے برداشت کرنے تک محدود نہ ہو بلکہ مسلمانوں کو اس امر کے لئے آمادہ کرے کہ وہ طاقت کا طاقت سے مقابلہ کرنے میں ایک دوسرے کی اعانت کریں۔ اس خیال سے آپ ﷺ نے اس جماعت کے سرداروں سے خفیہ طور پر ملاقاتیں کیں اور انہیں اس بات کے لئے آمادہ کیا اور ان سے عہد لیا کہ وہ ایامِ تشریق میں رات کے پچھلے پہر گھاٹی کے قریب ملیں۔ ان لوگوں نے بھی اس بات کو مخالفین سے پوشیدہ رکھا اور حسب وعدہ ایک چور راستے سے گھاٹی میں پہنچ گئے۔ دو عورتیں بھی ان کے ہمراہ تھیں۔

ان لوگوں کو گھاٹی میں پہنچے ہوئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ آنحضرت ﷺ اپنے چچا عباس بن

Marfat.com

عبدالمطلب کے ہمراہ وہاں پہنچے (حضرت عباس رضی اللہ عنہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے)۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے سنا تھا کہ معاہدے کی بات چیت کرنی ہے۔ انہوں نے خیال کیا کہ ممکن ہے جنگ کی نوبت آجائے اور انہیں بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے ساتھ رسول کریم ﷺ کی حمایت کے لئے میدان میں آنا پڑے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ میں اپنے بھتیجے اور دوسرے رشتہ داروں کے لئے عہد و پیان کرلوں۔ بصورت دیگر ہوسکتا ہے کہ لڑائی چھڑ جائے اور بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کو اہل یثرب کی طرف سے کوئی مدد نہ ملے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اس لئے گفتگو میں سبقت کی اور اہل مدینہ سے کہا: رسول کریم ﷺ کی جو قدر و منزلت ہمارے دل میں ہے محتاج بیان نہیں۔ ہم قریش کے ہم عقیدہ ہیں لیکن اس کے باوجود قریش کے مظالم سے ہم انہیں ہر طرح سے بچائے ہوئے ہیں لہٰذا یہ اپنے شہر میں اور اپنے قرابت داروں کے درمیان ہر طرح محفوظ و مامون ہیں۔ اب ان کا خیال ہے کہ آپ لوگوں سے علاقہ قائم کریں اور آپ کے شہر میں جا کر رہیں۔ اگر آپ لوگ انہیں مخالفین کے ظلم و ستم سے بچا سکتے ہیں اور اپنے عہد پر ثابت قدمی سے جمے رہنے کا عزم کر چکے ہیں تو یہ ادائے فرض کی بہترین صورت ہوگی لیکن اگر انہیں تحقیر و تذلیل کے بعد دشمنوں کے حوالے کرنا مقصود ہو تو اسی وقت ان سے قطع تعلق کر لیجئے۔

اہل مدینہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی باتیں سنیں تو کہا کہ: جو کچھ آپ نے فرمایا ہے ہم نے غور سے سنا، بعد ازاں انہوں نے آنحضرت ﷺ سے مخاطب ہو کر کہا: اے خدا کے پیغمبر ﷺ! آپ ارشاد فرمایئے۔ آپ ہم سے جو عہد بھی فرمائیں گے ہم اس کی بجا آوری کے لئے تیار ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے چند قرآنی آیات کی تلاوت کی۔ مختصر الفاظ میں دعوتِ اسلام دینے کے بعد فرمایا: میں آپ لوگوں سے یہ عہد لینا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے زن و فرزند کی طرح میری حمایت کا بیڑا اٹھائیں۔

براء بن عازب اپنی قوم کا سردار تھا اور عقبہ کے اولین معاہدہ کے بعد اس نے اسلام قبول کیا تھا۔ یہ شخص مراسم اسلام ادا کرتا لیکن بیت المقدس کے بجائے کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتا تھا۔ اس مسئلے میں اس کے اور دوسرے مسلمانوں کے مابین اختلاف تھا۔ مکہ پہنچنے کے بعد اس معاملے میں مسلمانانِ یثرب نے آنحضرت ﷺ، سے فیصلے کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے براء کو ہدایت کی کہ بیت المقدس کی جانب منہ کر کے نماز ادا کیا کرو۔ جب نبی اکرم ﷺ نے مسلمانان مدینہ سے فرمایا کہ میری حفاظت اپنے اہل و عیال کی طرح کرنا۔ اس وقت براء نے آپ ﷺ کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ہم عہد کرتے ہیں خدا کی قسم! ہم جنگ آزمودہ اشخاص ہیں اور یہ فطرت ہمیں اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملی ہے۔ اس سے پہلے کہ براء کی بات ختم ہو، ابوالہیثم بن تیہان نے اس کی بات کاٹ کر کہا اے پیغمبر خدا ﷺ! یہودیوں سے ہمارے تعلقات ہیں، ہم انہیں قطع کر دیں گے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ جب آپ ﷺ کو فتح و نصرت عطا ہو تو آپ ﷺ ہمیں چھوڑ کر اپنے لوگوں میں واپس چلے آئیں۔ آنحضرت ﷺ نے تبسم فرمایا اور اس کے جواب میں کہا: آپ لوگ مجھ

Marfat.com

سے ہیں اور میں آپ سے ہوں۔ جس سے بھی آپ جنگ کریں گے میں بھی جنگ کروں گا اور جس سے صلح ہو گی اس سے ہماری صلح بھی ہو گی۔ لوگ عہد کے بعد اٹھنے لگے تو عباس بن عبادہ نے کہا: "اے خزرجیو! تم ان کے ساتھ یہ عہد کر رہے ہو کہ ان کے مخالفین کے ساتھ جنگ کرو گے اگر تمہارے اندر اس بات کا حوصلہ نہیں ہے اور نقصان جان و مال اٹھانے کے بعد انہیں دشمنوں کے حوالے کر دینا چاہتے ہو تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو ورنہ دونوں جہان میں گھاٹے میں ہوں گے اور اگر یہ یقین ہے کہ تم اپنے عہد پر قائم ہو گے اور اتلافِ جان و مال سے تمہارے حوصلے پست نہ ہوں گے تو انہیں اپنا پیشوا بنا لو۔ دونوں جہاں کی فلاح اسی میں ہے۔"

عباس رضی اللہ عنہ بن عبادہ کی یہ باتیں سن کر سب نے کہا: ہم اپنے مال و جان سے قطعاً کوئی دریغ نہیں کریں گے اور ہمارے اور ان کے پیمانِ وفا میں کوئی فرق نہیں آئے گا لیکن اس کا صلہ کیا ہو گا؟ نبی کریم ﷺ نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ آپ لوگوں کو اس کے صلے میں بہشت ملے گی۔ غرض مسلمانانِ مدینہ اور آنحضرت ﷺ کے مابین پختہ معاہدہ ہو گیا۔ بعد ازاں آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ اپنی جماعت میں سے بارہ اشخاص کو اپنا نقیب مقرر کر لو جو اہم امور کی سرانجام دہی اپنے ذمے لیں۔ نو اشخاص خزرجیوں میں سے اور تین اوسیوں سے نقیب مقرر کیے گئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان نقیبوں سے فرمایا:

> "آپ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوارین کی طرح اپنے لوگوں کے سرپرست ہیں اور میں بھی اپنے لوگوں کا سرپرست ہوں۔"

بعد ازاں یہ معاہدہ مرتب ہوا:

> "ہم عہد کرتے ہیں کہ رنج و راحت اور سختی و نرمی میں ہم آپ کے احکام کی تعمیل کریں گے اور جہاں کہیں بھی ہوں گے لوگوں کی ملامت کی پروا کیے بغیر اعلانِ حق کریں گے۔"

یہ قول و قرار رات کے پچھلے پہر مکہ کی آبادی سے دور گھاٹی میں انجام پائے۔ سب کو گمان تھا کہ اہل مکہ میں سے کسی شخص کو خبر نہیں لیکن یہاں سے ہٹنے ہی کو تھے کہ کسی نے قریش سے کہا کہ آنحضرت ﷺ اور دین سے برگشتہ لوگوں کی ایک جماعت نے تمہارے ساتھ لڑنے کا عہد کر لیا ہے۔ جس شخص نے قریش کو اس واقعے کی اطلاع دی وہ کسی کام سے اس گھاٹی کی طرف آیا تھا اور اس نے تمام باتیں سن لی تھیں۔ اس نے صرف یہی نہیں کہ قریش کو مسلمانوں کے عہد و پیمان کی خبر دی بلکہ یثربی معاہدین کو بھی یہ کہہ کر کہ اب راز آشکارا ہو چکا ہے، نقضِ عہد کی ترغیب دی لیکن مسلمانانِ یثرب اپنے عہد پر مضبوطی سے قائم رہے۔ اس مخبر کی باتیں سن کر عباس بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ اس خدا کی قسم جس نے آپ کو منصب نبوت پر فائز کیا، اگر آپ حکم دیں تو ابھی منیٰ کے لوگوں کو تہ تیغ کر دیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہمیں اس اقدام کی

Marfat.com

ابھی اجازت نہیں ملی ہے۔ آپ لوگ اپنی اپنی جگہ واپس چلے جایئے۔ چنانچہ تمام مسلمان اپنے اپنے ٹھکانوں پر جا کر سو رہے۔

معاہدۂ عقبہ سے قریش کی بدحواسی

صبح ہوئی تو مسلمانوں کے معاہدے کی خبر مکے میں عام ہوگئی اور انہیں اس کے نتائج کی فکر لاحق ہوئی۔ کچھ لوگ خزرجیوں کی قیام گاہ پر آئے اور انہیں ملامت کی کہ ''ہم تم سے جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے پھر تم نے کیوں (حضرت) محمد (ﷺ) کی معیت میں ہم سے لڑنے کا معاہدہ کیا ہے؟''

خزرجیوں میں سے جو لوگ مسلمان نہ تھے انہوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ ہمیں اس واقعے کی مطلق خبر نہیں، مسلمان یہ دیکھ کر کہ قریش اس بات پر یقین لے آنے میں متامل ہیں، چپ ہو گئے اور کچھ نہ کہا۔ بعد ازاں قریش کی تشویش اور بڑھ گئی اور انہوں نے اس سلسلے میں مزید تحقیق کی۔ مسلمانانِ یثرب نے اس فرصت کو غنیمت سمجھا اور اپنے وطن کی راہ لی۔ آخر قریش کو وثوق سے معلوم ہو گیا کہ معاہدہ کی خبر درست ہے چنانچہ انہوں نے اہل یثرب کے تعاقب کا ارادہ کیا لیکن موقع ہاتھ سے جاتا رہا تھا۔ اہلِ یثرب کے قافلے میں سے صرف حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ان کے ہاتھ آئے۔ قریش انہیں پکڑ کر مکہ میں لائے اور انہیں طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں دینے لگے یہاں تک کہ جبیر بن مطعم اور حارث بن امیہ نے انہیں پناہ دی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بھی سفر شام میں مدینہ منورہ سے گزرتے وقت جبیر و حارث کو اپنے یہاں ٹھہرایا کرتے تھے۔

مسلمانانِ یثرب نے آنحضرت ﷺ سے جو معاہدہ کیا تھا قریش اس سے خائف تھے۔ انہیں آغازِ نبوت کے بعد تیرہ سال کی مدت میں یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ نبی کریم ﷺ کو تائید الٰہی اور نصرتِ غیبی حاصل ہے۔ وہ حق کی راہ میں ثابت قدم ہیں اور اپنے مقصد کے لئے انہیں اپنی جان کا خوف بھی نہیں ہے۔ تمام مسلمانوں کو دو تین سال گھاٹی میں محصور رکھنے اور اہل مکہ کو آنحضرت ﷺ کی پیروی سے خوفزدہ کرنے کے بعد انہیں یہ یقین ہو چلا تھا کہ ہم نبی کریم ﷺ پر غالب آ جائیں گے اور ان کے پیرووں کی تعداد بھی بڑھنے نہیں پائے گی۔ یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ اور ان کے پیرو تنگ آ کر اپنے آپ کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے۔

مسلمانانِ یثرب اور پیغمبر خدا کے درمیان معاہدہ کی تکمیل کے بعد یہ امید خاک میں مل کر رہ گئی۔ قریش کو اندیشہ ہوا کہ کہیں مسلمان ہم پر غلبہ نہ پالیں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہمارے بتوں کی مذمت زیادہ بے باکی اور آزادی سے کرنے لگیں۔ مدینہ کے مسلمان ان کی تائید و نصرت کے لئے آمادہ ہو گئے ہیں۔ مسلمانانِ مکہ ان کی اعانت سے اپنے دینی مراسم آزادی سے بجا لائیں گے اور دوسروں کو بھی اپنے دین کی دعوت دیں گے اور کون جانتا ہے کہ عرب میں ان کے دین کو کہاں تک ترقی ہو گی۔ اگر اس انقلاب کو جس کے آثار نمودار ہو

Marfat.com

رہے ہیں، ابتدا ہی میں نہ روکا گیا تو مستقبل میں ہمیں لینے کے دینے پڑ جائیں گے اور آنحضرت ﷺ اپنے دوستوں اور ہم نواؤں کی مدد سے ہمیں زیر کرلیں گے۔

غرض قریش کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ نبی کریم ﷺ کو کس طرح شکست دیں اور آنحضرت ﷺ کو یہ یقین تھا کہ جو راہ خدا نے کھولی ہے وہ دین حق کی برتری اور اس کے فروغ کی راہ ہے۔ بہر حال قریش سے اس سلسلہ میں جو مقابلہ ہوگا، سخت ترین ہوگا اور اس سے فریقین کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس معرکے میں راست بازوں کا غلبہ یقینی ہے تاہم ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم اپنی طاقت جمع کریں اور تائید الٰہی کے منتظر رہیں۔ ہمیں چاہئے کہ حکمت سے حصول مقصد کے لئے اپنی مہم جاری رکھیں۔

ہجرت کا اذن

آنحضرت ﷺ نے اپنے پیروؤں کو اس بات کی عام اجازت دے دی کہ وہ جدا جدا مدینہ کی جانب ہجرت کریں تاکہ قریش ان کی جانب متوجہ نہ ہوں اور کسی قسم کا ہنگامہ برپا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ مسلمانوں نے اس حکم کی تعمیل میں الگ الگ یا چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں منقسم ہو کر ہجرت شروع کر دی۔ لیکن قریش کو اس کا پتہ چل گیا اور وہ مسلمانوں کو مدینہ کی راہ سے واپس لانے اور انہیں تکلیفیں دے دے کر دین حق سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرنے لگے یہاں تک کہ اگر کسی کی بیوی قریش سے تعلق رکھتی ہوتی اور اس کا شوہر ہجرت کرنا چاہتا تو اس کی بیوی کو اس کے ہمراہ جانے نہیں دیتے تھے اور جو ان کی بات نہیں مانتا تھا اسے قید و بند کے شکنجوں میں کستے لیکن بات اس سے زیادہ نہ بڑھنے پاتی اور وہ اس خیال سے کہ کہیں مکہ میں خانہ جنگی کی وبا نہ پھوٹ پڑے مسلمان مکہ سے مدینہ کو ہجرت کر رہے تھے اور آنحضرت ﷺ ابھی مکہ ہی میں مقیم تھے۔ کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ آپ ﷺ مکہ ہی میں رہیں گے یا مدینہ چلے جائیں گے کیونکہ اس سے پیشتر بھی آپ ﷺ مسلمانوں کو ہجرت حبشہ کا حکم دے چکے تھے اور خود مکہ ہی میں رہے تھے۔ آخر ایک روز ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے اپنے لئے اجازتِ ہجرت طلب کی جس پر آپ ﷺ نے صرف یہ فرمایا: ابھی جلدی نہ کیجئے شاید خدا آپ کے لئے کوئی رفیق سفر پیدا کردے۔ اس بات کے سوا آپ ﷺ نے اور کچھ نہ فرمایا۔

اس کے باوجود قریش کو آنحضرت ﷺ کی متوقع ہجرت کا اندیشہ ضرور تھا۔ مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہوگئی تھی اور قریب تھا کہ عنانِ اقتدار ان کے ہاتھوں میں آ جائے۔ مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں آباد ہوتے جا رہے تھے اور مسلمانانِ مدینہ کی طاقت میں معتدبہ اضافہ ہو رہا تھا۔ قریش کو خوف تھا کہ اگر نبی کریم ﷺ بھی مدینہ چلے گئے تو حالات خطرناک صورت اختیار کرلیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ اہل مدینہ مکہ پر چڑھائی کر دیں یا اس کی راہ تجارت قطع کر دیں یا اہل مکہ کو حصار میں لے کر بھوکوں مار ڈالیں جس طرح انہوں نے خود مسلمانوں کو اڑھائی تین سال برابر گھاٹی میں محصور رکھا تھا۔

Marfat.com

قریش کو اندیشہ تھا کہ آنحضرت ﷺ مکہ میں رہے اور ہم نے انہیں ہجرت سے باز رکھا تو ہوسکتا ہے کہ اہل مدینہ اپنے پیغمبر ﷺ کی مدد کے لئے مکہ پر چڑھائی کر دیں اس لئے بہتر یہ ہے کہ آپ ﷺ کو ہلاک کر دیا جائے تاکہ یہ خلش باقی نہ رہے لیکن اس صورت میں بھی انہیں یہ خطرہ تھا کہ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب آنحضرت ﷺ کے انتقام کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے اور مکہ میں خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ قریش اس معاملے میں اتنے پریشان تھے کہ کسی ایک رائے پر ان کا خیال نہیں جمتا تھا۔ آخر مشورہ کے بعد دارالندوہ میں ان کا اجتماع ہوا۔ ایک شخص نے مشورہ دیا کہ آنحضرت ﷺ کو قید با مشقت کی سزا دی جائے تاکہ اسی عالم میں ان کی عمر کا پیمانہ لبریز ہو جائے لیکن اس مشورہ سے کسی نے اتفاق نہ کیا۔ دوسرے شخص نے رائے دی کہ بہتر ہے ہم انہیں دیس نکالا دے دیں تاکہ جہاں ان کا جی چاہے چلے جائیں۔ لیکن اس صورت میں اندیشہ تھا کہ حضور ﷺ مدینہ چلے جائیں گے اور جس بات کا خطرہ تھا وہی سامنے آ جائے گی۔

آخر فیصلہ ہوا کہ ہر قبیلے کے نوجوان جمع ہو کر یکبارگی آپ ﷺ پر ٹوٹ پڑیں اور آپ ﷺ کو ہلاک کر دیں۔ اس طرح آپ ﷺ کا خون سب کی گردن پر رہے گا۔ بنی عبد مناف جو تمام قبائل سے بیک وقت لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے مجبوراً آپ ﷺ کا خون بہا لینے پر رضا مند ہو جائیں گے اور قریش ان کی ہلاکت کے بعد آسودگی سے زندگی گزار سکیں گے۔

اس رائے سے سب نے اتفاق کیا اور اس کام کے لئے انہوں نے جوانوں کا انتخاب کر لیا۔ دارالندوہ کے فیصلے کے بعد قریش اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ اب ہماری مقصد برآری کے دن قریب آ گئے ہیں اور عنقریب آنحضرت ﷺ سے ہم ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔ صرف یہی نہیں بلکہ قریش کو یہ امید بھی تھی کہ نبی کریم ﷺ کو قتل کرنے کے بعد دعوتِ اسلام کے آثار بھی مٹ جائیں گے اور جو لوگ مدینہ چلے گئے ہیں وہ بھی اسلام سے برگشتہ ہو کر دوبارہ اپنا آبائی دین اختیار کر لیں گے۔ نیز قریش کے اس اتحاد کی بنیادیں جو متزلزل ہو چکی ہیں از سرِ نو استوار ہو جائیں گی۔

حواشی

ا۔ ہاں اشارہ اس آیت کی جانب ہے:

كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٢١﴾ (سورہ المجادلہ: ۲۱)

"اللہ نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ "میں اور میرے رسول غالب آئیں گے بلاشبہ اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے۔"

*

Marfat.com

باب 9

واقعاتِ ہجرت

قریش کی طرف سے دارالندوہ میں آپ کے خلاف سازشِ قتل کی اطلاع آنحضرت ﷺ کو مل گئی۔ آپ ﷺ کو یہ علم بھی ہو گیا کہ میرے مدینہ ہجرت کر کے چلے جانے سے قریش کو کیا خطرات لاحق ہیں اور اس ہجرت سے انہیں مکہ پر کن آفتوں کے وارد ہونے کا ڈر ہے حتیٰ کہ قریش کے اس اندیشہ سے بھی آپ مطلع ہو گئے کہ وہ آپ کی ہجرت میں شام سے اپنی تجارتی رہ گزر کے انقطاع سے کس قدر خائف ہیں۔

قریش کو اس بات میں مطلق کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ آپ ﷺ کو جب موقع ملا آپ ﷺ ہجرت ضرور کریں گے لیکن کسی کو آپ ﷺ کے ارادے کا علم نہ تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب آپ ﷺ سے ہجرت کی اجازت طلب کی تھی تو آپ ﷺ نے صرف یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ”ابھی جلدی ہی کیا ہے۔ اس پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خاموش ہو رہے لیکن پھر بھی آپ نے احتیاطاً دو اونٹ سفر کے واسطے تیار کر رکھے تھے۔ اکثر مسلمان مدینہ کو ہجرت کر گئے تھے اور بہت تھوڑے تھے جو اپنی کسی نہ کسی مجبوری کے باعث ترکِ وطن پر قادر نہ ہو سکے تھے۔ آخر وحی نازل ہوئی اور آپ ﷺ کو ہجرت کی اجازت مل گئی۔ چنانچہ اسی وقت آپ ﷺ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مکان پر تشریف لے گئے۔ اور انہیں حکم الٰہی کی اطلاع دی۔ ساتھ ہی یہ فرمایا کہ وہ بھی آپ کے ہمراہ رختِ سفر باندھیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے نہایت خوشی اور خوش دلی سے جواب دیا کہ چشم ما روشن دل ماشاد۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جاں فروشی

اس موقع پر ایک ایسا واقعہ ظہور میں آیا جس کی نظیر تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ اس واقعے سے جاں سپاری اور ایثار پیشگی کی قدریں اُجاگر ہوتی ہیں۔ جیسا کہ سطور بالا میں مذکور آ چکا ہے، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سفر مدینہ کے لئے پہلے ہی سے دو اونٹ وقف کر دیئے تھے اور عبداللہ بن اریقط کو اس خدمت پر مامور کیا تھا کہ وہ انہیں چراتے رہیں۔ مدینہ تک رہبری کے لئے بھی انہی سے پیمان طے پایا تھا۔ یہ صاحب ہنوز مسلمان نہ ہوئے تھے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہ تھا کہ مکہ سے روانگی کے فوراً بعد قریش تعاقب ضرور کریں گے اس لیے آنحضرت ﷺ نے مناسب یہی سمجھا کہ سفر ایک ایسی راہ سے کیا جائے جو ناسپردہ ہو

Marfat.com

اور جس سے عام و خاص متعارف نہ ہوں۔

قریش کے جو نوجوان آپ ﷺ کے قتل پر مامور تھے وہ رات پھر اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ آپ ﷺ کہیں بے خبری میں آمادۂ سفر نہ ہو جائیں۔ جس شب کو آپ ﷺ قصدِ ہجرت رکھتے تھے، آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا۔ ''میرے بستر پر سو جانا اور (چند اشیاء سپرد کرتے ہوئے) یہ امانتیں جن جن کی ہیں انھیں سونپ کر خود بھی مدینہ کی راہ لینا۔'' اس شب میں قریش کے نوجوان ایک سوراخ سے یہ دیکھ کر کہ آنحضرت ﷺ کے بستر پر کوئی محوِ خواب ہے، مطمئن تھے اور انہیں یہ یقین تھا کہ ابھی آپ ﷺ مکان ہی میں ہیں۔ نصف شب گذر چکی تھی کہ آنحضرت ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مکان پر تشریف لے گئے اور ان کی معیت میں مکان کے چھوٹے عقبی دروازے سے نکل کر جنوب کی سمت غارِ ثور کا رُخ کیا۔ قریش کو یہ سان گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے جنوب کی سمت عزمِ سفر کیا ہوگا۔

غارِ ثور کا قیام

حضرت عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ، ان کی ہر دو ہمشیرگان حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت اسما رضی اللہ عنہا اور حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ (آزاد کردہ غلام) کے سوا اور کسی کو کانوں کان بھی یہ خبر نہ تھی کہ آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غارِ ثور میں روپوش ہیں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ دن بھر تو مکہ میں قریش کے درمیان ملے جلے رہتے تھے تاکہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں قریش کی چہ میگوئیوں سے باخبر رہیں اور رات پڑتی تو غارِ ثور میں پہنچ کر آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کفارِ قریش کی ریشہ دوانیوں اور منصوبہ بندیوں سے مطلع کرتے۔ حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کا معمول یہ تھا کہ دن بھر بکریاں چراتے اور دن ڈھلے ہی انہیں غارِ ثور کے قریب لے جاتے تاکہ سرورِ کونین ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ شکم سیر ہو کر دودھ پی سکیں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ غار سے نکلتے تو حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ ان کے پیچھے پیچھے بکریاں ہانک کر لے جاتے تاکہ نقوشِ قدم مٹ جائیں اور کسی کو یہ شبہ بھی نہ ہو کہ اس طرف سے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ گزرے ہیں۔ آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تین دن برابر غارِ ثور میں رہے۔ اس اثنا میں کفارِ قریش نے ان کی سراغ رسانی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں رکھا۔ انھیں یہ خدشہ تھا کہ اگر آنحضرت ﷺ صحیح و سالم بخیریت تمام مدینہ پہنچ گئے تو ہم پر قیامت آجائے گی۔

آنحضرت ﷺ جب تک غارِ ثور میں روپوش رہے، ہر لحظہ ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی قسمت رب کے حوالے کر دی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہر آہٹ پر کان لگائے ہوئے تھے اور انہیں یہ فکر دامن گیر تھی کہ قریش میں سے کوئی غار تک نہ آ پہنچے۔ ہوا یہ کہ جوانانِ قریش آنحضرت ﷺ کے تجسس میں غارِ ثور تک آ ہی نکلے اور ایک گلہ بان سے انھوں نے یہ پوچھا کہ اس کے خیال

Marfat.com

میں آنحضرت ﷺ کہاں ہو سکتے ہیں؟ گلہ بان نے اٹکل سے جواب دیا۔ ''بہت ممکن ہے غار میں روپوش ہوں لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے کسی کو اس غار میں آتے جاتے نہیں دیکھا۔'' گلہ بان کا جواب سُن کر، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ آخر انہوں نے اپنا معاملہ خدا کو سونپ دیا۔ قریشی نوجوان غار کے اوپر آئے، ان میں سے ایک غار کے منہ پر پہنچ کر واپس ہو گیا۔ اس کے ساتھیوں نے اس سے دریافت کیا کہ تو نے غار میں جھانک کر کیوں نہیں دیکھا۔ اس پر اس نے جواب دیا۔ ''جھانک کر کیا دیکھتا۔ غار کے منہ پر مکڑی نے جالا تان رکھا ہے۔ دو جنگلی کبوتر بھی میں نے وہاں بیٹھے ہوئے دیکھے، مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت سے پہلے تک اس غار میں کسی نے قدم نہیں رکھا۔ احتیاطاً میں نے جھانک کر بھی دیکھ لیا ہے، مجھے تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔'' اس نازک ساعت میں آنحضرت ﷺ دعا مانگ رہے تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر کیفیت اضطراب طاری تھی اور اس عالم میں وہ آں حضرت ﷺ سے قریب تر ہوتے جاتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے انھیں الہامی زبان میں تسلی دی:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ

''غمگین نہ ہو، بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔''

کتب احادیث میں روایت منقول ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو احساس ہوا کہ کفار قریش تلاش کرتے کرتے غار کے قریب آ گئے ہیں تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے آہستگی کے ساتھ کہا۔ ''اگر ان میں سے کوئی نیچے کی جانب نظر ڈالے گا تو ہم اس کی نگاہوں سے مخفی نہیں رہ سکتے۔'' آنحضرت ﷺ نے حکیمانہ انداز میں ارشاد فرمایا۔ ''ایسے دو شخصوں سے متعلق جن میں تیسرا خدا ہو، آپ کا کیا عقیدہ ہے (کیا انھیں کوئی گزند نہ پہنچا سکتا ہے)؟'' قریش کے نوجوانوں نے یہ بھی دیکھا کہ غار کے دہانے پر ایک درخت کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ اتنی گھنی ہیں کہ انھیں کاٹے اور صاف کیے بغیر کوئی شخص بھی غار میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ان تمام باتوں سے انھیں یہ پختہ یقین ہو گیا کہ غارِ ثور میں کوئی نہیں ہے۔ یہ قریشی نوجوان ناکام لوٹے اور آپ ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے لوٹتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنی۔ اس واقعہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایمان باللہ میں اور بھی زیادہ پختگی اور استواری آ گئی۔ اس موقع پر تشکرانہ انداز میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''الحمد اللہ! اللہ اکبر (حمد و ثنا خدا کے لئے سزاوار ہے اور اللہ کو کبریائی زیب دیتی ہے)۔''

معجزہ اور کتب سیرت

غارِ ثور کے منہ پر تنے ہوئے مکڑی کے جالے، وحشی کبوتروں اور درخت کی پھیلی ہوئی شاخوں کی موجودگی کو کتب سیرت میں معجزے سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان کے معجزہ ہونے کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ

Marfat.com

چیزیں وہاں پیشتر موجود نہ تھیں۔ آنحضرت ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جونہی غارِ ثور میں داخل ہوئے مکڑی نے جالا تان دیا، جنگلی کبوتروں نے وہاں گھونسلا بنا کر انڈے دے دیے اور ایک درخت نے اپنی شاخیں پھیلا کر غار کا منہ ڈھانپ دیا۔ درمنگھم رقم کے بقول کہ صرف یہی ایک ایسا واقعہ ہے جسے مورخین نے تاریخ میں معجزے کی حیثیت دی ہے یعنی مکڑی کا جالا بننا، کبوتروں کا انڈے دینا اور درخت کی شاخوں کا پھیلنا وغیرہ۔ لیکن ایسے عجائب تو آئے دن وقوع میں آتے رہتے ہیں۔

سیرت ابن ہاشم میں اس معجزے کا سرے سے کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سیرت نگار نے غارِ ثور کے واقعے سے متعلق صرف یہ تحریر کیا ہے کہ:

آپ ﷺ غارِ ثور کی جانب گئے اور اس میں داخل ہو گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے فرزند حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو یہ ہدایت دی کہ دن کو قریش کی باتیں سن سنا کر، رات کے وقت ہمیں اطلاع دے دیا کریں، انھوں نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کو اس خدمت پر مامور کیا کہ دن بھر وہ کسی اور جانب بکریاں چرائیں لیکن جب رات پڑے تو انہیں ہانک کر غار کے قریب لے آئیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت اسما رضی اللہ عنہا رات کے وقت کھانا پہنچایا کرتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ تین دن رات غار میں پناہ گزین رہے۔ قریش نے اعلان کیا تھا کہ جو شخص آنحضرت ﷺ کو پکڑ لائے گا اسے ایک سو اونٹ انعام میں ملیں گے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ دن بھر مکے میں قریش کے درمیان رہتے اور وہ باتیں سنتے جو آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیا کرتے تھے۔ رات کو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ یہ باتیں غارِ ثور میں آکر آنحضرت ﷺ کو سناتے۔ حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ رات کو بکریاں لے کر غار کے قریب پہنچ جاتے اور نبی کریم ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کا دودھ پیتے۔ جب صبح کو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ واپس جاتے تو حضرت عامر رضی اللہ عنہ ان کے عقب میں بکریاں ہانک کر لے جاتے تاکہ نقوشِ قدم مٹ جائیں۔ تین دن گزرنے کے بعد قریش کی آتشِ انتقام قدرے سرد پڑ گئی۔ آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جس شخص کو سفر میں اپنی رہنمائی کے لیے منتخب کیا تھا وہ تین اونٹ لے کر حاضر ہوا۔ دو اونٹ آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے اور ایک اونٹ اپنے لیے۔''

غارِ ثور میں آنحضرت ﷺ کی پناہ گزینی اور اس سے روانگی کے بارے میں یہ ابن ہشام کا بیان ہے۔ قریش نے آنحضرت ﷺ کے تعاقب میں جو تگ و دو کی اس کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں۔

(الف) وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ (سورۃ انفال: ۳۰)

''(اے رسول ﷺ) یاد کیجیے جب کفار داؤ فریب سے یہ چاہتے تھے کہ آپ کو گرفتار کر لیں یا قتل کر دیں یا دیس نکالا دیں، اور صورت یہ تھی کہ کفار اپنے جتن کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنی تدبیر سے ان کے حیلے کا توڑ کر رہا تھا اور اللہ تعالیٰ بہترین تدبیر کار ہے۔''

(ب) اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (سورۃ التوبہ: ۴۰)

''اگر تم (رسول ﷺ) آپ کی مدد نہ بھی کرو (تو اس سے بگڑتا کیا ہے) (اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کا مددگار ہے) اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی مدد اس وقت بھی کی جب کفار نے آپ ﷺ کو دیس نکالا دیا، صرف دو آدمی تھے دو میں سے دوسرے (ایک) آنحضرت ﷺ جب وہ دونوں غار میں تھے، اپنے رفیق کو نصیحت فرما رہے تھے۔ غمگین نہ ہو، بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر سکون واطمینان کی کیفیت طاری کی اور آپ کی فرشتوں کی ایسی فوج سے مدد کی جس کو تم نہ دیکھ سکے۔ اس نے کافروں کی بات نیچی کر دی اور اللہ کے نام کا بول بالا رہا اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔''

مدینہ کی راہ پر

تیسرے روز جب آپ ﷺ کو یہ علم ہو گیا کہ قریش کے انتقامی جذبات پر اوس پڑ گئی ہے تو آنحضرت ﷺ نے مدینہ کے لئے عزمِ سفر کیا۔ عبداللہ بن اریقط اونٹ لے کر وقت مقررہ پر آ موجود ہوا۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے کھانا پہنچایا۔ اس موقع پر سامان خورونوش باندھنے کے لئے کوئی چیز ہاتھ نہ آئی تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے کمر سے اپنی پٹی کھولی اور اس کے دو ٹکڑے کئے۔ ایک ٹکڑے میں تو کھانا باندھا اور دوسرا اپنی کمر سے لپیٹ لیا۔ آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھ کر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو ذات النطاقین کے خطاب سے نوازا۔ یہ خطاب تمام عمر ان کے نام کا جزو بنا رہا اور آج بھی وہ اسی خطاب سے یاد کی جاتی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پانچ ہزار درہم تھے اور یہی ان کی پونجی تھی۔ غار ثور ہی میں یہ پتا چل گیا تھا کہ قریش کے کچھ

جوان تعاقب میں ہیں اس لئے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفیق سفر دونوں غیر معروف راستے سے عازم مدینہ ہوئے۔ پوری رات اور دن کے ایک حصے میں آپ ﷺ کا سفر جاری رہتا تھا۔ سفر کی زحمت اور اس کی صعوبت کا مطلق خیال نہ تھا البتہ اگر کچھ تھوڑی بہت فکر تھی تو قریش کے ہاتھوں گرفتار ہونے کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آنحضرت ﷺ کو اپنے خدا پر کامل اعتماد تھا لیکن یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ آپ ﷺ جان بوجھ کر اپنے آپ کو خطرے میں ڈال دیتے۔ خدا بھی اپنے بندوں کی اسی وقت مدد کرتا ہے جب بندے خود اپنی مدد کے لئے آمادہ ہوں اور دوسروں کی مدد سے دریغ نہ کریں۔ اگرچہ آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غار ثور سے بہ حفاظت تمام نکل آئے تھے لیکن آپ کو یہ بھی علم تھا کہ قریش نے آپ ﷺ کی گرفتاری کے لئے انعام مقرر کر دیا ہے اور انعام کی طمع میں لوگ کیا کچھ نہیں کر گزرتے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ قریش آنحضرت ﷺ کو اپنا دشمن سمجھتے تھے لہٰذا بدوی فطرت کے مطابق ان سے یہ بعید نہ تھا کہ وہ خونریزی پر اتر آئیں۔ قریش کے لئے ایسے آدمی کے قتل کر ڈالنے میں کیا تامل ہوسکتا تھا جو اپنی مدافعت نہ کرسکتا ہو۔ ان حالات میں آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے رفیق کے لئے یہ لازم تھا کہ اپنے سفر میں حد درجہ محتاط رہیں۔ اور اپنی حفاظت کا پورا پورا خیال رکھیں۔

سراقہ کا قصہ

آنحضرت ﷺ کی احتیاط بے جا اور نامناسب نہ تھی۔ کسی شخص نے قریش کو خبر دی تھی کہ میں نے راستے میں تین شتر سوار دیکھے ہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ اور ان کے دوست تھے۔ جس وقت مخبر یہ خبر دے رہا تھا' سراقہ بن مالک بن جعشم بھی وہاں موجود تھا' اس خیال سے کہ سو اونٹ کا انعام میں حاصل کرلوں اور یہ شخص محروم رہ جائے وہ کہنے لگا: ''تو نے جن لوگوں کو راستے میں دیکھا وہ کسی اور قبیلے کے تھے۔'' یہ کہنے کے بعد تھوڑی دیر وہاں ٹھہرا' پھر اپنے گھر پہنچ کر ہتھیار سنبھالے' اپنے گھوڑے کو آگے بھیج دیا تاکہ کسی کو اس کے ارادے کا علم نہ ہو۔ تھوڑی دور بڑھ کر گھوڑے پر سوار ہوا اور مخبر کی بتائی ہوئی راہ پر ہولیا۔

آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ راستے میں ستانے اور کھانا کھانے کے لئے ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں بیٹھے ہوئے تھے' مشرق سے آفتاب نے طلوع کیا تو آنحضرت ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آگے جانے کا قصد کیا۔ سراقہ نے انہیں دور سے دیکھ کر گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اگرچہ اس سے پیشتر دوبار اس کا گھوڑا ٹھوکر کھا چکا تھا لیکن اس نے انعام کے لالچ میں اس کی مطلق پروا نہ کی اور برابر اپنے گھوڑے کو دوڑاتا رہا۔ آخر گھوڑے نے اس بری طرح ٹھوکر کھائی کہ سراقہ بھی اس کی پیٹھ پر سنبھل نہ سکا' دھڑام سے زمین پر گرا' معاً اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ یہ کوئی اچھا شگون نہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ خداؤں کی یہ مرضی نہیں کہ میں یہ کام کروں۔ ہوسکتا ہے کہ اگر میں یہ اقدام کروں تو مجھے مصیبت میں مبتلا ہونا پڑے۔ یہ خیال آتے ہی اس

نے آگے جانے والے شتر سواروں کو بہ آواز بلند پکارا اور یہ کہا: ''میری طرف دیکھئے میں سراقہ بن مالک بن جعشم ہوں۔ مجھے آپ سے کچھ کام ہے۔ میری ذات سے آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔'' اس آواز پر آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقا ٹھہر گئے۔ سراقہ نے آنحضرت ﷺ سے بہ اصرار کہا: ''مجھے کچھ لکھ کر دے دیجئے تاکہ ہمارے درمیان نشانی رہے۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کے حسب الارشاد ہڈی یا ٹھیکری پر کچھ لکھ کر سراقہ کو دے دیا۔ سراقہ واپس چلا گیا اور ان لوگوں کی جو آنحضرت ﷺ کے تعاقب میں تھے' غلط رہنمائی کرنے لگا۔

مسلمانانِ مدینہ اور انتظار رسول ﷺ

آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقا جھلسا دینے والی دھوپ اور تپتے ہوئے صحرا میں راستے کی بلندیوں اور پستیوں سے گزرتے چلے جا رہے تھے یہاں تک کہ دوپہر کے وقت بھی انہیں کوئی پناہ گاہ یا نخلستان نہیں ملتا تھا۔ اس بے آب و گیاہ رہگذار میں صبر و ایمان کے سوا آپ ﷺ کے لئے اور کوئی پناہ نہ تھی چنانچہ اسی طرح سات روز برابر آپ ﷺ چلتے رہے۔ دن کو جب دھوپ کی گرمی نا قابل برداشت ہو جاتی تو رک جاتے' رات کو پھر سفر شروع کر دیتے۔ رات کے سناٹے اور ستاروں کے دلفریب سماں سے آپ ﷺ کی اور آپ ﷺ کے رفقا سفر کی روح کو قرار اور دل کو سکون حاصل ہوتا تھا۔ جب آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقا اس مقام پر پہنچے جہاں قبیلہ بنی سہم آباد تھا تو اس قبیلے کے شیخ بریدہ سہمی نے گرم جوشی سے آپ ﷺ کا خیر مقدم کیا۔ اس سے آپ ﷺ کی تشویش رفع ہوئی اور آپ ﷺ کو اطمینان ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے ہمیں یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ اب آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقا مدینہ کے بالکل قریب آ پہنچے تھے۔

اس اثنا میں آنحضرت ﷺ کی ہجرت مدینہ کی خبر اہل مدینہ کو پہنچ چکی تھی اور انہیں یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ قریش نے آپ ﷺ کا تعاقب بھی کیا ہے۔ تمام مسلمان بڑی بے صبری سے آپ ﷺ کی آمد کے منتظر تھے۔ ان میں سے بہت سے مسلمان ایسے بھی تھے جو ابھی آپ ﷺ کے دیدار سے مشرف بھی نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے صرف آپ ﷺ کے حالات سنے تھے اور آپ ﷺ کے اصحاب کی تبلیغ سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ ایک دن سعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ اور مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ چند مسلمانوں کے ساتھ بنی ظفر کے ایک باغ میں بیٹھے تھے۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ (یہ دونوں اپنے اپنے قبیلوں کے سردار تھے) کو اس بات کی خبر ملی تو سعد رضی اللہ عنہ نے اسید رضی اللہ عنہ سے کہا: ''یہ لوگ ہمارے یہاں آئے ہیں اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کو دین سے برگشتہ کر دینا چاہتے ہیں، جاؤ اور انہیں اس کام سے روکو۔ سعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ میرا ابن عم ہے، مجھ سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔''

Marfat.com

غرض اسید نے سعد بن زرارہ ؓ اور مصعب بن عمیر ؓ کی جانب اس عالم میں رخ کیا کہ مزاج کا پارہ تیز تھا اور زبان پر زجر وتوبیخ کے الفاظ تھے۔ جب یہ مصعب بن عمیر ؓ کے قریب پہنچے تو موخرالذکر نے کہا: ''آؤ اور ہماری باتیں سنو، جی چاہے تو قبول کرو اور دل نہ مانے تو پھر تمہیں ہم سے نفرت و بیزاری کا حق حاصل ہے۔'' اسید بن حضیر ؓ کو یہ معقول بات پسند آئی اور انہوں نے کہا: ''آپ نے بجا فرمایا۔'' یہ کہہ کر اپنی تلوار زمین پر رکھ کر قریب ہی بیٹھ گئے۔ مصعب بن عمیر ؓ کی باتیں سنیں تو صدقِ دل سے ایمان لائے۔ مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد وہ دوسرے سردار سعد بن معاذ کے پاس واپس پہنچے۔ جب سعد ؓ کو ان کے قبولِ اسلام کا علم ہوا تو بہت غضبناک ہوئے اور خود غصے میں بھرے ہوئے مسلمانوں کے پاس پہنچے لیکن مصعب بن عمیر ؓ کی باتیں سن کر یہ بھی ایمان لائے بغیر نہ رہ سکے۔ قبولِ اسلام کے بعد سعد بن معاذ ؓ اپنی قوم میں گئے اور دریافت کیا: ''اے بنی عبدالاشہل! تمہاری نظر میں میرا کیا درجہ ہے؟'' لوگوں نے کہا: ''آپ ہمارے سردار ہیں اور آپ کی رائے ہماری رائے سے زیادہ وزن رکھتی ہے۔'' بعدازاں سعد بن معاذ ؓ نے کہا: ''جب تک تم خدا اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہ لاؤ گے میں تم سے بات تک بھی نہیں کروں گا۔'' یہ سنتے ہی قبیلہ بنی عبدالاشہل کے تمام مرد وزن مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

مدینہ میں اسلام کی اشاعت

مدینہ میں آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے قبل اسلام کی اشاعت اور اس کی قوت کا دائرہ اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ مسلمانانِ مکہ اس کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ مسلمان نوجوان اپنے بت پرست رشتہ داروں کے معبودانِ باطل پر طنز وتعریض کرتے تھے۔ قبیلہ بنی سلمہ کے سردار عمرو بن جموح نے منات نام کا ایک لکڑی کا بت اپنے گھر میں نصب کر رکھا تھا۔ جب اس قوم کے نوجوان مشرف بہ اسلام ہوئے تو انہوں نے رات کے وقت منات کو اس مقام پر جا ڈالا جہاں بستی کے لوگ رفع حاجت کے لیے جاتے تھے۔ عمرو اپنا بت ڈھونڈ ڈھانڈ کر اٹھا لایا اور پھر اسے پاک صاف کر کے اس کی جگہ پر نصب کر دیا۔ اگلی رات کو مسلمان نوجوانوں نے پھر یہ بت کوڑے پر پھینک دیا اور عمر پچھلی رات کی طرح پھر اسے اٹھا لایا۔ غرض کئی بار یہ واقعہ پیش آیا۔ آخر عمرو بن جموح کو غصہ آ گیا اور اس نے منات کی گردن میں تلوار لٹکا کر کہا: ''اگر تو کچھ کر سکتا ہے تو خود اپنی حفاظت کر اور لے یہ تلوار سنبھال۔'' صبح اٹھ کر دیکھا تو بت پھر غائب تھا۔ عمرو بن جموح نے اسے ڈھونڈا تو اس کا سراغ ایک گڑھے میں ملا جہاں اس کے پاس ہی ایک کتے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کی گردن سے تلوار بھی غائب تھی۔ اس واقعے کے بعد جب مسلمانوں نے اسے اسلام کی دعوت دی تو وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گیا کیونکہ اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ بت پرستی انسان کو ایسی پستی میں دھکیل دیتی ہے جسے انسانیت اور شرافت سے دور کی نسبت بھی نہیں ہوتی۔

Marfat.com

ان امور سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اہل مدینہ کس تمنا اور کس آرزو کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی آمد کے منتظر ہوں گے۔ مسلمان روزانہ صبح سویرے بستی سے باہر جاتے اور دن چڑھے تک آنحضرت ﷺ کی آمد کے منتظر رہتے۔ نبی کریم ﷺ مقامِ قبا (یہ بستی مدینہ سے دو فرسخ کے فاصلے پر ہے) پہنچے اور یہاں آپ ﷺ نے چار روز قیام کیا۔ اس اثنا میں آپ ﷺ نے مسجد قبا کی بنیاد ڈالی۔ ابھی آپ ﷺ کا قیام قبا ہی میں تھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی آپ کے ساتھ آ ملے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہل مکہ کی امانتیں واپس کر دی تھیں اور پھر مدینہ کی راہ لی تھی۔ آپ رات کو سفر کرتے اور دن کو کسی مقام پر روپوش ہو جاتے اس طرح دو ہفتے کی جاں کاہ زحمت سفر برداشت کرنے کے بعد آپ اپنے برادرانِ دینی تک پہنچے تھے۔

مدینہ میں ورودِ مسعود

ایک دن مسلمانانِ مدینہ اپنے معمول کے مطابق آنحضرت ﷺ کی آمد کے منتظر تھے کہ ایک یہودی نے انہیں آپ ﷺ کی آمد کی خوشخبری سنائی۔ جمعہ کا دن تھا، آنحضرت ﷺ نے نمازِ جمعہ مدینہ میں ادا کی، سب مسلمان وادی رانونا کی مسجد میں جمع ہو گئے۔ ان کو یہ اشتیاق تھا کہ جلد از جلد آنحضرت ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوں۔ وہ آپ ﷺ سے قرب تر ہونا چاہتے تھے۔ ہر روز نماز میں چند بار آپ ﷺ کا نام نامی ان کی زبان پر آتا تھا، گوشہ دل میں اپنے محبوب آقا کو پہلے ہی جگہ دے چکے تھے۔ اب ان کی آرزو تھی کہ انہیں اپنی آنکھوں میں بٹھائیں۔ چند امرائے مدینہ نے آپ ﷺ سے بصد ادب درخواست کی کہ آپ کے مستقل قیام کے لیے ہمارے غریب خانے حاضر ہیں تشریف لائیے اور ہمیں اس کی سعادت بخش دیجیے لیکن آپ ﷺ نے معذرت فرماتے ہوئے اپنے اونٹ کی مہار چھوڑ دی۔ اونٹ مدینہ کی گلیوں سے گزر رہا تھا اور مسلمانوں کا ہجوم اس کے گرد و پیش تھا۔ مدینہ کے تمام یہودی اور مشرکین اس نظارے سے حیرت زدہ تھے کہ اس جلیل القدر مہاجر کے پرانے جانی دشمن اوس و خزرج اس پر جان چھڑک رہے ہیں اور ان کی آنکھیں فرشِ راہ بنی ہوئی ہیں۔ ہر خاندان اسے اپنا مہمان بنانے کی آرزو دل میں لیے ہوئے ہے۔ ان یہودیوں اور مشرکین کو اس وقت یہ احساس نہ تھا کہ تاریخ کا نیا باب شروع ہو رہا ہے اور تقدیر مدینہ کو مجد و شرف کا وہ مقام عطا کر رہی ہے جس پر لیل و نہار کی گردشیں اثر انداز نہیں ہوں گی۔

آنحضرت ﷺ کا اونٹ چلتا رہا، یہاں تک کہ قبیلہ بنی نجار کے دو یتیم لڑکوں کی افتادہ زمین کے پاس پہنچ کر زمین پر اس نے اپنے گھٹنے ٹیک دیے۔ آنحضرت ﷺ اس کی پشت سے اترے اور یہ دریافت کیا کہ یہ جگہ کس کی ملکیت ہے معاذ بن عفرا رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اس کے مالک سہل اور سہیل دو یتیم ہیں ان کا باپ عمرو تھا۔ ہم انہیں رضامند کر لیں گے۔ ہماری تمنا ہے کہ یہاں مسجد کی تعمیر کی جائے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ تجویز قبول فرمالی اور حکم دیا کہ اس جگہ مسجد بھی تعمیر کی جائے اور میرا مکان بھی یہیں بنے۔

*

Marfat.com

Marfat.com

باب 10

مدینہ منورہ کا ابتدائی زمانہ

مدینہ منورہ کے رہنے والے مسلمان اور یہود و مشرک سب استقبال کے لئے گھروں سے نکل آئے۔ مردوں کے جتھے ایک طرف ہیں۔ عورتوں کے گروہ علیحدہ ہیں۔ کہیں اِکا دُکا مرد اور کسی طرف تنہا کوئی عورت کھڑی ہوئی راہ تک رہی ہے۔ اہل مدینہ اس ہجرت کے اسباب پر مطلع ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ قریش نے آنحضرت ﷺ کو روکنے کے لئے کیا کیا بندشیں باندھی تھیں۔ وہ اس تصور سے بھی آشنا تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس سفر میں کن کن صعوبتوں سے پالا پڑا۔ تہامہ کی شعلہ ریز چٹانیں جو آفتاب کی تمازت سے دوزخ کا نمونہ بن جاتی ہیں، مہاجر عظیم ﷺ ان سلوں کو روندتے ہوئے ہمارے شہر کو اپنی قیام گاہ کی عزت بخشنے کے لئے آ رہے ہیں۔

استقبال کی تحریک کچھ تو شوق زیارت نے کی اور کچھ اس حقیقت نے کہ یہ وہ ہستی ہے جس کے دین کا ڈنکا عرب کے طول و عرض میں بج رہا ہے ہر محفل میں یہی تذکرے اور یہی چرچے تھے کہ آنحضرت ﷺ جس دین کے داعی ہیں وہ عربوں کے آبائی دین کی بنیادیں منہدم کر دے گا۔ آنحضرت ﷺ کی پیشوائی اور آپ ﷺ کے استقبال میں اہل مدینہ نے جس جوش و خروش سے حصہ لیا اس کے اسباب میں مندرجہ بالا اسباب کے علاوہ کچھ اور اسباب و وجوہ کو بھی دخل تھا۔ ایک خاص سبب یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کی مدینہ میں تشریف آوری مستقل قیام کی غرض سے تھی۔ ہر قبیلہ اس سے مختلف سیاسی اور اجتماعی نتائج اخذ کرتا تھا...... ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ اس نے آنحضرت ﷺ سے اپنے خیال اور اپنے قیاس کے مطابق جو توقعات وابستہ کی ہیں وہ کسی نہ کسی صورت ضرور پوری ہوں اور آپ ﷺ کے وجود مسعود کی خیر و برکت سے مدینہ کی قدر و منزلت اور اس کی اجتماعی زندگی میں خوش آئند تغیرات رونما ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ آنحضرت ﷺ کے استقبال میں صرف مسلمانوں ہی نے نہیں بلکہ یہودیوں اور مشرکین نے بھی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ آپ ﷺ کے ورودِ مسعود کے وقت مختلف طبقوں کے آدمی قطار در قطار جمع تھے۔ اگرچہ ان کے خیالات میں یکسانی نہ تھی تاہم یہ خواہش سب کے دلوں میں موجزن تھی کہ آپ ﷺ کا دیدار ذرا قریب سے کیا جائے پذیرائی اور پیشوائی کے لیے جو لوگ مجتمع تھے ان میں سے اکثر کے علم میں یہ بات تھی کہ یہ وہی صاحب ہیں جن سے اہل

Marfat.com

مدینہ نے عقبہ کا معاہدہ کیا تھا، جو تیرہ سال تک اشاعت اسلام اور اعلان توحید کی پاداش میں اپنی قوم کے ہاتھوں انسانیت سوز مظالم برداشت کر چکے ہیں اور اب یہ اپنے لوگوں سے منہ موڑ کر اور وطن کو خیر باد کہہ کر مدینہ میں رونق افروز ہو رہے ہیں۔ ذوق و شوق کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کا ہجوم بڑھتا جاتا تھا اور اس میں کوئی نظم اور کوئی ترتیب نہ تھی اپنی اپنی مرضی اور منشا کے مطابق لوگ چاروں طرف سے امڈے چلے آ رہے تھے اور ان میں سے ہر ایک کی دلی خواہش یہ تھی کہ اپنے گرامی قدر مہمان کو چشم و دل کے خلوت کدوں میں جگہ دے۔

مسجد نبوی ﷺ اور کاشانۂ نبوت کی تعمیر

جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں آنحضرت ﷺ کا اونٹ اس زمین میں بیٹھ گیا تھا جو دو یتیموں کی ملکیت تھی چنانچہ ایسا ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ زمین خرید لی اور کاشانۂ نبوت اور مسجد نبوی کی تعمیر تک آپ کا قیام حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان میں رہا۔ آپ ﷺ نے مسجد کی تعمیر میں بذاتِ خود حصہ لیا اور مہاجرین و انصار نے بھی اس کام میں آپ ﷺ کا ہاتھ بٹایا یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ مسجد پایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔ مسجد نبوی ﷺ کی تکمیل کے بعد کاشانۂ نبوت کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ مکان اور مسجد کی تعمیریں سادہ تھیں۔ ان میں کسی قسم کی صنعت کاری اور تعمیری تکلف کو دخل نہ تھا۔ مسجد کی ہیئت ایک وسیع احاطے کی سی تھی جس کی دیواریں اینٹ گارے سے اٹھائی گئی تھیں اس کے ایک حصے کی چھت درختوں کے پتوں سے بنائی گئی تھی اور دوسرا حصہ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ مسجد کا ایک حصہ بے خانماں اور نادار مسلمانوں کے قیام کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ عشا کا وقت آتا تو مسجد میں روشنی کھجوروں کے پتے جلا کر کی جاتی تھی چند سال تک روشنی کا بندوبست اسی نہج پر رہا۔ آخر مسجد کے ستونوں پر جو کھجوروں کے تنوں سے بنائے گئے تھے چند چراغ دان نصب کر دیے گئے۔ کاشانہ نبوت کی تعمیر، مسجد نبوی کی تعمیر سے کچھ مختلف اور کچھ بہتر نہ تھی البتہ آخر الذکر میں پردے کا اہتمام کیا گیا تھا ان دونوں تعمیروں میں صرف یہی فرق تھا۔

مسجد نبوی اور کاشانہ نبوت کی تعمیر کے بعد آنحضرت ﷺ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان سے اپنے دولت کدے میں منتقل ہو گئے اور منزل حیات کے اس موڑ پر غور و فکر کرنے لگے جس نے آپ ﷺ کی دینی دعوت کے لیے ایک نئی راہ کا تعین کیا تھا۔ مدینہ کے باشندوں میں آپ ﷺ کو باہم ایسی منافرت نظر آئی جس کا وجود اہل مکہ میں نظر نہ آتا تھا۔ تاہم قریش کے برعکس مدینہ کے مسلمان قبائل ایسی زندگی کے متلاشی تھے جس میں سکون و طمانیت اس درجہ ہو کہ اس پر کوئی حادثہ اثر انداز نہ ہو سکے۔ کیونکہ ماضی میں انہیں بارہا تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑا تھا وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کا اثر و اقتدار اہل مکہ سے بھی زیادہ ترقی پر ہو لیکن آنحضرت ﷺ کی نظر میں اہل مدینہ کی ثروت اور ان کے اقتدار کا مسئلہ اتنا زیادہ قابل

Marfat.com

توجہ اور درخورِ اعتنا نہ تھا۔ آپ ﷺ کی تمام تر توجہات رسالت کے فرائض کی سرانجام دہی اور دینی تبلیغ پر مرکوز تھیں۔ آغازِ بعثت سے ہجرت تک قریش نے نہایت سختی سے دینِ حق کی مخالفت کی تھی، ان کے مظالم کے خوف سے بہت سے لوگ قبولِ اسلام اور دعوتِ اسلام پر لبیک کہنے سے رکے ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کے دل و دماغ پر ایمان کا پرتو نہ پڑا ہو صرف وہی مصائب و آلام کے خوف سے قبولِ حق سے گریز کرسکتے ہیں۔

مسلمانوں اور ان کے واسطے سے دوسروں پر یہ حقیقت واضح ہوجانی چاہیے کہ جو شخص بھی جادۂ حقیقت اور شاہراہِ دینِ برحق پر گامزن ہوتا ہے وہ لوگوں کی ایذا رسانیوں سے محفوظ ہوجاتا ہے اور یہ اس لیے کہ مسلمانوں کے عقائد میں اس نظریے سے پختگی آئے اور جو غیر مسلم تردد اور تذبذب میں مبتلا ہیں وہ خوشی سے مشرف بہ اسلام ہوجائیں۔ آنحضرت ﷺ اپنے دولت کدے میں منتقل ہوجانے کے بعد ان امور پر سنجیدگی اور کامل انہماک سے غور و خوض کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی زندگی کے حالات سے واقفیت کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ ہم اس مسئلے پر خصوصیت کے ساتھ غور و فکر کا سرمایہ صرف کریں۔ آنحضرت ﷺ مال و جاہ اور تجارت کے طالب نہ تھے البتہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے پیروؤں کی آسودہ روزگاری کا سامان مہیا کریں تاکہ مسلمان بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنے افکار و خیالات اور نظریات وعقائد کے اظہار و اعلان میں آزاد ہوں اور اس آزادی میں مسلمان، عیسائی اور یہودی برابر کے شریک ہوں کیونکہ آزادی کے ماحول میں حقیقت کی قدریں اجاگر ہوتی ہیں اور انسان اگر دنیا میں راہِ کمال پر گامزن ہوتا ہے تو صرف آزادی کے سہارے جہاں عقائد و افکار کی آزادی نہیں، وہاں وہم و گمان راہ پاجاتے ہیں، انسان کی روح پر ظلمت کی گھٹائیں چھاجاتی ہیں اور وہ قوت جو کائنات سے انسان کا رشتہ قائم رکھتی ہے ضعیف اور بے حس ہوجاتی ہے۔

جنگ سے بیزاری

اس روشِ فکر نے آنحضرت ﷺ کو صلح و آشتی پر مائل اور جدال و قتال کے ہولناک تصورات سے بیزار کردیا تھا۔ آپ ﷺ جنگ و خونریزی کے معاملے میں ہمیشہ متامل و متذبذب رہتے تھے۔ جب کبھی دین کے تحفظ کا سوال سامنے آتا تھا اس وقت آپ ﷺ کی طرف سے مدافعانہ جنگ کی اجازت تھی جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے کہ عقبہ کے معاہدہ ثانی کے بعد جب مسلمانانِ مدینہ میں سے ایک شخص نے کہا: ''خدا کی قسم اگر آپ ﷺ حکم دیں تو ہم ابھی اہلِ منیٰ کو تہ تیغ کیے دیتے ہیں۔'' اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ابھی ہمیں اس بات کی اجازت نہیں ملی ہے جنگ کے بارے میں پہلی آیت جو نازل ہوئی وہ یہ تھی:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿٣٩﴾

(سورۃ الحج:۳۹)

Marfat.com

''اجازت دے دی گئی ہے انہیں جو جنگ کرتے ہیں اس لیے کہ انہوں نے ظلم و ستم سہے ہیں اور خدا ان کی فتح و نصرت پر قادر ہے۔''

اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (سورۂ انفال:۳۹)

''اور ان کے ساتھ جنگ کرو یہاں تک کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور تمام دین اللہ کے لئے ہو۔''

آنحضرت ﷺ کو سوائے اس بات کے اور کوئی دھن نہ تھی کہ مسلمانوں کو دینی آزادی حاصل ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے آپ ﷺ نے جنگ کی اجازت بھی دی اور اپنے پیروؤں کو یہ واضح حکم دے دیا کہ جو زیادتی کرنے پر تلے ہوئے ہیں ان کے خلاف ضرور تلوار اٹھائیں تا کہ ظالم کسی کو دین سے منحرف اور کسی کو محض عقائد کی بنا پر تختۂ مشق ستم نہ بنا سکیں۔

ایک نئے باب کی شروعات

ایک طرف تو آنحضرت ﷺ کو مدینہ میں مستقل قیام کے بعد عقائد و افکار کی فکر دامن گیر تھی اور دوسری طرف وہ لوگ بھی جنہوں نے آپ ﷺ کے استقبال میں سرگرمی اور گرم جوشی کا ثبوت دیا تھا اس فکر سے غافل نہ تھے مسلمان مہاجرین اور انصار کے علاوہ اوس و خزرج کے وہ لوگ بھی ابھی مدینہ میں آباد تھے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور ابھی ان کے دلوں میں دیرینہ عداوت کی بھٹی بھی سلگ رہی تھی۔ ان کے علاوہ یہودی بھی مدینہ میں سکونت پذیر تھے۔ بنی قینقاع بستی کے اندر، بنی قریضہ فدک میں، بنی نضیر مضافات میں اور خیبر کے یہودی مدینہ کے شمال میں بود و باش رکھتے تھے۔

اگرچہ اسلام نے مہاجرین و انصار کے درمیان دوستانہ تعلقات کی طرح ڈال دی تھی لیکن اس کے باوجود آنحضرت ﷺ کو اندیشہ تھا کہ مبادا قدیم عداوتیں پھر ابھر آئیں۔ اس خیال سے آپ ﷺ کی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کی روح پھونک دی جائے اور وہ تمام اسبابِ جنگ دور کر دیے جائیں جو بالعموم جنگ اور خونریزی کا باعث ہوتے رہے ہیں۔ اوس و خزرج کے بت پرست بھی آئے دن کی خونریزی سے ضعیف اور مضمحل ہو چکے تھے اور انہیں یہ بات صاف نظر آ رہی تھی کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے مقابلے میں ہماری حیثیت کچھ بھی نہیں۔ وہ اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان پھوٹ ڈلوا دیں۔ یہودیوں نے نبی کریم ﷺ کا خیر مقدم محض اس توقع کی بنا پر کیا تھا کہ شاید آپ ﷺ انہیں اپنا حلیف بنا کر ان سے معاہدہ کر لیں۔ یہودی یہ چاہتے تھے کہ آپ ﷺ کی اعانت سے عرب کو اپنا ہم نوا بنا کر عیسائیت کی اشاعت کے سیلاب پر بند باندھ دیں۔ ان یہودیوں کو یہ غصہ تھا کہ

Marfat.com

عیسائیوں نے انہیں ارضِ موعود سے دیس نکالا دے دیا تھا۔

اس مقام پر آنحضرت ﷺ کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ اس کی نظیر دیگر انبیا علیہم السلام کے حالات میں نہیں ملتی، اور یہ سیاسی زندگی ہے۔ اس زندگی میں آپ ﷺ کے کمالِ تدبر سے عقل دنگ رہ جاتی ہے اور انسان مجبور ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی شخصیت کی عظمت کا اعتراف کرے۔ نبی کریم ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ اپنے نئے وطن میں امن وسکون اور صلح وآشتی کی فضا پیدا کر دیں تا کہ اس کے باشندوں میں کسی قسم کا اختلاف اور دشمنی نہ رہے۔ پورے عرب میں اس انداز کے نظم وضبط کا وجود کہیں بھی نہ تھا۔ البتہ مدتوں پیشتر یمن میں سیاسی نظام قائم رہ چکا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اس بارے میں اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ سب سے پہلے ضرورت یہ محسوس کی جا رہی تھی کہ مسلمانوں کو معنوی وحدت کی لڑی میں پرو دیا جائے اور انہیں اس شان سے منظم ومتحد کیا جائے کہ دیرینہ عداوتوں کا نام ونشان باقی نہ رہے اور آئندہ کے لیے بھی عناد کی راہیں مسدود ہو جائیں۔ اس خیال سے آپ ﷺ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بن جائیں۔

مؤاخات

اس پر عملدرآمد کی صورت یہ قرار پائی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود آنحضرت ﷺ کے دینی برادر قرار پائے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے درمیان سلسلہ مؤاخات قائم ہوا۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ اخوت کی لڑی میں پروئے گئے۔ حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ کے دینی بھائی عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ ٹھہرائے گئے۔ مہاجرین میں سے ہر ایک نے انصار میں سے ایک ایک شخص کو اپنا منہ بولا بھائی بنا لیا۔ آنحضرت ﷺ نے اس سلسلہ مؤاخات کو نسبی برادری کے مساوی قرار دیا چنانچہ اس طرزِ عمل اور طریق کار سے مسلمانوں کی شیرازہ بندی ہو گئی۔

انصار نے مہاجرین کی دلجوئی اور خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مہاجرین اپنے ساتھ مکہ سے کچھ نہیں لائے تھے، سب کچھ وہیں چھوڑ آئے تھے۔ اکثر مہاجرین کا ذریعہ معاش بھی کچھ نہ تھا۔ ان میں اگر کوئی صاحب ثروت تھا تو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، ایک دن نبی کریم ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس آئے اور یہ کہا: ”کھانے پینے کے لیے کچھ دیجیے تا کہ جسم وجان کا تعلق تو باقی رہ سکے۔“ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ منہ بولے بھائی تھے لیکن حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنا برابر کا شریک کرنا چاہا لیکن حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے یہ بات قبول نہ کی اور کہا تو صرف یہ کہ مجھے بازار کی راہ بتا دیجیے۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی کی خواہش کے مطابق بازار کی نشاندہی کی جہاں مؤخر الذکر نے پنیر کی تجارت شروع کر دی اور

Marfat.com

تجارت میں اپنی اہلیت و قابلیت کے باعث تھوڑے دنوں میں مالدار ہو گئے۔ مدینہ میں انہوں نے شادی بھی کی اور تجارت کے لیے قافلے بھی بھیجنے لگے۔ ان کے علاوہ کچھ اور مہاجرین نے بھی تجارت کے ذریعے سے اپنی معاشی حالت درست کی۔ اہل مکہ تجارت پیشہ تھے اور انہیں اس کے اصول معلوم تھے اس لیے انہیں جلد کامیابی ہوئی۔ ان میں سے ایک شخص کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ یہ شخص اپنے ہاتھ میں مٹی کی چٹکی اٹھاتا ہے تو وہ سونا بن جاتی ہے۔

سلسلہ مؤاخات کے قیام و استحکام کے بعد آنحضرت ﷺ انصار و مہاجرین کی یگانگی کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔ آپ ﷺ کا یہ اقدام سراسر حکمت و دانش پر مبنی تھا۔ منافقین ومخالفین کی مفسدہ پردازیوں اور ریشہ دوانیوں کے پیش نظر اگر نبی کریم ﷺ کے اس اقدام پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کی شیرازہ بندی کے سلسلے میں جو قدم اٹھایا تھا اس میں کتنی حکمت، مصلحت اور دوراندیشی تھی۔

یہودیوں سے معاہدہ

اہم ترین کام یہودیوں کے ساتھ معاہدے کی تشکیل تھی جس کے ذریعے سے آپ ﷺ نے اہل مدینہ کو اختلاف کے باوجود متحد و متفق کر دیا اور انہیں ایک نظام کے تابع کر دیا تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، یہودیوں نے آنحضرت ﷺ کے استقبال میں گرم جوشی کا ثبوت اس لیے دیا تھا کہ وہ آپ ﷺ کو اپنا حلیف بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ان کی توقع کے مطابق ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا اور ان سے روابط استوار کر لیے اس خیال سے کہ یہودی اہل کتاب اور خدا پرست ہیں یہاں تک کہ جس دن یہودی روزے سے ہوتے تھے آپ ﷺ بھی روزہ رکھتے تھے۔ آپ ﷺ بیت المقدس (جو یہودیوں کی عبادت گاہ تھا) کی جانب رخ کر کے نمازیں پڑھتے تھے۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے یہودیوں سے دوستی کی بنیادیں اور بھی زیادہ استوار ہو رہی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کے حسن اخلاق، تواضع، مہر و مروت، شیوۂ صدق و صفا، نیکوکاری اور غربا نوازی نے اہل مدینہ کے دل موہ لیے تھے اور آپ ﷺ کی عزت و منزلت ان کی نگاہوں میں بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ کچھ عرصے بعد یہودیوں کو ایک ایسے معاہدے کی ضرورت محسوس ہوئی جس کی رو سے فریقین ایک دوسرے کے عقائد کے احترام اور ان کی شہری آزادی کے تحفظ کا وعدہ کریں۔

یہ معاہدہ اپنے متن کے اعتبار سے حیرت انگیز ہے اور تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ دوسرے انبیا علیہم السلام کی زندگی میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ ﷺ سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مجادلے اور معجزے کے سہارے دین کی تبلیغ کی تھی اور اس راہ سے سرمو تجاوز نہ کیا تھا۔ وہ اپنے بعد دین کی باگ ڈور اربابِ سیاست اور اصحابِ اقتدار کے ہاتھوں میں سونپ گئے تھے تاکہ سیاسی اقتدار اور جنگ

وجدل کے ذریعے سے دین کی اشاعت و تبلیغ کے فرائض سرانجام دیں۔ مسیحیت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے شاگردوں کی کوشش سے فروغ نصیب ہوا۔ یہ لوگ اپنے عقائد کے تحفظ کی خاطر صبر وسکون سے مصائب برداشت کرتے اور سختیاں جھیلتے تھے یہاں تک کہ روم کے شہنشاہ کی پشت پناہی انہیں حاصل ہوگئی جس کی مساعی سے مسیحیت نے حیرت انگیز ترقی کی۔ دوسرے دین بھی اسی طرح کسی نہ کسی کی حمایت اور پشت پناہی سے پھیلے لیکن مشیت الٰہی کا تقاضا تھا کہ اسلام کو صرف نبی کریم ﷺ کی مساعی کی بدولت فروغ نصیب ہو۔ آپ ﷺ اپنی سیاسی سوجھ بوجھ سے بھی کام لیں اور فتح و نصرت بھی آپ ﷺ کے قدم چومے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان تمام مراحل میں اپنی شخصی عظمت کا ثبوت دیا اور آپ ﷺ کے اخلاق و اطوار سے کمالِ انسانیت کی آئینہ داری بھی ہوتی رہی پہلے آنحضرت ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک معاہدہ کی بنیاد ڈالی اور اس کے بعد یہودیوں سے بھی معاہدہ کیا۔ پہلے معاہدہ کا متن یہ ہے:

معاہدہ کا متن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ نے مہاجرین (مسلمانانِ مکہ اور انصار و مسلمانانِ مدینہ) اور ان غیر مسلم جماعتوں سے جو ان سے تعلق رکھتی ہیں کیا اور جس کی شرطیں یہ ہیں:

یہ سب ملت واحدہ قرار دیے جاتے ہیں۔ مہاجرین قریش اپنی رسوم پر قائم رہیں گے، اگر ان میں سے کسی ایک پر خوں بہا واجب ہوگا تو سب مل کر اسے ادا کریں گے، اپنے قیدیوں کا اجتماعی حیثیت میں فدیہ ادا کریں گے، بنی عوف بھی اپنی رسوم برقرار رکھیں گے اگر ان میں سے کسی ایک پر خوں بہا واجب ہوگیا تو سب اس کی ادائی کی متفقہ طور پر کوشش کریں گے اور ہر قبیلہ اپنے قیدیوں کا فدیہ ادا کرے گا۔ مومن کسی معذور یا مجبور کو اس کے حال پر نہیں چھوڑیں گے اور اس کا فدیہ یا خوں بہا بہ رضا و رغبت ادا کریں گے، کوئی مومن کسی مومن کے غلام سے اس کے علم کے بغیر معاہدہ نہیں کرے گا، اگر کوئی شخص سرکشی کرے، ظلم پر کمر باندھے، جرم کا مرتکب ہو، زیادتی کرے یا مومنوں کے درمیان موجب فساد بنے تو مومن اس کے مقابلے میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے خواہ وہ شخص ان میں سے کسی کا فرزند ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی مومن کسی دوسرے مومن کو کسی کافر کی حمایت میں ہلاک نہیں کرے گا نہ کسی کافر کو کسی مومن کے مقابلے میں مدد دے گا۔ خدا کا عہد ایک ہے، ایک ادنیٰ ترین مسلمان اگر چاہے تو سب کی طرف سے عہد و پیمان کرسکتا ہے۔ مومن باہم ایک دوسرے کے دوست ہیں، انہیں دوسروں سے

Marfat.com

کوئی سروکار نہیں۔

یہودیوں سے معاہدہ

یہودیوں میں سے جو شخص ہمارا پیرو ہوگا (یعنی عہد کی پابندی کرے گا) وہ بھی ہماری اعانت اور ہمارے تعاون کا مستحق ہوگا۔ کوئی شخص اس پر دست درازی نہیں کرنے پائے گا اور ہم اس کے خلاف کسی کی مدد کے لیے آمادہ نہیں ہوں گے، مومن کی صلح، صلح ہے، مومن کسی جنگ میں دوسرے مومن (کی مرضی) کے بغیر انصاف و مساوات سے بے نیاز ہوکر کسی بات کے لیے آمادہ نہ ہوگا، جو قبیلہ ہمارے دوش بدوش جنگ کرے گا، اس کے دستے باری باری حصہ لیں گے، مسلمان اس خونریزی میں جو راہ خدا میں ہوتی ہے ایک دوسرے کے اعانت کریں گے، پرہیزگار مومن ہدایت اور راہِ راست پر چلیں گے کوئی مشرک (مشرکین سے مراد مشرکین مدینہ ہیں جو اس معاہدہ میں شریک ہوئے تھے) قریش کے کسی آدمی یا مال کو اپنی حافظت میں نہیں لے گا اور اس پر تسلط سے کسی مسلمان کو نہیں روکے گا۔ جو شخص کسی مومن کو بے سبب مار ڈالے گا اور اس پر جرم ثابت ہوجائے گا اسے مار ڈالا جائے گا مگر وہ شخص (اس سے مستثنٰی ہوگا) جس سے مقتول کے متعلقین رضا مند ہو جائیں، تمام مومن اس معاہدے سے متفق ہیں اور اس کی کسی دفعہ سے انہیں اختلاف نہیں۔ کسی مومن کے لیے جو معاہدہ کو تسلیم کرتا اور خدا اور روزِ قیامت پر یقین رکھتا ہو یہ زیبا نہیں کہ وہ کسی خطا کار کو مدد یا پناہ دے اور جو کسی مجرم کو پناہ یا مدد دے گا قیامت کے دن خدا کے غضب اور اس کی لعنت کا مستوجب ہوگا اور اس کی توبہ یا فدیہ ناقابل قبول ہوگا۔ اگر کسی معاملے میں اختلاف ہو تو خدا اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کریں جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ یہودیوں کا صرفہ بھی ہوگا، بنی عوف کے یہودی مومنوں کے ساتھ متحد ہیں اور ایک امت کا حکم رکھتے ہیں، یہودی اپنے دین کے اور مسلمان اپنے دین کے پیرو ہیں اور ان کے غلام انہی کے حکم میں داخل ہیں مگر وہ شخص جو ظلم کرے یا جرلم کا مرتکب ہو وہ نہ صرف اپنی ذات کو بلکہ اپنے پورے خاندان کو مصیبت میں مبتلا کرے گا۔ بنی نجار، بنی حارث، بنی ساعدہ، بنی جشم، بنی اوس، بنی ثعلبہ، بنی جفنہ، بنی شغیبہ بھی ایسے ہی ہیں جیسے بنی عوف کے یہودی اور مسلمانوں سے ان کا اتحاد ہے بنی ثعلبہ کے غلام بھی اس معاہدہ میں اسی طرح شریک ہیں جیسے بنی ثعلبہ اور وہ لوگ جو یہودیوں سے وابستہ ہیں وہ بھی یہودیوں کے ذیل میں

Marfat.com

آتے ہیں، کوئی شخص آنحضرت ﷺ کی اجازت کے بغیر معاہدین کے زمرے سے خارج نہ ہوگا، قصاص کا حکم کسی صورت ساقط نہ ہوگا اور جو شخص کسی کا خون بہائے گا اس کے اور اس کے خاندان کے ذمے خوں بہا کی ادائی ہوگی مگر وہ شخص جو مظلوم ہوا اس حکم سے مستثنیٰ ہے، اللہ تعالیٰ ایفائے عہد کے حق میں ہے۔

یہودی بحالت جنگ اپنے مصارف کے متحمل خود ہوں گے اور مسلمان اپنے اخراجات برداشت کریں گے، جو شخص اس معاہدے میں شریک قبائل کے خلاف آمادہ جنگ ہو اس کے مقابلے کے لیے سب مجتمع ہوں گے اور کوئی شخص اپنے ہم عہد سے بے وفائی نہیں کرے گا، مظلوم کی حمایت سب پر فرض ہوگی، اس معاہدے میں شریک ہونے والوں کے لیے مدینہ کا اندرونی حصہ بمنزلہ حرم ہوگا یعنی اس کی حدود میں جنگ جائز نہ ہوگی، ہر شخص کا ہمسایہ خود اس کے برابر ہے کسی کو زیبا نہیں کہ وہ اپنے ہمسائے کے ساتھ بدسلوکی کرے، کسی شخص کو اس کے رشتہ داروں کی اجازت کے بغیر پناہ نہ دی جائے، اس معاہدے میں شریک ہونے والوں کے درمیان اگر کسی معاملے میں اختلاف رونما ہو یا مناقشے کی کوئی صورت پیش آئے تو اس کے تصفیے کے لیے خدا اور خدا کے رسول ﷺ کی جانب رجوع کیا جائے، خدا معاہدے کی بہتری میں ہے۔

قریش اور ان کے دوستوں کو پناہ نہ دی جائے، اگر کوئی شخص مدینہ پر حملہ آور ہو تو اس معاہدہ میں شریک قبائل اس کے خلاف جنگ میں ایک دوسرے کی مدد کریں، اگر انہیں صلح کی دعوت دی جائے تو اسے قبول کرلیں، اگر یہ صلح کا پیغام دیں تو مسلمانوں کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اسے قبول کرنے میں پس و پیش نہ کریں لیکن اس سے وہ شخص مستثنیٰ ہے جو دین کے بارے میں جنگ پر آمادہ ہو، اوس کے یہودی اور ان کے غلام اس معاہدہ سے مستفید ہوں گے ان سے نیک سلوک روا رکھا جائے گا نیکی، بدی سے قطعاً علیحدہ ایک چیز ہے، جو شخص کچھ کرتا ہے وہ اپنے لیے کرتا ہے خدا اس معاہدہ پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے اور اس کا منشا ہے کہ اس کی دفعات پر پورا پورا عمل ہو، ظالم اور مجرم کی حمایت منشائے ایزدی کے منافی ہے، جو شخص مدینہ سے باہر چلا جائے مامون ہے اور جو یہاں رہے وہ بھی امن میں ہے، اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں اور نیکوکاروں کا ناصر و یاور ہے۔

یہ معاہدہ ایک سیاسی کارنامہ ہے جسے آنحضرت ﷺ نے تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال بیشتر سرانجام دیا

Marfat.com

اس کی رو سے افکار و عقائد کی آزادی اور مدینہ میں اہل مدینہ کی حفاظت کے لیے ایک نظام معرض وجود میں آ گیا۔ اس دور میں چہار سو ظلم و فساد اور جور و ستم کا دور دورہ تھا۔ یہ معاہدہ اپنی حیثیت میں اپنی نظیر آپ ہے۔ اگرچہ بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنی قینقاع کے یہودیوں نے اس معاہدے میں شرکت نہیں کی تھی لیکن چند روز کے بعد انہوں نے بھی اسی قسم کا معاہدہ آنحضرت ﷺ سے کیا اور اس طرح مدینہ اور اطراف مدینہ اس کے باشندوں کے لیے امن و سلامتی کے مرکز و محور بن گئے۔ معاہدین پر معاہدہ کی حفاظت اور جنگ کی صورت میں ان پر ایک دوسرے کی مدد لازم ہو گئی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حرم نبوی ﷺ میں

آنحضرت ﷺ اپنی مساعی جمیلہ اور ان کے نتائج سے مطمئن ہو گئے اور مسلمانوں کو بھی امن و سکون نصیب ہو گیا۔ انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے سب اپنی دینی رسوم آزادی سے سرانجام دینے لگے۔ کسی کے ظلم و ستم کا اندیشہ نہ رہا انہی دنوں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (جن کا عقد پہلے ہی ہو چکا تھا) حرم نبوی ﷺ میں داخل ہوئیں۔ ان ایام میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا سنّ دس یا گیارہ سال کا تھا۔ ابھی کم سنی کی عادتیں نہیں گئی تھیں۔ نبی کریم ﷺ کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ نے انہیں اپنے یہاں بھی باپ کے گھر کی طرح کھیلنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اُم المؤمنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا جس حجرے میں تھیں مسجد نبویؐ کے قریب، اسی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رہن سہن تھی۔

اسی زمانے میں نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت کا اعلان ہوا اور شرعی حدود کا تعین بھی انہی ایام میں ہوا۔ مدینہ میں اسلام کی شان دو بالا ہونے لگی۔ آنحضرت ﷺ کے دورِ مدینہ سے پیشتر دستور یہ تھا کہ نماز کے وقت مسلمان خود اپنی اٹکل سے جمع ہو جاتے تھے کسی دعوت یا کسی اعلان کا انتظار نہیں کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ چاہتے تھے کہ ایک بوق (بگل) کے ذریعے سے مسلمانوں کو نماز کے لیے جمع کیا جائے (ان ایام میں یہودی بوق ہی بجاتے تھے) لیکن نماز کے لیے دعوت کا یہ انداز کچھ معقول نہیں معلوم ہوتا تھا، بعدازاں ناقوس خیال آیا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے مشورے کے بعد اس طریق کو بھی قابل عمل نہ سمجھا گیا (ناقوس کا رواج نصاریٰ کے یہاں تھا)۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ناقوس سے آپ ﷺ نے اپنی توجہ وحی الٰہی کے نزول کے بعد ہٹائی۔ اذان پر اتفاق کیا گیا جس کے لئے آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن زید بن ثعلبہ کو حکم دیا:

> ''اے عبداللہ! (بلال رضی اللہ عنہ اذان دیں) تم ان کے پاس کھڑے ہو کر اذان کے کلمات دہراتے جاؤ کیونکہ تمہاری آواز سے بلال رضی اللہ عنہ کی آواز کہیں زیادہ بلند ہے۔''

زنانِ بنی نجار میں سے ایک خاتون کا مکان مسجد کے قریب واقع تھا جو مسجد سے بلندی پر تھا۔ حضرت

Marfat.com

بلال ؓ اس کی چھت پر چڑھ جاتے اور اپنی رسیلی اور سریلی آواز میں اذان دیتے۔ نسیم سحر کی لہریں صبح صادق کی نوید جانفزا کے ساتھ ساتھ حضرت بلال ؓ کی کوثر سے دھلی ہوئی زبان سے نکلے ہوئے کلمات مسلمانانِ مدینہ کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں رس گھولتے اور وہ نماز کے لیے آمادہ ہوجاتے۔ اذان کے کلمات یہ ہیں (جنہیں آج بھی دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں دہرایا جاتا ہے)

اَللّٰہُ اَکْبَر، اَللّٰہُ اَکْبَر، اَللّٰہُ اَکْبَر، اَللّٰہُ اَکْبَر، اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللہ دو بار اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللہ دو بار حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ، حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ، حَیَّ عَلَی الْفَلَاح، حَیَّ عَلَی الْفَلَاح، اَللّٰہُ اَکْبَر، اَللّٰہُ اَکْبَر، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

اس طرح مسلمانوں کا خوف و ہراس امن وسکون سے بدل گیا اور یثرب مدینۃ الرسول ﷺ اللہ اور مرکز شوکت اسلام کی حیثیت سے قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ مدینہ کے غیر مسلموں کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ مسلمان طاقت میں ہم سے کہیں بڑھے چڑھے ہوئے ہیں، ان پر غالب آنا ہمارے بس کی بات نہیں کیونکہ ان کی طاقت کا سرچشمہ مادیت نہیں بلکہ روحانیت ہے۔ وہ ایمان کی راہ میں مصائب و آلام کا پامردی سے مقابلہ کر چکے ہیں اور اب قدرت نے انہیں ان کے صبر و تحمل کا پھل دیا ہے اور انہیں یہ موقع ملا ہے کہ وہ آزادی سے اپنی دینی رسوم ادا کر سکیں۔ اسلام نے یہ فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے پر فوقیت نہیں رکھتا عبادت صرف خدا کے لیے مخصوص ہے بندے اس کے سامنے اپنے عجز و درماندگی کا ثبوت نہ دیں تو اور کہاں دیں۔ قدرت ان کے نیک و بد اعمال پر انہیں جزا و سزا بھی دیتی ہے اس اثنا میں آنحضرت ﷺ کو اپنی تعلیمات کے اظہار و اعلان کے لیے خاصے مواقع مل گئے اور آپ ﷺ نے بذات خود ان تعلیمات کا نمونہ بن کر تمدنِ اسلام کی بنیادیں مستحکم کیں۔

تمدنِ اسلام کی بنیاد

تمدنِ اسلام کی بنیاد اخوت اور مساوات پر ہے (اور اس کی تائید آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے)

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ

"تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔"

یہاں تک کہ آپ نے اسی مساوات میں ایسی مہربانی اور لطف کی تعلیم فرمائی جس میں کسی قسم کی تکلیف و زحمت کا احساس نہ ہو۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کون سا عمل بہترین ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

Marfat.com

تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَتَقْرَءُ السَّلَامَ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ

"(حقداروں کو) کھانا کھلائے اور ہر شخص کو خواہ اس سے جان پہچان ہو یا نہ ہو سلام کرے۔"

ایک دفعہ خطبے کے آغاز میں فرمایا:

مَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ یَقِیَ وَجْهَهٗ مِنَ النَّارِ وَلَوْ بِشِقَّةٍ مِنْ تمر فَلْیَفْعَلْ وَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَبِكَلِمَةٍ طیبة فَاِنْ بِهَا تجزیَ الْحَسَنَةُ عشرَ اَمْثَلُهَا

"جو شخص چاہے آدھا خرما کسی کو بخش کر جہنم کی آگ سے محفوظ رہ سکتا ہے اور اگر یہ بات اس کے بس میں نہ ہو تو اچھی باتوں کی بدولت جہنم سے نجات پا سکتا ہے کیونکہ اس کی ایک نیکی کا صلہ دس گنا دیا جائے گا۔"

اُعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَیْئًا وَّاتَّقُوْهُ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَاَصْدِقُوا اللّٰهَ صَالِحَ مَا تَقُوْلُوْنَ وَتَحَابُّوْا بِرُوح اللّٰهِ بَیْنَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ یَغْضِبُ اَنْ ینتكث عَهده

اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ خدا سے جیسا کہ حق ہے، ڈرو اور اس کی راہ میں صدق و صلاح کو اپنا پیشہ بناؤ، ایک دوسرے کو دوست رکھو، ان لوگوں سے جو عہد شکنی کرتے ہیں خدا ناخوش رہتا ہے۔

آپ ﷺ اپنے صحابہؓ سے گفتگو کے دوران اور مسجد میں خطبہ ارشاد کرتے وقت اس قسم کی باتیں کیا کرتے تھے۔ پہلے خطبہ پڑھتے وقت آپ ﷺ کھجور کے ایک ستون کا سہارا لیا کرتے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے حکم سے تین سیڑھیوں کا ایک منبر بنایا گیا آپ ﷺ پہلی سیڑھی پر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے اور دوسری سیڑھی پر بیٹھا کرتے تھے۔

آپ ﷺ کی شفقت و ملاطفت

آپ ﷺ صرف اپنے ارشادات ہی کے ذریعے سے مسلمانوں کو اخوت و مساوات کی تعلیم نہیں دیتے تھے بلکہ آپ ﷺ کا عمل اور آپ ﷺ کا کردار بھی اخوت و مساوات کا بہترین نمونہ تھا۔ آپ ﷺ اللہ کے رسول تھے لیکن اس کے باوجود عظمت و اقتدار کی نمود و نمائش سے آپ ﷺ کو طبعی اور دلی نفرت تھی۔ آپ ﷺ صحابہؓ سے فرمایا کرتے تھے:

لَا تُطْرُوْنِیْ كَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی ابْنَ مَرْیَمَ اِنَّمَا اَنَا عَبْدُ اللّٰهِ. فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُه

"میری تعریف میں ایسا مبالغہ نہ کرو جیسا کہ نصاریٰ ابن مریم کی تعریف میں کرتے ہیں

میں تو خدا کا بندہ ہوں مجھے خدا کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔"

ایک بار آپ ﷺ چند دوستوں کے قریب سے گزرے وہ احتراماً کھڑے ہو گئے آپ ﷺ نے فرمایا:

لَا تَقُوْمُوْا كَمَا تَقُوْمُ الْاَعَاجِمُ يُعَظِّمُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا

"میرے استقبال کے لیے ان عجمیوں کی طرح نہ کھڑے ہوا کرو جن میں سے بعض، بعض کی تعظیم کے لیے ایسا کرتے ہیں۔"

جب اصحابؓ کے پاس تشریف لے جاتے تو مجلس کے آخر میں بیٹھ جاتے، دوستوں سے بلا تکلف ملتے اور خوش طبعی سے گفتگو فرماتے، ان کے بچوں سے کھیلتے اور انہیں اپنی گود میں لیتے۔ آزاد، غلام، لونڈی اور محتاج کی دعوت قبول فرماتے اور مدینہ کے دور افتادہ مقامات میں پہنچ کر بیماروں کی عیادت فرماتے، جو کوئی عذر کرتا اس کا عذر قبول فرماتے، سلام میں ہمیشہ پہل کرتے اور دوسروں کے ساتھ خوش دلی سے مصافحہ کرتے، اگر کوئی قریب بیٹھا ہوتا تو نماز جلد ختم کر دیتے اور اس سے اس کی حاجت دریافت فرماتے، باتیں کرنے کے بعد دوبارہ نماز میں مصروف ہو جاتے۔

آپ ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ خندہ جبیں اور خوش طبع تھے مگر اس وقت جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی یا آپ ﷺ وعظ اور خطبے میں مشغول ہوتے (تو آپ ﷺ کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار نمایاں ہوتے تھے) گھر والوں کا کام کاج میں ہاتھ بٹاتے، اپنے کپڑے خود دھو لیتے، بکری کا دودھ دوہتے، پھٹے ہوئے کپڑوں میں پیوند لگاتے، اپنے جوتے بھی خود ہی گانٹھ لیتے، اپنے اونٹ کی پچھاڑی خود باندھتے، خادم کے ساتھ کھانا کھانے میں آپ ﷺ کو کوئی عار نہ تھی، محتاج، نادار اور کمزور کی حاجت پوری کرتے، جب کسی کو حاجت مند پاتے تو اسے اپنے لوگوں پر خواہ وہ کتنے ہی حاجت مند کیوں نہ ہوں، ترجیح دیا کرتے تھے۔ کل کے لیے کچھ نہ چھوڑتے، وصال کے وقت آپ ﷺ کی ایک زرہ اجناسِ خوردنی کے عوض ایک یہودی کے پاس گروی رکھی تھی۔

ایک دفعہ جب دربار نجاشی کے کچھ لوگ مدینہ آئے تو آپ ﷺ نے ان کی خوب خاطر تواضع کی اور ان کی مہمانداری کے فرائض خود ہی سرانجام دیے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یہ کام ہم پر چھوڑ دیجیے۔ فرمایا ان لوگوں نے ہمارے دوستوں کا احترام کیا تھا میں چاہتا ہوں کہ ان کے حسن سلوک کی تلافی خود ہی کروں۔ وفاداری کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کا ذکر آتا تو آپ ﷺ ان کے بارے میں کلمات خیر ارشاد فرماتے۔ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے منقول ہے کہ مجھے کسی عورت پر رشک نہ آتا تھا البتہ حضرت خدیجہ ؓ کی طرف سے میرے دل میں رشک کے جذبات ضرور موجزن رہتے تھے کیونکہ آنحضرت ﷺ انہیں ہمیشہ یاد فرمایا کرتے تھے۔ ایک بار ایک عورت آئی، آپ ﷺ نے نہایت کشادہ دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ اس

Marfat.com

سے باتیں کیں اور اس کی مزاج پرسی بھی کی۔ وہ عورت چلی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ عورت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں ہمارے یہاں آیا کرتی تھی۔ دوستی اور پاسِ عہد ایمان کی علامت ہے۔''

آپ ﷺ کی نرم دلی اور سادہ طبعی کا یہ عالم تھا کہ بچے نماز پڑھنے کی حالت میں آپ ﷺ سے کھیلتے رہتے اور آپ ﷺ انہیں منع نہ فرماتے۔ ایک بار آپ ﷺ نے بہ حالت نماز حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی بیٹی کو اپنے شانے پر بٹھالیا تھا۔ سجدے میں جاتے تو اسے زمین پر بٹھا دیتے اور اٹھتے تو پھر شانے پر بٹھا لیتے۔

آپ ﷺ کے حسنِ سلوک کا دائرہ صرف بنی نوعِ انسان تک محدود نہ تھا بلکہ آپ ﷺ حیوانات پر بھی شفقت فرماتے تھے۔ اگر کوئی بلی پناہ کے لیے آتی تو آپ ﷺ خود اس کے لیے دروازہ کھول دیتے۔ اگر کوئی مرغ بیمار پڑ جاتا تو خود اس کی دیکھ بھال کرتے۔ اپنی قمیص کی آستین سے گھوڑے کی مالش کرتے۔ ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک سست رفتار اونٹ پر سوار تھیں۔ وہ چلتا نہیں تھا۔ انہوں نے اسے سختی سے ہانکا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''عائشہ رضی اللہ عنہا! نرمی سے ہانکو، اونٹ پر سختی نہ کرو۔'' غرض آپ ﷺ کی مہربانی سب کے لیے تھی، کوئی اس سے محروم نہ تھا۔

عدل وانصاف

آنحضرت ﷺ کی نرم دلی احساسِ مرعوبیت یا عجز و ناتوانی کا نتیجہ نہ تھی۔ نہ آپ ﷺ کسی پر احسان جتانا چاہتے اور نہ نام و نمود کی آپ ﷺ کو ہوس تھی۔ ایک سادہ اور پر خلوص رشتہ اخوت تھا جو آپ ﷺ کے اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان قائم تھا۔ ان حقائق کے پیشِ نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمدنِ اسلام کی قدریں دوسرے ادیان کی اقدارِ تمدن سے مختلف ہیں۔ اسلام میں اخوت و مساوات لازم و ملزوم ہیں۔ اصولِ اسلام کی رو سے اخوت کی بنیادیں عدل وانصاف کے بغیر استوار نہیں ہو سکتیں۔ اسلام کا اصول یہ ہے:

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪

(سورۃ البقرہ: ۱۹۴)

''پس جس نے تم پر زیادتی کی ہے تم بھی اس پر اتنی زیادتی کر سکتے ہو جتنی زیادتی تم پر کی گئی ہے۔''

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ (سورۃ البقرہ: ۱۷۹)

''اے دانش مندو! قصاص میں تمہارے لیے زندگی کا راز مضمر ہے۔''

اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اخوت کی بنیاد مہر و مروت، حسنِ سلوک اور آزادی پر ہونی چاہیے، یہ کام محض رضائے الٰہی کے لیے ہو اور اسے وہی شخص انجام دے سکتا ہے جس کے دل میں قوم کا درد ہو، جو خدا کی

Marfat.com

ذات کے سوا کسی سے خائف نہ ہو، ضعف و ناتوانی کو تقویٰ کے لباس میں چھپانے کی کوشش نہ کرے، جرم و معصیت کے سوا اور کوئی چیز اسے ڈرا نہ سکتی ہو۔ وہ شخص جس کے اندر مستقل مزاجی نام کو بھی نہیں، جو دوسروں کے آگے سر تسلیم خم کر دینے کے لیے تیار رہتا ہے اور جسے خواہشات تگنی کا ناچ نچاتی ہیں اسے صاحب عزم انسان نہیں کہا جا سکتا اور نہ اس کی روح میں کبھی بالیدگی آسکتی ہے۔ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحابؓ نے مکہ سے ہجرت اس لیے کی تھی کہ قریش کے زیر اقتدار نہ رہیں اور ان کی ستم کیشیوں اور جفاجوئیوں سے محفوظ ہو کر آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ ہم پر خواہشیں اسی وقت غلبہ پالیتی ہیں جب روح جسم کے تابع ہو جاتی ہے اور دل کی امنگیں عقل کی مصلحت اندیشیوں پر اپنی پرچھائیں ڈال دیتی ہیں۔ ان حالات میں روحانی زندگی، مادی اعتبارات کے آگے ہتھیار ڈال دیتی ہے لیکن صحیح معنوں میں روح کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اس کا معیار بلند ہے۔ اگر ہم چاہیں تو ہمارے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آسکتی اور ہم مادی ترغیبات سے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔

تقویٰ اور دنیا سے بے تعلقی

آنحضرت ﷺ صلاح و تقویٰ کا کامل نمونہ تھے۔ آپ ﷺ کو یہ تردد نہ تھا کہ کل کو کھانے پینے کا کیا بندوبست ہوگا۔ جو کچھ بھی آپ ﷺ کے پاس ہوتا تھا اہل حاجت کو بخش دیتے تھے یہاں تک کہ ایک صحابی کا قول ہے کہ آنحضرت ﷺ جب بخشش پر اتر آتے ہیں تو آپ ﷺ کو اپنی بے سروسامانی کا مطلق اندیشہ نہیں ہوتا۔ مافوق البشر زندگی اور زہد و ورع کی خاطر آپ ﷺ نے مادی اسباب سے توجہ ہٹالی تھی لیکن اس کے باوصف آپ ﷺ زندگی کے اسرار و رموز اور اس کے حقائق و معارف پر اکثر غور و خوض فرمایا کرتے تھے۔ دراصل اسرار حیات کی عقدہ کشائی کا شوق آپ ﷺ کو حد سے زیادہ تھا۔

آپ ﷺ کے زہد اور دنیا سے بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ کا بستر چمڑے کا تھا اور اس میں کھجور کے چھلکے بھرے ہوئے تھے۔ کبھی آپ ﷺ شکم سیر ہو کر طعام تناول نہیں فرماتے تھے۔ دو دن لگا تار کبھی آپ ﷺ نے نان جویں بھی تناول نہیں فرمائی۔ آپ ﷺ کی خاص غذا ستو تھی۔ اکثر و بیشتر کھجوروں پر قناعت فرما لیتے تھے۔ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے افرادِ خاندان روٹی کے ٹکڑے، گوشت کے شوربے میں چورا کر کے شاذ و نادر ہی کھاتے تھے، اکثر بھوکے اور خالی پیٹ رہتے، بھوک کے آزار کو کم کرنے کے لیے پیٹ سے پتھر باندھ لیا کرتے تھے، غرض آپ ﷺ کی غذا کا معمول یہ تھا۔ کبھی کبھی بہترین اور نفیس غذا بھی تناول فرما لیتے تھے (غالباً اس لیے کہ امت کے صالحین کہیں آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع میں انتہا پسندی کا ثبوت نہ دینے لگیں)۔ بکری کے پائے، کدو، شہد اور حلوہ آپ ﷺ کو بہت مرغوب تھے۔

لباس کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ایک دن ایک عورت آئی اور اس نے آپ ﷺ کی خدمت میں

Marfat.com

آپ ﷺ کی پوشش کے لیے لباس نذر کیا۔ اسی اثنا میں ایک سائل آیا اور اس نے یہ عرض کیا کہ ایک میت کے لیے کفن کی ضرورت ہے۔ آپ ﷺ نے فوراً وہ لباس اس کے حوالے کر دیا، اگرچہ خود بھی آپ ﷺ کو لباس کی احتیاج تھی۔ آپ کا عام لباس اون، سوت یا کتان کا چغہ ہوتا تھا۔ جب موقع ومحل کا تقاضا ہوتا (کسی وفد سے ملاقات کے درمیان میں) تو آپ ﷺ یمنی لباسِ فاخرہ بھی زیب تن فرماتے تھے آپ ﷺ کے جوتے بھی سادہ وضع کے تھے، اچھی بناوٹ کا جوتا (ساقہ دار جوتا) کبھی استعمال نہ کیا، البتہ نجاشی نے جوتوں کی ایک نفیس جوڑی اور ایک شلوار بھیجی تو آپ ﷺ نے اسے استعمال کیا۔

آپ ﷺ کی یہ غیر معمولی پرہیز گاری اور دنیا سے بے تعلقی دینی فرائض سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی یعنی آپ ﷺ نے اپنی امت کو اس کے لیے مکلف نہیں کیا۔ قرآن شریف میں ارشاد ہوتا ہے۔

كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ط (سورۃ البقرہ:۵۷)

''اچھی اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ جو ہم نے تمہارے لیے روزی قرار دی ہیں۔''

اور اسی مفہوم کو آیات ذیل واضح کرتی ہیں۔

وَابْتَغِ فِيمَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (سورۃ القصص:۷۷)

''جو کچھ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا کیا ہے اس سے آخرت طلب کیجیے اور دنیا سے اپنا حصہ فراموش نہ کیجیے اور نیکی اور نیکوکاری کا شیوا اختیار کیجیے جیسا کہ اللہ نے آپ سے اچھائی کا برتاؤ کیا ہے۔''

ایک حدیث میں یہ مضمون وارد ہے:

اُحْرُثْ لِدُنْيَاكَ كَاَنَّكَ تَعِيْشُ اَبَدًا وَاعْمَلْ لِاٰخِرَتِكَ كَاَنَّكَ تَمُوْتُ غَدًا

''دنیا کے لیے جدوجہد کر اس انہماک سے گویا ہمیشہ دنیا میں زندہ رہنا ہے اور آخرت کے لیے عمل اس انداز سے ہو جیسے کل ہی تجھے مرجانا ہے۔'' (حدیث)

ان احکام کے باوجود آنحضرت ﷺ زہد کا کامل نمونے تھے اور اس حد تک اپنے اوپر ریاضت و مشقت کا بار ڈالتے تھے کہ کبھی کبھی آپ ﷺ پر ضعف طاری ہو جاتا تھا اس ریاضت سے آپ ﷺ کی غرض یہ تھی کہ خدا کے سوا اور کسی چیز کی محبت دل میں راہ نہ پانے پائے۔ جب کوئی انسان اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو مخلوق کو اس کے خلوص و اخلاص میں کوئی شبہ نہیں رہتا اور لوگ بہ رضا و رغبت اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتے اور اس پر جان چھڑکتے ہیں بلکہ اس کی اطاعت اپنے اوپر فرض کر لیتے ہیں۔

اسلام نے عدل و شفقت کے ساتھ ساتھ عفو و درگزر پر زور دیا ہے لیکن عفو کے لیے طاقت شرط ہے تاکہ معافی کو کمالِ شفقت قرار دیا جائے۔

آنحضرت ﷺ نے تمدنِ اسلام کی جو قدریں متعین کی ہیں ان کا حال آپ ﷺ کی اس روش سے معلوم ہوسکتا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے ان الفاظ میں واضح کی:

المعرفۃُ رأس مالی والعقل اصل دینی والحبّ اساسی والشّوق مرکبی وذکر اللہ انیسی والثقۃ کنزی والحزن رفیقی والعلم سلاحی والصّبر ردائی والرّضا غنیمتی والفقر فخری والزّھد حرفتی والیقین قوّتی والصّدق شفیعی والطّاعۃ حسبی والجھاد خلقی وقرّۃ عینی فی الصّلوٰۃ

''میری دولت معرفت ہے، میرے دین کی بنیاد عقل پر ہے، محبت میرے کام کی اساس ہے، شوق میری سواری ہے، اعتماد میرا خزانہ ہے، غم رفیق زندگی ہے، علم اسلحہ ہے، صبر چادر ہے، رضا مالِ غنیمت ہے، فقر فخر ہے، زہد میری صنعت ہے، یقین میرے دست و بازو ہیں، صداقت میری شافع ہے، عبادت میرے لئے سبب کفائیت ہے، جہاد میری فطرت میں مضمر ہے اور نماز میرے قلب کی تسکین ہے۔''

یہودیوں کی مخالفت کی ابتدا

نبی کریم ﷺ کی تعلیمات لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئی تھیں۔ لوگ کثیر تعداد میں مشرف بہ اسلام ہوگئے تھے اور مدینہ میں مسلمانوں کا اقتدار اور ان کی طاقت روز افزوں ترقی پر تھی۔ اسلام کی اس بڑھتی ہوئی شان و شوکت سے یہودیوں کو تشویش ہوئی۔ رسول کریم ﷺ سے معاہدہ کرتے وقت انہیں یہ توقع تھی کہ وہ مسلمانوں کو اپنا حلیف بنالیں گے اور ان کی رو سے انہیں عیسائیوں پر غلبہ حاصل ہوگا لیکن اب حالات نے ایسا رخ بدلا کہ مسلمان، یہودیوں اور عیسائیوں سے زیادہ اثر و رسوخ اور غلبہ و اقتدار کے مالک ہوگئے صرف یہی نہیں بلکہ روز بروز مسلمانوں کی عظمت کو چار چاند لگ رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ کو کبھی کبھی یہ خیال آتا کہ قریش نے کس طرح مجھے اور میرے رفقا کو مکہ سے ہجرت پر مجبور کیا اور یہاں تک کہ بعض مسلمانوں کو دین سے برگشتہ بھی کردیا۔ یہودیوں کو یہ تردد تھا کہ آیا رسول کریم ﷺ کی دعوت کا دائرہ وسیع ہونے اور ان کے اثر و اقتدار کو بڑھنے دیں اور خود ان کی سرپرستی میں تجارت اور زراندوزی کے دھندوں میں مصروف رہیں؟ اگر انہیں یہ یقین ہوتا کہ رسول اکرم ﷺ کی دعوت یہودیوں پر اثر انداز نہ ہوگی تو شاید وہ جس حال میں تھے اس پر قناعت کرتے لیکن انہیں قلبی اطمینان نہ تھا اور ان کی دینی تعلیم کا تقاضا اور ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ بنی اسرائیل کے سوا اور کسی خاندان کے فرد کی پیغمبری تسلیم نہ کریں۔

انہی ایام میں عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو اکابر یہود میں سے تھے حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ انہیں یہ ڈر تھا کہ یہودیوں کو ان کے قبولِ اسلام کا علم نہ ہوجائے اور کہیں وہ ان کے بارے میں غلط افواہیں نہ پھیلائیں

Marfat.com

اس اندیشے کی بنا پر انہوں نے رسول کریم ﷺ سے درخواست کی کہ پیشتر اس سے کہ عوام میں میرے قبولِ اسلام کی شہرت ہو، آپ ﷺ میرے بارے میں یہودیوں کی رائے دریافت کریں۔ نبی کریم ﷺ نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی خواہش کے مطابق یہودیوں سے ان کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہمارے پیشوا، ہمارے پیشوا کے فرزند جلیل اور دانشمند بزرگ ہیں لیکن جب عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اپنے اعلانِ اسلام کے بعد یہودیوں کو قبولِ اسلام کی دعوت دی تو وہ ان سے برگشتہ ہو گئے اور ان کے متعلق غلط اور ناروا باتیں منسوب کرنے لگے۔ انہوں نے علانیہ رسول کریم ﷺ کی نبوت سے انکار کر دیا۔ اوس و خزرج کے مشرکین اور وہ لوگ جو منافقانہ طور اسلام لے آئے تھے ان کے ہم نوا و ہمساز ہو گئے۔

مسلمانوں اور قریش مکہ کے درمیان جو آویزش رہی تھی مدینہ میں یہودیوں اور مسلمانوں کی کشمکش اس سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔ یہودیوں کو انبیائے سابقین کے حالات از بریاد تھے اور ان کی تعلیمات سے بھی انہیں واقفیت تھی۔ کچھ یہودی بظاہر مسلمان ہو گئے تھے جو ہمہ وقت اپنی پرہیز گاری اور نیکو کاری کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی آنحضرت ﷺ سے اپنے شبہات رفع کرنے کے لیے سوالات بھی کیا کرتے تھے۔ ان سوالات سے دراصل ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے عقائد کی بنیادیں متزلزل کر دیں اور دین کے بارے میں اتنے شبہات ان کے دلوں میں پیدا کر دیں جو اسلام سے ان کی برگشتگی کا باعث ہوں۔ اسلام اور پیروانِ اسلام سے یہودیوں کی عداوت اس انتہا کو پہنچی کہ وہ تورات کی تعلیم (کے اس حصے سے جو نبی کریم ﷺ کی رسالت سے متعلق تھا) سے بھی کھلم کھلا انکار کرنے لگے۔ منافقین بھی آنحضرت ﷺ سے اسی قسم کے سوالات کیا کرتے تھے مثلاً اگر خدا نے مخلوق کو پیدا کیا تو پھر خدا کا خالق کون ہے؟ آنحضرت ﷺ ان سوالات کے جواب میں سورہ اخلاص کی تلاوت فرماتے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴿۱﴾ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ﴿۲﴾ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ﴿۳﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿۴﴾ (سورۂ اخلاص: ۱ تا ۴)

"کہہ دیجیے خدا ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کا والد ہے، نہ مولود اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔"

مسلمانوں کو بھی یہودیوں کی ان ریشہ دوانیوں اور منصوبہ بندیوں کا علم ہو گیا تھا۔ ایک دن چند یہودیوں کو دیکھا گیا کہ وہ مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے سرگوشیاں کر رہے ہیں رسول کریم ﷺ نے حکم دیا کہ انہیں مسجد سے باہر کر دو لیکن یہ بدفطرت یہودی اپنی حرکتوں سے باز آنے والے کہاں تھے! ان میں سے ایک یہودی شاس بن قیس نے دیکھا کہ اوس و خزرج ایک جماعت میں ملے جلے بیٹھے ہیں۔ اس اتحاد و اتفاق سے اس کا جی جل گیا اس نے ایک نوجوان یہودی کو جو اس جماعت میں شامل تھا اشارے سے بلا کر کہا: "کسی

Marfat.com

ڈھب اور کسی جتن سے انہیں جنگ بعاث اور خزرج کی شکست کے واقعات یاد دلاؤ۔" چنانچہ اس نوجوان یہودی نے ایسا ہی کیا۔ اس یاد دہانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغض و عداوت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر سلگ اٹھیں اور اوس وخزرج کے درمیان تو تکار اور تو تو میں میں شروع ہوگئی۔ بعض نے یہاں تک کہا کہ تم پھر لڑنا چاہتے ہو تو ہم اس کے لیے آمادہ ہیں۔ اس نزاع کی خبر آنحضرت ﷺ تک بھی پہنچی۔ آپ ﷺ نے اوس وخزرج کے ملے جلے مجمع میں فرمایا: "اسلام نے تمہارے دلوں میں الفت و مروت کا بیج بو دیا ہے اب تم ایک دوسرے کے بھائی ہو۔" آپ ﷺ نے کچھ اس انداز سے تقریر کی کہ حاضرین کے دل موم ہوگئے اور ان پر رقت طاری ہوگئی۔ انہوں نے ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر خدا سے اپنی غلط روش پر توبہ کی۔

نبی کریم ﷺ اور یہودیوں کے درمیان جو مناقشت شروع ہوئی شدید قسم کی تھی چنانچہ اس ضمن میں جن آیات کا نزول ہوا ہے ان سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی مسلسل کئی آیات اور سورۂ نسا کے بہت سے حصے میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب نے کس طرح تورات کے مندرجات سے انکار کیا چنانچہ اسی انکار کی بنا پر انہیں ملعون قرار دیا گیا۔ مندرجہ ذیل آیات اسی باب میں ہیں:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ (سورۂ البقرہ: ۸۷ تا ۸۹)

"اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام پر کتاب نازل کی اور ان کے بعد پیغمبر بھیجے اور عیسیٰ علیہ السلام بن مریم کو معجزات عطا کیے اور روح القدس سے ان کی تائید کی۔ جب بھی کوئی پیغمبر آیا اور ایسی تعلیم لایا جو تمہیں پسند نہ تھی تو تم نے غرور و تکبر کا اظہار کیا۔ ان میں سے بعض کی تم نے تکذیب کی اور بعض کو قتل کر دیا اور کہنے لگے کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ خدا نے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی گنے چنے لوگ ان میں سے ایمان لائے تھے اور جب خدا کی طرف سے ان پر کتاب نازل ہوئی اور وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی تھی جو پہلے سے ان کے پاس موجود ہے تو باوجودیکہ وہ (تورات کی پیشین گوئیوں کی بنا پر اس ظہور عظیم کے منتظر تھے اور) کافروں کے مقابلے میں اس کا نام لے کر فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے تھے لیکن جب وہی جانی بوجھی ہوئی بات سامنے آگئی تو صاف انکار کر گئے

Marfat.com

پس ان لوگوں کے لئے جو (جان بوجھ کر) کفر کی راہ اختیار کریں، اللہ کی لعنت ہے (یعنی ایسوں پر فلاح وسعادت کی راہ کبھی نہیں کھلتی)۔"

داستان فنحاص

مسلمانوں اور یہودیوں کی اس کشمکش نے زبانی تکرار اور بحث وتمحیص سے گزر کر آویزش کی شکل اختیار کر لی اور مباحثوں میں زدوکوب کی نوبت آنے لگی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نہایت نرم طبع آدمی تھے۔ ایک دن فنحاص نامی یہودی سے آپ کی گفتگو ہو رہی تھی اور آپ اسے اسلام کی دعوت دے رہے تھے۔ فنحاص نے جواب میں کہا، خدا کی قسم! ہمیں خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے البتہ خدا کو ہماری ضرورت ہے، ہم اس سے مستغنی ہیں وہ ہم سے بے نیاز نہیں، اگر خدا بے نیاز ہوتا تو جیسا کہ تمہارے رفیق کا قول ہے یہ بات نہ ہوتی:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗۤ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً ؕ

(سورۃ البقرۃ:۲۴۵)

"کون ہے جو خدا کو قرضِ حسنہ دیتا ہے تاکہ خدا اس کا قرض کئی گنا زیادہ کر کے ادا کرے۔"

خدا بندوں سے قرض ہرگز نہ طلب کرتا۔ وہ تمہیں سود خوری سے منع کرتا ہے لیکن ہمیں خود سود دیتا ہے۔ اگر اسے ہماری پروا نہ ہوتی تو ہمیں سود ہرگز نہ دیتا۔ فنحاص نے قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیت پر زبان طعن دراز کی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فنحاص کے اس طنز وتعریض کو برداشت نہ کر سکے۔ آپ نے جوش میں آ کر فنحاص کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا اور کہا کہ اگر ہمارے اور تمہارے درمیان معاہدہ نہ ہوتا تو میں تیرا سر تن سے جدا کر دیتا۔ فنحاص نے اس مار پیٹ کی شکایت آنحضرت ﷺ سے کی اور اس بات کا مطلق ذکر نہ کیا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہی تھی بلکہ اس سے (جب اسے وہ باتیں یاد دلائی گئیں) صاف مکر گیا۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ ۘ سَنَکْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَھُمُ الْاَنْۢبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ﴿۱۸۱﴾

(سورۂ آل عمران:۱۸۱)

"بے شک خدا نے ان لوگوں کی باتیں سنیں جو یہ کہتے ہیں کہ خدا فقیر ہے اور ہم بے نیاز ہیں اور جلد ہی جو کچھ انہوں نے کہا ہم ضبط تحریر میں لے آئیں گے اور ان کا یہ جرم بھی کہ انہوں نے ناحق پیغمبروں کو قتل کیا اور ہم کہیں گے کہ جلا دینے والا عذاب چکھو۔"

یہودیوں کی ریشہ دوانیوں اور دسیسہ کاریوں کا منشا صرف یہی نہ تھا کہ مہاجرین اور انصار میں پھوٹ پڑ جائے، اوس اور خزرج آپس میں لڑنے لگیں اور مسلمان پھر بت پرستی اختیار کرلیں بلکہ وہ نبی کریم ﷺ کو بھی فریب دینے کی فکر میں تھے چنانچہ چند یہودی سرداروں نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر یہ عرض کیا کہ آپ کو ہماری قدرو منزلت کا علم ہے اگر ہم آپ ﷺ کی پیروی اختیار کریں تو سارے یہودی آپ ﷺ کے پیرو ہو جائیں گے وہ ہمارے حکم سے باہر نہ ہوں گے شرط یہ ہے کہ ہمارے اور بعض لوگوں کے درمیان جو نزاع ہے، اس کا تصفیہ آپ ﷺ ہمارے حق میں کردیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ۝ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝

(سورۃ المائدۃ: ۴۹، ۵۰)

”اور فیصلہ صادر کیجیے ان کے درمیان اس کے مطابق جو خدا نے نازل کیا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیے اور ان سے بچتے رہیے مبادا وہ آپ کو بعض ان چیزوں سے جو خدا نے آپ پر نازل کی ہیں منحرف کردیں، اگر وہ پھر جائیں (آپ کے فیصلے کو نہ مانیں) تو سمجھ لیجیے کہ خدا چاہتا ہے ان کے بعض گناہوں کی سزا انہیں دے اور ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔ کیا یہ لوگ ایام جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ کون ہے جس کا فیصلہ خدا سے بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں۔“

یہودی اپنے منصوبے میں ناکام رہے تو انہوں نے دوسری چال چلی یعنی نبی کریم ﷺ کو اس امر کی ترغیب دی کہ مدینہ سے چلے جائیں اور اس سلسلے میں انبیائے سابقین کے حوالے دیئے کہ سب نے بیت المقدس کو اپنا مرکز قرار دیا اور وہیں اقامت اختیار کرلی۔ اگر آپ ﷺ بھی خدا کے سچے پیغمبر ہیں تو دوسرے پیغمبروں کی تقلید کریں اور مدینہ کو مکہ اور بیت المقدس کے درمیان ہجرت کے لیے ایک واسطہ قرار دیجیے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ التسلیم کو یہودیوں کے اس مشورے کی تہ میں ڈوبنے اور اس پر غور کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ مکہ سے مدینہ کو ہجرت کئے ہوئے آپ ﷺ کو ۱۷ ماہ گزر چکے تھے کہ وحی نازل ہوئی، اپنا قبلہ، کعبہ کو قرار دیجیے اور اس سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی:

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ (سورۃ البقرۃ: ۱۴۴)

Marfat.com

''ہم دیکھتے ہیں کہ (انتظار وحی میں) آپ نے اپنا رخ آسمان کی طرف کر رکھا ہے پس ہم ضرور آپ کا رخ اسی قبلے کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں پس آپ اپنا منہ مسجد حرام (کعبہ) کی جانب پھیر لیجیے اور جہاں کہیں بھی آپ ہوں آپ اسی طرف اپنا منہ پھیر لیا کیجیے۔''

یہودیوں پر یہ بات بہت گراں گزری اور مکروفریب سے یہ کہنے لگے اگر نبی کریم ﷺ پہلے قبلہ (بیت المقدس) کی جانب پھر منہ کر کے نمازیں پڑھنے لگیں تو ہم ان کی پیروی کے لیے آمادہ ہو جائیں گے اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿١٤٢﴾ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۗ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ (سورۃ البقرۃ: ۱۴۲، ۱۴۳)

''عنقریب کچھ نادان اور کم عقل لوگ کہیں گے کہ کس چیز نے انہیں پہلے قبلے سے روگرداں کیا، آپ فرما دیجیے مشرق و مغرب (کی سمتیں) خدا کی ہیں، وہ جس کی چاہے صراط مستقیم کی جانب رہنمائی کرتا ہے، اس طرح ہم نے تم کو درمیانی امت قرار دیا ہے تاکہ لوگوں کے شاہد ہو اور رسول ﷺ تمہارا شاہد ہو اور جس قبلے پر آپ قائم تھے اسے ہم نے نہیں بدلا مگر اس سبب سے کہ نبی کریم ﷺ کی پیروی کرنے والوں اور ان سے منحرف ہونے والوں کو پہچان لیں اور یہ (اقدام) ان لوگوں کے سوا جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے سب پر شاق گزرتا ہے (یعنی ایسے لوگ ہی اس اقدام کی قدر و منزلت کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں ایمان کی رمق ہے اور جو ہدایت کی راہ پر گامزن ہیں)۔''

نجران کا وفد

اس اثنا میں نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد جس کے ارکان کی تعداد ۶۰ تھی مدینہ پہنچا۔ اس وفد میں بعض عیسائیت کے سرکردہ اور سربراہ بھی تھے اور مندرجات انجیل اور ارکان دین مسیحؑ پر ان کی گہری نظر تھی۔ غالباً یہ لوگ آنحضرت ﷺ اور یہودیوں کے درمیان اختلاف کی خبریں سن کر اس غرض سے آئے تھے کہ اس نزاع کی آگ کو اور بھڑکائیں تاکہ کھلی ہوئی دشمنی کے شرارے اٹھنے لگیں اور انہیں شام و یمن میں عربوں اور

Marfat.com

یہودیوں کی مخالفت کا اندیشہ نہ رہے۔ غرض یہودیت، مسیحیت اور اسلام کے پیرو ایک شہر میں جمع ہو گئے (روم کے بادشاہ نصرانی تھے اور ان کی سرپرستی میں عیسائیت کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا تھا یہاں تک کہ ان کے حکم سے جگہ جگہ گرجے بھی تعمیر کیے گئے تھے) اور نظریاتی بحث وجدال کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفی ﷺ دونوں کی رسالت کا انکار کیا اور اپنے اس بنیادی عقیدے کا اعلان کیا کہ حضرت عزیرؑ خدا کے بیٹے ہیں۔ نصاریٰ تثلیث اور الوہیت مسیح کے قائل تھے (چنانچہ انہوں نے اس عقیدے پر روشنی ڈالی)۔ رہے حضرت محمد مصطفی ﷺ، وہ لوگوں کو توحید الٰہی کی دعوت دیتے تھے اور اس معنوی وحدت پر زور دیتے تھے جس کی لڑی میں ازل سے ابد تک پوری کائنات پروئی ہوئی ہے (آپ ﷺ نے اس موقع پر بھی اسی تعلیم کا اعادہ کیا)۔ آخر میں یہودیوں اور عیسائیوں نے آپ ﷺ سے سوال کیا کہ آپ کس پیغمبر پر ایمان رکھتے ہیں تو اس پر آپ ﷺ نے جواب دیا:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ (سورۃ البقرہ:۱۳۶)

''ہم اللہ اور جو کچھ ہماری طرف نازل ہوا اور جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کی اولاد پر نازل ہوا اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا اور جو پیغمبروں کو ان کے رب کی جانب سے ملا، سب پر ایمان لائے (ایمان رکھتے ہیں) ہم ان کے درمیان فرق و امتیاز روا نہیں رکھتے اور ہم اس کے حکم کے تابع اور اس کے فرمانبردار ہیں (گویا ہم صرف اپنے پیغمبر ہی پر نہیں بلکہ جتنے انبیا علیہم السلام بھی مبعوث کیے گئے ہیں ان پر اور ان کی تعلیمات پر پختہ ایمان لائے ہیں اور یہی ایمان ہمارے اسلام کی اساس ہے۔)''

یہودی اور عیسائی ذات باری کے متعلق جو کچھ کہتے تھے آنحضرت ﷺ اس کی تردید سختی سے کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان لوگوں نے آسمانی کتب کے مندرجات میں تحریف کی ہے اور یہ جن پیغمبروں کی رسالت کا اقرار کرتے ہیں ان کے عقائد سراسر ان پیغمبروں کی تعلیمات کے منافی ہیں۔ جو کچھ مجھ پر نازل ہوا اور جو تعلیمات حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیں ان میں کوئی وجہ اختلاف نہیں ہے کیونکہ ان تمام تعلیمات کی روح ازلی وابدی ہے اور جو شخص بھی اپنی روح کو مادی ترغیبات کی آلودگیوں سے پاک وصاف کر کے اور فرسودہ عقائد سے بالا ہو کر کائنات کا مشاہدہ چشم بصیرت سے کرے گا، حقیقت کبریٰ کے جلوے اس کی نگاہوں سے مستور نہیں رہ سکتے۔

Marfat.com

ادیانِ ثلاثہ کا اجتماع

مدینہ میں ادیانِ ثلاثہ کا اجتماع دراصل بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ ان ادیان کو دنیا کے معاملات اور اس کے احوال میں اچھا خاصا دخل تھا۔ اگرچہ یہودیوں اور عیسائیوں کا مقصد کچھ اور تھا لیکن آنحضرت ﷺ کا منشا یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح انسانیت کا معیار بلند ہو اس مقصد سے آپ ﷺ نے اسلام کی دعوت ان قرآنی الفاظ میں پیش کی:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۞ (سورۂ آل عمران: ۶۴)

"کہہ دیجیے اے اہل کتاب اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان ایک جیسی ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور کسی کو کسی شے میں اس کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور ہم میں سے بعض، بعض کو اللہ کے ماسوا معبود قرار نہیں دیں گے پس اگر وہ اس عقیدے سے روگردانی کریں تو کہہ دیجیے گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں (خدا کے فرمانبردار ہیں)۔"

یہودی، عیسائی اور دوسرے مخالفین اسلام اس دعوت پر کیا اعتراض کر سکتے تھے، نبی کریم ﷺ کی تعلیم یہی تو تھی کہ خدا کے سوا کسی کے آستانہ معبودیت پر سرِ تسلیم خم نہ کرو، کسی کو اس نظام کائنات کے خلق و نصر میں اس کا شریک نہ گردانو، مقدس، مصفا اور منزہ روح جس کے آئینے میں نورِ بصیرت کی چمک دمک ہے اور جس پر لطیف رجحانات کا پرتو ہے، اس نظریے کے سوا اور کسی نظریے کو ہرگز تسلیم نہیں کرے گی لیکن بنی نوع انسان کی زندگی میں روحانیت آمیز رجحانات کے علاوہ ایک اور رجحان بھی ہوتا ہے جو اسے مادہ پرستی کی جانب مائل کرتا ہے۔ انسان اس راہ میں ذلت و خواری سے دوچار ہوتا ہے وہ مادی منفعت کی خاطر اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں کو خود اپنی مرضی سے فنا کرتا ہے، روحانیت کی منزل سے منہ موڑ کر وہ پست ترین جذبات کے تابع ہو جاتا ہے۔

انہی ایام میں نجران کے ایک عیسائی ابوحارثہ نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ مجھے آنحضرت ﷺ کے پیغام اور ان کی دعوت کی صحت و صداقت کا یقین ہو گیا ہے لیکن جب اس کے رفیق نے دریافت کیا کہ پھر تم ان کے پیرو کیوں نہیں ہو جاتے تو ابوحارثہ نے اس سوال کا جواب یہ دیا: "عیسائیوں نے مجھے عزت بھی دی اور دولت بھی، اگر آج میں عیسائیت سے تائب ہو کر آنحضرت ﷺ کا دین قبول کر لیتا ہوں تو نہ عزت رہے گی نہ دولت۔"

آنحضرت ﷺ نے عیسائیوں کو دعوتِ اسلام دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر تم اس دعوت پر لبیک کہنے کے لیے تیار نہیں ہو تو آؤ ہم مباہلہ کریں تا کہ جو فریق حق بجانب نہ ہو وہ مستوجب نفرین و تشنیع ٹھہرے۔ عیسائیوں کو خصوصیت سے دینی دعوت دینے کی وجہ یہ تھی کہ یہودیوں سے پہلے ہی معاہدہ ہو چکا تھا، لیکن عیسائی اس مباہلے کے لیے تیار نہ ہوئے اور کہا تو صرف یہ کہا کہ آپ اپنے دین پر رہیں ہمیں اپنے دین پر رہنے دیں۔ چند روز بعد عیسائیوں کو آنحضرت ﷺ کی حق پسندی کا یقین ہو گیا اور انہیں یہ اندازہ ہو گیا کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کے اندر عدل و انصاف کے جوہر سمائے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بارگاہِ رسالت میں یہ درخواست کی کہ آپ ﷺ ہمارے ساتھ اپنے کسی صحابی کو روانہ فرما دیں تا کہ اس کے ذریعے متنازع فیہ امور کے بارے میں کوئی فیصلہ ہو سکے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کام پر حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو مامور کیا اور وہ عیسائیوں کے ہمراہ روانہ کر دیئے گئے۔

مکہ کی یاد

نبی کریم ﷺ نے اپنی گفتار اور اپنے کردار سے جس تمدن کی بنیادیں استوار کی تھیں اس کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا تھا لیکن اس اثنا میں آپ ﷺ کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ قریش سے کیا معاملہ کیا جائے۔ اس تردد کے چند اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ کعبہ، مکہ میں واقع تھا، دوسرے یہ کہ آپ ﷺ کے اور مہاجرین کے تمام قرابت دار مکہ میں سکونت پذیر تھے۔ ایک طرف تو ان سے ملاقات کا اشتیاق تھا اور دوسرے اس بات کا ملال کہ وہ لوگ ابھی تک بت پرستی پر قائم ہیں۔ مہاجرین کا سب کچھ یعنی جتنا کچھ بھی مال و متاع تھا مکہ میں رہ گیا تھا۔ وہ ہجرت کی رواروی میں یہ مال و متاع اپنے ہمراہ نہیں لا سکے تھے۔ اس ضمن میں یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ مہاجرین تپ لرزہ کی وبا میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مدینہ میں یہ وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اس مرض نے انہیں یہاں تک کمزور کر دیا تھا کہ نماز میں قیام کی طاقت بھی نہیں رہی تھی۔ اس حالت میں انہیں اپنے وطن کی یاد ستاتی تھی، پھر یہ ہجرت اختیاری نہ تھی۔ قریش کے مظالم نے انہیں ترکِ وطن پر مجبور کیا تھا اور اس کی صورت ایسی تھی جیسے کوئی ہزیمت خوردہ فریق، جنگ میں شکست کھا کر ترکِ وطن پر بہ امر مجبوری آمادہ ہو جائے لیکن یہ مہاجرین ایسے لوگ نہ تھے جو دشمنوں کے ظلم و ستم کی یاد اور اس کی کسک دل سے بھلا دیں اور اتنے گر جائیں کہ انہیں مغلوبیت کا احساس ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانے پر مجبور کر دے اور کبھی ان کے دل میں جذبہ انتقام بھی موجزن نہ ہو۔ بہر حال مکہ ان کا وطن تھا اور وطن کی جانب رغبت ان کی فطرت کا تقاضا تھا۔ ہم میں سے کون ہے جس کا میلان وطن کی جانب نہیں۔ وطن ہی وہ مقام ہے جہاں ہم نے پہلی بار آنکھیں کھولیں۔ اسے ہمارے مولد و منشا کی حیثیت حاصل ہے۔ وطن ہی کی سرزمین میں پہلی بار ہم نے بولنا، چلنا اور سوچنا سیکھا۔ اسی کی حدود میں رہ کر ہم نے دنیا دیکھی، ہمارا لڑکپن وطن میں گزرا اور بڑے ہونے کے

Marfat.com

بعد بھی ہماری توجہات وطن ہی پر مرکوز ہوتی ہیں۔ ہمارے دل میں حب وطن کے لیے ایک خاص جگہ اور ایک خاص مقام ہے۔ ہماری روح وطن سے پیوستہ رہتی ہے اور ہمارے رجحانات اس سے ایک ایسا ربط رکھتے ہیں جو نظر نہیں آتا بلکہ محسوس ہوتا ہے۔ ہم وطن ہی کے لیے ہر چیز کی خواہش کرتے ہیں اور اس کی حفاظت کے لیے مال و جان کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ہماری دلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ موت کے بعد بھی ہم وطن کی سرزمین ہی میں سپردِ خاک ہوں اور یہی خاک ہماری تربت ہو جس سے ہمارا خمیر گوندھا گیا ہے۔ یہی اسباب تھے کہ مہاجرین کو ہمیشہ مکہ کی یاد ستاتی تھی اور وہ اس سوچ میں رہتے تھے کہ قریش سے کیا معاملہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ قریش سے نرمی اور صلح جوئی کا برتاؤ کچھ مفید ثابت نہیں ہوا تھا۔ مسلمان تیرہ سال تک مسلسل طرح طرح کی اذیتیں سہہ کر بھی قریش کو اپنی مصالحانہ روش سے مطمئن و متاثر نہیں کر سکے تھے اور آخرکار نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہیں وطن کو خیرباد کہنا پڑا تھا۔ اسلام جس کی خاطر انہوں نے یہ مصائب و آلام برداشت کیے تھے، ضعف و ناتوانی، ذلت و خواری اور یاس و حرماں کے اثرات قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ دین دوسروں پر زیادتی سے روکتا ہے اور سب کو اخوت و مروت کی دعوت دیتا ہے لیکن ساتھ ہی اپنے پیروؤں کو یہ حکم دیتا ہے کہ اپنی شخصی عظمت، شرافت اور عقیدہ و وطن کا تحفظ کریں۔ آنحضرت ﷺ نے اہل مدینہ سے عقبہ کا معاہدہ بھی اسی غرض اور اسی مقصد سے کیا تھا۔ اس صورت میں سوال یہ تھا کہ مہاجرین کس طرح وطن سے متعلق اپنے فرائض سرانجام دیں؟ نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے پیرو اسی ادھیڑ بن اور اسی کشمکش میں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ عقدہ خوش اسلوبی سے حل ہو جائے۔

حواشی

۱۔ اس جگہ معاہدہ میں انصار کی مختلف جماعتوں اور خاندانوں کے نام درج ہیں مثلاً بنی حارث، بنی ساعدہ، بنی جشم، بنی نجار، بنی عمرو بن عوف اور بنی النبیت۔

۲۔ بعض روایات میں حیّ علی الخیر العمل بھی آیا ہے۔

Marfat.com

باب 11

سرایا اور ابتدائی جھڑپیں

مسلمانوں کو مکہ سے ہجرت کیے کئی ماہ گزر چکے تھے اور مدینہ میں ان کے قیام کا بندوبست بھی ان کے منشا کے مطابق ہو گیا تھا لیکن پھر بھی انہیں اپنے مال ومنال اور اہل وعیال کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ قریش کے مظالم بھی نہیں بھولے تھے۔ وہ کبھی کبھی اپنے دل سے سوال کیا کرتے تھے کہ ہمیں قریش کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟ اکثر مؤرخین نے تحریر کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے جان نثار صحابہ رضی اللہ عنہم اس فکر میں تھے کہ قریش سے انتقام لیں اور موقع پاتے ہی ان سے جنگ چھیڑ دیں۔ بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ مدینہ میں آمد کے بعد ہی سے مسلمان قریش سے انتقام لینے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ فوراً جنگ نہ چھیڑ دینے کا سبب یہ تھا کہ انہیں ابھی معاشرتی اور معاشی وسائل اتنے زیادہ حاصل نہ ہو سکے تھے کہ وہ اطمینان و فراغت سے اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ انہیں یہ مہلت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ کسی دوسرے مسئلہ پر غور کریں۔ آخر الذکر مؤرخین اپنے دعوے کے جواز میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے عقبہ کا معاہدہ دشمنوں سے لڑنے ہی کے لیے کیا تھا۔ یہ امر بھی مسلم ہے کہ رسول کریم ﷺ اور مسلمانوں کی نظر میں اگر ان کے مخالفین تھے تو قریش ہی تھے۔ قریش کو جب اس معاہدہ کا تھوڑا بہت علم کسی ذریعے سے ہو گیا تھا تو وہ یہ جاننے کے لیے بے تاب تھے کہ معاہدہ کی نوعیت کیا ہے؟ (اور وہ اس لیے کہ ان کا خیال یہی تھا کہ ضرور ہمارے خلاف کچھ باتیں ہوئی ہوں گی اور ہو سکتا ہے کہ ہم سے جنگ کے منصوبے باندھے گئے ہوں)۔ یہی وجہ تھی کہ قریش اگلے دن صبح سویرے اوس وخزرج سے یہ پوچھتے تھے کہ کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے کہ رات کو تم نے نبی کریم ﷺ سے کس بنیاد پر معاہدہ کیا ہے؟ اور اس معاہدہ سے مقصود کیا ہے؟

فوجی دستوں کی تشکیل

مؤرخین کا یہ آخری گروہ اپنے قول کی تائید میں وہ واقعات پیش کرتا ہے جو ہجرت سے دس ماہ بعد وقوع پذیر ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو تیس سواروں کی جمعیت کے ساتھ جو مہاجرین میں سے تھے ساحل بحر کی جانب روانہ کیا۔ وہاں ابوجہل سے جس کے ساتھ تین سو سواروں کا ایک فوجی دستہ تھا مڈبھیڑ ہو گئی۔ قریب تھا کہ تلواریں نیام سے باہر نکل آئیں کہ اس اثنا میں مجدی بن عمرو جہنی نے

جو طرفین سے دوستانہ روابط رکھتا تھا، بیچ میں پڑ کر دونوں جماعتوں کو متصادم ہونے سے روک دیا۔

دوسری بار نبی کریم ﷺ نے عبید بن حارث رضی اللہ عنہ کو ساٹھ سواروں کی معیت میں ساحلِ بحر کی طرف بھیجا جہاں ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں سے جن کی تعداد بائیس سے زیادہ تھی، آمنا سامنا ہوگیا لیکن لڑائی تک نوبت نہ آئی اور فریقین نے اپنی اپنی راہ لی۔ صرف حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک تیر چلایا اور یہ پہلا تیر تھا جو اسلام کی تاریخ میں چلا۔ تیسری بار آنحضرت ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک روایت کے مطابق آٹھ مہاجرین کا اور دوسری روایت کے موجب بیس مہاجرین کا دستہ روانہ کیا۔ یہ فوجی دستہ سرزمین حجاز[۲] تک پہنچ کر واپس آیا لیکن ان کا کسی مقام پر کفار سے آمنا سامنا نہ ہوا۔

نبی کریم ﷺ کا سفر

مؤرخین کی اس جماعت نے اپنے قول کی تائید میں یہ واقعہ بھی تحریر کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں ایک سالہ قیام کے بعد وہاں کا انتظام حضرت سعدؓ بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو سونپا اور خود ابواء کی جانب قصد سفر فرمایا۔ اس سفر سے آپ کا مقصد قریش اور بنی ضمرہ کا تعاقب تھا۔ قریش سے تو مڈبھیڑ نہ ہوئی البتہ بنی ضمرہ سے سامنا ہوگیا لیکن بات صرف معاہدہ پر ٹل گئی۔[۳]

اس واقعے کے ایک ماہ بعد آپ ﷺ نے بائیس مہاجرین کے ہمراہ بواط کا رخ کیا۔ اس مرتبہ آپ اس قافلے کے تجسس میں تھے جس کی قیادت امیہ بن خلف کے سپرد تھی۔ اس قافلے میں ایک ہزار بائیس اونٹ تھے اور سو سوار اس کی حفاظت کے لیے ساتھ تھے لیکن اس قافلے کا سراغ نہیں ملا کیونکہ وہ غیر معروف راہ سے گزر گیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے بواط سے مراجعت کے بعد دو یا تین ماہ کے وقفے سے ابوسلمہ بن عبدالاسد کو مدینہ کا انتظام سونپ کر بائیس مسلمانوں کی معیت میں عشیرہ کا رخ کیا اور چند روز تک اس قافلے کی آمد کے منتظر رہے جس کا رہنما ابوسفیان تھا لیکن اس قافلے کا پتا بھی نہ چلا اس سفر کے دوران آپ ﷺ نے بعض عرب قبائل سے دوستی کے معاہدے کیے۔ مدینہ واپسی ہوئی تو کرز بن جابر فہری نے مدینہ کی سرحد پر شبخون مارا اور کچھ اونٹ اور کچھ بکریاں اپنے ہمراہ لے کر چلتا بنا۔ اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ کے انتظام کے لیے مامور کیا اور خود کرز بن جابر فہری کی جستجو میں نکلے یہاں تک کہ بدر کے پاس پہنچ گئے لیکن کرز کا کہیں سراغ نہ ملا۔ سیرت نگاروں نے اس سفر کو بدر کی پہلی جنگ یا غزوۂ بدر کے مقدمہ سے تعبیر و موسوم کیا ہے۔

گشتی نقل و حرکت کی غایت

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم قریش سے انتقام لینے

Marfat.com

اور جنگ چھیڑنے کی فکر میں تھے؟ مؤرخین کے ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ ان اقدامات سے نبی کریم ﷺ کے دو مقصد تھے۔ اول یہ کہ شام کو آنے جانے والے قریشی قافلوں پر حملہ کر کے جتنا مال ان سے چھینا جا سکے چھین لیں۔ دوسرے یہ کہ ساحل بحر اور مدینہ کے درمیانی علاقے میں رہنے بسنے والے عرب قبائل سے دوستانہ معاہدے کر لیں تاکہ قریش پر شام کی تجارت کے دروازے بند ہو جائیں اور قریش کے قافلوں پر حملہ آوری کے وقت ان قبائل کی طرف سے کوئی مزاحمت نہ ہو اور نہ قریش کی اعانت کریں۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں جو فوجی دستے روانہ کیے گئے اور بنی ضمرہ اور بنی مدلج وغیرہم سے جو معاہدے ہوئے ان سے دوسرے مقصد کی تائید ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی مسلمان قریش پر شام کی تجارت کی راہیں مسدود کر دینا چاہتے تھے۔

ہمارا نقطہ نظر

مؤرخین کا یہ بیان کہ مسلمانوں نے مدینہ میں چھ مہینے کے قیام کے بعد ہی فوجی دستے مرتب کر لیے تھے جن میں صرف مہاجرین شریک ہوتے تھے اور یہ دستے قریش سے جنگ جوئی اور ان کے قافلوں پر حملہ آوری کے لیے بھیجے جاتے تھے محل نظر ہے کیونکہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں جو دستہ بھیجا گیا تھا وہ صرف تیس یا اس سے کچھ ہی زیادہ افراد پر مشتمل تھا۔ حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کے دستے میں ساٹھ اشخاص سے زیادہ نہ تھے اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا دستہ بہ اختلاف روایت آٹھ یا بیس افراد پر مشتمل تھا لیکن ان کے مقابلے میں قریش کے قافلوں کے محافظین کی تعداد ان سے کئی گنا زیادہ ہوتی تھی۔ علاوہ بریں جب سے آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی قریش نے بربنائے احتیاط اپنے قافلوں کے محافظین کی تعداد میں اضافہ کر دیا تھا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی شجاعت میں کوئی شبہ نہیں لیکن ان کے دستوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ جنگ ان کے بس کی بات نہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ یہ دستے حملہ کیے بغیر واپس آ جاتے تھے۔ صرف ایک بار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک تیر چلایا تھا۔

جو اشخاص قریش کے قافلوں کی پاسبانی کے فرائض سرانجام دیتے تھے، ان میں سے اکثر و بیشتر مہاجرین کے رشتہ دار تھے وہ ایک دوسرے کا خون بہانا اور مکہ و مدینہ کے درمیانی علاقے کو میدان جنگ بنانا پسند نہیں کرتے تھے۔ مسلمانوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ عقبہ کے معاہدہ کی حیثیت دفاعی ہے۔ اوس و خزرج نے صرف یہ ذمہ داری قبول کی ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے دیں گے لیکن انہوں نے دوسروں کے خلاف نبرد آزمائی اور ان پر حملہ آوری کے عہدہ پیمان نہیں کیے تھے۔ ان واقعات کے پیش نظر سیرت نگاروں کے بیان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان فوجی دستوں کی ترتیب اور اولین

Marfat.com

اقدامات سے مقصد جنگ تھا۔ فوجی دستوں کی تشکیل اور ان کے قیام کا کوئی ایسا سبب ہوسکتا ہے جو آنحضرت ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی اس روش اور سیاست سے مناسبت رکھتا ہو جس کی بنیاد عرب قبائل کے اتحاد واتفاق پر تھی۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ ان دستوں کی ترتیب وتشکیل سے یہ مقصد تھا کہ قریش متوجہ ہوں اور وہ مسلمانوں سے مصالحت و مفاہمت کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کریں تا کہ دشمنی اور تلخی کا سرے سے وجود ہی نہ رہے۔ ایک طرف مسلمان اپنے دینی معاملات میں آزاد ہو جائیں اور دوسری طرف قریش کی راہِ تجارت بھی محفوظ ہو جائے۔ اس دور میں مکہ اور طائف کے مابین تجارت زوروں پر تھی جنوبی علاقے سے مکہ میں بہت سا سامان تجارت آتا تھا۔ بعض قافلوں میں دو دو ہزار اونٹ ہوتے تھے اور ان کی مالی حیثیت پچاس ہزار دینار سے زیادہ ہوتی تھی۔ مشہور مستشرق سپرنگر کا بیان ہے کہ مکہ سے ان دنوں جو مال تجارت باہر جاتا تھا اس کی قیمت ایک لاکھ ساٹھ ہزار لیرہ طلائی کے لگ بھگ ہوتی تھی۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ اگر قریش کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اُن کی تجارت مہاجرین سے دشمنی کے باعث خطرے میں ہے تو وہ ضرور مصالحت و مفاہمت کے لیے کوشاں ہوتے لیکن یہ اسی صورت میں ہوسکتا تھا کہ قریش کو مہاجرین کی طاقت کا اندازہ ہو جاتا اور وہ سمجھ لیتے کہ مہاجرین مکہ کی تجارتی راہ مسدود کرنے پر قادر ہیں یہی وجہ تھی کہ جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی مڈ بھیڑ ابوجہل اور اس کے رفقا سے ہوئی تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مجدی بن عمرو جہنی کے کہنے اور سمجھانے سے واپس چلے گئے اور اسی وجہ سے مسلمان اپنے دستے مکہ کی راہ تجارت کی سمت بھیجتے تھے (کہ لڑائی تو نہ ہو البتہ دشمن کو اندیشہ ضرور لاحق ہو جائے) لیکن ان دستوں کی تعداد اتنی تھوڑی ہوتی تھی کہ یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ لڑنے کے ارادے سے جاتے تھے اور اسی مصلحت سے نبی کریم ﷺ نے ان عرب قبائل سے معاہدے کیے جو قریش کی راہِ تجارت کے متصل آباد تھے تا کہ قریش ان معاہدات کی اطلاع پا کر مرعوب ہوں اور مسلمانوں کے ساتھ مصالحت پر آمادہ ہو جائیں۔

اس نظریے کی تائید اس واقعے سے ہوتی ہے کہ جب پیغمبر ﷺ بواط اور عشیرہ کی جانب تشریف لے گئے تھے تو آپ کی ہمراہی میں مہاجرین کے علاوہ چند انصار بھی تھے۔ جیسا کہ پیشتر بیان کیا گیا ہے مسلمانانِ مدینہ نے رسول کریم ﷺ کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا اور اسی قسم کے قول وقرار ان سے ہوئے تھے۔ معاہدہ کی رو سے ان پر یہ لازم نہ تھا کہ وہ دوسروں کے خلاف جارحانہ اقدامات میں بھی تعاون کریں چنانچہ غزوۂ بدر کے واقعات سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اقدامِ جنگ میں سخت تردد تھا اور جب تک مسلمانانِ مدینہ نے تعاون اور ہم کاری کا وعدہ نہ کیا اس وقت تک آپ ﷺ نے جنگ کا فیصلہ مطلق نہیں کیا۔ رسول کریم ﷺ نے عرب قبائل سے جو معاہدے کیے تھے مسلمانانِ مدینہ انہیں اپنے معاہدہ کے منافی نہیں سمجھتے تھے۔ کسی بات سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ مسلمانانِ مدینہ اہل مکہ سے جنگ کے لیے آمادہ تھے

کیونکہ عرب کی رسم قدیم کے مطابق ان کے اور اہل مکہ کے مابین کوئی ایسی خصومت اور کوئی ایسی کدورت نہ تھی جس سے جنگ کی تحریک ہوتی۔

نبی کریم ﷺ عرب قبائل سے جو معاہدے کرتے تھے ان سے اہل مدینہ کے حوصلے بلند ہوتے تھے اور اہل مکہ کا اپنی تجارت کے معرضِ خطر میں پڑنے کا احساس بڑھتا جاتا تھا لیکن اس صورتِ حال اور جنگ کے صریح اعلان میں فرق ہے۔ اس لیے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے دستوں کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ جنگ کے ارادے سے گئے تھے اور نہ ان اقدامات کو جنگ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے یہ بیان کہ جب رسول کریم ﷺ ابواء، بواط اور عشیرہ کی طرف گئے تو آپ کا مقصد سوائے جنگ کے اور کچھ نہ تھا غلط اور خلافِ واقعہ ہے اور اس پر وہی اعتراضات وارد ہوتے ہیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔

مؤرخین کے اشتباہ کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتب سیرت قرن ثانی کے نصف آخر میں سپرد قلم کیں اور ان کے دل و دماغ پر اس عہد کے معرکوں اور ان کے اسباب کا اثر غالب تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فوجی طاقت کے مظاہروں کو بھی انہوں نے جنگی اقدامات سے تعبیر کیا۔ بہت سے مستشرقین نے اس اعتراض پر بحث کی ہے لیکن کسی نے اس نکتے کی جانب اشارہ نہیں کیا۔ مستشرقین، مسلمان مؤرخین سے اس باب میں متفق ہیں کہ مسلمان مدینہ میں قیام کے بعد ہی قریش سے جنگ کے منصوبے باندھنے لگے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ فوجی دستے مرتب کرنے سے مسلمانوں کا مقصد قریش کے قافلوں کو لوٹنا تھا کیونکہ لوٹ مار صحرانشینوں کی فطرت کا تقاضا ہے اور مسلمانانِ مدینہ نے بھی معاہدہ عقبہ کے خلاف اس معاملے میں آنحضرت صلعم کی پیروی محض مالِ غنیمت کے لالچ میں کی تھی۔

مذکورہ بالا بیان بے بنیاد ہے کیونکہ اہل مکہ کی طرح اہل مدینہ بھی صحرانشین نہ تھے اور نہ ان کی معاش کا دارومدار لوٹ مار پر تھا ان میں اکثر و بیشتر لوگ زراعت پیشہ تھے اور آرام وسکون کی زندگی کو جنگ وجدل پر ترجیح دیتے تھے۔ کبھی کوئی مجبوری ہی پیش آجاتی تو جنگ وجدل میں حصہ لیتے تھے۔ بہرحال مہاجرین کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ اپنا مال و متاع جو مکہ میں چھوڑ آئے تھے قریش سے واپس لیں لیکن اس کے لیے انہیں کوئی زیادہ بے چینی نہ تھی۔ غزوۂ بدر کے بعد اس غرض سے انہوں نے کوئی قدم نہیں اٹھایا اور فوجی دستے بھیجنے سے ان کا مقصد اموالِ قریش پر قبضہ کرنا نہ تھا۔ اس حقیر مقصد کے لیے، جیسا کہ مستشرقین کا خیال ہے، اسلام نے جنگ وجدل کی اجازت نہیں دی۔ نبی کریم ﷺ اور ان کے پیروؤں نے اس غرض سے کوئی جنگ نہیں لڑی۔ جنگ سے ان کی غرض و غایت یہ تھی کہ ہمیں دینی فرائض کی سرانجام دہی سے کوئی نہ روکے اور اسلام کی دعوت کے سلسلے میں کوئی خلل انداز نہ ہو۔ آنحضرت ﷺ نے عرب قبائل سے جو معاہدے کیے تھے ان سے مقصد صرف یہ تھا کہ مدینہ کا دبدبہ قائم ہو اور لوگ اس کی عظمت کے قائل ہوجائیں تاکہ قریش کی یہ جرات ہی نہ ہو

Marfat.com

کہ وہ ادھر کا رخ کریں اور مسلمانوں کے اخراج کے سلسلے میں وہی چال چلیں جو انہوں نے حبشہ میں چلی تھی تاہم اب بھی آنحضرت ﷺ دل سے یہ بات چاہتے تھے کہ قریش سے کوئی معاہدہ ہو جائے تا کہ فتنہ فرو ہو اور اسلام کی تبلیغ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

یہودیوں کی دسیسہ کاریوں کا سدباب

ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ کا مقصد ان دستوں کی ترتیب اور ان کی اسلحہ بندی سے اس کے سوا کچھ اور بھی ہو، ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ مدینہ اور اطراف مدینہ میں رہنے والے یہودیوں کو مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب کرنا چاہتے ہوں۔ جیسا کہ پیشتر مذکور ہوا یہودی شروع شروع میں نبی کریم ﷺ کو اپنا حلیف بنانا چاہتے تھے اور انہوں نے مسلمانوں سے یہ معاہدہ بھی کیا تھا کہ فریقین اپنے اپنے دینی رسوم کی بجا آوری میں آزاد ہوں گے لیکن کچھ دنوں بعد یہ دیکھ کر کہ مسلمانوں کا اثر و اقتدار روبہ ترقی ہے اور اسلام کی شان و شوکت کو چار چاند لگ رہے ہیں وہ اپنی سابقہ روش سے برگشتہ ہو گئے تھے اور ان کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے بغض و عناد کی بھٹیاں سلگ رہی تھیں وہ مدینہ میں خانہ جنگی کے اندیشے سے اپنی اسلام دشمنی کا کھلے بندوں اعلان نہ کر سکتے تھے اور نہ ان میں معاہدہ شکنی کا حوصلہ تھا تاہم مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے اور اوس و خزرج کی دیرینہ عداوتوں کی یاد تازہ کرنے کے لیے مکر و فریب کے جال بچھاتے رہتے تھے۔

جب مسلمانوں کو یہ علم ہو گیا کہ یہودی مکاریوں اور فتنہ پردازیوں پر تلے ہوئے ہیں تو انہوں نے انہیں منافقین سے بھی بدتر سمجھا اور اپنی مسجد سے بھی (ایک دفعہ) نکال باہر کیا۔ مسلمانوں نے ان سے میل جول اور گفتگو کا سلسلہ بھی ختم کر دیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ایک مدت تک یہودیوں کو دلائل سے مطمئن اور قائل کرنے کی کوشش کی لیکن آخر آپ ﷺ ان سے اجتناب کرنے لگے مگر یہ حقیقت آپ ﷺ پر روشن تھی کہ اگر یہودیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا تو وہ فتنہ و فساد کا طوفان برپا کر دیں گے اور اس کے علاوہ ان کی طاقت بھی بڑھ جائے گی۔ وقت اور ضرورت کا تقاضا یہی تھا کہ یہودیوں سے محض احتراز و اجتناب پر اکتفا نہ کیا جائے اور صرف یہی کافی نہ سمجھ لیا جائے کہ مسلمانوں کو ان کی حیلہ گری سے متنبہ کر دیا جائے بلکہ ضرورت یہ محسوس کی گئی کہ ان یہودیوں پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ مسلمان اتنے طاقت ور ہیں کہ وہ ہر فتنہ کو فرو کر سکتے اور ان کی فتنہ سامانیوں کو خاک میں ملا سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے کوئی تدبیر مسلح دستوں کی گشت اور فوجی مظاہروں سے زیادہ موثر اور کارآمد نہ ہوسکتی تھی۔ ساتھ ہی اس اقدام میں یہ احتیاط بھی ضروری تھی کہ مسلمانوں کو شکست کا منہ نہ دیکھنا پڑے اور یہودی بھی کہیں ان پر قریش کی طرح مسلط نہ ہو جائیں اس لیے اس کام کی سرانجام دہی کے لیے حضرت حمزہ ؓ ایسے تند مزاج اور آتش خو مسلمانوں کو فوجی دستوں کی

Marfat.com

سربراہ مقرر کیا گیا۔ اگر کوئی معین لائحہ عمل نہ ہوتا تو دوسروں کی مداخلت انہیں جنگ سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فوجی دستوں کی ترتیب سے مسلمانوں کے دو مقصد تھے۔ ایک طرف تو یہودیوں کو مرعوب کرنا مقصود تھا اور دوسری طرف قریش کو مصالحت پر آمادہ کرنا مطلوب تھا تا کہ مسلمان اپنے دینی مراسم آزادی کے ساتھ ادا کر سکیں۔

اسلام اور جنگ

ہم یہ نہیں کہتے کہ ان ایام میں اسلام جان و ایمان کے تحفظ کی خاطر جنگ سے منع کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اس کام کو نہ صرف مستحسن بلکہ واجب سمجھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ جارحانہ اقدام کی بھی اجازت نہیں دیتا چنانچہ قرآن شریف میں اس کے متعلق یہ ارشاد ہے:

وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ (سورۃ البقرہ:۱۹۰)

"اور حد سے نہ بڑھو (زیادتی نہ کرو) بے شک اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو اچھا نہیں سمجھتا۔"

اگر چہ مہاجرین اپنے مال و متاع کی واپسی کے مطالبے کے سلسلے میں حق بجانب تھے تاہم خدا کے نزدیک یہ مسئلہ زیادہ اہم تھا کہ مسلمان اپنے عقیدے میں آزاد ہوں اور کسی کو یہ جرأت نہ ہو کہ وہ انہیں اسلام سے برگشتہ کرے۔ اس مقصد سے جنگ جائز قرار دے دی گئی۔

اس دعوے کی دلیل وہ آیات ہیں جو عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے دستے سے متعلق نازل ہوئیں۔ آنحضرت ﷺ نے ۲ھ میں عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو مہاجرین کی ایک جماعت کے ہمراہ ایک تحریری فرمان دے کر روانہ کیا اور یہ حکم دیا کہ وہ دو دن کی مسافت طے کرنے کے بعد اسے پڑھیں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ یہ بھی ہدایت کی کہ ساتھیوں میں سے کسی کو اس کام پر مامور نہ کرنا۔ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے دو روزہ سفر کے بعد جب یہ فرمان کھولا تو اس میں یہ تحریر تھا:

"یہ تحریر پڑھنے کے بعد مکہ اور طائف کے درمیان نخلستان کا رخ کرنا، وہاں قریش کے قافلے کا انتظار کرنا اور اس کے حالات سے باخبر ہونا۔"

عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے ساتھیوں کو بھی یہ مضمون سنا دیا وہ سب ان کے ہمراہ نخلستان کی جانب روانہ ہو گئے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور حضرت عتبہؓ بن غزوان جو اپنے گم شدہ اونٹوں کی تلاش میں پیچھے رہ گئے تھے قریش کے ہاتھوں اسیر ہوئے۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی نخلستان تک پہنچ گئے۔ رجب کی آخری تاریخ کو قریش کا قافلہ عمرو بن حضرمی کی رہنمائی میں وہاں پہنچا۔ حضرت عبداللہؓ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کو قریش کے مظالم یاد آ گئے انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اگر آج کی رات ہم نے اس گروہ کو

Marfat.com

چھوڑ دیا تو یہ لوگ حرم میں داخل اور ہماری دسترس سے باہر ہو جائیں گے اور انہیں مار ڈالا تو ماہ حرام میں خونریزی ہوگی۔ اس تردد میں اول اول انہوں نے کوئی قدم نہ اٹھایا آخر گفت و شنید کے بعد یہ بات طے پائی کہ قتل اور لوٹ مار کے بغیر اس قافلے کو جانے نہ دینا چاہیے چنانچہ ان میں سے ایک نے تیر مار کر عمرو بن حضرمی کو ہلاک کر دیا اور دو شخصوں کو گرفتار بھی کر لیا۔

عبداللہؓ بن جحش اور ان کے ساتھی قافلے کا مال اور قیدی لے کر مدینہ آئے اور انہیں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ غنیمت کا پانچواں حصہ بھی آپ ﷺ کے لیے علیحدہ کر دیا گیا آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے یہ حکم نہیں دیا تھا کہ ماہ حرام میں جنگ کرو۔'' آپ ﷺ نے مالِ غنیمت میں کوئی تصرف نہیں کیا اور قیدیوں کی نگہداشت کا حکم بھی دیا۔ عبداللہؓ بن جحش اور ان کے ساتھی اپنے اقدام سے متعلق سخت تشویش میں مبتلا تھے۔ مسلمان انہیں ملامت کرتے تھے اور قریش نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا تھا کہ نبی کریم ﷺ اور ان کے رفقا نے ماہِ حرام کا احترام نہیں کیا اس مہینے میں قتل و غارت سے باز نہیں آئے اور دو شخصوں کو گرفتار بھی کر لیا۔ مکہ کے مسلمان اس پروپیگنڈے کا یہ جواب دیتے تھے کہ مسلمانوں نے یہ اقدام شعبان میں کیا ہے۔ یہودی اس معاملے میں دخل دے کر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانا چاہتے تھے۔ انہی ایام میں آیت نازل ہوئی۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ (سورۃ البقرۃ: ۲۱۷)

''آپ ﷺ سے ماہ حرام میں جنگ سے متعلق جو لوگ سوال کرتے ہیں ان سے کہہ دیجیے کہ اس مہینے میں جنگ بڑا گناہ ہے مگر لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کا انکار کرنا اور مسجد حرام میں نہ جانے دینا نیز مکہ سے وہاں کے بسنے والوں کو نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے اور یہ لوگ تم سے برابر لڑتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ اگر بن پڑے تو تمہیں دین سے برگشتہ کر دیں۔''

مسلمانوں کو اس آیت کے نزول سے اطمینان بھی ہوا اور مسرت بھی۔ نبی کریم ﷺ نے قافلے کے مال میں تصرف کیا اور اسیروں کو اپنے یہاں کڑی نگرانی میں رکھا۔ قریش نے زرِ فدیہ دے کر اپنے آدمیوں کو رہا کرانے کی کوشش کی لیکن آپ نے فرمایا: ''ہمارے دو دوست حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عتبہ بن غزوان تمہارے پاس اسیر ہیں، ہم ان کی رہائی چاہتے ہیں اگر تم نے انہیں ہلاک کر دیا ہے تو ہم بھی

تمہارے دونوں ساتھیوں کو جو ہمارے پاس اسیر ہیں ہلاک کر دیں گے۔"

غرض قریش نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ کو رہا کر دیا ان کے بدلے میں آنحضرت ﷺ نے بھی ان کے اسیروں کی رہائی کے احکام صادر کر دیے ان اسیروں میں سے ایک اسیر حکم بن کسیان نے اسلام قبول کر لیا اور دوسرے نے مکہ کی راہ لی اور وہیں اپنے آبائی دین پر اس کی موت واقع ہوئی۔

اس موقع پر ہمیں عبداللہ رضی اللہ عنہ بن جحش کے دستے اور اس آیت کے مضمون پر غور کرنا ہے کیونکہ یہاں سے اسلام کی سیاست کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ اس واقعے سے ایک ذی اقتدار اور عظیم الشان شخصیت کا حال معلوم ہوتا ہے جس نے مادی اور روحانی زندگی کے اندر نظم وضبط کی روح دوڑا دی تھی۔ قرآن کریم نے ان مشرکین کے سوال کا جواب دیا جو ماہ حرام میں جنگ سے متعلق دریافت کرتے تھے اور ان کے نظریے کی تائید کی کہ واقعی ماہ حرام میں جنگ بڑا گناہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ فرمایا کہ ایک گناہ اور ہے جو اس سے بھی زیادہ بڑا ہے اور وہ مسجد حرام سے لوگوں کا اخراج ہے یعنی کسی کو اس کے دین سے مکروفریب، حرص وطمع اور ظلم وتشدد کے ذریعے سے باز رکھنا، اور یہ کہ ماہ ہائے حرام میں اقدامِ قتل فتنہ پردازی سے کہیں بہتر ہے اور قریش جو ماہِ حرام میں قتل سے متعلق دریافت کرتے ہیں وہ اب بھی مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہیں اور اگر ان کے بس میں ہو تو انہیں اسلام سے منحرف کر دیں، ایسے حالات میں کہ قریش مسلمانوں کو مسجد حرام سے نکال رہے ہیں اور انہیں اسلام سے برگشتہ ہونے کے لیے مجبور کر رہے ہیں اس میں کیا قباحت اور کیا مضائقہ ہے اگر وہ لوگ جنہیں ان سے نقصان پہنچ رہا ہے ماہ حرام میں ان سے لڑنے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ ماہِ حرام میں لڑنا اس صورت میں معیوب اور کارِ معصیت ہے جب فریق ثانی ایسا شخص یا ایسی جماعت ہو جس سے شر کا ظہور نہ ہوا ہو۔

قرآن اور جنگ

فتنہ پردازی اپنی نوعیت کے اعتبار سے قتل اور خونریزی سے زیادہ مکروہ ہے۔ اگر کسی شخص کو لوگ اس کے دین سے برگشتہ کرنے کی کوشش اور جدوجہد کرتے ہیں تو اسے یہ حق پہنچتا ہے بلکہ اس پر یہ واجب ہے کہ وہ ان سے جنگ کرے تاکہ مخالف اپنے اقدام سے باز رہیں اور دین کا بول بالا ہو۔ مستشرقین اور مسیحی مبلغین یہ آوازے کستے ہیں کہ اسلام لوگوں کو جہاد کی دعوت دیتا ہے اور اس کی طرف سے یہ اجازت ہے کہ اس کے پیرو لوگوں کو بزورِ شمشیر حلقہ بگوش اسلام کریں، کیا یہ تعصب نہیں ہے؟ عیسائیت کی دینی تعلیمات کی رو سے جنگ ایک مذموم فعل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دین لوگوں کو امن وسلامتی اور صلح وآشتی کی دعوت دیتا ہے ہم نہیں چاہتے کہ اس موقع پر عیسائیوں سے بحث وتکرار کی خاطر انجیل کا یہ قول نقل کریں:

"میں زمین پر صلح جوئی کے لیے نہیں بلکہ شمشیر زنی کے لیے آیا ہوں۔"

Marfat.com

ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ انجیل کے اس قول کی شرح کریں کیونکہ مسلمان، دینِ مسیح کو جیسا کہ قرآن میں واضح کیا گیا ہے، تسلیم کرتے ہیں۔ ہم ان لوگوں کے بہتان و افترا کی تردید کرنا چاہتے ہیں جو یہ کہتے ہیں: ''آنحضرت ﷺ کی تعلیم ہے کہ لوگوں کو بزورِ شمشیر دائرہ اسلام میں داخل کیا جائے۔'' قرآن اس اتہام کی ان الفاظ میں تردید کرتا ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (سورۃ البقرہ:۲۵۶)

''دین میں کوئی جبر نہیں، ہدایت اور گمراہی کی راہیں جدا جدا ہیں۔''

دوسری جگہ قرآن کریم میں یہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۱۹۰ (سورۃ البقرہ:۱۹۰)

''اور جنگ کرو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو اچھا نہیں سمجھتا۔''

ان کے علاوہ اس مضمون کی اور بہت سی آیات نازل ہوئیں۔

جہاد فی سبیل اللہ

عبداللہؓ بن جحش کے فوجی دستے سے متعلق جو آیات نازل ہوئیں ان کی رو سے جہاد فی سبیل اللہ سے مراد وہ جنگ ہے جو ان لوگوں سے کی جائے جو مسلمانوں کو دین سے برگشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جنگ دین کے تحفظ اور اس کی بقا کے لیے ہوتی ہے۔ عصر حاضر کی اصطلاح میں اس کا مقصد عقیدے کا دفاع اور اس کا تحفظ ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کو دلیل کے سہارے اس کے عقیدے سے منحرف کرنا چاہے اور طاقت، رشوت اور اذیت سے کام نہ لے تو اس کی دلیل کا توڑ دلیل ہی سے کرنا چاہیے لیکن اگر کوئی طاقت اور اسلحہ کی مدد سے کسی کو اس کے عقیدے سے پھیرنا چاہے تو اس کا مقابلہ طاقت اور اسلحہ سے کرنا چاہیے کیونکہ انسان کی قدر و منزلت اس کے عقائد سے وابستہ ہے اور ان لوگوں کے نزدیک جو انسانیت کے مفہوم سے آشنا ہیں، عقیدہ، دولت، طاقت، اقتدار حتیٰ کہ جان سے بھی زیادہ عزیز ہے یہ مادی زندگی تو ایک متاعِ حقیر ہے جس سے قدرت نے حیوانات کو بھی بہرہ یاب کیا ہے۔ حیوانات بھی انسانوں کی طرح خواب و خور اور نشوونما کے طبعی خصائص سے محروم نہیں ہیں۔ عقیدہ انسان کو بنی نوع انسان کے رشتے میں منسلک، اپنے پروردگار سے قریب اور حیوانات سے ممتاز کر دیتا ہے۔ یہ عقیدے ہی کا صدقہ ہے کہ ایک انسان کے دل میں خیر خواہی اور نوع پروری کے جذبات بیدار ہوتے ہیں یہاں تک کہ جو کچھ وہ اپنے لیے چاہتا ہے وہی دوسروں کے لیے چاہتا ہے۔ ایسا انسان بے نوا اور نادار اشخاص کو خود اپنے قرابت داروں پر ترجیح دیتا ہے اور وہ ہمیشہ بنی نوع انسان

Marfat.com

کے شرف وکمال کے لیے کوشاں رہتا ہے۔

جب عقیدے کی روح کسی کے دل و دماغ میں سرایت کر جاتی ہے تو دوسروں کی گمراہ کن روش کے سلسلے میں وہ صاحب عقیدہ کچھ اسی قسم کی روش اختیار کرتا ہے جیسی کہ مسلمانوں نے مکہ میں ہجرت سے پہلے اختیار کی تھی۔ وہ مصائب و آلام برداشت کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ بھوک، پیاس اور ناکامیاں اسے عقیدے سے برگشتہ نہیں کرسکتیں۔ پہلے عیسائیوں نے بھی مسلمانوں کی طرح یہی روش اختیار کی تھی۔ وہ رنج و آزار پر صبر کرتے تھے، لیکن یہ ایک مخصوص طبقہ ہوتا تھا اسے ہم عوام کی سطح پر نہیں لاسکتے۔ قدرت اس طبقے کے افراد کو انسانیت کے بلند معیار پر فائز کردیتی ہے۔ ان کی بے پناہ ایمانی قوت کا بحرنا پیدا کنار اپنی رو میں مصائب وشدائد کی چٹانیں خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے......قدرت ان کے ایمان کی بنیادیں اتنی مستحکم کردیتی ہے کہ اگر وہ پہاڑ سے بھی کہیں کہ تو جنبش میں آ، تو وہ ضرور جنبش میں آجائے گا۔

اگر کوئی شخص انہی وسائل اور اسلحہ سے مخالفین کا مقابلہ کرسکتا ہے جن کے بل بوتے پر وہ اسے دین سے برگشتہ کرنا چاہتے ہیں تو اسے اس اقدام میں تامل و تذبذب نہیں کرنا چاہیے ورنہ یہ سمجھ لیا جائے گا کہ اس کے عقائد کی بنیادیں کمزور ہیں۔ رسول کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ نے مدینہ میں اقامت گزینی کے بعد یہی روش اختیار کی اور یہی روش عیسائیوں نے روم اور شام میں برسراقتدار آنے، شاہانِ روم کے قبولِ عیسائیت اور ان کی پشت پناہی کے بعد اختیار کی تھی۔

عیسائیت اور جنگ

عیسائی مبلغین بزعم خود یہ کہتے ہیں کہ مسیحیت کی تعلیم کی رو سے جنگ جائز نہیں ہے۔ ہم اس دعویٰ کی صحت یا عدم صحت سے بحث نہیں کرتے، مسیحیت کی تاریخ خود گواہی دیتی ہے اور تاریخ اسلام بھی شاہد عادل ہے کہ جب سے دین مسیح کو فروغ نصیب ہوا ہے، اس کے دور اقتدار میں زمین انسانی خون کے چھینٹوں سے لالہ زار بن گئی ہے۔ رومیوں اور دوسری مغربی اقوام نے وہ خونریزیاں کیں کہ خدا کی پناہ! صلیبی جنگوں کی ہولناک قیامت سامانیوں میں خود عیسائیوں کے اقدام کو دخل ہے۔ مسلمانوں نے اس سلسلے میں پہل نہیں کی تھی۔ برسوں عیسائی جنگ جو گروہ در گروہ یورپ سے اسلامی ممالک کی جانب پیش قدمی کرتے اور مسلمانوں سے معرکہ آرا ہوتے رہے۔ پاپایانِ روم جو جانشینانِ مسیح کی حیثیت رکھتے تھے ان عیسائی نبرد آزماؤں کے حق میں، جو بیت المقدس پر قبضے کے لیے یورش کرتے تھے، دعائیں مانگتے تھے۔ کیا یہ پاپایانِ روم سب کے سب مسیحیت کی تعلیم سے بیگانہ اور دین سے منحرف تھے؟ کیا انہیں یہ علم نہ تھا کہ مسیحیت نے جنگ کے حق میں عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے؟ یا پھر یہ تسلیم کرلینا چاہیے کہ قرونِ وسطیٰ کا دور ظلمت و جہالت کا دور تھا اور بنا بریں

Marfat.com

اس دور کے واقعات کو عیسائیت کی تائید یا تردید میں نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اگر یہ لوگ بفرضِ محال ایسی بات کہیں تو ہم انہیں یہ جواب دیں گے کہ آج بیسویں صدی میں بھی جسے تہذیب و شائستگی اور علم و ہنر کا دور سمجھا جاتا ہے، انہی واقعات کا اعادہ ہو رہا ہے جو قرونِ وسطیٰ میں ظہور پذیر ہوئے تھے۔ اس کی مثالیں ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں چنانچہ ۱۹۱۸ء کے اواخر میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر لارڈ الیانی نے جو اتحادیوں کے نمائندہ تھے، بیت المقدس پر صلیب لہراتے ہوئے نہایت فخر کے ساتھ کہا تھا: "آج صلیبی جنگوں کا خاتمہ ہوا ہے۔"

مقدسین اسلام و مسیحیت

اگر مختلف تاریخی ادوار میں کچھ ایسے مسیحی مقدسین کا سراغ ملتا ہے جنہیں جنگ سے قطعاً نفرت تھی اور وہ اپنی روحانی عظمت کی بنا پر نہ صرف وحدت انسانی بلکہ آفاقی یگانگی کے اسرار و رموز سے آشنا تھے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تاریخ ہمیں ایسے مقدسین اسلام سے بھی روشناس کراتی ہے جن کی روحانی شخصیتیں حقیر و ناچیز اختلافات سے بلند و بالا رہی ہیں اور جن کی مہر و محبت میں ڈوبی ہوئی نظر ساری کائنات کا احاطہ کیے ہوئے تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مقدسین عام اس سے کہ وہ مسیحی ہوں یا مسلمان، کمالِ انسانیت کے آئینہ دار ہیں لیکن وہ زندگی جو عوام بسر کرتے ہیں ابھی اس بلند مقام تک نہیں پہنچی ہے۔ ہم ابھی اس مقام کا صرف تصور ہی کر سکتے ہیں، خارج میں اس کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔ ہر دور میں انسان جنگ و جدل کے دلدادہ اور جنگ و خونریزی پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں۔ اسلحہ سازی اور تباہ کن آلاتِ جنگ کی صنعت روز افزوں ترقی پر ہے۔ تخفیف اسلحہ اور جنگ بندی کی تجاویز صرف ان اوقات اور ان مواقع پر زیر غور آتی ہیں جب دنیا کی اقوام لڑتے لڑتے عاجز و درماندہ ہو جاتی ہیں اور ان کی جنگجو یانہ قوت کی چولیں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں۔ امن و صلح کی باتیں زیادہ تر انہی لوگوں کی زبانوں پر ہوتی ہیں جنہوں نے کبھی اس میدان میں عملی اقدام نہیں کیا۔ مسلح صلح پر انہوں نے کبھی اس صلح کو فوقیت نہیں دی جس کی تحریک عدل و انصاف اور اخوت و مساوات کے تقاضے کرتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ مسلح صلح ہی دراصل جنگ کا پیش خیمہ اور تباہی و بربادی کا ہراول ثابت ہوتی ہے۔

اسلام دینِ فطرت ہے

اسلام کی تعلیمات میں وہم و خیال اور تصور و تخیل کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے وہ صرف اس چیز پر قناعت نہیں کرتا کہ اس کے معدودے چند افراد اپنی زندگی میں بلند و بالا مقام حاصل کر لیں بلکہ یہ دین، دینِ فطرت ہے۔ اس کے پیرو افراد بھی ہیں اور جماعتیں بھی۔ جہاں تک جنگ انسان کی طبیعت اور اس کے مزاج سے تعلق رکھتی ہے اس کا استیصال نہیں کیا جا سکتا البتہ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ اس پر انسانیت کا غلاف

چڑھا دیا جائے۔ یہ بہت بڑی اصلاح ہے جس سے انسانیت کے لیے راہیں ہموار ہوسکتی ہیں جنگ کو انسانیت کا روپ دینے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ اسے جان و ایمان کے تحفظ کے لیے جائز قرار دے دیا جائے اور جنگ کے دوران میں یہ چیز بھی ملحوظ رہے کہ اخلاق و شرافت کے دامن پر کسی صورت داغ نہ لگنے پائے۔ جہاد جسے اسلام نے جائز قرار دیا ہے اور قرآن حکیم نے جس کی تائید و توثیق کی ہے، اسی قسم کی مدافعانہ جنگ کا نام ہے۔

❋

حواشی

۱۔ اس سے مقصد قریش کی اس تجارتی لائن کو قطع کرنا تھا جو اہل مکہ اور اہل شام کے درمیان واقع تھی یا کچھ اور؟
(ص:۶۱۰:۶ ملاحظہ ہو"ابوجہل بن ہشام تجارتی قافلہ لے کر شام سے لوٹ رہا تھا"؟)

(زادالمعاد ابن القیم جلد اول فصل فی سیاق مغازیہ وبعوثہ)۔

۲۔ مکہ و مدینہ کی درمیانی حدود۔"حجاز...... میان دو چیز مکہ و مدینہ و طائف و روستاہائے آنہا کانہا حجرت بین نجد و تہامہ"۔

(منتہا الارب)

۳۔ سریہ اور غزوہ میں یہ تفریق بیان کی جاتی ہے، سریہ جس میں رسول اللہ ﷺ خود شریک نہ ہوں۔ غزوہ جس میں آنحضرت ﷺ بنفسہٖ شرکت فرمائیں، خواہ مقابلہ و مقاتلہ کی نوبت آئے یا نہ آئے۔

Marfat.com

باب 12

حق و باطل کا پہلا معرکہ

غزوۂ بدر

عبداللہؓ بن جحش کے فوجی دستے کی تشکیل سے اسلامی سیاست نے اپنی تاریخ کا ایک نیا ورق الٹا تھا کیونکہ اس موقع پر واقد بن عبداللہ تیمی کے تیر سے عمرو بن حضرمی کی ہلاکت عمل میں آئی تھی۔ یہ پہلا خون تھا جو مجاہدین اسلام کے ہاتھوں بہا اور اس بارے میں وہ آیات نازل ہوئیں جنہیں ہم پیشتر نقل کر چکے ہیں۔ ان آیات کی رو سے ان لوگوں کے ساتھ جنگ کی اجازت مل گئی تھی جو مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مسلمانوں نے ارادہ کرلیا تھا کہ جنگ کے ذریعے سے اپنا مال و متاع قریش سے واپس لیں۔ قریش اس واقعہ کے بعد (عمرو بن حضرمی کے قتل کے بعد) اس کوشش میں تھے کہ عرب قبائل کو مسلمانوں سے جنگ کے لیے آمادہ کریں اور ان کے خلاف یہ زہر اگلیں کہ مسلمانوں نے ماہ حرام میں ایک آدمی کو ہلاک کیا ہے (حالانکہ اس مہینے کی حرمت کا تقاضا یہ تھا کہ مطلق خونریزی نہ ہوتی) ادھر آنحضرت ﷺ کو بھی یہ پختہ یقین ہو گیا تھا کہ قریش سے کسی قیمت پر صلح نہیں ہو سکتی۔

ابوسفیان کا قافلہ تجارت

دوسرے سال ہجری کے اواخر میں قریش کا ایک قافلہ تجارت ابوسفیان کی سرکردگی میں عازم شام ہوا۔ اور یہ وہی قافلہ تھا جس کی تلاش میں نبی کریم ﷺ عشیرہ تک گئے تھے لیکن اس کی روانگی دو روز پیشتر عمل میں آ چکی تھی اور مسلمانوں نے یہ طے کیا تھا کہ اب اس کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے۔ جب قافلے کی مراجعت کے ایام قریب آئے تو رسول کریم ﷺ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کو قافلے کی سراغرسانی کے لیے روانہ فرمایا۔ یہ دونوں حوراء پہنچ کر کشد جہنی کے خیمے میں فروکش ہوئے یہاں تک کہ قافلہ بالائی حصے سے گزرا، یہ دیکھ کر دونوں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعید رضی اللہ عنہ بسرعت تمام واپس آئے اور نبی کریم ﷺ کو قافلے کی خبر دی لیکن آنحضرت ﷺ کو ان کی آمد سے پیشتر ہی خبر مل چکی تھی کہ قافلہ بہت بڑا ہے، اہل مکہ نے اس قافلے میں حسب استطاعت حصہ لیا ہے اور اس کے مال اسباب کی مالیت پچاس ہزار

Marfat.com

دینار کے قریب ہے۔ آپ ﷺ کو اندیشہ تھا کہ ایسا نہ ہو، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی خبر رسانی کے وقت تک قافلہ گزر جائے اور مسلمان واپسی میں بھی اس پر قابو نہ پاسکیں، اس لیے آپ ﷺ نے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا کہ قریش کا قافلہ راستے میں ہے باہر نکل کر اس کا تعاقب کرو شاید اس کا مال تمہارے ہاتھ آجائے۔

بعض نے اس پیغام پر لبیک کہا، بعض تذبذب میں پڑ گئے اور بعض نے مالِ غنیمت کی طمع (یہ مسلمان نہ تھے) میں مسلمانوں کے ہمراہ جانے کی خواہش ظاہر کی لیکن آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ تم اگر ہمارے ساتھ چلنا چاہتے ہو تو پہلے مشرف بہ اسلام ہو جاؤ۔

ابوسفیان کو شام کی جانب سفر کرتے ہوئے یہ علم ہو چکا تھا کہ نبی کریم ﷺ قافلہ قریش کی تلاش میں نکلے ہیں چنانچہ واپسی میں بھی اسے مسلمانوں کی طرف سے حملے کا اندیشہ تھا اور اس غرض سے وہ مسلمانوں کی نقل و حرکت سے متعلق حالات دریافت کرتا رہتا تھا۔ قافلہ قریش شام سے لوٹتے ہوئے حوراء کے مقام پر پہنچا تو ابوسفیان نے کشد جہنی سے مسلمانوں کی سرگرمیوں کا حال دریافت کیا۔ اگرچہ جہنی نے اسے صحیح جواب نہ دیا تاہم ابوسفیان کو ایک حد تک مہاجرین و انصار کی منصوبہ بندیوں کا علم ہو گیا تھا اور اسے اپنے انجام کا خوف دامن گیر تھا کیونکہ قافلے کے پاسبانوں کی تعداد تیس یا چالیس افراد سے زیادہ نہ تھی۔

اس خیال سے ابوسفیان نے ضمضم بن عمرو غفاری کو مکہ بھیجا اور اس کے ذریعے سے قریش کو یہ پیغام دیا کہ فوراً مدد کے لیے کچھ لوگ بھیجو، (حضرت) محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھی ہمارے درپے ہیں۔ ضمضم نے مکہ کے پاس پہنچ کر اپنے اونٹ کے کان کاٹ ڈالے، اس کی ناک چیر دی، کجاوہ الٹ دیا، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور اونٹ پر کھڑا ہو کر چلایا: ''اے قریش! تمہارا مال خطرے میں ہے، (حضرت) محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھی کاروانِ ابوسفیان کا تعاقب کر رہے ہیں، تمہارے مال کی خیر نہیں، جلد مدد بھیجو۔'' ابوجہل نے ضمضم کی یہ پکار سن کر خانہ کعبہ کے نزدیک کھڑے کھڑے لوگوں کو امداد کے لیے جمع کیا۔ ابوجہل بہت تیز، طرار، دوراندیش اور زبان آور تھا لیکن قریش کو اس موقع پر کسی ترغیب و تحریک کی احتیاج نہ تھی کیونکہ قافلے میں ہر ایک کا تھوڑا بہت مال تھا۔

اہل مکہ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یہ محسوس کرتے تھے کہ قریش مسلمانوں پر خاصا ظلم و ستم کر چکے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو پہلے ہجرتِ حبشہ پر اور بعد میں ہجرتِ مدینہ پر مجبور کیا، یہ اس تذبذب میں تھے کہ کارواں کی حفاظت کے لیے جائیں یا یہ سمجھ کر کہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا مکہ میں ہی ٹھہرے رہیں۔ ان لوگوں کو یہ خیال بھی تھا کہ قریش اور کنانہ کے درمیان قدیم ایام سے عداوت چلی آتی ہے اور وہ ایک دوسرے سے انتقام لینے کی فکر میں رہتے ہیں ممکن ہے۔ ادھر قریش اپنے قافلے کی حفاظت کے لیے جائیں اور ادھر کنانہ انتقام لینے کے لیے مکہ پر چڑھائی کر دے۔ قریب تھا کہ قریش پر بھی یہ اندیشہ غالب آجائے اور

Marfat.com

قافلے کی حفاظت کے لیے روانگی کا قصد ملتوی کر دیں لیکن مالک بن جعشم مدلجی نے جو کنانہ کے سرداروں میں سے تھا، مکہ پہنچ کر قریش کو اطمینان دلایا کہ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے جانے کے بعد کنانہ مکہ پر حملہ آور نہیں ہوں گے۔" مالک بن جعشم کی یقین دہانی پر ابوجہل اور عامر حضرمی کی یہ رائے کہ قافلے کی حفاظت کے لیے ضرور جانا چاہیے، غالب آئی اور جو شخص لڑنے کی طاقت رکھتا تھا اس کے لیے دو ہی راستے تھے۔ یا خود کارواں کی حفاظت کے لیے جائے یا کسی دوسرے کو اپنی طرف سے بھیجے۔ اکابر قریش میں سے کوئی بھی شخص ابولہب کے سوا مکہ میں نہ رہا۔ عاص ابن ہشام کو ابولہب کے چار ہزار درہم دینے تھے۔ ابولہب نے اسے اپنے بجائے بھیج دیا۔ امیہ بن خلف بوڑھا اور بھاری بھرکم آدمی تھا۔ وہ بھی قافلے کی حفاظت کے لیے جانا نہیں چاہتا تھا۔ عقبہ بن ابی معیط اور ابوجہل اس کے پاس گئے۔ عقبہ کے پاس انگیٹھی تھی اور دھونی کے لیے خوشبو (یا کوئی چیز جس سے آگ میں ڈال کر دھونی دی جاتی ہے)، ابوجہل کے پاس سرمہ دانی اور سلائی تھی۔ عقبہ نے انگیٹھی امیہ بن خلف کے سامنے کی اور کہا: ابوعلی تو عورت ہے خوشبو کی دھونی دے۔ ابوجہل بولا: ابو علی تو صنف نازک ہے سرمہ لگا۔ امیہ بن خلف نے ان کے طن و تشنیع سے زچ ہو کر اونٹ خریدا اور دوسروں کے ساتھ اس نے بھی رخت سفر باندھا۔

مسلمانوں کی نقل و حرکت

آنحضرت ﷺ نے ۸ رمضان ۲ھ کو مدینہ سے قصد سفر کیا۔ روانگی سے قبل آپ ﷺ نے عمرو بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو فرائض امامت کی انجام دہی کی خدمات سونپیں اور مدینہ کے داخلی انتظامات کی باگ ڈور ابو لبابہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کی۔ مجاہدینِ اسلام کی جماعت سیاہ رنگ کے دو پرچم لیے ہوئے تھی۔ ان کے پاس ستر اونٹ تھے۔ اونٹوں کی کمی کے باعث سواری کا بندوبست یہ کیا گیا تھا کہ باری باری دو سے چار اشخاص تک ہر اونٹ پر سوار ہوں۔ نبی کریم ﷺ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک اور صحابی شریک تھے اور دوسروں کی طرح باری باری اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی ایک اونٹ کے مشترکہ سوار تھے۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ جو مجاہدین شریک تھے ان کی تعداد تین سو پانچ تھی ان میں ۸۳ مہاجرین، ۶۱ اوسی اور باقی خزرجی تھے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت نے سبک گامی سے مسافت طے کی۔ اس خیال سے کہ ابوسفیان قافلے کے ساتھ راہ فرار اختیار نہ کرے راستے میں اس جماعت کا جہاں پڑاؤ ہوتا، اس کے افراد ابوسفیان کے قافلے کا حال دریافت کرتے۔ عرق الظبیہ[1] کے مقام پر ان کی ملاقات ایک اعرابی سے ہوئی۔ انہوں نے اس سے قافلے کے بارے میں پوچھ گچھ کی لیکن وہ کچھ بھی نہ بتا سکا۔ وادی ذفران پہنچنے کے بعد مسلمانوں کو پتہ چلا کہ قریش اپنے قافلے کی حفاظت کے لیے آ پہنچے ہیں۔ اب صورتِ حال مختلف ہو گئی، مسلمانوں کو اس صورت میں

Marfat.com

ابوسفیان کے قافلے کے تیس یا چالیس محافظین ہی سے مقابلہ درپیش نہ تھا کہ آسانی سے ان پر قابو پالیتے بلکہ تمام اکابر قریش اور اہل مکہ سے تصادم کی نوبت آ پہنچی تھی۔ اگر مسلمان قافلہ ابوسفیان کو لوٹ لیتے اور کچھ لوگوں کو اسیر کر کے اپنے ہمراہ واپس لے جاتے تو اس صورت میں بھی یہ خطرہ تھا کہ قریش تعاقب کریں گے اور جنگ چھڑے بغیر نہیں رہے گی۔ اس عالم میں نبی کریم ﷺ مدینہ کو مراجعت فرماتے تو مسلمانوں کی سبکی یقینی تھی۔ مزید برآں یہودیوں کی نظر میں بھی ان کا وقار باقی نہ رہتا اور مجبوراً نبی کریم ﷺ کو یہودیوں سے صلح کرنی پڑتی۔ اعلائے کلمۃ الحق اور دین اسلام کی فتح مندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔

آنحضرت ﷺ نے اس سلسلہ میں اپنے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ اپنی اپنی رائے کا اظہار کر چکے تو مقداد بن عمرو نے کہا:

"یَا رَسُوْلَ اللهِ اِمْضِ لِمَا اَرَاكَ اللهُ فَنَحْنُ مَعَكَ وَاللهِ لَا نَقُوْلُ لَكَ كَمَا قَالَ بَنُوْا اِسْرَائِيْلَ لِمُوْسٰى: اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ وَلٰكِنْ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا مَعَكُمَا مُقَاتِلُوْن"

''یا رسول اللہ! جو کچھ خدا نے آپ پر ظاہر کیا ہے اس کے مطابق اقدام کیجیے ہم آپ کے ساتھ ہیں خدا کی قسم! ہم بنی اسرائیل نہیں جنھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا تھا کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر لڑیں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں[1] لیکن (ہم تو یہ کہتے ہیں) آپ ﷺ اور آپ ﷺ کا خدا جا کر لڑیں، ہم بھی دونوں کے ساتھ ساتھ جدال و قتال میں برابر کا حصہ لیں گے۔''

دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم پر سکوت طاری تھا۔ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''حضرات! آپ بھی تو اپنی رائے کا اظہار کریں۔'' دراصل آپ ﷺ کا روئے سخن انصار کی جانب تھا جنہوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم آپ ﷺ کی حفاظت اسی طرح کریں گے جس طرح اپنے اہل و عیال کی حفاظت کرتے ہیں لیکن انہوں نے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ ہم کسی فوجی اقدام میں بھی آپ ﷺ سے تعاون کریں گے۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی تقریر

حضرت سعدؓ بن معاذ انصار کے علمبردار تھے آپ نے عرض کیا: ''کیا آپ ﷺ کا روئے سخن ہماری جانب ہے؟'' نبی کریم ﷺ نے اثبات میں جواب دیا اس پر حضرت سعدؓ بن معاذ نے ان الفاظ میں انصار کے جذبات کی ترجمانی کی:

''ہم آپ ﷺ پر ایمان لائے، ہم نے آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی اور یہ شہادت دی کہ آپ ﷺ کا دین، دین برحق ہے آپ ﷺ سے ہم نے یہ عہد بھی کیا کہ ہم آپ ﷺ کی اطاعت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے۔ آپ ﷺ کا

Marfat.com

جو ارادہ ہو کیجیے، ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ ہیں اس خدا کی قسم! جس نے آپ ﷺ کو رسالت کے منصب پر فائز کیا، اگر آپ ﷺ سمندر میں بھی کودیں گے تو ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ چھلانگیں لگائیں گے اور ہم میں سے کسی ایک کو بھی آپ ﷺ ساحل پر نہیں پائیں گے، ہم دشمن کے مقابلے میں بے خوف ڈٹ کر لڑیں گے، ہم رزم میں ثابت قدم اور بزم میں راست گفتار ہیں، شاید خدا ہماری روش سے آپ ﷺ کو مطمئن و مسرور کرے اور ہمیں ہدایت دے اور اپنی برکات سے نوازے۔''

ابھی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی تقریر مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ نبی کریم ﷺ کا چہرہ فرطِ مسرت سے دمک اٹھا اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''آگے بڑھو اور فضلِ الٰہی کے امیدوار رہو کیونکہ اس نے مجھے قریش کے دو گروہوں میں سے ایک پر غلبہ و نصرت عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے اور مجھے نظر آ رہا ہے کہ وہ کہاں کہاں اپنے کیفر کردار کو پہنچیں گے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم کی جمعیت اس مقام سے روانہ ہوئی اور اس نے بدر کے مقام پر پڑاؤ کیا۔ یہاں نبی کریم ﷺ کو ایک بوڑھا آدمی نظر آیا۔ آپ ﷺ نے اس سے قریش کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کیں۔ بوڑھے کے جواب سے آپ ﷺ کو یہ علم ہوا کہ قافلہ قریش کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔

بوڑھے سے قافلہ قریش کی آمد سے متعلق اطلاع پا کر نبی کریم ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو چند اصحاب کے ہمراہ چاہِ بدر کی جانب بھیجا تا کہ وہ وہاں جا کر خیر خبر لائیں۔ یہ جماعت تھوڑی دیر بعد واپس آئی اور اپنے ہمراہ دو غلام لائی۔ رسولِ کریم ﷺ نے ان غلاموں سے قافلہ قریش کا موقف معلوم کیا اور ان کی تعداد پوچھی۔ غلام اس سوال کا صحیح صحیح جواب نہ دے سکے تو آپ ﷺ نے ان سے دریافت کیا: ''اچھا تو یہ بتاؤ کہ ان کے یہاں ہر روز کتنے اونٹ ذبح ہوتے ہیں؟'' غلاموں نے جواب دیا کہ کسی دن نو اور کسی دن دس اونٹ ذبح کیے جاتے ہیں۔ اس جواب سے آپ کو یہ اندازہ ہو گیا کہ قریش کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔ غلاموں سے یہ بھی معلوم ہو گیا تمام اکابر قریش مسلمانوں کی مزاحمت کے لیے مکہ سے نکل آئے ہیں۔ قریش کے بارے میں اہم اور کارآمد معلومات حاصل کرنے کے بعد آپ ﷺ صحابہؓ سے مخاطب ہوئے اور یہ فرمایا:

هٰذا مكة قد القت اليكم افلاذ كبدها

''لو، مکہ نے اپنے تمام جگر گوشوں کو تمہاری طرف بھیج دیا۔''

اس طرح نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو قریش سے جنگ کے لیے آمادہ کر دیا حالانکہ آخر الذکر تعداد میں ان سے تین گنا زیادہ تھے۔ آپ ﷺ نے ان کی قوتِ ارادی کو مضبوط اور ان کے عزائم کو قوی کر دیا کیونکہ ہولناک معرکہ درپیش تھا اور اس میں وہی لوگ فاتح و کامران ہو سکتے تھے جنہیں اپنی ایمانی قوت پر اعتماد اور نصرتِ الٰہی کا تیقن ہو۔

دو مسلمان پھر بدر کی جانب گئے اور حالات کا جائزہ لینے کی خاطر کنوئیں کے قریب جا بیٹھے۔ یہاں انہوں نے دو کنیزوں کو مصروفِ گفتگو پایا۔ دورانِ گفتگو ایک کنیز نے دوسری کنیز سے اپنے قرض کا مطالبہ کیا تو دوسری کنیز نے جواب دیا کہ کل یا پرسوں یہاں ایک قافلہ پڑاؤ کرے گا۔ اہل قافلہ کے پاس محنت مزدوری کر کے میں تیرا قرض بے باق کر دوں گی۔ ان دونوں مسلمانوں نے جو کچھ ان کنیزوں سے سنا تھا اس سے نبی کریم ﷺ کو مطلع کیا۔

ابوسفیان کا فرار

ابوسفیان کو یہ خدشہ تھا کہ مبادا مسلمان اس کے قافلے پر چھاپہ ماریں۔ اس اندیشے سے وہ حالات کی جانچ پڑتال کے لیے قافلے سے آگے بڑھ آیا اور بدر کے پاس پہنچ کر مجدی بن عمرو (جو اس وقت وہاں موجود تھا) سے دریافت کیا تم نے کسی کو یہاں آتے جاتے تو نہیں دیکھا؟ مجدی نے کہا: ''ابھی ابھی دو سوار آئے تھے اور کنوئیں کے پاس تھوڑی دیر ٹھہر کر چلے گئے۔'' ابوسفیان احتیاطاً اس جگہ پہنچا جہاں ان دو سواروں نے اپنے اونٹ ٹھہرائے تھے اور آثار و قرائن سے یہ بھانپ لیا کہ یہ اونٹ یثرب (مدینہ) ہی کے ہو سکتے ہیں۔ یہ دیکھ کر فوراً قافلے میں جا شامل ہوا اور اس کی راہ تبدیل کر کے ساحل بحر کی جانب رخ بدلا اور اس تدبیر سے اپنے قافلے کو صاف بچا لے گیا۔ دوسرے دن مسلمانوں کو قافلے کی آمد کا انتظار تھا لیکن خبر ملی کہ قافلہ تو گزر گیا ہے البتہ سوارانِ قریش قریب آ پہنچے ہیں۔ اس اطلاع سے ان لوگوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا جو یہ خیال کر رہے تھے کہ ابوسفیان کے قافلے کا مال ہمارے ہاتھ آئے گا۔ بعض نے آنحضرت ﷺ کو مدینہ واپس ہو جانے کی رائے دی تاکہ قریش سے جنگ کی نوبت نہ آئے اس حالت میں یہ آیت نازل ہوئی:

وَاِذۡ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحۡدَى الطَّآئِفَتَيۡنِ اَنَّهَا لَـكُمۡ وَتَوَدُّوۡنَ اَنَّ غَيۡرَ ذَاتِ الشَّوۡكَةِ تَكُوۡنُ لَـكُمۡ وَيُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّحِقَّ الۡحَـقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقۡطَعَ دَابِرَ الۡكٰفِرِيۡنَ ۙ (سورۃ الانفال: ۷)

''اور خدا تم سے دو گروہوں میں سے ایک کا (قافلہ ابوسفیان اور سوارانِ قریش) وعدہ کرتا ہے لیکن تم چاہتے ہو کہ وہ گروہ تمہارے ہاتھ لگے جس میں لڑائی کی طاقت نہیں اور خدا چاہتا ہے کہ اپنے کلمات سے حق کو ثابت کر دے اور کافروں کی جڑیں کاٹ دے۔''

اس طرف تو مسلمانوں کا یہ حال تھا اور دوسری طرف قریش بھی متردد تھے اور دل میں سوچتے تھے کہ ہمارا قافلہ تو سلامتی سے گزر گیا ہے پھر ہم کیوں لڑیں۔ مسلمان خود ہی مایوس ہو کر مدینہ واپس چلے جائیں گے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ ہم جس راہ سے آئے ہیں، اسی سے واپس چلے جائیں۔ ابوسفیان نے بھی قریش کو پیغام بھیجا کہ تم قافلے کی حفاظت کے لیے آئے تھے خدا نے اس خطرے سے نجات دلا دی اس لیے واپس چلے جاؤ۔ قریش کی اکثریت کا یہی خیال تھا لیکن ابوجہل نے کہا: ''خدا کی قسم! بدر تک پہنچے بغیر ہم واپس نہیں

Marfat.com

ئیں گے۔ وہاں تین دن ہمارا قیام رہے گا۔ اس قیام کے دوران میں ہم خوب رنگ رلیاں منائیں گے، چیں گے، گائیں بجائیں گے اور شراب پئیں گے۔ عرب کے لوگوں میں ہمارے جشن کا چرچا ہوگا اور سوں تک اس کے افسانے زبانوں پر رہیں گے۔“

بدر کا مقام عرب میں کئی اعتبارات سے مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ ابوجہل کا خیال تھا کہ اگر ہم یہاں سے یونہی واپس چلے گئے تو لوگوں میں یہ افواہیں گرم ہوں گی کہ ہم نبی کریم ﷺ اور ان کے ساتھیوں سے رفزدہ اور مرعوب ہوگئے ہیں اور اس طرح نبی کریم ﷺ کی دھاک بیٹھ جائے گی اور اس سے ان کی دینی وت کا دائرہ بھی زیادہ وسیع ہوجائے گا۔ جب سے عبداللہؓ بن جحش کے فوجی دستے نے کاروانِ قریش کو لوٹا، شخصوں کو اسیر کیا اور عمرو بن حضرمی کا کام تمام کیا اس وقت سے قریش کو زوالِ اقتدار کا خدشہ لاحق تھا۔ ریش اس حیص بیص میں تھے کہ ہم ابوجہل کی صلاح پر چلیں یا مکہ واپس جائیں کیونکہ قافلہ واقعی سلامتی سے لزر چکا تھا چنانچہ بنی زہرہ کی جماعت اپنے سردار اخنس بن شریق کی رائے سے مکہ واپس چلی گئی۔ دوسرے گوں نے ابوجہل کے مشورے پر عمل کو ترجیح دی اور انہوں نے جنگ کے ارادے سے عروۃ القصویٰ کی رف کوچ کیا اور ریت کے ایک ٹیلے کے قریب ڈیرے ڈال دیے۔

ر میں مسلمانوں کی آمد

جب مسلمانوں نے دیکھا کہ قافلہ بچ نکلا ہے تو دشمنوں کے مقابلے کے لیے آپس میں مشورے کرنے لگے چنانچہ اس خیال سے انہوں نے بدر کا رخ کیا اور پانی کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئے۔ حضرت حبابؓ بن منذر ر اور اس کے گردوپیش سے باخبر تھے۔ آپ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ آیا آپ ﷺ نے یہ مقام پنے اختیار سے پسند فرمایا ہے یا خدا نے وحی کے ذریعے سے آپ ﷺ کو یہاں ٹھہرنے کا حکم دیا ہے؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اگر کوئی مصلحت ہو تو تبدیلی مقام میں کوئی مضائقہ نہیں۔ حضرت حبابؓ بن منذر نے گزارش کی کہ لوگوں کو یہ حکم دیجیے کہ یہاں سے چل کر اس پانی کے نزدیک پہنچ جائیں جو دشمن سے نزدیک تر ہے۔ ہم اس جگہ پڑاؤ کرلیں گے اور اس کے عقب میں جتنے کنویں ہیں انہیں پانی سے پر کرلیں گے۔ اس تدبیر سے ہمارے پاس تو پانی وافر ہوگا لیکن دشمن کو میسر نہ آسکے گا اور اسے سخت دشواری پیش آئے گی۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت حبابؓ کی رائے کو قرین صواب سمجھ کر منظور کرلیا اور اعلان کیا کہ میں بھی تمہاری طرح بشر ہوں، ہمارے تمام کام صلاح مشورے کے بغیر طے نہیں پاسکتے، میں بھی کسی کا قصد نہیں کروں گا جب تک مشورہ نہ کرلوں۔

مسلمانوں نے پانی کے قریب پہنچ کر ایک حوض بنالیا اور جب یہ کام ہوچکا تو حضرت سعدؓ بن معاذ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں گزارش کی ہم آپ ﷺ کے لیے سائبان بنائے دیتے ہیں اور اس کے قریب ہی آپ ﷺ کے لیے سواریاں بھی ہمہ وقت تیار رہیں گی۔ ہم خود بڑھ کر دشمن سے مقابلہ کریں گے۔ اگر خدا

نے ہمیں فتح و نصرت عطا کی تو پھر کیا ہی بات ہے۔ اگر معاملے کی صورت دوسری ہوئی تو آپ ﷺ اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ واپس ہو جائیں۔ ہم میں سے جو لوگ مدینہ میں رہ گئے ہیں وہ بھی ہماری طرح آپ ﷺ سے محبت کرتے ہیں۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ جنگ کی نوبت آئے گی تو وہ ہرگز مدینہ میں نہ رہتے۔ اگر انہیں یہ معلوم ہوگا کہ آپ ﷺ جہاد کا عزم رکھتے ہیں تو وہ آپ ﷺ سے تعاون کرنے میں پہلو تہی نہ کریں گے بلکہ آپ ﷺ کے دوش بدوش دادِ شجاعت دیں گے۔ خدا آپ ﷺ کو ان کے ذریعے سے نصرت عطا کرے گا۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت سعدؓ بن معاذ کے حق میں تعریفی کلمات ارشاد فرمائے اور ان کے حق میں دعائے خیر بھی فرمائی غرض نبی کریم ﷺ کے لیے ایک سائبان بنایا گیا تاکہ آپ ﷺ وہاں ٹھہرے رہیں اور شکست کی صورت میں مدینہ واپس تشریف لے جائیں۔

اس مقام پر انسان مسلمانوں کی قوتِ ایمانی اور اس محبت سے جو انہیں نبی کریم ﷺ سے تھی، مبہوت ہو جاتا ہے۔ مسلمان یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ قریش ان سے تعداد میں تین گنا زیادہ ہیں لیکن اس کے باوجود ان سے جنگ کے لیے آمادہ ہو گئے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ قافلہ ابوسفیان بچ نکلا ہے اور اب ہم اس کے مال پر دسترس نہیں پا سکتے لیکن پھر بھی وہ سرفروشی اور جاں بازی کے لیے آمادہ تھے انہیں یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ جنگ میں انہیں فتح نصیب ہوگی یا شکست، تاہم وہ رسول اللہ ﷺ کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جنگ پر گرم جوشی سے تلے ہوئے تھے اور اس خیال سے انہوں نے آپ ﷺ کی باسلامت واپسی کا بندوبست بھی پہلے ہی کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ قوت ایمانی کا مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

قریش بھی میدانِ جنگ میں آموجود ہوئے اور انہوں نے کسی کو بھیج کر لشکر اسلام کی تعداد دریافت کی۔ مخبر نے اطلاع دی کہ مسلمان تین سو کے قریب ہیں اور ان کے پاس کوئی کمین گاہ بھی نہیں ہے تاہم وہ ایسے اور اس انداز کے مجاہد ہیں جو اپنی تلوار کے سوا کسی اور پناہ کے طالب نہیں ہیں اور ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اپنے مقابل کو ہلاک کیے بغیر جان دے۔ چونکہ تمام اکابر قریش اس لشکر میں شریک تھے اس لیے بعض دور اندیش لوگوں کو خوف تھا کہ ان میں سے اکثر مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جائیں گے اور اس سے مکہ کی قدر و منزلت میں فرق آئے گا لیکن ساتھ ہی یہ لوگ ابوجہل کی تندخوئی اور تنک مزاجی سے بھی ڈرتے تھے اور اس بات سے سہمے ہوئے تھے کہ وہ ہمیں بزدل اور کم حوصلہ کہے گا۔ اس کے باوجود عتبہ بن ربیعہ نے سرداران قریش سے کہا کہ اگر تم نے (حضرت) محمد (ﷺ) پر غلبہ پا لیا اور ان کے دوستوں اور ساتھیوں کو ہلاک کر دیا تو ہمارے ہاتھوں سے اپنے ہی رشتہ داروں اور عزیزوں کا خون ہوگا۔ آؤ واپس چلیں اور (حضرت) محمد (ﷺ) کو عرب قبائل کے حوالے کر دیں۔ اگر انہوں نے آپ ﷺ پر غلبہ پا لیا تو ہمارا مقصد حاصل ہو جائے گا ورنہ (حضرت) محمد (ﷺ) سے ہمیں کسی نقصان اور کسی شر کا اندیشہ نہیں۔ ابوجہل، عتبہ کی بات سن کر آگ بگولا ہو گیا اور کسی شخص کو عامر بن حضرمی کے پاس بھیج کر یہ پیغام دیا کہ تیرا دوست لوگوں

Marfat.com

واپسی کا مشورہ دیتا ہے۔ تو نے اپنے بھائی کے قاتل کو دیکھا ہے، اٹھ اور اس کا انتقام لے۔ عامر نے ابوجہل کی رائے کے مطابق اٹھ کر فریاد کی اور اپنے مقتول بھائی کے قتل کے انتقام کے سلسلے میں واعمراہ! واعمراہ! کی صدائیں بلند کیں۔ عامر کے اس اقدام سے جنگ ناگزیر ہوگئی اور اس سے مفر کی کوئی سبیل نہ رہی۔

جنگ کا آغاز

اسود مخزومی قریش کی صفوں سے نکل کر مسلمانوں کی طرف بڑھا اور اس نے اس حوض کو خراب کرنے کا ارادہ کیا جو مسلمانوں نے اپنے لیے بنایا تھا۔ حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب نے اس کے پاؤں پر وار کیا جس کی وجہ سے وہ گر گیا اور اس کے پاؤں سے خون جاری ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے دوسرے وار میں اس کا کام تمام کردیا۔ بہتے ہوئے خون اور مقتول کی تڑپتی ہوئی لاش کے منظر سے زیادہ کوئی چیز انسان کو جنگ کے لیے آمادہ نہیں کرتی۔ اسود مخزومی کے ہلاک ہوتے ہی عتبہ بن ربیعہ اپنے بھائی اور فرزند شیبہ اور ولید کو ہمراہ لے کر قریش کی صفوں سے نکلا اور اس نے اپنی مقابل فوج سے مبارزت طلب کی۔ مدینہ کے چند نوجوان ان کی طرف بڑھے لیکن عتبہ نے انہیں پہچان کر کہا: ''ہمیں تمہاری ضرورت نہیں۔ ہم اپنے آدمیوں سے نبرد آزما ہونا چاہتے ہیں۔'' عتبہ کے ساتھیوں میں سے کسی نے پکار کر کہا۔ ''(حضرت) محمد (ﷺ) ایسے لوگوں کو ہمارے مقابلے میں بھیجے جو ہمارے ہمسر اور ہم کفو ہوں۔'' حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ لشکر اسلام سے ان کے مقابلے کے لیے نکلے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شیبہ اور ولید کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد انہوں نے عتبہ کی جانب رخ کیا اس لیے کہ وہ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ پر غالب آچلا تھا۔ یہ دیکھ کر تمام قریش حملے کے لیے بڑھے، مسلمانوں نے بھی حرکت کی، غرض دونوں لشکر دست بدست جنگ میں مصروف ہوگئے۔ یہ واقعہ ۱۷ رمضان ۲ھ کو پیش آیا۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے لشکر کی صفیں درست کیں لیکن اس موقع پر آپ ﷺ کو اس خیال سے کہ لشکر اسلام مختصر ہے اور طاقت میں بھی لشکر قریش سے بڑھا ہوا نہیں یہ اندیشہ لاحق ہوا کہیں مسلمانوں کو شکست نہ ہوجائے۔

بیم و رجا کی اس ذہنی کشمکش میں کہ دیکھئے آج کیا صورت پیش آتی ہے اور اگر مسلمانوں کو فتح نصیب نہ ہوئی تو اسلام کا کیا حشر ہوتا ہے، نبی کریم ﷺ نے سائبان کا رخ کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آپ ﷺ کی معیت میں تھے۔ سائبان میں پہنچ کر نبی کریم ﷺ نے قبلے کی جانب متوجہ ہوکر خشوع و خضوع سے دعا کی:

اللهم هذا قريش قد اتت بخيلا ئها تحاول ان تكذب رسولك اللهم
فنصرك الذى وعدتنى اللهم ان تهلك هذه العصابة اليوم لا تعبد

''اے اللہ! قریش لاؤ لشکر سمیت ٹوٹ پڑے ہیں یہ تیرے رسول ﷺ کی تکذیب پر تلے ہوئے ہیں۔ اے اللہ! وعدۂ نصرت وفا کر۔ اگر یہ گنے چنے مسلمان ہلاک ہوگئے تو

Marfat.com

پھر تیری پرستش کوئی نہیں کرے گا۔"

آپ ﷺ یہ دعا بار بار دہرا رہے تھے اور وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ کی ردائے اقدس شانوں سے سرکی پڑتی اور گر گر جاتی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ردا پھر شانوں پر ڈال دیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ یہ عرض کرتے تھے:

يَا نَبِيَّ اللهِ لَقَدْ سَمِعَ بَعْضَ مُنَاشِدَتِكَ فَإِنَّ اللهَ مُنْجِزٌ لَكَ مَا وَعَدَكَ

"اے خدا کے رسول ﷺ! اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی التجا سن لی ہے وہ اپنا وعدہ پورا کر کے رہے گا۔"

اسی عالم خود فراموشی میں نبی کریم ﷺ پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور اس حالت میں آپ ﷺ نے نصرتِ الٰہی کے جلوے اور تائید ایزدی کے نظارے دیکھے۔ ایک دو لمحوں کے بعد آپ ﷺ پر سے بے خودی کی کیفیت دور ہوئی، سر اٹھایا اور ان الفاظ میں مسلمانوں کو بشارت دی۔

وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَا يُقَاتِلُهُمُ الْيَوْمَ رَجُلٌ فَيُقْتَلُ صَابِرًا مُحْتَسِبًا مُقْبِلًا غَيْرَ مُدْبِرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللهُ الْجَنَّةَ

"اور اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے۔ آج جو شخص بھی کفار کے ساتھ صبر و استقلال ایمان و احتساب کے ساتھ اس عالم میں شہید ہوگا کہ اس نے دشمنوں کا مقابلہ ڈٹ کر کیا ہو اور پیٹھ نہ پھیری ہو، اللہ تعالیٰ اسے جنت میں جگہ دے گا۔"

آپ ﷺ کی تقریر نے مسلمانوں کے دل و دماغ میں ایک نئی روح پھونک دی اور ان کا عزم مستقل اور فتح پر یقین محکم ہوگیا۔ مجاہدین اسلام دشمنوں کی کثرتِ تعداد سے قطع نظر اور ان کی طاقت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بڑی بے جگری سے شجاعت کے جوہر دکھانے لگے۔ ایمانی طاقت ہمارے تصور سے بھی زیادہ انسان کی روح اور اس کے دل و دماغ پر اثرانداز ہوتی ہے۔ علاوہ بریں حب وطن کا جذبہ بھی کچھ کم اثر نہیں رکھتا۔ جو سرفروش ناموسِ وطن کے تحفظ کی خاطر میدانِ جنگ کی خون آلود فضا میں اپنی پامردی کا ثبوت دیتا ہے اسے ہم صحیح معنوں میں محب وطن قرار دے سکتے ہیں۔ ایسے شخص کی روحانی طاقت حب وطن اور پیش آمدہ خطرات کی خراد پر چڑھ کر چند در چند ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام و ملل اپنی نئی پود کو شروع ہی سے حب وطن کا درس دیتی ہیں تاکہ بڑی عمر میں جب ناموس وطن کے تحفظ کے لیے جاں نثاری اور فدا کاری کی ضرورت پیش آئے تو وہ اس سے مطلق دریغ نہ کریں۔ حق و صداقت، عدل و انصاف اور عزم و استقلال کی لگن روحانی طاقت کی بنیادیں مستحکم کر دیتی ہے۔ جن لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ پہلی عالمگیر جنگ میں اتحادی کس زور شور سے اپنے دشمنوں کے خلاف پروپیگنڈا کرتے، اپنے آپ کو حق و صداقت، حریت طلبی اور صلح و آشتی کا علمبردار ظاہر کرتے اور اپنی فوجوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اخلاقی قوت اپنے

اندر کتنا وزن اور کتنی اہمیت رکھتی ہے جب اس قسم کے بے بنیاد پروپیگنڈے سے دل و دماغ کو متاثر کیا جاسکتا ہے تو ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت جوان پروپیگنڈوں سے کہیں بالاتر تھی دل و دماغ اور مزاج وطبیعت پر کتنے کچھ اثرات چھوڑتی ہوگی۔

صرف یہی نہیں کہ نبی کریم ﷺ سب کو حق و انصاف کی دعوت دیتے تھے بلکہ وہ یہ تعلیم بھی دیتے تھے کہ مخلوق کو اپنے خالق سے رشتہ اور کائنات سے ربط قائم کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ خدائے بزرگ و برتر پر ایمان اور کائنات سے وابستگی جس سے عبارت مخلوق ہے روح میں بڑی طاقت پیدا کر دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی جسمانی قوت کی بالیدگی اور اس کی نشوونما میں بھی اس سے کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ غزوۂ بدر سے پیشتر مسلمانوں کی اخلاقی طاقت باہمی اختلافات کے باعث ابھی اپنے کمال کو نہیں پہنچی تھی اور اسی سبب سے ان کی جسمانی طاقت میں بھی خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا تھا لیکن میدان جنگ میں نبی کریم ﷺ کی ترغیب سے ان کی روحانی طاقت بھی بڑھی اور اس بڑھی ہوئی روحانی طاقت نے قلت تعداد اور قلت ساز و سامان کی تلافی بھی کر دی چنانچہ رسول مقبول ﷺ اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ان آیات کا نزول ہوا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾ اَلْــٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۭ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٦٦﴾ (سورۃ الانفال: ٦٥، ٦٦)

"اے نبی ﷺ! مومنوں کو جنگ کی ترغیب دیجیے اگر آپ کی جماعت میں سے بیس اشخاص صابر ہوں تو دو سو پر غلبہ پا سکتے ہیں اور اگر سو ہوں تو ایک ہزار کفار پر غالب آسکتے ہیں کیونکہ وہ قوم عقل و فہم نہیں رکھتی۔ لیجیے اب اللہ نے مسلمانوں کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے اور ان کے ضعف کا اسے اندازہ ہو گیا ہے۔ اب اگر مسلمانوں میں سے سو آدمی صابر ہوں تو دو سو پر حاوی ہو جائیں گے اور اگر ایک ہزار صابر ہوں گے تو خدا کے حکم سے دو ہزار پر غلبہ پالیں گے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

قلت و کثرت کے سلسلہ میں انسان جو کچھ سوچتا ہے اس کی بنیاد مادی اسباب پر ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے خوف دامن گیر رہتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں خوف کا ازالہ کر دیا ہے۔

میدان بدر میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے امیہ بن خلف اور اس کے بیٹے کو دیکھا۔ چند مسلمان اس کے گرد جمع تھے۔ امیہ بن خلف وہی شخص تھا جو مکہ میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو انسانیت سوز اذیت دیا کرتا تھا۔ گرمی کے

Marfat.com

موسم میں انہیں تپتی ہوئی ریت پر لٹاتا اور ان کے سینے پر گرم پتھر رکھ دیتا تا کہ وہ اسلام سے منحرف ہو جائیں لیکن حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس حال میں احد، احد پکارتے تھے۔ امیہ بن خلف کو دیکھ کر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے پکار کر کہا: ''یہ کافروں کا سردار ہے، بچ کر نہ جانے پائے۔'' بعض مسلمان جو اس کے قریب تھے، یہ چاہتے تھے کہ اسے ہلاک کرنے کے بجائے اسیر کرلیں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے ان کے ارادے کا بدلا ہوا رخ دیکھ کر پھر بلند آواز سے کہا: ''یہ کافروں کا سرخیل ہے، اسے زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔'' یہ کہہ کر خود امیہ کی طرف بڑھے اور اس پر پے در پے وار کیے یہاں تک کہ اسے ہلاک کر دیا۔

حضرت معاذ بن عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کو موت کے گھاٹ اتارا۔ حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور دوسرے مسلمان اس بے جگری سے لڑ رہے تھے کہ انہیں اپنی تعداد کی کمی کا خیال تک بھی نہیں آتا تھا۔ اسی اثنا میں سخت آندھی آئی اور اس سے فضا تاریک ہوگئی۔ سردارانِ قریش ایک ایک کر کے اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ رہے تھے۔ ان کی ہلاکت سے مسلمانوں کے حوصلے بلند ہوتے جاتے تھے اور ان کی زبانوں پر احد، احد کے نعرے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی نگاہوں کے سامنے زمان و مکان کے حجابات چاک ہو گئے ہیں اور خدا نے ان کی تائید و نصرت کے لیے فرشتوں کی فوج بھیج دی ہے اور وہ اس لیے کہ مسلمانوں کو بشارت دے اور ایمان کو قوی کر دے۔ نظر آ رہا تھا کہ مسلمان اپنی طاقت سے نہیں بلکہ خدائی طاقت کے بل پر مصروفِ جنگ ہیں۔

رسول کریم ﷺ لشکر کے مرکز میں تھے اور دیکھ رہے تھے کہ ملک الموت کفار کی روحیں قبض کرنے میں مصروف ہے۔ اس حالت میں آپ ﷺ نے مٹھی بھر کنکریاں اٹھا کر قریش پر ایک نظر ڈالی اور فرمایا:

شَاهَتِ الْوُجُوه۔ (تمہاری صورتیں مسخ ہو جائیں۔)

یہ فرمایا اور آپ ﷺ نے وہ کنکریاں قریش کی طرف پھینک دیں اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ پوری قوت سے کفار پر ٹوٹ پڑو۔ مسلمانوں نے قلت تعداد کے باوجود حملہ کر دیا اگر خدا کی تائید اور اس کی توفیق شاملِ حال نہ ہوتی تو مسلمان قریش پر کبھی غالب نہ آتے۔ نہ انہیں ہلاک کر سکتے نہ پکڑ سکتے۔ اس باب میں یہ آیت نازل ہوئی:

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝۱۲ (سورۃ الانفال:۱۲)

''جب آپ ﷺ کے رب نے فرشتوں کو وحی بھیجی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں ان لوگوں کو جو ایمان لائے ثابت قدم کر دو اور قریب ہے کہ میں کافروں کے دلوں پر رعب طاری کر دوں گا پس ان کی گردنوں اور ان کی انگلیوں پر وار کرو۔''

اور یہ آیت بھی نازل ہوئی:

Marfat.com

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ

(سورۃ الانفال: ۱۷)

"پس تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے انہیں قتل کیا اس موقع پر جب آپ ﷺ نے کنکریاں پھینکیں تو آپ ﷺ نے نہیں پھینکیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکیں۔"

نبی کریم ﷺ نے کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ مسلمانوں کو فتح و نصرت نصیب ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ وفا کیا تو آپ ﷺ پھر سائبان میں تشریف لے گئے۔ قریش نے راہِ فرار اختیار کی۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور جو لوگ بھاگ نہ سکے تھے انہیں اسیر کر لیا۔

غزوۂ بدر میں غلبہ کے بعد مسلمانوں کی دھاک پورے عرب میں بیٹھ گئی۔ اہم مقامات پر اسلام کا ہلالی پرچم لہرانے لگا اور وہ مملکت وجود میں آئی جسے تمدنِ اسلام کا مرکز کہنا چاہیے اور یہ تمدن وہ ہے جس کے اثرات آج بھی دنیا کے گوشے گوشے میں پائے جاتے ہیں۔

اگرچہ غزوۂ بدر میں رسول کریم ﷺ مجاہدین اسلام کو ترغیب جنگ دے رہے تھے اور آپ ﷺ کو یہ یقین کامل تھا کہ اس معرکے میں دشمنانِ خدا نیست و نابود ہو جائیں گے تاہم آپ ﷺ نے شروع ہی میں اپنے پیروؤں سے کہہ دیا تھا کہ بعض اکابر قریش اور بنی ہاشم کو ہلاک نہ کریں حالانکہ بنی ہاشم اور قریش کے یہ سردار مسلمانوں سے لڑنے کے لیے آئے تھے اور جس مسلمان کو چاہتے ہلاک کر سکتے تھے۔ آپ ﷺ کی یہ ہدایت اقربا نوازی کی بنا پر نہ تھی بلکہ حقیقت یہ تھی کہ آپ ﷺ کو وہ احسانات یاد تھے جو بنی ہاشم نے آپ ﷺ کی بعثت سے ہجرت تک آپ ﷺ کے (اور آپ ﷺ کے پیروؤں کے) ساتھ کیے تھے۔ انہوں نے آپ ﷺ کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھا تھا اور ہر موقع پر حمایت کی تھی، یہاں تک کہ عباسؓ معاہدہ عقبہ کی شب بھی آپ ﷺ کے ہمراہ تھے اور آپ ﷺ کو یہ بھی یاد تھا کہ بعض اکابر قریش نے بہ حالت کفر بھی اس معاہدہ کی تنسیخ کی کوشش کی تھی جس کی رو سے قریش نے مسلمانوں سے ترکِ موالات کر دی تھی۔ آپ ﷺ یہ چاہتے تھے کہ بنی ہاشم اور قریش کو ان کے احسانات کا اجر دیں۔ یہی وجہ تھی کہ غزوۂ بدر میں مسلمان ان لوگوں کے قتل سے باز رہے لیکن قریش میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو مسلمانوں کی اس رواداری سے فائدہ اٹھانا پسند نہیں کرتے تھے مثلاً ابو البختری جس نے زندگی پر موت کو ترجیح دی حالانکہ وہ ترکِ موالات کے معاہدہ کی تنسیخ میں سرگرمی سے حصہ لے چکا تھا۔

اہل مکہ نے شکست خوردگی کے عالم میں مکہ کی جانب راہِ فرار اختیار کی۔ مسلمان شام تک بدر کے میدان جنگ میں رہے انہوں نے مقتولین قریش کی لاشیں جمع کر کے ایک گڑھے میں دبا دیں نبی کریم ﷺ نے پوری رات اپنے جاں نثار صحابہؓ کی معیت میں گزاری۔ مالِ غنیمت کی فراہمی اور اسیروں کی نگرانی میں بہت سا وقت گزرا۔ اس دوران میں آپ ﷺ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ مٹھی بھر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے کس

Marfat.com

طرح کثیر التعداد دشمنوں پر غلبہ عطا کیا اور قریش نے کس طرح ایمانی طاقت کے فقدان کے باعث رسوا کن شکست کا منہ دیکھا۔

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے آنحضرت ﷺ کو رات کے وقت یہ فرماتے ہوئے سنا:

يَا أَهْلَ الْقَلِيبِ! يَا عُتْبَةَ بْنِ رَبِيعَةَ! وَيَا شَيْبَةَ بْنِ رَبِيعَةَ! وَ يَا أُمَيَّةَ بْنِ خَلَفَ! وَ يَا أَبَاجَهْلِ بْنِ هِشَّامٍ! وَاسْتَمَرَّ يَذْكُرُ مَنْ فِي الْقَلِيبِ هَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَكُمْ رَبُّكُمْ حَقًّا! فَإِنِّي وَجَدْتُ مَا وَعَدَنِي رَبِّي حَقًّا

''اے کنوؤں میں دبے ہوئے قریشیو! اے عتبہ بن ربیعہ، اے شیبہ بن ربیعہ، اے امیہ بن خلف، اے ابوجہل بن ہشام (اس طرح آپ ﷺ نے ان تمام مقتولین قریش کے نام فرداً فرداً لیے جنہیں کنوؤں میں دبا دیا گیا تھا) اے کنوؤں میں دبے ہوئے قریشیو! خدا نے تم سے جو وعدہ کیا تھا آیا تم نے اسے سچا پایا؟ مجھ سے میرے رب نے جو وعدہ کیا تھا وہ تو پورا ہوگیا۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ ﷺ مردوں سے باتیں کررہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مردے بھی تمہاری طرح باتیں سنتے ہیں لیکن انہیں جواب دینے پر قدرت نہیں۔''

آنحضرت ﷺ نے عتبہ بن ربیعہ کے فرزند ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے چہرے پر ملال کے آثار دیکھے تو فرمایا: ''ابوحذیفہ! کیا تم اپنے باپ کے انجام سے کبیدہ خاطر ہو؟'' ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''خدا کی قسم! مجھے اپنے باپ کے مقتول ہونے کا ملال نہیں البتہ یہ غم ضرور ہے کہ جو کچھ ہوا میری توقع کے خلاف ہوا۔ میں اپنے باپ کو دانشمند سمجھتا تھا اور مجھے امید تھی کہ خدا اسے ہدایت نصیب کرے گا لیکن یہ دیکھ کر کہ اس کا خاتمہ کفر پر ہوا مجھے واقعی قلق ہوا۔'' رسول کریم ﷺ نے ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے جذبات کی قدر کی اور ان کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔

غنیمت کی مساوی تقسیم

اگلے دن صبح کو جب مسلمانوں نے مدینہ کو واپسی کا ارادہ کیا تو ان کے درمیان مالِ غنیمت کی ملکیت سے متعلق اختلافِ رائے ہوگیا۔ جن لوگوں نے یہ مال جمع کیا تھا وہ کہتے تھے کہ مال ہمارا ہے۔ جن لوگوں نے دور تک قریش کا تعاقب کیا تھا ان کا خیال یہ تھا کہ ہم اس مال کے حق دار ہیں، اگر ہم نہ ہوتے تو یہ مال کسی کے ہاتھ نہ آتا۔ جو اصحاب رضی اللہ عنہم جنگ کے دوران میں نبی کریم ﷺ کے نزدیک آپ ﷺ کی حفاظت پر متعین رہے ان کا دعویٰ تھا کہ ہم سے زیادہ مالِ غنیمت کا استحقاق اور کسی کو نہیں، ہم بھی دشمن پر حملہ کرسکتے تھے اور مالِ غنیمت بھی جمع کرسکتے تھے لیکن ہمیں اندیشہ تھا کہ دشمن کہیں نبی کریم ﷺ پر حملہ نہ کردیں اس لیے ہم ان کے پاس سے نہیں ہٹے۔ نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ جس نے جو مال جمع کیا ہے واپس کردے، ہم یہ سب مال لے کر مدینہ واپس چلتے ہیں۔ امید ہے کہ تقسیمِ غنیمت کے سلسلے میں کوئی تصفیہ ہوجائے گا یا خود

Marfat.com

خدا کوئی فیصلہ کردے گا۔

آنحضرت ﷺ نے عبداللہؓ بن رواحہ اور زیدؓ بن حارثہ کو مدینہ روانہ کیا کہ وہاں جاکر مسلمانوں کو فتح و ظفر کی خوشخبری سناؤ اور خود بھی صحابہؓ کی معیت میں مالِ غنیمت اور اسیران بدر کو لیے ہوئے عازمِ مدینہ ہوئے۔ آپ ﷺ نے مالِ غنیمت پر عبداللہؓ بن کعب کو نگران مقرر کیا۔ اثنائے راہ میں صفرا سے گزرنے کے بعد آپ ﷺ نے ایک جگہ پڑاؤ کیا اور مالِ غنیمت مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ پہلے آپ ﷺ نے مالِ غنیمت میں سے خمس (پانچواں حصہ) نکال لیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۱﴾

(سورۃ الانفال: ۴۱)

"اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو غنیمت تم نے حاصل کی ہے اس کا پانچواں حصہ خدا، پیغمبر، قرابت داروں، یتیموں، محتاجوں اور مسافروں کا حق ہے، اگر خدا پر اور اس چیز پر جو بدر کے دن جب دو گروہ مقابل تھے ہم نے اپنے بندے پر بھیجی، ایمان رکھتے ہو (تو اس تقسیم پر تمہیں خوشی سے متفق ہونا چاہیے) اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

متقدمین میں سے اکثر سیرت نگاروں کی یہ رائے ہے کہ یہ آیت غزوہ بدر اور تقسیم غنیمت کے بعد نازل ہوئی۔ نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کے درمیان مالِ غنیمت کی مساوی تقسیم کی۔ گھوڑے کا بھی اتنا ہی حصہ قرار دیا جتنا سوار کا۔ شہدا کے حصے کا مالِ غنیمت ان کے ورثا کے حوالے کیا گیا۔ ان لوگوں کا بھی حصہ مقرر کیا گیا جو مدینہ میں مسلمانوں کے لیے اہم انتظامات پر مامور تھے یا کسی معقول عذر کی بنا پر غزوہ میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ صرف وہی لوگ غنیمت کے مستحق نہیں قرار دیے گئے جو جنگ میں شریک تھے بلکہ ان تمام لوگوں کو بھی غنیمت میں سے حصہ ملا، جنہوں نے اس غزوہ میں مسلمانوں کی مدد کی تھی اگرچہ یہ لوگ خود جنگ میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔

نضر و عقبہ کا قتل

لشکر اسلام فتح کے بعد مدینہ جا رہا تھا کہ راستے میں دو اسیرانِ جنگ کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ ان میں ایک نضر بن حارث تھا اور دوسرا عقبہ ابن ابی معیط، اس وقت تک نبی کریم ﷺ نے اسیران جنگ کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا اور یہ بات طے نہیں پائی تھی کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے یا غلام بنا لیا جائے۔ نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط مکہ میں مسلمانوں کو سخت اذیتیں دیا کرتے تھے اور

Marfat.com

انہوں نے مسلم آزاری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ لشکر اسلام جب اثیل کے مقام پر پہنچا اور اسیرانِ جنگ آپ ﷺ کے سامنے سے گزرے تو آپ ﷺ نے نضر بن حارث کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھا، نضر لرز اٹھا اور اپنے قریب کے ایک شخص سے کہنے لگا خدا کی قسم (حضرت) محمد (ﷺ) مجھے ضرور ہلاک کر دیں گے، انہوں نے مجھے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا ہے۔ اس سے صاف یہ پتہ چلتا ہے کہ میری ہلاکت یقینی ہے۔ اس شخص نے جواب دیا: تمہارا یہ خیال خوف کا نتیجہ ہے۔ بعدازاں نضر بن حارث نے حضرت مصعبؓ بن عمیر سے (جو دوسروں کی نسبت اس کے نزدیکی عزیز تھے) کہا: آپ اپنے رفیق سے کہیں کہ مجھے بھی اپنے اصحاب میں شامل فرمالیں۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو وہ مجھے ضرور ہلاک کر دیں گے۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر نے فرمایا، تو کتاب اللہ اور رسول خدا کے بارے میں ناروا باتیں کیا کرتا تھا اور تو نے ہمیشہ ان کے دوستوں کو اذیتیں دی ہیں۔ اس پر نضر نے (حقیقت پر پردہ ڈالتے ہوئے) کہا، مصعبؓ! اگر قریش آپ کو قید کر لیتے تو میرے جیتے جی کسی کی مجال نہ تھی کہ آپ کی طرف قتل کے ارادے سے کوئی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لیتا۔ حضرت مصعبؓ نے جواب دیا: تو غلط کہتا ہے۔ میری حیثیت وہ نہیں ہے جو تیری ہے۔ اسلام نے وہ عہد و پیمان جو اس سے پہلے کیے گئے تھے، کالعدم قرار دے دیئے ہیں۔ نضر بن حارث کو حضرت مقدادؓ نے اسیر کیا تھا اور انہیں امید تھی کہ نضر کے رشتہ دار گراں قدر فدیہ دے کر اسے رہا کرالیں گے لیکن یہ دیکھ کر کہ نضر کو قتل کرنے کے منصوبے ہو رہے ہیں پکار کر کہا: ''نضر کو میں نے اسیر کیا ہے۔'' نبی کریم ﷺ نے نضر کی گردن مارنے کا حکم صادر کیا اور اس کے ساتھ ہی حضرت مقدادؓ کے حق میں یہ دعا کی:

اَللّٰھُمَّ اَغْنِ الْمِقْدَادَ مِنْ فَضْلِكَ

''اے اللہ! مقدادؓ کو اپنے فضل و کرم سے غنی کر دے۔''

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نبی کریم ﷺ کے حکم کی تعمیل میں تلوار کے ایک ہی وار سے نضر بن حارث کا سر تن سے جدا کر دیا۔

لشکر اسلام عرق الظبیہ کے مقام پر پہنچا تو نبی کریم ﷺ نے عقبہ بن ابی معیط کے قتل کا حکم بھی صادر کیا۔ عقبہ نے فریاد کی:

فَمَنْ لِلصِّبْیَةِ یَا مُحَمَّدُ؟ اے محمد (ﷺ) میری ننھی سی بچی کی سرپرستی کون کرے گا؟

آپ ﷺ نے فرمایا:

اَلنَّار جہنم کی آگ۔

بہ اختلاف روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ نے عقبہ بن ابی معیط کو تہ تیغ کیا۔

مدینہ میں فتح کی خوشخبری

فتح مند لشکر اسلام کی آمدِ مدینہ سے ایک روز پیشتر حضرت زیدؓ اور حضرت عبداللہؓ بن رواحہ فتح کی

خوشخبری لے کر مدینہ پہنچ چکے تھے۔ دونوں جدا جدا راہوں سے بستی میں داخل ہوئے تھے۔ ایک طرف حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ انصار کو لشکر اسلام کی فتح مندی کی خبر سنا رہے تھے اور دوسری طرف حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ (جو اس وقت نبی کریم ﷺ کے اونٹ پر سوار تھے) مسلمانوں کی فتح ونصرت کی سرگزشت بیان کر رہے تھے۔ مسلمان لشکر اسلام کی فتح مندی کا حال سن کر بہت خوش ہوئے لیکن یہودیوں، بت پرستوں اور منافقوں کو اس خبر سے تردد ہوا اور انہوں نے مسلمانوں کی خوشی کو غم میں تبدیل کرنے کے لیے یہ ہوائی اڑائی کہ (حضرت) محمد (ﷺ) ہلاک ہو گئے ہیں (نعوذ باللہ) اور ان کے ساتھیوں کو شکست فاش ہوئی (ان مفسدہ پردازوں نے اپنی بات کو زیادہ وزنی کرنے کے لیے یہ بھی کہا کہ) حضرت زیدؓ بن حارثہ جس اونٹ پر سوار ہیں نبی کریم ﷺ کا ہے اگر وہ فاتح ہوتے تو اپنا یہ اونٹ دوسرے کو نہ دیتے۔ (حضرت) زیدؓ کی زبان سے جو باتیں سننے میں آ رہی ہیں ان میں صداقت نہیں بلکہ یہ باتیں ہذیان کا نتیجہ ہیں۔ وہ شکست کے باعث ہوش وحواس کھو بیٹھے ہیں لیکن تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ فتح کی تصدیق ہو گئی اور اس سے مسلمانوں کی طبیعت باغ باغ اور دل نہال ہو گئے لیکن اس خوشی میں ایک غم بھی شامل تھا اور وہ یہ کہ جب نبی کریم ﷺ بدر کی جانب روانہ ہو رہے تھے تو آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سخت علیل تھیں اور آپ ﷺ ان کے شوہر حضرت عثمانؓ بن عفان کو ان کے علاج اور تیمارداری کے لیے مدینہ میں چھوڑ گئے تھے۔ حضرت رقیہؓ کے حق میں یہ بیماری مرض الموت ثابت ہوئی اور آنحضرت ﷺ کے ورودِ مدینہ سے پیشتر ہی انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ مدینہ کے مشرکین ومنافقین کو مسلمانوں کی فتح کا بڑا صدمہ تھا اور وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے مقابلے میں عاجز اور کمزور سمجھ رہے تھے۔ یہودیوں کے ایک سردار نے اس معرکے کا حال سنا تو اس نے کہا: ''عرب کے فرمانرواؤں اور حرم کے پاسبانوں کے مارے جانے کے بعد زندگی سے موت بہتر ہے۔''

اسیرانِ بدر کا معاملہ

لشکر اسلام، اسیرانِ جنگ کی آمد سے ایک روز بعد پہنچا۔ ام المومنین حضرت سودہؓ نے ابو زید سہل بن عمرو کو جب اس حال میں دیکھا کہ اس کے ہاتھ گردن سے بندھے ہوئے ہیں تو کہا: ''تم نے کیوں اپنے آپ کو ایسی آسانی سے حوالے کر دیا، شریفوں کی طرح میدان جنگ میں جان کیوں نہیں دی؟'' نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: ''سودہؓ! تم لوگوں کو خدا اور پیغمبر ﷺ کے خلاف ابھار رہی ہو۔'' حضرت سودہؓ نے جواب دیا کہ اس قیدی کو دیکھ کر بے اختیار میری زبان پر یہ بات آ گئی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے اسیرانِ جنگ کو اصحاب میں تقسیم کر دیا اور یہ حکم دیا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ بعدازاں آپ ﷺ کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ ان قیدیوں کو تہ تیغ کر دیا جائے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ یہ خیال بھی دامن گیر تھا کہ اگر انہیں فدیہ لے کر رہا کر دیا جاتا ہے تو ان میں سے بعض کینہ جوئی اور انتقام پر کمربستہ ہو کر دوبارہ مسلمانوں کے مقابلے میں آئیں گے اور اگر انہیں ہلاک کر دیا جاتا ہے تو ان کے ورثا کے دلوں میں عداوت کے نقش اور

Marfat.com

گہرے ہو جائیں گے اور وہ اس واقعے کو دل سے نہیں بھلائیں گے۔

نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ سے اسیرانِ بدر سے متعلق مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ بعض اسیران جنگ نے جو خاطر خواہ فدیہ پیش کر سکتے تھے، کسی شخص کو حضرت ابوبکرؓ صدیق کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان رشتے اور قرابتیں ہیں۔ اپنے رفیق نبی کریم ﷺ سے سفارش کیجیے کہ ازراہِ کرم و احسان ہمیں رہا کر دیں یا ہم سے فدیہ قبول کر لیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے سفارش کا وعدہ تو کر لیا لیکن آپ سمجھتے تھے کہ حضرت عمرؓ اس کی تائید نہیں کریں گے۔ آپ نے کسی کو اسیرانِ جنگ کا یہ پیغام دے کر ان کے پاس بھیجا۔ حضرت عمرؓ نے یہ بات سنی تو برافروختہ ہو گئے۔ آخر حضرت ابوبکرؓ صدیق نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ عرض کیا کہ اسیرانِ جنگ سب کے سب ہمارے رشتہ دار ہیں۔ انہیں فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے، شاید خدا انہیں آتش دوزخ سے نجات دے اور ان کے دل اسلام کی جانب مائل ہو جائیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس سفارشی مشورے پر خاموشی اختیار کی۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق اٹھ کر چلے آئے۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اسیرانِ جنگ دشمنانِ خدا و رسول ہیں۔ انہوں نے آپ ﷺ کی تکذیب کی ہے۔ آپ ﷺ کے ساتھ جنگ کی ہے اور آپ ﷺ کو مکہ سے دیس نکالا دیا ہے۔ یہ لوگ کفر و شرک کے پتلے ہیں۔ انہیں قتل کرا دیجیے تاکہ اسلام کی سربلندی ہو اور کفر کی ذلت و خواری۔ اسی اثنا میں حضرت ابوبکرؓ پھر حاضر ہوئے اور انہوں نے پھر عرض کیا کہ اسیرانِ جنگ کی رہائی کا حکم صادر فرما دیجیے، شاید خدا انہیں ہدایت نصیب کرے لیکن حضرت عمرؓ نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ اسیرانِ بدر حسن سلوک کے مستحق ہرگز نہیں ہیں۔ نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر الفاروقؓ کی باتیں سننے کے بعد اپنے حجرہ اقدس میں تشریف لے گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آئے۔ صحابہؓ ابھی تک اسیرانِ جنگ کے بارے میں گفتگو اور ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ کچھ حضرت ابوبکرؓ کے ہم خیال تھے اور کچھ حضرت عمرؓ کے ہم نوا۔

رسول کریم ﷺ نے صحابہؓ سے مشورے کے بعد فرمایا کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ اپنے اپنے زاویہ نظر کے اعتبار سے میکائیل علیہ السلام و جبرئیل علیہ السلام سے فرشتوں میں نیز ابراہیم علیہ السلام و مسیح علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام سے انبیاء میں مشابہ و مماثل ہیں۔ میکائیل علیہ السلام اللہ کی طرف سے اس خدمت پر مامور ہیں کہ بندوں کے لیے رحمت و رافت اور عفو و درگزر کا پیغام لائیں، یہی خصلت ابوبکرؓ صدیق کی سیرت میں نمایاں ہے۔ انبیاء میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ابوبکرؓ صدیق کی مماثلت کا سبب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں یہ منقول ہے کہ وہ اپنی قوم کے حق میں شہد سے زیادہ نرم و شیریں تھے مگر مشرکین نے ان کے ساتھ یہ بدسلوکی کی کہ انہیں نذرِ آتش کر دینے سے بھی نہ چوکے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو اگر کبھی تنبیہہ بھی فرمائی تو ان نرم و نازک الفاظ میں:

Marfat.com

أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ (سورۃ الانبیاء:۶۷)

"تمہاری حالت کتنی افسوسناک ہے اور ان کی بھی جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو کیا تم عقل سے بالکل کورے ہو گئے ہو؟"

کمال کی بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان لوگوں کے حق میں دعا بھی فرمائی تھی:

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۶﴾ (سورۃ ابراہیم:۳۶)

"پس جس نے میری پیروی کی وہ مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی پس تو بخشنے والا مہربان ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ابوبکرؓ صدیق کی مشابہت و مماثلت کی مثال یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام (ان مظالم کے باوجود جو قوم نے ان پر ڈھائے) قوم کے لیے ان الفاظ میں الحاح فرماتے رہے ہیں:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۱۸﴾ (سورۃ المائدہ:۱۱۸)

"(خدایا) تو اگر انہیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو بے شک تو غالب حکمت والا ہے۔"

حضرت عمرؓ ملائکہ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے مشابہ ہیں جو دشمنانِ خدا پر عذاب و عتاب کے نزول کی خدمات بجالاتے رہے ہیں۔ انبیاء میں ان کی مماثلت حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی روش سے بیزار ہو کر یہ دعا کی تھی:

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا ﴿۲۶﴾ (سورۃ نوح:۲۶)

"اے پروردگار! روئے زمین پر کفار میں سے کسی کو رہتا بستا باقی نہ چھوڑ۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے تنگ آ کر یہ دعا مانگی تھی:

رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ﴿۸۸﴾ (سورۃ یونس:۸۸)

"اے رب! ان کا مال و متاع ضائع کر دے اور ان کے دلوں پر مہریں لگا دے تاکہ وہ اس وقت تک تجھ پر ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔"

اس مثالی و تمثیلی ارشاد کے بعد آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بات دراصل یہ ہے کہ تم میں کوئی بھی ایسا نہیں جسے کچھ احتیاج نہ ہو۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ ان اسیرانِ بدر کو فدیہ لے کر رہا کر دو اور جو ان میں سے فدیہ نہ دے اسے قتل کر ڈالو۔"

Marfat.com

اسیرانِ بدر میں ابوعزہ (عمرو بن عبداللہ بن عمیر جمحی) نام ایک شاعر بھی تھا۔ اس نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو مختلف الرائے پایا تو موقع غنیمت جان کر عرض کیا: اے (حضرت) محمد (ﷺ) میری پانچ بیٹیاں ہیں جن کے پاس کوئی بھی اثاثہ نہیں، مجھے ان کے طفیل فدیہ سے مستثنیٰ قرار دے دیجیے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی آپ ﷺ سے لڑنے کے لیے نہیں آؤں گا نہ کسی کو جنگ کے لیے آمادہ کروں گا۔ نبی کریم ﷺ نے اسے فدیہ لیے بغیر رہا کر دیا۔ صرف یہی ایک ایسا قیدی تھا جس نے اس طرح رہائی پائی لیکن اس نے عہد شکنی کی اور پھر غزوۂ احد میں مسلمانوں سے لڑنے کے لیے لشکرِ کفار میں شامل ہوا۔ اس دفعہ پھر اسے قید کر لیا گیا اور کچھ کہے سنے بغیر تہ تیغ کر دیا گیا۔

مسلمانوں میں اس مسئلے پر دیر تک مشورے ہوتے رہے آخر فیصلہ ہوا کہ فدیہ لے کر اسیرانِ جنگ کی رہائی کے احکام صادر کر دیے جائیں۔ اس باب میں یہ آیت نازل ہوئی:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۷﴾ (سورۃ الانفال: ۶۷)

"نبی کے لیے یہ زیبا نہیں کہ اس کے تصرف میں قیدی ہوں جب تک کہ ملک میں غلبہ حاصل نہ کر لے۔ (مسلمانو!) تم دنیا کی متاع چاہتے ہو اور اللہ چاہتا ہے کہ (تمھیں) آخرت کا اجر دے اور اللہ غالب ہے حکمت والا۔"

مستشرقین کا اعتراض

مستشرقین کا ایک گروہ اسیرانِ بدر اور نضر و عقبہ کے قتل سے متعلق کہتا ہے کہ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے خون آشامی کی اجازت دی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو مسلمان دونوں قیدیوں (نضر و عقبہ) کو قتل نہ کرتے اور جنگ میں فتح اور مالِ غنیمت پر اکتفا کرتے ہوئے اسیروں کو رہا کر دیتے۔ مستشرقین کے اس قول کا منشا یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات بیٹھ جائے کہ اسلام نے اپنے پیروؤں کو عفو و درگزر کی تعلیم نہیں دی ہے اور اس مسئلے کو موضوعِ بحث قرار دے کر وہ غزوۂ بدر کے وقوع سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال بعد اسلام اور اس کے ہادی کو طعن و تعریض کا ہدف بنانا چاہتے ہیں۔ اگر بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو ہمیں اس اعتراض میں کوئی وزن نظر نہیں آتا۔ اگر عقبہ اور نضر کے قتل کا موازنہ ان خونی واقعات سے کیا جائے جن سے عیسائیوں کی تاریخ کے صفحات رنگے ہوئے ہیں تو اس قتل کی سرے سے کوئی اہمیت ہی باقی نہیں رہتی۔ عیسائیوں نے جو خونریزیاں کی ہیں ان کے مقابلے میں قتل کا یہ واقعہ اتنا معمولی ہے کہ اس کی طرف کسی کی نظر بھی نہیں اٹھنی چاہیے۔ ہنگامہ زارِ حیات میں اس کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ فرانس اور دوسرے مغربی ممالک کے انقلابی ہنگاموں میں قتل و غارت کا جو بازار گرم ہوا ہے اس پر نظر ڈالتے ہوئے عقبہ و نضر کے قتل کی حیثیت گرد ہو کر رہ جاتی ہے۔

Marfat.com

نبی کریم ﷺ نے جس تحریک کی ابتدا مکہ میں کی اس کی غرض وغایت یہی تھی کہ بنی نوع انسان کو شرک وبت پرستی کی دلدل سے نکالیں۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ نے کدو کاوش کی۔ اس کی پاداش میں آپ ﷺ کو تیرہ سال مسلسل اہل مکہ کے مظالم کا تختہ مشق بننا پڑا۔ وطن سے بے وطن ہوکر آپ ﷺ ہجرت مدینہ پر مجبور ہوئے۔ یہاں آپ ﷺ کو کچھ فراغت نصیب ہوئی تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کی شیرازہ بندی کچھ اس انداز سے کی کہ کفر وشرک کے خلاف تھوڑی مدت میں ایک اچھا خاصا محاذ تیار ہوگیا۔ قریش مکہ کو مسلمانانِ مدینہ کی طاقت کا علم ہو یا نہ ہو البتہ انہیں یہ علم ضرور تھا کہ مدینہ کے یہودیوں سے بھی ان کے عہد وپیمان ہوچکے ہیں۔

غزوۂ بدر سے قبل مسلمانوں کے سرایا (فوجی دستے) مدینہ کے اطراف وجوانب میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مظاہرہ کر چکے تھے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے اثر واقتدار کی بنیادیں صرف غزوۂ بدر کے بعد ہی مستحکم ہوئی ہیں البتہ ہم اسے اسلام کی ترقی کی اساس قرار نہیں دے سکتے۔ یہ معرکہ ترقی کے دیگر اسباب میں سے صرف ایک سبب اور ایک وسیلہ تھا۔ نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے جس تحریک کو فروغ دینے کے لیے جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھا، اس کی بنیاد، اسلام کے ان اصول ومقاصد کی تعلیم وتعمیل پر تھی جنہیں آپ ﷺ نے حکم الٰہی کی پیروی میں مخلوق کے سامنے پیش کیا۔ بات یہ ہے کہ تحریک اور اس کے مبادی کی حیثیتیں جدا جدا ہیں۔ وہ وسائل جو کسی مقصد کے حصول کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں ضروری نہیں کہ ان کے اور مقصد کے درمیان مطابقت تامہ پائی جائے۔ اسلام نے تمدن کی بنیاد اخوت و مساوات پر رکھی تھی لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے اسے وہ راہیں اختیار کرنی پڑیں جو اس نے موقع ومحل کے مطابق مناسب سمجھیں اس غرض سے اس نے کبھی کبھی جب مفر کی کوئی صورت نہیں دیکھی تو قہر و جبر اور ہیبت وجلال کے مظاہرے کی اجازت بھی دی ہے۔

مہر ومروت اور عدل وانصاف کے مدعی عیسائیوں نے اپنے مخالفین سے جو وحشیانہ سلوک کیا ہے اس کے مقابلے میں مسلمانوں کا برتاؤ اپنے دشمنوں سے سراسر رحمت ورافت پر مبنی ہے۔ سان بارتلمی کی خونریزی اور اسی قسم کے دوسرے بے رحمانہ واقعات نے تاریخ عیسائیت کے صفحات پر کالک کا پچارا پھیر دیا ہے۔ ایسی وحشت سامانیوں کی مثال اسلام کی تاریخ میں کہیں بھی نہیں ملتی۔ سان بارتلمی کی خونریزی کے سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس کے اسباب ایک رات میں پیدا ہوگئے تھے۔ کیتھولک فرقے کے عیسائیوں نے پیرس اور نواح پیرس کے کثیر التعداد پروٹسٹنٹ فرقے کے عیسائیوں کو مکر وفریب سے تہ تیغ کردیا تھا۔ اگر مسلمانوں نے تیرہ سال تک مکہ میں اپنے مخالفین کے ہاتھوں ظلم وستم اور جبر وتشدد برداشت کرنے کے بعد اسیرانِ بدر میں سے دو کو قتل کردیا تو کون سی قیامت آگئی اور اس قتل کی حقیقت ہی کیا ہے اور پھر بات یہ ہے کہ اس اقدام سے کچھ فوائد بھی تھے چنانچہ اس سے متعلق سورۂ انفال کی آیہ ۶۷ نازل ہوئی جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

مکہ میں شکست کی خبر

مدینہ میں مسلمان مسرور و شاداں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ میں فتح ونصرت عطا کی اور اس کے ساتھ ہی بہت سا مال و متاع غنیمت میں ملا لیکن ادھر حیسمان خزاعی ؓ نے اہل مکہ کو شکست کی خبر دی۔ اہل مکہ کو اس شخص کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ سردارانِ قریش نے نہ صرف شکست کھائی بلکہ انہیں ہلاک بھی کیا گیا۔ پہلے تو انہیں اس خبر کی صحت وصداقت پر یقین نہ آیا لیکن حیسمان خزاعی نے یہ تمام واقعات جس غمگینی اور دل سوزی کے ساتھ سنائے اس سے انہیں اندازہ ہو گیا کہ خبر درست ہے، واقعی قریش نے شکست کھائی ہے۔ اہل مکہ کو اس واقعے سے اتنا صدمہ ہوا جیسے ان پر غم والم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ ابولہب کو اس صدمے سے عارضۂ بخار لاحق ہو گیا اور اسی مرض میں سات دن تک مبتلا رہ کر جان دی۔

مقتولین بدر کے ورثا نے یہ فیصلہ کیا کہ صف ماتم ہرگز نہ بچھے ورنہ مسلمانوں کو اس سے خوشی ہوگی، نہ کسی کو اسیران جنگ کی خبر گیری کے لیے مدینہ روانہ کیا جائے، اس صورت میں مسلمان زیادہ سے زیادہ زرفدیہ کا مطالبہ کریں گے۔ اس فیصلے کے بعد قریش نے چند روز صبر وضبط سے کام لیا آخر مکرز بن حفص، قریش سے بالا بالا، سہیل بن عمرو کو زرفدیہ کے عوض رہا کرانے کے لیے مدینہ پہنچا۔ حضرت عمر الفاروق ؓ یہ نہیں چاہتے تھے کہ سہیل کو صرف فدیہ لے کر رہائی دے دی جائے۔ آپ ؓ نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے اجازت دی جائے، میں سہیل بن عمرو کے سامنے کے دو دانت اکھاڑ دینا چاہتا ہوں تا کہ آپ ﷺ کے خلاف پھر اس کی زبان فراٹے نہ بھرے لیکن آنحضرت ﷺ نے یہ درخواست منظور نہ کی اور یہ فرمایا میں مثلہ یعنی قطع اعضا نہیں کروں گا اور اگر میں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ کرے گا حالانکہ میں نبی ہوں۔

نبی کریم ﷺ کی دختر نیک اختر حضرت زینب ؓ نے اپنے شوہر ابو العاص بن ربیع کے فدیے کے لیے کچھ چیزیں بھیجی تھیں۔ ان میں وہ ہار بھی تھا جو حضرت خدیجہ ؓ نے ان کے جہیز میں انہیں دیا تھا۔ یہ ہار دیکھ کر نبی کریم ﷺ پر رقت طاری ہو گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر چاہو تو اس اسیر کو رہا کر دو اور یہ مال واپس دے دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

بعد ازاں آپ ﷺ نے ابو العاص سے وعدہ لیا کہ وہ حضرت زینب ؓ سے جدائی اختیار کریں گے کیونکہ اسلام نے ان کے اور حضرت زینب ؓ کے درمیان خط فصل کھینچ دیا ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت زید ؓ بن حارثہ کو کسی شخص کے ہمراہ مکہ بھیجا کہ وہ مکہ سے حضرت زینب ؓ کو اپنے ہمراہ مدینہ واپس لے آئیں چنانچہ حضرت زید ؓ حکم نبوی ﷺ کی تعمیل میں مکہ گئے اور حضرت زینب کو اپنے ہمراہ لے آئے۔ اس واقعے کے بعد (فوراً نہیں بلکہ کچھ عرصہ بعد) ابو العاص قریش کا کچھ مال تجارت لے کر شام جا رہے تھے۔ مدینہ کے

Marfat.com

قریب مسلمانوں نے ان کا مال لوٹ لیا ئے۔ ابوالعاص نے رات کو مدینہ میں حضرت زینبؓ کے مکان پر پہنچ کر ان سے امان طلب کی تا کہ حربی ہونے کی وجہ سے انہیں قتل نہ کر دیا جائے۔ حضرت زینبؓ نے انہیں امان دے دی۔

جب صبح کو اس کا علم لوگوں کو ہوا تو انہوں نے ان کا لوٹا ہوا مال واپس دے دیا۔ ابوالعاص یہ مال لے کر مکہ پہنچے اور جس جس کا مال تھا اسے واپس کیا، پھر انہوں نے اہل مکہ سے دریافت کیا کسی کی کوئی چیز تو میرے پاس نہیں رہ گئی ہے؟ سب نے کہا خدا تمہیں جزائے خیر دے تم کریم اور صاحب دیانت و امانت ہو۔

اہل مکہ کی زبان سے یہ سن کر ابوالعاص نے کہا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور حضرت محمد ﷺ اس کے بندے اور پیغمبر ہیں۔ خدا کی قسم! میں مدینہ ہی میں اسلام قبول کر لینا چاہتا تھا لیکن اس ڈر سے کہ مبادا تم لوگ یہ سمجھو کہ ہمارے مال پر قبضہ کرنے کے لیے اسلام قبول کیا ہے میں نے ایسا نہیں کیا۔'' اس اعلانِ اسلام کے بعد ابوالعاصؓ نے مدینہ کا رخ کیا۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو پھر ان کے حوالے کر دیا۔

قریش نے فدیہ دے دے کر اپنے قیدیوں کو رہا کرایا۔ ایک ایک قیدی کا فدیہ ایک ہزار سے چار ہزار درہم تک تھا۔ جو قیدی مفلوک الحال تھے انہیں آنحضرت ﷺ نے یونہی رہا کر دیا۔

مقتولین بدر کا ماتم

قریش کو غزوۂ بدر کی شکست کا غم فراموش نہیں ہوا تھا۔ عورتیں ایک ماہ برابر ماتم کرتی رہی تھیں۔ دستور یہ تھا کہ مقتول کا گھوڑا یا اونٹ لایا جاتا اور لوگ اس کے گرد جمع ہو کر نوحہ سرائی کرتے۔ عتبہ کی بیٹی ہند اس ماتم اور اس نوحہ سرائی میں شامل نہ ہوئی۔ کچھ عورتیں اس کے پاس پہنچیں اور اس سے کہا: ''اپنے باپ، بھائی، چچا اور دوسرے رشتہ داروں کا ماتم نہیں کرو گی؟''

ہند نے جواب دیا: ''اگر میں ماتم کروں گی تو اس کی خبر (حضرت) محمد (ﷺ) اور ان کے رفقا کو پہنچے گی اور وہ مسرور ہوں گے، اور بنی خزرج کی عورتیں بھی میرا مذاق اڑائیں گی۔ خدا کی قسم! جب تک میں ان سے انتقام نہیں لوں گی، ماتم نہ کروں گی اور اس وقت تک سر پر تیل لگانا بھی میرے لیے حرام ہے۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ رونے سے غم غلط ہو جائے گا تو میں ضرور روتی اور ماتم بھی کرتی لیکن میں جانتی ہوں کہ میرے غم کی آتش صرف انتقام کے چھینٹے ہی سرد کر سکتے ہیں۔'' ہند نے اپنی بات نبھاتے ہوئے نہ سر پر تیل لگایا اور نہ ابوسفیان کو اپنی خواب گاہ تک آنے کا موقع دیا۔ ابوسفیان نے بھی یہ عہد کیا تھا کہ جب تک میں مقتولین بدر کا انتقام نہیں لے لوں گا اپنی جنسی خواہش کی تسکین کا سامان نہیں کروں گا۔

❁

حواشی

۱۔ روما سے تین میل۔ (معجم البلدان)

۲۔ سورہ المائدہ: آیہ ۲۴

۳۔ یہ اپنے قبیلہ کے سردار تھے اور ان کا خاتمہ اسلام پر ہوا۔

۴۔ مصنف نے یہاں اس واقعے کے لئے ''سریہ محمدی'' کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن حقیقتاً یہ سریہ محمدی نہ تھا بلکہ ان لوگوں کی یلغار تھی جو صلح حدیبیہ کے زمانہ سے حضرت ابوبصیر اور جناب ابوجندل کی سرکردگی میں مدینہ سے خارج ہونے کی وجہ سے ساحل سمندر پر جا بیٹھے تھے۔

(اصابہ در تذکرہ ابوبصیر: عتبہ بن اسید: نمبر ۳۸۹۔ وایضاً در اصابہ کتاب الکنیٰ در تذکرہ ابوالعاص نمبر ۶۸۴)۔

Marfat.com

باب 13

بدر سے احد کا درمیانی وقفہ

فتح بدر کا مدینہ کے غیر مسلموں پر اثر

فتح بدر کا اثر اہل مکہ پر ہوا، اس کی مختصر حکایت پہلے گزر چکی ہے۔ اہل مکہ کے دلوں میں جذبہ انتقام کی آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے وہ کسی نہ کسی موقع کے منتظر تھے۔ مدینہ میں جنگ کے نتائج اور اس کے اثرات صاف نمایاں تھے۔ یہودیوں اور منافقین کو یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ غزوۂ بدر کے بعد مسلمانوں کی طاقت میں متعدبہ اضافہ ہو گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ رفتہ رفتہ پورے مدینہ پر انہی کا تسلط ہو جائے اور تمام اہل مدینہ ان کی طاقت اور ان کے اثر و اقتدار کا لوہا مان لیں۔ یہودی غزوۂ بدر سے پیشتر بھی مسلمانوں کے حالات سے بے خبر نہ تھے۔ وہ درپردہ مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے لیکن معاہدہ کی وجہ سے کھلم کھلا قدم نہیں اٹھاتے تھے۔

مسلمان بدر کے میدان سے فتح و نصرت کے پرچم لہراتے ہوئے آئے تو یہودیوں نے زیادہ شدومد سے ان کی مخالفت شروع کر دی حالانکہ کہنے کو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ صلح کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ انہوں نے عوام کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کرنے کے لیے شعر گوئی کا حربہ بھی استعمال کیا۔ اس طرح گویا انقلاب کا میدان مکہ سے مدینہ کی جانب یا دوسرے لفظوں میں دین سے سیاست کی طرف منتقل ہو گیا۔ یہودیوں کو صرف اسلام ہی سے عناد نہ تھا بلکہ وہ نبی کریم ﷺ کے اثر و اقتدار میں ترقی سے بھی ہراساں اور خوف زدہ تھے۔ نبی کریم ﷺ کو بھی یہودیوں کے ان عزائم اور ان سازشوں کا علم تھا، غرض مسلمان اور یہودی دونوں ایک دوسرے کے خلاف اقدام کے لیے موقع و محل کے انتظار میں تھے۔

فتنہ پردازوں کا انجام

غزوۂ بدر سے پیشتر مسلمان بھی اہل مدینہ سے خائف تھے۔ اگر کوئی شخص ان پر زیادتی بھی کرتا تھا تو انتقام کی جرأت نہیں کرتے تھے لیکن بدر سے فاتحانہ مراجعت کے بعد سالم رضی اللہ عنہ بن عمیر نے ابو افک کا کام تمام کرنے کی ٹھان لی۔ ابو افک بنی عمرو بن عوف کے قبیلے سے تھا وہ رسول مقبول ﷺ اور مسلمانوں کی مذمت

Marfat.com

میں ہجویہ اشعار کہا کرتا تھا۔ ابوافک اپنے اشعار میں اسلام اور ہادیٔ اسلام ﷺ کے خلاف زہر اگلتا اور لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتا تھا۔ سالمؓ بن عمیر موسم گرما کی ایک شب میں ابوافک کے مکان پر پہنچے۔ ابوافک صحن میں سویا ہوا تھا۔ سالمؓ نے بڑھ کر تلوار کا ایسا وار کیا کہ ابوافک کا جسم دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔

عصماء بنت مروان[1] کا وطیرہ بھی یہی تھا کہ لوگوں کو ابھارتی اکساتی اور ان سے کہتی کہ اسلام کوئی اچھا مذہب نہیں ہے۔ غرض یہ عورت لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کرتی رہتی تھی۔ نبی کریم ﷺ کی شان میں بھی اس نے ناروا اور نازیبا باتیں کہی تھیں۔ عمیرؓ بن عوف رات کے وقت اس کے گھر پہنچے۔ عصماء اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ عمیرؓ کی نظر کمزور تھی۔ اس لیے پہلے تو انہوں نے ہاتھ سے ٹٹول کر اس سے بچے کو جدا کیا پھر تلوار سے اس کا خاتمہ کر دیا۔

عمیرؓ بن عوف نبی کریم ﷺ کو عصماء کے قتل کی اطلاع دے کر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں انہیں عصماء کے رشتہ دار مل گئے جو عصماء کو دفن کر کے لوٹ رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے عمیرؓ سے کہا: ''تمہی نے عصماء کو قتل کیا ہے؟'' عمیرؓ نے جواب دیا ''ہاں! اس کا قاتل میں ہوں، جو تم سے ہو سکے کر لو۔ خدا کی قسم! اگر تم بھی وہی بات کہو جو عصماء نے کہی تھی تو ابھی تلوار کھینچ لیتا ہوں، یا تم مجھے مار ڈالو گے یا میں تمہیں ہلاک کر دوں گا۔'' عمیرؓ کی جرأت و بے باکی کا اثر یہ ہوا کہ بنی خطمہ (عصماء کا شوہر بنی خطمہ کے قبیلے کا ایک فرد تھا) میں قبولِ اسلام کے لیے زمین ہموار ہوگئی۔ جو لوگ ابھی تک علی الاعلان اپنے اسلام کا اعلان نہیں کر سکے تھے انہیں بھی حوصلہ ہوا اور وہ دھڑلے سے اسلام کے حلقے میں آ شامل ہوئے۔

ان دونوں کے بعد کعب بن اشرف کی باری آئی۔ کعب بن اشرف وہ شخص تھا جس نے اکابر قریش کی ہلاکت کی خبر سن کر کہا تھا کہ یہ عرب کے سردار ہی تھے جن پر (حضرت) محمد (ﷺ) نے غلبہ پا لیا۔ ہمارے لیے تو زندگی سے موت بہتر ہے (یعنی ہم پر نبی کریم ﷺ غلبہ نہیں پا سکتے)۔ اس شخص نے غزوۂ بدر کے بعد مکہ پہنچ کر قریش کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لیے ابھارا تھا۔ اس نے اشعار پڑھے اور ان کشتگانِ بدر کا ماتم کیا جنہیں مسلمانوں نے گڑھے میں داب دیا تھا، اور یہی شخص تھا جس نے مکہ سے واپس آ کر خواتین اسلام کے حسن و جمال کی تعریف کی تھی۔ ننگ و ناموس کے معاملے میں صحرا نشین عربوں کا جذبہ غیرت و حمیت ضرب المثل ہے۔ جہاں عزت و آبرو کا سوال آ جاتا ہے ان کے مزاج کا پارہ فوراً تیز ہو جاتا ہے۔ کعب بن اشرف کی باتوں سے مسلمان اتنے برافروختہ ہوئے کہ اجتماعی طور پر سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ اس کی ہلاکت کے لیے فوری اقدام ناگزیر ہے۔ چند مسلمانوں نے اس کام کا بیڑا اٹھا لیا۔

اس طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک مسلمان کعب کے پاس گیا اور باتوں باتوں میں رسول کریم ﷺ کا ذکر چھیڑ کر کہا، اس شخص کا ورودِ مدینہ تو ہمارے لیے عذاب ثابت ہو رہا ہے۔ عرب ہمارے دشمن ہو گئے ہیں۔ راستے بھی ہم پر مسدود ہیں۔ ہم تو بڑی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ ان باتوں کے بعد کعب سے کہا، مجھے اور

Marfat.com

میرے ساتھیوں کو کچھ روپیہ قرض دے دو اور ہماری زرہیں گروی رکھ لو۔ کعب نے روپیہ دینے کا اقرار کرلیا اور یہ کہا کہ پھر کسی وقت آنا۔

کعب بن اشرف کا گھر مدینہ کی عام آبادی سے ذرا فاصلے پر تھا۔ ایک رات کو کعب اپنے گھر میں سو رہا تھا کہ ابو نائلہ نے (پروگرام کے مطابق) اسے آواز دی۔ کعب نے باہر جانا چاہا تو اس کی بیوی نے اسے ٹوکا کہ آدھی رات کے وقت گھر سے باہر نہ جاؤ لیکن کعب نے اس بات کی پروانہ کی اور باہر نکلا۔ ابو نائلہ کعب کو اپنے ہمراہ لے کر اپنے دوستوں کے پاس پہنچا۔ یہ سب تھوڑی دور چلے۔ اثنائے راہ میں اپنے افلاس اور اپنی غربت کی شکایت کرتے تھے تاکہ کعب کو ان کی طرف سے اطمینان ہو جائے۔ ابو نائلہ نے چلتے چلتے کعب کے سر پر ہاتھ رکھا اور سونگھ کر کہا: ''مجھے تمہارے سر سے ایسی خوشبو پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔'' کعب کا شبہ دور کرنے کے بعد ابو نائلہ نے پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بال مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیے اور اپنے ساتھیوں سے کہا: ''اس دشمن خدا کا سر قلم کر دو۔'' ابو نائلہ کے ساتھیوں نے اپنی اپنی تلواروں سے اس پر وار کیے جن سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔

یہودی اس واقعہ قتل سے بہت زیادہ خوفزدہ ہوئے۔ ان میں سے کسی کو بھی اپنی جان کی خیر نظر نہیں آتی تھی، پھر بھی مسلمانوں کے بارے میں ان کی زبانیں خاموش نہیں رہی تھیں۔ انہی دنوں ایک عرب عورت بنی قینقاع کے یہودیوں کے بازار میں ایک سنار کے پاس گئی۔ یہودی اس کی صورت بے نقاب دیکھنا چاہتے تھے لیکن اس نے اپنا نقاب نہیں سرکایا۔ ایک یہودی نے عورت کے پیچھے پہنچ کر اس کے دوپٹے کا ایک پلو ایک کانٹے سے قمیص کے ساتھ ٹانک دیا۔ عورت کو پتا بھی نہ چلا۔ جب وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی تو اس کے جسم کا ایک حصہ نمایاں ہو گیا۔ عورت نے شور مچایا۔ کچھ مسلمان جمع ہو گئے۔ ایک مسلمان نے بڑھ کر یہودی سنار کو مار ڈالا۔ اس پر یہودیوں نے جمع ہو کر اس مسلمان کو شہید کر دیا۔ مقتول مسلمان کے رشتہ داروں نے شور برپا کیا اور مسلمانوں سے مدد طلب کی۔ مسلمانوں اور بنی قینقاع کے یہودیوں کے تعلقات میں کشیدگی آئی تو نبی کریم ﷺ نے یہودیوں سے فرمایا، مسلمانوں کو ایذا نہ دو اور عہد کا پاس رکھو ورنہ قریش کی طرح ذلت و خواری کے لیے تیار رہو۔ یہودیوں نے اس تنبیہ کی مطلق پروانہ کرتے ہوئے کہا:

> ''آپ مغرور نہ ہوں، آپ نے ان لوگوں سے جنگ کی جو فنِ حرب سے ناآشنا تھے۔ یہی سبب ہے کہ آپ نے ان پر غلبہ پایا۔ اگر ہم سے جنگ کی نوبت آئی تو ہم آپ پر یہ بات واضح کر دیں گے کہ ہم کیا ہیں اور کس قسم کے لوگ ہیں؟''

یہود کی اس دھمکی کے بعد مسلمانوں کو جنگ کے بغیر چارہ نہ رہا ورنہ مدینہ میں ان کی وہی رسوائی اور ذلت ہو جاتی جو کل ان کے ہاتھوں قریش کو دیکھنا پڑی اور جس کے چرچے عرب کے گھر گھر میں ہو رہے تھے۔ کل کو یہی چرچے مسلمانوں کے بارے میں شروع ہو جاتے۔

بنی قینقاع کا محاصرہ اور اخراج

آخر جنگ کی نوبت آ گئی۔ یہودی قلعہ بند ہو کر دبک گئے اور مسلمانوں نے باہر سے ان کی رسد بند کر دی۔ مسلمانوں نے بنی قینقاع کے یہودیوں کا محاصرہ پندرہ روز تک جاری رکھا۔ وہ کسی یہودی کو گھر سے نکلنے نہیں دیتے تھے نہ کسی کو محصورین تک خوراک لے جانے دیتے تھے۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے اطاعت قبول کر لی اور اپنے آپ کو مسلمانوں کے رحم و کرم کے حوالے کر دیا۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورے کے بعد یہ طے کیا کہ ان یہودیوں کو تہ تیغ کر دیا جائے۔

عبداللہ بن ابی بن سلول جس کا یہودیوں اور مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ تھا، درمیان میں پڑا اور اس نے نبی کریم ﷺ سے کہا: اے (حضرت) محمد (ﷺ)، میرے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیئے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہے۔ عبداللہ بن ابی نے پھر وہی بات دہرائی۔ رسول کریم ﷺ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ عبداللہ بن ابی نے آپ ﷺ کی زرہ کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس حرکت سے آپ ﷺ کو غصہ آ گیا اور آثارِ جلال آپ ﷺ کے چہرے پر نمودار ہو گئے۔ اس حالت میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے چھوڑ!'' پھر فرمایا: ''تجھ پر حیف! مجھے چھوڑ دے۔'' عبداللہ بن ابی نے کہا: ''خدا کی قسم میں اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک آپ ﷺ میرے دوستوں سے حسن سلوک کا وعدہ نہیں کریں گے۔ یہ سات سو نفوس ہیں اور انہوں نے مدتوں مجھے دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھا ہے۔ آپ ﷺ ان سب کو فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ خدا کی قسم! میں انجامِ کار سے ڈرتا ہوں۔''

اگرچہ عبداللہ بن ابی بن سلول کا اثر مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے باعث کم ہو گیا تھا تاہم اوس اور خزرج کے مشرکین میں اس کا کچھ رسوخ باقی تھا ہنوز عبداللہ بن ابی کا اصرار جاری تھا کہ عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت بھی آ گئے اور وہ بھی یہی بات کہنے لگے جو عبداللہ بن ابی بن سلول کہہ رہا تھا۔ آخر رسول کریم ﷺ نے فیصلہ کیا کہ یہودیوں کی جاں بخشی اس شرط پر کی جاتی ہے کہ وہ مدینہ سے نکل جائیں۔

عبداللہ بن ابی دوبارہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جانا اور یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ یہودیوں کے اخراج کا حکم منسوخ کر دیا جائے لیکن ایک مسلمان نے اسے نہ جانے دیا۔ اسی کشمکش میں عبداللہ بن ابی زخمی بھی ہو گیا۔ ایک یہودی نے اسے اس حالت میں دیکھ کر کہا، تم ہمارے ہوتے ہوئے زخمی ہو گئے اور ہم تمہاری امداد نہ کر سکے۔ خدا کی قسم! اب ہم اس بستی میں ہرگز نہ رہیں گے۔ غرض یہودی اپنے اسلحہ اور دوسرے آلات مدینہ میں چھوڑ کر وادی القریٰ میں جا آباد ہوئے اور مدتوں وہاں رہے۔ بعدازاں انہوں نے شام کی حدود میں اقامت اختیار کی۔ غالباً شام کی جانب ان کی نقل مکانی اس لیے تھی کہ کبھی نہ کبھی ہم ارضِ موعود تک جا پہنچیں گے۔

Marfat.com

مدینہ کی سیاسی وحدت

قبیلہ بنی قینقاع کی جلاوطنی کے بعد مدینہ یہودیوں سے پاک وصاف ہوگیا۔ مدینہ کے یہودی خیبر اور ام القریٰ میں اقامت گزیں ہوگئے۔ یہودیوں کے اخراج سے آنحضرت ﷺ کا جو مقصد تھا، پورا ہوگیا۔ کسی شہر کے لیے اس سے زیادہ تباہ کن اور کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ اس کے باشندے آپس میں مصروف جنگ وجدل ہوں۔ باہمی کشمکش کے نتیجے میں ایک جماعت دوسری پر غالب آجاتی ہے اور اس جماعت کا جو غالب آئے اثر بڑھ جاتا ہے۔ مدینہ کے مسلمانوں اور یہودیوں کے نزاع کا نتیجہ بھی یہی ہوا۔ بعض مؤرخین نے یہودیوں کے بارے میں مسلمانوں کی روش پر تنقید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر یہودی سنار نے مسلمان عورت کی اہانت کی تھی تو اس کی بنا پر ایک یہودی اور ایک مسلمان مقتول ہوچکے تھے اور کوئی قضیہ باقی نہ رہا تھا لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کیونکہ مسلمان عورت کی بے حرمتی سے مسلمانوں کی جو اہانت ہوچکی تھی وہ دو شخصوں کے قتل سے زائل نہیں ہوسکتی تھی۔ عرب اپنی اس فطرت کے تقاضے سے، جو صحرا نشینی کی خصوصیات میں سے ہے، ننگ و ناموس پر جان دیتے تھے اور یہ معاملہ ان کے نزدیک اتنی اہمیت کا حامل تھا کہ اس کی وجہ سے دو قبیلوں کے درمیان برسوں جنگ جاری رہ سکتی تھی۔ تاریخ عرب کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے ان کی نگاہوں کے سامنے ایسی بے شمار مثالیں ہیں لیکن اہانت سے قطع نظر اس واقعے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ یہ واقعہ سرائیوو (بوسنیا ہرزیگووینا) کے ولی عہد نمسا کے قتل سے مماثل ہے جو ۱۹۱۴ء میں وقوع پذیر ہوا اور جس کے بعد آتش جنگ کے شعلے ساری دنیا میں بھڑک اٹھے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے دلوں میں ایک مدت سے بغض وعناد کی آگ سلگ رہی تھی۔ واقعہ مذکورہ نے اسے اور مشتعل کردیا اور اس کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ یہ سمجھنا چاہیے کہ مدینہ میں ایک آتش فشاں پہاڑ تھا جو دفعتہ پھٹ پڑا۔ بنی قینقاع کا محاصرہ اور اس کے بعد جو واقعات ظہور میں آئے وہ سب اسی کے نتائج وعواقب تھے۔ یہودیوں کے اخراج کے بعد مسلمانوں نے اپنی بڑھتی ہوئی طاقت میں کچھ اور اضافہ کیا اور تقریباً ایک مہینے تک زندگی نہایت امن وسکون اور آرام سے گزاری۔ مدینہ میں مسلمانوں کی یہ پرسکون حالت دراصل اس سکون سے مشابہ تھی جو کسی سخت طوفان کے بعد رونما ہوا کرتا ہے۔ لیکن یہ حالت زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکی۔ ابوسفیان شکست کی ذلت اٹھا کر مکہ میں چین سے بیٹھ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی منصوبہ بندیوں کا سلسلہ جاری تھا۔

غزوہ سویق[1]

ابوسفیان نے عربوں میں یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ قریش میں ابھی کس بل موجود ہیں اور وہ چاہیں تو اب بھی جنگ میں شجاعت کے جوہر دکھا سکتے ہیں۔ غرض وہ مکہ کے دو سو اشخاص اور ایک روایت کے مطابق

Marfat.com

چالیس اشخاص کو اپنے ہمراہ لے کر چھپتے چھپاتے عازمِ مدینہ ہوا اور صبح سویرے مقام عریض پر پڑاؤ کیا۔ یہاں اسے دو شخص ملے جن میں ایک انصاری تھا۔ ابوسفیان نے دونوں کو تہ تیغ کر دیا اور دو گھروں اور ایک نخلستان کو آگ لگادی۔ ان حرکات کے بعد ابوسفیان کو یہ اطمینان ہوگیا کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے انتقام لے لیا ہے لیکن اس اطمینان کے ساتھ اسے یہ اندیشہ بھی تھا کہ شاید مسلمان اس کا تعاقب کریں چنانچہ ابو سفیان اور اس کے ساتھی بہ عجلت تمام مکہ کو واپس ہوئے۔ اس اثنا میں قریش کے اقدام کی خبر مدینہ میں پہنچ چکی تھی۔ نبی کریم ﷺ اپنے صحابہؓ کی ایک جماعت کے ہمراہ ابوسفیان کے تعاقب میں قرقرۃ الکدر تک پہنچے۔ ابوسفیان کے ساتھی راستے میں اپنا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے ستو کی بوریاں پھینکتے ہوئے گئے تھے۔ مسلمانوں کو یہ بوریاں نظر آئیں تو انہوں نے اٹھالیں۔ نبی کریم ﷺ نے اس خیال سے کہ قریش کا تعاقب لاحاصل ہے، مدینہ کو واپسی کا ارادہ کیا۔ اس غزوہ کا نام ''سویق'' اسی اعتبار سے رکھا گیا ہے کہ سویق عربی زبان میں ستو کو کہتے ہیں۔ ابوسفیان کے ناکام اقدام اور راہ فرار اختیار کرنے کی خبر عرب کے طول وعرض میں پھیل گئی لیکن جو عرب قبائل مدینہ سے فاصلے پر تھے وہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کی سرگرمیوں کو چنداں اہمیت نہ دیتے تھے۔

قبائل کی سرکشی کا انسداد

وہ عرب قبائل جو مدینہ سے قریب آباد تھے انہیں یہ تشویش لاحق ہوئی کہ مسلمانوں کی طاقت کسی صورت میں قریش سے کم نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شام کی تجارتی راہ مسلمانوں کے اقتدار کے باعث خطرے میں پڑ جائے (اس زمانے میں مکہ سے شام کا راستہ بحیرۂ احمر کے ساحل کے قریب سے گزرتا تھا اور قریش کے جو قافلے اس راستے سے جاتے تھے ان سے ان قبائل کو جو راستے میں آباد تھے، بڑے مالی فوائد پہنچتے تھے)۔ نبی کریم ﷺ نے ساحل کے قریب آباد قبائل سے معاہدے کر لیے تھے اور یہ راستہ قریش کے لیے مخدوش ہوگیا تھا۔ اس بات کا احتمال تھا کہ قریش تجارتی راہ تبدیل کر دیں گے اور راستے کی تبدیلی سے ان تمام قبائل کو مالی نقصان پہنچے گا جن کی معاش کا دارومدار کاروانوں کی آمدورفت پر تھا۔

غزوۂ بدر نے عرب قبائل کو شش وپنج میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ اس ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے کہ مسلمانوں سے لڑیں یا کوئی اور راہ اختیار کریں۔ ایک دن رسول کریم ﷺ کو یہ خبر ملی کہ غطفان وسلیم کے قبائل مسلمانوں پر حملہ آور ہوا چاہتے ہیں۔ آپ قرقرۃ الکدر پہنچے۔ وہاں چوپایوں کے نشانات تو تھے لیکن کوئی شخص موجود نہ تھا۔ آپ ﷺ نے کسی شخص کو سراغرسانی کے لیے روانہ کیا اور خود انتظار میں وہیں ٹھہر گئے۔ اس اثنا میں یسار نامی ایک غلام وہاں آیا۔ آپ ﷺ نے اس سے دریافت کیا تو معلوم ہوا وہ گروہ ساحل کے قریب پہنچ چکا ہے۔ مسلمانوں نے جو چوپائے ان کو ملے انہیں جمع کر لیا اور نبی کریم ﷺ کا خمس (پانچواں حصہ

نکالنے کے بعد جو کچھ بچا وہ آپس میں تقسیم کرلیا بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پانچ سو اونٹ تھے۔ خمس نکالنے کے بعد ہر مسلمان کے حصہ میں دو دو اونٹ آئے۔

ایک دن نبی کریم ﷺ کو خبر ملی کہ بنی ثعلبہ اور محارب کے کچھ لوگ مقام ذی امر میں جمع ہوکر مسلمانوں پر اطراف سے حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ ساڑھے چار سو مسلمانوں کی معیت میں مدینہ سے باہر نکلے اور بنی ثعلبہ کے ایک فرد سے حالات دریافت کیے۔ اس نے نشاندہی کے بعد کہا کہ اگر انہیں آپ ﷺ کی نقل وحرکت کی اطلاع مل گئی ہے تو انہوں نے راہ فرار اختیار کرلی ہوگی۔ میں آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوں اور ان کی کمین گاہ کا سراغ بتاتا ہوں لیکن موقع پر پہنچ کر پتا چلا کہ یہ گروہ مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر بھاگ نکلا ہے۔

ایک روز نبی کریم ﷺ کو خبر ملی کہ بنی سلیم کا ایک گروہ نجران میں مسلمانوں سے جنگ کی تیاریاں کررہا ہے۔ آپ ﷺ تین سو مسلمانوں کی معیت میں نجران کے قریب پہنچے اور ایک شخص سے اس گروہ کا حال پوچھا۔ پتا چلا کہ وہ لوگ متفرق ہوچکے ہیں اور اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں، مسلمانوں کی ان سرگرمیوں سے قبائل عرب سہم سے گئے۔ اول تو ان میں مقابلے کی سکت نہ تھی اور اگر کوئی اس قسم کا منصوبہ باندھتا تو مسلمانوں کی آمد کی خبر سنتے ہی راہ فرار اختیار کرلیتا۔

یہودیوں کی وحشت

کعب بن اشرف کے قتل کے بعد یہودی بہت زیادہ خوف زدہ ہوگئے تھے۔ اکثر اوقات وہ اپنے گھروں کی چہار دیواریوں میں محصور رہتے تھے۔ چونکہ محاصرہ بنی قینقاع کے بعد نبی کریم ﷺ نے یہودیوں کی خوں ریزی جائز قرار دے دی تھی اس وجہ سے ان پر اور بھی زیادہ خوف چھایا ہوا تھا۔ ایک دن کچھ یہودی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شکایت کی کہ کعب بن اشرف کو بے رحم و بے قصور قتل کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس نے ہمیں اذیتیں دیں اور ہماری ہجو میں مذمت آمیز اشعار بھی پڑھے اگر وہ دوسرے یہودیوں کی طرح رہتا تو اسے کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کعب بن اشرف کے قتل اور یہودیوں سے مسلمانوں کے عام برتاؤ کے بارے میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی آخر رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہودیوں کے ساتھ ایسا معاہدہ کیا جائے جس کا فریقین احترام کریں۔

قریش کی تجارتی زبوں حالی

قریش کو اپنی تجارت کا خدشہ تھا کیونکہ ان کی معاش کا دارومدار اسی پر تھا۔ اگر تجارت کی راہیں مسدود ہوجاتیں تو اہل مکہ کہیں قحط میں مبتلا ہوتے اور کہیں بھوکوں مرتے۔ نبی کریم ﷺ چاہتے تھے کہ قریش کی راہ تجارت مسدود کردیں اور مکہ کو حصار میں لے کر اس کی مرکزی حیثیت ختم کردیں۔

Marfat.com

ایک روز صفوان بن امیہ نے قریش سے کہا: "(حضرت) محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھی ہماری تجارت میں رکاوٹیں ڈال دینا چاہتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ ساحلی علاقوں میں بھی اپنا اثر و رسوخ قائم کریں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم اس مزاحمت کا مقابلہ کیسے کریں۔ (حضرت) محمد (ﷺ) نے ساحلی علاقوں میں رہنے والوں سے عہد و پیمان کر لیے ہیں۔ اگر ہم گھروں میں بیٹھے رہیں تو سرمایہ کم ہوتے ہوتے ختم ہو جائے گا۔ ہماری زندگی کا دار و مدار گرما میں شام کی تجارت سے اور سرما میں حبش کی تجارت سے وابستہ ہے۔"

اسود بن مطلب نے کہا، بہتر یہ ہے کہ بحیرہ احمر کی ساحلی راہ چھوڑ کر عراق کی راہ اختیار کی جائے۔ فرات بن حیان کو جو قبیلہ بنی بکر کا ایک فرد تھا، انہوں نے اپنا رہنما قرار دیا۔ فرات بن حیان نے کہا کہ (حضرت) محمد (ﷺ) کے اصحاب کو یہ جرأت ہرگز نہ ہوگی کہ وہ عراق کا رخ کریں کیونکہ یہ کوہستانی علاقہ ہے اور یہاں بڑے بڑے صحرا ہیں۔ صفوان کو صحرا کا کوئی اندیشہ نہ تھا کیونکہ سردیوں کا موسم تھا اور پانی کی ضرورت زیادہ پیش نہ آتی تھی۔ اس قرار داد کے مطابق ایک قافلہ ترتیب دیا گیا۔ اس کے مالِ تجارت کی قیمت ایک لاکھ درہم تھی۔

جس زمانے میں قریش قافلہ تجارت کی ترتیب اور اس کے متعلق اہم انتظامات میں مصروف تھے، اتفاق سے مدینہ کا ایک شخص نعیم نامی وہاں مقیم تھا۔ جب وہ مدینہ واپس آیا تو اس نے باتوں باتوں میں ایک مسلمان سے قریش کے منصوبے کا ذکر کیا۔ اس مسلمان نے فوراً رسول کریم ﷺ کو اس بات سے مطلع کر دیا چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو سو سواروں کی معیت میں قافلہ قریش کی روک تھام کے لیے روانہ فرمایا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ مجد کے ایک چشمے کے پاس پہنچے جو سرِ راہ واقع تھا۔ قریش کا قافلہ وہاں پہنچا تو مسلمانوں کو دیکھ کر اس نے راہِ فرار اختیار کی۔ اس کے مال و اسباب پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ یہ پہلی بڑی غنیمت تھی جو مسلمانوں کے قبضے میں آئی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ مدینہ واپس آئے اور غنیمت کا خمس نکال کر اس کی تقسیم صحابہؓ میں کر دی گئی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ فرات بن حیان کو بھی گرفتار کر لائے تھے اسے اسلام کی دعوت دی گئی چنانچہ وہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔[3]

غور طلب امر یہ ہے کہ آیا آنحضرت ﷺ ان امید افزا واقعات سے مطمئن اور فکرِ فردا سے بے پرواہ ہو گئے تھے؟ آیا انہوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ جو مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا ہے اس سے دین کی بنیادیں مستحکم ہو گئی ہیں اور کوئی وجہ تردد باقی نہیں رہی ہے؟ آیا آپ ﷺ نے اس یقین کی بنا پر جو آپ ﷺ کو اپنی فتح سے متعلق تھا اور اس توکل کے سہارے جو خدا کی تائید پر تھا اپنے تمام معاملات تقدیر کے حوالے کر دیے تھے؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمام امور اور تمام معاملات کی باگ ڈور قدرت کے ہاتھوں میں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خدا ان امور کو وسائل و اسباب کے تحت سرانجام دیتا ہے اور اس روش میں کبھی فرق نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں کچھ اوصاف اور کچھ صفات ودیعت کی ہیں جن

Marfat.com

سے انکار نہیں کیا جاسکتا حالات و واقعات کے وجوہ و اسباب کی تحقیق و تدقیق میں ان اوصاف و صفات کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔ قریش عرب کے سردار تھے اور ان کی فطرت میں بغض و عناد اور عداوت و انتقام کی خصلتیں گھر کر چکی تھی۔ صفوان کے قافلے پر جو کچھ بیتی اس نے قریش کو پہلے سے بھی زیادہ انتقام پر آمادہ کر دیا۔ نبی کریم ﷺ کی نگاہ سے بھی یہ حقیقت مستور نہ تھی اور ان حالات میں یہ ناگزیر تھا کہ آپ ﷺ مسلمانوں سے اپنا رشتہ کچھ اور بھی زیادہ استوار کریں۔ اگرچہ پہلے ہی اسلام نے مسلمانوں کو اخوت و مساوات کی لڑی میں پرو دیا تھا تاہم اگر اس ربط کو اور زیادہ استوار کر دیا جاتا تو یہ توقع تھی کہ ان کے حوصلے کچھ اور بلند ہو جائیں گے۔

حضرت حفصہ ؓ سے عقد

حضرت عمر الفاروق ؓ کی دختر نیک اختر حضرت حفصہ ؓ سے نبی کریم ﷺ کا عقد اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ حضرت حفصہ ؓ کے پہلے شوہر خنیس ؓ (سابقون الاولون میں سے تھے) سات مہینے پیشتر داعی اجل کو لبیک کہہ چکے تھے۔ اس رشتے سے نبی کریم ﷺ کے ساتھ حضرت عمر الفاروق ؓ کا تعلق پہلے سے بھی زیادہ استوار ہو گیا۔ اس سے پیشتر رسول کریم ﷺ اپنی دختر حضرت فاطمہ زہرا ؓ کو حضرت علی ؓ کے حبالہ عقد میں دے چکے تھے۔ حضرت علی ؓ کو آپ ﷺ کے ساتھ بے حد محبت تھی اور لڑکپن ہی سے آپ ﷺ کے ساتھ شیفتگی کا تعلق رکھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہ ؓ جو حضرت عثمان غنی ؓ کی رفیقہ حیات تھیں اس جہانِ فانی سے چل بسیں تو آپ ﷺ نے اپنی دوسری دختر حضرت اُم کلثوم ؓ کا عقد بھی ان کے ساتھ کر دیا۔ اس طرح حضرت علی ؓ، حضرت ابوبکر ؓ، حضرت عمر ؓ اور حضرت عثمان ؓ سے آپ ﷺ کی یگانگی کا تعلق گہرا ہو گیا۔

ان سب امور کے ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ قریش کے حالات سے بے خبر نہ تھے۔ یہ حقیقت آپ ﷺ پر بخوبی روشن تھی کہ قریش، مسلمانوں سے انتقام لینے، اپنی راہِ تجارت کھولنے اور مکہ کی دینی و تجارتی اہمیت کو برقرار رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

Marfat.com

حواشی

۱۔ یہ مروان بن الحکم کی بیٹی نہیں تھی۔ اس کا باپ مدینہ کا باشندہ تھا جبکہ مروان بن الحکم قرشی اور مکی ہیں۔

۲۔ ابوسفیان رات کو شہر میں آیا۔ پہلے حی بن اخطب کے ہاں گیا مگر اس نے معذرت کر دی، پھر سلام بن مشکم کے ہاں آیا۔ اس نے شراب بھی پلائی اور مسلمانوں کی پوری حالت بھی سنا دی۔ (سیرۃ ابن ہشام باب غزوۃ السویق)

۳۔ فرات رسول اللہ ﷺ کی ہجو میں اپنی زبان ملوث کرتے رہتے تھے۔ جب گرفتار ہو کر آئے تو اسی زبان سے رسول اللہ ﷺ کی منقبت میں قصیدہ خوانی سے اپنے روئیں روئیں کو پاک کر لیا جس پر رسول اللہ ﷺ نے فرات کا اسلام قبول فرما لیا۔ (اصابہ نمبر:۶۹۰۸)

Marfat.com

باب 14

غزوۂ احد

قریش کے دلوں پر غزوۂ سویق نے تو کوئی اثر نہ چھوڑا البتہ غزوۂ بدر کا چرکہ ہنوز مندمل نہ ہوا تھا۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے کاروانِ قریش کو جو لوٹ لیا تھا اس نے آتش انتقام پر اور تیل چھڑک دیا تھا۔ مقتولین بدر کی یادان کے دل سے محو نہ ہوئی تھی کیونکہ وہ لوگ قوم کے سردار اور پیشوا تھے۔ قریش کی ہر عورت اپنے باپ، بھائی اور شوہر وغیرہ کی یاد میں آنسو بہاتی اور نوحہ کرتی تھی۔ جو لوگ بدر کے میدان سے جان سلامت لے گئے تھے انہوں نے قافلہ ابوسفیان کے مال کو (غزوۂ بدر اس مال کی بنا پر ہوا تھا) دارالندوہ میں محفوظ کر دیا تھا۔ اکابر قریش کی رائے تھی کہ یہ سامان فروخت کرنے کے بعد اس کی قیمت سے فوج بھرتی کی جائے اور مسلمانوں کے مقابلے میں صف آرا ہونے کے لیے تمام عرب قبائل کو دعوت دی جائے۔ ابوعزہ شاعر جسے نبی کریم ﷺ نے غزوۂ بدر کے بعد فدیہ لیے بغیر رہا کر دیا تھا، ان لوگوں سے آملا تھا۔ حبشی النسل عربوں سے بھی قریش نے مدد کی درخواست کی تھی۔

قریش کی عورتیں بھی میدانِ جنگ میں شرکت کے لیے اصرار کر رہی تھیں۔ مردوں کی آرا اس باب میں مختلف تھیں۔ ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ عورتوں کا ہمارے ہمراہ چلنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہ مردوں کو بہتر پیرائے میں جنگ کی ترغیب دے سکتی ہیں اور مقتولین بدر کی یاد بھی تازہ کر سکتی ہیں۔ ہم لوگ تو جان سے ہاتھ دھو چکے ہیں یا انتقام لیں گے یا اسی کوشش میں جان دے دیں گے۔ گھروں کو واپسی کا ہمارا ارادہ ہی نہیں۔ دوسرا گروہ یہ کہتا تھا کہ عورتوں کی معیت ہرگز مناسب نہیں ہے۔ ممکن ہے ہمیں جنگ میں شکست ہو اور ہماری عزت و ناموس بھی خطرے میں پڑ جائے۔ جو لوگ عورتوں کو ہمراہ لے جانے کی مخالفت کر رہے تھے ان سے ابوسفیان کی بیوی ہند نے کہا۔ ”تم لوگ بدر کے دن صحیح و سلامت رہے تھے اور خیریت سے اپنے اپنے گھر واپس آگئے تھے لیکن اب ہمارا ارادہ شرکت جنگ کا ہے تو تم ایسی باتیں کرتے ہو۔ ہم ضرور چلیں گے۔ ہمیں کوئی واپس جانے اور مکہ میں ٹھہرے رہنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ تم لوگوں نے بدر کے موقع پر عورتوں کو جحفہ کے مقام سے لوٹا دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے اعزہ و اقارب مارے گئے کیونکہ میدانِ جنگ میں کوئی نہ تھا جو انہیں جنگ کی ترغیب دیتا۔“

Marfat.com

سپاہِ قریش کی پیش قدمی

قریش مکہ سے روانہ ہوئے۔ عورتیں بھی ہند کی سرکردگی میں ان کے ساتھ چلیں۔ ہند کے دل میں آتشِ انتقام بڑی تیزی سے بھڑک رہی تھی کیونکہ غزوۂ بدر میں اس کا باپ، بھائی اور دوسرے اعزہ مارے گئے تھے۔ لشکرِ قریش کے ساتھ تین علم تھے اور ان کی فوج تین ہزار کے قریب افراد پر مشتمل تھی۔ بنی ثقیف کے دو سو افراد کے علاوہ باقی سب اہلِ مکہ تھے۔ لشکر کے پاس سامانِ حرب کی فراوانی تھی۔ ستر اشخاص زرہ پوش، دو سو گھوڑے اور تین ہزار اونٹ تھے۔ نبی کریم ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ بھی لشکرِ قریش میں شامل اور ان کے تمام منصوبوں سے باخبر تھے۔ عباسؓ (زمانہ کفر میں) بت پرست تھے لیکن اس کے باوجود نبی کریم ﷺ کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور غزوۂ بدر کے موقع پر آپ نے ان سے جو حسن سلوک کیا انہیں اس کا اعتراف تھا۔ لشکرِ قریش کوچ کے لیے آمادہ تھا۔ اس موقع پر حضرت عباسؓ نے آنحضرت ﷺ کو ایک خط لکھا جس میں قریش کے لشکر کی تعداد اور سامانِ جنگ وغیرہ کی تفصیل درج تھی۔ یہ خط انہوں نے ایک قاصد کے ہمراہ اس ہدایت کے ساتھ مدینہ بھیجا کہ اسے نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچا دیا جائے۔

لشکرِ قریش مکہ سے روانہ ہو کر منزلیں مارتا ہوا ابواء کے مقام پر پہنچا اور رسول کریم ﷺ کی والدہ ماجدہ کی قبر کے پاس سے گزرا۔ بعض لوگوں نے جو زیادہ غضب آلود اور کمینہ خصلت تھے کہا کہ آمنہ کی قبر اکھاڑ دی جائے لیکن اکابرِ قریش نے اس ناشائستہ فعل کی اجازت نہ دی اور کہا کہ عرب میں یہ رسم بد شروع ہو جائے گی اور بنی بکر اور بنی خزاعہ کے لوگ ہمارے بزرگوں کی ہڈیاں اکھاڑ پھینکیں گے۔ غرض وہ لوگ اس بے جا حرکت سے باز رہے۔ لشکر ابواء سے چل کر مقامِ عقیق میں پہنچا جو کوہِ احد کے دامن میں مدینہ سے پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

عباس رضی اللہ عنہ کا قاصد

(حضرت) عباس رضی اللہ عنہ کا قاصد مدینہ پہنچ کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ اس وقت قبا میں تھے اور مسجد سے نکل کر اونٹ پر سوار ہوا ہی چاہتے تھے۔ قاصد نے خط پیش کیا۔ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے اسے پڑھ کر سنایا۔ نبی کریم ﷺ نے ابیؓ بن کعب کو ہدایت کی کہ خط کا مضمون ابھی مخفی رکھیں اور کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں۔ بعد ازاں نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے حضرت سعدؓ بن ربیع کے مکان میں پہنچ کر انہیں بھی اس خط کے مضمون کے سلسلے میں اپنا ہم راز بنایا لیکن ساتھ ہی انہیں بھی ہدایت کی کہ خط کا مضمون معرضِ اخفا میں رہے لیکن حضرت سعدؓ بن ربیع کی زوجہ گھر میں موجود تھیں اور یہ باتیں سن رہی تھیں، اس لیے یہ راز مخفی نہ رہ سکا۔ آنحضرت ﷺ نے فضالہ کے فرزندوں انس رضی اللہ عنہ اور مونس رضی اللہ عنہ کو اس خدمت پر مامور کیا کہ وہ قریش کی نقل و حرکت سے مطلع کریں۔ انسؓ اور مونسؓ نے لشکر

قریش کو مدینہ سے باہر خیمہ زن پایا۔ لشکریوں نے اونٹوں اور گھوڑوں کو کھیتوں میں چرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے حضرت حبابؓ بن منذر کو لشکر قریش سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ حضرت حبابؓ نے واپسی پر جو کچھ بیان کیا اس میں اور عباسؓ کے مضمون میں مطابقت تھی اس لیے آنحضرت ﷺ کو حیرت ہوئی۔ حضرت حبابؓ کے بعد حضرت سلمہؓ بن سلامہ لشکر قریش کے تجسس میں پہنچے۔ انہوں نے قریش کے ہراول کو دیکھا کہ مدینہ کے قریب آ پہنچا ہے اور قریب ہے کہ بستی میں داخل ہوجائے۔ یہ دیکھ کر وہ فوراً واپس آئے اور انہوں نے جو کچھ دیکھا تھا، اس سے مسلمانوں کو مطلع کیا۔ اوس و خزرج کے قبائل اور دوسرے اہل مدینہ ہونے والی جنگ کے انجام سے خائف تھے، اس لیے کہ قریش نے جنگ کی تیاری پر اپنی پوری قوت اور اپنا پورا سرمایہ صرف کر دیا تھا۔ مسلمانوں کی ایک مسلح جماعت اس اندیشے سے کہ مبادا قریش آنحضرت ﷺ کی آرام گاہ پر حملہ کردیں اس رات مسجد میں رہی اور بستی کے لوگ بھی ہوشیار اور بیدار رہے۔ صبح کے وقت نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو اور ان لوگوں کو جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے طلب کیا اور ان سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ کس نوعیت اور کس صورت سے کرنا چاہیے؟

محاذِ جنگ کے سلسلے میں اختلاف

آنحضرت ﷺ کی یہ رائے تھی کہ مدینہ میں محصور وقلعہ بند ہوکر دشمن کا مقابلہ کیا جائے کیونکہ اس صورت میں حملہ آوروں کو پسپا کیا جاسکے گا عبداللہ بن ابی نے اس رائے کی تائید کرتے ہوئے عرض کیا کہ ہم ہمیشہ مدینہ میں محصور ہوکر جنگ کرتے رہے ہیں۔ عورتوں اور لڑکوں کو چھتوں پر بٹھا دیتے اور ان کے پاس سنگریزے جمع کر دیتے اور فصیل کو مستحکم کر دیتے تھے تاکہ قلعے کا کام دے۔ اگر دشمن حملہ آور ہوتا تو اوپر سے عورتیں اور لڑکے سنگباری کرتے تھے اور گلیوں میں نوجوان تلواروں کے جوہر دکھاتے تھے۔ آج تک کوئی دشمن مدینہ کی حدود میں داخل نہیں ہوسکا اور جو کوئی اس ارادے سے آیا مغلوب ہوا لیکن جب بھی ہم دشمن کے مقابلے کے لیے باہر نکلے تو ضرور ہم نے شکست کھائی۔ اس لیے مناسب ہے کہ آپ میری بات پر عمل کریں۔ میں نے قوم کے بزرگوں اور تجربہ کار لوگوں سے یہ باتیں سنی ہیں۔

اکابر اسلام عبداللہ بن ابی کی رائے سے متفق تھے لیکن کچھ جوشیلے نوجوان جو غزوۂ بدر میں شریک نہ ہوسکے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہم پر کوئی غالب نہیں آسکتا، ان کی رائے تھی کہ مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ دشمن کو یہ گمان نہ ہونا چاہیے کہ ہم ڈر کے مارے مدینہ کی حدود سے باہر نہیں نکلتے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ غزوۂ بدر کی نسبت ہماری طاقت کہیں زیادہ ہے کیونکہ وہ غزوہ (بدر) مدینہ سے فاصلے پر وقوع پذیر ہوا تھا اور اس موقع پر اہل مدینہ اپنے گھروں کی مدد نہیں کرسکے تھے۔
ان میں سے ایک نوجوان نے یہ بھی کہا، میں اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا کہ قریش واپس جا کر اپنے لوگوں سے کہیں کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کو مدینہ میں محصور کرلیا تھا۔ اس طرح قریش ہم پر دلیر ہوجائیں گے۔ قریش

Marfat.com

ایک سال کی جنگی تیاریوں کے بعد یہاں آئے ہیں۔ ہمارے لیے یہ مناسب نہیں کہ گھروں میں بیٹھے رہیں اور قریش صحیح سالم چوٹ کھائے بغیر واپس چلے جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو قریش کے حوصلے بڑھ جائیں گے اور وہ جب چاہیں گے ہم پر چڑھ دوڑیں گے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ ہم پر ہماری راہیں مسدود کر دیں گے۔ مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کے حامی یہ بھی کہتے تھے کہ اگر خدا نے ہمیں فتح عطا کی تو ہم اپنی مراد کو پہنچیں گے اور شکست کھا کر مارے گئے تو بہشت میں جگہ پائیں گے۔

شجاعت و شہادت کی باتوں سے بے پناہ جوش و خروش کا ایک سیلاب امڈا پڑتا تھا۔ لوگوں کے دلوں میں غیرتِ قومی اور حمیت دینی کے غیر متزلزل جذبات لہریں لے رہے تھے۔ ان کے قلبی رجحانات نے جو دراصل ایمان اور خود اعتمادی کا ماحصل تھے دوسروں پر بھی پرتو ڈالا تھا۔ سب پر ایک ہیجان کی سی کیفیت طاری تھی اور ان کی زبان پر یہی صدا تھی کہ میدان میں نکل کر دشمن کے دانت کھٹے کر دینے چاہئیں۔ اس وقت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جو صحابہؓ حاضر تھے ان کے دل و دماغ ایمان و اذعان سے معمور تھے اور ان کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ ہم دشمن پر ضرور فتح پائیں گے، ہمیں مالِ غنیمت ملے گا، دشمن کے سپاہی ہماری حراست میں آئیں گے اور اگر یہ سب کچھ نہیں ہوگا تو بہشت ہمیں نصیب ہوگی جہاں ہمیں ہر وہ چیز دستیاب ہوگی جسے ہمارا دل چاہے گا۔ وہاں ہم دوستوں کی ہم نشینی کا لطف اٹھائیں گے اور کوئی ایسی بات سننے میں نہیں آئے گی جس سے ہمارے دل کو صدمہ پہنچے۔ ایک نے کہا: "امید ہے خدا ہمیں فتح عطا کرے گا اور اگر یہ نہیں تو شہادت تو کہیں نہیں گئی۔ میں پورے ذوق و شوق کے باوجود غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ میں نے اپنے فرزند کے نام کے ساتھ قرعہ ڈالا تھا۔ قرعہ اس کے نام پر نکلا اور اس نے شرکت غزوہ کے بعد جام شہادت نوش کیا۔ کل رات میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ بہشت میں ہے اور مجھ سے کہتا ہے "آیئے اور ہمارے گروہ میں شامل ہو جایئے، خدا نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا، پورا کر دیا ہے" چنانچہ میرے شوق کا تقاضا ہے کہ میں جلد از جلد اپنے بیٹے سے جا ملوں۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میرے اعضا ڈھیلے اور ہڈیاں نرم پڑ گئی۔ ہمیں اب تو لے دے کے یہ تمنا ہے کہ جوارِ رحمت میں تھوڑی سے جگہ مل جائے۔"

جب یہ اندازہ ہو گیا کہ مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے والوں کی اکثریت ہے تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مجھے یہ خوف ہے کہ تمہیں کہیں شکست نہ ہو جائے۔" لیکن اس کے باوجود اکثریت کے عزائم میں فرق نہ آیا چنانچہ آپ نے بہ امر مجبوری رائے عامہ پر اتفاق کیا اور اس کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا کیونکہ جب تک وحی نازل نہ ہو کوئی قدم مشورے کے بغیر اٹھایا نہیں جا سکتا تھا۔ جمعہ کا دن تھا آنحضرت ﷺ نے نماز جمعہ مسلمانوں کے ساتھ ادا کی اور یہ فرمایا کہ اگر تم صبر و تحمل سے کام لو گے تو فتح ہی فتح ہے۔ بعد ازاں آپ ﷺ نے حکم دیا کہ دشمن کے مقابلے کے لیے تیاریاں کی جائیں۔ نمازِ عصر کے بعد آپ ﷺ حجرۂ اقدس میں تشریف لے گئے۔ زرہ پہنی اور شمشیر پہلو سے لٹکائی۔ اس اثنا میں مسلمانوں کے مابین پھر وہی بحث چھڑ گئی۔

Marfat.com

حضرت سعدؓ بن معاذ نے جو مدینہ کی حدود میں رہ کر لڑنے کے حامی تھے، دوسری جماعت سے خطاب کیا:

''تم لوگوں نے یہ جاننے کے باوجود کہ آنحضرت ﷺ قلعہ بند جنگ کی حمایت میں ہیں مدینہ کی حدود سے باہر نکل کر لڑنے پر اصرار کیا بہر حال اب بھی موقع ہے معاملہ خود آپ ﷺ کی رائے پر چھوڑ دینا چاہیے وہ جیسے چاہیں کریں اور جو حکم چاہیں دیں ہمیں ہر حال میں ان کے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے۔''

کھلے میدان میں مقابلہ کے جو لوگ حامی تھے ان کی آنکھیں بھی کھلیں اور انہیں یہ احساس ہوا کہ ہم نے آنحضرت ﷺ کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ بہت ممکن ہے اس بارے میں کسی آیت کا نزول ہوا ہو۔ اس احساس سے ان کے ابھرے ہوئے جذبات پر اوس پڑ گئی۔ جب آنحضرت ﷺ واپس تشریف لائے تو ان لوگوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضری دی اور عرض کیا، ہمیں آپ ﷺ کی رائے سے اختلاف کا حق نہ تھا، جو کچھ ہوا سو ہوا، اب آپ ﷺ اپنی رائے اور اپنی مرضی کے مطابق عمل فرمائیں۔ ہم اپنے اصرار اور اپنی رائے سے رجوع کرتے ہیں۔ فیصلہ کن معاملات کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں ہے یا اس کے بعد آپ کے ہاتھوں میں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''میں نے پہلے جو رائے ظاہر کی تھی اس سے تم نے اتفاق نہیں کیا لیکن اب زرہ پہننے کے بعد بہ حیثیت پیغمبر مجھے یہ بات زیب نہیں دیتی کہ میں ارادہ بدلوں یہاں تک کہ خدا اس کے اور دشمنوں کے درمیان کوئی فیصلہ نہ کر دے۔ اب میرے حکم کا انتظار کرو اور اس پر عمل پیرا ہو۔ صبر و تحمل سے کام لیا تو فتح پاؤ گے۔'' غرض باہمی مشورے سے نبی کریم ﷺ نے لشکر کو ترتیب دیا۔ یہ لشکر آپ کی قیادت میں مدینہ سے باہر نکلا اور احد کی سمت کوچ کرتا ہوا مقام شیخان تک جا پہنچا۔ وہاں ایک اور جماعت ملی جس کے افراد سے روشناسی نہ تھی۔ تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ یہ یہودیوں کی ایک جماعت ہے اور عبداللہ بن ابی سے معاہدہ کی بنا پر مسلمانوں کی امداد کے لئے آئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مشرکین کے مقابلہ کے لیے مشرکین کی مدد قبول نہیں کی جاسکتی ہاں اس کا امکان اس صورت میں ہے کہ یہ مشرکین حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں۔ یہ سن کر یہودیوں نے مدینہ کی راہ لی اور ابن ابی سے کہا: ''تم نے (حضرت) محمد (ﷺ) کو مشورہ دیا، اپنے بزرگوں کی روش سے بھی انہیں مطلع کیا اور درآں حالیکہ وہ خود بھی یہ چاہتے تھے لیکن انہوں نے تمہارے مشورہ پر عمل نہیں کیا اور اس کے برخلاف ناتجربہ کار نوجوانوں کی بات مان لی۔'' ان باتوں میں آ کر یا سوچی سمجھی سازش کے ماتحت ابن ابی بھی یہودیوں کے ہمراہ لوٹ آیا۔ رسول کریم ﷺ نے سات سو مسلمانوں کی جمعیت کے ہمراہ میدان جنگ کی جانب پیش قدمی فرمائی۔

فریقین کی صف آرائی

مسلمانوں نے احد کے مقام پر پڑاؤ ڈالا اور اپنی فوج کو اس انداز سے ترتیب دیا کہ عقب میں پہاڑ

Marfat.com

پڑتا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے پچاس تیر اندازوں کو ایک درہ پر مامور کیا اور ہدایت کی کہ وہ یہاں سے قدم نہ ہٹائیں۔ ان کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ عقب سے دشمن حملہ آور ہونے نہ پائے لیکن کسی قیمت پر خواہ ہم دشمن کو شکست دے کر اس کے خیموں تک بھی پہنچ جائیں انہیں یہ مقام نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگر تم یہ دیکھو کہ دشمن کے حملہ سے ہمیں نقصان پہنچ رہا ہے تو ہماری مدد کرنا اور وہ اس صورت میں کہ اس پر اتنے تیر برسانا کہ اسے ہمارے نزدیک آنے کی جرأت نہ ہو۔ بعدازاں آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ جب تک میں حکم نہ دوں جنگ کا آغاز نہ کرنا۔

ادھر قریش نے اپنی صف بندی کی تھی۔ عورتیں دف بجاتی ہوئی ان کے حلقوں سے گزرتی تھیں۔ ابوسفیان کی بیوی ہندان کی رہنمائی کر رہی تھی۔ عورتوں کی یہ ٹولی کبھی صفوں کے آگے اور کبھی پیچھے گشت کرتی، مردوں کو دلیرانہ جنگ کی ترغیب دیتی، ولولہ انگیز اشعار گاتی اور یہ کہتی تھی کہ اگر تم نے دشمن کو تہ تیغ کیا تو ہماری آغوش میں تمہیں جگہ ملے گی۔ ہم تمہارے لیے فرشِ مخمل بچھائیں گی اور اگر تم نے دشمن کو پیٹھ دکھائی اور اس کے مقابلے میں راہ فرار اختیار کی تو ہم سے تمہارا کوئی واسطہ نہ ہوگا۔

غرض دونوں لشکر جنگ کے لیے آمادہ ہو گئے۔ قریش مقتولین بدر کے نام لے لے کر اپنے ساتھیوں کے جذبات برانگیختہ کرتے تھے اور مسلمانوں کی نظر خدا کی تائید اور اس کی نصرت پر تھی نبی کریم ﷺ نے واضح الفاظ میں یہ ارشاد فرما دیا تھا کہ ''اگر تم نے ثابت قدمی سے دشمن کا مقابلہ کیا تو فتح یقینی ہے۔''

حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کا اعزاز

نبی کریم ﷺ نے لشکر اسلام کی صفوں میں گشت کرتے اور ان کی ترتیب کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی شمشیر کی جانب اشارہ کیا اور یہ فرمایا: ''کون ہے جو یہ شمشیر لے اور پھر اس کا حق بھی ادا کرے؟'' چند نوجوان شمشیر لینے کے لیے آگے بڑھے لیکن آپ ﷺ نے ان میں سے کسی کو یہ شمشیر نہیں دی۔ آخر حضرت ابودجانہؓ نے دریافت کیا: ''اس شمشیر کا حق کیا ہے؟ اور اس کی ادائی کی کیا صورت ہے؟'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''یہ شمشیر دشمن پر اس بے پناہی کے ساتھ برسے کہ اس میں خم آ جائے۔''

حضرت ابودجانہؓ نے رسول کریم ﷺ کے ہاتھ سے شمشیر لے لی۔ ابودجانہؓ نہایت بہادر مرد تھے۔ ہر وقت ایک سرخ پٹی ان کے سر سے بندھی رہتی تھی اور وہ اسے موت کا نشان قرار دیتے تھے۔ پٹی کے رنگ کی سرخی اس امر کی دلیل تھی کہ یہ جس کے سر سے بندھی ہے وہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک جنگ میں بہا دے گا۔ حضرت ابودجانہؓ بصد ناز و انداز اپنے لشکر کی صفوں کے سامنے سے گزرے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کو یہ بانکی چال چلتے دیکھا تو فرمایا: ''یہ وہ چال ہے کہ خدا اس موقع کے سوا اور کسی مقام پر اسے پسند نہیں کرتا۔''

پہلا شخص جس نے جنگ کا آغاز کیا ابو عامر اوسی تھا (یہ شخص قریش کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے

Marfat.com

مدینہ سے مکہ پہنچا تھا)۔ اس کے ساتھ قبیلہ اوس کے پندرہ اشخاص بھی تھے۔ ابو عامر اوسی کا یہ خیال تھا کہ قبیلہ اوس کے جو لوگ مسلمانوں کے ساتھ ہیں میرے ایک اشارہ پر قریش سے آملیں گے چنانچہ اس نے آواز دی، اوسیو! میں ابو عامر اوسی ہوں! مسلمانوں نے جواب دیا: "او بدکار! خدا کرے تجھے کبھی خوشی نصیب نہ ہو!"

اب جنگ شروع ہوگئی۔ قریش کی ایک جمعیت نے عکرمہ بن ابو جہل کی کمان میں مسلمانوں پر حملہ کیا لیکن مسلمانوں نے اس زور کی سنگباری کی کہ حملہ آور قدم پیچھے ہٹانے پر مجبور ہو گئے۔ اس اثنا میں حضرت حمزہؓ نے نعرہ بلند کیا اور بلاخوف وخطر دشمن کی فوج کے قلب پر حملہ کر دیا۔ ادھر سے قریش کا علمدار طلحہ نعرے لگاتا ہوا مبارزت طلب ہوا۔ حضرت علیؓ اس کے مقابلے کے لیے بڑھے، ساتھ ہی فریقین کی صفیں ایک دوسرے کی جانب بڑھنے لگیں۔ حضرت علیؓ نے بڑھ کر تلوار کا ایک ہی وار اس انداز سے کیا کہ طلحہ کے سر کی تربوز کی سی دو قاشیں ہو گئیں۔ آنحضرت ﷺ اس ضربِ حیدری سے بے حد مسرور ہوئے اور آپ نے نعرہ بلند کیا۔ مسلمانوں نے بھی آپ کی ہم نوائی میں نعرہ تکبیر بلند کیا اور ایک بے پناہ جذبے سے دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت ابو دجانہؓ سرخ پٹی سر سے باندھے ہوئے جدھر سے بھی گزرتے کشتوں کے پشتے لگا دیتے یہاں تک کہ دشمن کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ اسی اثنا میں حضرت ابو دجانہؓ نے دیکھا کہ لشکر قریش کا ایک سپاہی مسلمانوں پر بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا ہے۔ آپ شمشیر بکف اس کی طرف جھپٹے تو وہ عورتوں کی طرح چیخنے چلانے لگا۔ حضرت ابو دجانہؓ نے غور سے دیکھا تو وہ ابوسفیان کی بیوی ہند تھی۔ آپ نے اس سے منہ پھیر لیا اور رسول اللہ ﷺ کی شمشیر کو عورت کے خون سے رنگین کرنا گوارا نہ کیا (اگر ایسا کرتے تو شمشیر کی توہین ہوتی)۔

قریش، مقتولین بدر کا انتقام لینے کی خاطر بڑی شدت وحدت کے ساتھ نبرد آزما تھے۔ دونوں فوجوں کے مقاصد جداگانہ تھے۔ ایک فوج جو تعداد میں کہیں زیادہ تھی جذبہ انتقام کی تسکین کے لیے سردھڑ کی بازی لگا رہی تھی اور دوسری فوج جس کی تعداد کہیں کم تھی اپنے ایمان اور وطن کی حفاظت کی خاطر دادِ شجاعت دے رہی تھی۔ قریش کے لشکر کے پیچھے عورتوں کی صفیں تھیں جو مردوں کو غزوۂ بدر کے انتقام پر ابھار رہی تھیں۔ یہ عورتیں جس شخص کو مسلمانوں کے مقابلے کے لیے بھیجتی تھیں اس سے وعدہ کرتی تھیں کہ اگر تم نے ہمارے رشتہ داروں کے قاتلوں سے انتقام لے لیا تو تمہیں اتنا کچھ ملے گا کہ تم مالا مال ہو جاؤ گے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر میں ہند کے باپ عتبہ اور دوسرے عزیزوں کو تہ تیغ کیا تھا۔ میدانِ احد میں آپ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح بڑی قیامت سامانی کے ساتھ دشمنوں کا خون بہا رہے تھے۔ ادھر ہند نے ایک حبشی غلام وحشی سے یہ بات طے کر لی تھی کہ اگر تو نے (حضرت) حمزہ رضی اللہ عنہ کو ہلاک کر دیا تو تجھے نہال کر دوں گی۔ اس حبشی غلام کے آقا جبیر بن مطعم (اس کا چچا غزوۂ بدر میں کام آیا تھا) نے اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر تو حمزہؓ کے قتل میں کامیاب ہو گیا تو میں تجھے آزاد کر دوں گا۔

Marfat.com

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت

اس وحشی کا بیان ہے کہ میں لشکر قریش سے نکلا اور حبشیوں کے طور وطریق کے مطابق نیزے کو جنبش دینے لگا۔ میرے نیزے کا وار بہت کم خطا کرتا تھا۔ مسلمانوں کی صفوں کے قریب پہنچ کر میں نے (حضرت) حمزہ رضی اللہ عنہ کو تلاش کیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک جگہ قریش کے نوجوانوں سے مصروف پیکار ہیں۔ میں نے برچھی پھینک کر ماری جوان کی کمر سے گزر کر ٹانگوں کے درمیان نکل آئی۔ (حضرت) حمزہؓ اس کاری ضرب کی تاب نہ لا سکے اور انہوں نے جان دے دی۔ جب میں نے دیکھا کہ میری مراد حاصل ہوگئی ہے تو میں نے برچھی نکال لی اور لشکر قریش کے خیموں میں چلا آیا کیونکہ جو کام مجھ سے متعلق تھا میں انجام دے چکا تھا۔ مکہ پہنچنے کے بعد مجھے آزادی بھی مل گئی۔

وطن کی مدافعت میں ایک منافق کی جنگ

لشکر اسلام میں کچھ لوگ ایسے بھی شامل تھے جو اپنے اہل وعیال اور مال ومنال کی حفاظت کے لیے جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ انہی لوگوں میں ایک شخص قزمان نامی بھی تھا۔ یہ شخص منافق تھا۔ جس دن لشکر اسلام احد کی جانب روانہ ہوا ہے، قزمان مدینہ میں تھا اور اس کا ارادہ جنگ میں شرکت کا نہ تھا۔ بنی ظفر کی عورتوں نے اسے طعنہ دیا کہ تیرے عزیز تو میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دینے کے لیے پہنچ گئے ہیں اور تو عورتوں کی طرح گھر میں گھس کر بیٹھ گیا ہے۔ قزمان کی دلیری کے افسانے زبان زد عام تھے۔ وہ عورتوں کے اس طعنہ کو برداشت نہ کر سکا اور کمان، ترکش اور تلوار سنبھال کر احد جا پہنچا۔ میدانِ جنگ میں قزمان اس وقت پہنچا جب آنحضرت ﷺ صف بندی فرمارہے تھے۔ قزمان پہلی صف میں جا کھڑا ہوا اور یہی وہ پہلا شخص تھا جس نے لشکر اسلام کی جانب سے تیر پھینکا تھا۔ اس کے تیر نیزے کا سا اثر رکھتے تھے۔ شام کے وقت جب لشکر اسلام کو شکست ہوئی تو قزمان نے لشکر قریش کے سات سپاہیوں کو یکے بعد دیگرے ہلاک کیا اور یہ تعداد ان کے علاوہ ہے جنہیں وہ آغازِ جنگ میں ہلاک کر چکا تھا۔ جب اس پر جانکنی کا عالم طاری تھا تو ابوغیداق کا اس کے قریب سے گزر ہوا۔ اس نے قزمان کو شہادت پر مبارکباد دی۔ قزمان نے کہا۔ "خدا کی قسم! میں نے دین کے لیے جنگ نہیں کی تھی۔ میں تو محض اس لیے جنگ میں شامل ہوا تھا کہ قریش ہم پر غالب نہ آجائیں، اگر یہ خیال نہ ہوتا تو میں جنگ میں کبھی شریک نہ ہوتا۔"

مسلمانوں کا عزم واستقلال

لشکر اسلام میں جس کی تعداد سات سو سے زیادہ نہ تھی، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ ایسے جانباز، جاں نثار اور مخلص مجاہدین بھی تھے جن کی شجاعت وبسالت نے قریش کی صفیں چیر کر رکھ دی تھیں اور جن کے عزم واستقلال نے جمعیت کفر کا شیرازہ کچھ ایسا منتشر کر دیا تھا کہ اس کے اجزا کی

Marfat.com

یکجائی دشوار ہو گئی تھی۔ لشکر قریش میں مسلمانوں کی بے پناہ تیغ زنی سے بدحواسی پھیل گئی تھی۔ ان کے نو علم دار یکے بعد دیگرے کھیت ہوئے تھے۔ جس نے بھی علم داری کی جرأت کی وہی تہ تیغ ہوا۔ مختصر یہ ہے کہ مشرکین مکہ کے پاؤں اکھڑ گئے تھے۔ ان کی عورتیں حصار میں لے لی گئی تھیں اور جس بت کو وہ برکت و سعادت کے لیے اپنے ساتھ لائے تھے وہ بھی منہ کے بل اوندھا زمین پر پڑا ہوا تھا۔ میدانِ احد میں لشکر اسلام کی فتح ہوئی۔

بعض مؤرخین اس بے مثال فتح کو نبی کریم ﷺ کی دقت نظر اور آپ کی پیغمبرانہ بصیرت سے منسوب کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے تمام امور کا جائزہ پہلے ہی لے لیا تھا اور پہلے ہی تیر اندازوں کا ایک دستہ پہاڑ کی گھاٹی پر متعین کر دیا تھا تاکہ عقب سے دشمن کو حملہ آوری سے روکے۔ مؤرخین کی اس رائے کی صحت میں کلام نہیں لیکن اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو اپنے سے پانچ گنی فوج کے مقابلہ میں جو فتح نصیب ہوئی اس میں قائدانہ کمال کے علاوہ روحانی طاقت اور ایمانی قوت کو بھی دخل تھا کیونکہ جس شخص کے دل میں عزم و یقین کی قوت ہوتی ہے وہ مادی قوت کی کثرت سے ہرگز مرعوب نہیں ہوتا اگر دنیا کی تمام مادی قوتیں بھی اس کے خلاف ایک مرکز پر سمٹ آئیں تو اس کے عزم کی دیوار متزلزل نہیں ہو سکتی۔ بے نظیر سپہ سالاری اور جنگی مہارت ہی فتح کے لیے کافی نہ تھی۔ تیر اندازوں کا وہ دستہ جسے گھاٹی پر متعین کیا گیا تھا صرف پچاس اشخاص پر مشتمل تھا۔ اگر دشمن کے تین سو سپاہی اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اس طرف بڑھنے کی کوشش کرتے تو اس دستہ پر وہ یقیناً غالب آ سکتے تھے لیکن ایمان ہی وہ طاقت ہے جو کسی صاحب ایمان کو مغلوب ہونے نہیں دیتی۔ یہی سبب تھا کہ قریش کے تین ہزار سپاہیوں نے صرف سات سو مسلمانوں سے شکست کھائی اور قریب تھا کہ ان کی عورتیں بھی گرفتار ہو جاتیں۔ مسلمانوں نے تعاقب کے بعد قریش کو دور تک بھگا دیا تھا اور اس کے بعد وہ مالِ غنیمت جمع کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ مال و زر کی طمع نے انہیں دور تک دشمنوں کا تعاقب کرنے نہیں دیا۔

فتح کے بعد شکست

تیر اندازوں کے اس دستے نے جو آنحضرت ﷺ کی ہدایت کے بموجب گھاٹی پر حفاظت کے لیے متعین تھا جب یہ دیکھا کہ دوسرے مسلمان مالِ غنیمت جمع کر رہے ہیں تو آپس میں ایک دوسرے سے کہا: ''ہم یہاں بے فائدہ کیوں کھڑے رہیں، خدا نے دشمنوں کو شکست دے دی ہے اور ہمارے رفقا ان کے خیمے لوٹ رہے ہیں۔ ہم بھی چلیں اور مالِ غنیمت جمع کرنے میں شریک ہو جائیں۔'' ان میں سے ایک نے کہا: ''نبی کریم ﷺ کا حکم تو یہ ہے کہ اپنی جگہ سے نہ ہلنا اور ہم پر اس طرف سے حملہ ہو تو اس کی روک تھام کرنا۔'' دوسرے نے اس پر یہ جواب دیا کہ ''اس فرمان سے یہ مقصود ہرگز نہیں کہ ہم دشمن کی شکست اور پامالی کے بعد بھی اپنی جگہ جمع رہیں۔'' اس بات پر اختلاف رائے ہو گیا۔ ان کے سردار عبداللہ بن جبیرؓ نے کہا: ''نبی کریم ﷺ کے فرمان کی مخالفت ہمیں کسی صورت میں بھی نہیں کرنی چاہیے۔'' لیکن ان لوگوں نے اس کی پروا

Marfat.com

نہ کی اور مالِ غنیمت کی طمع ان کو کشاں کشاں میدان کی طرف لے گئی۔ جو لوگ گھاٹی پر رہ گئے تھے ان کی تعداد دس سے زیادہ نہ تھی۔

اس اثنا میں مکہ کے سواروں کا ایک تازہ دم دستہ خالد بن ولید کی سرکردگی میں باقی ماندہ تیراندازوں پر حملہ آور ہوا۔ مٹھی بھر مسلمان اس ناگہانی حملے کی تاب نہ لا سکے۔ خالد نے آگے بڑھ کر نعرہ لگایا جس سے مقصود قریش کو اس بات سے مطلع کرنا تھا کہ ہمارے سپاہی لشکر اسلام کے عقب میں پہنچ گئے ہیں۔ اس سے قریش کی شکست خوردہ فوج میں پھر جان پڑ گئی اور اس نے پھر پورے عزم سے میدان کا رخ کیا۔ مسلمانوں کو کچھ خبر نہ تھی۔ وہ تو مالِ غنیمت جمع کرنے میں مصروف تھے۔ ان کی صفیں ٹوٹ چکی تھیں اور کوئی ترتیب یا نظم وغیرہ بھی نہ تھا۔ قریش کے لوٹ آنے سے میدان جنگ کا نقشہ دگرگوں ہو گیا۔ مسلمانوں کی فتح شکست میں تبدیل ہو گئی۔ پہلے وہ تحفظ ایمان کی خاطر لڑ رہے تھے لیکن اب انہیں اپنی جان کی حفاظت کے لیے تلواریں سنبھالنی پڑیں۔ قریش کا شکست خوردہ لشکر ایک امنڈتے ہوئے سیلاب کی طرح بڑھا مسلمان اس ہجوم میں گم ہو گئے۔ عجلت میں تلواریں سنبھال کر حملہ آوروں کی روک تھام کی کوشش کی لیکن اب حالات قابو سے باہر ہو گئے تھے۔ معاملہ کچھ اتنا نازک ہو چکا تھا کہ دوست اور دشمن کے درمیان تمیز نہ رہی تھی۔ اسی دوران میں کسی نے شرارت سے چلا کر کہا (حضرت) محمد (ﷺ) ہلاک کیے گئے۔ اس سے مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے اور وہ بدحواسی میں ایک دوسرے پر وار کرنے لگے۔ حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ مسلمان تھے لیکن غلطی سے آپ کسی مسلمان کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ مسلمانوں کو لینے کے دینے پڑ گئے البتہ حضرت علیؓ ایسے مقتدر صحابہ کو اللہ تعالیٰ نے لغزش سے محفوظ رکھا۔

مسلمانوں کی جانفشانی

قریش نبی کریم ﷺ کی ہلاکت کی خبر سن کر ہر چہار طرف سے سمٹ آئے۔ ان کی ناپاک خواہش یہ تھی کہ نبی کریم ﷺ کے اعضا کی قطع و برید (نعوذ باللہ) میں برابر کے شریک ہوں اور ایک دوسرے پر فخر کر سکیں (کہ ہم نے یہ نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے)۔ اس اثنا میں وہ مسلمان بھی جو قریب تھے آنحضرت ﷺ کی حفاظت کے لیے جمع ہو گئے۔ ان کی ایمانی طاقت پھر جوش میں آئی۔ موت بے حقیقت سی نظر آنے لگی اور زندگی ان کی نگاہوں میں بے معنی ہو کر رہ گئی۔ اس دوران میں عتبہ بن ابی وقاص نے ایک پتھر پھینک کر مارا جو آنحضرت ﷺ کے چہرۂ اقدس پر اس زور سے لگا کہ خود کی دو کڑیاں جلد میں پیوست ہو گئیں اور آپ کے دو دندانِ مبارک بھی شہید ہو گئے۔ ہونٹوں پر بھی ضرب آئی۔ اس کے باوجود آپ ﷺ سنبھلے رہے اور اپنے اصحاب کے ہمراہ ہو لیے۔ دشمنوں نے ایک گڑھا کھود کر اسے خاروخس سے پاٹ دیا تھا۔ جب اس طرف سے آپ ﷺ گزرے تو اس میں گر پڑے۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ نے آپ کو سہارا دے کر گڑھے سے نکالا۔ غرض آنحضرت ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کی معیت میں پہاڑ

پر چڑھے تا کہ دشمن آپ کا تعاقب نہ کر سکیں۔

حضرت ام عمارہ انصاریؓ اسی روز صبح کو مدینہ سے پانی کا ایک مشکیزہ ساتھ لے کر میدان جنگ میں آئی تھیں اور مسلمانوں کو پانی پلاتی پھرتی تھیں۔ جب مسلمانوں کو شکست ہوئی تو انہوں نے مشکیزہ پھینک کر تلوار اٹھالی اور رسول کریم ﷺ کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہوگئیں۔ تیر بھی پھینکتی تھیں اور تلوار بھی چلاتی تھیں یہاں تک کہ زخم خوردہ ہو کر گر گئیں۔ حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ بھی ڈھال بنے ہوئے تھے۔ جو تیر آپ ﷺ کی طرف آتا تھا۔ اس کا نشانہ ان کا جسم بنتا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے پہلو میں کھڑے تھے اور دشمنوں پر تیر برسا رہے تھے۔ رسول کریم ﷺ خود اپنے ترکش سے انہیں تیر دیتے جاتے اور فرماتے کہ چلاؤ، چلاتے رہو۔ ان سے پیشتر رسول کریم ﷺ خود تیر چلا رہے تھے تا آنکہ آپ ﷺ کی کمان ٹوٹ گئی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ کی ہلاکت کا یقین ہو گیا تھا اور وہ پہاڑ کے ایک گوشے میں جا بیٹھے تھے۔ حضرت انسؓ بن نضر نے انہیں دیکھا اور دریافت کیا کہ آپ یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ آنحضرت ﷺ شہید ہو چکے ہیں۔ حضرت انسؓ نے کہا: ''تو پھر آپ ﷺ کے بعد جی کر کیا لو گے! اٹھو اور لڑ کر جان دے دو۔'' حضرت انسؓ بن نضر نے قریش پر حملہ کیا اور یہاں تک لڑے کہ جسم زخموں سے چور چور ہو گیا۔ ان کی نعش پر ستر زخموں کے نشان گنے گئے۔ انہیں پہچاننا دشوار ہو گیا تھا۔ ان کی بہن نے انگلیوں کی نشانی سے انہیں شناخت کیا۔

قریش یہ جان کر بہت شادمان تھے کہ نبی کریم ﷺ بھی جاں بحق ہو گئے ہیں۔ ابوسفیان، مقتولین میں آپ کو تلاش کرنے چلا۔ نبی کریم ﷺ کی حفاظت جو صحابہ رضی اللہ عنہم کر رہے تھے وہ ہلاکت کی غلط افواہ کی تردید اس لیے نہیں کرتے تھے کہ کہیں قریش آپ ﷺ پر حملہ نہ کر دیں۔ اس اثنا میں حضرت کعبؓ بن مالک اس مقام پر آ نکلے جہاں حضرت ابو دجانہؓ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم آنحضرت ﷺ کی حفاظت کر رہے تھے۔ سید العرب والعجم سر پر خود پہنے ہوئے تھے تاہم حضرت کعبؓ نے آپ کو پہچان لیا اور پکار کر بآوازِ بلند کہا:

''مسلمانو! خوش خبری ہو کہ نبی کریم ﷺ یہاں موجود ہیں۔''

سید الکونین ﷺ نے اشارہ سے حضرت کعب رضی اللہ عنہ کو اعلان سے منع کیا تاہم مسلمانوں نے حضرت کعبؓ کی بات سن لی تھی۔ سب اس مقام کی جانب سمٹ آئے اور آنحضرت ﷺ کو پہاڑ پر لے گئے۔ حضرت کعبؓ کا اعلان قریش نے بھی سن لیا تھا۔ ان میں سے بعض کو گمان تھا کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی کی خبر صرف مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کے لیے اڑائی گئی ہے لیکن قریش کی ایک جماعت نے رسول مقبول ﷺ اور ان کے رفقا پر حملہ کر دیا۔ ابی ابن خلف نے آگے بڑھ کر کہا (حضرت) محمد (ﷺ) کہاں ہیں؟ اگر وہ زندہ رہیں تو میں زندہ نہیں رہوں گا۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت حارثؓ بن خشیمہ کے نیزے سے ابی پر وار کیا۔ ابی گھوڑے سے گر پڑا لیکن پھر سوار ہو کر جس راہ سے آیا تھا اسی سے واپس چلا گیا اور مکہ کو لوٹتے ہوئے راستے

Marfat.com

ہی میں اس نے جان دی۔ مسلمان درے کے سرے پر پہنچے تو حضرت علیؓ اپنی ڈھال میں پانی بھر کر لائے جس سے نبی کریم ﷺ نے اپنے چہرہ مبارک سے لتھڑا ہوا خون دھویا اور اپنے سر کے بال درست کیے۔ حضرت ابوعبیدہؓ ابن جراح نے خود کی وہ کڑیاں نکالیں جو آپ ﷺ کے رخسار میں پیوست ہوگئی تھیں۔ اسی اثنا میں خالد بن ولید سواروں کی ایک جماعت لے کر وہاں پہنچے لیکن مسلمانوں نے انہیں قریب نہیں آنے دیا۔ نبی کریم ﷺ اتنے مضمحل اور واماندہ تھے کہ آپ ﷺ نے احد پر نمازِ ظہر بیٹھ کر ادا کی۔ آپ کی معیت میں صحابہؓ نے بھی بیٹھ کر ہی اپنی نمازیں ادا کیں۔

قریش اپنی فتح سے بہت زیادہ آپے سے باہر ہو رہے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ ہم نے مقتولین بدر کا مسلمانوں سے انتقام لے لیا ہے۔ ابوسفیان نے اونچی آواز سے کہا: ”ہم نے بدر کا بدلہ تو جی بھر کے لے لیا ہے اب ہم اگلے سال تم سے نبٹیں گے۔“ ابوسفیان کی بیوی ہند نے اور اس کی دیکھا دیکھی دوسری عورتوں نے شہدائے احد کے اعضا کی قطع و برید شروع کی۔ ہند نے ان اعضائے مقطوعہ سے اپنے گلے کا ہار بنایا۔ اس سنگ دل ہند نے حضرت حمزہ ﷺ کا شکم مبارک چاک کر کے ان کا کلیجہ دانتوں سے چبایا۔ قریش کے مرد عورتوں نے جو بے ہودہ حرکات کیں انہیں دیکھ کر ابوسفیان کو بھی تکدر ہوا۔ اس نے ایک مسلمان سے کہا: ”ہمارے لوگوں نے تمہارے مقتولین کے اعضا کی قطع و برید کی ہے لیکن خدا کی قسم مجھے اس حرکت سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ میں نے اس چیز کا نہ تو کسی کو حکم دیا تھا اور نہ پھر کسی کو اس فعل سے باز رکھا۔“

قریش اپنے مردوں کی تدفین کے بعد واپس چلے گئے۔ ان کے بعد مسلمان اپنے شہدا کے کفن و دفن کے لیے میدان میں آئے۔ نبی کریم ﷺ اپنے چچا حضرت حمزہؓ کی نعش تلاش کرنے لگے۔ جب آپ ﷺ نے نعش اس حال میں دیکھی کہ پیٹ چاک ہے اور اس کے ساتھ اعضا بھی قطع کیے گئے ہیں تو آپ کو اس سے بے حد قلق اور صدمہ ہوا۔ آپ ﷺ نے دعا فرمائی: خدایا پھر کسی ایسی مصیبت سے ہم دوچار نہ ہوں۔ ایسا الم انگیز واقعہ اس سے پہلے کبھی ظہور میں نہ آیا تھا۔ بعدازاں آپ ﷺ نے فرمایا اگر خدا نے ہمیں پھر غالب کیا تو ہم بھی ان کے مقتولین کے اعضا کی قطع و برید اس انداز میں کریں گے کہ عرب میں اس کی نظیر نہیں ملے گی۔ اس باب میں یہ آیت نازل ہوئی:

وَاِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِهٖ‌ ۚ وَلَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَهُوَ خَيۡرٌ لِّلصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۲۶﴾ وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ‌ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ وَلَا تَكُ فِىۡ ضَيۡقٍ مِّمَّا يَمۡكُرُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾ (سورۃ النحل: ۱۲۶، ۱۲۷)

”اور اگر تم کسی کو تکلیف دو تو تمہاری تکلیف بھی ویسی ہی ہو جیسی کہ تمہیں پہنچی ہے اور اگر تم صبر کرو تو صابرین کے لیے یہ بہتر ہے صبر کرو اور تمہارا صبر بھی توفیق الٰہی کے بغیر نہیں۔ ان کے سبب سے غمگین نہ ہو اور ان کے مکر سے تمہارے دلوں میں تنگی نہیں آنی چاہیے۔“

Marfat.com

شہدائے احد کی تدفین

ان آیات شریفہ کے نزول کے بعد نبی کریم ﷺ نے شیوۂ صبر اختیار کیا اور اپنے اصحاب کو یہ حکم دیا کہ وہ مقتولین کے اعضا ہرگز قطع نہ کریں۔ آپ ﷺ نے اپنے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اپنی چادر میں سپردِ خاک کیا۔ نمازِ جنازہ بھی آپ ﷺ نے پڑھی تھی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے بھی نمازِ جنازہ میں شرکت کی اور اپنے بھائی کے لیے پروردگار سے دعائے مغفرت بھی کی۔ دوسرے شہدا کی تدفین بھی کی گئی۔ بعدازاں مسلمانوں نے مدینہ کا رخ کیا۔ غزوۂ احد میں ستر مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا تھا۔

مسلمانوں کو احد میں اپنی شکست کا بے حد ملال تھا۔ مدینہ کے یہودی اور منافق اس شکست سے خوش تھے۔ عبداللہ بن ابی اس عذر سے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کی رائے پر عمل نہیں کیا تھا، اپنے ساتھیوں سمیت مدینہ لوٹ آیا تھا۔ اگر مسلمان احد کی شکست گوارا کر لیتے تو ظاہر تھا کہ مدینہ میں ان کا اقتدار قائم نہ رہتا۔ مخالفین ان پر ہنستے اور آوازے کستے۔ ان حالات میں ضرورت اس امر کی تھی کہ مسلمان ایسا اقدم اٹھائیں گے جس سے شکست کی رسوائی کا داغ دھل جائے اور اس کے ساتھ ہی وہ عظمت بھی بحال ہو جائے جو انہیں بدر میں حاصل ہوئی تھی۔

قریش کا تعاقب

دوسرے ہی دن نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کیا اور ان سے یہ ارشاد فرمایا کہ چلو ہم دشمن کے تعاقب کے لیے چلتے ہیں لیکن ہمارے ہمراہ وہی لوگ چلیں جو غزوۂ احد میں شریک ہو چکے ہیں۔ غرض مسلمان پھر مدینہ سے باہر نکلے۔ آپ ﷺ حمرا الاسد تک پہنچے جو مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس وقت ابوسفیان روحا میں تھا۔ معبد خزاعی جس نے مسلمانوں کو راہ میں دیکھا ابوسفیان کے پاس پہنچا اور یہ اطلاع دی کہ (حضرت) محمد (ﷺ) اور ان کے بے شمار ساتھی تمہارے تعاقب میں ہیں اور ان کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہیں جو غزوۂ احد میں شریک نہ تھے۔ ابوسفیان کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ فتح کے بعد اگر ہم نے راہ فرار اختیار کی تو اس کا اثر کچھ اچھا نہ ہوگا۔ عرب کے لوگ ہمیں برا بھلا کہیں گے۔ اگر مقابلے میں شکست ہوئی تو قریش کو اتنا نقصان پہنچے گا کہ اس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔

خاصے غور وخوض کے بعد آخر ابوسفیان نے بنی عقدالقیس کے چند اشخاص کی زبانی (جو مدینہ کی جانب جا رہے تھے) یہ پیغام بھیجا کہ ابوسفیان مسلمانوں کے دانت کھٹے کرنے کے لیے پھر لوٹ رہا ہے۔ یہ پیغام سننے کے بعد بھی آنحضرت ﷺ اپنے عزم پر قائم رہے اور آپ ﷺ نے حمرا الاسد میں تین دن تک مسلسل قیام کیا۔ لشکر اسلام میں رات بھر آگ روشن رکھی جاتی تھی تا کہ قریش کو معلوم ہو کہ مسلمان مقابلے کے ارادہ سے آئے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

آخر ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور انہوں نے اسی میں خیریت سمجھی کہ ہمیں مکہ واپس ہو جانا چاہیے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی مدینہ واپس آ گئے۔ مسلمانوں کے اس اقدام سے احد کی شکست کا کچھ اثر زائل ہوا تاہم منافقین ہنس ہنس کر مسلمانوں سے کہا کرتے کہ اگر بدر کی فتح (حضرت) محمد (ﷺ) کی نبوت کے اثبات کے لیے ایک برہان تھی تو احد کی شکست کس چیز پر دلالت کرتی ہے؟

ابوسفیان کو یہ خوشی تھی کہ اہل مکہ کی پیشانی سے غزوۂ بدر کی شکست کا داغ مٹ چکا ہے۔ مکہ پہنچنے کے بعد پہلے وہ کعبہ میں داخل ہوا اور ہبل کی تعریف و توصیف کی بعد ازاں اس نے اپنے سر کے بال منڈوائے اور اپنے گھر آیا مقتولین بدر کا انتقام لیے بغیر جنسی جذبات کی تسکین سے باز رہنے کے سلسلے میں اس نے جو عہد کیا تھا اسے اس نے آخر تک نباہا۔

غزوۂ احد کے بعد

مسلمان جب مدینہ پہنچے تو نقشہ بدلا ہوا اور حالات دگرگوں پائے اگرچہ وہ لشکر قریش کا تعاقب کر کے واپس آئے تھے اور ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو دوبارہ لوٹ کر ان پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی تھی تاہم احد کی شکست کے آثار بام و در سے نمایاں تھے۔ نبی کریم ﷺ پر جلد ہی یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ احد کی شکست سے مسلمانوں کی ہوا اکھڑ گئی ہے اور یہ بھی اندیشہ تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے عرب قبائل بھی ان سے مقابلہ کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ اس خیال سے آپ ﷺ نے عرب قبائل کے حالات کی تفتیش کی اور مسلمانوں کے اقتدار کی بحالی کے سلسلے میں خاصا غور و خوض کیا۔

غزوۂ بنی اسد

نبی کریم ﷺ کو غزوۂ احد کے اختتام سے دو ماہ بعد یہ خبر ملی کہ خویلد کے لڑکے طلحہ اور سلمہ جو بنی اسد کے سردار تھے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو مدینہ پر حملہ کرنے اور مسلمانوں کا مال و متاع لوٹنے کی ترغیب دے رہے ہیں اور یہ جرأت انہیں اس خیال سے ہوئی ہے کہ غزوۂ احد کے بعد مسلمانوں کے کس بل نکل گئے ہیں اور ان میں مقابلہ کی طاقت نہیں رہی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہ کو ڈیڑھ سو مسلمانوں کی ایک جمعیت کے ساتھ قبیلہ بنی اسد کی طرف جانے کا حکم دیا اور ساتھ ہی یہ ہدایت فرمائی کہ رات کو سفر جاری رہے اور دن میں نقل و حرکت کا راز پوشیدہ رہے۔ غیر معروف راستے سے سفر کرنا چاہیے۔ ابو عبیدہ، سعدؓ بن ابی وقاص اور اسیدؓ بن حضیر بھی اس غزوہ میں شریک تھے۔ حضرت ابوسلمہؓ نے اس ہدایت پر عمل کیا اور ایک دن بے خبری کے عالم میں بنی اسد پر ہلہ بول دیا۔ بنی اسد مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگ نکلے۔ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ خود وہیں ٹھہرے اور مسلمانوں کی ایک جمعیت کو مفرورین کے تعاقب کے لئے بھیجا۔ بنی

Marfat.com

اسد کے کچھ لوگ گرفتار کر لئے گئے اور ان کا مال قبضے میں لے لیا گیا۔ خمس نکال کر غنیمت کا مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس واقعہ سے مسلمانوں نے کسی حد تک اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لیا۔ چند روز کے بعد حضرت ابوسلمہؓ نے وفات پائی۔ وہ غزوۂ احد میں زخمی ہو گئے تھے اور ابھی ان کے زخم بھرنے بھی نہ پائے تھے کہ بنی اسد پر چھاپہ مارنے کے لئے کوچ کرنا پڑا، صعوبت سفر سے آپ کے زخموں کے منہ کھل گئے اور ان سے خون بہ نکلا، اس عالم میں آپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

خالد ہزلی

نبی کریم ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ خالد ہزلی مسلمانوں سے جنگ کے لئے تیاریاں کر رہا ہے۔ آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن انیس کو بھیجا کہ وہ جائیں اور حالات کی تفتیش کریں۔ حضرت عبداللہؓ کچھ مسافت قطع کر کے خالد ہزلی کے پاس جا پہنچے، اس کے ساتھ کئی عورتیں تھیں اور وہ مکان کی تلاش میں تھا۔ خالد ہزلی نے حضرت عبداللہؓ سے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟'' حضرت عبداللہؓ نے کہا۔ ''میں بھی عرب کا باشندہ ہوں۔ سنا تھا کہ آپ محمد (ﷺ) کے خلاف لشکر جمع کر رہے ہیں۔ اسی خبر پر یہاں پہنچا ہوں۔'' خالد نے جواب دیا کہ ہاں! مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے میں ایک فوجی دستہ ترتیب دے رہا ہوں۔ حضرت عبداللہؓ نے خالد ہزلی کو تنہا پا کر قتل کر دیا اور عورتوں کو اس کی لاش پر روتا چھوڑ کر واپس چلے آئے، اور آنحضرت ﷺ کو پوری سرگزشت سنائی۔

واقعۂ رجیع

خالد ہزلی کے قبیلہ کے لوگ اس کی موت کے بعد بہت دنوں تک خاموش رہے آخر انہوں نے انتقام کا ارادہ کیا۔ سوچی سمجھی سکیم کے مطابق عربوں کی ایک جماعت جو خالد ہزلی کے قبیلے کے پاس رہتی تھی، مدینہ پہنچی اور نبی کریم ﷺ سے یہ عرض کی کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں، اپنے اصحاب میں سے کسی کو ہمارے ہمراہ بھیج دیجئے تاکہ ہمیں قرآن اور دینی مسائل کی تعلیم دے۔

سرور کونین ﷺ نے ان کی درخواست پر اپنے اصحاب میں سے چھ اشخاص کو تعلیم اور تبلیغ اسلام کے لئے روانہ کر دیا جب یہ لوگ سرزمین حجاز میں مقام رجیع تک پہنچے تو انہوں نے قبیلہ ہذیل کے لوگوں کو بلایا کہ وہ آئیں اور مسلمانوں کو اپنی حراست میں لے لیں۔ وہ آئے اور انہوں نے تلواریں سونت کر مسلمانوں کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اس عالم میں مسلمانوں نے بھی اپنی تلواریں نیام سے باہر نکال لیں۔ بنی ہذیل نے کہا: ''خدا کی قسم! ہم تمہیں قتل کرنا نہیں چاہتے البتہ اہل مکہ کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں۔'' مسلمانوں نے سوچا کہ مکہ جانے سے بہتر تو یہی ہے کہ ہمیں یہیں جان دے دیں۔ اس لئے انہوں نے بنی ہذیل کی پیشکش قبول نہ کی اور یہ جانتے ہوئے کہ ہم اس گروہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے، تلواریں چلانے لگے۔ بنی ہذیل نے تین

Marfat.com

مسلمانوں کو تو شہید کر دیا اور تین ان کی قید میں آئے۔ بنی ہذیل کے کچھ لوگ انہیں فروخت کرنے کے لئے مکہ لے چلے۔ اثنائے سفر میں عبداللہؓ بن طارق نے اپنے ہاتھ کھول کر تلوار سنبھالی، دشمن بھاگ نکلے اور دور سے انہوں نے حضرت عبداللہؓ پر اتنے تیروں کی بارش کی کہ وہ شہید ہو گئے۔ قبیلہ ہذیل کے لوگوں نے باقی دو مسلمانوں کو لے جا کر فروخت کر دیا۔

صفوان بن امیہ نے حضرت زیدؓ بن دشنہ کو اس لئے خریدا تا کہ اپنے باپ امیہ بن خلف کے انتقام میں انہیں قتل کرے۔ صفوان کا غلام نسطاس حضرت زید رضی اللہ عنہ کو تہ تیغ کرنے کی غرض سے لئے جا رہا تھا کہ راستے میں ابوسفیان سے ملاقات ہوئی۔ ابوسفیان نے حضرت زیدؓ سے کہا: "آیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ہم تمہاری جگہ (حضرت) محمد (ﷺ) کو قتل کریں اور تم اپنے لوگوں میں آرام سے زندگی بسر کرو"۔ حضرت زیدؓ نے جواب دیا۔ "خدا کی قسم میں ہرگز اس بات سے خوش نہ ہوں گا کہ رسول کریم ﷺ کو کوئی گزند پہنچے اور میں اپنے گھر راحت و آرام کی زندگی بسر کروں"۔ ابوسفیان نے (غالباً) اسی موقع پر کہا تھا۔ "میں نے (حضرت) محمد (ﷺ) کے دوستوں سے زیادہ کسی کی دوستی کو پائیدار اور استوار نہیں پایا۔" نسطاس نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے نہایت خندہ پیشانی سے اسلام اور ہادیٔ اسلام کی محبت میں جان دی۔

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کچھ بعد تک کفار مکہ کی قید و بند میں رہے آخر انہیں بھی پھانسی کے تختے پر چڑھایا گیا۔ آپ نے اپنی شہادت سے قبل کفار مکہ سے دو رکعت نماز کی اجازت طلب کی تھی۔ اجازت ملی تو نماز پڑھی اور اس سے فراغت کے بعد کہا: "خدا کی قسم! اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تم لوگ سوچو گے میں موت کے ڈر سے نماز کو طول دے رہا ہوں تو میں کچھ دیر اور نماز پڑھتا۔" غرض حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے بھی خدا، رسول ﷺ اور دین کی راہ میں جام شہادت نوش کیا۔ اگرچہ خبیب و زید رضی اللہ عنہما اپنے دین سے برگشتہ ہو کر کفار کی قید سے رہائی پا سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ان کا ایمان، خدا، بقائے روح اور روز حساب پر تھا ان کے عقائد کی رو سے موت، جسے زندگی کے انجام سے تعبیر کیا جاتا ہے، اجر و ثواب کا پیش خیمہ تھی۔ انہیں پختہ یقین تھا کہ ہمارا خون ہرگز رائیگاں نہیں جائے گا۔ ہمارے دینی بھائی کبھی نہ کبھی مکہ میں فاتحانہ شان و شوکت سے داخل ہوں گے اور اسے بت پرستی کی آلودگیوں سے پاک و صاف کر دیں گے اور اس مقام کو جہاں خدا کے سوائے اور کسی کا نام لینا روا نہیں ہے پھر خانہ خدا میں تبدیل کر دیں گے۔

مستشرقین بدر، بدر کے دو قیدیوں کی ہلاکت پر تو جز بز ہوئے لیکن وہ اس واقعہ سے متعلق کچھ نہیں لکھتے کہ آیا مسلمانوں کو مکر و فریب سے دعوت دینا اور پھر انہیں گرفتاری کے بعد شہید کر دینا کس قانون اور کس اصول کی رو سے روا ہے؟ یہ مسلمان جنگی قیدی نہ تھے، قریش نے ان مسلمان قیدیوں سے جو سلوک کیا ہے اس سے حد درجہ کمینگی کا ثبوت ملتا ہے۔

Marfat.com

واقعہ بئر معونہ

قبیلہ ہذیل کے لوگوں نے چھ مسلمانوں پر جو ظلم کیا تھا اس کی اطلاع سے مدینہ کے تمام مسلمانوں کو صدمہ ہوا۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے دردانگیز اشعار میں حضرت زیدؓ اور حضرت خبیبؓ کا مرثیہ لکھا۔ نبی کریم ﷺ کو اندیشہ دامن گیر ہوا کہ مبادا اسی قسم کے واقعات ظہور میں آنے لگیں اور اس سے مسلمانوں کی شان وشوکت کا آفتاب گہن میں آ جائے۔ انہی دنوں ابوالبراء بن مالک آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے اسے قبولِ اسلام کی دعوت دی جو اس نے منظور نہ کی لیکن اس کے ساتھ ہی اسلام سے دشمنی بھی ظاہر نہ کی۔ اس نے کہا۔ ''اگر آپ ﷺ اپنے چند اصحاب کو نجد بھیج دیں تو مجھے امید ہے کہ اہل نجد مشرف بہ اسلام ہو جائیں گے۔'' آنحضرت ﷺ نے اس خیال سے کہ کہیں اہل نجد بھی مسلمانوں سے وہی سلوک نہ کریں جو بنی ہذیل نے کیا تھا، اس رائے سے اتفاق نہ کیا۔ ابوالبراء نے کہا۔ ''آپ اپنے اصحاب کو شوق سے روانہ فرما دیجئے، میں انہیں پناہ دوں گا۔'' ابوالبراء صاحب اثر ورسوخ شخص تھا اور جسے اس کی پناہ حاصل ہو جاتی تھی وہ لوگوں کے ظلم وستم کے پنجے سے محفوظ رہتا تھا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت منذرؓ بن عمرو کو چالیس مسلمانوں کی معیت میں ابوالبراء کے ہمراہ نجد روانہ کر دیا۔ یہ لوگ بنی عامر اور بنی سلیم کے علاقے میں بئر معونہ کے قریب پہنچے تو حرامؓ بن ملحان کو آنحضرت ﷺ کا دعوت نامہ دے کر عامر بن طفیل کے پاس بھیجا گیا، عامر نے یہ دعوت نامہ نہ پڑھا اور الٹا قاصد رسول کو قتل کر دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ دوسرے مسلمانوں کے قتل کے لئے اس نے عرب قبائل سے مدد طلب کی۔ عرب قبائل نے ابوالبراء کے وعدہ اور قول وقرار کا مطلق کوئی پاس نہ کیا اور مسلمانوں کو ایک جمعیت کے ہمراہ گھیرے میں لے لیا۔ مسلمانوں نے بھی تلواریں سونت لیں اور لڑائی شروع ہو گئی یہاں تک کہ حضرت کعبؓ بن زید اور حضرت عمروؓ بن امیہ کے سوا کوئی باقی نہ رہا۔ حضرت کعب بن زید رضی اللہ عنہ سخت مجروح ہو گئے تھے۔ حضرت عمروؓ بن امیہ کو عامر بن طفیل نے اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ان کی والدہ نے عامر کے بدلے میں ایک غلام دے کر انہیں رہا کرا لیا۔ جب حضرت عمروؓ بن امیہ مدینہ آ رہے تھے تو راستہ میں انہوں نے دو شخص دیکھے، انہیں یہ خیال ہوا کہ ہو نہ ہو یہ عامر کے آدمی ہیں۔ جب وہ سو گئے تو حضرت عمروؓ بن امیہ نے ان دونوں کو ہلاک کر دیا۔ مدینہ پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ یہ لوگ عامر اور ابوالبراء کے متوسلین میں سے تھے اور نبی کریم ﷺ نے انہیں پناہ دے دی تھی۔ اس غرض سے ان کا خون بہا ادا کیا گیا۔

آنحضرت ﷺ کو بئر معونہ کے اس واقعہ کا انتہائی قلق تھا، آپ فرماتے تھے کہ یہ کام ابوالبراء نے کیا ہے۔ میں پہلے ہی اس کی بات ماننے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ عامر بن طفیل کی یہ حرکت ابوالبراء کو بھی سخت ناگوار گزری چنانچہ اس کے فرزند ربیعہ نے عامر کے باپ کو نیزے سے مار ڈالا۔ رسول کریم ﷺ کو بئر معونہ کے واقعہ کا اتنا صدمہ تھا کہ آپ ﷺ نے مسلسل ایک ماہ تک نماز فجر کے بعد یہ دعا مانگی۔ ''اے خدا اس واقعہ کے

Marfat.com

انتقام کی توفیق عطا فرما۔" مسلمانوں کو اپنے دینی بھائیوں کی ہلاکت کا بہت زیادہ ملال تھا لیکن ساتھ ہی انہیں یہ بھی یقین تھا کہ انہوں نے جامِ شہادت نوش کیا اور انہیں بہشت میں جگہ مل گئی ہے۔

یہود کی سازش

رجیع اور بئر معونہ کے واقعات نے مدینہ کے منافقین اور یہودیوں کی نگاہ میں مسلمانوں کا وزن ہلکا کر دیا تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ خطرناک بات یہی ہو سکتی تھی کہ اہل مدینہ کی نظر میں ان کا وقار نہ رہے۔ اگر نواح مدینہ کے عرب قبائل کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اہل مدینہ میں باہمی اختلافات ہیں تو وہ مسلمانوں پر یقیناً ٹوٹ پڑتے اور اس صورت میں یہ بھی اندیشہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے۔ نبی کریم ﷺ کو یہ تو معلوم تھا کہ یہودی وقت اور موقع کے انتظار میں ہیں لیکن ان کے منصوبوں کا علم بھی ضروری تھا۔ اس خیال سے آپ ﷺ دس مسلمانوں کے ہمراہ یہودیوں کے پاس پہنچے اور ان کی وساطت سے ان دو شخصوں کا خون بہا ادا کرنا چاہا جنہیں حضرت عمروؓ بن امیہ نے غلط فہمی سے قتل کر دیا تھا (اس سلسلہ میں یہ چیز قابل ذکر ہے کہ بنی نفیہ کے یہودیوں کا قبیلہ بنی عامر سے معاہدہ دوستی تھا)۔

یہودیوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کا مدعا کیا ہے تو انہوں نے مسرت کا اظہار کیا اور یہ کہا کہ آپ ﷺ جو کچھ فرماتے ہیں ہم اس کی تعمیل کے لئے حاضر ہیں۔ لیکن اثنائے گفتگو میں آپ ﷺ نے دیکھا کہ کچھ یہودی ایک دوسرے سے سرگوشی میں مصروف ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کعب بن اشرف کے قتل کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہودیوں کی حرکتوں، سرگوشیوں اور باتوں سے آپ کو کچھ شک گزرا اور آثار و قرائن سے اس کی تقویت ہو گئی۔ اس بنا پر آپ ﷺ فوراً وہاں سے اٹھ کر چلے آئے لیکن اصحاب میں سے کسی کو بھی آپ نے اپنے ہمراہ نہ لیا۔ اصحاب کا خیال تھا کہ نبی کریم ﷺ کسی ضرورت سے باہر تشریف لے گئے ہیں، جلد ہی واپس آ جائیں گے۔ یہودی حیران تھے کہ کیا کریں۔ اگر اصحاب محمد (ﷺ) کو کوئی تکلیف پہنچی تو اس کا انتقام سختی سے لیا جائے گا لیکن اگر انہیں چھوڑ دیا گیا تو ممکن ہے کہ ہماری سازش ظاہر نہ ہو اور ہم نے مسلمانوں سے دوستی کا جو معاہدہ کر رکھا ہے، قائم رہے۔ آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے دلوں سے شکوک دور کر دیئے جائیں۔ اصحابؓ رسول اللہ ﷺ کے منتظر تھے، جب انتظار نے طول کھینچا تو آپ کی تلاش کے لئے اٹھنے لگے۔ اس اثنا میں ایک شخص جو مدینہ سے آ رہا تھا، اس نے کہا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو مسجد میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ یہ سنتے ہی تمام اصحاب نے مدینہ کی راہ لی، مدینہ پہنچے تو آنحضرت ﷺ نے وہ تمام باتیں بیان فرمائیں جو آپ ﷺ نے یہودیوں سے سنی تھیں۔ صحابہؓ نے بھی جو کچھ وہاں دیکھا اور سنا تھا، عرض کیا۔ نبی کریم ﷺ نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور یہ حکم دیا کہ بنی نضیر کے یہودیوں کے پاس جاؤ اور ان سے کہو: "مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے اور ان کا یہ حکم ہے کہ تم میری سرزمین سے نکل جاؤ۔ تم مجھ سے خیانت اور معاہدہ شکنی کرنا چاہتے تھے، تمہیں دس دن کی مہلت دی جاتی ہے۔ اگر اس مدت کے بعد تم

میں سے کوئی نظر آیا تو اسے تہ تیغ کر دیا جائے گا۔" یہودیوں کو اس حکم سے بڑی حیرت ہوئی اور کوئی جواب نہ بن پڑا۔ انہوں نے صرف یہ بات کہی کہ ہمیں یہ گمان تک نہ تھا کہ قبیلہ اوس کا کوئی شخص اس قسم کا پیغام لے کر ہمارے پاس آئے گا۔ (اس میں اس معاہدہ کی طرف اشارہ تھا جو ہجرت سے پیشتر خزرج کے خلاف قبیلہ اوس اور یہودیوں کے مابین ہوا تھا)۔ ابن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے یہ جواب سن کر کہا: "دل بدل گئے ہیں"۔

عبداللہ بن ابی کی شرارت

چند روز بعد جب یہودی مدینہ سے جانے کی تیاریاں کرنے لگے تو عبداللہ بن ابی کا قاصد ان کے پاس یہ پیغام لے کر آیا کہ ترکِ وطن نہ کرو، گھروں میں جمے رہو اور اپنے اموال و املاک ہرگز نہ چھوڑو۔ میں تمہاری مدد کے لئے دو ہزار آدمی بھیجوں گا جو تم سے ہر قسم کا تعاون کریں گے۔ جب تک ان میں سے ایک بھی زندہ رہے گا تم پر کسی کو بھی دست درازی کی جرأت نہ ہوگی۔ یہ پیغام سن کر یہودی شش و پنج میں پڑ گئے کیونکہ ان میں سے بعض کو عبداللہ کی باتوں پر قطعاً کوئی اعتماد نہ تھا۔ ان سے پیشتر اس نے بنی قینقاع کے یہودیوں سے بھی مدد کا وعدہ کیا تھا لیکن جب ان پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا تو اس نے اپنی راہ لی تھی اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ یہودیوں کو معلوم تھا کہ بنی قریضہ کے یہودی ہماری مدد کو نہیں آئیں گے کیونکہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان معاہدہ دوستی قائم ہے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر ہم مدینہ سے نکل کر خیبر یا اس کے قریب کسی جگہ مقیم ہو جائیں تو کھجوروں کی فصل میں مدینہ آ سکتے اور باغات کی پیداوار لے کر واپس جا سکتے ہیں، اس صورت میں کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہودی اس فکر میں تھے کہ ان کے ایک سردار حی بن اخطب نے کہا۔ "میں (حضرت) محمد (ﷺ) کو یہ پیغام بھیجے دیتا ہوں کہ ہم اپنے وطن سے ہرگز نہ نکلیں گے اور نہ اپنے املاک و اموال سے دست بردار ہوں گے، آپ سے جو بن پڑے، کیجئے۔ بعد ازاں ہم اپنے قلعوں کی مرمت، اپنے مورچوں کو مستحکم کریں گے اور سنگریزے جمع کر رکھیں گے۔ ایک سال کے لئے ہمارے پاس غلہ موجود ہے، پانی کی بھی کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ (حضرت) محمد (ﷺ) ایک سال تک ہمارا محاصرہ کرنے سے رہے"۔ غرض دس روز کی مہلت ختم ہوگئی اور یہودی اپنے گھروں سے نہ نکلے۔

محاصرۂ بنی نضیر

آنحضرت ﷺ کے حکم سے مسلمانوں نے اسلحہ سے آراستہ ہو کر یہودیوں کی بستی کا محاصرہ کر لیا۔ بیس روز تک یہ سلسلہ جاری رہا، اس اثناء میں مسلمان جب کسی مکان یا عمارت پر قابض ہو جاتے تو یہودی اسے ویران و مسمار کر کے دوسرے مکان یا عمارت میں محصور ہو جاتے۔ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ ان کے کھجوروں کے درخت کاٹ کر جلا دیئے جائیں تا کہ مالی نقصان کے غم سے ان کی ہمتیں پست ہو جائیں۔ یہودی مسلمانوں کے اس اقدام سے بہت زیادہ مضطرب ہوئے اور فریاد کی۔ اے (حضرت) محمد (ﷺ) آپ تو فساد سے روکتے اور مفسدین پر نکتہ چینی کرتے تھے، اب ہمارے کھجوروں کے باغ کیوں کاٹے اور

Marfat.com

جلائے جا رہے ہیں؟ اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (سورۂ الحشر: ۵)

''تم نے کھجوروں کے جو درخت کاٹے یا چھوڑے، وہ خدا کے حکم سے اور بدکاروں کی رسوائی کے لئے تھا۔''

یہودیوں کو عبداللہ بن ابی کے تعاون کی امید نہ رہی اور یہ خوف غالب ہوا کہ محاصرہ نے طول کھینچا تو اس کا انجام ہمارے حق میں کچھ بہتر نہ ہوگا۔ آخر انہوں نے سرورِ کونین ﷺ سے امان طلب کی اور یہ کہا کہ ہم مدینہ سے جانے کے لئے تیار ہیں۔ یہ درخواست منظور کر لی گئی مگر اس شرط کے ساتھ کہ تین تین یہودی ایک ایک اونٹ پر جو سامان لاد کر لے جا سکتے ہیں لے جائیں، اس کے سوا انہیں سب کچھ یہیں چھوڑ جانا ہوگا۔

بنی نضیر کی جلاوطنی اور مدینہ میں امن کا قیام

یہودی ابن اخطب کی رہنمائی میں مدینہ سے نکلے، ان میں سے کچھ تو خیبر میں مقیم ہو گئے اور کچھ شام کی طرف چلے گئے۔ غلہ اور دوسرے سامان کے علاوہ پچاس زرہیں اور تین سو چالیس تلواریں مسلمانوں کو غنیمت میں دستیاب ہوئیں۔ ان کے علاوہ یہودیوں کی زمینیں بھی تھیں لیکن انہیں غنیمت کے طور پر تقسیم نہ کیا گیا بلکہ رسول کریم ﷺ کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تاکہ آپ اپنی صوابدید کے مطابق ان میں جو تصرف چاہیں فرمائیں۔ آنحضرت ﷺ نے کچھ زمینیں تو مہاجرین میں تقسیم کر دیں اور کچھ ناداروں کے لئے وقف کر دیں۔ ان زمینوں کے دستیاب ہونے کے بعد مہاجرین، انصار کی مدد سے بے نیاز ہو گئے اور ان کی مالی حیثیت بھی بڑھ گئی۔ انصار کو ان زمینوں میں سے کچھ حصہ نہ ملا البتہ حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کو کچھ زمینیں دے دی گئیں کیونکہ انہوں نے اپنی احتیاج ظاہر کی تھی۔ بنی نضیر کے دو یہودی ایمان لے آئے اور وہ اپنے اموال و املاک پر بدستور قابض رہے۔

مدینہ میں یہودیوں کا وجود فتنہ کی جڑ تھا اور ان سے یہ اندیشہ تھا کہ اگر کسی دشمن نے مسلمانوں پر حملہ کیا تو مدینہ کے یہودی بھی اس کا ساتھ دیں گے۔ اور اس طرح ان سے بھی جنگ چھڑ جائے گی۔ یہودیوں کی شرارت سے ہر روز ایک دو ناخوشگوار واقعات ظہور میں آتے رہتے تھے۔ مدینہ سے بنی نضیر کے اخراج سے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ

Marfat.com

الْاَدْبَارَ۟ ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ۝۱۲ لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ۝۱۳ (سورۃ الحشر:۱۱ تا ۱۳)

”کیا آپ ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جنہوں نے نفاق کو اپنا پیشہ ٹھہرا لیا ہے کہ اپنے کافر بھائیوں سے جو اہل کتاب ہیں، کہتے ہیں کہ اگر تم دیس نکالا دیئے جاؤ گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ ترکِ وطن کریں گے اور تمہارے معاملے میں کسی کی بات نہ مانیں گے۔ اگر لوگ تم سے جنگ کریں گے تو ہم تمہیں مدد دیں گے اور خدا گواہ ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ اگر کفار شہر بدر ہوں گے تو منافق ان کے ساتھ ہرگز نہیں نکلیں گے اور اگر کوئی ان سے جنگ کرے گا تو یہ ان کی مدد بھی نہیں کریں گے اور اگر کفار کی مدد کے لئے آئیں گے بھی تو دشمن کو پیٹھ دکھائیں گے اور کوئی ان کی مدد نہیں کرے گا تم ان لوگوں کی نظر میں خدا سے بھی زیادہ دہشت انگیز ہو اس لئے کہ یہ لوگ بے شعور ہیں۔“

سورۂ حشر کی ان آیات کے بعد پھر ایمان کے اثر کی بات درمیان آتی ہے حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد انسان کی روح پر کوئی شر غالب نہیں آتا۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ۝۲۲ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ۝۲۳ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۝۲۴ (سورۃ الحشر:۲۲ تا ۲۴)

”وہ اللہ اس شان کا ہے کہ اس کے سوائے کوئی معبود نہیں ہے۔ پوشیدہ اور ظاہر اس کے علم میں ہے۔ وہ بڑا مہربان اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔ وہی اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بادشاہ، پاک و پاکیزہ ہستی، سلامتی عطا کرنے والا، امن دینے والا، نگہبان و نگران، زبردست باعظمت و باجبروت، وہی ہے۔ یہ لوگ جس انداز میں اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں وہ اس سے پاک اور بے نیاز ہے۔ وہ خالق، موجد اور صورت طراز ہے۔ اس کے نام (صفتیں) ایک سے ایک اعلیٰ ہیں۔ آسمانوں اور زمین میں جو بھی مخلوق ہے وہ اس کی تسبیح کرتی ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔“

نبی کریم ﷺ کا کاتب

یہودیوں کی جلاوطنی سے قبل نبی کریم ﷺ کا کاتب ایک یہودی تھا جو عبرانی اور سریانی زبانوں میں آپ ﷺ کے خطوط تحریر کرتا تھا۔ یہودیوں کے اخراج کے بعد آپ ﷺ نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ کتابت کی

Marfat.com

خدمت کسی غیر مسلم سے لی جائے اور اسے بھید کی باتیں بتائیں جائیں۔ چنانچہ آپ ﷺ کے حکم سے حضرت زید بن ثابتؓ نے عبرانی اور سریانی زبانیں سیکھ لیں اور کتابت کی ذمہ داری کا بار اپنے کاندھوں پر لے لیا۔ حضرت زیدؓ بن ثابت وہی صحابیؓ ہیں جنہوں نے عہد صدیقیؓ میں جمع قرآن کی خدمت انجام دی اور جب عہد عثمانیؓ میں اختلاف قرأت کی صورت پیش آئی تو انہی کے زیر نگرانی قرآن کی ترتیب عمل میں آئی اور اس ترتیب کے بعد دوسرے تمام نسخے نذر آتش کر دیئے گئے۔

یہودیوں کے اخراج کے بعد مدینہ میں امن وسلامتی کی فضا پیدا ہوگئی۔ مسلمانوں کو منافقین کی ریشہ دوانیوں کا اندیشہ بھی نہ رہا۔ مہاجرین خوش حال ہو گئے تھے کیونکہ انہیں یہودیوں کی چھوڑی ہوئی زمینیں مل گئی تھیں۔ انصار پر مہاجرین کا کوئی بوجھ نہ رہا اور مہاجرین انصار کی مدد سے بے نیاز ہو گئے۔ غرض مسلمانوں نے اپنی اپنی جگہ اطمینان کا سانس لیا۔

بدرِ ثانی

غزوۂ احد پر ایک سال بیت چکا تھا، رسول کریم ﷺ کو ابوسفیان کی بات یاد آگئی، اس نے کہا تھا کہ بدر کے مقتولین کا بدلہ تو ہم نے لے لیا، اب اگلے سال ہم تم سے نبٹ لیں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابو سفیان نے مسلمانوں کو دوبارہ بدر کے میدان میں نبرد آزمائی کی دعوت دی تھی۔ اس سال بارش کم ہوئی تھی۔ ابوسفیان چاہتا تھا کہ جنگ کو اور ایک سال معرضِ التوا میں رکھا جائے تاہم اس نے مدینہ میں کسی کی زبانی یہ پیغام بھیجا کہ قریش نے ایسا لشکر جرار تیار کیا ہے کہ کوئی اس کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتا۔ یہ لشکر مسلمانوں کو تہس نہس کر کے رکھ دے گا اور ایسی سخت لڑائی ہوگی کہ اس کے مقابلے میں معرکۂ احد کی حیثیت بھی ایک فسانہ کی سی نظر آئے گی۔ بعض مسلمان اس خطرہ سے بچنا اور مدینہ میں رہنا چاہتے تھے لیکن نبی کریم ﷺ کو ان کا یہ تذبذب ناگوار گزرا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"خدا کی قسم! اگر میں تنہا بھی رہ جاؤں تو پھر بھی بدر کا رخ ضرور کروں گا۔"

غرض مسلمانوں نے مسلح ہو کر بدر کی راہ لی۔ آنحضرت ﷺ نے مدینہ کے داخلی انتظام کی باگ ڈور حضرت عبداللہؓ (ابن عبداللہ بن ابی بن سلول) کو سونپی۔ لشکر اسلام نے بدر کے میدان میں پہنچ کر قریش کا انتظار کیا۔ ابوسفیان دو ہزار جنگجو افراد لے کر مکہ سے چل تو دیا تھا لیکن دو روز سفر کرنے کے بعد اس نے کچھ سوچا اور اپنے ساتھیوں سے کہا: "جنگ کے لئے یہ سال مناسب نہیں کیونکہ بارش نہیں ہوئی ہے۔ آؤ واپس چلیں۔" غرض ابوسفیان اور اس کے ساتھی راستہ ہی سے لوٹ گئے۔ نبی کریم ﷺ آٹھ روز تک بدر میں مقیم رہے، اس کے بعد مدینہ واپس چلے آئے۔

بدرِ ثانی کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ

Marfat.com

أَنۡفُسِكُمُ الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝ وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ قُتِلُوۡا فِىۡ
سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ ۝ فَرِحِيۡنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ
اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ۙ وَيَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِيۡنَ لَمۡ يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ مِّنۡ خَلۡفِهِمۡ ۙ اَلَّا
خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ۝ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِنِعۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضۡلٍ ۙ
وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝ اَلَّذِيۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِلّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ مِنۡۢ
بَعۡدِ مَآ اَصَابَهُمُ الۡقَرۡحُ ؕ لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوۡا مِنۡهُمۡ وَاتَّقَوۡا اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ۝
اَلَّذِيۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَكُمۡ فَاخۡشَوۡهُمۡ فَزَادَهُمۡ
اِيۡمَانًا ۖ وَّقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَنِعۡمَ الۡوَكِيۡلُ ۝ فَانۡقَلَبُوۡا بِنِعۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ
وَفَضۡلٍ لَّمۡ يَمۡسَسۡهُمۡ سُوۡٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوۡا رِضۡوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوۡ فَضۡلٍ
عَظِيۡمٍ ۝ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيۡطٰنُ يُخَوِّفُ اَوۡلِيَآءَهٗ ۖ فَلَا تَخَافُوۡهُمۡ وَخَافُوۡنِ
اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۝ (سورۂ آل عمران: ۱۶۸ تا ۱۷۵)

”وہ لوگ جو بیٹھ گئے اور اپنے بھائیوں سے کہنے لگے اگر ہماری بات مانی ہوتی تو مارے نہ جاتے۔ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو اپنے سے موت (کا خدشہ) دور کرو۔ جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ہیں انہیں مردوں میں شامل نہ سمجھو۔ وہ لوگ زندہ ہیں اور اپنے خدا کے پاس رزق پاتے ہیں۔ جو کچھ خدا نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے اس سے خوش ہیں، خوشخبری دیتے ہیں ان لوگوں کو جو ابھی ان سے نہیں ملے ہیں کہ انہیں کوئی خوف نہیں۔ اور نہ وہ غمگین ہوں گے، خوشخبری دیتے ہیں اللہ کے فضل اور اس کے احسان کی کہ اللہ ان مومنین کے اجر و ثواب کو ضائع نہیں کرتا جنہوں نے اس مصیبت کے بعد بھی جو ان پر نازل ہوئی اللہ اور رسول ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا یعنی اطاعت کی ان میں سے جن لوگوں نے تقویٰ اور احسان کی منازل قطع کیں ان کے لئے اجر عظیم ہے۔ وہ جن سے کہا گیا کہ تم سے لڑنے کے لئے لوگ آئے ہیں تم ان سے ڈرو، اس بات سے ان کا ایمان اور قوی ہو گیا۔ وہ کہنے لگے اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور بہترین کارساز ہے۔ وہ نعمت و فضل کے ساتھ واپس آئے، انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ انہوں نے اللہ کی رضا طلب کی اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ بے شک شیطان تم کو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے پس تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔“

غزوۂ بدر ثانی نے غزوۂ احد کی شکست کے آثار بالکل محو کر دیئے۔ قریش کو ذلت و رسوائی کے لئے ایک سال اور گزارنا پڑا اور کون نہیں جانتا کہ جن لوگوں پر بزدلی کے سبب تنگی و بے وقعتی کی لعنت مسلط ہو جاتی ہے

Marfat.com

اس میں شکست سے بھی زیادہ گھناؤنا پن ہوتا ہے۔

غزوۂ ذات الرقاع

سرورِ کونین ﷺ امن و اطمینان سے مدینہ میں شب و روز بسر کرنے لگے۔ آپ ﷺ کو اس بات سے خوشی تھی کہ مسلمانوں کی گری ہوئی حالت پھر سنبھل گئی ہے لیکن اس کے ساتھ آپ ﷺ دشمنوں کے مکروہ فریب سے بچنے کے لئے ان کی حرکات سے بھی بے خبر نہ تھے۔ آپ ﷺ سراغرسانی کے لئے اپنے جاں نثاروں کو بھی کہیں نہ کہیں بھیجتے رہتے تھے۔ اس دوران میں آپ ﷺ کو اطلاع ملی کہ بنی غطفان کے کچھ لوگ مسلمانوں سے لڑنے کے لئے جمع ہو رہے ہیں۔ آپ ﷺ کا دستور یہ تھا کہ دشمن پر اس کی غفلت میں حملہ آور ہوتے تھے اور اسے مزاحمت و مدافعت کی فرصت بھی نہ دیتے تھے۔ یہ خبر ملی تو آپ ﷺ نے چار سو مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ ذات الرقاع کا رخ کیا جہاں بنی ثعلبہ اور بنی محارب کے کچھ لوگ جمع تھے۔ مسلمانوں کو دیکھتے ہی یہ گروہ اپنی عورتیں اور وہ مال و منال جو ساتھ لائے تھے چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس مال میں سے مسلمان جتنا کچھ لا سکے، ساتھ لے آئے۔ چونکہ دشمنوں کے تعاقب کا اندیشہ تھا اس لئے راستہ میں نمازِ خوف پڑھتے تھے۔ اس طرح کہ جب ایک دستہ نماز میں مشغول ہوتا تو دوسرا دستہ اس کی حفاظت کرتا لیکن دشمن کہیں نمودار نہ ہوا اور مسلمانوں کی یہ جماعت پندرہ روز کے بعد بہ خیر و عافیت مدینہ واپس آئی۔

غزوۂ دومتہ الجندل

اس غزوہ سے چند روز بعد رسول کریم ﷺ نے غزوۂ دومتہ الجندل کے لئے عزمِ سفر کیا۔ (دومتہ الجندل حجاز اور شام کے درمیان بحیرۂ قلزم اور خلیج فارس کی راہ میں ایک نخلستان ہے)۔ دشمن مسلمانوں کی آمد کی خبر پا کر بھاگ نکلا اور بہت سا مال اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحابؓ کا دائرہ اقتدار کتنا وسیع ہو گیا تھا، پورے عرب پر ان کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمان ان لڑائیوں میں طرح طرح کی تکالیف برداشت کرتے تھے، بھوک پیاس کی زحمتیں سہتے تھے اور موت کا انہیں مطلق خوف نہ تھا۔ ان کی ایمانی طاقت نے انہیں یہ یقین دلا دیا تھا کہ فتح و نصرت انہی کے لئے ہے۔

ان واقعات کے بعد سرورِ کونین ﷺ چند ماہ مسلسل مدینہ میں قیام پذیر رہے اور اس بات کے انتظار میں رہے کہ آئندہ سال قریش نے جنگ کا جو منصوبہ تیار کیا ہے وہ کب عمل میں آتا ہے؟ اس اثنا میں آپ نے اس نوزائیدہ اسلامی جامعہ کے نظام کی ترتیب و تشکیل کی جو ان ایام میں صرف چند ہزار افراد پر مشتمل تھا اور بعد میں جس کی تعداد کروڑوں تک پہنچنے کو تھی۔ جامعہ کی یہ تکمیل آپ ﷺ نے اس خوش اسلوبی سے کی کہ اس وقت بھی سزاوارِ تحسین تھی اور صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی اس سے بے نظیر سیاست اور اعلیٰ تدبیر کی آئینہ داری ہوتی ہے۔

باب 15

تذکرۂ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن

پہلے کی دو فصلوں میں جن واقعات کا مذکور آیا ہے ان کا ظہور جس زمانے میں ہوا، ٹھیک اسی زمانے آنحضرت ﷺ نے پے در پے تین عقد کئے۔ اولاً حضرت زینب بنت خزیمہ سے، ثانیاً حضرت ام سلمہؓ بنت ابی امیہ بن مغیرہ سے اور ثالثاً حضرت زینبؓ بنت جحش سے، آخر الذکر سے عقد اس وقت ہوا جبکہ حضرت زیدؓ بن حارثہ نے انہیں طلاق دے دی تھی، حضرت زیدؓ بن حارثہ وہی ہیں جنہیں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے خریدا اور نبی کریم ﷺ نے آزاد کر کے متبنیٰ بنا لیا تھا۔ (دراصل ہوا یہ تھا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے از خود انہیں خرید رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہبہ کیا تھا اور آنحضرت ﷺ نے انہیں آزاد فرما دیا۔)

مستشرقین اور عیسائی مبلغین طنز تعریض اور اعتراض کے رنگ میں یہ کہتے ہیں کہ جب آپ ﷺ کی تین بیویاں پہلے سے موجود تھیں تو آپ ﷺ نے پے در پے تین عقد اور کیوں کئے؟

اگر مستشرقین کے تمام اعتراضات کو بفرضِ محال درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو پھر بھی رسول کریم ﷺ کی عظمت میں فرق نہیں آتا۔ بات یہ ہے کہ جو اصول و قواعد عوام پر جاری ہوتے ہیں ان کا اطلاق خواص پر نہیں ہو سکتا۔ جب ہم خواص کو مستثنیٰ قرار دے سکتے ہیں تو انبیاء علیہم السلام بدرجہ اولیٰ مستثنیٰ قرار دیئے جائیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دو شخصوں کو باہم دست و گریباں دیکھا، ان میں سے ایک ان کا پیرو تھا اور دوسرا مخالف، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بیچ بچاؤ میں مخالف کو جان سے مار ڈالا۔ عام قانون کی رو سے یہ ہلاکت آفرین اقدام جائز نہ تھا کیونکہ نہ جنگ چھڑی ہوئی تھی اور نہ اس کے مشابہ کوئی حالت لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اس قانون کا اطلاق نہیں ہوتا تھا اور ان کا یہ اقدام ان کی پیغمبرانہ عظمت کے منافی نہ تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ان اصولِ فطرت کے منافی تھی جو سلسلہ توالد و تناسل میں قریب قریب ناگزیر قرار دیئے جاتے ہیں۔ روح القدس نے انسانی صورت میں ان کی والدہ کے سامنے ہویدا ہو کر تولیدِ پسر کی بشارت دی۔ حضرت مریم علیہا السلام کو اس بشارت سے حیرت ہوئی اور بولیں۔ ''میرے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کسی آدمی نے مجھے مس تک نہیں کیا اور میں بدکار بھی نہیں ہوں؟'' روح القدس نے کہا۔ ''خدا اسے اپنے بندوں کے لئے حجت قرار دینا چاہتا ہے۔'' جب وضع حمل کا زمانہ قریب پہنچا تو حضرت مریم علیہا السلام نے کہا۔ ''کاش! اس سے پہلے مجھے موت آ گئی ہوتی اور لوگ مجھے بھول جاتے۔'' فرشتے نے ان کے قدموں

Marfat.com

کے نیچے سے آواز دی۔ ''غمگین نہ ہو، خدا نے تمہارے قدموں تلے چشمہ جاری کر دیا ہے۔'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعد لوگ حضرت مریم علیہا السلام کے پاس آئے اور ان کے بچے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''یہ عجیب شے ہے جو ظہور میں آئی ہے۔'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے (بجائے اس کے کہ ان کی والدہ جواب دیتیں) ان لوگوں سے کہا: ''میں خدا کا بندہ ہوں۔'' اگرچہ یہودیوں نے اس چیز سے انکار کیا ہے تاہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصی عظمت سے یہ چیز پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ خدا نے ان کی خاطر طبیعت اور خلقت کے قواعد وضوابط بدل دیئے تھے۔ تعجب کی بات ہے کہ عیسائی مبلغین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تو لوگوں سے کہتے ہیں کہ قانون کائنات میں تبدیلی پر یقین لے آؤ لیکن ایک ایسے واقعہ سے متعلق جو اس کے مقابلہ میں کچھ زیادہ عجیب نہیں ہے، رسول کریم ﷺ پر نکتہ چینی کرتے ہیں حالانکہ اکابر سے ایسے واقعات کا ظہور ممکن ہے جو رسوم اجتماع اور قوانین طبیعت کے خلاف ہوں۔

نبی کریم ﷺ جیسا کہ مستشرقین کا خیال ہے ایسے انسان نہ تھے جن کی عقل پر ہوس غالب آ جاتی۔ آپ ﷺ کے ازدواجی تعلقات کے سلسلے میں بعض سیرت نگاروں نے قیاس کی بنیاد پر بعض باتیں ایسی کہہ دی ہیں جنہیں دشمنانِ اسلام سند کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ سیرت نگار آنحضرت ﷺ کو ہر حیثیت سے حتیٰ کہ ازدواجی تعلقات کے اعتبار سے بھی ممتاز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ یہ تصور ہی سرے سے غلط ہے۔ نبی کریم ﷺ کے حالاتِ زندگی سے اس کی نفی ہوتی ہے اور آپ ﷺ کی عظمت وشان سے اس قسم کی باتوں کو کوئی مناسبت بھی نہیں۔

۲۳ سال کی عمر میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے آپ کا عقد ہوا تھا۔ ۲۸ سال یہی خاتون آپ ﷺ کی رفیقہ حیات رہیں حالانکہ اس زمانے میں عرب کی رسم و رواج کے متعلق تعددِ ازدواج کوئی معیوب فعل نہ تھا، اولاد نرینہ نہ ہونے کی بنا پر آپ ﷺ چاہتے تو دوسرا عقد کر سکتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ عرب اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے اور صرف بیٹوں کو اولاد سمجھتے تھے۔ سرورِ کونین ﷺ نے بعثت سے قبل ۱۷ سال اور بعثت کے بعد ۱۱ سال حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ زندگی گزاری اور کسی وقت بھی آپ ﷺ کو دوسرے عقد کا خیال تک نہ آیا۔ ان ایام میں عورتیں پردہ نہ کرتی تھیں اور نہ بناؤ سنگھار کسی سے مخفی رکھتی تھیں (البتہ بعد میں اسلام نے اس نمود ونمائش پر پابندی عائد کی)۔ اپنے مزاج اور اپنی طبیعت کے اعتبار سے نبی کریم ﷺ ایسے شخص نہ تھے جو عورتوں کے حسن پر فریفتہ ہو جاتے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں اور اس کے علاوہ ماقبل عقد زندگی میں کوئی ایسی بات آپ ﷺ سے ظہور میں نہیں آئی۔ اس روش کے پیش نظر یہ عجیب بات ہے کہ ۵۰ سال کی عمر کے بعد یکایک آپ ﷺ کی زندگی کے لیل ونہار ہی بدل جائیں اور ۵ بیویوں کے ہوتے ہوئے جن میں ایک اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تھیں جنہیں آپ ﷺ نے عمر بھر محبوب رکھا، آپ ﷺ ایک ہی نظر میں زینب رضی اللہ عنہا بنت جحش پر ریجھ جائیں اور رات بھر آپ

Marfat.com

کو انہی کا خیال رہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ ۵۰ سال کی عمر کے بعد صرف عورتوں سے محبت کے باعث پانچ سال میں سات عورتوں سے زیادہ اور ۷ سال میں ۹ عورتوں سے زیادہ اپنے حبالۂ عقد میں لے آئیں۔

مسلمان سیرت نگاروں نے آنحضرت ﷺ کی ازدواجی زندگی سے متعلق جو کچھ تحریر کیا ہے، عیسائی مؤرخین نے بھی اس کی تائید کی ہے لیکن یہ ایسی گھٹیا درجے کی بات ہے کہ عوام میں بھی اسے معیوب سمجھا جاتا تھا چہ جائیکہ ایک ایسی ہستی کے بارے میں اس قسم کی بات کہی جائے جس کی گفتار اور جس کے کردار نے دنیا کی تاریخ ہی بدل دی تھی اور بہت ممکن ہے کہ پھر دوبارہ بھی انہی کی بدولت کوئی انقلاب آئے۔

نبی کریم ﷺ کی اولاد

اگر مستشرقین کو آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ناگہانی تغیر کچھ عجیب معلوم ہوتا ہے تو یہ بات کیا کچھ کم عجیب اور حیرت انگیز ہے کہ ۵۰ سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے آپ ﷺ کے ہاں کئی بچے پیدا ہوئے اور ۶۰ سال کی عمر میں حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے صرف ایک فرزند متولد ہوا جس کا نام حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ تجویز کیا گیا۔ باقی ازواج سے کوئی اولاد نہ تھی۔ آنحضرت ﷺ اپنی شخصی عظمت اور اپنے روحانی کمالات کے باوصف انسان تھے اور اس حیثیت سے آپ کو نرینہ اولاد کی تمنا بھی تھی۔ تاریخ ایک صادق القول شاہد کی حیثیت سے ان تمام روایات کی تردید و تغلیط کرتی ہے جو خیر البشر ﷺ کے تعددِ ازدواج سے متعلق مسیحی مبلغین اور مستشرقین نے بیان کی ہیں۔

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے نکاح

رسول کریم ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد سکرانؓ بن عمرو کی بیوہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے عقد کیا تھا۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے شوہر سکرانؓ بن عمرو سابقون الاولون میں سے تھے۔ انہوں نے دین کی راہ میں سخت تکالیف برداشت کی تھیں۔ جب انہوں نے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ حبشہ میں ہجرت کی تھی تو حضرت سودہ رضی اللہ عنہا بھی اپنے شوہر کے ہمراہ تھیں اور اس پوری مدت میں ان کے رنج و غم میں برابر شریک رہیں۔ آج تک کسی مؤرخ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے حسن و جمال یا مال و منال سے متعلق کوئی شہادت نہیں دی۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو محض اس لئے شرف ازدواج سے نوازا کہ ان کی بقیہ زندگی کے ایام راحت و آرام سے بسر ہو جائیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ازدواج کا مقصد صرف یہ تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ سے تعلقات کی بنیاد استوار ہو جائے، اسی غرض اور اسی منشا سے آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شرف دامادی سے نوازا۔ اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کو جو تعلق خاطر تھا اس کا وجود عقد سے قبل نہ تھا بلکہ بعد میں رفاقت سے یہ چیز

Marfat.com

ظہور میں آئی۔ حضرت عائشہ ؓ کا عقد آنحضرت سے ۷ سال کی عمر میں ہوا تھا۔ اس عمر میں تعلق خاطر خلاف قیاس ہے۔ حضرت حفصہ ؓ سے بھی آپ ﷺ کو کوئی تعلق خاطر نہ تھا جیسا کہ خود حضرت عمر الفاروق ؓ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عمر الفاروق ؓ فرماتے ہیں۔

''خدا کی قسم! ہم عہد جاہلیت میں عورتوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ یہاں تک کہ خدا نے آیات نازل کیں اور عورتوں کے لئے ایک حصہ مقرر کر دیا۔ میں ایک دفعہ کسی کام سے متعلق کسی سے مشورہ کر رہا تھا، میری بیوی کہنے لگی، ایسا اور ایسا کرو۔ میں نے کہا تمہیں اس بات سے کیا واسطہ؟ بیوی نے کہا، تعجب ہے کہ آپ اپنے کام میں کسی کی مداخلت گوارا نہیں کرتے حالانکہ آپ کی بیٹی بھی تو رسول مقبول ﷺ سے جھگڑتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ دن بھر خفگی کے عالم میں رہتے ہیں۔ یہ سن کر میں نے اپنی چادر سنبھالی اور گھر سے سیدھا حضرت حفصہ ؓ کے پاس پہنچا اور اس سے کہا بیٹی! تو نبی کریم ﷺ سے جھگڑتی ہے یہاں تک کہ وہ سارا دن ناخوشی کے عالم میں گزارتے ہیں؟ حضرت حفصہ ؓ نے کہا، ہاں! میں ان سے جھگڑتی ہوں۔ میں نے کہا، تو خدا اور رسول ﷺ کے غضب سے نہیں ڈرتی؟ بیٹی! تو اس عورت (حضرت عائشہ صدیقہ ؓ) کی ریس نہ کر جو اپنے جمال اور رسول کریم ﷺ کی محبت پر نازاں ہے۔ خدا کی قسم! میں جانتا ہوں کہ رسول کریم ﷺ کو تجھ سے محبت نہیں اور اگر میرا پاسِ خاطر نہ ہوتا تو تجھے طلاق دے دیتے۔''

اس روایت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہ ؓ اور حضرت حفصہ ؓ سے تعلق خاطر کی بنا پر عقد نہیں کیا تھا بلکہ اس سے مقصد یہ تھا کہ اصحاب ؓ سے آپ ﷺ کے تعلقات استوار ہو جائیں۔ حضرت سودہ ؓ سے آپ نے اس لئے عقد کیا تھا کہ مسلمانوں کو یہ یقین آ جائے کہ اگر وہ راہِ خدا میں کام آ گئے تو ان کے زن و فرزند سرپرستی سے محروم نہیں رہیں گے۔

حضرت زینب ؓ بنت خزیمہ اور حضرت ام سلمہ ؓ کے ساتھ آپ ﷺ کا عقد بھی اس امر کا قطعی ثبوت ہے۔ حضرت زینب ؓ حضرت عبیدہ ؓ بن حارث کی رفیقۂ حیات تھیں (حضرت عبیدہ ؓ بن حارث غزوۂ بدر میں شہید ہو گئے تھے)۔ یہ خاتون نیک طینت اور نیکوکار تھیں۔ لوگ انہیں ان کی فیاضی کی بنا پر ام المساکین کہا کرتے تھے۔ جب آنحضرت ﷺ سے ان کا عقد ہوا ہے تو ان کا شباب ڈھل چکا تھا۔ رشتہ ازدواج کے ایک یا دو سال بعد تک زندہ رہیں۔ حضرت ام سلمہ ؓ حضرت ابوسلمہ ؓ کی اہلیہ تھیں اور حضرت ابوسلمہ ؓ سے ان کے چند فرزند بھی تھے۔ غزوۂ بنی اسد سے واپسی پر حضرت ابوسلمہ ؓ نے وفات پائی۔ رسول کریم ﷺ حضرت ابوسلمہ ؓ کی وفات کے وقت ان کے سرہانے تشریف رکھتے تھے اور دعا فرما

Marfat.com

رہے تھے۔ حضرت ابوسلمہؓ نے دم توڑا تو آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات سے چار ماہ بعد آپ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو پیغام بھیجا تو جواب ملا کہ میری جوانی کے دن بیت چکے ہیں اور بچے بھی زیادہ ہیں لیکن آپ ﷺ نے مکرر پیغام بھیجا۔ آخر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے آپ کا عقد ہو گیا اور آپ ﷺ نے ان کے بچوں کی تربیت میں خصوصیت سے توجہ فرمائی۔ ظاہر ہے کہ یہ رشتہ ازدواج، حضرت ام سلمہؓ کے حسن و جمال کی بنا پر نہ تھا۔ اگر عقد کے لئے یہ خیال محرک ہوتا تو انصار و مہاجرین میں بہت سی دوشیزہ لڑکیاں موجود تھیں اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے اس حیثیت میں کہیں بہتر تھیں۔ آپ ﷺ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب فرما سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان رشتوں کی بنا پر آنحضرت ﷺ سے مسلمانوں کا رابطہ بہت زیادہ استوار ہو گیا تھا۔ وہ آپ ﷺ کو رسول خدا بھی مانتے تھے اور یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ آپ ﷺ کی حیثیت ہمارے مہربان باپ کی سی ہے۔ ہر نادار، مجبور بیوہ اور یتیم سے آپ ﷺ کو ہمدردی تھی اور وہ آپ ﷺ کو اپنا سمجھتے تھے۔

تاریخی تحقیق کا نتیجہ

سطور بالا میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے مسلمانوں کو نصیحت کی تھی کہ عام حالات میں ایک بیوی پر اکتفا کریں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں آپ ﷺ کا عمل بھی یہی رہا ہے اور قرآن حکیم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ (سورۃ النساء: ۳)

"پس نکاح کرو عورتوں سے جو تمہیں پسند آئیں، دو، تین یا چار اور اگر یہ اندیشہ ہو کہ تم ان کے درمیان انصاف نہ کر سکو گے تو بس ایک پر قناعت کرو یا ملک یمین پر قانع رہو۔"

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ (سورۃ النساء: ۱۲۹)

"اور اگر پوری کوشش سے بھی بیویوں کے درمیان عدل نہ کر سکو تو کلیتاً کسی ایک کی طرف مائل نہ ہو جاؤ اور دوسری کو یوں نہ رکھو جیسے "معلقہ" ہے (یعنی ایسی عورت ہے کہ نہ تو بیوہ ہے اور نہ طلاق دی ہوئی ہے کہ اپنا دوسرا انتظام کر لے۔ نہ شوہر ہی اس کا حق ادا کرتا ہے کہ شوہر والی عورت کی طرح ہو۔ بیچ میں لٹک رہی ہے۔)"

ہجرت کے آٹھویں سال یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب نبی کریم ﷺ کا سلسلہ ازدواج پایہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ اس سے ان لوگوں کا اعتراض رفع ہو جاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ سرور کونین ﷺ نے

Marfat.com

جس چیز کو اپنے لئے بہتر سمجھا دوسروں کے لئے ناجائز ٹھہرایا جیسا کہ ہم نے دیکھا ان آیات میں ایک بیوی پر اکتفا کو مستحسن قرار دیا گیا اور اس چیز کی بھی وضاحت کر دی گئی کہ اگر تم عدل نہ کر سکو تو صرف ایک ہی بیوی پر قناعت کر و لیکن اس خیال سے کہ اجتماعی زندگی میں ایسے حالات و واقعات پیش آ سکتے ہیں کہ تعددِ ازدواج کی ضرورت پیش آ جائے، شرطِ عدل لگا کر چار بیویوں تک عقد کی اجازت دے دی گئی۔ کیا تعددِ ازدواج پر زبان طعن دراز کرنے والے ان ہلاکت خیز لڑائیوں اور وبائی بیماریوں کے بعد جن میں لاکھوں انسان ہلاک ہو جاتے ہیں اور کثیر التعداد عورتیں بے شوہر رہ جاتی ہیں، یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک عورت پر اکتفا کرنا چاہیے؟ کیا اہل مغرب یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد ایک عورت پر اکتفا کا قانون عملاً بھی اسی طرح نافذ رہا جس طرح رسماً اور اسماً تھا۔ جنگ کے بعد مغربی ممالک میں جو اجتماعی اور اقتصادی بحران رونما ہوا تھا کیا اس کا سبب یہ نہ تھا کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان قانونی تعاون موجود نہ تھا اور اگر ہوتا تو تمام بے شوہر عورتیں مردوں کی سرپرستی میں آ سکتی تھیں اور اقتصادی توازن برقرار رہ سکتا تھا۔ ہم اس کا فیصلہ مفکرین کی رائے اور صوابدید پر چھوڑتے ہیں اور یہاں صرف یہ بات کر دینا چاہتے ہیں کہ عام زندگی میں ایک بیوی پر اکتفا خاندان اور معاشرہ کی خوش بختی اور خوش حالی کا موجب ہوتا ہے۔

واقعہ زینبؓ بنت جحش

حضرت زینبؓ بنت جحش سے متعلق راویوں نے جو داستان پیش کی ہے سراسر لغو اور بے بنیاد ہے۔ اس کے برعکس تاریخ گواہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس واقعہ میں اپنے اس ارشاد پر عمل فرمایا تھا۔

لَا تَكْمِيْلُ اِيْمَانُ الْمَرْءِ حَتّٰى يُحِبُّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ

"کسی شخص کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔"

حضرت زینبؓ آنحضرت ﷺ کی پھوپھی اصیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی تھیں اور انھوں نے آپ ہی کے زیرِ سرپرستی تربیت پائی تھی۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ چاہا کہ ان کا عقد زیدؓ سے کر دیا جائے۔ حضرت عبداللہؓ بن جحش جو حضرت زینبؓ کے بھائی ہوتے ہیں اس رشتہ سے راضی نہ تھے اور انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ ان کی بہن کی شادی ایک ایسے شخص سے ہو جو غلام رہ چکا ہو اور اس کے بعد اسے آزادی نصیب ہوئی ہو۔ اس عہد کے رسم و رواج کے مطابق اشراف کی بیٹیاں آزاد شدہ غلاموں سے تزویج میں اپنی توہین سمجھتی تھیں لیکن نبی کریم ﷺ کا منشا یہ تھا کہ اس قسم کے بے بنیاد رسمی تصورات کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔ آپ ﷺ تعصب اور عصبیت کے پردے چاک کر دینا چاہتے تھے تاکہ عرب اور غیر عرب یہ سمجھ لیں کہ ان کے درمیان اگر کوئی خط امتیاز کھینچا جا سکتا ہے تو محض تقویٰ کی بنا پر کھینچا جا سکتا ہے۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (سورۂ حجرات:۱۳)

''تم میں اللہ کے نزدیک مکرم و معظم وہی ہیں جو زیادہ پرہیزگار ہیں۔''

رسول کریم ﷺ نے اس رسم کو مٹانے کے سلسلہ میں اپنے خاندان سے پہل کرنا چاہی، اسی غرض سے آپ ﷺ نے خود اپنی پھوپھی زاد بہن کا رشتہ حضرت زیدؓ کے لئے مانگا۔ حضرت زیدؓ آپ ﷺ کے متبنیٰ تھے اور عرب کے رسم و رواج کے مطابق آپ کو آنحضرت ﷺ کی میراث پانے کا حق بھی تھا۔

آنحضرت ﷺ کے اصرار سے حضرت عبداللہؓ بن جحش نے یہ رشتہ منظور کر لیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝

(سورۂ الاحزاب:۳۶)

''اور مؤمن مرد اور مومن عورت کے لئے یہ زیبا نہیں کہ جب خدا اور اس کے رسول ﷺ نے ان کے بارے میں فیصلہ کر لیا تو اس کے بعد اپنے اختیار سے کام لیں اور جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہے۔''

اس آیت کے نزول کے بعد حضرت زینبؓ اور ان کے بھائی حضرت عبداللہؓ بن جحش نے آنحضرت ﷺ کے تجویز کردہ رشتے پر صاد کیا۔ غرض حضرت زیدؓ سے حضرت زینبؓ کا عقد ہو گیا۔ نبی کریم ﷺ نے خود مہر ادا فرمایا۔ عقد کے بعد حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے تعلقات میں ناخوشگواری آ گئی۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو اپنے نسب اور اس بات پر فخر تھا کہ میں کبھی غلامی کی حالت میں نہیں رہی۔ اس کشیدگی اور تلخی نے طول کھینچا تو حضرت زیدؓ نے آنحضرت ﷺ سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شکایت کی اور طلاق کی اجازت طلب کی لیکن نبی کریم ﷺ نے یہ کہہ کر بات ٹال دی: ''اپنی بیوی کا خیال کرو اور خدا سے ڈرو''۔ لیکن حضرت زیدؓ روز روز کی دانتا کل کل زیادہ عرصہ تک برداشت نہ کر سکے اور آخر انہوں نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دے ہی دی۔

ایامِ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ عرب متبنیٰ کو بھی متوفی کے ترکے میں سے دوسرے فرزندوں اور عزیزوں کی طرح حصہ دیتے تھے۔ رسول کریم ﷺ اس رسم کو بھی مٹانا چاہتے تھے۔ اس باب میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ۝ (سورۂ الاحزاب:۴)

''متبنیٰ درحقیقت تمہارے بیٹے نہیں۔ یہ ایک بات ہے جو تم کہتے ہو لیکن خدا درست بات کہتا ہے اور لوگوں کو سیدھی راہ سمجھاتا ہے۔''

Marfat.com

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص ایسی عورت سے عقد کر سکتا ہے جو اس کے متبنیٰ کی بیوی رہ چکی ہو لیکن اس زمانے میں ایسا کون تھا جو اس قدیم رسم کو ختم کر کے خود اپنی زندگی میں اس کا عملی ثبوت دیتا۔ رسول کریم ﷺ نے خود اس رسم کو مٹانے کا فیصلہ کیا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے جبکہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے انہیں طلاق دے دی، خود عقد کر لیا لیکن آپ کے دل میں یہ خیال ضرور آتا تھا کہ لوگ اس قدیم رسم کی خلاف ورزی سے متعلق کیا رائے قائم کریں گے اور خدا کے اس ارشاد کا کہ ''جو دل میں ہے اسے آپ چھپاتے ہیں لیکن خدا اسے آشکارا کر دے گا، آپ لوگوں سے ڈرتے ہیں حالانکہ خدا کی ذات ایسی ہے کہ اس سے ڈرنا چاہیے۔'' مقصود و مفہوم یہی ہے۔ بہرحال نبی کریم ﷺ نے فرمانِ الٰہی کی تعمیل میں اس رسمِ کہن کو ختم کر دیا اور اسلام سے قبل متبنیٰ کے جو حقوق تسلیم کئے جاتے تھے انہیں باطل قرار دینے کے لئے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر لیا۔ اس آیت میں اسی واقعہ کی جانب ارشاد ہے۔

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۳۷﴾

(سورۃ الاحزاب: ۳۷)

''پس جب زید نے اس عورت سے تعلق قطع کر لیا تو ہم نے آپ سے اس عورت کا عقد کر دیا تاکہ عام مسلمانوں کو اپنے لے پالکوں کی مطلقات سے عقدِ ثانی میں کوئی عار نہ آئے اور خدا کا حکم تو ہو کر ہی رہتا ہے۔''

ان حقائق اور واقعات کی روشنی میں مستشرقین اور عیسائی مبلغین کی افسانہ طرازیوں کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ تاہم وہ بغض جو حروبِ صلیبی کے زمانے سے ان کے دل و دماغ کو ماؤف کئے ہوئے ہے انہیں اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں بالعموم اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے متعلق بالخصوص بے سروپا باتیں گھڑیں۔ اس قسم کی رکیک روایات کی توضیع ایک ایسا جرم ہے جسے تاریخ کبھی معاف نہیں کر سکتی۔

اگر ان لوگوں کے اعتراضات میں کوئی وزن ہوتا تو ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ اکابر کسی قانون کے تابع نہیں ہوتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یونس علیہ السلام تولد اور اپنی حیات کے اعتبار سے اجتماعی اور طبعی قوانین کے پابند نہیں رہے اور اس سے ان کی عظمت کے دامن میں کوئی جھول نہیں آیا۔ رہے آنحضرت ﷺ، ہمیں تو یہ نظر آتا ہے کہ آپ ﷺ نے ربِ قدوس کے حکم سے قوانینِ اجتماع کی نہ صرف ترتیب بلکہ تنقید بھی کی۔ آپ ﷺ سے زیادہ کسی نے بھی عورتوں کا احترام نہیں کیا اور کسی نے آپ سے زیادہ صنفِ نازک کی ترقی کے لئے مواقع بہم نہیں پہنچائے۔ عورتوں سے آپ ﷺ کا حسنِ سلوک ایک اسوہ، ایک نمونہ اور ایک مثال تھا جیسا کہ حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ کی روایت سے واضح ہوتا ہے۔

Marfat.com

باب 16

غزوۂ خندق (احزاب) اور یہودِ بنی قریظہ

مدینہ میں یہود کے تین بڑے قبیلے آباد تھے۔ بنو قینقاع جن کا اخراج سب سے پہلے عمل میں آیا۔ بنو نضیر جو بنو قینقاع کے بعد نکالے گئے اور بنو قریظہ جن کی داستان اب بیان کی جائے گی۔

مدینہ سے بنی نضیر کے اخراج، غزوۂ بدر ثانی، غزوۂ غطفان اور غزوۂ دومتہ الجندل کے بعد مسلمانوں کو مدینہ میں امن و سکون اور اطمینان و فراغت سے زندگی بسر کرنے کے مواقع نصیب ہوئے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ ان غزوات میں شرکت کے سبب انہیں تجارت و زراعت ایسی معاشی مشغولیتوں کے لئے وقت نہیں ملا اور نہ اس دوران ان آمدنی کے شعبوں سے انہیں کوئی یافت ہوئی تاہم غنیمت میں جو مال انہیں ملا تھا اس کے سہارے وہ اپنی زندگی فارغ البالی سے بسر کر سکتے تھے۔ نبی کریم ﷺ بھی اگرچہ دوسروں کی طرح اپنی معاش کی جانب سے مطمئن تھے لیکن آپ ﷺ کو ہر گھڑی یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ دشمنوں نے کہیں مکر و فریب کے جال نہ بچھائے ہوں۔ چنانچہ آپ ﷺ اپنے جاں نثاروں کو وقتاً فوقتاً مختلف اطراف میں بھیجتے رہتے تھے تاکہ دشمنوں اور ان کی جنگی تیاریوں سے باخبر رہیں اور غنیم کے جارحانہ اقدام سے پیشتر آپ ﷺ کو اتنا موقع اور اتنی مہلت مل سکے کہ آپ ﷺ مسلمانوں کو مداخلت کے لئے کیل کانٹے سے لیس کر سکیں۔ مسلمانوں کی پرامن زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے اس قسم کی پیش قدمی ناگزیر تھی کیونکہ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ قریش اور دوسرے مخالفین موقع بے موقع مسلمانوں پر چڑھائی کرتے رہتے تھے۔ علاوہ بریں بلادِ عرب اس زمانے میں اور بعد کے اکثر تاریخی ادوار میں چھوٹی چھوٹی جمہوریتوں سے مشابہ رہے ہیں ان کی حیثیت گو مستقل رہی ہے تاہم ان میں سے ہر ایک کی حالت رسوم و عادات کے اعتبار سے حزب کے صحرا نشین قبائل سے ملتی جلتی تھی۔ رسوم و عادات کی گرفت ان پر اتنی سخت تھی کہ دوسری منظم اقوام میں بھی اس کی نظیر نہیں ملتی۔

نبی کریم ﷺ کو ہر وقت دشمنوں کی پیش قدمی کا اندیشہ رہتا تھا کیونکہ آپ ﷺ خود عرب تھے اور آپ ﷺ یہ جانتے تھے کہ عربوں کے خمیر میں بغض و انتقام کے رذائل گندھے ہوئے ہیں۔ قریش، بنی قینقاع، بنی نضیر، بنی غطفان، بنی ہذیل اور وہ قبائل جو شام کے قرب و جوار میں آباد تھے اس موقع کے انتظار میں تھے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب پر حملہ بول دیں اور اس شخص سے انتقام لیں جس نے پانچ سال پیشتر بے سرو سامانی اور ناتوانی کے عالم میں مکہ سے ہجرت کی اور ایک قلیل مدت میں عرب کے طاقتور

Marfat.com

قبائل پر اپنی بڑھتی ہوئی طاقت سے وحشت طاری کر دی تھی۔

یہودیوں کی شدید عداوت

دوسرے تمام دشمنوں کی بہ نسبت یہودی آنحضرت ﷺ کی تعلیمات سے زیادہ باخبر تھے اور انہیں یہ بھی علم تھا کہ دینی دعوت کے نتیجے میں آپ ﷺ کو جو غلبہ نصیب ہوگا اس سے ان کی حیثیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ بلادِ عرب میں یہودی توحید کے علمبردار تھے اور انہیں پیروانِ مسیحیت سے اس لئے رقابت تھی کہ انہیں غلبہ واقتدار حاصل ہے۔ ان کے دل میں یہ تمنا چٹکیاں لے رہی تھی کہ ہم کسی نہ کسی طرح ان پر غالب آ جائیں۔ یہ تمنا کچھ بے جا بھی نہ تھی کیونکہ سامی نسل کے لوگ طبعاً توحید کی جانب میلان رکھتے تھے اور ان کی نظر میں مسیحیت کا کوئی مقام نہ تھا۔ آنحضرت ﷺ بھی سامی نژاد تھے اور آپ ﷺ لوگوں کو مؤثر اور دلنشیں پیرائے میں توحید کی دعوت دیتے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی تعلیم سے انسانیت کا معیار بھی بلند کر دیا نیز آپ ﷺ نے تھوڑی سی مدت میں اتنی طاقت حاصل کر لی تھی کہ ایک طرف بنی قینقاع کو مدینہ سے جلاوطن کیا اور دوسری طرف بنی نضیر کو دیس نکالا دیا۔ مؤخر الذکر اس فکر میں غلطاں و پیچاں تھے کہ آیا ہم پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ ﷺ کے پیروؤں کو ان کے حال پر چھوڑ کر شام کی راہ لیں اور بیت المقدس یا ارض موعود چلے جائیں یا قبائل عرب کو آپ ﷺ کے خلاف ابھاریں اور آپ ﷺ سے انتقام لیں؟

یہودیوں کے قاصد

بنی نضیر کے سرداروں نے آخر یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم عرب قبائل کو آنحضرت ﷺ کی مخالفت کے لئے ابھاریں گے اور انہیں اپنا ہم نوا بنانے کے لئے پوری کوشش کریں گے چنانچہ اس غرض سے ایک گروہ جس میں حیی بن اخطب، سلام بن ابی حقیق اور کنانہ بن ابی حقیق اور بنی وائل کے دو فرد ہوزہ بن قیس اور ابو عمار بھی شامل تھے، مکہ پہنچا۔ اہل مکہ نے حیی بن اخطب سے بنی نضیر کا حال پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ خیبر اور مدینہ کے درمیان تمہارے انتظار میں ہیں تاکہ (حضرت) محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں پر چڑھائی کی جائے۔ اہل مکہ نے پھر بنی قریظہ کے بارے میں دریافت کیا، اس کے جواب میں حیی بن اخطب نے کہا کہ وہ مدینہ میں مقیم ہیں لیکن انہوں نے یہ سوچ رکھا ہے کہ جب قریش حملہ آور ہوں گے تو ہم ان سے تعاون کریں گے۔ قریش کو کچھ تردد ہوا اور انہوں نے اپنے دل میں سوچا کہ نبی کریم ﷺ سے ہمارا اختلاف دینی دعوت کے سلسلے میں ہے اب جبکہ آپ ﷺ کا دائرہ اثر نفوذ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ ﷺ ہی حق بجانب ہوں۔

اس ضمن میں اہل مکہ نے یہودیوں سے کہا: ''تم اہل کتاب ہو ہمارے اور (حضرت) محمد (ﷺ) کے درمیان جو اختلافات ہیں ان کی نوعیت تم پر واضح ہے اور تمہیں اس سلسلہ میں کافی معلومات بھی ہیں۔ یہ تو بتاؤ

Marfat.com

آیا ہمارا دین بہتر ہے یا آپ ﷺ کا دین؟" یہودیوں نے جواب دیا کہ تمہارا دین (حضرت) محمد (ﷺ) کے دین سے کہیں بہتر ہے اور تم اپنے مؤقف میں حق بجانب ہو۔ قرآن کریم میں اس واقعہ سے متعلق یہ آیات وارد ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿٥١﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿٥٢﴾ (سورۂ نساء:۵۱،۵۲)

"کیا آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کو کتاب آسمانی سے بہرہ یابی کا شرف حاصل ہے وہ بت اور شیطان پر ایمان لے آئے ہیں اور لوگوں سے یہ کہتے ہیں کہ یہ مومنوں کی بہ نسبت زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے اور جس پر خدا لعنت کرتا ہے آپ اس کا حامی و ناصر کسی کو بھی نہ پائیں گے۔"

ایک یہودی مؤرخ کا عقیدہ

ڈاکٹر اسرائیل ولنسفون جو ایک یہودی مؤرخ ہے اس سلسلہ میں اپنے ہم مذہبوں پر تنقید کرتا ہے اور یہودیوں کی اس روش کو ناروا اقرار دیتا ہے کہ انہوں نے توحید پر بت پرستی کو ترجیح دی۔ اپنی کتاب "تاریخ الیہود فی العرب" میں یہ مؤرخ رقم طراز ہے۔

"مناسب تو یہ تھا کہ یہودی اس قسم کی خطائے فاش کے مرتکب نہ ہوتے۔ اگر اکابر قریش ان کی بات نہ مانتے تھے تو انہیں اپنا ہم خیال بنانے کے لئے انہیں یہ نہ کہنا چاہئے تھا کہ بت پرستی، توحید سے بہتر ہے کیونکہ بنی اسرائیل صدیوں بت پرست اقوام میں رہے لیکن ہمیشہ انہوں نے توحید کا علم بلند رکھا۔ خدائے واحد پر ایمان کی بدولت تاریخ کے مختلف ادوار میں بنی اسرائیل نے مصائب و آلام اور ذلت و خواری کی صعوبتیں بھی سہیں ان کا نصب العین یہ رہا ہے کہ مشرکین کی مذمت ہر حال میں کرنی چاہیے خواہ اس سلسلہ میں انہیں اپنی جان سے بھی کیوں نہ ہاتھ دھونے پڑیں۔ اپنے مسلک سے ہٹ کر بت پرستوں کے دامن میں پناہ لینا یہودیوں کے لئے ہرگز مناسب نہ تھا اور ان کی یہ روش تورات کی تعلیم کے منافی بھی تھی جس نے انہیں یہ حکم دیا ہے کہ بت پرستوں سے انہیں ہمیشہ برسر پیکار رہنا چاہیے۔"

قبائل عرب کو تحریک جنگ

حیی بن اخطب اور ان یہودیوں نے جو اس کے ہمراہ تھے قریش کو آنحضرت ﷺ کے خلاف جنگ کے لئے آمادہ کیا اور یہ بات طے پائی کہ چند ماہ بعد جنگ چھڑے گی لیکن انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ

Marfat.com

وہ بنی غطفان، بنی قیس، بنی مرہ، بنی خزارہ، بنی اشجع، بنی سلیم، بنی سعد، بنی اسد اور دوسرے ان تمام قبائل کے پاس بھی پہنچے اور انہیں بھی جنگ کے لئے ابھارا۔ نیز انہوں نے ان قبائل کو یہ یقین بھی دلایا کہ قریش بھی ہمارے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑنے کے لئے آمادہ ہیں۔ اسی ضمن میں (محض ان کی دلجوئی اور مقصد برآری کیلئے) انہوں نے بت پرستی کے حق میں تعریفی کلمات بھی کہے۔ یہودیوں نے ان قبائل کے دل میں یہ بات بھی بٹھائی کہ مسلمانوں پر ان کی فتح یقینی ہے۔

غرض یہودیوں نے مسلمانوں سے جنگ کے لئے جو فوجی دستے فراہم کئے تھے باہر نکلے اور قریش بھی ابوسفیان کی قیادت میں ان کے ساتھ آ ملے۔ قریش کی فوج چار ہزار نبرد آزماؤں پر مشتمل تھی۔ ان کے ساتھ تین سو گھوڑے اور ڈیڑھ ہزار اونٹ تھے۔ اس فوج کا علمدار عثمان بن طلحہ تھا جس کا باپ غزوۂ احد میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا اور اسی غزوہ میں اسے بھی علمداری کی خدمات سپرد تھیں۔ بنی خزارہ بھی خاصی جمعیت کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ ان کے ہمراہ بھی ہزار اونٹ تھے۔ بنی اشجع اور بنی مرہ میں سے ہر قبیلہ نے چار سو افراد جنگ کے لئے بھیجے تھے۔ بنی سلیم کے ساتھ سو افراد جمع ہوئے تھے۔ بنی سعد و بنی اسد کے لوگ بھی اس ملی جلی فوج میں شریک ہو گئے۔ غرض دس ہزار افراد سے زائد پر مشتمل ایک فوج تیار ہوئی اور اس نے ابوسفیان کی قیادت میں مدینہ کی جانب کوچ کیا۔ مدینہ کے سفر میں نوبت یہ نوبت مختلف قبائل کے سرداروں نے فوج کی کمان اپنے ہاتھوں میں لی۔

وحشت و اضطراب

نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو قریش اور عرب قبائل کی ملی جلی فوج کے کوچ کی خبر ملی تو اضطراب کی لہر دوڑ گئی اور اس سوچ میں پڑ گئے کہ اب قبائل عرب نے یکجا ہو کر ہم پر لشکر کشی کی ٹھانی ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں صفحۂ ہستی سے ناپید کر دیں۔ اس مقصد سے انہوں نے ایسی فوج جمع کی ہے کہ عرب کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ غزوۂ احد میں مسلمانوں کو قریش کی اس فوج نے شکست دے دی تھی جو مقابلتاً اس موجودہ لشکر سے کہیں کم تھی۔ اتنی بڑی فوج کا مقابلہ کیسے ہوگا؟ مسلمانوں کے لئے اس کے کوئی اور چارہ کار نہ تھا کہ وہ حدودِ مدینہ میں قلعہ بند ہو جائیں۔ لیکن یہ سوال بھی درپیش تھا کہ آیا قلعہ بندی اتنی بڑی فوج کے مقابلہ میں کافی بھی ہے یا نہیں؟

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فنون جنگ سے باخبر تھے اور انہیں کچھ ایسی حربی تدابیر بھی معلوم تھیں جن سے عرب ناآشنا تھے۔ انہوں نے اس موقع پر یہ مشورہ دیا کہ مدینہ کے اردگرد خندق کھودی جائے اور اس کی داخلی حدود بھی مستحکم کر دی جائیں۔[1] غرض مسلمانوں نے سلمان فارسیؓ کے مشورہ پر عمل کیا اور خندق کھودنے میں پوری مستعدی سے مشغول ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ بھی اپنے صحابہؓ کے ہمراہ کھدائی کے کام میں ہاتھ بٹا رہے تھے، مٹی ریگ خود اپنے ہاتھوں سے ڈھو رہے تھے اور یہ بھی مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کے لئے ایک کاوش

Marfat.com

تھی۔ خندق کھودنے کے سلسلے میں جن آلات (کدال، پھاوڑا وغیرہ) کی مسلمانوں کی ضرورت پیش آتی تھی بنی قریظہ سے لیتے تھے۔ ان یہودیوں کا دوستانہ معاہدہ مسلمانوں سے برقرار تھا۔ مسلسل کام اور لگاتار کوشش سے چھ دن میں مسلمان خندق کی کھدائی سے فارغ ہوئے۔ اسی اثنا میں ان مکانات کی مرمت بھی کرائی گئی جو دشمن کی زد میں آ سکتے تھے اور جن کا فاصلہ خندق سے دو فرسخ کے قریب تھا۔ بعدازاں وہ مکانات خالی کر دیئے گئے جو خندق سے باہر واقع تھے۔ عورتوں اور بچوں کو ان مکانات میں جن کی مرمت کی گئی تھی یکجا کر دیا گیا۔ خندق کے قریب ہی پتھر جمع کئے گئے تاکہ بوقت ضرورت دشمنوں پر برسائے جا سکیں۔

قریش کا خندق سے سامنا

قریش اور عرب قبائل کی فوجیں عازمِ مدینہ تھیں اور انہیں یہ امید تھی کہ نبی کریم ﷺ اور ان کے صحابہؓ سے اُحد کے میدان میں ملاقات ہوگی لیکن انہیں احد کے مقام پر کوئی بھی نظر نہ آیا چنانچہ انہوں نے مدینہ کا رخ کیا یہاں تک کہ خندق کے قریب آ پہنچے اور اس سے ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ عرب ان دنوں میں اس چیز سے بے خبر تھے کہ یہ بھی دفاع کا ایک ذریعہ ہے۔ انہوں نے جھنجھلا کر کہا تو یہ کہا کہ یہ بھی لڑائی کا کوئی طریقہ ہے؟ یہ تو کھلی بزدلی کی علامت ہے۔ مجبوراً انہوں نے خندق کے قریب ہی پڑاؤ ڈال دیا، اس مقام پر جہاں وادی رومہ کا پانی اکٹھا ہوتا ہے بنی غطفان اور اہل نجد نے وادی نقمی کے سرے پر مورچہ بنایا۔ نبی کریم ﷺ کی قیادت میں مسلمانوں نے جن کی تعداد تین ہزار تھی خندق سے شہر کی جانب سلع نام پہاڑی کے دامن میں اپنا محاذ قائم کیا۔ دونوں فوجوں کے درمیان خندق تھی۔ آنحضرت ﷺ کے لئے سرخ رنگ کا خیمہ نصب کیا گیا تھا۔

دشمنوں کو عبورِ خندق کی جرأت نہ تھی اس لئے انہوں نے تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی ادھر سے بھی ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیا گیا چند روز برابر یہی سلسلہ رہا۔

سرما کی شدت

ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ خندق کی صورت میں ہم برسوں تک بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ایک تو موسم سرما کی شدت اور دوسرے سن کر دینے والی ٹھنڈی ہوائیں اور ان پر مستزاد یہ کہ ان ایام میں مہاوٹیں بھی برستی تھیں۔ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ اس کے سر پر موت کی گھٹائیں تلی کھڑی ہیں۔ اہل مکہ اور بنی غطفان اپنے اپنے گھروں میں تو اس کڑاکے کی سردی سے محفوظ رہ سکتے تھے لیکن یثرب کی کھلی فضا میں خندق کے کنارے انہوں نے جو خیمے نصب کئے تھے ان میں انہیں سردی سے امن نصیب نہ ہو سکتا تھا۔ جب یہ لوگ عازمِ مدینہ ہوئے تھے تو ان کا خیال یہ تھا کہ جنگ میں ایک دن سے زیادہ صرف نہ ہوگا اور یہ فتح کے بعد شادمانی کے گیت گاتے ہوئے مالِ غنیمت لے کر لوٹ آئیں گے۔ یہودیوں نے بنی غطفان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر جنگ میں فتح نصیب ہوئی تو ہم خیبر کے کھیتوں اور باغوں

Marfat.com

کی ایک سال کی فصل تمہیں دے دیں گے۔ اب انہیں نظر آ رہا تھا کہ خندق کے درمیان میں ہوتے ہوئے اور اتنی سخت سردی میں فتح کی کوئی صورت نہیں ہے۔ غالب خیال یہ تھا کہ بنی غطفان محض محصول کی معافی کے لالچ میں سرما کی شدت ہرگز گوارا نہ کریں گے اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی راہ لے گا۔

قریش کے دل میں اگرچہ مسلمانوں کی طرف سے حد درجہ بغض تھا اور وہ اس لئے کہ بدر اور اس کے بعد کی لڑائیوں میں انہیں مسلمانوں کے ہاتھوں خاصی زک اٹھانی پڑی تھی تاہم اس صورت میں کہ خندق درمیان میں حائل تھی اور بنی قریظہ ان کی مدد کر رہے تھے انہیں صاف نظر آ رہا تھا کہ ہم کئی ماہ تک بھی یہ مہم سر نہ کر سکیں گے اس لئے ان کا خیال تھا کہ ہمیں اور قبائل عرب کے فوجی دستوں کو لوٹ جانا چاہئے، جنگ قرین مصلحت نہیں ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ انہیں یہ خیال بھی آتا کہ دوسری بار اتنی بڑی فوج آسانی سے جمع نہیں ہو سکتی۔ اس دفعہ تو یہودیوں نے حیی بن اخطب کی سرکردگی میں گھوم پھر کر مسلمانوں کے خلاف قبائل عرب کو جمع کر لیا ہے تاکہ وہ مسلمانوں سے انتقام لیں۔ اگر یہ موقع ہاتھ سے جاتا رہا اور قبائل عرب منتشر ہو گئے تو پھر کبھی میسر نہیں آئے گا۔ اگر اس دفعہ (حضرت) محمد (ﷺ) کا پلہ بھاری رہا اور قبائل عرب نے اپنی اپنی راہ لی تو یہودیوں کا حشر بہت برا ہوگا۔

حیی بن اخطب کی چال

حیی بن اخطب بھی ان حالات سے بے خبر نہ تھا۔ اسے یہ اندیشہ تھا کہ نتائج کہیں خلاف توقع برآمد نہ ہوں۔ اس نے حالات پر قابو پانے کے لئے ایک آخری تدبیر سوچی۔ چنانچہ اس نے عرب فوج کے دستوں سے کہا کہ میں بنی قریظہ (مدینہ کے معاہد یہودی) کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ نقض عہد کریں۔ اگر ایسا ہو گیا تو مسلمانوں کو رسد و کمک نہیں ملے گی۔ نیز مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے بھی ہمیں راستہ مل جائے گا۔ قریش و غطفان نے یہ بات سنی تو ان کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ غرض حیی بن اخطب اپنی تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے بنی قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس پہنچا۔ شروع شروع میں تو کعب نے اس کے لئے اپنے قلعہ کا دروازہ نہ کھولا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر مسلمان جنگ میں پچھڑ گئے تو یہودی بنی قریظہ کی غداری خود ان کے اپنے اور دوسرے یہود کے لئے سود مند ثابت ہو سکتی ہے لیکن اگر اس کے برعکس قبائل عرب کو شکست ہوئی اور وہ ہزیمت خوردہ ہو کر مدینہ سے چلے گئے تو مسلمان اس غداری کی سزا اتنی سخت دیں گے کہ یہودیوں کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔

حیی بن اخطب کے پیہم اصرار پر کعب بن اسد نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے کعب سے کہا: بڑے افسوس کی بات ہے، میں تو قریش و غطفان اور ان کے سرداروں کو لایا ہوں اور انہوں نے مجھ سے پیمان وفا باندھا ہے کہ ہم یہاں سے قدم تک نہیں ہٹائیں گے جب تک (حضرت) محمد (ﷺ) اور ان کے رفقا کو تہس نہس کر کے نہ رکھ دیں (اور تم ہو کہ قلعہ کا دروازہ کھولنے پر بھی آمادہ نہیں ہو)۔ کعب بن اسد کو

جب حیی بن اخطب کا منشا معلوم ہوا تو اس نے حیی کی بات ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ یہ جانتا تھا کہ نبی کریم ﷺ کا معاملہ اس کے اور بنی قریظہ کے ساتھ صدق ووفا کا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے اس کام سے انجام کا خوف بھی دامن گیر تھا لیکن حیی بن اخطب نے دوران گفتگو میں عہد شکنی پر زور ڈالا اور کعب پر یہ حقیقت واضح کی کہ یہودی کتنے ذلیل وخوار ہو رہے ہیں اور اگر عرب فوج مغلوب ہو گئی تو پھر انہیں کتنی رسوائی ہو گی اور وہ کہیں کے بھی نہ رہیں گے۔

بعدازاں حیی بن اخطب نے قبائل عرب کی فوجی طاقت کا نقشہ کھینچا اور یہ بتایا کہ اگر خندق درمیان حائل نہ ہوتی تو قبائل عرب کے فوجی دستے تھوڑی سی مدت میں مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے ناپید کر دیتے۔ حیی بن اخطب کے اصرار سے کعب بھی حیی کا ہم خیال ہو گیا لیکن اس نے حیی سے یہ سوال ضرور کیا کہ اگر قبائل عرب کے فوجی دستے ناکام لوٹ گئے تو ہمارا کیا حشر ہو گا؟ حیی بن اخطب نے کعب سے عہد کیا کہ اگر قریش و غطفان بے نیل ومرام لوٹے تو وہ خود قلعہ میں اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ آ ملے گا اور اس مصیبت کا مزا چکھے گا جو تم پر نازل ہو گی۔ یہودی فطرت کعب پر غالب آئی اور اس نے حیی بن اخطب کی بات مان لی۔ نبی کریم ﷺ سے اس کے جو عہد و پیمان تھے اس نے توڑ ڈالے۔

بنی قریظہ اور قاصدانِ رسول ﷺ

آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے جاں نثاروں کو بنی قریظہ کی عہد شکنی کی خبر ہو گئی۔ اس سے آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بڑا تردد ہوا۔ زیادہ تشویش مآلِ کار کی تھی۔ سرور کونین ﷺ نے سردار اوس سعدؓ بن معاذ اور سردار خزرج سعدؓ بن عبادہ کو مع دوسرے دو شخصوں کے بنی قریظہ کے پاس بھیجا تاکہ حقیقت آشکارا ہو جائے۔ آپ ﷺ نے ان سے یہ بھی فرمایا کہ اگر عہد شکنی کی خبر درست نکلے تو واپسی پر دوسروں کے سامنے اس کا ذکر نہ کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان وحشت زدہ اور مضطرب ہوں۔ جب دربار رسول ﷺ کے یہ قاصد بنی قریظہ کی اقامت گاہ میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ جو کچھ سننے میں آیا ہے حالات اس سے بھی بدتر ہیں۔ انہوں نے کعب سے گفتگو کی اور یہ چاہا کہ وہ پھر مسلمانوں سے عہد استوار کر لے لیکن کعب نے کہا تم بنی نضیر کو جو ہمارے دینی بھائی ہیں مدینہ میں واپس بلا لو (اس وقت عہد و پیمان کی تجدید سے متعلق گفت وشنید ہو سکتی ہے) سعدؓ بن معاذ نے جن کے قبیلہ سے بنی قریظہ کے دوستانہ مراسم تھے، بنی قریظہ کو عہد شکنی کے انجام سے ڈرایا لیکن ان کی باتوں سے یہودیوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی بلکہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے خلاف زبان طعن و تشنیع تک کھولی۔ کعب نے کہا: ''پیغمبر خدا کو ہم کیا سمجھتے ہیں؟ (حضرت) محمد (ﷺ) سے ہمارا کوئی عہد و پیمان نہیں ہے۔''

قریب تھا کہ تو تو، میں میں تک نوبت آ جائے مگر قاصدان رسول کریم ﷺ لوٹ آئے اور جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا آنحضرت ﷺ سے بیان کیا۔ حالات کچھ اتنے پیچیدہ ہو گئے کہ ان کے سلجھاؤ کی کوئی سبیل نظر

Marfat.com

نہیں آتی تھی۔ مسلمانوں پر خوف ودہشت کی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اہل مدینہ کو کھلی آنکھوں یہ نظر آ رہا تھا کہ عرب فوج بنی قریظہ کی طرف سے مدینہ پر ٹوٹ پڑے گی اور قتل عام کا ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ یہ ذہنی الجھن وہم وقیاس کی بنیاد پر نہ تھی بلکہ یہ حقیقت تھی کہ بنی قریظہ نے رسد وکمک کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ دوسری طرف انہیں یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ قریش وغطفان کو بنی قریظہ کی عہد شکنی اور اس کے تعاون کی اطلاع مل چکی ہے اور اس سے ان کے حوصلے اور بھی زیادہ بلند ہو گئے ہیں اور وہ جنگ کے لئے زور وشور سے تیاریوں میں مصروف ہیں۔ بنی قریظہ نے عرب قبائل سے دس روز کی مہلت طلب کی تھی کہ اس اثنا میں وہ اپنے آپ کو جنگ کے لئے تیار کر لیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ عرب فوج اس مدت میں برابر جنگ میں مصروف رہے۔ عربوں نے یہ شرط پوری کی اور وہ اس صورت میں کہ انہوں نے مسلمانوں سے لڑنے کے لئے تین دستے ترتیب دیئے اور ان میں سے ہر دستے نے جداگانہ اطراف سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ یہ آیات اسی واقعہ سے متعلق ہیں۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ﴿۱۰﴾ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ﴿۱۱﴾ وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۚ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾ (سورۃ الاحزاب: ۱۰ تا ۱۳)

"جب دشمن تمہاری طرف بالا وپست سے آئے (حملہ کرنے کے ارادہ سے) تو خوف کے مارے تمہاری آنکھیں پھری کی پھری رہ گئی تھیں اور تمہارے کلیجے منہ کو آ گئے تھے اور خدا کی نسبت تم طرح طرح کے گمان کرنے لگے تھے۔ اس موقع پر مسلمانوں کو آزمائش میں ڈالا گیا اور انہیں خوب لرزایا گیا۔ منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں شک وشبہہ کا روگ تھا بول اٹھے کہ خدا اور اس کے رسول ﷺ نے ہم سے جو وعدے کئے تھے وہ سب دھوکا تھا اور جب ان میں سے ایک گروہ کہنے لگا مدینہ کے لوگو! تم (دشمن کے بالمقابل) نہیں ٹھہر سکتے پس (بہتر یہ ہے) کہ لوٹ جاؤ اور ان میں سے کچھ لوگ پیغمبر سے اجازت مانگتے اور کہتے کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں حالانکہ وہ غیر محفوظ نہ تھے بلکہ ان کا ارادہ تو فرار کا تھا۔"

محصور مسلمانوں کی تشویش

مدینہ میں محصور مسلمانوں پر ہر طرف سے غم والم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ دشمن کی یلغار کے خطرہ سے

مسلمانوں کے جذبات پر کچھ اوس سی پڑ گئی تھی ستم بالائے ستم یہ کہ ان محصورین میں منافقین کا جو گروہ شامل تھا اس نے یہ کہہ کہ زخموں پر نمک چھڑکنا شروع کر دیا کہ ہم سے تو نبی کریم ﷺ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ قیصر و کسریٰ کے محلات اور ان کے خزائن پر ہمارا تسلط ہوگا، یہاں نقشہ یہ ہے کہ ہم رفع حاجت کے لئے بھی گھروں سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ان میں ایک تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جن کی آنکھیں جنگجو عرب فوج کے نظارہ سے پتھرا سی گئی تھیں۔ ان میں سے بعض وہ بھی تھے جن کے دل ڈوبے جا رہے تھے۔ ان لوگوں کی نظر میں قریش و غطفان کی چمکتی ہوئی تلواریں آگ برسا رہی تھیں۔ بعض لوگوں کو بنی قریظہ کے نقض عہد پر غصہ آ رہا تھا اور وہ دانت پیس پیس کر یہودیوں کو کوس رہے تھے۔ ان کی زبانوں پر یہ فقرے تھے ''اے یہود! تمہارا برا ہو! کیا اچھا ہوتا کہ رسول کریم ﷺ بنی نضیر کو دیس نکالا دینے کے بجائے قتل کرا دیتے تو آج حالات کی یہ نوعیت نہ ہوتی۔ افسوس! اے حیی بن اخطب! تجھے اس لئے زندہ رہنے دیا گیا تھا کہ تو قریش اور عرب قبائل کو مسلمانوں کے خلاف ابھارے۔ اب اگر اس حادثۂ عظیم اور مصیبت عظمٰی سے کوئی چیز ہمیں بچا سکتی ہے تو وہ صرف خدا کی پناہ اور اس کی زبردست قوت ہے۔''

کفار کا حملہ

بنی قریظہ کی عہد شکنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب فوج کے حوصلے بلند ہو گئے اور اس فوج کے چند افراد نے جن میں عمرو بن عبدود، عکرمہ بن ابی جہل اور ضرار بن الخطاب شامل تھے، خندق کے ایک سرے پر زور باندھا اور اس مقام پر جہاں خندق کا کچھ حصہ تنگ اور دبا ہوا تھا اپنے گھوڑے کدا دیئے۔ حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ اور بعض دوسرے مسلمانوں نے ان کا راستہ روک لیا۔ عمرو بن عبدود آگے بڑھا اور مقابلہ کے لئے اس نے مبارزت طلبی کی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس کے مقابلے کے لئے آگے بڑھے۔ عمرو بن عبدود نے کہا، میرا دل نہیں چاہتا کہ تیرا خون میرے ہاتھ سے بہے، اس پر حضرت علیؓ نے جواب دیا، میں تیرا خون بہائے بغیر دم نہ لوں گا۔ مقابلہ ہوا۔ حضرت علیؓ نے عمرو بن عبدود کا کام تمام کر دیا اور دوسروں نے جب عمرو بن عبدود کا یہ حشر دیکھا تو راہ فرار اختیار کی اور خندق پار کر گئے۔ دن ڈھلے نوفل بن عبداللہ نے اپنا گھوڑا خندق سے کدانا چاہا تو گھوڑے سمیت خندق میں آ رہا اور اس کی ہڈیاں پسلیاں چرمرا گئیں۔ اسی حالت میں اس نے جان دی۔ ابوسفیان نے کسی کو بھیجا کہ سو اونٹ کا فدیہ دے کر نوفل کی لاش لے آئے۔ آنحضرت ﷺ نے فدیہ قبول نہ کیا اور یہ فرمایا کہ تم اس کی لاش لے جاؤ یہ نجس ہے اور اس کا فدیہ بھی نجس ہے۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی شجاعت

عرب فوج نے آگ کے شعلے فروزاں کئے تا کہ بھڑکتی ہوئی آگ کے شراروں سے مسلمانوں کو مرعب کریں اور ان کے دلوں میں خوف و دہشت کی ٹھنڈی بجلیاں دوڑا دیں۔ بنی قریظہ کے سورما یہودی اپنی

Marfat.com

پناہ گاہوں سے نکلے اور انہوں نے مسلمانوں کی اقامت گاہوں کی جانب نقل وحرکت شروع کی تا کہ خانہ نشینوں کے ہوش وحواس ٹھکانے نہ رہیں۔ حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب، آنحضرت ﷺ کی پھوپھی حضرت حسانؓ بن ثابت کی پناہ گاہ میں تھیں۔ حضرت حسانؓ کے اہل وعیال بھی یہیں تھے۔ ایک یہودی اس پناہ گاہ کے پاس سے گزرا اور اس کے ارد گرد چکر کاٹنے لگا۔ حضرت صفیہؓ نے حضرت حسانؓ سے کہا۔ "یہ یہودی ہماری اقامت گاہ کے گرد منڈلا رہا ہے، کیا عجب کہ دوسرے یہودیوں کو بھی اتا پتا بتا دے اس لئے بہتر ہے کہ اس صورت میں کہ نبی کریم ﷺ اور ان کے صحابہؓ دوسرے کاموں میں مشغول ہیں۔ آپ نیچے جائیں اور اس یہودی کو ٹھکانے لگا دیں۔" حضرت حسانؓ نے کہا "اے بنت عبدالمطلبؓ! خدا آپ کی مغفرت فرمائے، آپ جانتی ہیں، میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں۔" چنانچہ حضرت صفیہؓ نے ایک موٹی سی بلی سنبھالی اور اپنی پناہ گاہ سے نیچے اتر کر اس زور سے یہودی کے سر پر دے ماری کہ اس کا کام تمام ہو گیا۔ جب آپ یہ کار نمایاں سرانجام دے کر لوٹیں تو آپ نے پھر حضرت حسانؓ سے کہا کہ "جاؤ اس کا لباس ہی اتار لاؤ، چونکہ یہ مرد تھا اس لئے میں نے اس کا لباس اتارنا کچھ مناسب نہیں سمجھا۔" حضرت حسانؓ نے جواباً عرض کیا۔ "مجھے اس کی احتیاج نہیں ہے۔"

نعیمؓ بن مسعود کی سیاست

اہل مدینہ سراسیمہ اور مضطرب تھے لیکن آنحضرت ﷺ اس فکر میں تھے کہ اس خطرہ سے بچاؤ کے لئے کیا چارۂ کار اختیار کرنا چاہیے۔ یہ بات مانی ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے اندر اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ میدان میں نکل کر دشمن کا سامنا کرتے اس لئے مجبوراً وہ کسی نہ کسی تدبیر سے حالات پر قابو پانا چاہتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے کسی کو بنی غطفان کے پاس بھیجا اور ان سے یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ میدان جنگ سے منہ موڑ کر چلے جائیں تو مدینہ کی تہائی فصل انہیں اس کے صلے میں دے دی جائے گی۔ بنی غطفان پہلے ہی اداس اور دل برداشتہ ہو رہے تھے اور انہیں یہ غصہ تھا کہ ہم نے یہودیوں کی باتوں میں آ کر اتنی مصیبتیں بے کار جھیلیں۔[۳]

نعیمؓ بن مسعود آنحضرت ﷺ کے حکم سے بنی قریظہ کے پاس پہنچے۔ نعیمؓ بن مسعود قبولِ اسلام سے قبل یہودیوں سے دوستانہ مراسم رکھتے تھے اور انہیں یہ خبر نہ تھی کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ غرض بنی قریظہ کے پاس ایک دوست اور بہی خواہ کی حیثیت سے نعیمؓ بن مسعود پہنچے، پہلے تو انہوں نے اپنے پرانے دوستانہ تعلقات کی یاد تازہ کی پھر کہا کہ تم نے (حضرت) محمد (ﷺ) کو چھوڑ کر قریش اور غطفان سے ساز باز کر لی ہے، بہت ممکن ہے زیادہ عرصہ تک ان کے قدم یہاں نہ جم سکیں اور وہ تمہیں (حضرت) محمد (ﷺ) کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کی راہ لیں۔ نعیمؓ بن مسعود نے انہیں مشورہ دیا کہ انجام کار سے اطمینان کی صورت یہی ہے کہ تم مسلمانوں کے ساتھ نبرد آزما ہونے سے قبل قریش وغطفان کے چند اشخاص کو اپنے پاس بطور ضمانت رکھو تا کہ تمہیں خطرے کی دلدل میں پھنسا کر وہ اپنی راہ نہ لے سکیں۔ بنی قریظہ کو نعیمؓ کی معقول

Marfat.com

بات پسند آ گئی۔ بعدازاں نعیم نے قریش کی جانب رخ کیا اور ان سے کہا کہ بنی قریظہ اپنے کئے پر نادم ہیں اور اب وہ یہ چاہتے ہیں کہ قریش کے چند آدمیوں کو اپنے قبضے میں لے کر (حضرت) محمد (ﷺ) کو سونپ دیں تاکہ وہ ان کا خون بہائیں لہٰذا اگر یہودی تمہارے پاس یہ پیغام بھیجیں کہ ہمارے پاس اپنے کچھ آدمی بطور یرغمال بھیج دو تو کہیں اپنے آدمی بھیج نہ دینا۔ نعیمؓ بن مسعود اس کے بعد بنی غطفان کے پاس پہنچے اور جو باتیں قریش سے کی تھیں ان سے بھی کہیں۔ قریش و غطفان نعیمؓ بن مسعود کی باتوں سے شش و پنج میں پڑ گئے اور انہوں نے آپس میں مشورہ کیا، غرض اس معاملہ کی تصدیق کے لئے ابوسفیان نے سردار بنی قریظہ کعب بن اسد کے پاس اپنے کسی آدمی کے ذریعے یہ پیغام بھیجا کہ ہمارے محاصرہ نے طول کھینچا ہے اور یہاں ٹھہرے ہوئے ہمیں خاصے دن گزر گئے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ تم کل ہی ایک طرف سے حملہ کر دو ہم بھی تمہاری پشت پناہی کے لئے آ پہنچیں گے۔

قاصد ابوسفیان، کعب بن اسد کے پاس سے یہ جواب لے کر واپس آیا کہ کل یوم سبت ہے، ہم اس دن جنگ میں شریک ہونے سے معذور ہیں۔ ابوسفیان کو اس جواب سے غصہ آیا اور اسے یقین آ گیا کہ نعیمؓ بن مسعود نے ہمیں جو اطلاع دی ہے غلط نہیں ہے۔ ابوسفیان نے دوبارہ کعب کے پاس پیغام بھیجا کہ اس شنبہ کی معذوری کو اگلے شنبہ پر ملتوی کر دو اور کل ضرور جنگ میں حصہ لو۔ اگر ہم جنگ میں مشغول ہو گئے اور تم نے ہم سے تعاون نہ کیا تو ہم تمہارے پیمان کو کالعدم سمجھیں گے اور تمہارے خلاف بھی ہماری تلواریں اٹھیں گی۔

جس وقت یہودیوں نے ابوسفیان کا دوسرا پیغام سنا تو انہوں نے کہا کہ ہم یوم سبت کو ہرگز تلوار نہیں اٹھا سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اس جماعت پر جس نے یوم سبت کا احترام نہیں کیا تھا، اپنا عذاب نازل کیا تھا اور وہ سوروں اور بندروں میں تبدیل کر دیئے گئے تھے۔ اس جواب کے ضمن میں انہوں نے قریش سے پھر یہ مطالبہ کیا کہ وہ ہماری تسلی اور اطمینان کے لئے اپنے کچھ آدمی یرغمال کے طور پر ہمارے پاس چھوڑ دیں، ابوسفیان نے یہ تمام باتیں سنیں سو اسے نعیمؓ بن مسعود کی باتوں پر حروف بحرف یقین آ گیا۔ اب ابوسفیان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ ہمیں ان حالات میں کیا راہ عمل اختیار کرنی چاہیے۔ اس نے بنی غطفان سے بات چیت کی تو انہیں بھی آنحضرت ﷺ کے اس پیغام کے نتیجے میں کہ مدینہ کی پیداوار کی ایک ثلث انہیں صلے میں ملے گا، متردد اور متذبذب پایا حالانکہ یک ثلث پیداوار کی واگزاری کی بات پختہ نہ تھی کیونکہ اوس و خزرج کے پیشوا حضرت سعدؓ بن معاذ اور حضرت سعدؓ بن عبادہ اور دوسرے مشیران بارگاہ رسالت ﷺ اس سے متفق نہ تھے لہٰذا یہ صرف ایک بات ہی تھی اس سلسلہ میں کوئی باضابطہ معاہدہ نہ ہوا تھا۔

طوفانِ بادوباراں

رات ہوئی تو اس قیامت کا طوفانِ بادوباراں اٹھا کہ کفار کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ بجلی کی تڑپ اور بادل کی گرج نے ہوش اڑا دیئے۔ خیموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں۔ جن دیگوں میں کھانا تیار کیا گیا تھا کہیں سے

Marfat.com

کہیں اوندھی جا گریں۔ عرب فوج کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ اس افراتفری میں اگر مسلمانوں نے موقع غنیمت جان کر حملہ کر دیا تو بہت برا حشر ہو گا۔ طلیحہ بن خویلد نے چلا کر کہا یہ سب کچھ (حضرت) محمد (ﷺ) کی طرف سے ہے اپنے بچنے کی جلد از جلد فکر کرو۔ ابوسفیان نے کہا: "اے قریش! ہمارا یہاں ٹھہرے رہنا بے سود ہے۔ ہمارے چوپائے ضائع ہو گئے۔ بنوقریظہ نے ہم سے بدعہدی کی اور عین موقع پر منہ پھیر لیا جیسا کہ نظر آ رہا ہے، طوفان نے ہمیں چکر میں ڈال دیا ہے، بہتر یہ ہے کہ اپنی راہ لو، میں بھی چلتا ہوں۔" غرض قریش اپنے ساز و سامان میں سے ہلکی پھلکی چیزیں لے کر چل دیئے۔ قبائل عرب بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ صبح تک میدان خالی ہو چکا تھا، وہاں آدم تھا نہ آدم زاد۔ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں نے مدینہ کی اطراف کا جائزہ لیا اور اس موقع پر رب قدوس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ہمیں خطرات سے نجات دی ہے۔

غزوۂ بنی قریظہ

قبائل عرب کی روانگی کے بعد نبی کریم ﷺ نے ان حالات پر غور کیا جو مستقبل قریب میں پیش آ سکتے تھے۔ آپ ﷺ نے سوچا کہ خدا نے دشمنوں کو تو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا لیکن یہ خطرہ ابھی باقی ہے کہ یہودی دوبارہ سرما گزرنے کے بعد قبائل عرب کو جنگ کے لئے ابھاریں گے۔ اگر اس موقع پر عرب فوج نے راہ فرار اختیار نہ کی ہوتی اور ان کے درمیان پھوٹ نہ پڑ جاتی تو بنی قریظہ کے یہودی ضرور مدینہ پر چڑھائی کرتے اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے ارادہ سے دشمن کو بھی یقیناً امداد دیتے۔ یہودیوں کی حیثیت زخم خوردہ سانپ کی سی ہے، کسی وقت اور کسی صورت بھی بغض و عناد کی روش جو ان کی سرشت میں داخل ہے، جا نہیں سکتی لہٰذا مناسب یہی ہے کہ ان یہودیوں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

آنحضرت ﷺ نے اس مقصد کے پیش نظر مؤذن کو یہ حکم دیا کہ وہ لوگوں میں یہ اعلان عام کر دے کہ ہر وہ شخص جو خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کا دم بھرتا ہے، نماز عصر بنی قریظہ کی بستی میں ادا کرے۔ آپ ﷺ نے حضرت علی ؑ کو چند مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ پہلے ہی اس بستی میں بھیج دیا۔ باوجود اس کے کہ مسلمان محاصرہ کے طول پکڑ جانے سے خستہ و درماندہ ہو گئے تھے اس جنگ کے لئے جس کے نتیجے سے وہ مطمئن تھے فوراً آمادہ ہو گئے۔ اگرچہ بنوقریظہ مضبوط قلعوں میں زندگی بسر کرتے تھے لیکن یہ قلعے صرف دفاعی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ان میں محصور رہتے ہوئے مسلمانوں پر حملہ نہ کر سکتے تھے۔ علاوہ بریں عرب فوج کے چلے جانے سے مسلمانوں کے قبضے میں خاصا سامان رسد آیا تھا اس لئے انہوں نے خوشی خوشی اور کامل اطمینان سے بنی قریظہ کے مقابلے کے لئے اپنی آمادگی ظاہر کی اور حضرت علی ؑ کے پیچھے پیچھے انہوں نے بھی بنی قریظہ کی بستی کا رخ کیا۔

جب یہ جاں نثاران رسول ﷺ وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا اور سنا کہ یہودی حیی بن اخطب سے مصروف گفتگو ہیں اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں نازیبا کلمات استعمال کر رہے ہیں، وہ آپ ﷺ

Marfat.com

دروغ گو کہہ رہے تھے اور آپ ﷺ کی عزت و ناموس پر بھی حملے کر رہے تھے۔ لشکر کفار کی واپسی کے بعد انہیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ ان کا حشر بہت برا ہو گا اس لئے جو کچھ ان کے منہ میں آتا تھا کہتے تھے۔ جب آنحضرت ﷺ وہاں پہنچے تو حضرت علیؓ نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ﷺ یہودیوں کے قلعوں کے نزدیک نہ تشریف لے جائیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''کیوں؟ کیا بات ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے ان کی زبان سے میرے بارے میں کچھ ناشائستہ الفاظ سنے ہیں۔'' حضرت علیؓ نے اثبات میں جواب دیا۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''جب وہ مجھے دیکھیں گے تو ان کی زبانوں پر ایسی ویسی باتیں نہیں آئیں گی۔'' چنانچہ جب آپ ﷺ یہودیوں کے قلعوں کے نزدیک پہنچے تو آپ ﷺ نے بلند آواز سے فرمایا ''بندروں کے بھائی بندرو! کیا خدا نے تمہیں ذلیل و خوار نہیں کیا تھا اور کیا اس نے تم پر اپنا قہر نازل نہیں کیا تھا؟'' یہودیوں نے جواب دیا۔ ''اے ابو القاسم! آپ ہم سے اور ہمارے حالات سے بے خبر نہیں۔''

شام ہونے تک مسلمان گردو درگردہ بنی قریظہ کی بستی میں جمع ہو گئے، آنحضرت ﷺ نے انہیں یہ حکم دیا کہ یہودیوں کو حصار میں لے لیا جائے۔ یہ محاصرہ پچیس روز تک مسلسل رہا۔ محاصرہ کے دوران میں چند مرتبہ دونوں طرف سے ایک دوسرے کی جانب پتھروں اور تیروں کی بارش ہوئی لیکن یہودیوں کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ اپنے قلعوں سے نکل کر دوبدو مسلمانوں سے مقابلہ کریں۔ آخر کار انہیں یہ پورا یقین ہو گیا کہ محاصرہ خواہ کتنا ہی طول کیوں نہ کھینچے، ہم مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ضرور ہو کر رہیں گے، اس غرض سے انہوں نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے سے یہ پیغام بھیجا کہ آپ ﷺ ہمارے پاس ابولبابہؓ اوسی کو بھیج دیجئے تا کہ ان سے ہم اپنے معاملے میں کوئی فیصلہ کن بات کریں۔ ابولبابہؓ اوسی کا یہودیوں سے عہد و پیمان تھا۔ جس وقت یہودیوں نے ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا، مرد، عورتیں اور بچے ان کے گرد جمع ہو گئے اور اتنی گریہ وزاری کی کہ خود ان پر بھی رقت طاری ہو گئی۔ بعدازاں انہوں نے ابولبابہؓ سے دریافت کیا۔ ''آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا ہمیں اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کر دینا چاہیے یا نہیں؟'' ابولبابہؓ نے جواب دیا۔ ''ہاں ایسا ہی مناسب ہے۔'' پر اپنے گلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اشارہ دیا کہ اگر تم نے اپنے آپ کو حوالہ کر دیا تو تمہارے سر قلم کر دیئے جائیں گے۔ کتب سیرت میں منقول ہے کہ بعد میں ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو اپنے اس اشارہ سے ندامت ہوئی۔

جب ابولبابہؓ یہودیوں سے رخصت ہوئے تو کعب بن اسد نے یہودیوں سے کہا۔ ''بہتر یہ ہے کہ تم (حضرت) محمد (ﷺ) کا دین قبول کر کے مسلمان ہو جاؤ۔ اس صورت میں تمہاری جان و مال اور زن و فرزند کو کوئی گزند نہ پہنچے گا اور تم محفوظ و مامون ہو جاؤ گے۔'' یہودیوں نے کعب کا یہ مشورہ قبول نہ کیا اور چلا کر کہا۔ ''ہم تورات کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے اور اسے پس پشت ڈال کر اور کوئی چیز قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔'' بعدازاں کعب نے یہ مشورہ دیا۔ ''اچھا تو یہ کرو کہ اپنے اہل و عیال کو خود اپنے ہاتھوں موت کے

Marfat.com

گھاٹ اتار دو اور تلواریں سونت کر (حضرت) محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑو تا کہ خدا ہمارے اور ان کے درمیان کوئی آخری فیصلہ کر دے۔ اگر ہم سب میدان میں مارے گئے تو ہمیں اپنے متعلقین کی کوئی فکر نہ ہوگی اور اگر بصورت دیگر ہم نے غلبہ پا لیا تو زن و فرزند دوبارہ بھی میسر آ سکتے ہیں۔" یہودیوں نے کعب کی یہ بات بھی نہ مانی اور یہ کہا: "ہم اپنے اہل و عیال کو جو ہمارے رحم و کرم پر ہیں کیوں قتل کریں ان کے بعد ہماری زندگی کس کام کی؟" کعب نے پھر کہا۔ "اگر تمہیں ان میں سے کوئی بات بھی منظور نہیں ہے تو پھر یہی بہتر ہے کہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کر دو ورنہ تم نے (ابو البابہؓ سے) سن ہی لیا ہے کہ اگر تم ایسا کرو گے تو تم سے کیا معاملہ ہوگا؟" غرض یہودیوں نے آپس میں مشورے کئے ان میں سے ایک نے کہا۔ "ہمارا حشر بنی نضیر جیسا نہ ہوگا۔ ہمارے اوسی حلیف ہمیں کوئی گزند نہ پہنچنے دیں گے اور اگر ہم نے محمد (ﷺ) سے درخواست کی کہ ہمیں شام کی طرف جانے دیا جائے تو ہمیں امید ہے یہ درخواست مسترد نہ ہوگی۔"

غرض بنی قریظہ نے کسی کو آنحضرت ﷺ کے پاس بھیجا اور یہ درخواست کی کہ آپ ﷺ ہمیں اجازت دیں کہ ہم اپنا مال و منال چھوڑ کر اذرعات کی جانب (شام میں ایک مقام ہے) ہجرت کر جائیں۔ آنحضرت ﷺ نے یہ درخواست مسترد کر دی اور ارشاد فرمایا کہ تم اپنے آپ کو ہمارے حوالے کرو۔ یہ جواب پا کر یہودیوں نے قبیلہ اوس کے پاس اپنا قاصد بھیجا اور یہ پیغام دیا، آیا جس طرح خزرجیوں نے اپنے دوست کی حمایت کی، کیا تم ہماری حمایت نہ کرو گے؟

قبیلہ اوس کی ایک جماعت آنحضرت ﷺ کے پاس یہ سفارش لے کر پہنچی کہ اے پیغمبر خدا! بنی قریظہ سے ہمارے دوستانہ مراسم ہیں ان سے بھی وہی معاملہ کیا جائے جو آپ ﷺ نے اس سے قبل قبیلہ خزرج کے دوستوں یعنی بنی نضیر سے کیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "اے اوسیو! کیا تم اس بات کے لئے تیار ہو کہ میرے اور اپنے دوستوں کے درمیان اپنے قبیلہ میں سے کسی کو ثالث قرار دو؟" انہوں نے کہا: "بے شک ہم اس بات کے لئے تیار ہیں۔" آپ نے فرمایا کہ تم اپنے دوست یہودیوں سے کہو کہ وہ قبیلہ اوس میں سے جسے چاہیں اپنا ثالث منتخب کر لیں۔ یہودیوں نے بالاتفاق حضرت سعدؓ بن معاذ کو اپنا ثالث تسلیم کیا۔ تقدیر نے ان کی عقلوں پر پردے ڈال دیئے تھے وہ یہ بھول ہی گئے کہ جب اس سے پیشتر انہوں نے نقض عہد کیا تھا اور دشمنوں سے سازباز کر لی تھی تو حضرت سعدؓ ہی ان کے پاس گئے تھے اور انہیں اس عہد شکنی کے انجام سے ڈرایا تھا لیکن انہوں نے نہ صرف یہ کہ ان کی بات نہ مانی تھی بلکہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں پر فقرے اور آوازے بھی کسے تھے۔

سعدؓ بن معاذ کی ثالثی

غرض حضرت سعدؓ نے حکم کی حیثیت سے اپنے اختیارات سے کام لیا اور یہ حکم دیا کہ یہودی قلعوں سے باہر نکلیں اور اپنے اسلحہ وہیں چھوڑ دیں۔ یہودیوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ پھر حضرت سعدؓ نے یہ فیصلہ کیا کہ

بنی قریظہ کے جنگجو مردوں کو تہ تیغ کر دیا جائے اور ان کے اموال و املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا جائے۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت سعدؓ بن معاذ کا حکم سنا تو ارشاد فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، خدا اور رسول ﷺ اور جملہ مسلمان تمہارے اس فیصلہ سے راضی اور متفق ہیں۔ مجھے بھی اسی نوعیت کا حکم ملا تھا۔''[1] بعدازاں آپ ﷺ مدینہ کے بازار میں تشریف لائے اور حکم دیا کہ چند گڑھے کھودے جائیں۔ جب گڑھے کھودے جا چکے تو یہودیوں کو دستہ دستہ لایا گیا اور ان کے سر قلم کئے گئے اور ان کی لاشیں گڑھوں میں دبا دی گئیں۔ بنی قریظہ کو حضرت سعدؓ بن معاذ سے جو ان کے حلیف تھے اس قسم کے حکم کی توقع نہ تھی بلکہ ان کا خیال یہ تھا کہ جس طرح عبداللہ بن ابی نے بنی قینقاع کی حمایت کی تھی اور انہیں قتل سے نجات دلائی تھی۔ حضرت سعدؓ بھی ان کی حمایت کریں گے۔ بات یہ ہے کہ حضرت سعدؓ نے سوچا کہ اگر عرب فوج بنی قریظہ کی عہد شکنی کے نتیجے میں مدینہ پر چڑھائی کر دیتی تو مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیا جاتا اور اس فوج کے سپاہیوں کو مسلمانوں کے اعضاء کی قطع و برید میں بھی کوئی پس و پیش نہ ہوتا۔ اس لئے حضرت سعدؓ نے بنی قریظہ کا وہی حشر کرایا جو بہ صورت دیگر ان کی شرارت سے مسلمانوں کا ہوتا۔

یہودیوں کی دلیری

یہودیوں نے اپنی موت کا مقابلہ مردانگی سے کیا، اس کا ثبوت وہ گفتگو ہے جو حیی بن اخطب[5] نے اپنی موت سے پہلے کی۔ جس وقت اسے گردن زدنی کے لئے لایا گیا تو آنحضرت ﷺ نے اسے دیکھا اور اس سے کہا۔ ''کیا خدا نے تجھے ذلیل و خوار نہیں کیا؟'' حی بن اخطب نے جواب دیا۔ ''موت کے پنجے سے کسی کو بھی رہائی نصیب نہیں ہو سکتی۔ میری عمر کی ایک معیاد مقرر ہے، اس سے تجاوز میں کیسے کر سکتا ہوں؟ لیکن پھر بھی میں نے آپ ﷺ کے خلاف جو قدم اٹھایا اس پر مجھے ندامت نہیں ہے۔'' پھر اس نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''حکم الٰہی سے ہراساں نہ ہونا چاہیے۔ بنی اسرائیل پر خدا کے حکم سے مصائب و حوادث کے پہاڑ ٹوٹے ہیں۔''

ایک یہودی نے جس کا نام زبیر تھا، جنگ بعاث میں حضرت ثابتؓ بن قیس پر احسان کیا تھا اور انہیں قید کر لینے کے بعد آزاد کر دیا تھا، جب حضرت سعدؓ بن معاذ کے حکم سے یہودیوں کے قتل عام کا فیصلہ صادر ہو گیا تو حضرت ثابتؓ بن قیس نے چاہا کہ زبیر کی جاں بخشی کرائیں چنانچہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو پورے واقعہ کی اطلاع دی اور ساتھ ہی یہ درخواست کی کہ زبیر کا خون نہ بہایا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت ثابتؓ بن قیس کی درخواست قبول کر لی۔ جب زبیر کو اس معافی اور جاں بخشی کی اطلاع ہوئی تو اس نے کہا کہ مجھ جیسا بوڑھا آدمی زن و فرزند کے بغیر کیسے زندگی کے دن گزارے گا؟ حضرت ثابتؓ کی سفارش سے یہ بات بھی مان لی گئی کہ اس کے زن و فرزند اسے دے دیئے جائیں۔ حضرت ثابتؓ کے کہنے سے زبیر

Marfat.com

کے مال و املاک کی واپسی کا حکم بھی صادر کر دیا گیا۔ جب زبیر کو زن و فرزند اور مال و منال کی طرف سے کلی اطمینان ہو گیا تو اس نے یہ دریافت کیا کہ کعب بن اسد حیی بن اخطب اور دوسرے سرداران بنی قریظہ سے کیا معاملہ رہا؟ جب اسے یہ بتایا گیا کہ وہ سب تہ تیغ کئے جا چکے ہیں تو اس نے حضرت ثابتؓ بن قیس سے کہا۔ ''میری خواہش ہے کہ مجھے بھی انہی مقتولین کے زمرہ میں شامل کر دیا جائے۔ ان کے بعد زندگی کا کیا لطف؟ مجھے اس وقت تک ایک لحہ بھی چین نہ آئے گا جب تک کہ میں اپنے دوستوں میں شامل نہ ہو جاؤں۔'' غرض اس کی اس خواہش کے مطابق اس کا سر قلم کر دیا گیا۔

مسلمان کبھی جنگ میں عورتوں اور بچوں پہ تلوار نہ اٹھاتے تھے لیکن اس دن اس عورت کو بھی جس نے چکی کی سل اٹھا کر ایک مسلمان کے ماری تھی اور اسے ہلاک کر دیا تھا، تہ تیغ کیا گیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ مجھے وہ عورت کبھی نہیں بھول سکتی حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اسے تہ تیغ کر دیا جائے گا لیکن اس کے باوجود وہ ہنس رہی تھی اور اس کے چہرہ پر مسرت و شادمانی کے آثار تھے۔ اس موقع پر چار یہودیوں نے اسلام قبول کیا اور قتل سے نجات پائی۔

حی بن اخطب کی گردن پر بنی قریظہ کا خون

ہمارے نزدیک بنی قریظہ کا خون حیی بن اخطب کی گردن پر ہے جو خود بھی ان کے ساتھ اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔ حیی بن اخطب نے وہ پیمان جو آنحضرت ﷺ کے ساتھ مدینہ سے جلاوطنی کے وقت کیا تھا، توڑ دیا تھا اور قریش و غطفان کو نبی کریم ﷺ سے جنگ کے لئے ابھارا تھا۔ اس نے یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان دشمنی کا بیج بویا تھا اور اس کی بنیادیں مضبوط کی تھیں، اسی حیی بن اخطب نے مسلمانوں کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ جب تک یہودی آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقا کو نیست و نابود نہ کر دیں گے، آرام سے نہ بیٹھیں گے۔ اسی حیی بن اخطب نے بنی قریظہ کو نقض عہد کے لئے آمادہ کیا تھا۔ اگر بنی قریظہ وعدہ شکنی نہ کرتے اور غیر جانبدار رہتے تو انہیں کوئی گزند نہ پہنچتا۔ جس وقت عرب فوج نے یثرب کے بالمقابل پڑاؤ ڈالا تو حیی بن اخطب بنی قریظہ کے قلعوں میں پہنچا اور انہیں مسلمانوں سے جنگ کے لئے ابھارا۔ اگر بنی قریظہ پہلے دن ہی اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کر دیتے اور اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے تو ان کی گردنیں نہ ماری جاتیں لیکن یہ بات ہوتی کیسے؟ مسلمانوں کی دشمنی حیی بن اخطب کی روح میں سرایت کر چکی تھی اور اس کے اثر سے بنی قریظہ بھی اسلام کے جانی دشمن ہو چکے تھے یہاں تک کہ حضرت سعدؓ بن معاذ جن سے ان کے عہد و پیمان تھے خوب سمجھتے تھے کہ اگر بنی قریظہ کو زندہ رہنے دیا گیا تو یہ چین سے نہ بیٹھیں گے اور دوبارہ قبائل عرب کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کریں گے اور اگر مسلمان ان کے قبضے میں آ گئے تو یہ ان سب کو تہ تیغ کر دیں گے۔ اس پہلو سے حضرت سعد ؓ کا فیصلہ اگرچہ بظاہر بہت زیادہ متشددانہ معلوم ہوتا ہے لیکن غلط نہ تھا۔ حضرت سعدؓ کے نزدیک یہودیوں کی ہستی و نیستی کا مسئلہ مسلمانوں کی موت و

Marfat.com

حیات کا مسئلہ تھا۔

بنی قریظہ کے اموال کی تقسیم

بنی کریم ﷺ نے بنی قریظہ کے اموال و املاک اور ازواج و اولاد کو خمس وضع کرنے کے بعد مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ تقسیم کی ترتیب یہ تھی کہ سوار کے دو حصے، گھوڑے کا ایک حصہ اور پیادہ کا ایک حصہ، غزوہ بنی قریظہ میں مسلمانوں کے پاس کل چھتیس گھوڑے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت سعدؓ بن زید کو بنی قریظہ کے چند قیدیوں کے ساتھ نجد بھیجا تا کہ وہ انہیں فروخت کر کے گھوڑے اور ہتھیار خرید لائیں اور اس طرح مسلمانوں کے پاس آلاتِ جنگ اور سامان حرب کی کمی نہ رہے۔

ریحانہ جو اسیران بنی قریظہ میں شامل تھی، آنحضرت ﷺ کے حصہ میں آئی تھی، آپ ﷺ نے اسے اسلام کی دعوت دی لیکن اس نے اسے قبول نہ کیا۔ آنحضرت ﷺ چاہتے تھے کہ اس سے عقد کر لیں۔ اس نے کہا بہتر یہ ہوگا کہ آپ مجھے اپنی کنیز بنا لیں، یہ میرے حق میں بھی بہتر ہے اور آپ کے حق میں بھی۔ غالباً ریحانہ نے اپنی قومی عصبیت کی بنا پر تزویج کے لئے آمادگی ظاہر نہ کی یا یہ کہہ لیجئے کہ اس کے دل میں نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کی طرف سے کدورت تھی۔ سیرت نگاروں میں سے کسی نے ریحانہ کے حسن و جمال کی تعریف نہیں کی حالانکہ وہ حضرت زینبؓ بنت جحش کے جمال کی توصیف سے نہیں چوکے، صرف اتنی بات بیان کی گئی ہے کہ ریحانہ حسن و جمال کا مرقع تھی۔ کتب سیرت میں اس چیز سے متعلق اختلاف ہے کہ آیا ریحانہ آنحضرت ﷺ کی دیگر ازواج مطہرات کی طرح پردہ کرتی تھی یا عرب کی ان تمام عورتوں کی طرح جو کھلے منہ پھرتی تھیں ریحانہ بھی بے پردہ تھی۔ ریحانہ آخر دم تک آنحضرت ﷺ کی کنیز رہی۔

غزوۂ احزاب اور بنی قریظہ کے استیصال سے مدینہ میں مسلمانوں کے ملی نظام کی بنیادیں مستحکم ہو گئیں۔ منافقین کے لئے ریشہ دوانی کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ قبائل عرب مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے تذکرے کرنے لگے اور ان پر آنحضرت ﷺ کی شخصی عظمت کی دھاک بیٹھ گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ رسالت کا دائرہ صرف مدینہ اور عرب تک محدود نہ تھا بلکہ آپ ﷺ کی دعوت عالمگیر تھی۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ نے یہ طے کیا کہ دین کی نشر و اشاعت کے لئے راہیں ہموار کریں اور جو مخالفین راستے میں حائل ہوں، انہیں ہٹائیں، غرض اس مقصد اور اس نصب العین پر توجہات مرکوز کی گئیں۔

❁

حواشی

۱۔ شہر سے باہر کے حصہ میں صرف شام کا رخ کھلا ہوا تھا اور اس طرف خندق کھودی گئی۔ باقی تینوں سمتوں میں پہاڑ ہیں۔

۲۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ نوفل سے مبازرت طلبی ہوئی، اور وہ زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ و بروایت دیگر علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ (فتح الباری باب غزوۃ الخندق)

۳۔ طبرانی میں یہ واقعہ ان الفاظ میں مذکور ہے: حارث غطفانی نے رسول اللہ ﷺ کے حضور حاضر ہو کر اپنی قوم کی طرف سے یہ مطالبہ کیا کہ اگر آپ کو مدینہ کی پیداوار کا نصف بطور خراج ہمیں ادا کرنا منظور ہو تو بہتر ورنہ ہماری فوجیں مدینہ کو پامال کرنے کے لئے کافی ہیں۔ فرمایا میں اوس وخزرج کے دونوں سرداروں سے مشورہ کر کے جواب دے سکتا ہوں۔ یہ جناب سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہم تھے۔ جب ان سے دریافت فرمایا تو انہوں نے کہا کہ اس قسم کا معاہدہ تو ہم ایام جاہلیت میں بھی نہ کرتے، اب تو خدا کے فضل وکرم سے اسلام نے ہماری انسانیت کا معیار بلند کر دیا ہے ہم یہ معاہدہ کیسے کر سکتے ہیں، اگر اس ضمن میں وحی نازل ہوگئی ہوتی یا آپ کا دلی منشا ہوتا تو ہم بسر وچشم اسے قبول کر لیتے، بنی غطفان کے اور ہمارے درمیان اب تو تلوار فیصلہ کرے گی۔ بنی غطفان کے قاصدوں نے جو عہد وپیمان کرنے آئے تھے جب یہ نقشہ دیکھا تو انہیں مسلمانوں کی فتح اور اپنی شکست کا پورا پورا یقین ہو گیا۔ چنانچہ بنی غطفان کو جب ان قاصدوں نے صورت حال سے مطلع کیا تو ان کے حوصلے بھی پست ہو گئے۔ سیرت کی تمام مستند کتابوں میں اس واقعہ کی تفصیل دی گئی ہے۔

۴۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ تورات کے مطابق بھی تھا کہ "جب تو کسی شہر پر حملہ کرنے کے لئے جاؤ تو پہلے صلح کا پیغام دے، اگر وہ صلح تسلیم کر لیں۔ لیکن اگر صلح نہ کریں تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو ان پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کر دے۔ باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں سب تیرے لئے مال غنیمت ہوں گی۔ (تورات کتاب تثنیہ: اصحاح: (۲۰) آیہ نمبر ۱۰)

گویا اسی اصول کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے اسے آسمانی فیصلہ سے تعبیر فرمایا۔

۵۔ اس بدنصیب کے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے۔ ازاں جملہ یہ ہے کہ مدینہ سے جلاوطنی کے موقع پر اس نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے خلاف کسی کی مدد نہ کرے گا۔ (بلاذری)

❋

باب 17

غزوۂ خندق اور بنی قریظہ کے استیصال سے لے کر حدیبیہ تک

غزوۂ خندق اور بنی قریظہ کی بیخ کنی کے بعد مدینہ میں آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے جاں نثاروں کو یک گونہ سکون نصیب ہوا۔ عرب قبائل پر دہشت سی طاری ہوگئی، اکثر و بیشتر قریش اس سوچ میں پڑ گئے کہ آیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم (حضرت) محمد (ﷺ) اور آپ ﷺ کے رفقا سے جو ہمارے ساتھ نسبت و قرابت رکھتے ہیں، صلح و آشتی کی طرح ڈالیں اور یہ بات اس لئے بھی ضروری ہے کہ وہ مہاجرین جو آپ ﷺ کی معیت میں ہیں ہمارے ہی سردار اور اکابر تو ہیں۔ مدینہ سے یہودیوں کے اخراج و استیصال کے بعد مسلمانوں کو بھی راحت و آرام کی زندگی نصیب ہوئی۔ غرض پورے چھ مہینے اس عالم میں گزرے کہ ایک طرف تو انہیں زندگی کی گوناگوں نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملا اور دوسری طرف ازدیادِ ایمان اور تعلیماتِ اسلام پر عمل کی راہیں کھلیں۔

اس عرصہ میں آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کی کوششیں یہ بھی رہیں کہ عرب میں ایک ایسے اجتماعی نظام کی تشکیل کریں جس کی نظیر عرب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایسے نظام کی تشکیل اس منظم جماعت کے لئے ناگزیر تھی جو بالتدریج اسلام کے دائرہ اثر و اقتدار میں داخل ہوئی تھی۔ اسلام سے قبل عرب میں کوئی باضابطہ نظام نہ تھا، لوگ رسوم و رواج کے پیرو تھے۔ خاندان اور اس کے نظام، ازدواجی زندگی اور اس کی حدود، طلاق اور اس کی قیود، تعلقاتِ زوجین اور اولاد سے متعلق عرب میں کچھ رسوم تھیں جن پر وہ اپنی مرضی اور طبیعت کے مطابق کاربند تھے۔ کبھی تو برابری کی سطح پر ایک دوسرے سے سلوک روا رکھا جاتا تھا اور کبھی قدیم وضع کی پابندی میں ایک فریق دوسرے فریق کو غلام و چاکر کی حیثیت دیتا تھا۔ ان حالات میں یہ ضروری سمجھا گیا کہ ابتدائے اسلام میں اس نوزائیدہ ملت اسلامیہ کے لئے ایک باضابطہ نظام مرتب کیا جائے جس پر ابھی تک رسوم و رواج کی پرچھائیں نہیں پڑی تھیں اور مختصر مدت میں تمدنِ اسلام کی اساس اس انداز سے استوار کی جائے کہ بعد میں ایران، روم اور مصر کے تمدن سے جب اس کا اختلاط ہو تو اسی کا رنگ غالب رہے اور رفتہ رفتہ اس تمدن کو وہ معراجِ کمال نصیب ہو کہ ایک دن یہ آیۂ شریفہ اس کی شان میں نازل ہو۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ (سورۃ المائدہ: ۳)

Marfat.com

"آج میں نے تمہارے دین کی تکمیل کر دی اور تم کو اپنی نعمت سے پورا پورا نواز دیا اور تمہارے لئے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کیا۔"

اسلام سے قبل عرب کی تمدنی یا بدوی زندگی سے متعلق لوگوں کا عقیدہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، خواہ وہ یہ کہیں کہ مکہ و مدینہ اور اسی طرح دوسرے بلادِ عرب بھی ان ایام میں ایسے تمدن سے آشنا تھے جس میں بدویت کی بو باس نام کو بھی نہ تھی، خواہ یہ کہ ابھی یہ بلادِ عرب تمدن کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے تھے، دراصل حقیقت یہ ہے جس کی شہادت قرآن ہی سے نہیں بلکہ اس دور کے آثار سے بھی ملتی ہے کہ عرب میں اسلام سے قبل مرد اور عورت کے ازدواجی تعلقات حیوانیت کی سطح سے قطعاً بلند نہ تھے۔ مختلف طبقات و قبائل کی ازدواجی زندگی میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ ان میں سے بعض کے طور و طریق ابتدائے نسل انسانی کے وحشی افراد سے ملتے جلتے تھے، یہی وجہ تھی کہ ایامِ جاہلیت میں عورتیں ٹیپ ٹاپ، سج دھج اور بناؤ سنگھار کی بے حد خوگر تھیں۔ غیر مردوں سے ان کا اختلاط معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ مرد و زن کے باہمی میل جول کو کوئی اہمیت نہ دی جاتی تھی۔ کھلے بندوں آپس میں بے شرمی اور بے حیائی کی باتیں ہوتیں اور ان پر کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی۔ انتہا یہ ہے کہ ابوسفیان کی بیوی ہند اس روز جبکہ احد کے میدان میں سخت جنگ ہو رہی تھی قریش کو ان اشعار میں جنگ کی ترغیب دے رہی تھی۔

اِنْ تُقْبِلُوْا نُعَانِقْ وَنَفْرُش النَّمَارِقْ
اَوْ تُدْ بروا نُفَارِقْ فِراقَ غیرِ وَامِقْ

اگر تم ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کرو گے تو ہم تمہیں اپنی آغوش میں جگہ دیں گے اور تمہارے لئے نرم و گرم مخمل کے فرش بچھائیں گے اور اگر تم نے دشمن کو پیٹھ دکھائی تو ہم تم سے ہمیشہ کے لئے جدائی اختیار کر لیں گے۔

ایامِ جاہلیت میں بعض قبائل عرب کے نزدیک زنا کو کوئی بڑا جرم نہیں سمجھا جاتا تھا، عشق و مستی کے مشاغل عام تھے۔ غیر مردوں سے میل جول میں کوئی قباحت نہ تھی۔ ابوسفیان کی بیوی ہند، باوجودیکہ اس کا شوہر صاحب جاہ و منصب تھا، عام روایات کے موجب غیر مردوں سے راز و نیاز کی باتیں کیا کرتی تھی اور اس قبیح عادت کے باعث اس کے قرابتداروں کی نظر میں اس کی عزت پر حرف نہ آتا تھا۔ جب کسی عورت کے ہاں کوئی لڑکا پیدا ہوتا اور اس کی ولدیت مشتبہ ہوتی تو وہ عورت بڑی ڈھٹائی سے ان تمام مردوں کے نام گناتی جو اس سے ہم بستر ہوئے تھے اور جس کسی سے بھی اس لڑکے کا حلیہ ملتا اسی سے اسے منسوب کر دیتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک مرد اپنی مرضی سے جتنی عورتیں اور کنیزیں چاہے تصرف میں لا سکتا تھا۔ عورتوں اور کنیزوں کو بھی کھلی آزادی تھی کہ وہ جس سے چاہیں تعلق جوڑ لیں۔

جب نوبت رسوائی اور بدنامی تک پہنچتی، سخت و سست باتیں سننے میں آتیں اور جنگ و جدل تک بات

Marfat.com

جا پہنچتی تو حالات کی نوعیت ہی بدل جاتی، عشق و محبت کے وہ رابطے جو پہلے دوستی کے پردے میں چھپے ہوتے تھے دشمنی انہیں طشت ازبام کر دیتی، اس کے بعد جنگ و جدل کے لئے زمین ہموار ہوتی اور بغض و عناد کی آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے۔ پھر کیا تھا زبانوں کی تلواریں نیام سے باہر نکل آتیں اور ہر شخص دوسرے کی عزت و ناموس پر جیسے چاہتا حملہ کرتا۔ عرب کے باشندے چونکہ کھلی فضا میں زندگی بسر کرتے ہیں اور انہیں اپنی حاجات کی جستجو میں صحرا کے طول و عرض کی خاک چھاننی ہوتی ہے اس لئے کبھی کبھی وہ مبالغہ اور دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں۔ تخیلات کی پرواز میں ان سے کوئی بازی نہیں جیت سکتا۔ فارغ اوقات میں ان کا بہترین مشغلہ یہی ہوتا ہے کہ کسی سے عشق و محبت کی راہ و رسم پیدا کریں، اسی میدان میں ان کا اشہب فکر و خیال زقندیں بھرتا ہے، صلح و آشتی اور امن و دوستی کے زمانے میں یہ ہوتا ہے کہ ایک عاشق اپنی محبوبہ کا تذکرہ کرتا اور اس کے حسن و جمال کی تعریف کرتا ہے لیکن اس حد سے تجاوز نہیں کرتا، لیکن جب تعلقات میں کشیدگی آ جاتی اور نوبت جنگ و جدل تک پہنچتی ہے تو پھر یہ عاشق پھکڑ پن پر اتر آتا ہے اور جو اس کے منہ میں آتا ہے بکتا پھرتا ہے مثلاً یہ کہتا ہے کہ میں نے اسے عریاں دیکھا ہے، پھر گردن، سینہ، کمر وغیرہ کی تصویر الفاظ میں کھینچتا اور بڑھ بڑھ کر باتیں کرتا ہے۔ حالانکہ ظہورِ اسلام کے بعد یہ پرانی بساط الٹ گئی ہے تاہم اس کے آثار آج بھی عرب شعرا کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔

دیگر اقوام کی اخلاقی حالت

وہ لوگ جو تمدنِ عرب کے دلدادہ ہیں اور جن کے نزدیک ایام جاہلیت کی بدوی زندگی بھی تمدن سے ناآشنا نہیں رہی۔ شاید ہماری باتوں کو مبالغہ پر محمول کریں، ہم انہیں معذور سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ مرد و زن کے ان روابط کو جو ایام جاہلیت کی یادگار ہیں، دورِ حاضر کے عرب کی زندگی پر قیاس کرتے ہیں حالانکہ یہ قیاس سرے سے غلط اور گمراہ کن ہے بلکہ مناسب تو یہ ہے کہ وہ قبائل عرب کی اس زندگی کا جو ساتویں صدی عیسوی میں تھی اسی دور کی اقوام کی زندگی سے موازنہ کریں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ باوجودیکہ قبائل عرب کی زندگی قریب قریب وحشیانہ زندگی تھی لیکن پھر بھی انہیں اپنی ہم عصر اقوام پر فوقیت حاصل تھی تو یہ کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ ہندوستان اور چین کے لوگ اس دور میں کس انداز کی زندگی بسر کرتے تھے؟ اس سوال کا جواب اور اس سے متعلق معلومات ہمارے پاس نہیں ہیں اس لئے ہم اس ضمن میں کچھ نہیں کہنا چاہتے البتہ یہ حقیقت ہے کہ شمالی اور مغربی یورپ کی اقوام ان ایام میں ظلمت و جہالت کا شکار تھیں۔ ان کی معاشرتی زندگی وحشیوں کی سی تھی۔ روم اگرچہ آئینی اور سیاسی اعتبار سے ممتاز تھا لیکن اس ملک میں عورت کی حیثیت اتنی پست تھی کہ خانہ بدوش عربوں کے ملک کو اس پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ رومی قانونِ معاشرت کی رو سے عورت گویا ایک پونجی تھی جسے مرد جس طرح چاہے استعمال کر سکتا تھا۔ اس کی زندگی اور موت پر بھی اسے کلی اختیار تھا۔ رومی عورتوں سے غلاموں کا سا برتاؤ کرتے تھے اور اس ملک کے قانون میں بھی عورتوں کو غلام کا درجہ دیا گیا تھا۔ عورت عمر بھر مرد کی لونڈی بنی

Marfat.com

رہتی تھی، کبھی باپ کی لونڈی، کبھی شوہر کی اور آخر عمر میں بیٹے کی۔ حیوانات اور جمادات کی طرح عورت بھی مردوں کی ملکیت تصور کی جاتی تھی۔ طبقہ نسواں کا مصرف یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ جذباتِ شہوانیہ کی تسکین کا ایک ذریعہ ہے اور خود اپنی عصمت کی حفاظت پر اسے قدرت نہیں۔ اس لئے یہ رومی اس کی پاک دامنی کی حفاظت کے لئے نطاقِ عصمت کا استعمال کرتے تھے اور یہ رسم صدیوں بعد تک جاری رہی (نطاقِ عصمت لوہے کی پیٹی پٹکا ہوتا تھا جس سے قدیم روم کے چابک سوار اپنی عورتوں کی کمر اور ٹانگیں کس دیتے تھے تاکہ ان کی غیر حاضری میں ان کی عورتوں کی عصمت محفوظ رہے)۔ یہ وہ دور ہے جبکہ جزیرۃ العرب میں عورتوں کی حالت بدرجہا بہتر تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام طبقہ نسواں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔ ایک دفعہ آپ کے سامنے ایک عورت کو، جو زنا کی مرتکب ہوئی تھی، سنگسار کرنے کی تجویز پیش کی گئی تو آپ نے فرمایا:

مَنۡ لَمۡ یَکُنۡ مِنۡکُمۡ ذَا خَطِیۡئَۃٍ فَلۡیَرۡمِهَا بِحَجَرٍ

"تم میں سے جو شخص کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوا وہ اسے (سنگسار کرنے کے لئے) پہلا پتھر مارے۔[1]"

اس اسوۂ مسیح کے باوجود مسیحی یورپ بھی قدیم اصنام پرست یورپ کی طرح عورت کو مبتذل اور پیش پا افتادہ سمجھتا تھا۔ مسیحیت کے پیروؤں کی نظر میں مرد و زن کے ازدواجی تعلقات کی بنیاد نہ صرف جوانی کے میلانات پر تھی بلکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ عورت کی حیثیت محض ایک باندی اور لونڈی کی سی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں متکلمین کا موضوع بحث یہ مسئلہ رہا ہے کہ آیا قدرت نے عورت کو بھی اسی روح سے نوازا ہے جو مرد کو عطا کی گئی ہے۔ آیا مردوں کی طرح قیامت میں عورتیں بھی زندہ کی جائیں گی اور ان سے بھی ان کے اعمال کا حساب و کتاب ہوگا یا ان کا حشر ان حیوانات کا سا ہوگا جو روحِ انسانی سے محروم ہیں، جنہیں موت کے بعد زندہ نہیں کیا جائے گا اور جن سے اعمال کی پرسش بھی نہ ہوگی اور جن کے لئے آسمانی بادشاہیت میں کوئی گنجائش نہیں۔

اسلام اور اصلاح و تجدید

وحی الٰہی کی روشنی میں نبی کریم ﷺ پر یہ حقیقت واضح کر دی گئی تھی کہ اجتماعی نظام کی تشکیل مرد و زن کے تعاون کے بغیر عمل میں نہیں آ سکتی لہٰذا یہ ضروری ہے کہ عورت اور مرد زندگی کے تمام شعبوں میں ایک دوسرے کی پوری پوری اعانت کریں، مردوں کی سرپرستی میں عورتوں کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے حقوق سے بہرہ یاب ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی تھی کہ قدیم رسوم کا فوری انسداد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ عرب جو دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے ان کے ایمان کی بنیادیں استوار تھیں لیکن اس کے باوجود اصلاحِ معاشرہ کی رفتار تدریجی تھی تاکہ یہ روش ازدیادِ ایمان اور دائرہ اسلام میں توسیع کی موجب

Marfat.com

ثابت ہو۔ تمام اجتماعی اصلاحات جو پروردگار نے وقتاً فوقتاً مسلمانوں کی سود و بہبود کے لئے نافذ کیں ان کی صورت اور ان کا انداز یہی تھا۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج ایسے واجبات و فرائض نیز شراب، جوا، خنزیر اور انہی کے مانند دوسرے محرمات سے متعلق احکام کی حیثیت بھی تدریجی ہے۔ مرد وزن کے تعلقات کی اصلاح کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ نے ابتدا خود اپنی ذات سے کی، مسلمانوں کے آنکھوں دیکھتے اجتماعی اصلاحات کے میدان میں پہلا قدم سرور کونین ﷺ نے اٹھایا تھا۔

غزوۂ خندق سے پیشتر آپ ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن باپردہ نہ تھیں، غزوۂ خیبر سے ایک سال بعد آپ ﷺ نے ایک مسلمان کو بشرط عدل و انصاف چار بیویوں تک سے عقد کی اجازت دے دی تھی۔ مقام حیرت ہے کہ آپ ﷺ نے ابتدا ہی میں ازدواجی تعلقات کی حدود متعین کر دیں اور کچھ اس انداز سے مرد وزن کے مساوی حقوق کی نگہداشت کے لئے زمین ہموار کی کہ بعد میں قرآنی تصریحات کی رو سے یہی روش اسلام کا جزو بن گئی۔ آپ ﷺ نے مردوں کی سرپرستی میں عورتوں کو بھی اپنے بنیادی حقوق سے بہرہ یابی کا موقع دیا۔

ابتدا میں مرد وزن کے تعلقات پر حیوانیت کی چھاپ تھی۔ مسلمان بھی عربوں کی طرح اسی روگ میں مبتلا تھے، عورتوں میں بناؤ سنگھار کی لت اس انتہا کو پہنچی ہوئی تھیں کہ مرد عام گزرگاہوں میں کھلے بندوں ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ جہاں یہ صورت ہو وہاں انسانیت اور روحانیت کی بنیاد پر مرد وزن میں تعلقات کیسے برقرار رہ سکتے تھے؟ یہودی اور منافق جو مدینہ میں آباد تھے۔ نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کی دشمنی میں اتنی گری ہوئی سطح پر اتر آئے تھے کہ وہ مسلمان خواتین کو چلتے پھرتے چھیڑتے تھے اور کبھی اس حد سے گزر کر اذیت بھی پہنچاتے تھے۔ ان بدطینتوں کی روش سے مسلمانوں کے لئے کچھ ایسی دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں کہ ان پر قابو پانا ان کے امکان سے باہر تھا چنانچہ جیسا کہ ہم نے اس سے پیشتر بیان کیا ہے محاصرۂ بنی قینقاع اسی قسم کے حوادث کا نتیجہ تھا۔ اگر مسلمان خواتین اظہار زینت نہ کرتیں اور سادہ وضع ان کی زندگی کا طرۂ امتیاز ہوتا تو لوگوں کو چھیڑ چھاڑ کا موقع ہی نہ ملتا اور وہ مشکلات جو بے پردگی اور خود نمائی کے سبب سے راہ پا گئی تھیں، سرے سے پیدا ہی نہ ہوتیں۔ غرض ان حالات کے پیش نظر اسلام نے مرد وزن کے تعلقات کی اصلاح اصول مساوات کی روشنی میں کی اور مسلمانوں کو یہ محسوس بھی نہ ہونے دیا کہ ان کی زندگی کے طور و طریق اور ان کے معاشرہ کی پرانی قدریں تبدیل کی جا رہی ہیں۔ اس ضمن میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا
بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿٥٨﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ
يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ
اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٥٩﴾ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ

Marfat.com

وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا
قَلِيْلًا ﴿۶۰﴾ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿۶۱﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي
الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۶۲﴾ (سورۃ الاحزاب: ۵۸ تا ۶۲)

"اور جو لوگ مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بغیر اس کے کہ انہوں نے قصور کیا ہو ناحق کی تہمت لگا کر ایذا دیتے ہیں تو وہ (جھوٹ) طوفان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنی گردن پر لیتے ہیں۔ اے نبیؐ اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی چادروں کے گھونگھٹ نکال لیا کریں اس سے غالباً یہ الگ پہچان پڑیں گی (کہ نیک بخت ہیں) اور کوئی چھیڑے گا نہیں اور منافق اور وہ لوگ جن کی نیتیں بد ہیں اور جو لوگ مدینہ میں جھوٹی جھوٹی افواہیں پھیلایا کرتے ہیں اگر اپنی حرکات سے باز نہ آئیں گے تو اے پیغمبر ﷺ! ہم تم کو ایک نہ ایک دن ان پر اکسائیں گے پھر یہ لوگ مدینہ میں تمہارے پڑوس میں تو ٹھہرنے کے نہیں مگر چند روز (عارضی طور پر) ان کا یہ حال ہوگا کہ ہر طرف سے پھٹکارے ہوئے، جہاں ملیں گے پکڑے جائیں گے اور ان کے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں گے اور جو لوگ پہلے ہو گزرے ہیں ان میں خدا کا دستور یہی رہا ہے اور (اے پیغمبر ﷺ) تم خدا کے دستور میں ہرگز کسی طرح کا ردوبدل نہ پاؤ گے۔"

غرض مسلمانوں نے عرب کی قدیم رسوم و عادات کو پامال کر دیا اور شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جن کا منشا یہ تھا کہ معاشرہ کو تمام آلودگیوں سے پاک و صاف کر دیں اور جنہوں نے زنا کو گناہ کبیرہ قرار دیا تھا، مسلمانوں کی توجہ اس چیز پر مرکوز کی کہ عورتوں کو ان لوگوں کے سامنے بناؤ سنگھار نہ کرنا چاہیے جن سے ان کی کوئی قرابت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بارے میں ارشاد فرماتا ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى
لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ
اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا
وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰي جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ
اٰبَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ
اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَاۗىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ
غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰي عَوْرٰتِ
النِّسَاۗءِ ۠ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۭ وَتُوْبُوْٓا اِلَى
اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾ (سورۂ نور: ۳۰، ۳۱)

"اے پیغمبر ﷺ! مسلمانوں سے کہو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اس میں ان کی زیادہ صفائی ہے۔ لوگ جو کچھ بھی کیا کرتے ہیں اللہ کو (سب) خبر ہے اور (اے پیغمبر ﷺ) مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ بھی اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کے مقامات کو ظاہر نہ ہونے دیں مگر جو اس میں سے (چار و ناچار) کھلا رہتا ہے تو اس کا اظہر ہوتے رہنا مضائقے کی بات نہیں، اپنے سینوں پر دوپٹوں کے بکل مارے رہیں اور اپنی زینت (کے مقامات) کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے باپ یا اپنے خاوند کے باپ پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر یا اپنے بھائیوں پر یا اپنے بھتیجوں پر یا اپنے بھانجوں پر یا اپنی (یعنی اپنے میل جول کی) عورتوں پر یا اپنے ہاتھ کے مال (یعنی لونڈی غلاموں) پر یا (گھر کے لگے ہوئے ایسے) خدمتیوں پر کہ مرد (تو) ہیں مگر عورتوں سے کچھ غرض و مطلب نہیں رکھتے (جیسے خواجہ سرا یا بوڑھے پھونس) یا لڑکوں پر جو عورتوں کے پردے (کی بات) سے آگاہ نہیں اور (چلنے میں) اپنے پاؤں ایسے زور سے نہ رکھیں کہ (لوگوں کو) ان کے اندرونی زیور کی خبر ہو اور مسلمانو! تم سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو تاکہ تم (آخرکار) فلاح پاؤ۔"

اسلام نے مردوزن کے باہمی تعلقات کو اس انداز میں استوار کیا، اس نے یہ ہدایات دیں کہ فریقین شر و فساد کے مواقع سے دور ہی رہیں تو بہتر ہے لیکن ان مواقع کے علاوہ ان پر اور کوئی پابندی عائد نہیں کی کیونکہ دونوں کو برابر کی حیثیت دی گئی ہے، دونوں پر عبدیت کی مہر ہے، دونوں خیر و فلاح اور صلاح و تقویٰ کی سطح پر ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی انسانیت کی مقررہ حدود سے تجاوز کر بیٹھے اور نفسانی ترغیبات اس پر غالب آ جائیں تو اس پر لازم یہ ہے کہ رب قدوس کی بارگاہ میں توبہ کرے۔ وہ تواب بھی ہے اور غفور الرحیم بھی۔

ایسی تعلیم ان عربوں کی زندگی میں جو صدیوں رسوم و عادات کے خوگر رہ چکے تھے تھوڑی سی مدت میں ایسا انقلاب نہیں لا سکتی تھی جیسا کہ توحید پر ایمان اور شرک سے بیزاری کی شکل میں اس سے قبل رونما ہوا۔ دراصل انقلاب بھی طبعی تقاضے کے تابع ہوتا ہے۔ ٹھیک جس طرح مادہ کی ارتقائی منازل تدریج و امہال کے بغیر طے نہیں ہوتیں کیونکہ اس پر طبعی قانون کی گرفت ہے، اسی طرح بنی نوع انسان کی زندگی میں بھی جب انقلاب رونما ہوتا ہے تو اس کا ظہور بھی فی الفور نہیں بلکہ بالتدریج ہوتا ہے۔ جب کسی انسان کی زندگی میں رسوم و عادات جڑ پکڑ لیں اور اس کی طبیعت اور اس کے مزاج میں رچ بس جائیں تو ان کی اصلاح کے لئے فوری اقدام دانشمندی کے منافی ہوتا ہے، ہاں البتہ جب مرورِ زمانہ اور امتدادِ ایام سے یہ گرفت خود بخود ڈھیلی ہونی

Marfat.com

شروع ہو جائے تو وہ اپنی زندگی میں اگر تغیر گوارا کر لے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ جب انسان کی زندگی تغیرات کی آماجگاہ بن جاتی ہے تو آہستہ آہستہ قلب ماہیت کے امکانات کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اسلام نے بھی مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی اصلاح کے لئے اسی طریقہ پر عملدرآمد کیا، شروع شروع میں صرف ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بال آخرت سے متعلق اسلام نے عقائد کی بنیاد مضبوط کی لیکن اس کے باوجود بہت سی قدیم رسوم جو مادی زندگی سے ہم رشتہ تھیں پامال نہیں کی گئی تھیں۔ بدوی زندگی کے اثرات مسلمانوں کی زندگی میں بھی نمایاں تھے، انہیں عورتوں سے میل جول اور بات چیت کا لپکا پڑا ہوا تھا جو آسانی سے نہ چھوٹ سکتا تھا۔ اگرچہ مرد وزن کے روابط میں کافی سے زیادہ اصلاح ہو چکی تھی لیکن ابھی تک بعض امور میں ان کی حالت پہلے کی سی تھی۔ کبھی کوئی مسلمان کاشانہ نبوت میں (احکام پردہ کے نفاذ سے قبل) آتا تو گھنٹوں آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے مصروف گفتگو رہتا حالانکہ آپ ﷺ کی مصروفیتیں کچھ اس قسم کی تھیں کہ ان میں ایسی طویل گفتگو سے خلل واقع ہوتا تھا، آپ کو بعض اہم امور پر یکسوئی سے غور وخوض کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بے ضابطگی کا خاتمہ کرنے کے لئے یہ آیت نازل کی۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَىٰ طَعَامٍ غَيْرَ نَاظِرِينَ إِنَاهُ وَلَٰكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ ۖ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ ۚ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ۚ ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ ۚ وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا ۚ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمًا ﴿٥٣﴾ (سورۃ الاحزاب: ۵۳)

"مسلمانو! پیغمبر کے گھروں میں نہ جایا کرو مگر یہ کہ تم کو کھانے کے لئے (آنے کی) اجازت دی جائے (تو اس صورت میں ایسا وقت تاک کر جاؤ) کہ تم کو کھانے کے لئے تیار ہونے کا انتظار نہ کرنا پڑے مگر جب تم کو بلایا جائے تو عین وقت پر جاؤ اور جب کھا چکو تو آپ سے اٹھ کر چل دو اور باتوں میں نہ لگ جاؤ، اس سے پیغمبر ﷺ کو ایذا ہوتی ہے اور وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں اور اللہ تو حق بات کہنے میں کسی کا کچھ لحاظ کرتا نہیں اور جب پیغمبر ﷺ کی بیویوں سے تمہیں کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے باہر (کھڑے رہ کر) ان سے مانگو اس سے تمہارے دل (ان کی طرف سے) خوب پاک صاف رہیں گے اور اس طرح ان کے دل بھی، اور تم کو کسی طرح شایاں نہیں کہ رسول خدا ﷺ کو ایذا دو اور نہ یہ (بات شایاں ہے) کہ ان کے بعد کبھی ان کی بیویوں سے نکاح کرو، خدا

Marfat.com

کے نزدیک یہ بڑی بے جابات ہے۔"

اس آیۂ شریفہ میں مومنین سے خطاب کیا گیا ہے۔ نیز انہیں ان فرائض سے آگاہی بخشی ہے جو نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کی ازواج مطہرات ؓ سے متعلق ان پر عائد ہوتے ہیں۔ ذیل کی آیت میں ازواج مطہرات ؓ کو مخاطب کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنی حیثیت سے ناآشنا نہ رہیں۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝ (سورۃ الاحزاب: ۳۲، ۳۳)

"اے پیغمبر کی بی بیو! تم کچھ عام عورتوں کی طرح تو ہو نہیں (پس) اگر تم کو پرہیزگاری منظور ہے تو دبی زبان سے (کسی کے ساتھ) بات نہ کیا کرو کہ ایسا کرو گی تو جس کے دل میں کھوٹ ہے وہ خدا جانے تم سے کس طرح کی توقعات پیدا کرے گا اور بات بھی کرو تو بے لاگ لپٹ جیسا کہ پاک لوگوں کا دستور ہے۔ اور اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہو اور اگلے زمانہ جاہلیت کے (سے) بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور خدا اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرو، اے پیغمبر ﷺ کی گھر والیو! خدا کو تو بس یہی منظور ہے کہ تم سے ہر قسم کی گندگی دور کرے اور تم کو ایسا پاک صاف بنا دے جیسا کہ حق ہے۔"

انسانی معاشرہ کی فلاح وبہبود کے لئے اسلام نے جس جدید اجتماعی نظام کی تشکیل کی تھی اس کی تمہید دراصل مرد وزن کے روابط سے متعلق ان نظریات کی اصلاح تھی جو عوام کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں رہ پا چکے تھے۔ اسلام کی منشا یہ تھی کہ طبائع پر جنسی میلانات کا تسلط نہ رہے اور انہیں ایک ایسی حیثیت دے دی جائے جنہیں کسی قیمت پر بھی عوام درخورِ اعتنا نہ سمجھیں۔ اسلام نے اجتماعی نظام کی اساس ایسے وسائل پر رکھی جن کی بدولت انسانیت کے اعلیٰ مدارج آسانی سے طے کئے جا سکتے ہیں اور جو انسان کے لئے زندگی سے بہرہ یابی کے مواقع بھی بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ وسائل ایسے ہیں جو کسی انسان کی آزادی سلب نہیں کرتے بلکہ ان کے طفیل آزادی کے دائرے میں کچھ وسعت ہی ہو جاتی ہے۔ وسیع و عریض کائنات سے اور وسائل کے طفیل انسان کا رشتہ اتنا محکم ہو جاتا ہے کہ زراعت، صنعت اور تجارت کی راہیں بھی اس کے رہوارِ عزم و عمل کی جولانگاہیں بن جاتی ہیں۔ ان مشاغلِ حیات سے اس کا تعلق چونکہ ایک ضابطے میں، ایک رابطے کے ماتحت ہوتا ہے اس لئے کبھی اسے اپنی نیکوکاری کے سبب نفوسِ قدسیہ کی صف میں جگہ ملتی ہے تو کبھی اسے مقرب

Marfat.com

فرشتوں کے انتہائی قرب کا مقام نصیب ہوتا ہے۔ روزہ، نماز اور زکوٰۃ مجد وشرف کے حصول کے لئے وسائل کا حکم رکھتے ہیں۔ بے حیائی، ناشائستہ کرداری اور سرکشی سے بچاؤ کے ذرائع اور دل و دماغ کی تطہیر و تقدیس کے اسباب اگر فراہم ہوتے ہیں تو انہی ارکان کے طفیل، ماسوا اللہ کی پرستش اور اس کے حضور اظہار عبودیت سے یہی ارکان باز رکھتے ہیں۔ اخوت و مساوات کی بنیادیں بھی انہی کے ذریعے سے استوار ہوتی ہیں۔ ایک فرد کا پوری جماعت انسانی سے رابطہ بھی انہی ارکان کی بدولت قائم ہوتا ہے۔

اسی دوران میں جدید اجتماعی نظام کے لئے تدریجی رفتار سے زمین ہموار کی جا رہی تھی۔ قریش اور عرب قبائل برابر اس ٹوہ میں لگے ہوئے تھے کہ انہیں موقع ملے تو وہ کم سے کم مدت میں اسلام کی بڑھتی طاقت کا سیلاب ہمیشہ کے لئے فرو کر دیں۔ نبی کریم ﷺ اور مسلمان بھی دشمنانِ اسلام کی طرف سے بے فکر نہ تھے۔ انہیں ہر وقت ان کی فوج کشی کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ یہاں بھی کسی ایسے موقع کا انتظار تھا کہ کفار پر ایسا بھرپور وار کیا جائے کہ پھر ان میں مقابلے کی سکت ہی نہ رہے۔

غزوۂ بنی لحیان

دو سال قبل بنو لحیان نے حضرت خبیب بن عدی رضی اللہ عنہ کو گرفتار اور ان کے ساتھیوں کو رجیع کے مقام پر مکر و فریب سے تہ تیغ کر دیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ان شہداء کے قصاص کی نیت سے لشکر اسلام کو کوچ کا حکم دیا، مصلحت کے تحت آپ ﷺ نے یہ راز کسی پر منکشف ہونے نہ دیا کہ رخت سفر کس مقام کے لئے باندھا جا رہا ہے۔ بظاہر آپ ﷺ نے اپنے جاں نثاروں سمیت شام کا قصد کیا اور جب کچھ منزلیں طے کرنے کے بعد آپ ﷺ کو یہ اطمینان ہو گیا کہ کفار قریش ہمارے عزائم سے بے خبر ہیں تو آپ ﷺ نے لشکر اسلام کا رخ مکہ کی جانب پھیر دیا۔ یہ لشکر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا بنی لحیان کی اس وادی میں آ پہنچا جسے ضران کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ لشکر اسلام نے جس مقام پر منزل کا رخ بدلا تھا بنی لحیان کے کسی فرد نے تاڑ لیا اور پہلے ہی اپنے قبیلہ کو پیش آ رہے خطرہ سے خبردار کر دیا تھا جس کے نتیجے میں بنی لحیان اپنے چوپائے اور ضروری سامان خورونوش لے کر پہاڑ کے دامن میں روپوش ہو گئے تھے۔ لشکر اسلام وہاں پہنچا تو میدان صاف پایا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے تعاقب میں دو سو سواروں کے ہمراہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو عسفان تک بھیجا مگر ان کا کہیں کھوج نہ ملا۔ آخر مدینہ کو واپسی ہوئی۔ موسم گرما کی شدت پورے زوروں پر تھی۔ لشکر اسلام جب مدینہ کی حدود میں داخل ہوا تو آپ نے یہ ارشاد فرمایا۔

> ''ہم اپنے رب کی حمد و ثنا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں اپنے وطن کو مراجعت کی توفیق دی، زحمت سفر، آزار بازگشت اور مال و اہل و عیال کے ناخوش کن نظارہ سے میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔''

Marfat.com

غزوۂ ذی قرد

غزوۂ بنی لحیان کے بعد ابھی لشکر اسلام نے اطمینان کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ چند دن بعد عینیہ بن حصن فرازی نے مدینہ کی چراگاہ پر حملہ بولا۔ وہ مدینہ کے ایک گلہ بان کو قتل کر دینے کے بعد مقتول کی اہلیہ اور اونٹوں کے ریوڑ ہمراہ لے کر کوچ کرنے ہی کو تھا کہ حضرت سلمہؓ بن عمرو بن الاکوع کی نظر پڑ گئی۔ آپؓ نے اس دستے کا تعاقب کیا اور مدینہ کے پہاڑ سلع تک اس پر بڑی جوانمردی سے تیر برسائے۔ سلع کے مقام پر حضرت سلمہؓ نے چلا چلا کر مسلمانوں کو آوازیں دیں لیکن اس کے باوجود تعاقب برابر جاری رکھا اور تیر برسانے میں بھی کوتاہی نہ کی۔ رسول کریم ﷺ نے ان کی آواز سنی تو شہر میں عام اعلان کرا دیا کہ جلد از جلد مسلح ہو کر آ جاؤ۔ جب چہار طرف سے مسلمان اکٹھے ہو گئے تو آپ ﷺ نے انہیں ہمراہ لے کر دشمن کے تعاقب میں قدم بڑھائے یہاں تک کہ ذی قرد کے مقام پر آ پہنچے۔ عینیہ بن حصن فرازی اپنے دستے کے ہمراہ بھاگا چلا جا رہا تھا اور اس کا ارادہ یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح بنی غطفان کی بستی میں پہنچ کر دم لے اور مسلمانوں سے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانیں بچا لے جائے۔ لیکن مجاہدین اسلام نے بھی کمال یہ کیا کہ اس مفرور دستے کے ہمراہ آخری حصہ کے جو اونٹ تھے ان پر قبضہ کر لیا۔ اس اثناء میں آنحضرت ﷺ بھی آ پہنچے، تھوڑی دیر بعد مقتول گلہ بان کی اہلیہ بھی آتی ہوئی دکھائی دی۔ مسلمانوں نے مؤدبانہ گزارش کی کہ حضور ﷺ! ہمیں لٹیروں کا پیچھا کرنے دیجئے۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے انہیں اس ارادہ سے باز رکھا اور یہ ارشاد فرمایا کہ تعاقب سے اب کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ یہ لوگ بنی غطفان کی بستی میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ غرض مسلمان مدینہ واپس چلے آئے اور ان کے ہمراہ سرور کونین ﷺ بھی۔ مقتول گلہ بان کی اہلیہ جس اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ آئی اس نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر اس اونٹ نے مجھے صحیح وسالم مدینہ پہنچا دیا تو میں اللہ کی راہ میں اسے قربان کر دوں گی۔ اس منت کی خبر نبی کریم ﷺ کو ہوئی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

> "اتنا برا بدلا! اللہ تعالیٰ نے اس اونٹ کے ذریعے سے تجھے دشمنوں کے پنجے سے چھڑایا اور تو اسے قربان کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ ایسی نذر کوئی حقیقت نہیں رکھتی جس سے اللہ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو۔ اس شے کی نذر بھی قبول نہیں کی جا سکتی جو اپنی ملکیت نہ ہو۔"

غزوۂ بنی مصطلق (یا مریسیع)

مدینہ میں دو ماہ قیام کے بعد غزوۂ بنی مصطلق سے سابقہ پڑا۔ مریسیع کے مقام پر، جو ایک تالاب ہے مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ یہ غزوہ ارباب سیرت اور مؤرخین کے نزدیک خصوصیت سے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور اس لحاظ سے اس پر جتنی بھی توجہ مبذول کی جائے تھوڑی ہے۔ اس غزوہ کی اہمیت صرف اس لئے نہیں کہ مسلمانوں اور ان کے حریفوں کے درمیان غیر معمولی معرکہ آرائی ہوئی یا اس لئے کہ اس موقع پر

Marfat.com

مسلمانوں کو صبر آزما تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑا بلکہ اس کی اہمیت کے وجوہ و اسباب یہ ہیں کہ:

۱ اس غزوہ کے بعد مسلمانوں میں پھوٹ پڑ گئی تھی، رسول کریم ﷺ نے نہایت خوبصورتی سے بیچ بچاؤ کرا دیا اور بات بڑھنے نہ پائی۔

۲ اہمیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس موقع پر آنحضرت ﷺ کا عقد حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بنت حارث سے ہوا اس عقد سے مفید نتائج برآمد ہوئے۔

۳ اس غزوہ کے بعد ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر خوامخواہ کی بہتان تراشی کی گئی۔ اگرچہ اُم المومنین رضی اللہ عنہا کی عمر ان ایام میں سولہ سال سے زائد نہ تھی لیکن پھر بھی آپ کی قوتِ ایمانی کے مقابلہ میں مخالفین اور بدخواہوں کی بات نہ بنی۔

واقعات

بارگاہ رسالت میں یہ خبر پہنچی کہ قبیلہ خزاعہ کی شاخ بنی مصطلق نے اپنی سرزمین میں مکہ کے نزدیک پڑاؤ ڈالا ہے اور لوگوں کو اس جماعت کے افراد آنحضرت ﷺ کے خلاف جنگ کے لئے ابھار رہے ہیں۔ یہ سب کچھ سردار فوج حارث بن ابوضرار کی سرکردگی میں ہو رہا ہے۔ یہ معلومات آنحضرت ﷺ کو ایک اعرابی سے حاصل ہوئیں۔ نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقا بسرعت تمام مسلح ہو کر مقابلہ کے لئے نکلے اور یہ چاہا کہ دشمن پر بے خبری میں حلہ بول دیا جائے۔ اسلامی لشکر میں مہاجرین کے علم بردار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے اور انصار کے حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن عبادہ۔ یہ لشکر مریسیع کے متصل ٹھہرا جو بنی مصطلق کی بستی کے قریب ایک تالاب ہے۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ مجاہدین اسلام نے دشمنوں کو حصار میں لے لیا۔ اس موقع پر ان لوگوں نے جو ان میں سے نہ تھے بلکہ ان کی ترغیب سے ان میں شامل ہو گئے تھے، راہِ فرار اختیار کی۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں مخالفین کے دس آدمی کام آئے۔ ایک مسلمان جن کا نام ہشام رضی اللہ عنہ بن صبابہ تھا، شہید ہوئے۔ انہیں ایک انصاری نے دشمن کے دھوکے میں تہ تیغ کیا تھا۔ بنی مصطلق نے کچھ دیر تک تو مقابلہ میں تیر چلائے لیکن جب انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ مفر کی کوئی صورت نہیں تو انہوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ ان کی عورتیں، بچے، اونٹ اور مویشی اور دوسرا مال اسباب بھی مسلمانوں کے تصرف میں آیا۔

اس غزوہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب کے ہمراہ ان کا ایک سائیس بھی تھا۔ یہ سائیس گھاٹ پر پانی بھرنے کے لئے گیا تو ایک انصاری سے اس کی تکرار ہو گئی، اس انصاری کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا۔ دونوں میں مار کٹائی ہونے لگی تو سائیس نے اپنی مدد کے لئے مہاجرین سے اور انصاری نے خزرج سے فریاد کی۔ رسوائے عام منافق عبداللہ بن ابی نے (جو خود خزرجی تھا) انصاری کی فریاد سنی تو اس نے انصار کے جذبات بھڑکائے اور اس طرح اسے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا، اس نے کہا۔

"مہاجرین کو ہم نے اپنے شہر میں پناہ دی اب یہ زور پکڑ گئے ہیں۔ ہمیں یہ امر مجبوری

Marfat.com

انہیں تہس نہس کرنے کے لئے دانشمندوں کے اس قول پر عمل کرنا پڑے گا کہ اگر کتے کو کھلا پلا کر موٹا تازہ کر دیا جائے تو وہ پہلے اپنے مالک ہی کی گردن دابے گا۔''[3]

اس کے بعد اس نے قسم کھا کر کہا۔

''ذرا ہم مدینہ پہنچ جائیں تو پھر دیکھنا کہ جسے خدا نے عزت دی ہے وہ ذلیل و خوار گروہ کو اپنے شہر سے نکال باہر کرے گا۔''

عبداللہ بن ابی بن سلول نے اپنے ہم قبیلہ افراد سے یہ بھی کہا۔

''تم نے اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماری ہے۔ انہیں (مسلمانوں کو) اپنے یہاں نہ صرف پناہ دی بلکہ ان کی مالی اعانت میں بھی پس و پیش نہیں کیا۔ خدا کے لئے ان کی نصرت و اعانت ہرگز نہ کرو، یہ مجبور و معذور ہو کر خود ہی اپنی راہ لیں گے۔''

یہ باتیں آنحضرت ﷺ کے گوش گزار ہوئیں۔ اتفاق سے حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ بھی حاضر تھے۔ انہوں نے بھی یہ پوری سرگزشت سنی، انہیں جوش آ گیا، آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ﷺ بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیں کہ اسے تہ تیغ کر دیں۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے بہ کمال متانت جواب دیا۔ ''اے عمر رضی اللہ عنہ! تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ میرے بارے میں یہ کہتے پھریں کہ میں اپنے رفقا کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیتا ہوں۔''

حالات کی نزاکت کے پیش نظر آنحضرت ﷺ نے سوچا کہ اگر عبداللہ بن ابی کے فتنہ کا فوری انسداد نہ کیا گیا تو نہ معلوم کیا صورت پیش آئے لہٰذا آپ ﷺ نے یہ کیا کہ لشکر اسلام کو رخت سفر باندھنے اور مدینہ کو کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ حکم خلاف توقع تھا۔ عبداللہ بن ابی کو پتہ چلا تو وہ بارگاہ نبوت میں حاضر ہوا اور اپنی عادت کے مطابق قسمیں کھا کھا کر ان تمام باتوں سے انکار کیا جو اس نے کہی تھیں لیکن آنحضرت ﷺ نے جو ارادہ کر لیا تھا اسی پر قائم رہے اور کوچ کا حکم جو آپ ﷺ نے صادر فرمایا تھا اپنی جگہ بحال رہا۔

تمام دن سفر جاری رہا، رات آئی تو پھر بھی آپ ﷺ کہیں منزل کئے بغیر چلتے ہی رہے، یہاں تک کہ دن نکل آیا، دوسرے دن ظہر کے وقت تک لشکر اسلام سفر میں رہا۔ غرض مدینہ کی حدود میں یہ لشکر داخل ہوا۔ مجاہدین اسلام کے جسم اتنے تھکے ٹوٹے ہوئے تھے کہ اپنے اپنے گھر پہنچتے ہی نیند نے انہیں آ دبایا اور وہ ایسے سوئے کہ کچھ خبر نہ رہی۔ عبداللہ بن ابی نے جو فتنہ برپا کیا تھا لوگوں کے ذہن سے اس کے نقش مٹ گئے۔ کسی کو یہ یاد بھی نہ رہا تھا کہ ابن ابی نے ان سے کیا کیا باتیں کی تھیں۔ غالباً اس طرح کے سفر کی یہی غرض و غایت تھی۔ مسلمان اس غزوہ میں جو مال غنیمت لائے تھے اس میں جہاں مویشی اور اموال تھے وہاں حارث بن ابی ضرار کی دختر جویریہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔

عبداللہ بن ابی کا بغض و حسد

عبداللہ بن ابی بھی لشکر اسلام کے ہمراہ مدینہ آ پہنچا تھا۔ اگرچہ پہلے کی طرح ظاہر میں اس کی گفتگو سے

Marfat.com

یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسلام کا خیر خواہ اور پختہ عقیدہ کا مسلمان ہے لیکن اس کے دل میں بغض وحسد کی بھٹی سلگ رہی تھی۔ بمقام مریسیع اس نے اسلام اور ہادیٔ اسلام ﷺ کے خلاف جو زہر اگلا تھا اس کی تردید و تغلیط میں اس نے ایڑی سے چوٹی تک زور لگایا اور قسمیں بھی کھائیں لیکن قرآن کریم نے ذیل کی آیات میں اس کا بھانڈا پھوڑ دیا۔

هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنفِقُوا عَلَىٰ مَنْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنفَضُّوا ۗ وَلِلَّهِ خَزَائِنُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ ﴿٧﴾ يَقُولُونَ لَئِن رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ ۚ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٨﴾ (سورۃ المنافقون: ۷،۸)

"یہی تو ہیں جو (لوگوں کو) بہکایا کرتے ہیں کہ جو لوگ رسول خدا ﷺ کے پاس (آ جے) ہیں (اپنا پیسہ) ان پر خرچ نہ کرو وہ (عاجز آ کر) آخر کار (آپ ہی) تتر بتر ہو جائیں گے۔ حالانکہ آسمانوں میں اور زمین میں جتنے خزانے ہیں (سب) اللہ ہی کے ہیں مگر منافقین کو اتنی سمجھ نہیں۔ (یہ منافق) کہتے ہیں کہ اگر مدینہ کو لوٹ گئے تو عزت والا ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا، حالانکہ اصل عزت اللہ کی، اس کے رسول ﷺ کی اور مسلمانوں کی ہے مگر منافقین نہیں جانتے۔"

ان آیات کے نزول کے بعد مسلمانوں کو یہ پختہ یقین ہو گیا تھا کہ عبداللہ بن ابی کی خیر نہیں، ان میں اس رئیس المنافقین کے پاک باطن فرزند عبداللہ رضی اللہ عنہ (بن عبداللہ بن ابی بن سلول) بھی تھے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے گزارش کی، یارسول اللہ ﷺ! سننے میں یہ بات آئی ہے کہ آپ ﷺ میرے والد کو قتل کرا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بہتر یہ ہو گا کہ آپ ﷺ مجھے اس کام پر مامور کریں، میں اپنے باپ کا سر قلم کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ اے اللہ کے رسول ﷺ! خزرجیوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو مجھ سے زیادہ اپنے باپ کی عزت اور اس کا ادب کرتا ہو لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ میرے سوا کسی دوسرے سے اگر آپ ﷺ نے میرے باپ کو تہ تیغ کرایا، تو محبت پدری کا تقاضا مجھے اس سے انتقام لینے پر آمادہ کر دے گا، میں یہ برداشت نہ کر سکوں گا کہ میرے باپ کا قاتل آزادی سے چلے پھرے اور میں اسے دیکھوں۔ جب تک میں اسے قتل نہ کر لوں گا مجھے تسکین نہ آئے گی۔ لیکن بات یہ ہے کہ مجھے یہ علم بھی ہے کہ اگر میں اپنے کافر باپ کے انتقام میں صاحب ایمان کو قتل کروں گا تو میرے جہنمی ہونے میں کوئی شبہ نہ رہے گا۔ یہ چیز بھی مجھے منظور نہیں۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ (بن عبداللہ بن ابی) نے جس انداز میں آنحضرت ﷺ سے یہ گفتگو کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت اپنے دل میں کئی خیالات لئے ہوئے تھے۔ محبت پدری، ایمانی قوت، نسلی عصبیت اور

Marfat.com

مسلمانوں سے ربط خاطر سے متعلق جو احساسات حضرت عبداللہؓ کے دل میں جاگزیں تھے ان کی وجہ سے ان پر کیفیت اضطراب طاری تھی۔ حضرت عبداللہؓ نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا اس سے بہتر اور کوئی پیرایہ نہ ہوسکتا تھا۔ محبت پدری، پختہ ایمانی، نسلی عصبیت اور برادرانِ اسلام سے قلبی علاقہ کی بدولت عبداللہؓ (بن عبداللہ بن ابی) کی ذہنی کشمکش نکتۂ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ اس فرزند توحید پر یہ حقیقت آشکارا ہوچکی ہے کہ عنقریب اس کے باپ ابن ابی کو تہ تیغ کر دیا جائے گا لیکن اس کے باوجود اس نے نبی کریم ﷺ سے جاں بخشی کی درخواست نہ کی کیونکہ اس کا یہ ایمان ہے کہ آپ ﷺ جو کچھ کرتے ہیں وہ فرمانِ الٰہی کے ماتحت ہوتا ہے۔ اسے اپنے باپ کفر و نفاق میں بھی مطلق کوئی شبہ نہیں۔ عبداللہؓ اس خطرہ کے پیش نظر کہ مبادا محبت پدری اسے انتقام پر آمادہ کر دے، یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو خود اپنے ہاتھ سے قتل کرے اور اس کا سر بارگاہ رسالت ﷺ میں پیش کر دے اگرچہ عبداللہ رضی اللہ عنہ کو یہ خیال بھی ستا رہا ہے کہ باپ کا قتل اس پر کچھ کم شاق نہ گزرے گا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی قوتِ ایمانی اسے یہ بھی یقین دلاتی ہے کہ اس کے ہاتھ کم از کم اس مردِ مومن کے خون سے تو رنگین نہ ہوں گے، جسے میرے باپ کے قتل پر مامور کیا جائے گا اور یہ کیا کم ہے کہ میں جہنم کی آگ کا ایندھن بننے سے نجات پا جاؤں گا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی ذہنی کشمکش فطرت اور ایمان کا تصادم تھا۔ ظاہر ہے اس سے زیادہ نازک موقع روحانی اضطراب کیلئے اور کیا ہوسکتا ہے۔

مقامِ غور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی باتیں سنیں تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ہم ابن ابی کو قتل کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ خاطر مدارت سے پیش آئیں۔ ہماری مجلس کے دروازے بھی اس پر بند نہ ہوں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے پاس آئے تا کہ حسن صحبت سے اسے کسی وقت بھی محرومی نہ ہو۔"

عفو و درگزر کی کوئی مثال اس سے زیادہ پر شکوہ ہوسکتی ہے؟ نبی کریم ﷺ اس شخص کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آ رہے ہیں جس نے اہل مدینہ کو آپ ﷺ کے اور آپ ﷺ کے رفقا کے خلاف برانگیختہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ دراصل یہ عفو و درگزر بھی ایک قسم کا انتقام ہی ثابت ہوا کیونکہ اس واقعہ کے بعد جب کبھی ابن ابی کفر و نفاق کی کوئی بات کہتا تھا تو لوگ اسے لعن طعن کرتے اور کہتے کہ جن کے دم قدم سے تجھے سانس لینے کی مہلت ملی ہے انہی کے خلاف زہر اگل رہا ہے۔ ایک دن آنحضرت ﷺ حضرت عمرؓ سے مصروف گفتگو تھے۔ گفتگو کے دوران وہ باتیں بھی آ گئیں جو ابن ابی کرتا تھا اور لوگ جنہیں سن کر اسے برا بھلا کہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا۔ "خدا کی قسم! جس روز تم نے مجھ سے کہا تھا کہ ابن ابی کو تہ تیغ کر دیا جائے، اگر میں مان لیتا تو اس کی حمایت کے لئے لوگ اٹھ کھڑے ہوتے لیکن آج اگر میں اس کے قتل کا حکم دوں تو وہ خود ہی اسے تہ تیغ کر دیں گے۔" حضرت عمرؓ نے عرض کیا: "اب مجھے اندازہ ہوا کہ آپ ﷺ کی بصیرت اور میرے فہم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔"

Marfat.com

واقعۂ افک

غزوہ بنی مصطلق سے واپسی کے بعد ایک ایسا حادثہ رونما ہوا جو شروع میں تو کچھ اتنا زیادہ اہم نہ تھا لیکن کچھ ہی دنوں بعد بعض عاقبت نااندیش اشخاص کی چہ میگوئیوں سے اس نے ایک ہنگامہ کی شکل اختیار کر لی۔ بات یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کسی غزوہ میں شمولیت فرماتے تھے تو اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے کسی نہ کسی کو قرعہ اندازی سے اپنی رفاقت کا شرف بخشتے تھے چنانچہ غزوۂ بنی مصطلق میں اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو آپ ﷺ کی رفاقت نصیب ہوئی۔ اُم المؤمنین ہلکے پھلکے جسم کی تھیں، ہودج دہلیز کے پاس لایا جاتا اور آپ اس میں قدم رنجہ فرماتیں تو اٹھاتے وقت ساربان کو یہ احساس بھی نہ ہوتا کہ ہودج میں کوئی ہے بھی۔

صعوبت ناک سفر کی منزلیں جس صبا رفتاری سے طے ہو رہی تھیں ان کا تذکرہ تو پہلے آ ہی چکا ہے، ایک مقام پر اثنائے سفر میں لشکر کو شب کے وقت پڑاؤ کا حکم ہوا۔ جب لشکری کچھ ستا لئے تو سفر پھر شروع ہوا۔ عین آغازِ سفر کے وقت (یہ نہ جانتے ہوئے کہ لشکر آمادۂ عزم سفر ہے) اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کسی طبعی ضرورت سے کچھ فاصلے پر چلی گئی تھیں۔ واپس ہونے لگیں تو پتہ چلا کہ گلے کا ہار کہیں گر پڑا ہے اس لئے پھر لوٹیں، ہار کی تلاش میں کچھ دیر ہو گئی، ہوسکتا ہے کہ تھکے ٹوٹے جسم پر نیند نے غلبہ پا لیا ہو، غرض ہار تو دستیاب ہو گیا لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ پڑاؤ پر لشکر کا نام و نشان بھی نہیں۔ بات یہ ہوئی کہ جاں نثارانِ رسول ﷺ نے یہ سمجھتے ہوئے کہ اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا ہودج میں ہیں، خالی ہودج اٹھا کر اونٹ پر رکھ لیا تھا اور لشکر کے ہمراہ روانہ ہو گئے تھے۔ ادھر اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کا یہ خیال تھا کہ جب لشکر مجھے نہ پائیں گے تو مجھے لینے کے لئے واپس ضرور ہوں گے اس لئے آپ نے پڑاؤ پر ٹھہرنا مناسب سمجھا، صحرا میں تنہا سفر کرنے میں آپ رضی اللہ عنہا نے کوئی مصلحت نہ سمجھی، غرض آپ نے چادر سے اپنے جسم کو لپیٹ لیا اور وہیں دراز ہو گئیں۔

اتفاق کی بات اس سفر میں صفوان بن معطل سلمی رضی اللہ عنہ بھی کسی ضرورت کے تحت قافلے سے بچھڑ گئے تھے۔ ان کا گزر اس طرف سے ہوا جہاں اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا رونق افروز تھیں۔ انہوں نے آپ کو پہچان لیا کیونکہ آیۂ حجاب کے نزول سے قبل اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کو انہوں نے دیکھا تھا۔ اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کو اس عالم میں تن تنہا پایا تو ہکا بکا رہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون کہا اور بولے: ''اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا! آپ اور اس صحرا میں تن تنہا! قافلہ سے آپ کی علیحدگی کا سبب کیا ہے؟'' اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا چپ رہیں اور کوئی جواب نہ دیا۔ صفوان رضی اللہ عنہ نے اپنا اونٹ بٹھا کر آپ سے درخواست کی کہ اس پر سوار ہو جائیے۔ خود ذرا پیچھے ہٹے تاکہ حیا دامن گیر نہ ہو۔ اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا سوار ہو گئیں تو صفوان رضی اللہ عنہ نے اونٹ کی رفتار تیز کر دی تاکہ قافلہ کے قریب پہنچ سکیں لیکن قافلہ اس سرعت سے منزلیں طے کر رہا تھا کہ اس نے مدینہ پہنچ کر ہی دم لیا۔ صفوان رضی اللہ عنہ اپنے اونٹ پر اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کو بٹھائے ہوئے مدینہ پہنچے تو دن کی روشنی خاصی پھیل چکی تھی۔ لوگوں نے اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کو صفوان رضی اللہ عنہ کے اونٹ پر سوار دیکھا۔ صفوان رضی اللہ عنہ نے

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کے دولت خانے کے قریب اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کو اتارا اور چلے گئے۔ اس موقع پر کسی کے دل میں نہ کوئی وسوسہ تھا اور نہ زبان پر کوئی ایسا فقرہ جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ لوگوں میں بدگمانی راہ پا چکی ہے۔ آنحضرت ﷺ کو بھی اس قسم کا کوئی خیال نہ آیا، سیدنا حضرت ابوبکرؓ صدیق کی صاحبزادی کے بارے میں ایسا خیال آ بھی نہ سکتا تھا۔

مدینہ میں لشکر اسلام کی آمد سے کچھ ہی دیر بعد اُم المؤمنینؓ بھی تشریف لے آئی تھیں اس لئے بدگمانی اور بدظنی کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ جب آپ نے اپنی قیام گاہ پر قدم رنجہ فرمایا تو اس وقت آپ کے چہرہ کی بشاشت کہے دے رہی تھی کہ کوئی ایسا واقعہ سرے سے ظہور میں آیا ہی نہیں جو وجہ اضطراب ہو۔ چونکہ کوئی ایسی ویسی بات نہ تھی اس لئے معمول کے مطابق نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اس مالِ غنیمت کی تقسیم میں مصروف ہو گئے جو غزوہ بنی مصطلق میں دستیاب ہوا تھا۔ مجاہدین اسلام کو یہ حق پہنچتا تھا کہ اپنی ایمانی قوت کی بدولت انہوں نے دشمنانِ دین پر جو غلبہ حاصل کیا ہے اس کا صلہ مالِ غنیمت کی صورت میں بھی حاصل کریں۔ یہ فتح انہوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر خالصتاً لوجہ اللہ دین قیم کی حمایت میں حاصل کی تھی۔ عرب میں ظہورِ اسلام سے قبل اس قسم کی فدویت کے لئے کوئی بھی آمادہ نہ ہوتا۔

اُم المؤمنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا

بنی مصطلق کے جو اسیر لشکر اسلام کے قبضے میں آئے تھے ان میں سردار قبیلہ حارث کی بیٹی حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ یہ خاتون حسن و جمال میں اپنی نظیر آپ تھیں، تقسیم غنیمت کے نتیجے میں یہ ایک انصاری کے حصے میں آئی تھیں۔ انہوں نے اپنی رہائی کے سلسلہ میں انصاری صحابہ سے فدیہ کی بات چیت کی تو انصاری نے اس خیال سے کہ یہ خاتون سردارِ قبیلہ کی دختر ہے اور اس کا باپ اس قابل ہے کہ فدیہ میں بڑی سے بڑی رقم دے سکے، فدیہ کی رقم بڑھا چڑھا کر بتائی۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے استعداد و استعانت کے ارادہ سے آنحضرت ﷺ سے رجوع کیا۔ جس وقت یہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پہنچیں آنحضرت ﷺ حجرۂ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا میں رونق افروز تھے، انہوں نے عرض کیا، میں سردار بنی مصطلق حارث بن ابی ضرار کی بیٹی ہوں۔ جس الجھن میں، میں گرفتار ہوں اس سے آپ ﷺ بخوبی واقف ہیں۔ آپ ﷺ کی خدمت میں، میں نے اس لئے حاضری دی ہے کہ آپ ﷺ زرِ فدیہ کے سلسلہ میں میری اعانت فرمائیں، میں جس کے حصہ میں آئی ہوں اس سے میں نے فدیہ کے عوض رہائی کے بارے میں بات چیت کر لی ہے۔ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا، بہتر صورت یہ ہے کہ میں زرِ فدیہ ادا کئے دیتا ہوں اور تم سے عقد بھی کرتا ہوں۔ صحابہؓ کو جب یہ معلوم ہوا کہ بنی مصطلق سے آنحضرت ﷺ نے مصاہرت کا رشتہ استوار کر لیا ہے تو انہوں نے احتراماً زرِ فدیہ لئے بغیر تمام اسیرانِ بنی مصطلق کو رہا کر دیا اس موقع پر اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔ ''جویریہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ کوئی عورت اپنی قوم کے حق میں مبارک ثابت نہیں ہوئی۔''

Marfat.com

ایک روایت تو یہ ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ حارث بن ابی ضرار اپنی بیٹی کی رہائی کے لئے زرِ فدیہ لایا لیکن جونہی آنحضرت ﷺ سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں آپ ﷺ پر ایمان لے آیا۔ اس کی بیٹی جویریہ رضی اللہ عنہا بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئیں۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ان سے رشتۂ ازدواج قائم کیا اور چار سو درہم مہر ادا کیا۔

اس سلسلہ کی ایک تیسری روایت یہ ہے کہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے والد حارث کو اس رشتۂ ازدواج سے اتفاق نہ تھا، ایک دوسرے قرابت دار کی شرکت سے اس عقد کی تکمیل ہوئی۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے رہن سہن کے لئے مسجد نبوی ﷺ کے قریب دیگر ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی اقامت گاہوں سے متصل ایک اقامت گاہ تعمیر کرائی۔ دیگر ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی طرح یہ بھی اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کے خطاب سے نوازی گئیں۔

فتنے کا آغاز

جن ایام میں اُم المؤمنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا امہات المومنین کے حلقہ میں شامل ہوئی ہیں، یہ سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا قافلہ سے بچھڑ کیوں گئی تھیں اور مدینہ میں صفوان ایسے جوان اور خوش رو کی معیت میں ان کے آنے کا کیا سبب ہے؟ مسلمانوں میں سے اُم المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی ہمشیرہ حمنہ بی بی جو پہلے ہی اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اس بنا پر جلتی تھیں کہ آنحضرت ﷺ کی نظر میں آپ کا مقام ان کی بہن سے زیادہ بلند کیوں ہے؟ اس جھوٹی افواہ کو ہوا دینے میں پیش پیش تھیں۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ بن ثابت بھی بی بی حمنہ کے ہم نوا تھے، ابن ابی جس کے اندر نفاق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ایسے موقع پر اپنی خباثت سے کیسے باز آ سکتا تھا، اس نے بھی بے پر کی اڑائیں اور خوب اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ بنی اوس کے انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب یہ افواہیں سنیں تو انہوں نے اپنے ایمان کی پختگی کا ثبوت دیا اور اس اعتماد کی بنا پر جو انہیں اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کی عفت و عصمت پر تھا، ان سرگوشیوں کی تردید میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن اس کے باوجود بات چل نکلی اور اس نے فتنہ کی صورت اختیار کر لی۔

یہ افواہیں آنحضرت ﷺ کے گوش گزار ہوئیں تو آپ ﷺ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، آپ ﷺ اس ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے کہ یہ افواہیں کیسے درست ہو سکتی ہیں؟ مجھے عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ امید ہرگز نہیں کہ اس نے خیانت کی ہو، ایسا اقدام محالات سے ہے، پھر دوسرے ایک بلند و بالا مرتبہ پر فائز ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے کہ اس قسم کی بات ظہور میں آئے۔ آنحضرت ﷺ کو اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا پر اتنا اعتماد تھا کہ اس قسم کی بدگمانیاں راہ نہ پا سکتی تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ آپ ﷺ کو یہ خیال بھی تھا کہ طبقہ نسواں کے اسرارِ درونِ پردہ کی تہ تک کون پہنچ سکتا ہے؟ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر ہی کیا ہے؟ اگر ہار گم ہو گیا تھا تو اس کی تلاش میں آدھی رات گئے انہیں صحرا میں دور جانے کی کیا ضرورت تھی؟ لشکر گاہ میں قافلہ کی روانگی سے قبل یہ بات انہیں

Marfat.com

مجھ سے کرنی چاہیے تھی، ایسا انہوں نے کیوں نہیں کیا؟ رسول کریم ﷺ کے دل و دماغ میں یہ خیالات گشت کر رہے تھے اور آپ قطعیت سے دوٹوک فیصلہ نہ کر سکتے تھے۔

اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کی بیماری

یہ افواہیں پھیلی ہوئی تھیں لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ کسی کو بھی اتنی جرأت نہ ہو سکی کہ وہ براہ راست اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے تذکرہ کرے۔ اس لئے اُم المؤمنین کو کانوں کان بھی یہ خبر نہ ہو سکی کہ شہر میں ان کے خلاف کیا سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ ہاں البتہ حضور ﷺ کی پھری ہوئی نگاہیں آپ کے حق میں بلائے بے درماں تھیں۔ اس کا آپ کو اتنا ملال تھا کہ بیمار پڑ گئی تھیں۔ تیمار داری کے لئے آپ کی والدہ ہمہ وقت قریب رہتیں، کبھی کبھی آنحضرت ﷺ بھی مزاج پرسی کے لئے تشریف لاتے تو آپ ﷺ کے الفاظ صرف یہ ہوتے۔ ''طبیعت کا کیا حال ہے؟'' حضور ﷺ کی بے رخی سے اُم المؤمنینؓ کے مرض کی شدت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ آپ نے اپنے طور پر یہ سمجھا کہ ہو نہ ہو حضور ﷺ کی مجھ سے بے توجہی، اُم المؤمنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے تعلق خاطر کی وجہ سے ہے، چنانچہ ایک دن آپ نے صورتحال سے دل تنگ ہو کر آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے اس وقت تک کے لئے جب تک کہ پورے طور پر صحت نہ ہو اپنے ماں باپ کے یہاں جا کر رہنے کی اجازت دے دی جائے۔ غرض آپ اپنے والدین کے گھر تشریف لے آئیں۔ اس اجازت سے اُم المؤمنینؓ کے دل پر حضور ﷺ کی بے رخی کا نقش اور بھی جم گیا، لگاتار ۲۹ روز کی بیماری نے آپ کی جان کھینچ لی اور آپ بے حد لاغر ہو گئیں لیکن ابھی تک آپ کو یہ علم نہ ہو سکا کہ آپ پر بہتان باندھا گیا ہے۔

انہی ایام آنحضرت ﷺ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا:

> ''اے لوگو! بعض ایسے ہیں جو خواہ مخواہ مجھے روحانی اذیت پہنچا رہے ہیں، میری اہلیہ کے بارے میں ان کی ناروا باتیں سننے میں آئی ہیں۔ خدا کی قسم! مجھے آج تک اپنی اہلیہ سے متعلق کبھی یہ شبہ بھی نہیں ہوا کہ خیر کے سوا کسی اور چیز کی بھی توقع ان سے کی جا سکتی ہے اور جس شخص کے بارے میں یہ افواہیں گشت کر رہی ہیں، میری دانست میں اس کے اندر بھی حسن و خوبی کے سوا اور کوئی چیز دیکھنے میں نہیں آئی۔ اگر یہ شخص کبھی میرے گھر بھی آیا ہے تو میری معیت میں۔''

اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''یارسول اللہ ﷺ! اگر یہ لوگ قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے ہیں تو ہم ان کی شرارتوں کا قلع قمع کر سکتے ہیں لیکن اگر ان کا تعلق قبیلۂ خزرج سے ہے تو آپ ﷺ ان کے بارے میں اپنے احکام صادر فرما دیجئے۔ خدا کی قسم! وہ واجب القتل ہیں۔'' سعدؓ بن عبادہ نے اسیدؓ بن حضیر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ان کی زبان سے خزرج کے بارے میں یہ فقرہ نکلا ہے کیونکہ انہیں پتہ ہے کہ سرگوشیوں

Marfat.com

میں جن لوگوں نے حصہ لیا ہے وہ زیادہ تر خزرجی ہیں۔ اگر ان لوگوں کا تعلق قبیلہ اوس سے ہوتا تو ایسی باتیں ان کی زبان سے ہرگز نہ نکلتیں۔" سعدؓ بن عبادہ کی اس گفتگو سے لوگوں میں ہیجان پیدا ہو گیا اور اگر اس موقع پر آنحضرت ﷺ پیغمبرانہ بصیرت سے کام نہ لیتے تو فتنہ کا سیلاب پھوٹ نکلتا۔

اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کو تہمت کی اطلاع

ایک انصاری خاتون نے نیک نیتی کی بنا پر اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو لوگوں کی بہتان طرازیوں سے مطلع کیا، یہ سنتے ہی اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کا دل ڈوبنے لگا، اتنا روئیں کہ روتے روتے آواز بھرا گئی۔ بستر سے اٹھیں اور اپنی والدہ ماجدہ کی آغوش میں گر کر سسکیاں بھرنے لگیں۔ ذرا کچھ ہوش آیا تو اپنی والدہ سے شکایت کی، امی جان! آپ نے سب کچھ سنا ہو گا لیکن یہ کیا بات ہے کہ آپ نے مجھ پر یہ راز آشکار نہیں ہونے دیا؟ ان کی والدہ نے کہا صرف یہ کہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کی پیاری ہو اور اس کی سوکنیں اس سے جلن نہ رکھیں۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ اُم المؤمنینؓ اپنی والدہ محترمہ کے تسلی آمیز الفاظ سے مطمئن نہ ہوئیں۔ جب آپ یہ سوچتیں کہ آنحضرت ﷺ کے دل میں میری طرف سے میل ہے تو آپ رضی اللہ عنہا کی افسردگی میں اور اضافہ ہو جاتا، کبھی یہ خیال آتا کہ رسول کریم ﷺ تشریف لائیں تو ان کے حضور قسمیں کھا کھا کر اپنی بے گناہی کا ثبوت دوں، یہ بھی سوچتیں کہ جو تہمتیں میرے خلاف تراشی جا رہی ہیں ان کی اصلیت واضح کر دوں۔ کبھی آپ کے ذہن میں یہ بات بھی آتی کہ میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ کیوں نہ اسی انداز کی بے رخی کا برتاؤ کروں جس کا اظہار آپ ﷺ کے رویہ سے ہو رہا ہے۔ اس حیص بیص کے دوران میں آپؓ نے یہ بھی سوچا کہ آنحضرت ﷺ خدا کے بزرگ و برتر رسول ہیں، ان کا مقام عام سطح سے بہت بلند ہے۔ میرے خلاف بہتان طرازیوں کا طوفان لوگوں نے اٹھایا ہے۔ انہیں اس بات سے کہ میں قافلہ سے جدا ہو کر صفوان کے اونٹ پر مدینہ آئی ہوں میرے خلاف چہ میگوئیوں کا موقع مل گیا۔ آنحضرت ﷺ کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔

آخر اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا نے قاضی الحاجات کی بارگاہ میں دعا کی "بار الٰہ! میری امداد کر اور کوئی ایسی صورت پیدا کر کہ رسول کریم ﷺ پر میری بے گناہی کی حقیقت آشکارا ہو جائے اور ان کی پھری ہوئی نگاہیں پھر میری جانب مائل ہو جائیں۔"

تحقیق کے لئے مجلس مشاورت

آنحضرت ﷺ تحقیق حال کی خاطر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے یہاں تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ نے حضرت اسامہ بن زیدؓ اور حضرت علیؓ بن ابی طالب کو جن پر آپ ﷺ کو پورا پورا اعتماد تھا، طلب فرمایا اور ان دونوں اصحاب رضی اللہ عنہم سے اس بہتانِ عظیم سے متعلق مشورہ کیا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے نہایت صفائی اور

Marfat.com

پورے اخلاص سے اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کی عصمت کی شہادت دی۔ دراصل آنحضرت ﷺ کا خیال بھی یہی تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا تو انہوں نے دوٹوک رائے دینے کے بجائے صرف اتنا کہا: ''عورتوں کی کمی نہیں، بہتر یہ ہوگا کہ آپ اُم المؤمنین ؓ کی کنیز سے بھی دریافت فرمالیں۔'' حضرت علیؓ نے کنیز کو اس لئے خوب مارا پیٹا تاکہ وہ نبی کریم ﷺ کے حضور سچ سچ بولیں۔ غرض کنیز نے اپنے بیان میں کہا کہ اُم المؤمنین ؓ تو پاک دامنی کا مجسمہ ہیں، اس کے علاوہ اُم المؤمنین ؓ کی صفائی میں اور بھی بہت سی باتیں کیں۔

اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا سے جواب طلبی

آخر میں اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے باز پرس کی نوبت آئی۔ آنحضرت ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف فرما ہوئے۔ اس موقع پر اُم المؤمنین ؓ اور ان کے والدین کے علاوہ ایک انصاریہ بھی موجود تھیں۔ نبی کریم ﷺ نے جب اُم المؤمنین سے اتہام کے متعلق باز پرس کی تو ان کی چیخیں نکل گئیں۔ انصاری خاتون بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کی از خود رفتگی کا سبب یہ تھا کہ اس باز پرس سے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ان کے ذہن میں پچھلی صحبتوں کے نقش ابھر آئے اور ساتھ ہی اس تاثر کا نقش بھی کہ اب باز پرس تک نوبت آ پہنچی ہے۔

جی کڑا کر کے حضور ﷺ کی جانب متوجہ ہوئیں تو آنسو رک گئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا۔ ''عائشہ رضی اللہ عنہا خشیت وتقویٰ کی راہ اختیار کرو۔ اگر تہمت درست ہے تو اس کی بارگاہ میں توبہ کرو، خدا تواب الرحیم ہے۔'' آنحضرت ﷺ جب یہ الفاظ ارشاد فرما چکے تو اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کو جلال آ گیا۔ انہوں نے باری باری اپنے والد اور اپنی والدہ کی طرف دیکھا تو دونوں کو ساکت وصامت پایا۔ اُم المؤمنین ؓ نے دونوں سے شکایت کی، آپ چپ ہی رہیں گے؟ اس پر دونوں کا جواب یہ تھا کہ معاملہ کی نوعیت سے ہم بالکل بے خبر ہیں۔ یہ کہا اور دونوں نے اپنی گردنیں جھکا لیں۔ والدین کے اس تاثر سے اُم المؤمنین ؓ پر پھر رقت طاری ہوگئی، انہوں نے اس عالم میں آنحضرت ﷺ سے کہا، یارسول اللہ ﷺ آپ جو یہ فرما رہے ہیں کہ میں توبہ کروں تو آخر یہ کس لئے؟ جب مجھ سے کوئی گناہ ہی سرزد نہیں ہوا، بداندیشوں نے جو بہتان باندھے ہیں اس کی اصلیت سے میں بے خبر نہیں۔ اگر میں اپنی صفائی میں کچھ کہوں تو لاحاصل ہے اس لئے کہ پروردگار پر ہر بات روشن ہے اور اگر میں لوگوں کے سامنے اپنی پاک دامنی کا ثبوت دوں تو وہ میرے بیان کی تصدیق کہاں کریں گے؟ قدرے تامل کے بعد اُم المؤمنین ؓ نے کہا، میں اپنے حق میں وہی الفاظ دہرائے دیتی ہوں جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمائے تھے (قرآن کریم کی زبان میں)

فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿١٨﴾ (سورۂ یوسف: ۱۸)

صبر ہی بہتر ہے، اور جو حال تم بیان کرتے ہو، خدا ہی مدد کرے کہ اس کا پردہ فاش ہو۔

Marfat.com

آیاتِ برأت کا نزول

اس گفت وشنید کے بعد حاضرین مجلس پر کچھ ایسا سکوت طاری ہوا کہ کسی کو یہ ہوش ہی نہ رہا کہ ہم کس عالم میں ہیں۔ اسی اثنا میں آنحضرت ﷺ پر نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا۔ حاضرین نے آپ ﷺ کا چہرہ چادرِ مبارک سے ڈھانک دیا، سرہانے تکیہ رکھ دیا گیا تاکہ آپ ﷺ اس سے ٹیک لگا سکیں، اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ اس موقع پر مجھے اپنی بے گناہی کے سبب قطعاً یہ شبہ نہ تھا کہ پروردگار میرے معاملہ میں انصاف نہیں فرمائے گا لیکن میرے والدین پر یہ عالم گزر رہا تھا جیسے ان کی روحیں قبض کی جارہی ہیں۔ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ الزام واتہام کی تصدیق کہیں وحی سے نہ ہو جائے۔ جب آنحضرت ﷺ نزولِ وحی سے فارغ ہوئے اور اپنی پیشانی سے آپ ﷺ نے پسینے کے قطرات پونچھے تو اس وقت میرے والدین کا اضطراب دیدنی تھا۔ آخر آنحضرت ﷺ نے مجھ سے خطاب کیا۔

اُبشری یاعائشة! قد انزل الله براء تك

"اے عائشہ رضی اللہ عنہا! مبارک ہو اللہ تعالیٰ نے تمہاری برأت میں آیات نازل کی ہیں۔"

اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا نے اپنی زبان سے صرف الحمدللہ کہا اور خاموش ہو گئیں۔ آنحضرت ﷺ اسی وقت مسجد نبوی میں تشریف لائے اور آپ نے مجمع عام میں ان آیات کی تلاوت کی۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ جَآءُوۡ بِالۡاِفۡکِ عُصۡبَۃٌ مِّنۡکُمۡ ؕ لَا تَحۡسَبُوۡہُ شَرًّا لَّکُمۡ ؕ بَلۡ ہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ؕ لِکُلِّ امۡرِیًٔ مِّنۡہُمۡ مَّا اکۡتَسَبَ مِنَ الۡاِثۡمِ ۚ وَ الَّذِیۡ تَوَلّٰی کِبۡرَہٗ مِنۡہُمۡ لَہٗ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۱﴾ (سورۂ نور: ۱۱)

"بے شک (اے مسلمانو!) جن لوگوں نے (اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف) بہتان باندھا تم ہی میں سے ایک گروہ ہے، اس (بہتان) کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو بلکہ یہ تو تمہارے لئے بہتر ہوا۔ (اس سے کھرے کھوٹے کی پہچان ہو گئی) بہتان باندھنے والوں میں سے جتنا گناہ جس نے سمیٹا وہ اس کی سزا بھگتے گا اور ان میں سے جس نے بہتان باندھا اس کو بڑی سخت سزا دی جائے گی۔"

اسی سلسلہ میں کچھ آیات کے بعد آپ ﷺ نے یہ آیات پڑھیں۔

وَ لَوۡ لَاۤ اِذۡ سَمِعۡتُمُوۡہُ قُلۡتُمۡ مَّا یَکُوۡنُ لَنَاۤ اَنۡ نَّتَکَلَّمَ بِہٰذَا ٭ۖ سُبۡحٰنَکَ ہٰذَا بُہۡتَانٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۶﴾ یَعِظُکُمُ اللّٰہُ اَنۡ تَعُوۡدُوۡا لِمِثۡلِہٖۤ اَبَدًا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۷﴾ وَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الۡاٰیٰتِ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِیۡعَ الۡفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۙ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۹﴾ (سورۂ نور: ۱۶ تا ۱۹)

Marfat.com

"اور جب تم نے ایسی باتیں سنی تھیں تو سنتے ہی کیوں نہ بول اٹھے کہ ہم کو ایسی بات منہ سے نکالنا زیبا نہیں حاشا وکلا یہ تو بڑا بھاری بہتان ہے۔ خدا تم کو نصیحت کرتا ہے کہ اگر ایمان رکھتے ہو تو پھر کبھی ایسا نہ کرو اور اللہ اپنے احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ سب کے حال سے واقف اور حکمت والا ہے۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے شرمی کی باتوں کا چرچا ہو ان کے لئے دنیا میں دردناک عذاب ہے اور آخرت میں بھی اور ایسے لوگوں کو اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

پاک دامن عورتوں پر جو بہتان باندھتے ہیں، ان کی سزا کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۴

(سورۂ نور: ۴)

"اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگائیں اور چار گواہ نہ لا سکیں تو ان کے اسی درے مارو اور آئندہ کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو اور یہ لوگ خود بدکار ہیں۔"

آنحضرت ﷺ نے قرآن حکیم کے اس تنزیلی حکم کی تعمیل میں مسطح بن اثامہ، حسان رضی اللہ عنہ بن ثابت اور بی بی حمنہ بنت جحش کو اسی اسی دروں کی سزا دی۔ ان تینوں نے اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کے خلاف بہتان باندھا تھا۔ ان آیات کے نزول کے بعد اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو حسب سابق عزت واحترام کا مقام حاصل ہو گیا، آنحضرت ﷺ انہیں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھنے لگے، اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا اپنے والدین کے گھر سے کاشانہ نبوت میں تشریف لے آئیں۔

مشہور مستشرق سر ولیم میور اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بلاشبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا افک سے قبل اور اس کے دونوں عہدوں میں اس قدر پاک دامنی سے رہیں کہ آپ کے متعلق ایسا شبہ نہ صرف بے بنیاد ہے بلکہ اس کی تردید کرنا بھی ضروری معلوم نہیں ہوتا۔

عفو و درگزر

حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ دروں کی سزا پانے کے بعد پھر حسب سابق آنحضرت ﷺ کی توجہ کا مرکز بن گئے آنحضرت ﷺ کے ایما پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی مسطح بن اثامہ سے پہلے کی طرح ہمدردی کا برتاؤ کیا اور نئے سرے سے ان کے وظیفہ کا اجرا فرما دیا۔ مدینہ میں واقعہ افک سے جو ہیجان برپا ہو گیا تھا آہستہ آہستہ ختم ہوا۔ اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کے وقار اور ان کی عزت کا نقش پہلے کی طرح پھر لوگوں کے دل و دماغ پر بیٹھ گیا۔ آنحضرت ﷺ پوری سرگرمی اور کامل انہماک سے تبلیغ اسلام کی جانب متوجہ ہوئے اور وہ حالات پیدا ہو گئے جن کی بدولت صلح حدیبیہ کے لئے زمین ہموار ہوئی یعنی وہ قرارداد جو فتح مبین کا پیش خیمہ تھی۔

Marfat.com

حواشی

۱۔ ''فقیہ اور فریسی ایک ایسی عورت کو لائے جو زنا میں پکڑی گئی تھی اور اسے بیچ میں کھڑا کر کے یسوع سے کہا: اے استاد، یہ عورت زنا میں فعل کے وقت پکڑی گئی ہے تو اس نے سیدھے ہو کر ان سے کہا کہ جو تم میں سے بے گناہ ہو وہی پہلے اس کے پتھر مارے۔'' (انجیل، یوحنا باب ۸ آیت ۱ تا ۱۱)

۲۔ یہ بی بی حارس کی اہلیہ تھیں۔

۳۔ یہ کلمہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے سن لیا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کر دیا۔ (سیرۃ ابن ہشام)

❋

Marfat.com

باب 18

حدیبیہ

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے رفقا کو مکہ سے ہجرت کئے چھ سال گزر گئے۔ اس مدت میں وہ خود دشمنوں کی مدافعت کی وجہ سے مسلسل جنگوں میں مصروف رہے۔ کبھی قریش کے حملوں سے خود کو محفوظ رکھنے میں منہمک اور کبھی یہود کی ریشہ دوانیوں سے نجات حاصل کرنے کی فکر۔ لیکن مسلمانوں کی ان پریشانیوں کے باوجود اسلام ہر طرف پھیلتا گیا اور اس کے حامیوں میں قوت و استقلال بڑھتا گیا۔

ہجرت کے سالِ اول ہی میں مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس کے بجائے بت الحرام یا کعبہ قرار پایا۔ گویا مسلمانوں نے اس بیت اللہ کی جانب منہ کر کے نمازیں پڑھنی شروع کیں جس کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ میں رکھی تھیں اور جس کی تعمیر جدید میں خود آنحضرت ﷺ نے عہد شباب میں حصہ لیا بلکہ حجر اسود کی تنصیب کا شرف بھی بالاتفاق آپ ﷺ ہی کو حاصل ہوا۔ یہ واقعہ ان ایام سے تعلق رکھتا ہے جبکہ نہ خود آپ ﷺ کے اور نہ دوسروں کے دل میں کبھی یہ خیال گزرا تھا کہ آپ ﷺ منصب نبوت پر سرفراز ہونے والے ہیں۔

مسجد حرام یعنی کعبہ سالہا سال سے عرب کی مشہور عبادت گاہ تھا۔ ان مہینوں میں جن کی حرمت مسلم تھی لوگ اس خانۂ خدا کی زیارت کے لئے کشاں کشاں آتے تھے اور ان کا اعتقاد یہ تھا کہ جو شخص اس گھر میں داخل ہو جاتا ہے، دشمن اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ اگر حرم کی حدود میں کسی کا سخت ترین دشمن سے بھی آمنا سامنا ہو جاتا تو اسے یہ جرأت نہ ہوتی کہ تلوار نیام سے باہر نکالے اور حریف پر حملہ آور ہو۔

اپنی روایات کے خلاف قریش نے اس موقع پر جبکہ مسلمانوں نے آنحضرت ﷺ کی معیت میں مکہ سے ہجرت کی اپنے دل میں یہ ٹھان لی کہ خواہ کچھ ہو ہم مسلمانوں کو کعبہ کی حدود میں داخل نہیں ہونے دیں گے اور نہ انہیں دیگر قبائل عرب کی طرح زیارت کی سہولت دی جائے گی۔ اسی سلسلے میں ہجرت کے پہلے سال یہ آیت نازل ہوئی۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۝ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ

اللّٰهِ ؕ (سورۂ البقرہ: ۲۱۷)

"(اے رسول ﷺ) آپ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ حرمت کے مہینے میں جنگ کا کیا حکم ہے؟ آپ ان سے کہہ دیجئے اس میں جنگ بہت بری بات ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیجئے کہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنا اور کفر پر تل جانا اور مسجد حرام کے دروازے لوگوں پر بند کر دینا اور وہاں سے اس کے باشندوں کو دیس نکالا دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برائی کی بات ہے۔"

غزوۂ بدر کے بعد ان آیات کا نزول ہوا۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ۬ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾ (سورۂ الانفال: ۳۳ تا ۳۶)

"اور ان کے اندر ایسی کون سی بات ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دے اور جبکہ ان کا یہ حال ہے کہ یہ لوگوں کو مسجد حرام سے روکتے ہیں درآنحالیکہ یہ کعبہ کے متولی بھی نہیں، کعبہ کے متولی تو پرہیزگار لوگ ہیں لیکن ان میں سے اکثر یہ بات نہیں جانتے اور کعبہ کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا ان کی نماز ہی کیا تھی پس اے کفار جیسا کہ تم کفر کرتے رہے ہو اس کے بدلے عذاب کا مزا چکھو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کافر اپنا مال اس لئے خرچ کرتے رہتے ہیں تا کہ لوگوں کو راہ خدا سے روکیں، سو یہ لوگ تو مال اسی طرح خرچ کرتے رہیں گے مگر پھر آخر کار وہی مال ان کے حق میں موجب حسرت ہوگا اور قیامت کے دن کافر جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے۔"

اس قسم کی بے شمار آیات ہجرت کے بعد چھ سال کی مدت میں نازل ہوتی رہیں، ان کا یہ مضمون تھا کہ کعبہ مرجع عوام اور امن و سلامتی کا گہوارہ ہے لیکن قریش کا یہ نظریہ تھا کہ مسلمان، معبودانِ کعبہ سے روگرداں ہو گئے ہیں لہٰذا ان کا خیال تھا کہ جب تک یہ مسلمان دوبارہ اپنا آبائی دین قبول نہ کریں گے ہم پر ان سے جنگ بھی واجب ہے نیز یہ کہ انہیں کعبہ کی زیارت کا موقع نہ دیں۔

ہجرت کے بعد ابتدائی سال مسلمانوں پر اس لئے اور بھی زیادہ گراں گزرے کہ انہیں قریش کی چیرہ

Marfat.com

دستیوں کے باعث اپنے اس دینی فریضے کی ادائیگی کا موقع نہ مل سکا جو ان کے آباؤ اجداد ہی پر نہیں بلکہ خود ان پر بھی عائد ہوتا تھا۔ علاوہ بریں مہاجرین کو یہ قلق بھی تھا کہ ہم بے سروسامانی کے عالم میں ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور اپنے اعزہ و اقربا سے بھی ہمیں جدا ہونا پڑا تاہم مہاجرین اور ان کے ساتھ ہی انصار کو بھی یہ کامل یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ اور پیروانِ اسلام کی مدد ضرور کرے گا اور دوسرے تمام ادیان پر اگر انجام کار غلبہ ہوگا تو اسی کے دین کو۔ انہیں پورا وثوق تھا کہ مستقبل قریب میں وہ وقت دور نہیں جب مکے کے دروازے ان پر کھل جائیں گے اور انہیں بیت اللہ کی زیارت اور اس کے طواف کی سعادت نصیب ہوگی، نیز انہیں اس دینی فریضے کی بجا آوری کا موقع ملے گا جو نہ صرف ان پر بلکہ تمام مخلوق پر یکساں فرض ہے اگرچہ ہجرت کے بعد کئی بہاریں بیت چکی تھیں اور بدر، احد، خندق ایسے کئی غزوات بھی وقوع پذیر ہو چکے تھے، پھر بھی وہ متوقع تھے کہ ایک دن ایسا آئے گا ضرور جب ان کے سارے غم غلط ہو جائیں گے۔ اس دن کا انہیں انتظار تھا اور وہ ذوق و شوق کے عالم میں گھڑیاں گن رہے تھے۔ یہ جذبہ شوق آنحضرت ﷺ کے دل میں بھی لہریں لے رہا تھا اور وہ اپنے پیروؤں کو یہ یقین دلاتے رہتے تھے کہ وہ دن کچھ دور نہیں جب خدا کے فضل و کرم سے فتح و نصرت کا پرچم لہرائے گا۔

مسلمانوں کا اشتیاقِ طواف

یہ ایک حقیقت ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کو زیارت کعبہ اور حج و عمرہ کی ادائیگی سے باز رکھنا قریش کی زیادتی تھی کیونکہ کعبہ پر صرف قریش ہی کا نہیں بلکہ پورے عرب کا حق تھا۔ قریش کے فرائض میں تو سقایت (حاجیوں کو پانی پلانا)، حجابت (کعبہ کی نگہداشت) اور زائرین کی خبر گیری ایسے امور داخل تھے۔ بات یہ تھی کہ عرب قبائل میں سے ہر قبیلہ کے بت جدا جدا تھے، وہ انہی کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے تھے، دوسرے بتوں سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا لہٰذا قریش کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ کسی قبیلہ کو کعبہ کی زیارت، طواف یا اپنے معبود کی پرستش سے روک سکیں۔ آنحضرت ﷺ بت پرستی سے اجتناب اور شرک سے بیزاری کی تعلیم دیتے تھے اور آپ ﷺ کی دینی دعوت کا مقصد یہ تھا کہ روحانی ترقی اگر حاصل کی جا سکتی ہے یا تزکیہ نفس اور تصفیۂ باطن اگر ممکن ہے تو صرف خدائے واحد کی عبادت کی صورت میں، آپ ﷺ کے خیال میں وحدت الوجود کی حقیقت کے ادراک اور وجودِ حقیقی کی وحدانیت کے عرفان کا ذریعہ صرف یہی ایک صورت تھی۔ حج بیت اللہ اور عمرہ بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں تھیں اس لئے ایک نئے دین کے علمبرداروں کو اس اہم فریضے سے عہدہ برآ نہ ہونے دینا نہایت نازیبا اور ناشائستہ روش تھی۔ ادھر قریش کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر کہیں آنحضرت ﷺ اور آپ کے رفقا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر قوی ایمان رکھتے ہیں اور ہیں بھی مکے کے باشندے، زیارت کعبہ کے لئے آئے تو مکے کے اکثر و بیشتر لوگ ان کے زمرے میں شامل ہو جائیں گے اور ان پر ان مظالم کی حقیقت واضح ہو جائے گی جو ان پر جلاوطنی اور اعزہ و اقربا سے دوری کی شکل میں توڑے

Marfat.com

گئے ہیں اور اس کا نتیجہ سوا خانہ جنگی کے اور کچھ نہ ہوگا۔ علاوہ بریں امرائے قریش اور سرداران مکہ کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ شام سے ان کی تجارتی آمدورفت کی راہیں نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے پیروؤں کی دخل اندازی سے مسدود ہوئی ہیں اس لئے ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف غیظ و غضب کی بھٹی دہک رہی تھی۔ اس آگ کے شعلے اس تصور سے ہرگز سرد نہ ہو سکتے تھے کہ کعبہ خدا کا گھر اور تمام قبائل عرب کا اس پر حق ہے اور قریش پر صرف اس کی نگہداشت اور زائرین کی حفاظت و سیانت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

مسلمان اور کعبہ

ہجرت پر چھ بہاریں بیت چکی تھیں اور مسلمان زیارتِ کعبہ اور حج و عمرہ کی ادائیگی کے لئے بیتاب تھے۔ غرض ایک دن علی الصباح آنحضرت ﷺ نے اصحاب کو تازہ وحی سے آگاہ کیا اور یہ فرمایا کہ ہم عنقریب ان شاء اللہ اپنے سروں کے بال منڈوا کر امن و سلامتی سے بلاخوف و خطر حدودِ حرم میں داخل ہوں گے۔ جونہی مسلمانوں نے یہ بشارت سنی انہوں نے سجدۂ شکر ادا کیا اور یہ خبر آناً فاناً مدینہ کے طول و عرض میں پھیل گئی لیکن مسلمان اس سوچ میں تھے کہ مسجد حرام میں داخلہ کیسے ممکن ہے؟ کیا انہیں اس مقصد کے لئے ہتھیار اٹھانے ہوں گے؟ کیا وہ قریش کو مکہ سے نکال باہر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟ یا قریش خود اپنی مرضی سے ان کی اطاعت کا قلاوہ اپنی گردن میں ڈال کر بیت اللہ کے دروازے ان پر کھول دیں گے۔

حج بیت اللہ کے لئے اعلان

اس مقصد کے حصول کے لئے جنگ ناگزیر نہ تھی، نبی کریم ﷺ نے اعلانِ عام کر دیا کہ مسلمان ذی القعدہ میں سفر حج کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ اس ضمن میں آپ ﷺ نے عرب قبائل کو بھی پیغام بھیجا کہ وہ بھی بیت اللہ کی طرف آپ ﷺ کی معیت میں رخ کریں، یہ ارادۂ جنگ نہیں بلکہ امن و سلامتی اور صلح و آشتی کی نیت سے۔ اس دوران میں آپ ﷺ کی یہ خواہش تھی کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں آپ ﷺ کے ساتھ شریک سفر ہوں تاکہ قبائل عرب پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ آپ نے بہ ارادہ جنگ نہیں بلکہ فریضہ حج کی بجا آوری کے لئے مکہ کے لئے رخت سفر باندھا ہے جسے اسلام میں بھی عرب کے دیگر مذاہب کی طرح فرض کی حیثیت حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کے ہمراہ دوسرے مذاہب کے پیرو بھی شامل ہیں تاکہ وہ بھی اس فرض سے سبکدوش ہو سکیں۔ اگر اس صورت میں بھی قریش ماہِ حرام میں جنگ پر آمادہ ہوں گے اور اس فرض کی ادائیگی میں رکاوٹیں ڈالیں گے جس پر اختلاف عقائد کے باوجود تمام عرب کا ایمان ہے تو مستقبل میں عرب قبائل کا تعاون انہیں حاصل نہ ہو سکے گا اور اگر مسلمانوں سے جنگ چھڑی تو کوئی قبیلہ قریش کا ساتھ نہ دے گا کیونکہ مسلمانوں اور دوسرے قبائل کو بیت اللہ کے حج و طواف سے باز رکھنے کے معنی یہ لئے جائیں گے کہ قریش لوگوں کو دین اسماعیل علیہ السلام اور اپنے جد ابراہیم علیہ السلام کی ملت سے الگ کر دینا چاہتے ہیں۔

Marfat.com

اس سے مسلمانوں کو یہ اطمینان ہو جائے گا کہ عرب قبائل ان کے خلاف دوبارہ محاذ قائم نہ کریں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان لوگوں کی نظر میں اسلام کی اہمیت بڑھ جائے گی جو ابھی تک اس کے پیرو نہیں۔ علاوہ بریں قریش ان لوگوں کو کیا جواب دیں گے جو احرام باندھے اس عالم میں مکے جائیں گے کہ ان کے ہمراہ قربانی کے جانور ہوں گے اور ان کا مقصد سوا اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ وہ بیت اللہ کا طواف کریں جو تمام عرب کی مشترکہ زیارت گاہ ہے۔

غیر مسلم قبائل کو حج کی دعوت

نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو حج کی دعوت دی اور غیر مسلم قبائل کو بھی اپنے ہمراہ لے چلنا چاہا لیکن اکثر و بیشتر لوگوں نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مسلمانوں نے آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا۔ آپ ﷺ ذی القعدہ کے آغاز میں انصار و مہاجرین اور عربوں کے ہمراہ جو آپ ﷺ سے متفق تھے، اپنی اونٹنی قصوا پر سوار ہو کر مدینہ سے عازم مکہ ہوئے۔ آپ ﷺ کے ہمراہ ایک ہزار چار سو افراد تھے۔ قربانی کے لئے ستر اونٹ بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ ﷺ نے عمرہ کے لئے احرام باندھا تا کہ سب پر یہ بات کھل جائے کہ آپ ﷺ کا ارادہ جنگ کا نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ صرف کعبہ کی زیارت اور اس کے طواف کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں۔ جب آپ ﷺ مقام ذوالحلیفہ[1] پر پہنچے تو آپ ﷺ کے رفقا نے سر کے بال بٹ لئے اور عمرہ کے لئے تلبیہ کی اور قربانی کے اونٹوں کو الگ کر کے ان کے دائیں پہلوؤں پر نشان لگائے۔ انہی میں ابوجہل کا وہ اونٹ بھی تھا جو غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ لگا تھا۔ اس گروہ میں کسی کے پاس سوائے تلوار کے جسے عموماً ہر مسافر ساتھ رکھتا تھا اور کوئی ہتھیار نہ تھا۔ اُم المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بھی اس سفر میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھیں۔

قریش کی پیش بندی

قریش کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ حج کے ارادے سے آ رہے ہیں، اس سے وہ خوفزدہ ہوئے اور انہوں نے اس معاملے کے نشیب و فراز پر غور کیا۔ انہوں نے خیال کیا کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں اور ان کے رفیق قبائل کو مدینہ منورہ کی حدود میں داخل نہیں ہونے دیا لیکن خود مکے میں داخلے کی ایک تدبیر سوچی ہے۔ اگرچہ انہیں یہ علم ہو چکا تھا کہ ان کے مخالفین نے عمرہ کے لئے احرام باندھا ہے اور تمام عرب میں یہ اعلان عام کر دیا ہے کہ مکے کی طرف ان کا سفر محض ایک دینی فریضے کی بجا آوری کے سلسلے میں ہے اور اس کا علم تمام عرب قبائل کو ہے تاہم یہ خیال انہیں نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کی مزاحمت سے باز نہ رکھ سکا۔ وہ ہر قیمت پر مزاحمت کے لئے تلے ہوئے تھے چنانچہ اس غرض سے قریش نے خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل کو ایک فوج کا سربراہ بنا کر جس میں صرف سواروں کی تعداد دو سو تھی مکہ سے

Marfat.com

باہر بھیج دیا تا کہ وہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں۔ قریش کی یہ فوج مکہ سے اتنی دور نکل آئی کہ اس نے مقام ذی طویٰ پر پڑاؤ ڈال دیا۔

آمنا سامنا

آنحضرت ﷺ اپنے لشکر سمیت عسفان تک پہنچ گئے۔ یہاں بنی کعب کا ایک شخص ملا، آپ ﷺ نے اس سے قریش کے بارے میں معلومات حاصل کیں، اس نے کہا: "وہ آپ کے عزم سفر کی خبر سن کر غصے میں بھرے ہوئے مکہ سے چل کر مقام ذی طویٰ میں پڑاؤ ڈال چکے ہیں۔ انہوں نے یہ عہد کیا ہے کہ وہ آپ ﷺ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے، خالد بن ولید سواروں کا لشکر لئے ہوئے کراع الغمیم تک آ پہنچے ہیں۔" (کراع الغمیم سعان سے آگے آٹھ میل کے فاصلے پر ایک وادی ہے)۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "قریش کی روش افسوس کے قابل ہے۔ جنگ نے ان کی اجتماعیت کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے، اگر وہ ایسا کرتے کہ مجھے عرب قبائل کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے تو اس میں ان کا کیا نقصان تھا۔ اگر عرب قبائل مجھ پر غلبہ پا لیتے تو قریش کے دل کی آرزو پوری ہو جاتی اور اگر خدا مجھے ان پر غلبہ عطا کرتا تو پھر وہ دین اسلام کے حلقے میں جوق در جوق داخل ہو جاتے۔ اگر وہ یہ بات نہ کرتے تو جنگ کر سکتے تھے کیونکہ ان کے پاس قوت ہے لیکن نہ معلوم قریش نے کیا ٹھان رکھی ہے؟ بخدا میں اس مقصد کی خاطر جس کے لئے مجھے مبعوث کیا گیا ہے جدوجہد میں کوتاہی نہ کروں گا تا آنکہ مجھے غلبہ حاصل ہو یا میں ہی نہ رہوں۔"

بعد ازاں آپ ﷺ اس سوچ میں پڑ گئے کہ ان حالات میں کیا راہ عمل اختیار کرنی چاہیے؟ آپ ﷺ نے مدینہ سے کوچ جنگ کے ارادہ سے نہیں بلکہ زیارت بیت اللہ کی نیت سے کیا تھا اس لئے آپ ﷺ نے جنگ کی تیاری بھی نہ کی تھی۔ اگر جنگ کرتے اور اس میں فتح نہ ہوتی تو قریش پھولے نہ سماتے اور انہیں طعن و تعریض کا موقع مل جاتا۔ غالباً قریش نے یہی سوچ سمجھ کر خالد اور عکرمہ کی قیادت میں فوج بھیجی تھی۔

صلح طلبی

ابھی آپ ﷺ حالات کے نشیب و فراز پر غور و خوض ہی فرما رہے تھے کہ قریش کی فوج کے سوار مسلمانوں کو سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان کے انداز اور تیور یہ کہے دے رہے تھے کہ مسلمانوں کو اپنے مقصد میں ہرگز کامیابی نہیں ہو سکتی سوا اس صورت کے کہ قریش کی فوج پر ٹوٹ پڑیں اور ان کا صفایا کر دیں۔ انہیں یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ قریش اس معرکے میں ناموس وطن اور عزت نفس کے تحفظ کی خاطر جانوں پر کھیل جائیں گے لیکن آنحضرت ﷺ جنگ کے لئے آمادہ نہ تھے، حالات نے آپ ﷺ کو مجبور کر دیا کہ میدان جنگ میں اتریں اور دشمن کا مقابلہ کریں۔ جو مسلمان آپ ﷺ کے ہمراہ تھے وہ شجاعت و بسالت میں کس سے کم تھے؟ اگر وہ شمشیر بکف ہو کر مدافعت کے لئے دشمن کے مقابل صف آرا ہوتے تو

Marfat.com

غالب ہی رہتے لیکن اس سے آنحضرت ﷺ کا مقصد فوت ہو جاتا تھا۔ علاوہ بریں یہ بات بھی تھی کہ اگر مسلمان معرکہ آرا ہوتے تو قریش عرب قبائل میں یہ پروپیگنڈا کرتے کہ نبی کریم ﷺ نے ماہ حرام میں بھی ہم سے جنگ کی۔ آنحضرت ﷺ کی شخصیت، پیغمبرانہ بصیرت کے علاوہ دانش وحکمت کا مجسمہ تھی، یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آپ ﷺ کا کوئی فعل حکمت کے منافی ہو، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے رفقاء سے فرمایا۔ ''کوئی ہے جو ہمیں کسی ایسے راستے سے مکہ لے جائے جہاں ہم قریش کی فوج سے متصادم نہ ہوں۔'' اس طرح آپ ﷺ نے مدینہ سے روانگی سے قبل زیارت کعبہ کا جو ارادہ فرمایا تھا، نیز یہ قصد کہ اس سفر میں صلح و آشتی کے اصول پر عمل رہے گا، اس کی لاج رکھنی چاہی۔ غرض لشکر اسلام میں سے ایک شخص نے اپنی خدمات پیش کیں اور وہ سب کو ایک خطرناک اور دشوار گزار راستے اور پیچ در پیچ گھاٹیوں سے لے چلا۔ مسلمانوں کو اس راستے میں منزلیں طے کرنے میں حد درجہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک وادی کی راہ سے ہوتے ہوئے مجاہدین اسلام کا یہ لشکر ایک میدان میں آ نکلا، وہاں سے دائیں جانب کو ہولیا، حتیٰ کہ مکہ کے زیریں حصے میں مرار نامی ایک ٹیلے کے قریب حدیبیہ کی گھاٹی میں پڑاؤ ڈالا۔

قریش کے سواروں کو جب آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء کے اس فعل کا علم ہوا تو وہ الٹے پاؤں تیزی سے واپس ہوئے، اس خیال سے کہ اگر مسلمان مکے پر حملہ آور ہوں تو ہم ان کی مدافعت کر سکیں۔ جب مسلمان حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تھے تو آپ ﷺ کی اونٹنی قصواء بیٹھ گئی تھی، مسلمانوں کو یہ خیال ہوا کہ شاید اس پر تھکن غالب آ گئی ہے اس پر آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''اس اونٹنی کو مکہ میں داخلے سے اس ذات نے روکا ہے جس نے ابرہہ کے ہاتھی کو روکا تھا۔ قریش مجھ سے صلہ رحمی کی درخواست کرتے ہوئے جس امر کی دعوت بھی دیں میں اسے قبول کرلوں گا۔'' بعدازاں آپ ﷺ نے اپنے رفقاء کو یہیں فروکش ہونے کا حکم دیا۔ لوگوں نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! اس وادی میں کہیں پانی نہیں جہاں ہم پڑاؤ ڈالیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے ترکش میں سے ایک تیر نکال کر ایک شخص کو دیا اور اسے یہ ہدایت دی کہ وہ اسے وہاں کے کسی کنوئیں کی تہ میں اتر کر ریت میں گاڑ دے جب یہ عمل کیا گیا تو کنوئیں کا پانی جوش مار کر اوپر ابل آیا، اس سے لوگوں کو اطمینان ہوا اور پڑاؤ ڈال دیا۔

قریش کے قاصد

مسلمانوں نے تو حدیبیہ میں پڑاؤ ڈال دیا تھا لیکن قریش ان کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ وہ یہ سوچ بیٹھے تھے کہ خواہ نتیجہ ہلاکت ہی کیوں نہ ہو ہم آنحضرت ﷺ کو مکہ کی حدود میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ کیا مسلمانوں کو قریش سے نبرد آزما ہونا چاہیے تا کہ خدا ان کے اور قریش کے درمیان فیصلہ کر دے اور سارے جھگڑے ہی ختم ہو جائیں؟ یہ سوال مسلمانوں کے زیر غور تھا۔ قریش بھی جنگ کے

Marfat.com

بارے میں سوچ رہے تھے۔
اگر جنگ چھڑ جاتی اور مسلمان فاتح و کامران ہو جاتے تو قریش کا معاملہ ہمیشہ کے لئے عربوں کے نزدیک کھٹائی میں پڑ جاتا اور قریش کو یہ خطرہ پیش آ جاتا کہ نبی کریم ﷺ ان سے کعبہ کی تولیت وسقایت کا منصب اور دیگر تمام ذمہ داری کے کام جن پر قریش کو فخر تھا، چھین لیں گے۔ ان حالات میں انہیں کیا کرنا چاہیے؟ یہ سوال قریش کے زیر غور تھا۔ غرض دونوں لشکر اپنے اپنے حالات پر غور کر رہے تھے، ادھر آنحضرت ﷺ اپنی روش پر قائم تھے اور انہوں نے صلح و آشتی سے عمرہ کا جو قصد کیا تھا اس پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے البتہ اس صورت میں کہ قریش خود ان پر ٹوٹ پڑیں یا غداری کریں، جنگ ناگزیر تھی۔ قریش اپنے معاملے میں پریشان اور متردد تھے، آخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے کچھ آدمی آنحضرت ﷺ کی طرف اس غرض سے بھیجیں کہ ایک طرف تو وہ آپ ﷺ کی طاقت کا اندازہ کرلیں اور دوسری طرف آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے روکیں، غرض بدیل بن ورقاء بنی خزاعہ کے چند آدمیوں کے ہمراہ آپ ﷺ کے پاس آیا اور پوچھا کہ آپ ﷺ کی آمد کا کیا مقصد ہے؟ جب انہیں آپ ﷺ کی گفتگو سے اطمینان ہو گیا کہ آپ جنگ کے ارادے سے نہیں بلکہ صرف کعبہ کی زیارت اور اس کے طواف کی غرض سے آئے ہیں تو وہ قریش کی طرف واپس آئے تاکہ انہیں تسلی دیں اور وہ آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو زیارت کعبہ سے نہ روکیں لیکن قریش نے ان پر فقرے کسے، انہیں مارا پیٹا اور پکار اٹھے۔ اگر وہ جنگ کے ارادے سے نہیں آئے تو ہم ہرگز انہیں کعبہ کی حدود میں داخل نہیں ہونے دیں گے تاکہ آئندہ عرب کی تاریخ میں اس واقعہ کی جانب کوئی اشارہ بھی نہ آئے۔
قریش نے آپ ﷺ کی طرف ایک اور قاصد روانہ کیا، اس نے بھی نبی کریم ﷺ سے وہی باتیں سنیں جو اس سے پہلے اس کے ساتھی نے سنی تھیں لیکن اس نے اپنے آپ کو مورد الزام ٹھہرائے جانے کے خیال سے قریش کو کوئی جواب نہ دیا۔ قریش کو آنحضرت ﷺ سے جنگ کے سلسلہ میں احابیش[3] پر بھروسہ تھا۔ انہوں نے یہ سوچا کہ وہ ان کے پیشوا کو نبی کریم ﷺ کے پاس بھیجیں تاکہ جب وہ یہ دیکھے گا کہ آنحضرت ﷺ نے اس کی بات نہیں مانی اور آپ ﷺ نے اس سے مفاہمت نہیں کی تو قریش کی دل کھول کر مدد کرے گا اور اس طرح نبی کریم ﷺ کے خلاف قریش کی طاقت دوچند و سہ چند ہو جائے گی چنانچہ احابیش کا پیشوا حلیس مسلمانوں کے لشکر گاہ کی طرف گیا، جب آنحضرت ﷺ نے اسے آتے ہوئے دیکھا تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ قربانی کے اونٹ اس کے سامنے چھوڑ دیں تاکہ اس پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ قریش جن لوگوں سے جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں وہ تو صرف حج بیت اللہ اور اس کی تعظیم کی خاطر آئے ہیں۔ حلیس نے قربانی کے ستر اونٹ وادی کی جانب دیکھے جو بھوک کے مارے ایک دوسرے کے بال نوچ رہے تھے۔ اس منظر سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوا اور اس کے دینی جذبات ابھر آئے۔ اسے یہ

Marfat.com

یقین آ گیا کہ قریش ان لوگوں پر ظلم کر رہے ہیں جو جنگ یا پیش قدمی کے ارادے سے نہیں آئے چنانچہ وہ آنحضرت ﷺ سے ملاقات کئے بغیر واپس ہو گیا اور جو کچھ دیکھا ان سے بیان کیا۔ قریش اس کی باتیں سن کر غصے میں بھر گئے اور کہنے لگے، بیٹھو! تم جاہل اور اجڈ ہو۔ حلیس کو ان الفاظ پر طیش آ گیا اور اس نے انہیں دھمکی دی کہ میں نے تم سے اس بات پر عہد و پیمان نہیں کیا کہ میں اس شخص کو کعبہ کی حدود میں داخل ہونے سے روکوں جو اس کی تعظیم کی نیت سے آتا ہے۔ اس نے انہیں یہ بھی دھمکی دی کہ اگر وہ آنحضرت ﷺ کو کسی تعرض کے بغیر چھیڑیں گے تو وہ اپنے ہمراہ تمام احابیش کو مکہ سے باہر لے جائے گا۔ قریش اس کے غصے کے انجام سے خوف زدہ ہو گئے اور اس سے معاملے پر غور و خوض کے لئے مہلت طلب کی۔

عروہ بن مسعود کی سفارت

غرض قریش نے کسی ایسے دانشمند شخص کو نبی کریم ﷺ کے پاس بھیجنے کا ارادہ کیا جس کی معاملہ فہمی اور خوش تدبیری پر انہیں پورا پورا اعتماد ہو۔ اس سلسلہ میں ان کی نظر انتخاب عروہ بن مسعود ثقفی پر پڑی لیکن عروہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ قریش نے ان قاصدوں سے جواب تک بھیجے جا چکے ہیں کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تو اس نے معذوری ظاہر کی۔ قریش نے عروہ کو یقین دلایا کہ ہمیں تمہاری دانشمندی پر پورا اعتماد ہے اور ہم کسی صورت بھی تم پر آوازے نہ کسیں گے۔ عروہ بن مسعود نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ مکہ آپ ﷺ کا وطن مالوف ہے، آج آپ ﷺ اگر دوسرے لوگوں کی جماعت کے ساتھ وہاں کے رہنے والوں پر حملہ کریں گے تو کل جب یہ لوگ آپ ﷺ کا ساتھ چھوڑ دیں گے تو جہاں یہ بات قریش کی بدنامی کا باعث ہو گی وہاں اس سے آپ ﷺ بھی رسوا ہو جائیں گے۔ میرا خیال ہے خواہ آپ ﷺ کے اور قریش کے درمیان کتنی ہی کشیدگی کیوں نہ ہو آپ ﷺ یہ صورت حال ہرگز پسند نہ کریں گے۔

حضرت ابوبکرؓ صدیق نے پرزور الفاظ میں عروہ کے اس خیال کی تردید کی کہ آنحضرت ﷺ کے رفقاء آپ ﷺ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ عروہ گفتگو کے دوران میں اپنا ہاتھ آنحضرت ﷺ کی ریش اقدس تک لے جاتا تھا، حضرت مغیرہؓ بن شعبہ جو آپ ﷺ کے پاس ہی کھڑے تھے عروہ کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو جھٹک دیتے تھے گو انہیں یہ علم تھا کہ عروہ وہی شخص ہے جس نے ان کے قبول اسلام سے قبل ان تیرہ مقتولین کا خوں بہا ادا کیا تھا جو مغیرہؓ کے ہاتھ سے قتل ہوئے تھے تاہم ان کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ عروہ کا ہاتھ ان کے آقا کی ریش مقدس تک پہنچے۔

مختصر یہ کہ عروہ بھی اپنی قوم کے پاس وہی جواب لے کر پہنچا جو اس سے پہلے دوسرے قاصد لے جا چکے تھے یعنی یہ کہ آپ ﷺ یہاں بہ ارادہ جنگ نہیں آئے، بلکہ بیت اللہ کی زیارت کا جذبہ انہیں کھینچ لایا ہے۔ عروہ نے قریش سے کہا۔

''اے گروہ قریش! میں کسریٰ قیصر اور نجاشی کے شاہی درباروں میں باریابی کا شرف حاصل کر چکا

Marfat.com

ہوں لیکن بخدا! میں نے کسی فرمانروا کو اس کی قوم میں اتنا محترم اور اتنا معزز نہیں پایا جتنا کہ (حضرت) محمد (ﷺ) اپنی قوم میں ہیں۔ جب وہ وضو کرتے ہیں تو لوگ آپ ﷺ کے لئے پانی حاضر کرتے ہیں۔ اگر آپ ﷺ کا ایک بال بھی گر جاتا ہے تو وہ فوراً اسے اٹھا لیتے ہیں، مجھے تو یہ اندازہ ہوا ہے کہ وہ کسی وقت بھی آپ ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ اب تم خوب سوچ سمجھ لو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے؟''

قاصد رسول ﷺ سے بدسلوکی

اس قسم کی گفت وشنید کا سلسلہ تادیر جاری رہا۔ آپ ﷺ نے خیال کیا، قریش کے قاصدوں نے غالباً حالات کی صحیح ترجمانی نہیں کی، اگر ایسا ہوتا تو قریش آپ ﷺ کے ارادہ سے مطلع ہو کر مطمئن ہو جاتے۔ اس لئے آپ ﷺ نے اپنی طرف سے قریش کے پاس ایک قاصد بھیجا تاکہ انہیں معاملہ کی نوعیت سے باخبر کرے۔ قریش نے یہ زیادتی کی کہ اس قاصد کے اونٹ کی کونچیں کاٹ ڈالیں، وہ اسے بھی قتل کر دینا چاہتے تھے لیکن احابیش نے اس کی جان بچائی۔ قریش نے اپنی اس روش سے ثابت کر دیا کہ ان کے دلوں میں بغض وعناد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اس واقعہ سے مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہو گئے اور ان میں بعض نے جنگ کا تہیہ کر لیا۔ جس دوران میں فریقین کے مابین گفت وشنید ہو رہی تھی قریش کے بعض عاقبت نااندیش لوگ راتوں کو آبادی سے نکل کر مسلمانوں پر پتھروں کی بارش کیا کرتے تھے۔ ایک دن چالیس یا پچاس آدمی آپ ﷺ کے رفقا کی ایذارسانی کے لئے نکلے۔ حسن اتفاق سے انہیں مسلمانوں نے گھیر گھار کر گرفتار کر لیا اور وہ آنحضرت ﷺ کے حضور میں پیش کئے گئے لیکن حیرت کی بات ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں اپنی مصالحانہ روش اور ماہ حرام کی حرمت کے پیش نظر رہا کر دیا۔ اس سے آپ ﷺ کا مقصود یہ تھا کہ اس قابل احترام مہینے میں حدیبیہ کے مقام پر جو مکے کی حدود میں داخل ہے کسی قسم کی خونریزی نہ ہو۔ قریش کو یہ اطلاع ملی تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور ان کے وہ تمام خیالات باطل ثابت ہوئے جن کی بنا پر وہ یہ سمجھتے تھے کہ آنحضرت ﷺ کی آمد بہ ارادہ جنگ ہوئی ہے۔ قریش کو اب یہ یقین ہو گیا کہ ہمارے طرف سے اگر پیغمبر اسلام ﷺ پر کسی قسم کی بھی زیادتی ہوئی تو تمام قبائل عرب اسے کمینگی اور غداری پر محمول کریں گے اور ان کی نظر میں نبی کریم ﷺ کی ہر قسم کی پیش بندی اور مدافعت کے لئے طاقت کا استعمال نادرست نہ ہوگا۔

عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی سفارت

آنحضرت ﷺ نے ایک اور قاصد کے ذریعے سے قریش کی نیت کا جائزہ لینا چاہا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ قاصد کھل کر بالمشافہ گفت وشنید کرے تاکہ کوئی بات ڈھکی چھپی نہ رہے۔ آپ ﷺ نے اس خدمت کے لئے حضرت عمرؓ بن خطاب کا انتخاب کیا، حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! قریش سے مجھے جان کا خطرہ ہے اور مکہ میں بنی عدی بن کعب کا ایک فرد بھی ایسا نہیں جو میری حمایت کر سکے۔ قریش خوب جانتے ہیں کہ

Marfat.com

میں نے ان سے کیا کیا بدسلوکیاں کی ہیں۔ میں آپ ﷺ کو ایک ایسے شخص کی نشاندہی کرتا ہوں جو میری نسبت ان میں زیادہ محترم ہے اور وہ حضرت عثمان بن عفانؓ ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جو آپ ﷺ کے داماد تھے، طلب فرمایا اور انہیں یہ حکم دیا کہ وہ ابوسفیان اور دیگر سرداران قریش کے پاس جائیں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ روانہ ہوئے۔ آپ مکہ میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے آپ کی ملاقات ابان بن سعید سے ہوئی۔ ابان نے آپ کو پیغام پہنچانے کے وقت تک امان دی چنانچہ آپؓ سرداران قریش سے ملے اور انہیں پیغمبر اسلام ﷺ کے پیغام سے مطلع کیا، انہوں نے کہا: "اے عثمان! اگر تم کعبہ کا طواف کرنا چاہتے ہو تو کر سکتے ہو۔" انہوں نے جواب دیا کہ جب تک آنحضرت ﷺ طواف نہ کریں گے میں بھی نہ کروں گا۔ ہم سب کعبہ کی زیارت اور فریضہ عبادت کی بجا آوری کے لئے آئے ہیں چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ قربانی کے اونٹ بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ ہم ان کی قربانی کے بعد صلح و آشتی کے ساتھ مدینہ واپس چلے جائیں گے۔ قریش نے جواب دیا، ہم نے یہ قسم کھالی ہے کہ امسال (حضرت) محمد (ﷺ) مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ بات طول پکڑ گئی اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو خلاف توقع مکہ میں ٹھہرنا پڑ گیا۔ اس اثنا میں کسی نے یہ افواہ اڑا دی کہ قریش نے حضرت عثمانؓ کو دھوکے سے شہید کر دیا ہے۔ غالباً اس عرصہ میں سرداران قریش حضرت عثمانؓ سے مل کر اس بارے میں گفت و شنید کر رہے تھے کہ جب مسلمانوں کو کعبہ کے طواف اور اپنے مذہبی فریضہ کی ادائی کا اتنا شوق ہے تو ہماری یہ قسم کہ (حضرت) محمد (ﷺ) امسال بزور وقوت مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے، کیسے برقرار رہ سکتی ہے؟ ممکن ہے وہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے مانوس بھی ہو گئے ہوں اور اس اثنا میں ان سے یہ گفتگو انہوں نے چھیڑ رکھی ہو کہ (حضرت) محمد (ﷺ) سے روابط کیسے قائم رہ سکتے ہیں۔

بیعت رضوان

قصہ کوتاہ حدیبیہ کے مقام پر مسلمان حضرت عثمانؓ کے بارے میں سخت پریشان ہو رہے تھے۔ قریش کی غداری اور ان کے ہاتھوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایسے قابل احترام مہینے میں قتل، جس میں عرب کے تمام مذاہب کی رو سے حرم کعبہ یا حرم کعبہ کے اندر کسی شخص کے لئے جائز نہ تھا کہ وہ اپنے دشمن کو قتل کرے، یہ ایسی چیزیں نہ تھیں کہ ان سے مسلمان غضب آلود نہ ہوتے۔ انہیں بار بار قریش کی غداری کا خیال آتا تھا کہ انہوں نے ایک ایسے قاصد سے بھی یہ معاملہ کیا جو ان کے پاس صلح و آشتی کا پیغام لے کر گیا تھا۔ مسلمانوں سے رہا نہ گیا، انہوں نے طیش میں آ کر تلواریں سنبھال لیں، پیغمبر اسلام ﷺ کے دل میں بھی یہ بات بیٹھ گئی کہ قریش نے غداری کی ہے اور ماہ حرام میں بھی وہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قتل سے نہ چوکے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا، جب تک ہم ان لوگوں سے جنگ نہ کر لیں گے یہاں سے قدم نہ ہٹائیں گے۔ آپ ﷺ اس وقت اس وادی میں ایک درخت کے نیچے رونق افروز تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے رفقاء کو طلب فرمایا اور انہوں نے

Marfat.com

اس ارادہ سے آپ ﷺ کے دست اقدس پر بیعت کی کہ ہم جان دے سکتے ہیں بھاگ نہیں سکتے۔ بیعت کے وقت ان کا یقین محکم، ارادہ قوی اور دل اس جذبہ سے پُر تھا کہ خواہ کچھ ہو ہم غداروں اور قاتلوں سے بھرپور انتقام لیں گے۔ اس سلسلے میں اس آیت کا نزول ہوا۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾ (سورۃ الفتح:۱۸)

"بے شک اللہ تعالیٰ مومنوں سے راضی ہو گیا جبکہ وہ درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے سو جو کچھ ان کے دلوں میں تھا خدا کو اس کا علم تھا اس نے ان پر سکون کی کیفیت طاری کی اور انہیں ایک قریبی فتح عطا فرمائی۔"

جب مسلمان اس بیعت رضوان سے فارغ ہو چکے تو آنحضرت ﷺ نے حضرت عثمانؓ کی طرف سے بیعت کے لئے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر اس طرح مارا گویا وہ بھی اس بیعت میں شامل ہیں۔ اس بیعت کے فوراً بعد تلواریں جنبش میں آئیں اور مسلمانوں کو یہ پختہ یقین ہو گیا کہ اب جنگ چھڑ کر رہے گی چنانچہ ان میں سے ہر ایک کو یہ انتظار تھا کہ دیکھئے اس کی قسمت میں فتح ہے یا شہادت، اسی اثنا میں انہیں یہ خبر موصول ہوئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید نہیں ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد خود حضرت عثمانؓ بھی آ موجود ہوئے تاہم یہ بیعت رضوان بیعت عقبہ کی طرح تاریخ اسلام میں اپنی اہمیت و عظمت کے نقوش چھوڑ گئی ہے۔ جب اس بیعت کا ذکر چھڑتا تھا تو آنحضرت ﷺ اس سے بہت زیادہ محظوظ ہوا کرتے تھے کیونکہ اس بیعت سے آپ کے اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے باہمی تعلقات کی خوشگواری اور استواری کا ثبوت ملتا تھا اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ مسلمان اسلام اور حق و صداقت کی خاطر کس دلیری سے اپنی جانیں جوکھوں میں ڈالنے کے لئے مستعد رہتے ہیں۔ جو شخص مردانہ وار ایسے مواقع پر جانبازی کا مظاہرہ کرتا ہے جہاں قدم قدم پر موت کے جال بچھے ہوئے ہیں، موت خود اس سے پناہ مانگتی ہے، لیل و نہار کی گردشیں اس کے آگے سر جھکا دیتی ہیں اور بالآخر اسے فائز المرامی نصیب ہوتی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے واپسی پر آنحضرت ﷺ کو قریش کا یہ پیغام دیا کہ انہیں اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم بیت اللہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ ہمیں ماہ حرام میں عرب کے کسی باشندے کو حج اور عمرہ سے باز رکھنے کا حق نہیں۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے خالد بن ولید کی سرکردگی میں فوج بھیج کر آپ ﷺ کے ساتھ لڑنے اور آپ ﷺ کو مکہ میں داخلے سے روکنے میں پہل کی ہے اور ان کے اور آپ ﷺ کے پیروؤں کے درمیان جھڑپیں بھی ہو چکی ہیں۔ اگر اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی وہ آپ ﷺ کو مکہ میں داخل ہونے دیں گے تو قبائل عرب یہ کہیں گے کہ قریش

Marfat.com

آپ ﷺ کے مقابلے میں بھاگ گئے اور اس طرح عرب قبائل کی نظر میں ان کی نہ ہیبت باقی رہے گی نہ وقار، اس لئے وہ آن باقی رکھنے کے لئے اس سال ضد پر اڑے ہوئے ہیں اس لئے آپ ﷺ کو اور اصحاب رضی اللہ عنہم کو بھی یہ سوچنا ہے کہ اس مشکل کا کوئی حل نکل آئے ورنہ جنگ کے بغیر گتھی نہ سلجھے گی اور وہ طوعاً وکرہاً جنگ میں شامل ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود بھی اس حرمت کے مہینے میں جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے کیونکہ ایک طرف تو وہ دینی نقطۂ نظر سے قابل احترام مہینوں کی حرمت قائم رکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ان کا یہ خیال ہے کہ اگر آج وہ ان مہینوں کا احترام نہ کریں گے اور ان میں خونریزی ہوگی تو عرب قبائل آئندہ حرمت کے مہینوں میں بھی تجارت کی غرض سے مکہ کے بازاروں میں آنے کی جرأت نہ کریں گے اور اس طرح مکہ کی تجارت جو یہاں کے باشندوں کی زندگی کا سہارا ہے ختم ہو جائے گی۔

فریقین میں گفت وشنید کا سلسلہ جاری رہا۔ قریش نے اپنی جانب سے سہیل بن عمرو کو بھیجا اور اس سے کہا کہ تو پیغمبر اسلام ﷺ سے اس شرط پر صلح کر کہ آپ امسال واپس چلے جائیں کیونکہ بخدا ہم نہیں چاہتے کہ ہماری نسبت عرب یہ کہیں کہ آپ ﷺ بزور مکہ میں داخل ہو گئے۔ جب سہیل بن عمرو آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچا تو شرائط صلح کے بارے میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی جس کا سلسلہ منقطع بھی ہو سکتا تھا لیکن چونکہ فریقین صلح کے لئے آمادہ تھے اس لئے بات چیت پھر شروع ہو جاتی تھی۔ آنحضرت ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کے جو رفقا تھے وہ اس گفتگو سے تنگ آئے ہوئے تھے کیونکہ سہیل بن عمرو بعض امور میں سخت گیری کرتا اور آپ ﷺ اس کی باتیں قبول کرنے میں سہل انگاری سے کام لیتے۔ اگر مسلمانوں کو اپنے ہادی ﷺ پر کامل اعتماد نہ ہوتا تو وہ ان شرائط پر کبھی صلح کے لئے آمادہ نہ ہوتے جو فریقین کے مابین طے پائی تھیں۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ ضرور جنگ کرتے خواہ اس کے نتائج موافق برآمد ہوتے یا مخالف۔ شرائط صلح طے پانے کے بعد حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور دونوں میں حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

عمرؓ: اے ابوبکر رضی اللہ عنہ کیا نبی کریم ﷺ اللہ کے رسول نہیں؟

ابوبکرؓ: کیوں نہیں!

عمرؓ: کیا ہم مسلمان نہیں؟

ابوبکرؓ: کیوں نہیں!

عمرؓ: پھر اپنے دین کے بارے میں ہم یہ توہین کیوں گوارا کریں؟

ابوبکرؓ: اے عمرؓ! تحمل سے کام لیجئے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ ہمارے ہادی ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

عمرؓ: میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

اس گفتگو کے بعد حضرت عمرؓ الفاروق آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس عالم میں کہ

غصے کے مارے ان کا برا حال تھا۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے بھی ایسی ہی باتیں کیں لیکن ان کی باتوں سے آپ ﷺ کے عزم وارادہ میں کوئی تبدیلی نہ آئی بلکہ گفتگو کے اختتام پر آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ سے یہ فرمایا کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں میں اس کے (خدا کے) حکم کی خلاف ورزی نہ کروں گا اور مجھے امید ہے وہ بھی مجھے محفوظ رکھے گا۔ پھر جب صلح نامہ کی تسوید کا سلسلہ شروع ہوا تو آنحضرت ﷺ نے اتنے صبر و تحمل کا ثبوت دیا کہ بعض مسلمان جن کی نظر حقیقت پر نہ تھی برافروختہ ہو گئے۔ آپ ﷺ نے صلح نامہ کی تحریر کی خدمت پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مامور کیا اور ان سے یہ فرمایا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم تحریر کرو، اس پر سہیل بن عمرو نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا، ٹھہریئے میں رحمن ورحیم کا قائل نہیں، آپ اس کے بجائے باسمك اللھم تحریر کیجئے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ بات مان لی اور باسمك اللھم کی تحریر عمل میں آئی۔ بعدازاں آپ ﷺ نے فرمایا، یہ تحریر کرو کہ "یہ وہ شرائط ہیں جن پر محمد رسول اللہ ﷺ نے سہیل بن عمرو سے مصالحت کی ہے"۔ اس پر سہیل نے پھر ٹوکا اور کہا۔ "اگر میں آپ کو رسول اللہ ﷺ مان لیتا تو آپ سے جنگ کیوں کرتا، آپ اپنا اور اپنے والد کا نام تحریر کرائیں۔" آپ ﷺ نے یہ ترمیم بھی مان لی، ان ابتدائی الفاظ کے بعد طرفین کی قراردادیں سپردقلم کی گئیں جن میں ایک قرارداد یہ بھی تھی کہ فریقین نے (کتب سیرت کے اکثر مصنفین کی روایات کے مطابق) دس سال کے لئے اور (واقدی کے بیان کی رو سے) دوسال کے لئے صلح کی ہے اور یہ کہ قریش میں سے کوئی شخص اگر اپنے ولی کی اجازت کے بغیر پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس آ جائے گا تو آپ ﷺ اسے قریش کے حوالے کریں گے لیکن آپ ﷺ کے آدمیوں میں سے اگر کوئی شخص قریش کے پاس آئے گا تو وہ اسے واپس نہ کریں گے اور یہ کہ قبائل عرب میں سے اگر کوئی قبیلہ یا فرد آپ ﷺ کا حلیف بننا چاہئے تو اسے آزادی ہے اور جو قریش کا حلیف بننا چاہے وہ بھی آزاد ہے اور یہ کہ پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقا اس سال مکہ میں داخل ہوئے بغیر واپس چلے جائیں، آئندہ سال وہ آسکتے ہیں لیکن ان کا قیام صرف تین دن رہے۔ وہ اپنے ہمراہ سوتلواروں کے اور اسلحہ نہ لائیں اور تلواریں بھی نیاموں میں رہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا قرارداد پر عمل

اس قرارداد پر دستخط ثبت ہوئے ہی تھے کہ بنی خزاعہ نبی کریم ﷺ کے اور بنوبکر قریش کے حلیف بن گئے۔ اسی اثناء میں ابوجندل بن سہیل نے مسلمانوں میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ جب سہیل نے اپنے بیٹے کو دیکھا تو اس نے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کیا اور اس کا گریبان پکڑ کر کھینچنے لگا تا کہ اسے قریش کی طرف واپس لے جائے۔ ابوجندل نے بلند آواز سے فریاد کی۔ "کیا مجھے مشرکوں کے حوالے کر دیا جائے گا کہ وہ مجھے دین سے برگشتہ کر دیں؟" اس واقعہ سے مسلمانوں کو بے حد تشویش ہوئی اور اس عہد پر جو آپ ﷺ نے سہیل کے ساتھ کیا تھا ان کی نارضامندی اور بڑھ گئی لیکن آنحضرت ﷺ نے ابوجندل سے یہ فرمایا، صبر کر اور یہ نیت رکھ کہ اللہ تعالیٰ کسی کا عمل خیر ضائع نہیں کرتا۔ خدا تیری اور دوسرے تمام ستم رسیدوں کی

Marfat.com

نجات کے لئے کوئی صورت پیدا کر دے گا۔ ہم نے ان لوگوں سے معاہدہ کر لیا ہے اور ہر دو فریق کے اس پر دستخط ثبت ہو گئے ہیں، ہم ان سے خیانت نہیں کر سکتے، چنانچہ ابو جندل آنحضرت ﷺ کے عہد و پیمان کے پیش نظر قریش کے پاس چلے گئے۔ اس اثنا میں سہیل بن عمرو بھی مکہ کو لوٹا۔ آنحضرت ﷺ نے دیکھا کہ مسلمانوں پر اضطراب و تذبذب کی کیفیت طاری ہے لہٰذا اٹھے، نماز پڑھی اور قلبی سکون حاصل کیا۔ بعد ازاں آپ ﷺ نے اونٹ کی قربانی کی اور قدرے توقف کے بعد عمرہ کی شرائط کے مطابق سر کے بال منڈائے۔ اس اثنا میں آپ ﷺ کا دل سکون و اطمینان سے معمور تھا۔ جب مسلمانوں نے آپ ﷺ کو طمانیت قلب کے ساتھ یہ افعال سرانجام دیتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے بھی اونٹوں کی قربانی کی اور اپنے سروں کے بال منڈوائے۔ بعض نے استروں سے منڈوائے اور بعض نے ترشوا کر انہیں چھوٹا کرایا۔ آنحضرت ﷺ نے جب یہ دیکھا کہ صحابہؓ فارغ ہو چکے ہیں تو یہ دعا فرمائی۔ ''اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو ان لوگوں پر جنہوں نے بال منڈوائے ہیں۔'' لوگوں نے دریافت کیا۔ ''حضور ﷺ! بال کٹوانے اور ترشوانے والوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟'' تو آپ ﷺ نے پھر یہی ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو ان لوگوں پر جنہوں نے بال منڈوائے ہیں۔'' اس سے لوگوں کو اضطراب ہوا، انہوں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ ''حضور! بال کٹوانے والوں کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟'' اس مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ بال کٹوانے والوں پر بھی رحم کرے۔'' کسی نے دریافت کیا۔ ''یارسول اللہ! آپ ﷺ نے بال منڈوانے والوں کے لئے دو بار رحمت کی دعا کی ہے اور ان کے لئے جنہوں نے بال کٹوائے ہیں ایسا نہیں کیا، اس کا کیا سبب ہے؟'' آپ ﷺ نے جواب دیا: ''اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے شک و شبہ کو اپنے دل میں جگہ نہیں دی۔''

مسلمانوں کے لئے اس کے سوائے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ عازم مدینہ ہوں اور زیارت بیت اللہ کا معاملہ آئندہ سال کے لئے اٹھا رکھیں۔ صحابہؓ میں سے اکثر اس صورتحال سے بہت زیادہ افسردہ خاطر تھے اور غم ان کے دل سے کسی طرح بھی زائل نہ ہوتا تھا مگر کیا کرتے! آنحضرت ﷺ کا ارشاد اور آپ کا منشا یہی تھا۔ مسلمان اس چیز کے عادی نہ تھے کہ وہ دشمن سے پیٹھ موڑیں یا جنگ کے بغیر راہ فرار اختیار کریں۔ ان کا ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین اور اپنے رسول ﷺ کی تائید و نصرت ضرور کرے گا۔ اگر کہیں رسول کریم ﷺ انہیں مکہ میں بزور شمشیر داخلہ کا حکم صادر فرما دیتے تو وہ ایسے نہ تھے کہ اس کی تعمیل میں کوتاہی کرتے۔ بہرحال وہ چند روز تک حدیبیہ میں رہے، بعض آپس میں ایک دوسرے سے اس معاہدہ کی حکمت پوچھتے تھے جو آنحضرت ﷺ نے قریش سے کیا تھا اور بعض کو اس معاہدہ کی حکمت میں مطلق کوئی شبہ نہ تھا۔ غرض وہ مدینہ منورہ کی جانب روانہ ہوئے جب یہ قافلہ مکہ اور مدینہ کے درمیانی راستہ میں تھا تو آنحضرت ﷺ پر بذریعہ وحی سورۂ فتح نازل ہوئی اور آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم سے اپنے رفقا کو مطلع کیا۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝١ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ

وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ (سورۃ الفتح:۱۔۲)

''ہم نے آپ ﷺ کو کھلی فتح عطا کی تا کہ اللہ تعالیٰ (ہجرت سے قبل) اور (ہجرت کے بعد) کے ان تمام الزامات کے داغ دھوئے جو آپ ﷺ پر لگائے گئے تھے اور آپ ﷺ پر اپنی نعمت کا اہتمام کرے اور صراط مستقیم کی جانب ہدایت دے۔''

چنانچہ صلح حدیبیہ کی اس حیثیت میں کہ وہ فتح مبین ہے کوئی شبہ نہیں رہا اور فی الواقعہ یہ ایک حقیقت تھی اور حالات کی رفتار نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ معاہدہ سیاسی حکمت اور دور اندیشی پر مبنی تھا۔ اس معاہدہ کا اثر اسلام اور تمام عرب کے مستقبل پر پڑا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ قریش نے آپ ﷺ کی نسبت یہ اقرار کیا اور اعتراف بھی کہ آپ ﷺ سے ان پر ظلم و تعدی کی توقع نہیں بلکہ آپ ﷺ ان کے ایسے حریف ہیں جو کسی حیثیت میں بھی ان سے کم نہیں۔ گویا اس سے ان پر اسلام کی نوزائیدہ سلطنت کی حقیقت واضح ہو گئی۔ چونکہ انہوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ مسلمانوں کو بھی زیارت کعبہ اور مراسم حج کی ادائیگی کا حق پہنچتا ہے اس لئے اب یہ بھی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی کہ عرب کے دیگر رسمی ادیان کی طرح اسلام بھی ایک مستقل دین کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس صلح نے خواہ اس کی مدت دو سال تسلیم کی جائے خواہ دس سال مسلمانوں کو جنوب کی طرف سے مطمئن اور قریش کی پیش قدمیوں سے بے خوف کر دیا، اس طرح گویا اشاعت اسلام کے لئے راہیں کھل گئیں۔ کیا قریش نے جو اسلام کے سخت ترین دشمن اور ان سے لڑنے مرنے والے تھے، یہ اعتراف نہیں کر لیا تھا کہ اسلام بھی ایک حقیقت ہے؟ اس صلح کے نتیجے میں اسلام برق رفتاری سے ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا۔ آنحضرت ﷺ کے ہمراہ جو لوگ حدیبیہ میں آئے تھے ان کی تعداد ایک ہزار چار سو تھی لیکن دو سال کے بعد جب آنحضرت ﷺ فتح مکہ کے لئے تشریف لے گئے تو آپ ﷺ کے ہمراہ دس ہزار کی جمعیت تھی۔

سب سے بڑی چیز جس کی حکمت میں لوگوں کو شبہ تھا، قرارداد کا وہ حصہ تھا جس میں یہ بات تسلیم کی گئی تھی کہ قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر آنحضرت ﷺ کے پاس چلا جائے گا اسے قریش کی جانب واپس بھیجنا ہو گا لیکن مسلمانوں کا جو شخص قریش میں آ شامل ہو گا اسے وہ آنحضرت ﷺ کے پاس واپس نہیں بھیجیں گے۔ اس بارے میں آنحضرت ﷺ کی رائے یہ تھی کہ جو شخص اسلام سے منہ موڑ کر یعنی ارتداد کی صورت میں قریش کے پاس پناہ لیتا ہے وہ سرے سے اس قابل ہی نہیں کہ دوبارہ مسلمانوں کے پاس آئے اور جو شخص اسلام لے آیا ہے اور اس کا ارادہ حضور ﷺ اور پیروان اسلام کے زمرے میں شمولیت کا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی نجات کے لئے کوئی نہ کوئی سبیل ضرور نکالے گا۔ واقعات نے آپ ﷺ کے اس خیال کی تصدیق مسلمانوں کے اندازے سے بھی کم مدت میں کر دی اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ اسلام کو صلح حدیبیہ کی شرائط سے بہت فائدہ ہوا اور اس کی توسیع کے امکانات قوی تر ہو گئے۔ چنانچہ اس واقعہ کے دو سال بعد ہی بیرونی سلطنتوں کے فرمانرواؤں اور امراء کو اسلام کی دعوت دی گئی۔

Marfat.com

ابوبصیر رضی اللہ عنہ کا قصہ

بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ جس پیغمبرانہ بصیرت کے تحت آنحضرت ﷺ نے صلح حدیبیہ کی شرائط پر صاد کیا تھا اس کی حکمت و مصلحت کیا تھی۔ ابوبصیرؓ نامی ایک شخص جو اسلام لے آیا تھا مکہ سے مدینہ چلا آیا صلح حدیبیہ کی شرائط کی رو سے یہ ضروری تھا کہ اسے قریش کے حوالے کر دیا جائے کیونکہ مدینہ میں اس کا داخلہ اپنے ولی کے اذن سے نہیں ہوا تھا۔ ازہر بن عوف اور اخنس بن شریق نے آنحضرت ﷺ کے نام پیغام بھیجا کہ ابوبصیر رضی اللہ عنہ کو واپس مکہ بھیج دیا جائے۔ ان دونوں نے اپنا یہ پیغام بنی عامر کے ایک شخص کی وساطت سے بھیجا تھا۔ ان کا ایک غلام بھی اس کے ہمراہ تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ابوبصیرؓ سے فرمایا کہ ہم نے قریش سے جو معاہدہ کیا ہے تمہیں اس کا علم ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام میں خیانت کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں، اللہ تعالیٰ تمہاری اور تمہارے ایسے ستم رسیدوں کی رستگاری کے لئے کوئی نہ کوئی راہ جلد ہی کھول دے گا، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تم اپنی قوم کے پاس واپس جاؤ۔ ابوبصیرؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ! کیا آپ ﷺ مجھے پھر مشرکین کے حوالے کرتے ہیں اور ان کا یہ حال ہے کہ وہ مجھے دین کے بارے میں فتنہ میں ڈال دینا چاہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے پھر وہی ارشاد فرمایا تھا کہ واپسی ہی میں مصلحت ہے۔ چنانچہ ابوبصیرؓ ان دونوں آدمیوں کے ہمراہ واپس ہوا۔ جب وہ مقام ذوالحلیفہ میں پہنچے تو ابوبصیرؓ نے عامری سے اس کی تلوار مانگی، جونہی تلوار اس کے قبضے میں آئی اس نے عامری کو تہ تیغ کر دیا، غلام جو اس کے ہمراہ تھا بھاگ کر مدینہ پہنچا اور اس نے آنحضرت ﷺ کی بارگاہ میں حاضری دی۔ آپ ﷺ نے اسے دیکھتے ہی فرمایا، یہ شخص وحشت زدہ ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اس سے دریافت فرمایا، تجھ پر کیا مصیبت ٹوٹی ہے؟ اس نے جواب دیا، آپ ﷺ کے رفیق نے میرے رفیق کو قتل کر دیا۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ابوبصیر رضی اللہ عنہ بھی تلوار لٹکائے ہوئے آ پہنچا اور آپ ﷺ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا، یارسول اللہ! آپ ﷺ کی شرط تو پوری ہو گئی، آپ ﷺ نے جو عہد کیا ہے اس کی تعمیل آپ ﷺ فرما چکے ہیں۔ آپ ﷺ نے کھلی آنکھوں مجھے ان کے حوالے کر دیا تھا لیکن یہ میرا اپنا ذاتی معاملہ ہے میں دین کی خاطر فتنہ میں پڑنا یا ان کے ہاتھوں میں کھلونا بننا نہیں چاہتا۔ آنحضرت ﷺ نے ابوبصیرؓ کے رویہ پر خوشنودی کا اظہار کیا اور اس سے صاف لفظوں میں یہ کہا، کاش! تمہارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی شامل ہو جاتے۔ اس کے بعد ابوبصیرؓ مدینہ سے باہر مقام عیص پر جو سمندر کے کنارے اس راستے پر واقعہ تھا جہاں سے قریش شام کو جایا کرتے تھے اقامت گزیں ہو گیا۔ اس راستے کی نسبت آنحضرت ﷺ اور قریش میں یہ معاہدہ تھا کہ یہ راستہ تجارت کے لئے کھلا رہے گا، نہ آپ ﷺ اسے بند کریں اور نہ قریش۔ جب ابوبصیرؓ نے وہاں اپنا اڈا جما لیا اور مکہ میں رہنے والے مسلمانوں کو اس کی خبر ہوئی اور ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلا کہ آنحضرت ﷺ نے اس راہ عمل پر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا ہے

Marfat.com

تو ان میں سے ستر آدمی مکہ سے فرار ہو کر ابو بصیرؓ سے آ ملے اور اسے اپنا سردار تسلیم کر لیا۔ انہوں نے قریش کی آمد و رفت کا راستہ بند کر دیا قریش میں سے جو بھی ان کے ہتھے چڑھتا اسے تہ تیغ کر ڈالتے اور جو قافلہ بھی ادھر سے گزرتا اسے لوٹ لیتے۔ ان حالات میں قریش کو اندازہ ہوا کہ مسلمانوں کو مکہ میں روکے رکھنا خود ان کے حق میں بھی نقصان دہ ہے۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ گئے کہ کسی صادق الایمان مسلمان کو روکے رکھنا اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے کہ اسے جانے دیا جائے کیونکہ اسے جب بھی موقعہ ملے گا وہ راہ فرار اختیار کئے بغیر نہ رہے گا اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ ان لوگوں سے انتقام بھی لے گا جو اسے روکے رہے ہیں۔ اس کی فتح اور اس کا غلبہ بھی یقینی ہے کیونکہ اس کے پاس ایمانی قوت ہے، قریش کی نگاہوں کے سامنے اس وقت کی تصویر پھر گئی جب آنحضرت ﷺ نے مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت فرمائی اور شام کی جانب ان کی تجارت کا رستہ بند کر دیا تھا، قریش کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ اور ابو بصیر رضی اللہ عنہ بھی وہی داستان دہرائے گا۔

اس خیال سے قریش نے آنحضرت ﷺ کے پاس پیغام بھیجا اور صلہ رحمی کا واسطہ دے کر یہ درخواست کی کہ آپ ﷺ مسلمانوں کو بے شک مدینہ میں پناہ دیں تاکہ شام کا راستہ پرامن ہو جائے۔ اس طرح قریش صلح حدیبیہ کی اس شرط سے دستبردار ہو گئے جس پر سہیل بن عمرو نے اصرار کیا تھا اور جس کا منشا یہ تھا کہ قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر آپ ﷺ کے پاس چلا آئے گا اسے واپس کرنا ہو گا۔ اس صورت میں معاہدہ کی وہ شرط جس سے عمرؓ بن خطاب نعل در آتش ہو رہے تھے، ساقط ہو گئی۔ قریش کے پیغام پر آنحضرت ﷺ نے اپنے پیروؤں کو مدینے میں طلب فرما لیا اور شام کا تجارتی راستہ پرامن ہو گیا۔

مؤمنات کا معاملہ

ان خواتین کے بارے میں جو مکے سے ہجرت کر کے مدینہ آ جاتی تھیں آنحضرت ﷺ کی رائے کچھ مختلف تھی۔ ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ چلی آئی تو اس کے بھائیوں عمارہ اور ولید نے قرارداد کے مطابق آنحضرت ﷺ سے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے انکار فرما دیا اور یہ ارشاد کیا کہ اس شرط کا اطلاق عورتوں پر نہیں ہوتا۔ اگر عورتیں پناہ طلب کریں تو یہ واجب ہے کہ انہیں پناہ دی جائے۔ علاوہ بریں جب کوئی عورت اسلام لے آتی ہے تو وہ اپنے مشرک شوہر کے لئے حلال نہیں رہتی اور ان دونوں میں تفریق ناگزیر ہے۔ چنانچہ اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ ۖ اللَّهُ
أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ ۖ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۖ
لَا هُنَّ حِلٌّ لَهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۖ وَآتُوهُمْ مَا أَنْفَقُوا ۚ وَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۚ وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ

الْكَوَافِرِ وَاسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ۭ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ⑩ (سورۃ الممتحنہ: ۱۰)

"اے ایمان والو! جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو ان کی آزمائش کرو۔ اللہ ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے۔ اگر تم جان لو کہ وہ واقعی ایماندار ہیں تو انہیں کفار کی جانب واپس نہ بھیجو وہ کفار کے لئے حلال نہیں اور نہ کفار ہی ان عورتوں کے لئے حلال ہیں اور جو کچھ ان کفار نے (عورتوں کے مہر کے طور پر) خرچ کیا ہو وہ ان کو دے دو اور اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ تم ان کا مہر ادا کرنے کے بعد ان عورتوں سے نکاح کر لو کافر عورتوں سے نکاح اور مہر پر قبضہ نہ کرو، جو کچھ تم نے (مہر کے طور پر) خرچ کیا ہے اس کا مطالبہ کرو اور ان کفار کو بھی چاہئے کہ انہوں نے جو کچھ مہر کے طور پر خرچ کیا ہے وہ بھی مطالبہ کریں۔ اللہ کا یہی حکم ہے، وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔"

اس صورت میں حالات نے نبی کریم ﷺ کی سیاسی بصیرت، دور اندیشی اور خوش تدبیری کا ثبوت دے دیا اور اس چیز کی تصدیق کر دی کہ صلح حدیبیہ اسلام کے فروغ اور اس کی اشاعت کے لئے ایک بنیادی حقیقت تھی۔

آنحضرت ﷺ کا طرزِ عمل

صلح حدیبیہ کے بعد آنحضرت ﷺ اور قریش کے باہمی تعلقات نہایت تسلی بخش رہے فریقین کو ایک دوسرے کی جانب سے اطمینان ہو گیا۔ تمام قریش تجارت کے دائرہ کو وسیع کرنے کی جانب متوجہ ہوئے اور اس پر انہوں نے اپنی تمام تر توجہات مرکوز کر دیں۔ غالباً وہ اس نقصان کی جو انہیں مسلمانوں کے ساتھ لڑنے میں ہوا تھا، تلافی کرنا چاہتے تھے۔ پہلے بھی ان کے لئے شام کی راہ مسدود کر دی گئی تھی اور ان کی تجارت کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

آپ ﷺ تبلیغ رسالت کے سلسلے میں ہمہ تن پیکرِ عمل بنے رہتے تھے، اب آپ ﷺ نے مشرق و مغرب کے رہنے والوں کے لئے بہت کچھ بندوبست فرمایا تھا تاکہ وہ تبلیغ سے عوام کو مسلمانوں کی لڑی میں پروئیں۔ آپ ﷺ نے جزیرۂ عرب میں مسلمانوں کے اطمینان کی خاطر اپنے مقصد کی کامیابی کے اسباب و وسائل پر غور و خوض کیا۔ اس ضمن میں آپ نے دو اقدام کئے۔ پہلا یہ کہ گرد و نواح کے بادشاہوں اور نوابوں کے ہاں اپنے سفیر روانہ کئے، اور دوسرا یہ کہ غزوۂ خیبر کے بعد یہود کو جزیرۂ عرب سے ہمیشہ کے لئے جلاوطن کر دیا۔

Marfat.com

حواشی

۱۔ مدینہ منورہ سے ۶ یا ۷ میل کے فاصلے پر ایک بستی ہے جہاں مدینہ منورہ سے آنے والے لوگ حج کا احرام باندھتے ہیں۔

۲۔ عسفان مکے سے دو منزل کے فاصلے پر مکہ اور مدینہ کی راہ میں ایک گاؤں یا گھاٹ کا نام ہے۔

۳۔ احابیش عربوں میں سے تیر اندازوں کے چند قبائل کو کہتے ہیں۔ یہ حبش نام پہاڑ سے منسوب ہیں جو مکہ سے نیچے کی جانب واقع ہے۔

Marfat.com

باب 19

غزوۂ خیبر سے لے کر عمرۃ القضا تک

سلاطین وامرا کے نام دعوت نامے

رسولِ خدا ﷺ اور آپ کے رفقاء نے حدیبیہ میں تسلیم ہی کر لیا کہ اس مرتبہ کی بجائے آئندہ سال زیارتِ کعبہ کے لئے آئیں گے اور تکمیل معاہدہ کے بعد مسلسل تین ہفتے تک حدیبیہ میں قیام فرما رہے۔ مگر جب مدینہ کی طرف لوٹے تو بعض افراد نے نفس قرارداد کو مسلمانوں کی تذلیل پر محمول کیا۔ اسی دوران سورۂ فتح نازل ہوئی جسے آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو پڑھ کر سنایا۔ رسول اللہ ﷺ کو حدیبیہ سے واپسی پر دو باتوں کی سب سے زیادہ فکر تھی۔ اول، مسلمانوں کی قوت واستقامت، اور دوم، اسلام کی توسیع۔

غور وفکر کے بعد آپ ﷺ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہرقل، کسریٰ، مقوقس، نجاشی، حارث غسانی اور یمن میں کسریٰ کے عامل کی طرف دعوتِ اسلام کے لئے قاصد روانہ کئے جائیں، اس کے ساتھ ہی آپ ﷺ کا یہ عزم بھی تھا کہ جزیرۂ عرب سے یہود کے اقتدار کا قلع قمع کر دیا جائے۔

دعوت اسلام کی توسیع

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اس دور میں اس نکتۂ عروج تک پہنچ چکا تھا کہ اسے ایک عالمگیر حیثیت دے دی جائے۔ اسلام کی تعلیمات صرف توحید اور اس کے مستلزمات تک محدود نہ تھیں بلکہ یہ اجتماعی زندگی اور اس کے ان مختلف گوشوں کا بھی احاطہ کئے ہوئے تھا جو توحید سے علاقہ رکھتے تھے اور جو اس قابل تھے کہ مسلمانوں کو انسانیت کے بلند مقام پر فائز کر سکیں لہٰذا موقع اور محل کی مناسبت سے احکام نازل ہونے لگے۔

حرمت شراب

آنحضرت ﷺ کے سیرت نگاروں نے اس سلسلے میں اختلاف کیا ہے کہ شراب کب اور کن حالات میں حرام قرار دی گئی۔ بعض کی روایت ہے کہ یہ واقعہ حرمت ۴ھ میں پیش آیا لیکن اکثر کا خیال یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر اس کی حرمت کا اعلان کیا گیا۔ حرمت شراب کا علاقہ اجتماعی زندگی سے ہے اور مسئلہ توحید کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کی حرمت کا اعلان بعثت نبویہؐ سے

Marfat.com

تقریباً بیس سال بعد ہوا اور اس مدت تک شراب نوشی کا سلسلہ جاری رہا۔ علاوہ بریں حرمت کا اعلان یکبارگی نہیں ہوا بلکہ اس سلسلہ میں جو آیات نازل ہوئیں، ان کے زمانہ نزول میں فاصلہ ہے۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں نے شراب نوشی سے اجتناب کیا اور آخر میں ایک وقت آیا کہ انہیں اس سے قطعاً نفرت ہوگئی۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ نے شراب کے بارے میں استفسار کیا اور کہا: کاش! خدا اس سلسلہ میں وضاحت سے کوئی حکم صادر فرمائے۔ اس پر اس آیت کا نزول ہوا۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ (سورۃ البقرہ:۲۱۹)

''اور (اے رسول ﷺ) یہ لوگ آپ سے شراب اور قمار بازی کے بارے میں دریافت کرتے ہیں آپ ان سے فرما دیجئے ان کے استعمال میں خرابی بھی ہے اور فائدہ بھی لیکن خرابی ان کے فائدہ سے زیادہ ہے۔''

اس آیت کے نزول کے بعد بھی لوگ شراب پیتے رہے اور کبھی کبھی تمام تمام رات شغل مے نوشی میں گزار دیتے۔ جب وہ نماز پڑھتے تو انہیں یہ سدھ نہ رہتی کہ ان کی زبان سے کیا الفاظ ادا ہو رہے ہیں، حضرت عمر ؓ نے دوبارہ دعا کی بار الٰہ ہمارے لئے شراب کے بارے میں وضاحت سے حکم صادر فرما کیونکہ اس سے عقل بھی زائل ہوتی ہے اور نقصان مال بھی ہوتا ہے۔ اس موقع پر اس آیت کا نزول ہوا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (سورۃ نساء:۴۳)

''اے ایمان والو! اس حال میں نماز کے قریب نہ جاؤ جبکہ تم شراب کے نشے میں ہو (نماز کے قریب اس وقت جاؤ) جبکہ تم یہ جان سکو کہ تمہاری زبان سے کیا الفاظ نکل رہے ہیں۔''

اس دن سے یہ دستور ہو گیا تھا کہ نماز کے وقت ایک منادی یہ اعلان کیا کرتا تھا کہ کوئی نشے میں چور شخص نماز کے قریب نہ آئے۔ گو یہ چیز شراب نوشی کی عادت چھڑانے میں مفید ثابت ہوئی اور اکثر لوگوں نے حتی الامکان یہ لت چھوڑ بھی دی لیکن ترک مے نوشی کے لئے یہ حکم کافی نہ تھا۔ کچھ عرصے کے بعد حضرت عمرؓ نے پھر خدا سے دعا کی، پروردگارا! شراب کے بارے میں زیادہ واضح الفاظ میں حکم نازل فرما کیونکہ اس سے فقدانِ عقل اور نقصانِ مال دونوں کا خطرہ ہے۔ حضرت عمر ؓ کا یہ خیال درست تھا کیونکہ عرب اور ان میں سے اکثر مسلمان بھی اس بلا کی شراب نوشی کے خوگر تھے کہ نشے اور مستی میں وہ ایک دوسرے سے لڑتے بھی تھے، داڑھیوں میں ہاتھ ڈال دیتے اور لڑکھڑا کر ایک دوسرے پر گر پڑتے تھے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے چ

آدمیوں کو شراب نوشی کی دعوت دی، جب شراب کا نشہ ان پر سوار ہو گیا تو مہاجرین اور انصار کے بارے میں بھی گفتگو چھڑ گئی۔ ان میں سے ایک نے مہاجرین کی حمایت میں گفتگو کی، انصار کے ایک جانبدار نے دسترخوان پر سے ایک ہڈی اٹھا کر اس زور سے اس کی ناک پر ماری کہ خون بہہ نکلا۔ ایک دوسرے موقع پر دو قبیلوں کے درمیان شراب کی مستی میں لڑائی چھڑی، بعض نے آپس میں ایک دوسرے کو زخمی کیا اور اس طرح ان کے دلوں میں گرہ بیٹھ گئی حالانکہ اس سے پہلے ان کے تعلقات ناخوشگوار نہ تھے۔ اس مرحلے پر یہ آیت نازل ہوئی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٩٠﴾ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿٩١﴾ (سورۃ المائدہ: ۹۰، ۹۱)

''اے ایمان والو! شراب، جوا، بت اور تیر تکے نجس اور شیطانی کام ہیں لہٰذا تم ان سے بچو تاکہ نجات پا سکو۔ شیطان کا تو ارادہ یہی ہے کہ وہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض پیدا کر دے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے۔ کیا تم اس سے باز نہیں آؤ گے۔''

جس دن شراب کی حرمت کا اعلان ہوا اتفاق سے حضرت انسؓ ساقی گری کی خدمت، انجام دے رہے تھے۔ جب انہوں نے منادی سنی تو بڑی سرعت سے شراب زمین پر پھینک دی لیکن کچھ لوگوں پر شراب کی حرمت گراں گزری۔ وہ کہنے لگے شراب کیسے نجس ہو سکتی ہے۔ کیا فلاں فلاں اشخاص جو غزوۂ بدر میں شہید ہوئے ہیں شراب نہ پیتے تھے؟ اس سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٩٣﴾ (سورۃ المائدہ: ۹۳)

''ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے اس چیز کے بارے میں جو وہ کھا چکے کوئی گناہ نہیں جبکہ وہ پرہیز کریں اور ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور پھر پرہیز کریں اور ایمان لے آئیں، پھر پرہیز کریں اور اچھے کام کریں اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

اسلام اپنے پیروؤں کو نیکی اور پرہیزگاری کی تعلیم دیتا ہے اور ان عبادات کی جانب انہیں متوجہ کرتا

Marfat.com

ہے جن میں نفس کی ریاضت پائی جاتی ہے، نماز، رکوع وسجود کے ذریعے سے غرورِ نفس اور تکبر کا سر کچلتی ہے۔ ان اسباب کی بنا پر اسلام ان دیگر مذاہب کے مقابلے میں جو اس سے پہلے ہوئے ہیں فطرت کے عین مطابق ہے اور تمام روئے زمین کی مخلوق کو اس کی دعوت دی جاسکتی ہے۔

روم و ایران کی سلطنتیں

ان ایام میں ہرقل اور کسریٰ روم و ایران کی سلطنتوں کے فرمانروا تھے اور یہ دونوں سلطنتیں اس عہد کی زبردست اور پرشکوہ حکومتیں تسلیم کی جاتی تھیں اور دنیا کی تمام اقوام ان کا لوہا مانتی تھیں اور اپنے سیاہ وسفید کا مالک انہی کو سمجھتی تھیں۔ شروع شروع میں ایرانیوں کا طوطی بولتا تھا اور مصر وفلسطین پر انہی کا تسلط تھا بیت المقدس بھی انہی کے قبضہ وتصرف میں تھا۔ ایرانی صلیب بھی نکال لے گئے تھے۔ زمانہ نے کروٹ لی تو رومیوں کے جھنڈے دوبارہ مصر، شام اور فلسطین پر لہرانے لگے۔ ہرقل نے ایرانیوں سے صلیب بھی واپس لے لی۔ اس نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر اسے فتح نصیب ہوئی تو وہ خود پاپیادہ بیت المقدس کا سفر کرے گا اور اس کی زیارت کے بعد صلیب کو اس کی قدیم جگہ پر نصب کرے گا۔ ان دونوں سلطنتوں کی شان وشکوہ کا یہ عالم تھا کہ تمام سلطنتوں پر ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور وہ مجبور تھیں کہ ان سے دوستانہ روابط قائم رکھیں، اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا۔ جب روئے زمین کی سلطنتوں کی یہ حالت تھی تو عرب ان کی زد اور دستبرد سے کیسے محفوظ رہ سکتا تھا؟ اس پر بھی ان سلطنتوں کے اقتدار کی پرچھائیں پڑی تھی۔ یمن اور عراق ایران کے زیرنگیں تھے اور مصر وشام پر ہرقل کا تسلط تھا۔ عرب کے دوسرے تمام علاقے انہی سلطنتوں کے زیر اقتدار تھے۔ عربوں کی زندگی کا انحصار یمن اور شام کی تجارت پر تھا اس لئے یہ ضروری تھا کہ وہ کسریٰ اور ہرقل کا اقتدار تسلیم کریں۔ بصورتِ دیگر یہ خطرہ تھا کہ مبادا ان کی تجارت کا سلسلہ ہی منقطع ہو جائے۔ علاوہ بریں عرب کی آبادی مختلف قبائل پر مشتمل تھی جو کبھی تو میل جول سے رہتے اور کبھی ان میں لڑائی چھڑ جاتی تھی۔ کوئی ایسی طاقت نہ تھی جو ان کی شیرازہ بندی کے بعد انہیں اس قابل کر سکتی کہ وہ وقت کی ان زبردست طاقتوں سے ٹکر لیتے۔ ان حالات میں یہ عجیب بات تھی کہ آنحضرت ﷺ نے ہرقل وکسریٰ اور غسان، یمن، مصر اور حبشہ کے والیوں کی جانب اپنے قاصد بھیجے اور انہیں اسلام کی دعوت دی۔ آپ ﷺ کو اپنے اس اقدام کے نتائج کا مطلق خوف نہ تھا۔ بظاہر یہ خطرہ تھا کہ روم و ایران ان دعوت ناموں سے برافروختہ ہو کر ہمیشہ کے لئے بلادِ عرب کو اپنے قبضے میں لے آئیں اور ان کے کاندھوں پر اپنی غلامی کا جوا رکھ دیں۔

ان حالات کے باوجود رسول کریم ﷺ نے تمام فرمانرواؤں کو دعوت اسلام پیش کرنے میں پس وپیش نہ کیا بلکہ ایک روز آپ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا، اے لوگو! مجھے خدا نے تمام مخلوق کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ تم عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے حواریوں کی طرح مجھ سے اختلاف نہ کرنا۔ صحابہؓ نے دریافت کیا، یارسول

Marfat.com

اللہ ﷺ! حواریوں نے کس طرح اختلاف کیا تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں اسی چیز کی دعوت دی تھی جس کی دعوت میں تمہیں دے رہا ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے جس کو کسی قریب کے مقام پر خدمت کے لئے مامور کیا وہ تو خوش ہو گیا اور اس نے ان کے فرمان کی تعمیل کی مگر جسے کسی دور کے مقام پر متعین کیا وہ ناراض ہو گیا اور اس نے ان کے فرمان کی تعمیل میں کوتاہی کی۔ بعدازاں آپ ﷺ نے اپنے صحابہؓ پر یہ حقیقت واضح کی کہ میں ہرقل، کسریٰ، مقوقس اور حیرہ کے فرمانروا حارث غسانی نیز یمن کے والی حارث حمیری اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو دعوت اسلام دینا چاہتا ہوں۔ صحابہؓ نے آپ کی رائے سے اتفاق کیا چنانچہ آپ ﷺ نے چاندی کی ایک انگشتری تیار کرائی جس پر ''محمد رسول اللہ ﷺ'' کی مہر کندہ کی گئی۔ اس کے بعد مختلف فرمانرواؤں کو دعوت نامے ارسال کئے۔ نمونہ کے طور پر ہم وہ خط یہاں نقل کرتے ہیں جو آپ ﷺ نے روم کے بادشاہ ہرقل کی طرف لکھا تھا۔ اس کا مضمون یہ تھا۔

''بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ بندۂ خدا محمد ﷺ کی طرف سے ہرقل شاہ روم کے نام۔ اس شخص پر سلام ہو جو ہدایت کی پیروی کرے۔ میں تمہیں دعوتِ اسلام دیتا ہوں۔ تم اسلام قبول کر لو تاکہ سلامتی نصیب ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں دوہرا اجر دے گا اور اگر تم روگردانی کرو گے تو تمہارے اپنے پیروؤں کا گناہ بھی تم پر ہو گا۔ اے اہل کتاب! ایک ایسی بات پر متفق ہو جاؤ جو تمہارے اور ہمارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا ہم کسی دوسرے کو اپنا رب بھی نہ مانیں گے اور اگر وہ روگردانی کریں تو اے مسلمانو! تم کہہ دو کہ (اے اہل کتاب!) گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔''

ہرقل کے پاس وحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ، کسریٰ کے پاس عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ، نجاشی کے پاس عمرو بن امیہؓ ضمری، مقوقس کے پاس حاطب بن ابی بلتعہؓ، حاکم عمان کے پاس عمروؓ بن عاص سہمی، والی یمامہ کے پاس سلیطؓ بن عمرو، بحرین کے والی کے پاس ملاؓ بن حضرمی، حدود شام کے حکمران حارث غسانی کے پاس شجاع بن وہبؓ اسدی اور فرمانروائے یمن حارث حمیری کے پاس مہاجرؓ بن امیہ مخزومی آنحضرت ﷺ کے دعوت نامے لے کر پہنچے۔ اکثر مؤرخین کے نزدیک یہ قاصد بیک وقت روانہ ہوئے لیکن بعض کا خیال ہے کہ ان کی روانگی مختلف اوقات میں عمل میں آئی۔

کیا دعوت ناموں کی ترسیل کا سلسلہ حیرت انگیز نہیں اور کیا اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز یہ حقیقت نہیں کہ اس واقعہ کے تیس سال بعد ہی یہ تمام علاقے جہاں جہاں آنحضرت ﷺ کے قاصد پہنچے تھے، اسلام کے زیرنگیں آ گئے؟ ان علاقوں کی بیشتر آبادی حلقہ بگوش اسلام ہو گئی تھی لیکن جب ہم غور کرتے ہیں کہ یہ دونوں بڑی سلطنتیں یعنی ایران اور مشرقی روم، جن کا دعویٰ تھا کہ تہذیب وتمدن میں ہم سے کوئی ملک سبقت نہیں لے

Marfat.com

جا سکتا (اور بات بھی یہی تھی کہ تمام دنیا پر انہی کے تمدن کی چھاپ تھی)، مادی اغراض کی خاطر اپنے اپنے اقتدار کے لئے کوشاں رہتی تھیں، روحانیت ان میں نام کو بھی نہ تھی تو ہماری حیرت کی گھٹائیں چھٹ جاتی ہیں۔ آتش پرستی اور بت پرستی نے ایران کی وحدت پارہ پارہ کر دی تھی۔ رومیوں کی مسیحیت مختلف مذہبی فرقوں کی دراندازیوں سے اپنا مقام کھو چکی تھی۔ صحیح عقاید تو تھے نہیں جن کی بدولت ان کی دینی بنیادیں استوار ہوتیں۔ دل کی بیداری اور ایمان کی قوت کا ان پر سایہ بھی نہ پڑا تھا۔ ان کے عقاید کی حیثیت رسمی اور تقلیدی تھی جنہیں پیشوایان مذاہب نے اپنی اپنی مرضی کے مطابق اپنے ذاتی مفاد کے حصول اور معاشی اغراض کی تکمیل کی خاطر اختیار کر رکھا تھا اور انہی کے بل بوتے پر وہ عوام کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ یہ نئی اور عظیم الشان تحریک جس کی طرف آنحضرت ﷺ نے عام دعوت دی تھی اس کی بنیاد روحانیت پر تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اس سے انسانیت کی اعلیٰ قدریں اجاگر ہوں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں مادیت اور روحانیت متصادم ہوں اور جہاں دین و دنیا کے مفادات میں کشمکش ہو وہاں مادیت کی شکست یقینی ہے۔ کہاں دنیوی مطمح نظر اور کہاں دینی زاویہ نگاہ!

باوجود اس کے کہ ایران اور روم کی سلطنتیں جاہ و جلال کی مالک تھیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ قدرت نے ان سے ایجاد و ابداع کی قوت سلب کر لی تھی۔ ان کے یہاں اپنے آباو اجداد کی کورانہ تقلید کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا، جذبات میں بھی تقلید تھی اور اعمال میں بھی۔ ان کے نزدیک ہر نیا خیال بدعت اور ہر بدعت ضلالت سمجھی جاتی تھی۔ انسانی معاشرہ بھی افراد اور کائنات کی طرح ہر آن تغیر پذیر ہے۔ جب تک کوئی انسانی معاشرہ طاقتور اور مضبوط رہتا ہے وہ اپنی قوت تخلیق کی تجدید اور اپنی زندگی تکمیل و تعمیر میں مصروف رہتا ہے لیکن جب اس کی ارتقائی جدوجہد کا سلسلہ کسی مقام پر منقطع ہو جاتا ہے اور ایجاد و ابداع کی صلاحیتیں بھی جواب دے جاتی ہیں تو پھر سرمایہ حیات میں اضافہ کے بجائے تخفیف شروع ہو جاتی ہے اور بتدریج زوال کے آثار رونما ہو جاتے ہیں۔ وہ معاشرہ انسانی جو روبہ زوال ہو جاتا ہے اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق و تعمیر کی خدمت، قدرت کسی ایسے بیرونی عنصر کے سپرد کر دیتی ہے جس کی رگ و پے میں زندگی کا خون دوڑ رہا ہو۔ اس انداز کا توانا عنصر ایران میں تھا نہ روم میں، چین، ہندوستان اور وسط یورپ میں کہیں اس کا نام ونشان نہ تھا۔ ہاں، البتہ اگر ایسا عنصر کہیں تھا تو آنحضرت ﷺ کی ذات بابرکات میں موجود تھا۔ آپ کی دعوت توحید جو پورے شباب اور اپنی پوری جولانیوں پر تھی اس میں یہ طاقت اور یہ صلاحیت ضرور تھی کہ ان افسردہ دل و دماغ میں جن کی روح تقلید رسوم اور لغو عقاید نے قبض کر لی تھی نئے سرے سے حیات تازہ کی برقی لہر دوڑا دے۔

اس نور بصیرت نے جس سے آنحضرت ﷺ کا قلب معمور تھا اور آپ کی اس روحانی قوت نے جس کی ٹکر دنیا کی کوئی دوسری قوت نہیں سنبھال سکتی تھی آپ ﷺ کو اس بات کے لئے آمادہ کر دیا کہ فرمانروایان عالم کے نام دعوت نامے بھیجیں اور انہیں ایک ایسے دین کی دعوت دیں جس میں حق و صداقت بھی ہے اور بلوغ

Marfat.com

وکمال کے آثار بھی اور جسے ایسے دین سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو من جانب اللہ ہے۔ آپ انہیں ایک ایسے مذہب کے دائرے میں لانا چاہتے تھے جو دل و دماغ کو لغو اور باطل تصورات کی قید سے آزاد کر کے حقیقت آشنا کر سکے۔ مذہب بھی اس شان کا مذہب جو نہ صرف اجتماعی بلکہ روحانی زندگی کے لئے بھی لگے بندھے قوانین نافذ کرتا ہے، ایسے قوانین جو روحانیت اور مادیت کے مابین اعتدال کی صورت پیدا کرتے ہیں تاکہ انسان اس اعتدال کے ذریعے سے انسانیت کے اس بلند ترین مقام پر پہنچ جائے جہاں خلوص ہی خلوص کارفرما ہو نیز معاشرہ انسانی انقلابات کے تمام مراحل طے کرنے کے بعد اس نقطہ عروج تک آ پہنچے جو اس کے لئے ازل سے مقدر ہے۔

یہود کا استیصال

سوال یہ تھا کہ آیا آنحضرت ﷺ کو فرمانروایان ممالک کے پاس اپنے قاصد بھیجنے چاہئیں یا نہیں؟ آپ ﷺ ابھی تک ان یہودیوں کی جانب سے مطمئن نہ تھے جو مدینہ کے شمال میں آباد تھے۔ یہ درست ہے کہ صلح حدیبیہ کی بنا پر آپ ﷺ قریش کی دست درازیوں سے محفوظ تھے اور جنوبی علاقے کی طرف سے بھی کسی یورش کا خطرہ نہ تھا لیکن اندیشہ تھا تو صرف شمال کی جانب خیبر کے یہودیوں سے اور وہ یہ کہ عین ممکن ہے ہرقل یا کسریٰ ان سے ساز باز کر لیں اور ان کے دلوں میں بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنی قینقاع کے ان یہودیوں کی یاد تازہ کر کے جنہیں نبی کریم ﷺ نے ان کے وطن مدینہ سے دیس نکالا دے دیا تھا، آتش انتقام مشتعل کر دیں۔ قریش کی نسبت یہودیوں کو آنحضرت ﷺ سے زیادہ عناد تھا کیونکہ ایک تو انہیں اپنے مذہب سے بہت زیادہ وابستگی تھی اور دوسرے ان میں عقل و فراست کا مادہ بھی قریش سے کچھ زیادہ ہی تھا، یہودیوں سے کوئی معاہدہ، جو صلح حدیبیہ ایسی شرائط پر مشتمل ہو، کوئی آسان بات نہ تھی۔ ان کی جانب سے اطمینان بھی نہ ہو سکتا تھا کیونکہ یہودیوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں کئی بار شکست اٹھانی پڑی تھی لہٰذا کچھ بعید نہ تھا اگر ہرقل کی طرف سے انہیں مدد مل جاتی تو وہ انتقام لینے کی خاطر مسلمانوں سے جنگ کے لئے آمادہ ہو جاتے۔ ان حالات میں یہ ضروری تھا کہ یہودیوں کی ہستی ہمیشہ کے لئے ختم کر دی جائے تاکہ آئندہ جزیرہ عرب میں ان کے قدم نہ جم سکیں۔ یہ معاملہ فوری توجہ کا محتاج تھا تاکہ یہودیوں کو اتنی مہلت ہی نہ مل سکے کہ وہ قبائل غطفان یا ان دیگر عرب قبائل سے مدد لے سکیں جو آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے دشمن اور یہودیوں کے دوست تھے۔

غزوۂ خیبر کی تیاری

آنحضرت ﷺ نے اپنی پیغمبرانہ بصیرت کی بنا پر حالات کے مطابق عمل کیا۔ حدیبیہ سے واپسی پر آپ ﷺ نے مدینہ میں ایک روایت کے مطابق صرف پندرہ دن اور دوسری روایت کے بموجب صرف ایک ماہ قیام کیا۔ بعدازاں آپ ﷺ نے مسلمانوں کو غزوۂ خیبر کے لئے تیاری کا حکم دے دیا اور صرف ان لوگوں

Marfat.com

کو اس غزوہ میں شرکت کی اجازت دی جو حدیبیہ میں حاضر تھے۔ باقی اصحاب میں سے ہر اس شخص کو بھی شرکت کی اجازت تھی جو اپنی مرضی سے شریک ہونا چاہے لیکن مالِ غنیمت میں سے کسی حصے کا خواستگار نہ ہو، مسلمان مدینہ سے ایک ہزار چھ سو کی تعداد میں روانہ ہوئے جن میں سو کے قریب سوار تھے اور انہیں سورۂ فتح کی یہ آیت جو صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی تھی، یاد تھی۔

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ۭ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵﴾

(سورۃ الفتح:۱۵)

"(تم سے سفر حدیبیہ میں) پیچھے رہ جانے والے لوگ جب تم (خیبر سے) مالِ غنیمت حاصل کرنے جاؤ گے یہ کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ہمراہ لے چلو۔ وہ خدا کے کلام کو بدلنا چاہتے ہیں۔ اے پیغمبر ﷺ! ان سے کہہ دو کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہ آؤ۔ خدا نے پہلے ہی یہ کہہ دیا ہے وہ عنقریب کہیں گے بلکہ تم ہم پر حسد کرتے ہو البتہ ان میں تھوڑے ہیں جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔"

مسلمانوں نے مدینہ سے خیبر تک کی منزل تین دن میں طے کر لی۔ اہل خیبر کو اس چیز کا سان گمان بھی نہ تھا۔ راتوں رات مسلمانوں نے ان کے قلعوں کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا۔ صبح سویرے جب اہل خیبر حسب معمول اپنی اپنی کدالیں اور ٹوکریاں لے کر کھیتوں کو جانے لگے تو لشکر دیکھ کر چیختے چلاتے ہوئے بھاگے اور پکار پکار کر کہنے لگے کہ "یہ تو (حضرت) محمد (ﷺ) اور ان کے پیروؤں کا لشکر ہے۔" آنحضرت ﷺ نے یہ فقرہ سنا تو فرمایا۔

اِنَّا اِذَا نَزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ

جب ہم کسی قوم پر جا پڑتے ہیں تو ان لوگوں کا برا حال ہوتا ہے جنہیں خدا کے عذاب سے ڈرایا جاتا تھا۔

خیبر کے یہودیوں کو پہلے ہی یہ توقع تھی کہ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم ان پر حملہ آور ہوں گے اور وہ اس سے بچاؤ کی تدبیریں بھی سوچ رہے تھے۔ ان میں سے بعض کا مشورہ یہ تھا کہ وہ وادی القریٰ اور تیما کے یہودیوں سے متفق ہو کر عرب قبائل کی مدد کے بغیر یثرب (مدینہ) پر حملہ کر دیں لیکن بعض کا خیال یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ سے عہد و پیمان کر لینا چاہیے تا کہ اس صورت میں وہ کدورت محو ہو جائے جو مسلمانوں اور بالخصوص انصار کے دلوں میں اس نازیبا حرکت کی بنا پر پیدا ہو گئی تھی جو غزوۂ خندق کے موقع پر حیی بن اخطب نے مدینہ پر جبراً قابض ہونے کی نیت سے کی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ جانبین کے دلوں

Marfat.com

میں جذبہ انتقام کی آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے، مسلمانوں نے غزوۂ خیبر سے پہلے رؤسائے خیبر سلام ابن ابی حقیق اور یسیر بن رزام کو تہ تیغ کر دیا تھا چنانچہ جب انہیں یہ علم ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ ان پر چڑھائی کا ارادہ رکھتے ہیں تو انہوں نے قبائل غطفان سے (ان سے یہودیوں کے دوستانہ روابط تھے) کمک کی درخواست کی۔[1] اس بارے میں روایات مختلف ہیں کہ آیا قبائل غطفان نے یہودیوں کی امداد کی یا مسلمانوں کے لشکر نے راستے میں حائل ہو کر یہودیوں تک یہ کمک پہنچنے نہیں دی۔[2]

طرفین کی طاقت

بہر حال خواہ قبائل غطفان نے یہودیوں کی مدد کی خواہ آنحضرت ﷺ نے انہیں مالِ غنیمت میں سے حصہ دینے کے وعدے پر مدد سے روک دیا، یہ امر مسلم ہے کہ یہ جنگ بڑی اہمیت کی حامل تھی کیونکہ جو یہودی خیبر میں آباد تھے وہ یہودیوں کے تمام قبائل سے زیادہ زور و قوت اور دولت کے مالک تھے۔ مسلمانوں کو اس بات کا یقین تھا کہ جب تک عرب میں یہودیوں کا وجود باقی رہے گا اس وقت تک ان میں اور یہودیوں میں کشمکش باقی رہے گی اس لئے انہوں نے اس جنگ میں بڑے حوصلے سے حصہ لیا تھا۔ قریش اور عرب کے دیگر قبائل کو بڑی بے تابی سے یہ انتظار تھا کہ دیکھیں کس کی جیت ہوتی ہے اور کس کی ہار۔ بعض قریش تو اس پر شرطیں باندھتے تھے کہ غلبہ کسے ہو گا اور کون شکست کا منہ دیکھے گا؟ قریش میں سے اکثر کا خیال یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس جنگ میں لازماً شکست ہو گی کیونکہ خیبر کے قلعے چٹانوں اور پہاڑوں پر تھے اور تھے بھی نہایت مضبوط، یہاں کے باشندے جنگ آزمودہ بھی تھے۔

محاصرۂ خیبر

مسلمان پوری فوجی تیاریوں کے ساتھ خیبر کے قلعوں کے سامنے کیل کانٹے سے لیس ہو کر کھڑے رہے۔ یہودیوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ ان کے ایک سردار سلام بن مشکم نے یہ رائے دی کہ ہمیں چاہیے ہم اپنا مال و متاع، اہل و عیال وغیرہ وطیح اور سلالم کے قلعوں میں محفوظ کر دیں اور ہمارے پاس جو جمع پونجی ہے اسے قلعہ ناعم میں بحفاظت تمام پوشیدہ رکھیں۔ ان کے جنگجو قلعہ نطاۃ کے آس پاس صف آرا ہوئے۔[3] دونوں افواج میں گھمسان کا رن پڑا۔ اس جنگ میں صرف پچاس مسلمان مجروح ہوئے۔ یہودیوں میں سے کتنے زخمی ہوئے؟ ان کا اندازہ بھی اسی سے کیا جا سکتا ہے۔

اس معرکے میں سلام بن مشکم کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، اس کے بعد حارث بن ابی زینب نے قیادت کی باگ ڈور سنبھالی۔ قلعہ ناعم سے یہ سردار مقابلہ کے لئے نکلا لیکن بنی خزرج کی پامردی نے اسے الٹے پاؤں لوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ مجاہدین اسلام نے خیبر کے قلعوں کا بڑی دلیری اور بہادری سے محاصرہ کیا، یہودیوں نے مدافعت میں اپنی سی بڑی کوشش کی کیونکہ یہ بات ان پر روشن تھی کہ اگر انہیں شکست کا منہ

Marfat.com

دیکھنا پڑا تو عرب قبائل کی نظر میں ان کا وقار گر جائے گا۔

فریقین میں جھڑپیں ہوتی رہیں لیکن کوئی فیصلہ کن نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ آخر آنحضرت ﷺ نے لشکر اسلام کا علم حضرت ابوبکرؓ صدیق کو سونپا اور انہیں قلعہ ناعم کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق کی قیادت میں لشکر اسلام نے بڑی دلیری سے جنگ کی لیکن اس کے باوجود قلعے پر قابو نہ پایا جا سکا۔ دوسرے دن حضرت عمرؓ کو اس کام پر مامور کیا گیا لیکن انہیں بھی خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ تیسرے دن نبی کریم ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو یہ خدمت سونپی۔ جب آپؓ قلعے کے قریب پہنچے تو یہودی فوراً باہر نکل آئے اور جنگ زوروں پر شروع ہوگئی۔ ایک یہودی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر اس زور سے وار کیا کہ آپ کی ڈھال نیچے گر پڑی۔ حضرت علیؓ نے قریب کے ایک دروازے کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا۔ یہ دروازہ آپ مضبوطی سے پکڑے رہے اور لڑائی بھی جاری رہی یہاں تک کہ فتح نصیب ہوئی۔ اس دروازے سے پل کا کام بھی لیا گیا۔ مسلمان اس پر سے گزر کر قلعے میں داخل ہو گئے۔ قلعہ ناعم کے سردار حارث ابن ابی زینب کے مرتے ہی قلعے میں مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہ صورتحال اس لئے پیش آئی کہ ایک طرف تو یہودی اپنے وقار کی خاطر جان دینے پر تلے ہوئے تھے اور دوسری طرف مسلمان بھی محاصرے کو طول دینا نہ چاہتے تھے اور ان کا یہ ارادہ تھا کہ جلد سے جلد مہم سر کر لی جائے۔

قلعہ ناعم کی تسخیر کے بعد جنگ کے شعلے اور بھڑک اٹھے۔ مسلمانوں نے اس گرما گرمی میں قلعہ قموص پر بھی اپنا پرچم لہرا دیا۔ اس دوران میں تھوڑا بہت جو سامان رسد مسلمانوں کے پاس تھا ختم ہو گیا۔ اس کی اطلاع آنحضرت ﷺ کو دی گئی۔ آپ ﷺ نے کچھ نہ ہونے کی صورت میں یہ اجازت دے دی کہ گھوڑوں کو بھی اس مقصد سے ذبح کیا جا سکتا ہے۔ کسی مسلمان نے بھیڑوں کا ایک گلہ یہودیوں کے ایک قلعہ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو وہ اس میں سے دو بھیڑیں گھسیٹ لایا اور انہیں ذبح کر کے کھا لیا گیا۔ اس کے بعد جب صعب بن معاذ کا قلعہ قبضے میں آیا تو پھر اس قسم کی کوئی تکلیف نہ رہی۔ کھانے پینے کا اتنا سامان مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا جو یہودیوں کے تمام قلعوں کا محاصرہ کرنے کی صورت میں بھی کفایت کر سکتا تھا۔ یہودیوں کا حال یہ تھا کہ وہ پرزور مدافعت کے بغیر ایک قلعہ تو کیا، ایک بالشت زمین بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ جب ان کی جان پر آ بنتی تھی تب کہیں مسلمان ان کے قلعوں پر قابو پاتے تھے۔ یہودیوں کا ایک بڑا گرانڈیل سردار مرحب ایک قلعے سے یہ رزمیہ اشعار پڑھتا ہوا باہر نکلا۔

قَدْ علمتْ خَیْبَرُ اَنّی مَرْحَبُ	خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں
شَاکِی السَّلاحِ بَطَلٌ مُجرَّبُ	سلاح پوش، تجربہ کار، جنگجو ہوں
اَطعن اَحْیاناً وَحیناً اضربُ	میں کبھی نیزہ چلاتا ہوں اور کبھی تلوار
اِذا اللیوث اقبلت تُحَرَّبُ	جب شیر آگے بڑھتے ہیں تو وہ غصے سے بپھرے ہوئے ہوتے ہیں

اِنَّ حِمَایَ لَلْحِمَی لَا یُقْرَبُ   میری چراگاہ یقیناً ایک ایسی چراگاہ ہے جس کے قریب آنا بھی محال ہے

یُحْجِمُ عَنْ صَوْلَتِی الْمُجَرِّبُ   میرے رعب داب سے تجربہ کار جنگجو پیچھے ہٹ جاتے ہیں

آنحضرت ﷺ نے مجاہدین اسلام سے بہ آواز بلند پوچھا کہ تم میں سے کون اس یہودی سے ڈٹ کر مقابلہ کرے گا۔ محمد بن مسلمہؓ نے کہا۔ "یارسول اللہ ﷺ! اس سے میں لڑوں گا کیونکہ میرا بھائی کل ہی کام آیا ہے، میں اس کا قصاص لوں گا۔" چنانچہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ میدان میں اترے، دونوں میں مقابلہ ہوا۔ قریب تھا کہ مرحب انہیں شہید کر دیتا لیکن عین موقع پر ابن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اپنی ڈھال پر اس کی تلوار کا وار روکا۔ مرحب کی تلوار ڈھال میں پھنس کر رہ گئی۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اسے تلوار سے تہ تیغ کر دیا۔ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان بڑے زور کی جنگ چھڑی رہی، چونکہ یہودیوں کے قلعے بہت زیادہ مضبوط تھے اس لئے مسلمانوں کو ان کی تسخیر میں بہت زیادہ دشواریاں پیش آئیں۔

یہودیوں کی مایوسی

مسلمانوں نے قلعہ زبیر کا محاصرہ کیا جس نے کئی دنوں تک طول کھینچا، قلعے کے ارد گرد شدت سے مقابلہ ہوا لیکن ان قلعوں پر اس وقت تک مسلمان قابض نہ ہو سکے جب تک قلعہ بندوں کا پانی انہوں نے بند نہ کر دیا۔ مجبوراً یہودیوں کو جنگ کے لئے باہر نکلنا پڑا، انہیں مقابلے میں منہ کی کھانی پڑی، یکے بعد دیگرے باقی قلعے بھی مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ وطیح اور سلالم پر بھی اسلامی پرچم لہرایا تو یہودیوں کو سخت مایوسی ہوئی۔ مسلمانوں نے شق نطاۃ اور کتیبہ پر بھی تسلط قائم کرلیا تو یہودی جاں بخشی کی شرط پر صلح کے لیے آمادہ ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی شرط قبول کرلی اور ان کی جو زمین مسلمانوں کے قبضے میں آئی تھی اس شرط پر یہودیوں کو واپس کردی کہ وہ اس میں کاشت کریں اور اس کی پیداوار کا نصف انہیں دے دیا جائے گا۔[۵]

یہودیوں کے اقتدار کا خاتمہ

نبی کریم ﷺ نے بنی قینقاع اور بنی نضیر کے ساتھ مدینہ سے جلاوطنی کے موقع پر جو سلوک کیا تھا، اہل خیبر کے ساتھ روا نہ رکھا کیونکہ فتح خیبر کے بعد یہ خدشہ باقی نہ رہا تھا کہ یہودی پھر بھی مسلمانوں پر حملہ آور ہو سکیں گے۔ آپ ﷺ کو اطمینان تھا کہ اب یہودیوں کے قدم نہ جم سکیں گے۔ علاوہ بریں خیبر کے باغوں، درختوں اور کھیتوں سے پیداوار حاصل کرنے کے لئے بہت سے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ اگرچہ مدینہ کے انصار بھی کاشتکار تھے لیکن ان کے لئے یہی کام بہت تھا کہ وہ مدینہ میں اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کریں۔ مزید برآں جنگی امور پر بھی آنحضرت ﷺ کو فوج کی ضرورت تھی لہٰذا آپ ﷺ انہیں زراعت کے کھڑاگ میں کیسے ڈال سکتے تھے۔ غرض یہودی اس عالم میں کہ سیاسی حیثیت سے ان کا وقار ختم ہو چکا تھا اور وہ اپنی زندگی کے تعیشات سے بھی محروم ہو گئے تھے، خیبر کی زمینوں میں کاشت کرتے

Marfat.com

رہے۔آنحضرت ﷺ کا معاملہ ان سے بہت صاف تھا۔عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ ہر سال آپ ﷺ کی طرف سے پیداوار کی تقسیم کے لئے خیبر پہنچتے اور عدل وانصاف سے کام لیتے۔پھر بھی زراعت و پیداوار کے لحاظ سے خیبر کے یہودیوں کا کاروبار تباہ وبرباد ہو گیا۔

یہودیوں سے حُسن سلوک کی دلیل یہ ہے کہ جب غزوۂ خیبر میں مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو اس میں تورات کے چند اوراق بھی تھے۔یہودیوں نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے یہ اوراق واپس کرادیئے اور ان سے ان رومیوں کا سا برتاؤ نہ کیا جنہوں نے یروشلم کی فتح کے موقع پر کتب مقدسہ کو نذرآتش کر دیا تھا۔عیسائیوں کا سا سلوک بھی روا نہ رکھا جنہوں نے اندلس میں یہودیوں پر غلبہ پانے کے بعد تورات کے اوراق جلا کر خاک سیاہ کر دیے تھے۔

فدک کے یہودی

جن ایام میں مسلمانوں نے وطیح اور سلام کا محاصرہ کر رکھا تھا، یہودیوں نے صلح کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے اہل فدک کو پیغام بھیجا کہ یا تو وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں یا اپنا مال حوالے کر دیں۔اہل فدک خیبر کے یہودیوں کا انجام دیکھ چکے تھے اس لیے جنگ کے بغیر اپنا نصف مال آنحضرت ﷺ کو دے کر صلح کے لیے آمادہ ہو گئے۔خیبر پر تمام مسلمانوں کا حق تھا کیونکہ اس کے لیے انہوں نے بڑی بے جگری سے جنگ کی تھی اور فدک خصوصیت سے آنحضرت ﷺ کا حصہ تھا کیونکہ مسلمانوں نے اس کے لئے کوئی جنگ نہ کی تھی۔

وادی القریٰ کی اطاعت

آنحضرت ﷺ نے وادی القریٰ کے راستے مدینہ کو واپسی کا ارادہ کیا وہاں کے یہودیوں نے شروع شروع میں مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی مگر پھر اطاعت پر مجبور ہو گئے اور انہی شرائط پر صلح کی جن کی بنا پر خیبر کے یہودیوں نے صلح کی تھی۔تیما کے یہودیوں نے بھی جزیہ دینا قبول کر لیا غرض اس طرح یہودیوں کے تمام قبیلے مطیع ہو گئے اور عرب میں ان کا جو اقتدار تھا ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔شام اور سرحد شام کی جانب سے آنحضرت ﷺ کو کسی یورش کا خطرہ نہ رہا جیسا کہ اس سے قبل صلح حدیبیہ کے بعد آپ ﷺ کو جنوب کی طرف سے اطمینان ہو گیا تھا۔یہودیوں کا غلبہ ختم ہو جانے کی وجہ سے مسلمانوں اور خصوصاً انصار کے دلوں سے دیرینہ عداوت کا جذبہ کم ہو گیا۔اگرچہ کچھ یہودی دوبارہ یثرب میں رہنے سہنے لگے تھے مگر مسلمانوں نے ان سے چشم پوشی کی۔آنحضرت ﷺ نے ان یہودیوں سے ہمدردی کا اظہار کیا جو عبداللہ بن ابی کا ماتم کرتے تھے۔آپ ﷺ نے اس کے بیٹے کو بھی تسلی دلاسا دیا، نیز آنحضرت ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یہ ہدایت کی کہ وہ یہودیوں سے ان کے مذہب کے بارے میں تعرض نہ کریں۔آپ ﷺ نے بحرین کے یہودیوں پر

Marfat.com

آبائی دین پر جمے رہنے کے باوجود کوئی جزیہ مقرر نہ کیا۔ بنی غازیہ اور بنی عریض کے یہودیوں سے اس یقین دہانی پر کہ ان کی حفاظت ہمارے ذمے ہے، آپ ﷺ نے جزیہ لینا منظور کر لیا۔ مختصر یہ ہے کہ بلادِ عرب میں یہودی مسلمانوں کے زیر اقتدار آ گئے اور ان کی مرکزی حیثیت ختم ہو گئی حتیٰ کہ وہ ان مقامات سے ہجرت پر مجبور ہو گئے جہاں وہ مدتوں عزت و وقار سے رہتے چلے آئے تھے۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق عرب سے یہودیوں کا تخلیہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں اور ایک دوسری روایت کے موجب آپ ﷺ کے وصال کے بعد ہوا۔

زہر آلود گوشت سے رسول اللہ ﷺ کی ضیافت

خیبر اور دیگر مقامات کے یہودی اطاعت گزار تو ہو گئے تھے لیکن شکست خوردگی کا احساس ان میں اس شدت سے تھا کہ ان کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے بغض و عناد کی آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ انہیں یہ فکر تھی کہ کسی نہ کسی طرح آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے انتقام لیا جائے۔ خیبر کے بعد جب حالات خاصی حد تک پُرسکون ہو چکے تھے، سلام بن مشکم کی بیوی زینب بنت حارث نے ایک بھنی ہوئی بکری آنحضرت کی خدمت میں تحفہ کے طور پر بھیجی، آپ ﷺ اپنے دیگر صحابہؓ کے ساتھ دسترخوان پر یہ گوشت تناول کرنے کے لیے بیٹھے تو پہلے آپ ﷺ نے اس کا ایک ٹکڑا اپنے دانتوں سے کاٹا لیکن آپ ﷺ کو اس کا ذائقہ ناخوشگوار معلوم ہوا۔ آپ ﷺ کی دیکھا دیکھی بشر رضی اللہ عنہ بن براء نے بھی آپ ﷺ کی طرح ایک ٹکڑا دانتوں سے کاٹا اور نگل لیا۔ آنحضرت ﷺ نے لقمہ منہ سے اگل دیا اور یہ فرمایا کہ یہ گوشت کی بوٹی یا ہڈی مجھے بتا رہی ہے کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے، اس کے بعد آپ ﷺ نے زینب کو طلب کیا۔ اس نے اپنی اس کارستانی کا اقبال کیا اور کہا۔ ”جو کچھ میری قوم کے ساتھ آپ ﷺ نے کیا ہے وہ آپ ﷺ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میں نے دل یہ سوچا تھا کہ آپ ﷺ محض بادشاہ ہیں تو مجھے آپ ﷺ کی موت سے راحت نصیب ہو جائے گی اور اگر پیغمبر ہیں تو آپ کو میری حرکت کا علم ہو جائے گا۔“

بشر بن براء رضی اللہ عنہ تو اس زہر آلود گوشت کے اثر سے ہلاک ہو گئے۔ زینب کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ اکثریت کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ ﷺ نے زینب کو معافی دے دی اور اس نے جو عذر پیش کیا تھا اس سے قبول فرمایا کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا باپ اور شوہر مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ بعض روایات کے مطابق اسے بشر کے بدلے میں قتل کر دیا گیا۔

زینب کے اس انتقامی اقدام کے بعد مسلمانوں کے دلوں سے یہودیوں کا اعتماد جاتا رہا۔ اگرچہ یہودی اجتماعی حیثیت سے اپنا اقتدار کھو چکے تھے تاہم ان کی فطرت میں عہد شکنی اور خیانت کے جو معائب گھر کر چکے تھے مسلمانوں کے لیے وجہ تشویش بنے رہے۔ بنی نضیر کی ایک عورت صفیہ بنت حُیَی بن اخطب ان قیدیوں

Marfat.com

میں شامل تھی جو غزوۂ خیبر میں مسلمانوں کے ہاتھ آئے تھے۔ وہ کنانہ بن ربیع کی بیوی تھی۔ مسلمانوں کو کسی ذریعے سے یہ علم ہوا تھا کہ بنی نضیر کے خزانے کنانہ بن ربیع کے پاس ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے دریافت فرمایا تو اس نے قسمیں کھا کر یقین دلانے کی کوشش کی کہ اسے ان خزانوں کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر ان خزانون میں سے کوئی خزانہ تیرے پاس نکلا تو کیا پھر تجھے قتل کر دیا جائے؟ اس نے کہا: ''بے شک!'' کچھ دنوں بعد ایک مسلمان نے کنانہ کو کسی کھنڈر کے قریب آتے جاتے دیکھا تو اس نے اس کا ذکر آنحضرت ﷺ سے کیا۔ آپ ﷺ نے اس کھنڈر کی کھدائی کا حکم دیا اور خزانے کا کچھ حصہ وہاں سے برآمد کیا۔ کنانہ کو انکار کے جرم میں تہ تیغ کر دیا گیا۔ صفیہ جو قیدیوں میں شامل تھی اس کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ صفیہ، بنی قریظہ اور بنی نضیر کی سیدہ ہے۔ سوا آپ ﷺ کے اور کوئی اس کے لائق نہیں۔ آپ ﷺ نے آزاد کر کے اس سے عقد کر لیا۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ نے ماضی کے جلیل القدر فاتحین کے طریقے پر عمل کیا۔ وہ مفتوحہ ممالک کے سرداروں کی بیٹیوں سے شادی کر لیا کرتے تھے تاکہ ان کے مصائب کا بار ہلکا ہو جائے اور ان کی عزت بھی برقرار رہے۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو یہ خدشہ تھا کہ صفیہ رضی اللہ عنہا کے دل میں کہیں جذبہ انتقام بیدار نہ ہو جائے کیونکہ غزوۂ خیبر میں اس کا باپ شوہر اور اس کی قوم کے دوسرے لوگ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے، اس لیے موصوف نے حفظ ماتقدم کے طور پر آنحضرت ﷺ کے خیمے کے گرد ننگی تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے رات گزار دی۔ صبح کے وقت جب آنحضرت ﷺ نے انہیں دیکھا تو دریافت فرمایا۔ ''کیا قصہ ہے؟'' انہوں نے جواب دیا۔ مجھے اس عورت (صفیہ رضی اللہ عنہا) کی طرف سے خطرہ تھا اور وہ اس بنا پر کہ ابھی کل کی بات ہے کہ اس کا باپ، شوہر اور اس کی قوم کے کچھ لوگ ہمارے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں اور اس نے بھی کفر سے توبہ ابھی کی ہے (اندیشہ تھا کہ کہیں کسی سوچی سمجھی سکیم کے ماتحت آپ ﷺ پر شب زفاف میں کوئی وار نہ کر بیٹھے)۔

یہ محض خیال ہی تھا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ صفیہ رضی اللہ عنہا اُم المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بننے کے بعد آپ ﷺ کی آخر دم تک وفادار و وفا کیش رہیں۔ مرض الموت میں جب آپ ﷺ کی ازواج مطہرات آپ ﷺ کے بستر کے گرد جمع تھیں تو اُم المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا۔ ''یارسول اللہ ﷺ! کاش جو تکلیف آپ ﷺ کو ہے، مجھے ہو جاتی۔'' اس پر آپ ﷺ کی دوسری ازواج مطہرات نے ازراہِ تمسخر آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کیے، آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا: ''کلی کرو!'' ازواج مطہرات نے سبب دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے اس (صفیہ رضی اللہ عنہا) کی طرف آنکھوں آنکھوں میں اشارے کیے ہیں۔ لہٰذا جو کچھ اس نے کہا ہے اس میں صداقت ہے۔ اُم المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں وفات پائی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئیں۔

Marfat.com

نواحی بادشاہوں کی طرف بھیجی جانے والی سفارتیں

وضاحت طلب امر یہ ہے کہ ان قاصدوں کا کیا حشر ہوا جنہیں آنحضرت ﷺ نے ہرقل، کسریٰ اور نجاشی وغیر کی جانب بھیجا تھا؟ کیا یہ قاصد غزوۂ خیبر کے موقع پر موجود تھے یا نہیں؟ یا ان کی روانگی فتح خیبر کے بعد عمل میں آئی، اس بارے میں مؤرخین کی آراء میں اتنا اختلاف ہے کہ کوئی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی۔ غالب گمان یہ ہے کہ وہ سب بیک وقت روانہ نہ ہوئے بلکہ بعض کی روانگی خیبر کی جنگ سے قبل اور بعض کی اس کے مابعد عمل میں آئی۔ چند روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وحیہؓ بن خلیفہ کلبی جنہیں قاصد کی حیثیت سے ہرقل کے پاس بھیجا گیا تھا، غزوہ خیبر میں موجود تھے۔ وہ ہرقل کے پاس اس وقت پہنچے جب وہ ایران پر فتح کے بعد ان سے وہ صلیب واپس لے آیا تھا جو بیت المقدس سے ایرانی نکال لے گئے تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ اپنی منت پوری کرے اور بیت المقدس پا پیادہ جا کر صلیب کو اس کی جگہ نصب کرے۔ ہرقل حمص پہنچ چکا تھا کہ اسے آنحضرت ﷺ کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ یہ دعوت نامہ وحیہ کلبیؓ نے ہرقل کے فرمانروائے بصریٰ اور خود اس کے درباریوں کی معرفت ہرقل تک پہنچایا۔ وحیہ کلبیؓ نے خود اس کے دربار میں باریاب ہو کر یہ خدمت پیامبری انجام دی؟ اس کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ بہرحال دعوت نامہ ہرقل کے روبرو پڑھا گیا اور ترجمان نے اس کے مضمون سے اس کو واقفیت بہم پہنچائی۔ ہرقل کو اس دعوت نامے سے ناگواری ہوئی نہ اس کے دل میں جذبہ انتقام پیدا ہوا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ مجھے بلادعرب پر چڑھائی کر دینی چاہیے۔ جہاں تک واقعات سے ظاہر ہے اس نے دعوت نامے کا جواب شرافت سے دیا۔ غالباً اسی وجہ سے بعض مؤرخین کو یہ گمان ہوا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

انہی ایام میں حارث غسانی کا قاصد ہرقل کے دربار میں آیا اور یہ اطلاع دی کہ حارث کے پاس بھی نبی کریم ﷺ کا ایک قاصد دعوت نامہ لے کر آیا ہے ہرقل نے دیکھا تو یہ دعوت نامہ بھی مضمون کے اعتبار سے اسی قسم کا تھا۔ حارث نے ہرقل سے اس بات کی اجازت طلب کی تھی کہ وہ ایک لشکر لے کر مدعی نبوت پر چڑھائی کر دے اور اس بات کا انتقام لے کہ میرے پاس دعوت نامہ کیوں بھیجا گیا ہے لیکن ہرقل نے یہ مناسب خیال کیا کہ بیت المقدس کی زیارت کے موقعہ پر حارث بھی اس کے ہمراہ رہے تا کہ صلیب کو اس کی جگہ پر نصب کرنے کے سلسلے میں شاندار تقریب کا اہتمام ہو سکے۔ ہرقل نے نئے مذہب کے داعی ﷺ کو اتنی اہمیت نہ دی۔ یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ چند ہی سال میں بیت المقدس اور شام پر اسلام کا پرچم لہرانے لگے گا اور دمشق کی حیثیت اسلام کے پایہ تخت کی ہو گی۔ نیز یہ کہ اسلام اور روم کی کشمکش ۱۴۵۳ء میں فتح قسطنطنیہ تک ختم نہ ہو سکے گی۔ اس زمانے میں ترک وہاں کے سب سے بڑے کلیسا کو مسجد میں تبدیل کر کے اس پر اپنے نبی ﷺ کا نام کندہ کریں گے اور یہ کہ یہ کلیسا کئی صدیوں تک مسجد بنا رہے گا

Marfat.com

یہاں تک کہ ترک اسے مشرقی روم کے آثار قدیمہ کے عجائب گھر کی شکل دیں گے۔

کسریٰ کا رویہ

کسریٰ شاہ ایران نے جب آنحضرت ﷺ کے دعوت نامے کا مضمون سنا تو وہ سیخ پا ہو گیا۔ اس نے اس دعوت نامے کے پرزے پرزے کو ڈالے اور عامل یمن بازان کو یہ حکم نامہ بھیجا کہ اس مدعی نبوت کا سر (نعوذ باللہ) اس کے پاس بھیجے۔ شاید کسریٰ نے یہ سوچا ہو کہ اس کے اس طرز عمل سے اس شکست کا کفارہ ادا ہو جائے گا جو اسے ہرقل کے ہاتھوں اٹھانی پڑی تھی۔ جب نبی کریم ﷺ کو کسریٰ کے اس رویے کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اس کے ملک کو تہس نہس کرے۔ بازان نے کسریٰ کے حسب الحکم اپنے قاصد آنحضرت ﷺ کے پاس بھیجے۔ اس اثناء میں کسریٰ کے بجائے اس کا بیٹا شیرویہ تخت نشین ہو چکا تھا۔ نبی کریم ﷺ پر یہ بات روشن ہو چکی تھی۔ جب بازان کے قاصد آپ ﷺ کے پاس پہنچے تو آپ ﷺ نے انہیں اس حادثے کی اطلاع دی اور انھیں بازان کے پاس اس پیغام کے ساتھ واپس بھیجا کہ وہ اسلام لے آئے۔ اہل یمن ایرانیوں کی شکست کا عبرتناک منظر دیکھ چکے تھے اور یہ بات ان کے ذہن میں بیٹھ چکی تھی کہ ان پر بھی ایرانیوں کا تسلط باقی نہ رہے گا علاوہ بریں وہ یہ سن چکے تھے کہ آنحضرت ﷺ کو قریش پر پے در پے فتوحات حاصل ہوئی ہیں اور یہودیوں کا اقتدار بھی آپ کی کوششوں سے ختم ہو چکا ہے چنانچہ بازان کے قاصد جب یمن واپس پہنچے اور انہوں نے اسے آنحضرت ﷺ کا پیغام دیا تو اس نے فوراً لبیک کہا اور مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ نے اسے یمن کا والی رہنے دیا۔ چونکہ مکہ جس پر ابھی تک مسلمانوں کا قبضہ نہ ہوا تھا یمن کے درمیان حائل تھا اس لیے یہ بات ظاہر تھی کہ آنحضرت ﷺ بازان سے کوئی مطالبہ نہ کریں گے۔ ان حالات میں اس نے اس بات میں مصلحت سمجھی کہ زوال آمادہ ایران کے اقتدار کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار پھینکے اور عرب کی اس طاقت کے دامن میں پناہ لے جو اس سے کسی خراج کی طالب بھی نہیں۔ بازان کو اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ آنحضرت ﷺ سے اس کے دینی و دنیوی روابط کے معنی ہیں کہ جزیرۂ عرب کے جنوب میں اسلام کے لیے ایک مضبوط مرکز قائم ہو جائے گا جیسا کہ دو سال کے بعد ہی واقعات نے ثبوت بہم پہنچا دیا۔

مقوقس کا جواب

قبطیوں کے سردار مقوقس نے آنحضرت ﷺ کے دعوت نامے کا جو جواب دیا وہ کسریٰ کے جواب سے مختلف بلکہ ایک حیثیت سے ہرقل کے جواب سے بھی بہتر تھا۔ اس نے نبی کریم ﷺ کے دعوت نامے کے جواب میں یہ پیغام بھیجا کہ میرا عقیدہ ہے عنقریب ایک پیغمبر کا ظہور ہوگا لیکن میرے علم و اطلاع کے بموجب اس کا مقام ظہور شام ہے۔ مقوقس نے قاصد رسول ﷺ کی عزت و تکریم میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور اس کے

Marfat.com

ہمراہ ہدیہ کے طور پر دو بی بیاں ؎ ایک سفید خچر، ایک گدھا کچھ مال اور مصر کی عمدہ اور نایاب اشیاء بھیجیں۔ آپ ﷺ نے یہ ہدیہ قبول فرما لیا۔ مقوقس کی بھیجی ہوئی دو لونڈیوں میں سے ایک کا نام ماریہ رضی اللہ عنہا تھا جسے آپ ﷺ نے اپنے لیے منتخب فرمایا اور ابراہیم رضی اللہ عنہ اسی کے بطن سے متولد ہوئے۔ دوسری لونڈی کا نام سیرین تھا۔ یہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے حبالہ عقد میں آئی۔ آپ ﷺ نے خچر کا نام دلدل رکھا۔ یہ خچر ان تمام خچروں میں جو بلاد عرب میں پائے جاتے تھے اپنے سفید رنگ کی بدولت ممتاز تھا۔ گدھے کا نام آپ ﷺ نے عفیر یا یعفور رکھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مقوقس اس خوف سے مشرف بہ اسلام نہ ہوا کہ اہل روم اس سے مصر کی حکومت چھین لیں گے۔ اگر یہ تشویش دامن گیر نہ ہوتی تو وہ ضرور ایمان لے آتا اور اسے ہدایت نصیب ہوتی۔

نجاشی کا جواب

نجاشی اور مسلمانوں کی اس رسم و راہ کی بنا پر جس کا حال اوپر کے صفحات میں آ چکا ہے یہ قدرتی بات تھی کہ نجاشی کو ایمان لے آنا چاہیے تھا اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس نے دعوت نامے کا جواب بھی اچھے پیرائے میں دیا ہوگا۔ بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ مغربی مصنفین کی ایک جماعت کو اس میں کلام ہے۔ نبی کریم ﷺ نے دعوت نامے کے علاوہ ایک اور مکتوب بھی نجاشی کے پاس بھیجا تھا اور اس میں اس سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ حبشہ میں جو مسلمان اقامت گزیں ہیں انہیں بہ حفاظت تمام واپس بھیج دیا جائے۔ نجاشی نے حبشہ میں مقیم مسلمانوں کی روانگی کے لیے دو کشتیاں تیار کیں اور ان کے فیصلے سے انہیں مدینہ روانہ کیا۔ ان مسلمانوں کے سردار جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔ ام حبیبہ بنت ابوسفیان بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ حبشہ سے واپسی پر آنحضرت ﷺ نے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے عقد کر لیا۔ بعض مؤرخین نے یہ تحریر کیا ہے کہ اس رشتہ ازدواج کے بعد آنحضرت ﷺ اور ابوسفیان کے درمیان جو رابطہ پیدا ہوا اس میں یہ حکمت عملی بھی تھی کہ صلح حدیبیہ کی بنیادیں استوار ہوں۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے۔ کہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپ ﷺ کی شادی ابوسفیان پر گراں گزری اس لیے کہ وہ ابھی اپنے آبائی مذہب بت پرستی پر قائم تھا۔

امرائے عرب میں سے یمن اور عمان کے امرا نے آنحضرت ﷺ کے دعوت ناموں کے جوابات نہایت نازیبا الفاظ میں دیے۔ امیر بحرین کا جواب معقول تھا۔ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ امیر یمامہ نے اس شرط پر اسلام کے دائرے میں داخل ہونا منظور کیا کہ یمامہ کی حکومت مستقلاً اُسے سونپ دی جائے۔ آپ ﷺ نے اس طمع کی بنا پر اس پر لعنت بھیجی۔ کہا جاتا ہے کہ اس واقعے کے ایک سال بعد اس نے وفات پائی۔

جوابات کی نرمی کی وجہ

قارئین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر فرمانرواؤں نے آنحضرت ﷺ کے دعوت

Marfat.com

ناموں کے جوابات میں نرمی اور دانشمندی کا ثبوت کیوں دیا؟ ان میں سے کسی نے آپ ﷺ کے کسی قاصد کو قید یا قتل کیوں نہیں کیا؟ آخر کیا سبب ہے کہ ان میں سے اکثر قاصد معقول و مناسب جواب لے کر آئے، ایسے جواب بہت کم تھے جن میں درشتی یا نازیبائی تھی؟ ان فرمانرواؤں نے ایک نئے مذہب کے پیغام پر لبیک کیوں کہا اور اس کے داعی کی مخالفت کیوں نہیں کی اور وہ اس کے تاروپود بکھیر دینے کے لیے کیل کانٹے سے کیوں لیس نہ ہوئے؟ ان سوالات کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں اس وقت جو حالات تھے وہ اس دور کے حالات سے کچھ مختلف نظر نہیں آتے۔ تاریخ کے اس دور میں بھی روحانیت پر مادیت کا غلبہ تھا۔ عام رجحان یہ تھا کہ زندگی کا مقصود عیش و عشرت کے سوا اور کچھ نہیں۔ قومیں ایک دوسرے پر غلبہ و اقتدار حاصل کرنے یا حکام وقت کی جائز و ناجائز خیر خواہی یا اپنے ذاتی مفاد کے لیے ایک دوسرے سے مصروف جنگ و جدل رہتی تھیں۔ ایسے حالات میں عقیدے یا ایمان کی پیروی رسمی حیثیت سے باقی رہ جاتی ہے لوگ ان حقائق سے عمداً صرف نظر کرتے ہیں جو عقیدے یا ایمان کی تہ میں چھپے ہوتے ہیں۔ عوام کی زندگی کا مدعا بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ ان با اختیار امراء کے احکام کی اندھا دھند تعمیل کریں جو انہیں مادی فوائد عیش و عشرت کے اسباب اور دنیوی جاہ و منصب سے مالا مال کر دیں۔ اس قسم اور اس قماش کے لوگ مذہبی رسوم پر اسی حد تک عمل پیرا ہوتے ہیں جہاں تک ان سے ان کی ذاتی اغراض وابستہ ہوں۔ جب ان کی اغراض پوری ہو جاتی ہیں تو ان کے عزائم کی گرفت بھی ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ ان کے ارادے پست اور ہمتیں سست ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب لوگوں کے علم میں یہ بات آئی کہ ایک شخص انہیں ایک ایسے نئے اور عجیب عقیدے کی دعوت دے رہا ہے جس میں سادگی اور قوت کے جوہر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں، جس کی رو سے خدا کے نزدیک سب برابر اور ایک سطح پر ہیں اور وہ وہی ایک خدا مخلوق کے نفع و ضرر پر قادر ہے اگر کسی کو اس کی خوشنودی حاصل ہو جائے تو روئے زمین کے جابر و قاہر بادشاہوں کا غضب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور اگر وہ غضب آلود ہو جائے تو دنیا بھر کے بادشاہوں کی نوازشیں اور نعمتیں اسے اس کے غضب سے بچا نہیں سکتیں۔ ان لوگوں کے لئے جو اپنی بداعمالیوں سے تائب ہو جاتے ہیں اور آئندہ کے لئے نیک اعمال سرانجام دینے کا عہد کر لیتے ہیں، بخشش کی امید بھی ہے اور صلاح و فلاح کی توقع بھی، لوگوں نے اس دعوت پر غور کیا اور یہ دیکھا کہ اس کا علمبردار ہر قسم کی مخالفتوں، ایذا رسانیوں اور مادی قوتوں کے مقابلے میں غلبہ حاصل کر رہا ہے۔ باوجودیکہ شروع میں اس نے بے سروسامانی کی زندگی بسر کی ہے اور یتیمی کا داغ بھی اس کی پیشانی پر ہے۔ اس نے قلیل ترین مدت میں اتنی شاندار کامیابی حاصل کی ہے کہ اس کی نظیر نہ اس کے وطن میں ملتی ہے اور نہ پورے عرب میں۔ لوگوں کو بے تابی سے اس کے دیدار کا اشتیاق ہے، اس کی باتیں ذوق و شوق سے سنی جاتی ہیں۔ ان باتوں سے عوام کے دل و دماغ کو اپنی تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور اگر کہیں شکوک و شبہات اور خوف دہشت کے حجابات درمیان نہ ہوتے تو اس سرچشمہ صدق و صفا سے سیرابی کے لئے ان میں ضرور آمادگی

Marfat.com

کی لہر دوڑتی۔ فرمانرواؤں نے آپ ﷺ کے دعوت ناموں کے جوابات میں جو موافق رُخ اختیار کیا اس کی تہ میں یہی حقیقتیں کام کر رہی تھیں۔ فرمانرواؤں کے امید افزا ردِ عمل سے پیروانِ اسلام کے ایمان اور اطمینانِ قلب کی بنیادیں اور مستحکم ہوگئیں۔

حبشہ سے مسلمانوں کی واپسی

آنحضرت ﷺ خیبر سے واپس تشریف لائے، اور جعفر طیار رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی ایک جماعت کے ہمراہ حبشہ سے مدینہ پہنچے۔ اس اثنا میں آپ ﷺ کے بھیجے ہوئے قاصد بھی اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی کے بعد لوٹ آئے مدینہ منورہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو بے تابی سے اس وقت کا انتظار تھا کہ معاہدے کے موجب عازم مکہ ہوں اور بیت اللہ کی زیارت کا شرف حاصل کریں۔ آنحضرت ﷺ نے جب جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی تو آپ ﷺ کہ اتنی خوشی ہوئی کہ آپ نے فرمایا، نہیں معلوم مجھے فتح خیبر سے زیادہ خوشی ہوئی ہے یا جعفر رضی اللہ عنہ کی ملاقات سے، انہی ایام سے متعلق یہ داستان مشہور ہے کہ یہودیوں نے لبید کے ذریعے آپ ﷺ پر جادو کرا دیا تھا اور اس سے آپ ﷺ کی حالت کچھ اتنی غیر ہوگئی تھی کہ آپ ﷺ کو کل کا کیا ہوا کام بھی یاد نہیں رہتا تھا۔ اس داستان سے متعلق مختلف روایات ہیں۔ ان روایات میں زیادہ وزن ہے جن میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ قصہ من گھڑت ہے اور اس میں ذرہ بھر بھی صداقت نہیں ہے۔

عمرہ قضا کا انتظار

خیبر کی فتح کے بعد مسلمان مدینہ میں اطمینان سے زندگی بسر کر رہے تھے اور قدرت نے جو نعمتیں انہیں عطا کی تھیں ان سے بہرہ اندوز ہو رہے تھے۔ اس عرصے میں انہیں جنگ کا خیال تک بھی نہیں آتا تھا، ہاں البتہ اگر کوئی ان کے حقوق پر دست درازی کرتا تو اس کی سرکوبی کے لیے کبھی کبھی کوئی فوجی دستہ بھیجنا پڑتا۔ غرض جب سال ختم ہوا اور ماہ ذیقعدہ کی ابتدا ہوئی تو آنحضرت ﷺ دو ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم کی معیت میں قرار دادِ حدیبیہ کے موجب عمرہ قضا ادا کرنے کی نیت سے عازم مکہ ہوئے تا کہ ان لوگوں کی آتشِ شوق سرد ہو جائے جو بیت اللہ کی زیارت کے لیے بے تاب تھے۔

❁

Marfat.com

حواشی

۱۔ نقشہ ''بلاد العرب فی حیاۃ محمدؐ'' دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مدینہ سے خیبر بہ سمت راست شمالاً واقع ہے۔ خیبر کے بعد فدک شمال سے ذرا ہٹ کر غرباً اور بنو غطفان خیبر سے بہ سمت مشرق دور واقع ہے۔

۲۔ بنو غطفان آئے مگر مسلمانوں نے ان کی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ الٹے پاؤں واپس لوٹ گئے۔ اسلامی لشکر خیبر میں بنو غطفان ہی کی سمت پر پڑا ہوا تھا۔

۳۔ خیبر دس قلعوں کے مجموعہ کا نام تھا جن میں دس ہزار جنگی سپاہی رہتے۔ پھر یہ قلعے تین حلقوں میں واقع تھے۔ (۱) حلقہ نطاۃ: اس میں چار قلعے تھے، ناعم، نطاۃ، صعب ابن معاذ، قلعہ الزبیر۔ (۲) حلقہ: تین قلعے، حصن شق، حصن البر، حصن ابی۔ (۳) حلقہ کتیبہ: اس میں بھی تین ہی قلعے تھے، قموص، وطیح اور سلام۔ بفتحہ وکسرہ، دونوں۔

۴۔ خیبر کی اراضی کے دو حصے ہیں: (۱) جنگ سے فتح شدہ۔ اسے مجاہدین میں تقسیم کر دیا گیا۔ (۲) صلح سے حاصل شدہ۔ یہ ریاست کی ملکیت رہا۔ دوسرا حصہ آنحضرت ﷺ نے یہود کو بٹائی پر دے دیا۔ یوں خیبر میں سب کی اراضی شامل ہے، اس لئے دونوں قسموں پر لفظ خیبر ہی استعمال ہوتا ہے۔

۵۔ کئی کتب میں یوں لکھا گیا ہے کہ یہ دو خواتین دو کنیزیں تھیں حالانکہ مقوقس کے خط میں مرقوم ہے کہ میں آپ کے لئے دو نوعمر لڑکیاں بھیجتا ہوں جن دونوں کی قبطیوں میں بے حد عظمت ہے۔ کنیز کی عظمت کا تو سوال ہی نہیں پھر بادشاہِ وقت کی قوم میں! مگر یہ کہ ناقلین نے رسول اللہ ﷺ کے حرم میں شاہی خاندان کی شہزادی کو باندی ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

Marfat.com

باب 20

عمرۃ القضا سے لے کر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام تک

قرار دادِ حدیبیہ پر ایک سال بیت چکا تھا، اس معاہدے کے مطابق آنحضرت ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو مکہ میں داخلے اور بیت اللہ کی زیارت کا حق حاصل تھا چنانچہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو عمرہ قضا کی بجا آوری کے لیے جس سے وہ گزشتہ سال روک دیے گئے تھے، تیاری کا حکم دیا۔ اس امر کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ صحابہؓ نے کس ذوق وشوق سے اس حکم کی تعمیل کی ہوگی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں مہاجرین بھی تھے جنہیں مکہ کو خیرباد کہے سالہا سال کی مدت گزر چکی تھی اور انصار بھی جن کے اہل مکہ سے تجارتی تعلقات تھے۔ ان دونوں گروہوں کو بیت اللہ کی زیارت کا بے حد اشتیاق تھا۔

گزشتہ سال مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار چار سو (۱۴۰۰) تھی۔ اس سال یہ تعداد بڑھ کر دو ہزار تک جا پہنچی تھی۔ قرار داد حدیبیہ کے مطابق ان میں سے کسی نے سوا ایک، ایک تلوار کے جو نیام میں تھی کوئی ہتھیار ساتھ نہ لیا، آنحضرت ﷺ کو قریش کے فریب کا ہمیشہ خدشہ رہتا تھا اس لیے آپ ﷺ نے سو سواروں کی جماعت تیار کی اور اس کا سردار محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو بنایا۔ اس دستے کو ہراول کے طور پر آپ ﷺ نے پہلے بھیج دیا لیکن یہ ممانعت کردی کہ وہ حرم مکہ میں داخل نہ ہوں، بلکہ وادی مرالظہر ان میں ٹھہرے رہیں۔ ستر اونٹنیاں قربانی کے لیے مسلمانوں کے ہمراہ تھیں، یہ قافلہ مدینہ سے اس صورت میں روانہ ہوا کہ آنحضرت ﷺ اپنی اونٹنی قصوا پر ان کے آگے آگے تھے اور آپ ﷺ کے جلو میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا قافلہ تھا جسے بیت اللہ کی زیارت اور طواف حرم کا جذبہ کشاں کشاں لیے جا رہا تھا۔ مہاجرین میں سے ہر شخص اپنے منشا ومولد اور اس مقام کو دیکھنے کی تمنا دل میں لیے ہوئے تھا جہاں اس نے بچپن گزار کر جوانی کی منزل میں قدم رکھا تھا، اسے اپنے چھوڑے ہوئے دوستوں سے ملاقات اور اپنے وطن کی فضا میں کچھ وقت گزارنے کی حسرت ستا رہی تھی۔ وہ اس مبارک سرزمین کی خاک احتراماً اپنے جسم پر ملنے کے لیے تیار تھا جس کی آغوش میں آنحضرت ﷺ ایسی برگزیدہ ہستی نے آنکھیں کھولیں اور جسے اسلام میں سب سے پہلے مقامِ نزولِ وحی

ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ دو ہزار مسلمانوں کے اس قافلے کا ذرا تصور تو کیجئے جو تیز رفتاری سے قدم بڑھائے ہوئے چلا جاتا تھا اور جس کے افراد کے دل خوشی سے بلیوں اُچھل رہے تھے۔ جب منزل مقصود پر پہنچ کر انہوں نے اپنے اونٹوں کو بٹھایا تو وہ مکہ میں اپنے آخری ایام اور عہد طفولیت سے متعلق باتیں کرنے لگے۔ اس دوران میں ان دوستوں اور اس جائیداد وغیرہ کا ذکر بھی چھڑا جو انہوں نے ہجرت کے وقت مکہ میں صرف خدا کی خوشنودی کے لیے چھوڑی تھی۔ یہ عجیب و غریب تاریخی منظر جب نگاہوں کے سامنے آتا ہے تو ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ کس بے پناہی کے ساتھ وہ گھر جسے خدا نے لوگوں کے لیے مرجع و مامن قرار دیا تھا ان لوگوں کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔ چشم بصیرت سے دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا خوشی تھی جس کی بنا پر لوگ ازخود رفتہ اور بے خود ہو رہے تھے۔

قریش کا مکہ سے خروج

قریش کو آپ ﷺ کی اور مسلمانوں کی آمد کا علم ہوا تو وہ قرار داد حدیبیہ کے مطابق مکہ سے باہر آ گئے۔ انہوں نے شہر کے قریب ٹیلوں پر اپنے خیمے نصب کر لیے۔ بعض نے درختوں کے زیر سایہ پناہ لی۔ اہل مکہ نے بوقبیس حرا اور مکہ کے ہر بلند مقام سے کھلی آنکھوں دیکھا کہ کل جس شخص کو انہوں نے مکہ سے دیس نکالا دیا تھا، اپنے رفقاء سمیت مکہ میں داخل ہو رہا ہے اور کوئی مزاحم نہیں ہوتا۔ مسلمان مکہ میں شمال کی جانب سے داخل ہوئے۔ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی اونٹنی کی مہار پکڑے ہوئے تھے اور بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کو چہار طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ باقی پا پیادہ تھے اور شتر سواران کے عقب میں تھے۔ جونہی بیت اللہ پر ان کی نظر پڑی تمام مسلمانوں نے بیک آواز "لبیک اللھم لبیک" کے نعرے بلند کیے۔ انہوں نے اپنے دل و دماغ کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کیا۔ ان کے دل امیدوں اور تمناؤں سے پُر اور اس ہادی ﷺ کے احترام کے جذبے سے بھرپور تھے جس نے انہیں ہدایت ربی اور دین حق سے سرفراز کیا تھا۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ یہ ایک ایسا بے نظیر منظر تھا جس پر تاریخ کو بجا طور پر فخر ہے اور جس نے انتہائی سنگ دل مشرکین اور اسلام کے متعصب ترین دشمنوں کو بھی اسلام کی جانب مائل کر دیا۔ اہل مکہ کی آنکھیں یہ نظارہ دیکھ رہی تھیں اور لبیک لبیک کے نعرے جو زبانوں ہی سے نہیں بلکہ دلوں کی گہرائیوں سے بلند ہو رہے تھے کانوں سے گزر کر دل و دماغ کی خلوت سراؤں میں گونج رہے تھے۔

جب آنحضرت ﷺ مسجد حرام میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے اپنی چادر ایک طرف سے اپنے بائیں کندھے پر ڈال کر اور دوسری طرف سے داہنی بغل کے نیچے سے گزار کر اپنے جسم اقدس پر ڈال لی اور اپنا دایاں بازو باہر نکال کر فرمایا۔ "اے اللہ! اس شخص پر رحم فرما جو آج دشمنوں کو اپنا زور بازو دکھائے۔"

پھر آپ ﷺ نے حجر اسود کے قریب رکن کعبہ کو مس کیا اور سعی فرمائی۔ آپ ﷺ کے ہمراہی بھی

Marfat.com

آپ ﷺ کے ساتھ سعی میں شریک ہوئے۔ جب رکن یمانی کو مس کر چکے تو آپ ﷺ آہستہ آہستہ چلے اور حجرا سود کو چھوا۔ پھر آپ ﷺ نے دوبارہ سعی فرمائی اور تین بار طواف فرمایا لیکن باقی طواف آپ ﷺ نے آہستہ روی سے کیے۔ جب آپ ﷺ سعی فرماتے (دوڑتے) تو دو ہزار مسلمان بھی آپ ﷺ کے ہمراہ دوڑتے جب آپ ﷺ کی رفتار آہستہ ہوتی تو ان کی رفتار بھی مدھم پڑ جاتی۔ قریش یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ اس سے پہلے وہ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کے بارے میں جو گفتگو کیا کرتے تھے اس کا انداز یہ تھا کہ ان کی حالت کچھ اچھی نہیں ہے اور ان کے دن خستہ حالی کے عالم میں گزر رہے ہیں لیکن جب انہوں نے یہ نقشہ دیکھا تو ان کے خیالات کا رخ بدل گیا۔

جوش میں آ کر عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے قریش کو جنگ کا چیلنج دینا چاہا مگر حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں اس سے باز رکھا اور آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا۔ ''اے ابن رواحہ! صبر کرو اور یہ کہو سوا خدا کے کوئی معبود نہیں ہے جس نے اپنے بندے کی مدد کی، لشکر اسلام کی لاج رکھی اور گروہ قریش کو ذلت و خواری کے گڑھے میں دھکیلا۔'' ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ بہ آواز بلند دہرائے اور اس کے بعد تمام مسلمانوں نے ان کا اعادہ کیا۔ اس آواز سے تمام وادی گونج اٹھی اور اردگرد کے پہاڑوں پر جو لوگ قیام پذیر تھے۔ ان کے دل اس آواز کی ہیبت سے لرز اٹھے۔

مکہ میں تین دن

جب مسلمان طواف کعبہ سے فارغ ہوئے تو آنحضرت ﷺ ان کو صفا و مروہ کی جانب لے گئے اور رسوم عرب کے بموجب ان کے مابین سات بار سعی کی۔ بعد ازاں آپ ﷺ نے مروہ کے نزدیک قربانی کے جانوروں کو ذبح کیا اور اپنی حجامت کرائی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے مراسم عمرہ کی روانگی سے فراغت حاصل کی۔ اگلے دن آپ ﷺ کعبے میں داخل ہوئے اور نماز ظہر تک وہاں قیام فرمایا۔ ابھی تک بت کعبہ میں تھے تاہم آنحضرت ﷺ کی اجازت سے بلال حبشی رضی اللہ عنہ کعبہ کی چھت پر چڑھ گئے اور نماز ظہر کے لیے اذان دی۔ اس روز آپ ﷺ نے دو ہزار مسلمانوں کی معیت میں سات سال کے بعد کعبہ میں اسلامی اصول کے مطابق نماز ادا کی۔ قرارداد حدیبیہ کے مطابق مسلمانوں نے مکہ میں تین دن قیام کیا۔ اہل مکہ شہر سے باہر خیمہ گزیں تھے۔ مسلمان جہاں چاہتے جاتے تھے انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔

مہاجرین اپنے اپنے گھروں میں پہنچے اور اپنے انصاری دوستوں کو بھی ہمراہ لے گئے گویا اس پر امن شہر پر انہی کا قبضہ تھا۔ سب کے سب احکام اسلام پر کاربند تھے۔ روزانہ نمازیں ادا کرتے اور اس طرح اپنے نفس کو پامال کرتے تھے۔ ان میں سے جو طاقتور تھے وہ کمزوروں کی دستگیری اپنا فرض سمجھتے تھے۔ دولت مند محتاجوں سے حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی حیثیت ان کے درمیان ایک مہربان اور

مشفق باپ کی سی تھی۔ آپ ﷺ کسی سے خوش طبعی فرماتے اور کسی سے مزاح مگر حقیقت کے خلاف کوئی لفظ آپ ﷺ کی زبان پر نہ آتا تھا۔ قریش اور اہل مکہ اپنے اپنے گھروں کی چھتوں سے یہ تاریخی منظر بغور دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہوں کے سامنے وہ لوگ تھے جن کے اخلاق بلند اور جن کے اطوار شائستہ تھے۔ آنحضرت ﷺ کی صحبت کا یہ فیض تھا کہ وہ نہ بادہ نوشی کی لت میں مبتلا تھے اور نہ کسی مکروہ گناہ کا ارتکاب کرتے تھے۔ خورونوش کی عام مشغولیتوں کے بعد فتنہ وفساد کی آلودگیوں سے ان کا دامن داغدار نہ تھا، کوئی چیز انہیں حق وصداقت کی راہ سے منحرف نہ کرتی تھی۔ وہ کسی قیمت پر بھی احکام الٰہی سے سرتابی نہ کرتے تھے اور انہیں جو حکم دیا جاتا تھا اس کی بجا آوری کے لیے پوری تندہی سے کوشاں رہتے تھے۔ یہ نظارہ جس سے دراصل انسانیت اپنی پوری بلندیوں پر نظر آتی ہے دیکھنے والی آنکھوں پر کیا کچھ نقوش نہ چھوڑتا ہوگا، اس کا اندازہ آسانی سے ہوسکتا ہے اس لیے کہ چند ماہ بعد ہی آنحضرت ﷺ نے دس ہزار مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ اس شہر کو فتح کرلیا۔

اُم المؤمنین میمونہ رضی اللہ عنہا سے عقد

آنحضرت ﷺ کے عم محترم حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی بیوی ام فضل اپنی بہن میمونہ رضی اللہ عنہا کی سرپرست تھیں اور انہیں ان کے بیاہ شادی کے پورے پورے اختیارات تھے۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا رشتے میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی خالہ ہوتی تھیں۔ ام فضل نے اپنی بہن کی شادی کا اختیار اپنے شوہر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو دے دیا تھا۔ جب حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے عمرۂ قضا میں مسلمانوں کا طرزِ عمل دیکھا تو ان کا میلان اسلام کی جانب ہو گیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ان کے قبولِ اسلام سے متعلق اپنے بھتیجے نبی کریم ﷺ سے گفتگو کی اور یہ تجویز پیش کی کہ مناسب یہ ہے کہ آپ ﷺ انہیں اپنے حبالۂ زوجیت میں لے لیں۔ آپ ﷺ نے اس تجویز پر صاد کیا اور چار سو درہم کے مہر پر عقد کرلیا۔

قرار داد حدیبیہ کے مطابق مسلمانوں کے سہ روزہ قیام مکہ کی مدت ختم ہوچکی تھی لیکن آنحضرت ﷺ نے ولیمہ کی تقریب کے سلسلے میں قریش سے کچھ اور مہلت طلب کرنی چاہی۔ سہیل بن عمرو اور حویطب بن عبدالعزیٰ سے، جو قریش کی جانب سے آپ ﷺ کے پاس یہ کہنے کے لیے آئے تھے کہ مدت قیام ختم ہوچکی ہے لہٰذا اب آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء مدینہ واپس چلے جائیں، اس مہلت کے سلسلے میں گفتگو ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''اس میں کیا مضائقہ ہے اگر میں مکہ ہی میں شادی کرلوں اور تمہیں بھی اس ضیافت میں شرکت کا موقع دوں؟'' آپ ﷺ نے یہ بات اس لیے فرمائی تھی کیونکہ آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ عمرہ قضا نے اہل مکہ کے دلوں پر بہت کچھ اثرات چھوڑے ہیں اور ان کی عداوتیں بہت کچھ کم ہوگئی ہیں۔ آپ ﷺ جانتے تھے کہ اگر ان لوگوں نے آپ ﷺ کی ضیافت قبول کرلی اور انہوں نے آپ ﷺ سے گفت وشنید کی

Marfat.com

تو مکہ کے دروازے آپ ﷺ کے لیے کھل جائیں گے۔ سہیل اور حویطب کو بھی اس بات کا خدشہ تھا چنانچہ انہوں نے صاف صاف جواب دیا کہ ہمیں آپ ﷺ کی ضیافت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ آپ ﷺ فی الحال یہاں سے تشریف لے جائیں۔

مدینہ کو واپسی

آپ ﷺ نے قرارداد حدیبیہ کے موجب ان کے مطالبے کو تسلیم کر لیا اور مسلمانوں کو روانگی کا حکم دے دیا۔ چنانچہ آپ ﷺ مسلمانوں کے ہمراہ مکہ سے چل پڑے۔ آپ ﷺ اپنے مولیٰ ابو رافع کو اُم المؤمنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے پاس چھوڑ آئے تھے جو بعد میں اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کو مقام سرف پر لے آئے (یہ موضع مکہ سے قریب ۶ یا ۲ امیل کے فاصلے پر ہے) میمونہ رضی اللہ عنہا آپ کی آخری اہلیہ تھیں، وہ آپ ؐ کے بعد پچاس برس تک زندہ رہیں۔ ان کی وصیت تھی کہ انہیں اسی مقام پر دفن کیا جائے جہاں مقام سرف پر پہلی بار وہ اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کے لقب سے سرفراز ہوئی تھیں۔ آنحضرت ﷺ اُم المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہمراہ ان کی دو بہنوں کو بھی مدینہ لے آئے تھے۔ ایک سلمٰی رضی اللہ عنہا جو آپ ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیوہ تھیں اور دوسری عمارہ رضی اللہ عنہا جو ابھی تک غیر شادی شدہ تھیں۔

مسلمان مدینہ آ پہنچے۔ آنحضرت ﷺ کو یہ یقین تھا کہ عمرہ قضا نے قریش اور باقی تمام اہل مکہ کے دلوں پر گہرا اثر کیا ہے اور جلد ہی اس کا کوئی نتیجہ برآمد ہوگا۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام

دن گزرتے گئے اور واقعات نے یہ ثبوت بہم پہنچا دیا کہ آپ ﷺ کا اندازہ درست تھا۔ آپ ﷺ کو مدینہ پہنچے ہوئے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جو قریش کے مشہور شہسوار تھے اور جنہوں نے غزوۂ احد میں بہادری سے کفار کی حمایت میں جنگ کی تھی اپنے حلقہ احباب میں کہا۔ ''ہر دانشمند شخص پر یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ آنحضرت ﷺ نہ ساحر ہیں نہ شاعر، ان کی باتیں خدا کی باتیں ہیں۔ ہر عقلمند کا فرض ہے کہ وہ ان کی پیروی کرے۔'' عکرمہ بن ابی جہل نے یہ بات سنی تو وحشت زدہ ہو گیا اور اس نے کہا۔ ''اے خالد! تو صابی ہو گیا ہے؟'' خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ ''صابی نہیں بلکہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔'' عکرمہ نے کہا۔ ''قریش میں سے جس شخص کی زبان سے ایسے الفاظ کی توقع نہ تھی وہ تو تھا۔'' خالد رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا۔ ''آخر اس کا سبب؟'' عکرمہ نے کہا۔ ''کیونکہ پیغمبر اسلام ﷺ نے تیرے باپ کو زخمی بھی کیا اور ذلیل و خوار بھی اور جنگ بدر میں تیرا چچا اور اس کا بیٹا مسلمانوں کے ہاتھوں تہ تیغ کیے گئے۔ بخدا اگر تیری جگہ میں ہوتا تو ہرگز اسلام نہ لاتا اور نہ اس قسم کے الفاظ میری زبان سے نکلتے۔ تو نہیں جانتا کہ قریش اس سے جنگ کرنا چاہتے ہیں؟'' خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ ''یہ معاملہ ایام جاہلیت کی عصبیت

Marfat.com

اور حمیت پر مبنی ہے لیکن بخدا اب جبکہ مجھ پر حقیقت آشکار ہو چکی ہے میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔"

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے چند گھوڑے آنحضرت ﷺ کے پاس روانہ کیے اور اپنے قبولِ اسلام کی اطلاع بھی بھیجی۔ جب ابوسفیان کو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے اسلام کی خبر ملی تو اس نے انہیں بلا بھیجا اور پوچھا۔ "تمہارے متعلق جو افواہیں گرم ہیں کیا ان میں کچھ صداقت ہے؟" جب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کہا۔ "ہاں! ہاں! جو کچھ تم نے سنا ہے درست ہے۔" تو ابوسفیان نے غصے میں آ کر کہا۔ "لات و عزیٰ کی قسم! اگر مجھے یہ بات یقین سے معلوم ہو گئی کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو سچ ہے تو میں (حضرت) محمد ﷺ سے قبل تم سے دو دو ہاتھ کروں گا۔" جب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کہا۔ "بخدا! یہ سچ ہے کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ جنہیں یہ پسند نہیں وہ بے شک خفا ہو جائیں۔" اس پر ابوسفیان غصے میں آ کر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر ٹوٹ پڑا مگر عکرمہ نے جو وہاں موجود تھا اسے روکا اور کہا۔ "اے ابوسفیان! ٹھہرو، بخدا مجھے بھی یہی خدشہ ہے جو تمہیں ہے ورنہ میں بھی وہی بات کہتا جو خالد رضی اللہ عنہ نے کہی ہے اور میں بھی اسلام قبول کر لیتا۔ تم خالد رضی اللہ عنہ کو اس عقیدے کی بنا پر جو اس نے اختیار کیا ہے قتل کر دینا چاہتے ہو۔ تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ قریش کے تمام لوگوں کا زاویہ نظر بدل چکا ہے اور وہ بھی کچھ اسی قسم کے خیالات دلوں میں لیے بیٹھے ہیں۔ بخدا مجھے خطرہ ہے کہ ایک سال بھی نہیں گزرنے پائے گا کہ تمام اہل مکہ اسی عقیدے کے پیرو ہو جائیں گے۔" اس قصے کے بعد خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مکہ سے چل کر مدینہ آ گئے اور مسلمانوں کی جماعت میں آ شامل ہوئے۔

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کا اسلام

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بعد عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور کعبے کے پاسبان عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ بھی اسلام لے آئے۔ ان کے قبولِ اسلام سے بہت سے اہل مکہ حلقہ اسلام میں داخل ہوئے جس سے اسلام کی قوت اور اس کے شکوہ میں چند در چند اضافہ ہو گیا۔ ان حالات کی روشنی میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ عنقریب وہ وقت آ رہا ہے جب مکہ کے دروازے ہمیشہ کے لیے مسلمانوں پر کھل جائیں گے۔

❁

باب 21

غزوۂ موتہ وغزوۂ سلاسل اور دیگر غزوات اور سرایا

آنحضرت ﷺ کو مکہ فتح کرنے کی عجلت بھی نہ تھی۔ آپ ﷺ پر واضح ہو چکا تھا کہ اس معاملہ میں خود زمانہ آپ کی مساعدت کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں صلح حدیبیہ کو پورا ایک سال ہو جانے کے باوجود نہ تو مسلمانوں کی طرف سے کوئی ناگوار حادثہ وقوع میں آیا، نہ رسول اللہ ﷺ کے انداز سے یہ مترشح ہو سکا، اور کیسے ہو سکتا تھا؟ آنحضرت ﷺ اپنی ذات سے اس قدر پابند وفا تھے کہ قول یا عمل دونوں میں کسی ایک سے بھی وعدہ کے خلاف عمل نہ فرماتے۔ عمرۃ القضا سے واپسی پر کئی مہینے گزر گئے۔ اس دوران کئی چھوٹی جھڑپیں ہوئیں جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

آپ ﷺ نے قبیلہ بنی سلیم کی طرف پچاس اشخاص کو دعوتِ اسلام کی غرض سے بھیجا لیکن بنی سلیم نے ان سے خیانت کر کے انہیں بے قصور مار ڈالا۔ صرف ان کا سردار محض اتفاقیہ طور پر بچ رہا۔ علاوہ بریں آپ ﷺ نے ایک جماعت بنی لیث کے مقابلے میں بھیجی۔ انہوں نے بنی لیث پر فتح حاصل کی اور مالِ غنیمت لے کر واپس آئے۔ اسی طرح بنی مرہ کو ان کی گزشتہ خیانت کی سزا دینے کے لیے ایک جماعت روانہ کی۔ آپ ﷺ نے پندرہ آدمیوں کو حدودِ شام میں مقام ذات طلح کی طرف بھی بھیجا تاکہ وہ انہیں اسلام کی دعوت دیں لیکن انہوں نے بھی ان کے رئیس کے سوا سب کو قتل کر دیا۔

جب آپ ﷺ قرار دادِ حدیبیہ اور والیٔ یمن کے قبولِ اسلام کے سبب جنوب کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے تو آپ ﷺ نے اپنی توجہات شام اور عرب کے شمالی علاقوں پر مبذول کر دی تھیں کیونکہ دعوتِ اسلام کے حدودِ عرب سے باہر نکلنے میں آپ ﷺ کو اشاعت اسلام کے آثار نظر آ رہے تھے اور آپ ﷺ شام اور اس کے قریبی علاقے کو اپنی دعوت کا اولین مرکز بنانا چاہتے تھے اس لیے عمرہ قضا سے واپسی پر آپ ﷺ نے تین مہینے بھی مدینہ میں قیام نہ فرمایا تھا کہ آپ ﷺ نے جنگ موتہ کے لیے تین ہزار کا لشکر روانہ کیا جنہوں نے ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ اور دوسری روایت کے مطابق دو لاکھ رومیوں کا مقابلہ کیا۔

غزوۂ موتہ

غزوۂ موتہ کے اسباب مختلف بیان کیے جاتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ مقام ذات طلح میں

Marfat.com

آپ ﷺ کے جو اصحاب مارے گئے تھے، اس سلسلے میں اس جنگ سے خیانت کاروں کی سرکوبی مقصود تھی۔ بعض کا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے بصریٰ کے فرمانروا کی طرف جو ہرقل کی جانب سے وہاں کا حاکم تھا اپنا ایک قاصد بھیجا تھا اور غسان کے ایک اعرابی نے اس قاصد کو ہرقل کی آڑ لے کر قتل کر ڈالا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر آنحضرت ﷺ نے اس فرمانروا اور اس کے حامیوں کی سرکوبی کے لیے مجاہدین اسلام کا ایک لشکر روانہ کیا۔

جس طرح قرار دادِ حدیبیہ عمرہ قضا اور اس کے بعد فتح مکہ کا پیش خیمہ تھی اسی طرح غزوۂ موتہ، غزوۂ تبوک اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد فتح شام کا مقدمہ تھی۔ غزوۂ موتہ کا سبب خواہ آپ ﷺ کے اس قاصد کا قتل ہو جسے حاکم بصرہ کی طرف بھیجا گیا تھا اور خواہ آپ ﷺ کے پندرہ آدمیوں کی ہلاکت بہر حال آپ ﷺ نے جمادی الاولیٰ ۸ ھ میں اپنے بہترین آدمیوں میں سے تین ہزار اشخاص کو اس کام کے لئے آمادہ کیا اور ان پر زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار مقرر فرما کر ارشاد کیا کہ اگر زید رضی اللہ عنہ شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو علم سونپ دیا جائے۔ اگر جعفر رضی اللہ عنہ بھی شہادت پائیں تو پھر عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو سالاری کا منصب سونپا جائے۔ جب یہ لشکر روانہ ہوا تو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنی مرضی سے اس لشکر میں شامل ہوئے تا کہ میدان جنگ میں اپنی بہادری کے جوہر دکھا کر اپنی راسخ العقیدگی کا عملی ثبوت پیش کریں۔ یہ لشکر بڑے اہتمام سے روانہ کیا گیا خود آنحضرت ﷺ مدینہ کے باہر تک اسے رخصت کرنے کے لئے تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے لشکر اسلام کو یہ وصیت کی کہ عورتوں، بچوں اور اندھوں کو قتل نہ کریں، عمارتوں کو نہ گرائیں اور درختوں کو نہ کاٹیں۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر ان الفاظ میں لشکر کے لئے دعا فرمائی۔

''اللہ تمہارا ساتھ دے، تمہارے مصائب دور کرے اور سلامتی کے ساتھ تمھیں واپس لائے!''

اس موقع پر امرائے لشکر یہ سوچ رہے تھے کہ جیسے پہلی جنگوں میں آنحضرت ﷺ کی عادت تھی اور ان کا معمول تھا، عنقریب وہ اہل شام کو اچانک پہنچ کر گرفتار کر لیں گے اور جلد ہی فتح یابی کے بعد مالِ غنیمت اور بہت کچھ اثاثہ جلد از جلد حاصل کر کے واپس آ جائیں گے۔ آخر چلتے چلتے یہ لشکر معان کے مقام پر پہنچ گیا جو شام میں واقع تھا۔

مگر رومیوں کو مسلمانوں کی نقل و حرکت کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ شام پر ہرقل کی جانب سے شرجیل کی حکومت تھی۔ اس نے اطراف و جوانب کے قبائل کو جمع کر لیا اور ہرقل کے پاس پیغام بھیجا جس نے یونانیوں اور عربوں کے چند فوجی دستے امداد کے لیے روانہ کیے بعض روایات کے مطابق ہرقل خود لشکر لے کر میدان میں آیا اور اس نے ایک لاکھ رومی فوجیوں کی معیت میں سرزمین بلقا کے علاقہ مآب میں پڑاؤ ڈالا۔

Marfat.com

مختلف قبائل بنی لخم، جذام، قین، بہراء اور بلی وغیرہ سے ایک لاکھ مزید فوجی اس سے آملے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہرقل بذات خود لشکر کے ہمراہ نہ آیا تھا بلکہ اس کا قائم مقام تھیوڈور لشکر کا سربراہ تھا۔ مسلمان ابھی معان کے مقام ہی پر تھے کہ انہیں دشمن کی ٹڈی دل فوجوں کے اجتماع کا پتا چل گیا۔ وہ وہاں دو راتیں ٹھہرے اور یہی سوچتے رہے کہ اس کثیر التعداد لشکر کے مقابلے میں ہم پر کیا بنے گی۔ لشکر اسلام میں سے کسی نے کہا کہ ہم آنحضرت ﷺ کو بذریعہ تحریر دشمن کی کثرتِ تعداد کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں، وہ یا تو مزید کمک بھیج کر ہماری مدد کریں گے یا ہمیں حکم دیں گے جس کے مطابق ہم عمل پیرا ہوں۔ قریب تھا کہ اس رائے سے سب متفق ہو جائیں لیکن عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے جو ایک بہادر جنگجو ہونے کے علاوہ نغز گفتار شاعر بھی تھے۔ سب سے مخاطب ہو کر یہ کہا:

> ''دوستو! جس چیز سے تم بچ رہے ہو بخدا یہی تو ہے جس کی تلاش تمہیں یہاں تک لے آئی ہے یعنی شہادت! ہم دشمنوں سے سامان جنگ یا طاقت یا کثرت تعداد کی بنا پر جنگ آزما نہیں ہوتے بلکہ ہم تو صرف اس دین کے اعتماد پر جنگ کرتے ہیں جو خدا نے ہمیں عطا کیا ہے اس لیے بہتر ہے کہ دشمن سے ڈٹ کر مقابلہ کرو کیونکہ دو فائدوں میں سے ایک فائدہ تو ضرور حاصل ہوگا، غلبہ یا شہادت!''

اس بہادر شاعر کا جذبہ جمعیت تمام لشکر پر اثر انداز ہوا اور سب بیک آواز بول اٹھے۔ بخدا! ابن رواحہ رضی اللہ عنہ سچ کہہ رہا ہے چنانچہ انہوں نے کوچ بول دیا۔ جب وہ سرزمین بلقا میں پہنچے تو ایک بستی کے قریب جس کا نام مشارف تھا انہیں ہرقل کی فوجیں ملیں۔ جب دشمن قریب آیا تو مسلمان موتہ کی بستی میں جمع ہو گئے کیونکہ وہاں مشارف کی نسبت وہ زیادہ حفاظت سے رہ سکتے تھے۔ موتہ کے مقام پر ہرقل کی ایک لاکھ یا دو لاکھ کی فوج اور مسلمانوں کی تین ہزار فوج کے درمیان گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔

زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی شہادت

ایمان کے جذبہ بے پناہ کا شکوہ اور اس کی قوت کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ علم نبوی ﷺ ہاتھ میں لے کر میدان جنگ میں پوری جوانمردی سے کود پڑے۔ انہیں یقین تھا کہ موت سے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں لیکن اس موقع پر جو موت آئے گی وہ موت نہیں بلکہ شہادت فی سبیل اللہ ہے اور شہادت کی حیثیت بھی فتح و نصرت سے کم نہیں۔ زید رضی اللہ عنہ اپنی جان ہتھیلی پر لیے ہوئے شہ زوری سے لڑتے رہے یہاں تک کہ دشمن کے نیزوں نے ان کا جسم چھلنی چھلنی کر دیا۔ ان کی شہادت کے بعد جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھوں میں علم سنبھالا۔ ان کی عمر اس وقت ۳۳ سال کی تھی۔ وہ جتنے حسین و جمیل تھے اتنے ہی دلیر و بہادر بھی تھے۔

جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت

جعفر طیار رضی اللہ عنہ پرچم اٹھائے ہوئے مصروف جنگ رہے۔ آخر رومیوں نے ان کے گھوڑے کو گھیرے میں لے لیا۔ آپ نے جوش وخروش میں نیچے اتر کر گھوڑے کے پاؤں کاٹ ڈالے اور خود تیر کی طرح خم ٹھونک کر سیدھے کھڑے ہو گئے اور دشمنوں کے قلب میں گھس کر ان کے سروں پر تلوار چلانے لگے۔ پرچم جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ جب یہ ہاتھ کٹ گیا تو آپ نے بائیں ہاتھ میں پرچم سنبھال لیا، یہ ہاتھ بھی کٹ گیا تو علم دونوں بازوؤں سے تھامے رکھا حتیٰ کہ آپ نے زخموں سے چور ہو کر شہادت پائی۔ کہتے ہیں کہ دشمنوں نے ان کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔

ابن رواحہ رضی اللہ عنہ کی شہادت

جب جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے بھی شہادت پائی تو پرچم ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے سنبھالا اور گھوڑے پر سوار ہو کر آگے بڑھے۔ شروع شروع میں انہیں قدرے تردد ہوا اور ان کے بلند حوصلے میں کچھ پستی سی آنے لگی مگر انہوں نے جلد اپنے آپ کو سنبھالا:

اَقْسَمْتُ یَا نَفْسُ لَتَنْزِلَنَّهْ   لَتَنْزِلِنَّ اَوْ لَتُكْرَهِنَّهْ

اِنْ اَجْلَبَ النَّاسُ وشدُّوا الرَّنَّةْ   مَالِيْ اَرَاكِ تَكْرَهِيْنَ الْجَنَّةْ

اے نفس! میں قسم کھاتا ہوں کہ تجھے ضرور مقابلے میں آنا پڑے گا۔ تو خود ہی مقابلے کے لیے میدان میں اُتر ورنہ تجھے اس پر مجبور ہونا پڑے گا۔ اگر لوگ روتے اور چیختے چلاتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ تو جنت کو ناپسند کرتا ہے۔

یہ اشعار پڑھنے کے بعد آپ تلوار لے کر آگے بڑھے اور لڑتے رہے حتیٰ کہ آپ نے جام شہادت نوش کیا۔

زید رضی اللہ عنہ جعفر رضی اللہ عنہ اور ابن رواحہ رضی اللہ عنہ تینوں ایک ہی جنگ میں شہید ہوئے۔ جب آنحضرت ﷺ کو اس امر کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ کو بہت ملال ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں نے عالم رویا میں دیکھا کہ وہ زریں تختوں پر بہشت میں مقیم ہیں لیکن عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کا تخت اس کے باقی دونوں رفیقوں کی نسبت کچھ کج تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ اس کا کیا سبب ہے تو مجھے جواب ملا کہ جعفر رضی اللہ عنہ وزید رضی اللہ عنہ بلا خوف وخطر دشمن کے مقابلے کے لیے میدان میں نکلے تھے لیکن عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کسی قدر تردد کے بعد نبرد آزما ہوئے تھے۔ اس میں درس عبرت بھی ہے اور ایک نصیحت بھی جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مومن کے لیے تردد یا خدا کے راستے میں موت کا خوف ہرگز زیبا نہیں بلکہ جب وہ کسی ایسے کام کے لیے پیش قدمی کرے جو خدا کی رضا اور اس کی خوشنودی کے لیے ہو تو اسے جان ہتھیلی پر رکھ کر مخالف کا سامنا کرنا چاہیے۔ اگر اسے فتح

Marfat.com

کامرانی نصیب ہو تو جیسا کہ عقیدہ ہے اس نے خدا اور اپنے وطن کا حق ادا کر دیا اور اگر اس نے شہادت پائی تو وہ پیچھے رہ جانے والوں کے لیے ایک مثال قائم کرے گا اور اس کا ذکر ان لوگوں میں باقی رہے گا جو یہ جانتے ہیں کہ زندگی کی محبت اتنی ہی ہوتی ہے جتنی کہ نیک نامی اور ذکر خیر کے حصول کے لیے قربانی کا اجر۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ ذلت سے اپنے بچاؤ کی فکر کرنا موت کے مترادف ہے اور ایسا شخص اس قابل ہی نہیں کہ اسے زندوں میں شمار کیا جائے جو شخص کسی مبتذل مقصد کے لیے اپنی جان قربان کر دیتا ہے وہ خود اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھے میں ڈالتا ہے۔ ایسا شخص اپنی زندگی کو پردوں میں مخفی رکھنا چاہتا ہے اور موت سے اس درجہ خوف زدہ رہتا ہے کہ دراصل اس کا خوف بھی موت سے بدتر ہے۔ جب ابن رواحہ رضی اللہ عنہ کا تھوڑا سا تذبذب باجود اس کے کہ وہ لڑے بھی اور شہید بھی ہوئے انہیں زید رضی اللہ عنہ اور جعفر رضی اللہ عنہ کے رتبے تک نہیں پہنچنے دیتا تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو جاہ وجلال، مال و دولت یا اور کسی دنیاوی غرض سے خدا کی راہ سے پیٹھ پھیر لیتے ہیں؟

ایسے لوگوں کی حیثیت زمین میں رینگنے والے کیڑے مکوڑوں کی سی ہے خواہ عوام کی نظر میں ان کا مقام کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو خواہ دولت مندی کے لحاظ سے وہ قارون سے بھی دو چار قدم آگے ہوں۔ کیا کسی شخص کے لیے اس سے زیادہ بھی کوئی مقام مسرت ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے کام کی انجام دہی کے لیے میدان میں نکل آئے جس کے حق بجانب ہونے میں اسے مطلق کوئی شبہ نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس راہ میں دو ہی مقام حاصل ہوتے ہیں۔ شہادت یا احیائے دین کے لیے مسلسل اور ابد قرار جدوجہد کا جذبہ۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری

ابن رواحہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ثابت بن ارقم رضی اللہ عنہ نے پرچم سنبھالا۔ یہ پرجوش مجاہد بنی عجلان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے مجاہدین اسلام سے کہا بہتر یہ ہے کہ اپنے میں سے کسی ایک کو سپہ سالار منتخب کر لو۔ لوگوں کے یہ کہنے پر کہ سپہ سالاری کی باگ ڈور آپ ہی سنبھال لیجئے انہوں نے کہا میں اپنے اندر قیادت کی اہلیت نہیں پاتا ہوں۔ چنانچہ سب نے بالاتفاق خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری پر اپنی رضا مندی کا اظہار کیا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ لشکر اسلام میں انتشار پایا جاتا ہے اور ان کی روحانی قوت قریب قریب جواب دے گئی ہے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے پرچم سنبھال لیا۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ایک جنگ آزمودہ اور تجربہ کار سپہ سالار تھے۔ انہیں لشکر کو جوش میں لانے کا ڈھب بھی آتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس نازک موقع پر اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لیا اور صفوں کی ترتیب نو کے بعد دیر تک دشمن کا دلیری سے مقابلہ کرتے رہے حتیٰ کہ رات ہو گئی اور دونوں فوجوں نے صبح تک کے لیے جنگ موقوف کر دی۔ اس وقفے میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حالات کا قرار واقعی جائزہ لینے کے بعد اپنی فوج کے بہت سے آدمیوں کو فوج سے ذرا فاصلے پر علیحدہ ایک طویل قطار میں کھڑا کر دیا۔ سپیدۂ صبح نمودار ہوا تو قطار میں کھڑے ہوئے لوگوں نے شور برپا کر دیا جس

Marfat.com

سے مخالفین نے یہ خیال کیا کہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے مزید امدادی فوج آ گئی ہے۔ رومیوں نے سوچا کہ پہلے دن مسلمانوں کی تین ہزار فوج نے جب ہمارا یہ حال کیا کہ ہمارے بہت سے آدمیوں کا کام تمام کر دیا تو اب جبکہ امدادی فوج آ گئی ہے اور جس کی تعداد بھی معلوم نہیں تو نہ معلوم ہم پر کیا گزرے۔ اس خیال سے رومیوں نے لشکر اسلام پر حملہ نہ کیا اور جب انہوں نے دیکھا کہ خالدؓ بن ولید نے بھی حملہ نہیں کیا تو انہیں بہت خوشی ہوئی اور یہ دیکھ کر انہیں مزید اطمینان ہوا کہ خالدؓ بن ولید اور ان کے ساتھی مدینہ کو واپس جا رہے ہیں اگرچہ اس معرکے میں لشکر اسلام کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تاہم یہ بات بھی اپنی جگہ کامیابی ہے کہ مخالفین بھی انہیں شکست نہ دے سکے۔

جب خالدؓ بن ولید اور ان کی فوج مدینہ پہنچی تو آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں نے ان سے ملاقات کی۔ آپ نے عبداللہؓ بن جعفر کو بلایا اور ان سے بغل گیر ہوئے۔ لوگوں نے فوج کی طرف مٹی کی مٹھیاں بھر بھر کر پھینکیں اور کہا۔ "اے بھگوڑو! تم نے میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کی۔" لیکن نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "یہ بھگوڑے نہیں بلکہ ان شاء اللہ یہ پھر حملہ آور ہوں گے۔"

اگرچہ آپ ﷺ نے موتہ سے واپس آنے والی فوج کو تسلی دلا سا دیا تھا تاہم مسلمان پھر بھی یہ خیال کرتے تھے کہ اس فوج نے ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کیا ہے حتیٰ کہ مسلمہؓ بن ہشام مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز بھی نہ پڑھتے تھے کیونکہ انہیں یہ ڈر تھا کہ جو شخص انہیں دیکھے گا پھر ان سے کہے گا اے بھگوڑو! تم نے جہاد سے راہ فرار اختیار کی۔ بعدازاں جنگ موتہ کے یہ مجاہد اور خصوصیت سے خالدؓ بن ولید اگر بہادری کے جوہر نہ دکھاتے تو جنگ موتہ سے گریز و فرار کا داغ بدنامی ہمیشہ ان کی پیشانی پر رہتا اور ان کی بزدلی ضرب المثل بن جاتی۔

شہداء کے ورثا کی تعزیت

جب آپ ﷺ کو زیدؓ اور جعفرؓ کی شہادت کا علم ہوا تو آپ ﷺ کو دلی قلق ہوا۔ آپ ﷺ تعزیت کے لیے ان کے گھروں میں تشریف لے گئے۔ جعفر طیارؓ کی بیوی اسمائؓ بنت عمیس نے آٹا گوندھ رکھا تھا اور اپنے بیٹوں کو نہلا دھلا کر صاف ستھرے کپڑے پہنا رکھے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ جعفرؓ کے بیٹوں کو میرے پاس لاؤ۔ جب یہ بچے آپ ﷺ کے سامنے آئے تو آپ ﷺ نے ان کے سروں پر دست شفقت پھیرا اور آپ ﷺ کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ اسمائؓ بنت عمیس یہ دیکھ کر غمگین ہوئیں اور عرض کرنے لگیں۔ یا رسول اللہؐ! میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں، بھلا آپ ﷺ کیوں آنسو بہاتے ہیں؟ کیا آپ ﷺ کو جعفرؓ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں کوئی اطلاع ملی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ہاں! انہوں نے شہادت پائی ہے۔ یہ فرما کر آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ

Marfat.com

گئی۔ اسمائؓ کی چیخیں نکل گئیں اور بہت سی عورتیں وہاں جمع ہو گئیں۔ آپ ﷺ وہاں سے تشریف لے آئے۔ آپ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے فرمایا۔ آل جعفرؓ کے خورونوش کا بندوبست کرو کیونکہ وہ اپنے سرپرست کی دائمی جدائی کے غم میں ہیں۔ آپ ﷺ نے اپنے مولیٰ زیدؓ کی بیٹی کو آتے ہوئے دیکھا تو آپ ﷺ نے اس کے شانے پر ازراہِ ہمدردی تھپکی دی اور آپ ﷺ کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ بعض لوگ شہدائے موتہ پر آپ ﷺ کی اشک افشانی سے حیرت زدہ تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا۔ اس میں حیرت کی آخر کون سی بات ہے؟ یہ تو صرف ایک دوست کے آنسو ہیں جو کسی دوست کی جدائی میں بہائے جاتے ہیں۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جعفر رضی اللہ عنہ کی لاش مدینہ لائی گئی اور خالد رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر کی آمد سے تین روز بعد سپردِ خاک کی گئی۔ اس روز آپ ﷺ نے یہ حکم دیا کہ آئندہ جعفر رضی اللہ عنہ پر رونے دھونے سے باز رہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو کٹے ہوئے ہاتھوں کے عوض دو پر عطا کر دیے ہیں جن کے سہارے وہ جنت میں اڑتے پھرتے ہیں۔ جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے لقب کا سبب یہی واقعہ ہے۔

غزوہ ذات السلاسل

موتہ سے واپسی کے چند ہفتے بعد آپ ﷺ نے عرب کے شمالی علاقے میں مسلمانوں کی شوکت کا سکہ بٹھانا چاہا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو وہاں بھیجا تا کہ وہ قبائل عرب کو شام کی طرف ہجرت کر جانے پر آمادہ کریں۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی ایک رشتے کی والدہ انہی قبائل میں سے تھیں اس لیے ان کے لیے ان قبائل کو آمادۂ ہجرت کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ جب عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جذام کے علاقے میں سلسل نام کے ایک چشمے پر پہنچے تو انہوں نے حالات سے مرعوب ہو کر آنحضرت ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ ہمارے لیے ایک امدادی فوج اور بھیج دی جائے۔

آنحضرت ﷺ نے مہاجرین سابقین کی ایک جماعت ان کی مدد کے لیے روانہ کی۔ اس جماعت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ ایسے جلیل القدر صحابی بھی شامل تھے۔ یہ جماعت حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں روانہ ہوئی۔ آنحضرت ﷺ کو یہ اندیشہ تھا کہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جو تازہ تازہ ایمان لائے ہیں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے قطع نظر اس کے کہ وہ مہاجرین اولین میں سے ہیں، اختلاف کریں گے اس لیے آپ ﷺ نے روانگی کے وقت ہی فرما دیا تھا کہ اختلاف نہ کرنا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ عمرو رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے کہا۔ آپ ہماری امداد کے لئے آئے ہیں، اصل میں سپہ سالار میں ہی ہوں۔ انہوں نے جواب میں کہا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا اختلاف نہ کرنا، اگر تم میری اطاعت نہ کرو گے تو میں تمہاری اطاعت کرنے کو تیار ہوں۔ عمرو رضی اللہ عنہ نے با جماعت نماز کی امامت کے فرائض انجام دیے اور اس سے

فراغت کے بعد لشکر لے کر آگے بڑھے۔ انہوں نے اہل شام کو جوان سے مقابلے کے لیے آمادہ تھے منتشر کر دیا اور اس طرح ان اطراف میں مسلمانوں کی ہیبت کا سکہ بیٹھ گیا۔

اس دوران آنحضرت ﷺ مکہ اور اہل مکہ کے معاملے پر غور فرما رہے تھے لیکن جیسا کہ ہم اوپر تحریر کر آئے ہیں آپ ﷺ کو معاہدہ حدیبیہ کے اختتام کا انتظار تھا یعنی آپ ﷺ دو سال کی مدت پوری کرنا چاہتے تھے۔ اس عرصے میں آپ ﷺ گاہے گاہے ان قبائل کی سرکوبی کے لیے جو مقابلے کے لئے سر اٹھاتے تھے، چھوٹے چھوٹے فوجی دستے روانہ کرتے رہے لیکن ان مہمات میں آپ ﷺ کو زیادہ مشکلات پیش نہ آئیں کیونکہ مختلف اطراف سے وفود آنے شروع ہو گئے تھے اور یہ وفود اپنے اپنے قبائل کی جانب سے اطاعت کا اظہار کرتے تھے۔ ان حالات میں ایک حادثہ رونما ہوا جو فتح مکہ کا پیش خیمہ تھا جس کی بنا پر اسلام نے وہاں اپنی بنیادیں اتنی مستحکم کر لیں کہ وہ شہر ابدالآباد تک کے لیے مقدس ترین مقام ہو گیا۔

❋

Marfat.com

باب 22

فتح مبین و تطہیر کعبہ

غزوۂ موتہ کے بعد خالد بن ولید ؓ کی سرکردگی میں لشکر اسلام اس حال میں مدینے واپس آ پہنچا تھا کہ اسے نہ فتح ہوئی نہ شکست، مجاہدین غزوۂ موتہ اپنی جگہ مطمئن تھے کہ وہ سلامت لوٹ آئے ہیں۔ زید بن حارثہ ؓ، جعفر ؓ اور عبداللہ بن رواحہ ؓ کی شہادت کے بعد ان کی واپسی سے رومیوں، مسلمانانِ مدینہ اور قریش مکہ پر مختلف قسم کے اثرات طاری ہوئے۔ رومی تو اس بات سے خوش تھے اور خدا کے شکرگزار تھے کہ مسلمان ان سے فیصلہ کن جنگ کیے بغیر لوٹ گئے اور جنگ نے طول نہ کھینچا حالانکہ ایک روایت کے مطابق رومیوں کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ اور دوسری روایت کے مطابق دو لاکھ تھی جن کے مقابلے میں مسلمان صرف تین ہزار کی تعداد میں تھے۔ ہوسکتا ہے کہ رومی جنگ بندی سے اس دلیرانہ حملے کے سبب مطمئن ہوں جو خالد بن ولید ؓ نے سپہ سالار ہوتے ہی پہلے دن ان پر کیا تھا اور جس حملے میں سیف اللہ ؓ کے ہاتھ میں لڑتے لڑتے نو تلواریں ٹوٹی تھیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگلے دن لشکر اسلام کی باقاعدہ ترتیب اور کچھ فاصلے پر مجاہدین کی قطار بندی اور ہنگامہ خیزی سے رومیوں پر لشکر اسلام کی دھاک بیٹھ گئی ہو اور وہ سمجھے ہوں کہ مدینہ میں اس لشکر کی امداد کے لیے مزید تازہ دم فوج آ گئی ہے بہرحال شام میں بسنے والے عرب قبائل اس جنگ میں مسلمانوں کے بہادرانہ کارناموں پر حیران و ششدر رہتے تھے۔

چنانچہ ان کا ایک سردار فروہ بن عمرو جذامی جو رومیوں کی فوج کے ایک دستے کا سالار تھا، اسلام لے آیا جسے ہرقل کے حکم سے خیانت کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ ہرقل اس شرط پر اسے رہا کرنے اور پہلے منصب پر فائز کرنے کے لیے تیار تھا کہ وہ دوبارہ عیسائیت قبول کر لے لیکن فروہ ؓ نے یہ شرط پوری نہ کی اور اسلام پر قائم رہا۔ اس جرم میں اسے شہید کر دیا گیا۔ اسی طرح نجد کے ان قبائل میں جو عراق اور شام سے متصل علاقوں میں مقیم تھے، اسلام کی اشاعت وسیع پیمانے پر ہوئی حالانکہ وہاں رومیوں کا اثر و اقتدار تھا۔

مشرقی روم کی سیاسی بدنظمی کو بھی اشاعت اسلام کی توسیع میں بہت کچھ دخل ہے۔ رومی سلطنت کی بدعنوانیوں کا یہ عالم تھا کہ ہرقل کے ایک عامل نے جس کے سپرد لشکر کی رسد کا انتظام تھا، شام کے عربوں کو جنہوں نے رومیوں کی حمایت میں جنگ میں حصہ لیا تھا بری طرح للکارا اور صاف لفظوں میں یہ کہا:

Marfat.com

"شہنشاہ بڑی دقت سے اپنے لشکر کے روزینے مہیا کرتا ہے اس کے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ وہ اپنے کتوں کو بھی کچھ دے۔"

ان حالات میں یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں کہ یہ عرب شہنشاہ اور اس کی فوج سے الگ ہو گئے اور نئے مذہب نے انہیں اس بلند حقیقت سے آشنا کر دیا جس کی بشارت وہ لوگوں کو دیتا تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر اس قلیل مدت میں بنو سلیم کے سردار عباس بن مرداس کی پیشوائی میں بنی سلیم کے علاوہ بنی اشجع اور بنی غطفان جو خیبر میں یہودیوں کی شکست سے قبل ان کے ہم عہد تھے نیز بنی عبس، بنی ذبیان اور بنی فزارہ میں سے ہزار ہا لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ گویا غزوۂ موتہ مدینہ کے شمال میں حدود شام تک مسلمانوں کا اثر و وقار قائم کرنے اور اسلام کی عزت و قوت میں اضافے کا سبب بن گیا۔

مدینہ میں رہنے والے مسلمانوں پر غزوۂ موتہ کا کچھ اور ہی اثر ہوا۔ جب انہوں نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو رومی فوج پر فتح حاصل کیے بغیر لوٹتے دیکھا تو فوراً پکار اٹھے۔

"اے بھگوڑو! تم جہاد سے بھاگ آئے ہو۔"

لشکر اسلام میں جو اکابر شریک ہوئے تھے ان کا یہ حال تھا کہ وہ خانہ نشین ہو گئے تھے تا کہ مسلمانوں کے بچے اور نوجوان ان پر گریز و فرار کی تہمت نہ باندھیں۔

غزوۂ موتہ کا قریش پر یہ اثر ہوا کہ انہوں نے یہ سوچا کہ مسلمانوں کو رومیوں کے مقابلے میں شکست ہوئی اور ان کی ہیبت بھی ختم ہو گئی ہے اب کوئی شخص نہ ان پر اعتماد کرے گا اور نہ ان سے عہد و پیمان کو وزن دے گا لہٰذا معاہدہ حدیبیہ ٹوٹنا چاہیے۔ وہی حالات رہنے چاہئیں جو پہلے تھے قریش کو مسلمانوں اور ان کے ہم عہد قبائل کے خلاف جنگ آزما ہونا چاہیے اور ہرگز اس بات کا خوف نہیں ہونا چاہیے کہ پیغمبر اسلام قصاص کے لیے تیار ہوں گے۔

معاہدہ حدیبیہ کی تنسیخ

معاہدہ حدیبیہ کے مطابق یہ چیز طے پائی تھی کہ جو شخص نبی کریم ﷺ سے عہد و پیمان کرنا چاہے اسے آزادی ہے اور جو شخص قریش سے قول و قرار کرنا چاہیے اسے بھی اختیار ہو گا۔ چنانچہ اس معاہدے کے مطابق بنی خزاعہ نے پیغمبر علیہ السلام سے اور بنی بکر نے قریش سے دوستی کا معاہدہ کر لیا تھا۔ بنی خزاعہ اور بنی بکر میں دیرینہ عداوت چلی آتی تھی لیکن قرارداد حدیبیہ کے بعد جب سے دونوں قبیلوں میں سے ہر ایک نے فریقین میں سے علیحدہ علیحدہ ایک فریق سے عہد کر لیا تھا اس وقت سے ان کی پرانی عداوت کی بساط الٹ چکی تھی۔ جب غزوۂ موتہ پیش آیا تو قریش کو یہ گمان ہو گیا کہ مسلمانوں کا پہلا سا وقار قائم نہیں رہا ہے لہٰذا بنی بکر کی ایک شاخ بنی دیل نے یہ خیال کیا کہ اب انہیں بنی خزاعہ سے انتقام لینا چاہیے۔ علاوہ بریں اس امر پر انہیں قریش کے کچھ

Marfat.com

لوگوں نے بھی آمادہ کیا جن میں عکرمہ بن ابی جہل کے علاوہ بعض سردارانِ قریش بھی شامل تھے۔ انہوں نے بنی بکر کو اسلحہ بھی بہم پہنچایا چنانچہ ایک رات جب بنی خزاعہ اپنے ایک چشمہ وتیر نامی پر آرام کر رہے تھے بنی بکر ناگہاں ان پر ٹوٹ پڑے اور ان کے بعض آدمیوں کو تہ تیغ کر دیا۔

بنی خزاعہ مکہ کی طرف بھاگ آئے اور بدیل بن ورقا کے گھر میں پناہ لی اور اس کے پاس اس بات کی شکایت کی کہ قریش اور بنی بکر نے پیغمبر علیہ السلام سے جو معاہدہ کیا تھا اسے توڑ ڈالا ہے۔ عمرو بن سالم خزاعی بہ عجلت تمام مدینہ منورہ میں پیغمبر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ اس وقت لوگوں کے ہمراہ مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ عمرو بن سالم خزاعی نے تمام سرگزشت سنا کر آپ ﷺ سے امداد کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اے عمرو! ہم تمہاری مدد ضرور کریں گے۔ بعدازاں بدیل بن ورقا بنی خزاعہ کے چند آدمیوں کے ہمراہ مدینہ آئے اور اپنی سرگزشت سنائی اور عرض کیا کہ قریش نے ہمارے خلاف بنی بکر کو امداد دی ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے یہ خیال کیا کہ قریش کی اس عہد شکنی کا بدلہ یہی ہے کہ مکہ کو فتح کیا جائے جس کے لیے ضروری ہے کہ عرب کے مختلف اطراف میں رہنے والے مسلمانوں کو تیار رہنے کا پیغام بھیجا جائے مگر انہیں اس سے آگاہ نہ ہونے دیا جائے کہ کس طرف حملہ کرنا مقصود ہے۔

قریش کو خوف و ہراس

قریش کے مدبر اور دانشمند لوگوں کو جلد ہی اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ عکرمہ اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں خطرے میں ڈال دیا ہے کیونکہ یہی ہیں جنہوں نے قرار دادِ حدیبیہ کی تنسیخ کی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ جزیرہ عرب میں پیغمبر اسلام ﷺ کا وقار روز افزوں ترقی پر ہے۔ اگر آپ ﷺ اس امر کا ارادہ کر لیں کہ وہ اہل مکہ سے بنی خزاعہ کا انتقام لیں گے تو ان کے مقدس شہر کو سخت خطرہ لاحق ہے اس لیے وہ سوچتے تھے کہ اب کیا کریں۔ آخر انہوں نے ابوسفیان کو مدینہ بھیجا تا کہ وہ قرار داد کو مستحکم کرے اور اس کی مدت میں توسیع کرائے۔ غالباً قرار داد کی اصل مدت دو سال تھی اور اب وہ یہ چاہتے تھے کہ یہ مدت دس سال ہو جائے۔ غرض ابوسفیان جو اہل مکہ میں دانا و بینا شخص تھا، مدینہ پہنچا۔

جب وہ اثنائے راہ میں عسفان کے مقام پر پہنچا تو اس کی ملاقات بدیل بن ورقا اور اس کے ساتھیوں سے ہوئی۔ ابوسفیان کو یہ خطرہ تھا کہ شاید بدیل نے مدینہ پہنچ کر پہلے ہی آنحضرت ﷺ کو تمام حالات سے باخبر کر دیا ہے اور اگر یہ بات ہے تو پھر معاہدے کی مدت میں توسیع کی بات بنتی نظر نہیں آتی۔ بدیل سے دریافت کیا تو اس نے اس بات کا انکار کیا کہ اس نے پیغمبر اسلام ﷺ سے ملاقات کی ہے۔ لیکن ابوسفیان نے اونٹنی کی مینگنیوں سے اندازہ کر لیا کہ وہ ضرور مدینہ پہنچا ہے۔ اس لیے اس نے مناسب خیال کیا کہ براہ راست آنحضرت ﷺ سے ملاقی نہ ہو چنانچہ جب وہ مدینہ پہنچا تو پہلے اپنی بیٹی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے گھر آیا جو

Marfat.com

ازواج مطہرات اور امہات المومنین رضی اللہ عنہن میں سے تھیں۔

ابوسفیان مدینہ میں

قریش کے خلاف آنحضرت ﷺ کے جو خیالات تھے غالباً اُم المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ان سے بے خبر نہ تھیں البتہ مکہ کے بارے میں آپ ﷺ کے جو ارادے تھے ان کی انہیں اطلاع نہ تھی ممکن ہے مدینہ کے باقی مسلمانوں کا بھی یہی حال ہو۔ ابوسفیان نے پیغمبر اسلام ﷺ کے بستر پر بیٹھنے کا ارادہ کیا تو ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے فوراً اسے لپیٹ دیا۔ ابوسفیان نے پوچھا۔ کیا تم نے اپنے باپ کو اس لائق بھی نہیں سمجھا کہ وہ بستر پر بھی بیٹھ سکے؟ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا بستر ہے اور تم ابھی شرک کی نجاست سے آلودہ ہو، میں نہیں چاہتی کہ تمہارے بیٹھنے سے اس بستر کے تقدس میں فرق آئے۔ ابوسفیان غصے میں بڑبڑاتا ہوا اپنی بیٹی کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا اور باہر چلا آیا۔ بعدازاں اس نے آنحضرت ﷺ سے قرارداد اور اس کی مدت میں توسیع سے متعلق گفتگو کی۔ آپ ﷺ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ابوسفیان نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا تم میری طرف سے اس بارے میں گفتگو کرو مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صاف انکار کر دیا۔ پھر اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے درخواست کی انہوں نے سختی سے جواب دیا اور کہا۔ کیا میں آنحضرت ﷺ سے تمہاری سفارش کروں؟ بخدا! اگر چیونٹی اور صرف چیونٹی ہی میری پشت پناہ رہ جائے اور کوئی بھی مددومعاون نہ ہو اس صورت میں بھی میں تم سے لڑے بغیر نہ رہوں گا۔ پھر ابوسفیان حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کے پاس آیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی وہاں موجود تھیں۔ ابوسفیان نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا اور رسول کریم ﷺ کے پاس سفارش کی درخواست کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے نہایت نرم لہجے میں سمجھایا آنحضرت ﷺ کو کوئی شخص ان کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتا۔ قریش کے سفیر ابوسفیان نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے اس امر کی سفارش چاہی کہ ان کا فرزند حسن ابوسفیان کو لوگوں کے سامنے اپنی پناہ میں لے لے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کوئی شخص کسی کو پیغمبر اسلام ﷺ کی مرضی اور اجازت کے بغیر پناہ نہیں دے سکتا۔ غرض ابوسفیان بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ آخر اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اپنے بچاؤ کی کوئی صورت دریافت کی۔ انہوں نے کہا بخدا! مجھے ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی جو تمہارے لیے مفید ثابت ہو ہاں ایک بات ہے اور وہ یہ کہ تم بنی کنانہ کے سردار ہو لہٰذا خود ہی لوگوں سے جا کر یہ کہو کہ امان دیتا ہوں اور خود بھی امان کا طالب ہوں اور اپنے وطن کی راہ لو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا مجھے امید نہیں کہ یہ طریقہ کارگر کچھ کارآمد ہو لیکن اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں۔ غرض ابوسفیان نے مسجد میں جا کر لوگوں کے سامنے اعلان کر دیا کہ وہ اپنی طرف سے امان دیتا ہے اور امان کا طالب ہے۔ اس نے یہ الفاظ کہے اور مکہ کی راہ لی۔ اس کا دل اس خفت کے احساس سے ڈوبا جا رہا تھا جو اسے مدینہ میں اٹھانی پڑی تھی اور خصوصیت سے ان لوگوں کے

Marfat.com

ہاتھوں جو ہجرت سے قبل مدینہ میں اس کی عنایت کے طالب اور اس کی خوشنودی کے خواستگار رہا کرتے تھے۔

مکہ واپس آ کر ابوسفیان نے پوری سرگزشت سنائی اور یہ بھی کہا کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے لوگوں کے سامنے آ کر امان دی ہے نیز یہ کہ نبی کریم ﷺ نے میری امان کو معتبر نہیں سمجھا۔ اہل مکہ نے کہا تیرا خانہ خراب ہو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تجھ سے مذاق کیا ہے۔ اس کے بعد وہ باہمی صلاح مشورے میں مشغول ہو گئے۔

فتح مکہ کی تیاریاں

آنحضرت ﷺ نے مناسب خیال کیا کہ اہل مکہ کو اتنی فرصت نہ دی جائے کہ وہ آپ ﷺ کے مقابلے کی تیاری کر سکیں گو وہ اپنی فوجی طاقت اور خدائی امداد سے مطمئن تھے تاہم ان کی خواہش تھی کہ اہل مکہ پر ناگہانی حملہ کر دیا جائے تاکہ انہیں مدافعت کا موقع ہی نہ ملے اور وہ کشت وخون کے بغیر ہتھیار ڈال دیں۔ اس لیے آپ ﷺ نے لوگوں کو تیاری کا حکم دیا۔ جب تیاری مکمل ہو گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مکہ کا قصد ہے۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو سعی بلیغ اور پوری جدوجہد کا حکم دیا اور خدا سے دعا کی کہ قریش کو مخبروں اور جاسوسوں کے ذریعے سے ہماری نقل وحرکت کا علم نہ ہونے پائے۔

حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کا خط

ادھر مسلمانوں کا لشکر مکہ پہنچنے کی تیاریاں کر رہا تھا ادھر حاطب بن ابی بلتعہ نے ایک خط لکھ کر مکہ کی ایک عورت سارہ کو دیا جو بنی عبدالمطلب میں سے کسی شخص کی باندی تھی اور اسے اجرت کی شرط پر یہ ہدایت کی کہ وہ یہ خط قریش تک پہنچا دے تاکہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی تیاری سے آگاہ ہو جائیں۔ حاطب رضی اللہ عنہ اصحاب کبار میں سے تھے لیکن نفس انسانی کا خاصہ ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ کمزوریاں پائی جاتی ہیں جو بعض اوقات اس پر غلبہ پا لیتی ہیں اور انسان کو ایسے کام پر آمادہ کر دیتی ہیں جسے طبعاً وہ خود بھی پسند نہیں کرتا۔ ہوا یہ کہ آنحضرت ﷺ کو اپنی پیغمبرانہ بصیرت کی بنا پر جلد ہی اس بات کا پتا چل گیا۔ آپ ﷺ نے فوراً حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کو اس عورت کے تعاقب میں روانہ فرمایا۔ ان دونوں نے اسے راستے میں جا لیا۔ انہوں نے اسے سواری سے اتار کر اس کے کجاوے کی تلاشی لی لیکن کوئی چیز برآمد نہ ہوئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے ڈرایا اور فرمایا کہ اگر تم وہ خط نہ دو گی تو ہم اس کے حصول کے لیے تمہاری جامہ تلاشی کریں گے اور اس سلسلے میں تمہیں برہنہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ جب اس عورت نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اتنا سخت پایا تو کہنے لگی۔ آپ ذرا ایک طرف کو ہٹ جائیں۔ آپ ہٹے تو عورت نے اپنے بالوں کی مینڈھیاں کھول کر خط برآمد کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اس عورت کو واپس مدینہ لے گئے۔ آنحضرت ﷺ نے حاطب رضی اللہ عنہ کو بلا کر پوچھا کہ تمہیں اس کام کی جرأت کیسے ہوئی؟ حاطب رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! بخدا

Marfat.com

میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتا ہوں، مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے لیکن میں ایک ایسا شخص ہوں جس کے اہل وعیال اور کنبے کے لوگوں میں سے یہاں ایک بھی نہیں بلکہ میرے بیوی بچے مکہ میں ان لوگوں کے درمیان ہیں اس لیے میں نے یہ کام اپنے اہل وعیال کی سہولت اور اہل مکہ کی مدارات کی نیت سے کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے میں اس کی گردن اتار دوں۔ اس شخص نے کھلی منافقت کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اے عمر رضی اللہ عنہ! کیا تمہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ بدری صحابہؓ کے بارے میں خدا کا یہ فرمان ہے تم جو چاہو کرو میں نے تمہیں بخش دیا ہے۔ حاطب رضی اللہ عنہ بھی غزوۂ بدر میں شریک تھے۔ اس موقع پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی۔

يَآيُّهَا الَّذِينَ امَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُونَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ (سورۃ الممتحنہ:١)

"اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ اور ان کی طرف محبت کے پیغام نہ بھیجو۔"

مکہ کی طرف کوچ

لشکر اسلام مدینہ سے عازمِ مکہ ہوا۔ عزائم یہ تھے کہ اس کعبہ کو اپنی تحویل میں لے جسے خدا نے لوگوں کا مرجع و مامن قرار دیا تھا۔ اس لشکر کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اس سے قبل اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مہاجرین اور انصار کے علاوہ بنی سلیم، بنی مزینہ، بنی غطفان اور دیگر قبائل نے بھی اپنے اپنے آدمیوں کو اس میں شرکت وشمولیت کے لیے بھیجا تھا۔ یہ عظیم الشان لشکر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح بڑھا چلا جاتا تھا۔ جس جگہ یہ لشکر پڑاؤ ڈالتا تمام سطح زمین روپوش ہو جاتی اور ریت تک کہیں دکھائی نہ دیتی۔ ہزار ہا نفوس کی فوج تیزی سے قدم بڑھائے ہوئے چلی جاتی تھی اور جیسے جیسے منزلیں طے کرتی تھی اس کے ساتھ دیگر قبائل کے لوگ بھی آ شامل ہوتے تھے۔ ہر لشکری کے دل میں یہ جذبہ موجزن تھا کہ سوا اللہ تعالیٰ کے دنیا کی کوئی طاقت اس کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ آنحضرت ﷺ یہ سوچ رہے تھے کہ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم کعبہ میں خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر داخل ہو جائیں۔ مرالظہر ان کے مقام تک پہنچتے پہنچتے لشکر کی تعداد دس ہزار تک جا پہنچی اور لطف کی بات یہ کہ ابھی تک قریش کو اس لشکر کی کانوں کان بھی خبر نہ تھی اور وہ ابھی تک اسی حیص بیص میں تھے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے حملے سے بچاؤ کے لیے ہم کیا طریق کار اختیار کریں۔

سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام

آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ قریش کو اسی ذہنی کشمکش میں چھوڑ کر اپنے اہل وعیال سمیت مکہ سے نکلے تا آنکہ مقام جحفہ پر جو کہ مکہ سے چار فرسنگ کے فاصلے پر ہے ان کی ملاقات پیغمبر اسلام ﷺ سے

Marfat.com

ہوئی۔ غالباً بنی ہاشم کے چند نفوس کو کسی نہ کسی ذریعے سے لشکر اسلام کی نقل و حرکت کا علم ہو گیا تھا اس لیے انہوں نے چاہا کہ مخالفین کے ہاتھوں انہیں کوئی گزند نہ پہنچے۔ انہوں نے بہتری اسی بات میں سمجھی کہ پہلے ہی آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچ کر محفوظ ہو جائیں۔[1]

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے علاوہ ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب (آنحضرت ﷺ کے عم زاد) اور عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ (آپ ﷺ کی پھوپھی کے صاحبزادے) بھی مکہ سے نکلے اور لشکر اسلام میں آ شامل ہوئے۔ لشکر اسلام نے نیق العقاب میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ ان دونوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضری کی اجازت چاہی لیکن آپ ﷺ نے انکار کر دیا۔ آپ ﷺ کی اہلیہ محترمہ اُم المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے سفارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ میرے چچا کے بیٹے نے بدسلوکی اور بے مروتی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور میری پھوپھی کے بیٹے نے میری نسبت مکہ میں بہت کچھ زبان درازیاں کی ہیں۔ ابوسفیان بن حارث کو یہ اطلاع ہوئی تو اس نے کہا بخدا پیغمبر اسلام ﷺ کو چاہیے کہ وہ ہمیں ضرور حاضری کی اجازت دیں ورنہ میں اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر جنگل میں لے جاؤں گا اور وہاں ہم بھوکے پیاسے جان دے دیں گے۔ آنحضرت ﷺ کو ان باتوں پر ترس آ گیا اور آپ ﷺ نے انہیں اجازت دے دی چنانچہ وہ دونوں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضری کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے۔

حضرت عباس ﷺ بن عبدالمطلب کو اپنے بھتیجے کی فوج اور اس کی بے پناہ قوت سے کچھ بے چینی ہوئی۔ وہ اگرچہ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے تاہم انہیں یہ تشویش تھی کہ جب یہ طاقتور لشکر جس کے مقابلے کی طاقت عرب میں کسی کو بھی نہیں مکہ پر حملہ کرے گا تو اہل مکہ پر کیا گزرے گی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو مکہ مکرمہ سے آئے ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی اور ان کے رشتہ دار اور اعزہ و احباب بھی ابھی وہیں تھے۔ قبولِ اسلام کے باوجود حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ان سے اپنے تعلقات منقطع نہ کیے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس خدشے کا اظہار کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ اگر قریش آپ ﷺ سے امان طلب کریں تو آپ ﷺ کا کیا رویہ ہوگا؟ آنحضرت ﷺ حضرت عباس ﷺ کی اس صلح پسندانہ گفتگو سے غالباً ناخوش نہ ہوئے۔ آپ ﷺ نے انہیں قریش کے پاس بحیثیت سفیر بھیجنے کا ارادہ کیا تاکہ وہ ان کو آپ ﷺ کی طاقت سے مرعوب کریں اور اس طرح آپ ﷺ کشت و خون کئے بغیر مکہ مکرمہ کی حدود میں داخل ہو جائیں۔ یہ خیال آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ کی حرمت کے پیش نظر تھا چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے سفید خچر پر سوار ہو کر مکہ کی طرف چلے اور گزرگاہ اراک تک پہنچ گئے۔ آپ اس انتظار میں تھے کہ کوئی لکڑہارا یا گوالا جو مکہ کو جا رہا ہو آپ کو مل جائے اور آپ اس کے ذریعے سے اہل مکہ کو مسلمانوں کی طاقت اور لشکر سے متعلق پیغام بھیج سکیں تاکہ اس سے قبل کہ آنحضرت ﷺ بزور طاقت مکہ میں داخل ہوں اہل مکہ خود ہی آپ ﷺ

Marfat.com

کے پاس پہنچ کر امان طلب کریں۔

ابوسفیان کا تجسس

جس وقت مسلمان مرالظہر ان میں فروکش ہوئے تھے قریش کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ خطرہ قریب آ پہنچا ہے چنانچہ انہوں نے ابوسفیان بن حرب، بدیل بن ورقا اور حکیم بن حزام کو جو حضرت خدیجہ ؓ کے قریبی عزیز تھے، سراغ رسانی اور تجسس کی وجہ سے روانہ کیا۔ حضرت عباس ؓ جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے آنحضرت ﷺ کے سفید خچر پر سوار عازم مکہ تھے، انہوں نے ایک مقام پر ابوسفیان اور بدیل بن ورقا کو مصروف گفتگو پایا اور ان کا یہ مکالمہ بھی سنا۔

ابوسفیان: میں نے کسی رات اس قسم کی روشن آگ اور اتنی بھاری فوج نہیں دیکھی۔

بدیل: بخدا یہ بنی خزاعہ کے لوگ ہیں جو لڑنے کے لیے آ پہنچے ہیں۔

ابوسفیان: نہیں یہ لشکر بنی خزاعہ کا نہیں ہو سکتا۔ ان کے پاس اتنی طاقت اور ان کا ایسا شکوہ کہاں!

حضرت عباس ؓ نے آواز سے پہچان لیا کہ ہو نہ ہو یہ ابوسفیان کی آواز ہے۔ آپ نے اسے اس کی کنیت ابو حنظلہ سے پکارا، ابوسفیان نے بھی جواب میں حضرت عباس ؓ کی کنیت ابو الفضل استعمال کی۔ حضرت عباس ؓ نے کہا "ابوسفیان! تیرا برا ہو لشکر اسلام آ پہنچا ہے اور نبی کریم ﷺ اس کے ہمراہ ہیں۔ اگر یہ لشکر جرار مکہ میں اپنی طاقت کے بل بوتے پر داخل ہو گیا تو قریش پر قیامت گزر جائے گی۔" ابوسفیان نے کہا: میرے ماں باپ تجھ پر قربان! اب کیا صورت اختیار کی جائے؟ حضرت عباس ؓ اسے اپنے پیچھے خچر پر سوار کر کے مسلمانوں کے لشکر کی طرف لے گئے اور اس کے باقی دونوں ساتھیوں کو مکہ کی جانب لوٹا دیا۔ مسلمانوں نے خچر دیکھتے ہی پہچان لیا اور اسے آگے بڑھنے کے لیے راستہ دیا۔ حضرت عباس ؓ اور ابوسفیان دس ہزار کی فوج میں سے ہوتے ہوئے گزرے۔ لشکر اسلام نے اہل مکہ کو مرعوب کرنے کے لیے آگ مشتعل کر رکھی تھی۔ جب یہ سفید خچر حضرت عمر الفاروق ؓ کے قریب سے گزرا تو انہوں نے دیکھتے ہی ابوسفیان کو پہچان لیا اور یہ سمجھ گئے کہ حضرت عباس ؓ اسے پناہ دینا چاہتے ہیں۔ حضرت عمر ؓ پیغمبر اسلام ﷺ کے خیمے میں پہنچے اور یہ درخواست کی کہ مجھے ابوسفیان کا سر قلم کرنے کی اجازت دے دی جائے۔

حضرت عمر ؓ کی اس درخواست پر حضرت عباس ؓ نے آنحضرت ﷺ سے یہ عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں نے ابوسفیان کو امان دے دی ہے حضرت عباس ؓ اور حضرت عمر ؓ کے مابین یہ بات موضوع بحث بنی رہی۔ آخر کار آنحضرت ﷺ نے فرمایا اے عباس ؓ! تم ابوسفیان کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور صبح سویرے میرے پاس لے آنا۔ جب صبح ہوئی تو ابوسفیان کو آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر کیا گیا۔ مہاجرین اور انصار کے روبرو آنحضرت ﷺ اور ابوسفیان کے مابین یہ گفتگو ہوئی۔

Marfat.com

نبی کریم ﷺ : ابوسفیان! تیرا برا ہو۔ کیا اب بھی تجھ پر یہ حقیقت روشن نہیں ہوئی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟

ابوسفیان: میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں۔ آپ ﷺ کتنے متحمل، کریم النفس اور اقربانواز ہیں۔ بخدا میرا خیال ہے کہ اگر اللہ کے ماسوا کوئی اور معبود بھی ہوتا تو اب تک معاملہ کسی نہ کسی انتہا کو پہنچ چکا ہوتا۔

نبی کریم ﷺ: اے ابوسفیان! تیرا برا ہو۔ کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ تو جان لے میں اللہ کا رسول ہوں؟

ابوسفیان: میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں آپ ﷺ کتنے متحمل، کریم النفس اور اقربانواز ہیں۔ بخدا یہ معاملہ ایسا ہے کہ ابھی تک اس بارے میں میرا دل مطمئن نہیں ہوا۔

اسی اثناء میں حضرت عباس ﷺ آ گئے اور ابوسفیان سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: قبل اس کے کہ تمہارا سر قلم کر دیا جائے تمہیں چاہیے کہ تم اقرار توحید و رسالت کے بعد اسلام لے آؤ۔ ان حالات میں ابوسفیان کے لیے کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔ حضرت عباسؓ نے آنحضرت ﷺ سے مخاطب ہو کر یہ بات کہی۔ یا رسول اللہ ﷺ! ابوسفیان ایسا شخص ہے جو سرداری اور سربلندی پسند کرتا ہے اس لیے مناسب ہے کہ آپ ﷺ اس کی اس کمزوری کا لحاظ رکھیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا۔

"جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا اسے امان دے دی جائے گی اور جو شخص اپنے گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لے گا اس کے لیے بھی امان ہے اور جو شخص کعبہ میں داخل ہوگا وہ بھی مامون ہے۔"

کیا یہ اتفاقی واقعات ہیں؟

یہ ایسے واقعات ہیں جن پر تمام مؤرخین اور سیرت نگاروں کا اتفاق ہے لیکن ان میں سے بعض کے ذہن میں یہ سوال ابھرا ہے کہ آیا یہ جو کچھ ہے محض اتفاق کا نتیجہ ہے؟ کیا حضرت عباس ؓ مکہ سے اس لیے نکلے تھے کہ مدینہ پہنچیں گے؟ کیا مقام جحفہ میں لشکر اسلام سے ان کی ملاقات محض اتفاقی ہے؟ کیا بدیل بن ورقا کا ابوسفیان بن حرب کی معیت میں مکہ سے باہر آنا محض اس لیے تھا کہ حالات کا کھوج لگائیں اور انہیں پہلے سے مسلمانوں کی نقل و حرکت کا کوئی علم نہ تھا؟ امر واقعہ تو یہ ہے کہ بدیل بن ورقا نے پہلے ہی مدینہ جا کر بنی خزاعہ کی سرگزشت آنحضرت ﷺ کے گوش گزار کی تھی اور اسے معلوم تھا کہ آپ ﷺ بنی خزاعہ کی امداد فرمائیں گے۔ کیا ابوسفیان کو باہر نکلتے وقت یہ علم نہ تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ مکہ پر چڑھائی کے ارادے سے تشریف لائے ہیں؟ یا اس سے پہلے کوئی سکیم طے پا گئی تھی جس کے تحت حضرت عباس ؓ آنحضرت ﷺ سے ملاقات کے لیے نکلے تھے اور بعد میں ان کی اور ابوسفیان کی ملاقات بھی کیا اسی سلسلے کی کڑی نہیں؟ یہ

Marfat.com

حقیقت ہے کہ ابوسفیان نے مدینہ کا سفر اسی لیے کیا تھا کہ قرارداد حدیبیہ میں توسیع ہو۔ جب اسے اس مقصد کامیابی نہ ہوئی تو اسے اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ اگر لشکر اسلام مکہ پر حملہ آور ہوا تو اہل مکہ مدافعت نہ کرسکیں گے اس لیے ہوسکتا ہے کہ اس نے مکہ میں اپنی سیادت باقی رکھنے کے لئے فتح مکہ کے لیے خود ہی زمین ہموار کی۔ اس معاملے کی خبر سوا نبی کریم ﷺ اور ان لوگوں کے جن سے اس معاملے کا براہ راست تعلق تھا اور کسی کو نہ ہوسکتی تھی کیونکہ جب ابوسفیان مدینہ آیا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر ڈالنے کی اجازت آنحضرت ﷺ سے طلب کی تھی۔ ان حالات میں قطعیت سے کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی، ہم یقین سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ خواہ یہ تمام واقعات اتفاقی طور پر ظہور پذیر ہوئے ہوں یا خواہ ان کے بارے میں پہلے سے کوئی سکیم طے پا گئی ہو، یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی پیغمبرانہ بصیرت سے کسی خونریزی کے بغیر مکہ مکرمہ پر فتح کے جھنڈے لہرا دیے۔

مکہ میں داخلہ

اگرچہ ابوسفیان مشرف بہ اسلام ہوچکا تھا تاہم مکے میں داخلے کے وقت آنحضرت ﷺ نے ہر ممکن احتیاط ملحوظ خاطر رکھی۔ فتح و نصرت باری تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے فتح عطا کرتا ہے مگر وہ اسی شخص کی مدد کرتا ہے جو اسباب کی حد تک اپنی کامیابی کے سامان بہم پہنچاتا ہے اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے معمولی سے معمولی بات کی احتیاط کرتا ہے چنانچہ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ ابوسفیان کو پہاڑ کی تنگ وادی میں جس کا رُخ مکہ کی جانب تھا، مقید رکھا جائے تاکہ وہ لشکر اسلام کو وہاں سے گزرتا ہوا دیکھے اور ان کی کثرت اور بے پناہ قوت کا تذکرہ اپنی قوم سے کرے۔ اگر ابوسفیان کو یہ سب کچھ دیکھے بغیر مکہ جانے دیا جاتا تو بہت ممکن تھا کہ اہل مکہ تیاری میں مصروف ہوجاتے۔ لشکر اسلام کے فوجی دستے ابوسفیان کی نگاہوں کے سامنے سے گزرے لیکن اس سبز پوش دستے کے سوا جو آنحضرت ﷺ کی جلو میں تھا اور کسی دستے نے اس کی توجہ اپنی طرف منعطف نہ کی۔ یہ دستہ فوج مہاجرین و انصار پر مشتمل تھا جو اس قدر مسلح تھے کہ صرف ان کی آنکھیں خودوں کے نیچے سے نظر آتی تھیں۔

ابوسفیان نے جب انہیں دیکھا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا۔ "کوئی فوج ان کے مقابلے کی تاب نہ لا سکتی۔ بخدا کل تیرے بھتیجے کی مملکت کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہوجائے گا۔"[2] بعد ازاں ابوسفیان نے اپنی قوم کو ب آواز بلند پکارا:

> "اے گروہ قریش! حضرت محمد ﷺ ایک ایسا طاقت ور لشکر لے کر آئے ہیں جس کے مقابلے کی طاقت تم میں نہیں۔ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا اسے امان ہوگی اور جو شخص اپنے گھر میں دروازہ بند کرکے بیٹھ رہے گا وہ بھی مامون ہوگا۔ پھر جو شخص کعبے میں داخل ہوجائے گا اسے بھی امان ملے گی۔"

Marfat.com

آنحضرت ﷺ نے لشکر اسلام کے ساتھ پیش قدمی فرمائی۔ جب آپ ﷺ مقام ذی طویٰ میں پہنچے اور یہ دیکھا کہ اہل مکہ کا خیال مقابلے کا نہیں تو آپ ﷺ نے اپنے فوجی دستوں کو ٹھہرنے کا حکم دے دیا اور اپنی سواری ہی پر سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے اس ذات کے آگے سر تسلیم خم کیا جس نے آپ ﷺ کے اور آپ ﷺ کے پیروؤں کے لیے مکہ مکرمہ کے دروازے کھول دیے تھے تاکہ وہ امن وسکون سے بحالت اطمینان اس میں داخل ہو جائیں۔ اس اثناء میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد ابوقحافہ نے جو ابھی اسلام نہ لائے تھے اور جن کی بینائی بھی زائل ہو گئی تھی، اپنی ایک پوتی سے کہا کہ وہ انہیں کوہ ابوقبیس پر لے چلے۔ جب ان کی پوتی انہیں پہاڑ کے اوپر لے گئی تو انہوں نے اپنی پوتی سے دریافت کیا، تمہیں کیا دکھائی دیتا ہے؟ پوتی نے جواب دیا، میں یہ دیکھتی ہوں کہ سیاہی بڑھتی جا رہی ہے۔ ابوقحافہ نے کہا، یہ سواروں کی فوج ہے۔ پوتی نے کہا، بخدا وہ سیاہی اب پھیل گئی ہے۔ ابوقحافہ نے کہا کہ یہ فوجیں مکہ کی طرف بڑھ رہی ہیں، مجھے جلد از جلد واپس لے چلو۔ ابوقحافہ ابھی گھر پہنچنے نہ پائے تھے کہ لشکر اسلام کا سیلاب امنڈ آیا اور ان کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی یہ لشکر ان تک آ پہنچا۔

سپاہ کی ترتیب

آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے آپ ﷺ کو فتح مکہ سے نوازا لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے احتیاط سے کام لیا۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کیا جائے اس کے ساتھ ہی آپ ﷺ نے سب کو ہدایت کی کہ مجبوری کے سوا اور کسی حالت میں خونریزی کا قصد نہ کریں۔ آپ ﷺ نے لشکر کے بائیں بازو کا سالار زبیر بن رضی اللہ عنہ العوام کو مقرر کر کے انہیں شمال کی جانب سے مکہ میں داخلے کا حکم دیا۔ دائیں بازو کا سالار خالد رضی اللہ عنہ بن ولید کو مقرر کیا گیا اور انہیں زیریں حصے کی جانب سے داخلے کی ہدایت کی، سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اہل مدینہ کے سالار مقرر ہوئے اور انہیں یہ حکم دیا گیا کہ غربی سمت سے مکے میں داخل ہوں جبکہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو پیادہ اور نہتے مہاجرین کی سپہ سالاری دے کر ہدایت کی گئی کہ وہ جبل ہند کے سامنے والی راہ سے مکے میں داخل ہوں۔ نبی پاک ﷺ خود بھی اسی دستے کے ہمراہ تھے۔

جب مسلمان مکہ میں داخل ہو رہے تھے تو کسی نے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ آج جنگ کا دن ہے، آج کے دن حرم میں خونریزی حلال ہوگی۔ یہ بات آنحضرت ﷺ کے اس فرمان کے منافی تھی کہ مسلمان اہل مکہ میں سے کسی کو قتل نہ کریں گے لہٰذا جب آپ ﷺ کو سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی ان باتوں کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے فوج کا پرچم ان سے لے کر ان کے بیٹے قیس رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا۔ قیس رضی اللہ عنہ لحیم وجسیم شخص تھے لیکن اپنے باپ جیسے جوشیلے نہ تھے۔

Marfat.com

مسلمانوں کے فوجی دستے مکہ میں داخل ہو گئے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے دستے کے سوا اہل مکہ نے کسی اور دستے کا مقابلہ نہ کیا کیونکہ مکہ کے زیریں حصے میں قریش کے چند ایسے لوگ آباد تھے جو آنحضرت ﷺ کے بدترین دشمن تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے بنی بکر سے مل کر بنی خزاعہ پر حملہ کر کے قرارداد حدیبیہ کو توڑ دیا، ان کو ابو سفیان کی رائے پسند نہ آئی تھی بلکہ وہ جنگ کی تیاریاں کر رہے تھے اور ان میں سے بعض راہ فرار اختیار کرنے پر آمادہ تھے۔ ان کی پیشوائی صفوان، سہیل اور عکرمہ بن ابی جہل کر رہے تھے۔ جب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی فوج مکہ میں داخل ہوئی تو انہوں نے تیراندازی شروع کر دی لیکن خالد رضی اللہ عنہ بن ولید نے انہیں جلد ہی منتشر کر دیا۔ خالد رضی اللہ عنہ کے صرف دو آدمی مارے گئے جو راستہ بھول کر فوج سے بھٹک گئے تھے۔ قریش سے ایک روایت کے مطابق تیرہ اور دوسری روایت کے مطابق اٹھارہ آدمی مقتول ہوئے۔ جب صفوان، سہیل اور عکرمہ نے دیکھا کہ حالات کا رُخ ہمارے خلاف ہے تو انہوں نے راہ فرار اختیار کی اور اپنے ساتھیوں کو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور ان کے بہادر ساتھیوں کے قبضے میں چھوڑ گئے۔

جب آنحضرت ﷺ مہاجرین کے ایک گروہ کے ساتھ ایک بلند مقام پر چڑھ رہے تھے تاکہ آپ ﷺ ادھر سے مکے میں داخل ہوں۔ اس وقت آپ ﷺ پرامن فتح پر مسرور تھے۔ بلندی سے مکہ اور اس کے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے آپ ﷺ نے مکہ کے زیریں حصے میں چمکتی ہوئی تلواریں دیکھیں اور یہ دیکھا کہ خالد رضی اللہ عنہ بن ولید حملہ آوروں کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ اس سے آپ ﷺ کو ملال ہوا، آپ ﷺ نے اپنا وہ فرمان یاد دلایا کہ جنگ نہیں ہونی چاہیے لیکن جب آپ ﷺ کو حالات کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا، جو کچھ خدا کو منظور ہے اسی میں بہتری اور اسی میں مصلحت ہے۔

مکہ میں

آنحضرت ﷺ مکہ کے بالائی حصے میں کوہ ہند کے سامنے فروکش ہوئے۔ وہاں ابوطالب اور اُم المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی قبور کے قریب آپ ﷺ کے لیے خیمہ نصب کیا گیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ ﷺ اپنے گھر میں استراحت کرنا چاہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا، نہیں۔ ان لوگوں نے مکہ میں میرے لیے کوئی گھر نہیں چھوڑا۔ غرض آپ ﷺ نے خیمے میں آرام فرمایا۔ اس موقع پر آپ ﷺ کا دل جذبات شکر و امتنان سے لبریز تھا۔ خدا نے آپ ﷺ کو عزت و حرمت سے اس شہر میں داخلے کی توفیق دی جہاں کے لوگوں نے آپ ﷺ کو طرح طرح کی اذیتیں دی تھیں اور آپ ﷺ کو ترک وطن پر مجبور کر دیا تھا۔ آپ ﷺ نے مکہ کی وادی اور گردونواح کے پہاڑوں کی طرف نظر دوڑائی۔ یہ وہی پہاڑ تھے جہاں آپ ﷺ اس وقت پناہ لیا کرتے تھے جب قریش آپ ﷺ کو سخت اذیت پہنچاتے اور آپ ﷺ کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ یہ وہی پہاڑ تھے جن میں غارِ حرا بھی شامل تھا جہاں آپ ﷺ ریاضت و عبادت میں مشغول

Marfat.com

رہتے اور جہاں آپ ﷺ پر یہ وحی نازل ہوئی تھی:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَۚ ① خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍۚ ② اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُۙ ③ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِۙ ④ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْؕ ⑤

(سورۃ العلق: ۱ تا ۵)

''اپنے اس رب کے نام سے پڑھ جس نے (ہر شے کی) تخلیق کی، جس نے انسان کو گوشت کے ایک لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھ، اور تیرا پروردگار وہ بزرگ ذات ہے جس نے قلم کے ذریعے سے تعلیم دی اور انسان کو وہ چیزیں سکھائیں جن کا اسے علم نہ تھا۔''

آپ نے ان پہاڑوں اور اس وادی پر نظر ڈالی جہاں مکہ کے مکانات ادھر اُدھر منتشر حالت میں تھے اور کعبہ ان کے وسط میں واقع تھا۔ عالم خشوع وخضوع میں شکروامتنان کے جذبے کے تحت آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے کیونکہ آپ ﷺ سے بہتر کون جانتا تھا کہ اس ذات کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے اور جملہ امور اسی کے قبضہ وتصرف میں ہیں۔ اس وقت آپ ﷺ کو یہ پورا پورا احساس ہوگیا کہ سپہ سالار کی حیثیت سے آپ ﷺ کے فرض کی تکمیل ہوچکی ہے اس لیے آپ ﷺ خیمے میں زیادہ دیر تک نہ ٹھہرے بلکہ جلد ہی باہر آ کر اپنی اونٹنی قصوا پر سوار ہوکر کعبے تک تشریف لے گئے اور سات بار اس کا طواف کیا۔ اثنائے طواف میں آپ ﷺ نے رکن کعبہ کو ایک عصا سے جو آپ ﷺ کے ہاتھ میں تھا سات بار چھوا۔ جب آپ ﷺ طواف کر چکے تو آپ ﷺ نے عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو بلایا۔ انہوں نے کعبے کا دروازہ کھولا۔ آپ ﷺ دروازے پر کھڑے رہے، لوگ مسجد الحرام میں داخل ہوتے رہے۔ آپ ﷺ نے ان کے سامنے تقریر کی اور یہ آیت تلاوت کی:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْاؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ⑬

(سورۃ الحجرات: ۱۳)

''اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد نر اور ایک مادہ سے پیدا کیا اور تمہارے گروہ اور قبیلے بنادیے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے بڑھ کر بزرگ وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے اللہ یقینا دانا اور آگاہ ہے۔''

پھر آپ ﷺ نے اہل مکہ سے مخاطب ہوکر فرمایا۔ ''اے گروہ قریش! تمہیں معلوم ہے کہ میں تم سے کیا سلوک کروں گا؟'' انہوں نے جواب دیا۔ ''ہمیں آپ ﷺ سے بہتر سلوک کی توقع ہے، آپ ﷺ شریف بھائی اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''جاؤ تم آزاد ہو۔'' یہ فرما کر آپ ﷺ نے قریش اور تمام اہل مکہ کو عام معافی دے دی۔

Marfat.com

عفوِ عام

قدرتِ انتقام کے باوجود عفو و درگزر کا اقدام کتنا بہتر اور حوصلے کا کام ہے اور وہ روح کتنی عظمت کی حامل ہے، جو بغض وعداوت کی حدود سے گزر کر ہر پست درجے کے خیال سے منہ موڑ کر شرافت اور انسانیت کی ان بلندیوں تک پہنچ جائے جہاں تک رسائی ہر انسان کے بس کی بات نہیں...... یہ وہی قریش تھے جن میں سے بعض نے آپ ﷺ کے قتل کے مشورے کیے تھے اور اس سے پہلے مدتوں آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے رفقا کو تکالیف دی تھیں۔ یہ وہی تھے جو آپ ﷺ سے بدر و اُحد کے غزوات میں لڑے تھے، جنہوں نے غزوۂ خندق میں آپ ﷺ کا محاصرہ کیا تھا اور جنہوں نے تمام عرب کو آپ ﷺ کی دشمنی پر آمادہ کر دیا تھا۔ یہ وہی قریش تھے کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ آپ ﷺ کو قتل کر کے آپ ﷺ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ اب یہ قریش آپ ﷺ کے رحم وکرم پر تھے۔ ان کی گردن زدنی میں بس آپ ﷺ کے حکم کی دیر تھی اور ان کی موت وحیات کا انحصار آپ ﷺ کے ایک اور صرف ایک اشارۂ چشم وابرو پر تھا۔ آپ ﷺ کے تابع فرمان ہزار ہا کی تعداد میں اسلحہ بند فوجی تھے جو چشم زدن میں مکہ اور اہل مکہ کا صفایا کر سکتے تھے لیکن نبی کریم ﷺ خدا کے نبی اور رسول تھے۔ آپ ﷺ ایسے نہ تھے کہ آپ ﷺ کے دل میں کسی کی طرف سے بغض وعناد ہو، نہ آپ ظالم تھے نہ متکبر، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دشمن پر مسلط کر دیا تھا۔ آپ ﷺ کو اختیار ملا مگر آپ ﷺ نے معافی دے دی، اس طرح آپ ﷺ نے ساری دنیا اور اس میں بسنے والی تمام قوموں کے لیے احسان، وفائے عہد اور روحانی عظمت کی ایک ایسی مثال قائم کر دی جو کہیں اور نہیں ملتی۔

تطہیرِ کعبہ

آپ ﷺ کعبے میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے کعبے کی دیواروں پر فرشتوں اور پیغمبروں کی تصاویر کندہ پائیں۔ آپ ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک تصویر دیکھی جس کے ہاتھ میں جوئے اور فال کے تیر تھے۔ آپ ﷺ نے ایک کبوتر کی تصویر بھی دیکھی جو لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ آپ ﷺ نے اسے اپنے ہاتھ سے توڑ کر زمین پر گرا دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصویر آپ ﷺ نے بغور دیکھی اور فرمایا، خدا ان کو تباہ کرے، اس میں ہمارے مورثِ اعلیٰ کو جوا کھیلتے ہوئے دکھایا گیا ہے، بھلا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جوئے کے تیروں سے کیا تعلق؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے نہ عیسائی، بلکہ آپ تو ایک راست باز مسلمان تھے، آپ کا مشرکین سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ فرشتوں کی تصویریں خوبصورت عورتوں کے مشابہ بنائی گئی تھیں، آپ ﷺ نے ان تصاویر کو بھی ناپسند فرمایا اور کہا کہ فرشتوں میں نر اور مادہ نہیں ہوتے۔ آپ ﷺ نے تمام تصاویر کے مٹا ڈالنے کا حکم صادر فرمایا۔ کعبے کے گرد وہ بت بھی تھے جن کی قریش عبادت کرتے تھے۔ یہ بت

Marfat.com

دیواروں سے مضبوطی اور استواری سے جکڑے ہوئے تھے۔ ہبل بھی کعبے کے اندر رکھا ہوا تھا۔ آپ ﷺ ایک چھڑی سے ان بتوں کی جانب اشارہ فرماتے اور یہ آیت تلاوت کرتے جاتے تھے:

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿٨١﴾ (سورۃ الاسراء:۸۱)

''اور کہہ دیجیے کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل مٹ جانے والا ہے۔''

بُت اوندھے گرا دیے گئے، کعبے سے بتوں کا صفایا کر دیا گیا۔ آپ ﷺ نے فتح مکہ کے پہلے ہی دن وہ مہم سر کر لی جس کے لیے آپ ﷺ بیس سال سے جدوجہد کر رہے تھے اور جس کے سلسلے میں اہل مکہ سے سخت جنگیں بھی چھڑیں۔ آپ ﷺ نے بت مسمار کر دیے اور قریش کے آنکھوں دیکھتے کعبے سے بت پرستی کا جنازہ نکل گیا۔ قریش دیکھ رہے تھے کہ جن بتوں کی پوجا وہ اور ان کے باپ دادا کرتے تھے وہ جلب منفعت تو کیا، دفع مضرت پر بھی قادر نہیں۔

انصار کے خدشات

اہل مدینہ میں سے انصار نے یہ سب کچھ مشاہدہ کیا اور آپ ﷺ کو کوہ صفا پر کھڑے ہو کر دعائیں مانگتے دیکھا۔ انہوں نے خیال کیا کہ آپ ﷺ مدینہ چھوڑ کر اپنے قدیم وطن مالوف میں جواب فتح ہو گیا تھا، اقامت اختیار کر لیں گے۔ وہ آپس میں کہنے لگے، کیا یہ خیال صحیح ہے کہ آپ ﷺ اپنے وطن کی فتح کے بعد وہاں قیام فرمائیں گے؟ غالباً کسی حد تک ان کا یہ خوف حق بجانب تھا کیونکہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ﷺ تھے اور کعبہ مکہ میں تھا، مسجد حرام بھی مکہ میں تھی۔ لیکن جونہی آپ ﷺ دعا سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ تم لوگ کیا بات کر رہے تھے؟ جب انہوں نے کسی تامل کے بغیر اپنے خدشے کا اظہار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: معاذ اللہ، میری زندگی اور موت تمہارے ساتھ ہوگی۔ اس طرح آپ ﷺ نے بیعت عقبہ کے عہد و پیمان پر قائم رہنے اور ان انصار سے جو مصیبت کے ایام میں آپ ﷺ کے شریک کار رہے تھے، پاسِ وفا کا ثبوت دیا اور یہ حقیقت واضح کر دی کہ وطن کی کشش یا اہل وطن آپ ﷺ کو ایفائے عہد سے باز نہیں رکھ سکتے۔

جب کعبہ بتوں کی نجاست سے پاک وصاف ہو گیا تو آپ ﷺ نے حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ بیت اللہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دیں چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ لوگوں نے آپ ﷺ کی امامت میں نماز ادا کی۔ اس دن سے آج تک چودہ صدیاں گزر جانے کے باوجود یہ سلسلہ جاری ہے۔ بلال رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد انہی کے جانشین دن میں پانچ بار مسجد حرام کی چھت پر اذان کہتے چلے آئے ہیں، اور نمازیں برابر اسی سنت کے اتباع میں ہو رہی ہیں۔ مسلمان اپنے دل و دماغ کو ذاتِ باری کی جانب متوجہ کر کے بیت اللہ کی طرف رخ کرتے ہیں جسے آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر بتوں کی آلودگیوں سے پاک کیا تھا۔

Marfat.com

خدا کی شان کہ قریش کو انجام کار حضور ﷺ کی بارگاہ رسالت میں سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ آنحضرت ﷺ کی عفو گستری کے باعث انہیں اطمینان نصیب ہو گیا لیکن اس کے باوجود وہ آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے رفقا کو حیرت و دہشت کے ملے جلے جذبات سے دیکھتے تھے۔ چند اہل مکہ کو جن کی تعداد سترہ سے زائد نہ تھی، آپ ﷺ نے عفو عام کے حکم سے مستثنیٰ کر دیا تھا۔ جب آپ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے یہ حکم صادر فرما دیا کہ ان کو تہ تیغ کر دیا جائے خواہ وہ بیت اللہ کے پردوں سے چمٹے ہوئے کیوں نہ پائے جائیں۔ ان میں سے بعض تو اپنے گھروں میں روپوش ہو گئے تھے اور بعض نے راہ فرار اختیار کی تھی۔ آپ ﷺ نے ان اہل مکہ کے قتل کا حکم کسی غصے یا عناد کی بنا پر نہ دیا تھا کیونکہ ان رذائل کی گرد بھی آپ ﷺ کے دامن پر نہ پڑی تھی۔ بات یہ تھی کہ ان لوگوں نے بڑے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ ان میں سے ایک شخص عبداللہ بن ابی سرح تھا جو پہلے مسلمان تھا اور اسے کتابت وحی کی خدمت سپرد تھی۔ بعد ازاں وہ مرتد ہو کر مشرکین قریش میں آ شامل ہوا تھا۔ وہ یہ بات برملا کہتا پھرتا تھا کہ میں کتابت وحی کے وقت اس میں تبدیلی کر دیا کرتا تھا۔ دوسرا شخص عبداللہ بن اخطل تھا۔ یہ بھی پہلے اسلام لے آیا تھا، اس کے بعد اس نے اپنے ایک غلام کو قتل کر دینے کے بعد راہ ارتداد اختیار کی تھی۔ اس نے اپنی دو لونڈیوں کو جن میں سے ایک کا نام فرتنی تھا یہ حکم دے رکھا تھا اور وہ آنحضرت ﷺ کی ہجو و مذمت میں اشعار گایا کرتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن اخطل کے ساتھ ہی اس کی دونوں لونڈیوں کے قتل کا حکم بھی صادر کر دیا تھا۔ معتوبین میں ایک شخص عکرمہ بن ابی جہل تھا جسے آپ ﷺ سے اور مسلمانوں سے سخت ترین عداوت تھی حتیٰ کہ وہ فتح مکہ کے بعد بھی خالدؓ بن ولید کے فوجی دستے پر حملہ آوری سے باز نہ آیا۔

معتوبین کی معافی

مکہ میں داخلے کے بعد آپ ﷺ نے حکم صادر فرما دیا کہ مندرجہ بالا چند اشخاص کے سوا اور کسی کو تہ تیغ نہ کیا جائے چنانچہ اس گروہ کے تمام افراد روپوش ہو گئے اور جن سے ہو سکا فرار ہو گئے۔ جب حالات درست ہو گئے اور لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی فراخ حوصلگی کا اندازہ کیا تو آپ ﷺ کے بعض صحابہؓ نے ان لوگوں کے لیے بھی معافی کی درخواست کی جن کے قتل کا آپ ﷺ نے حکم صادر فرما دیا تھا چنانچہ حضرت عثمانؓ بن عفان اپنے رشتے کے بھائی عبداللہ بن ابی سرح کو لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کے لیے امان طلب کی۔ آپ ﷺ نے دیر تک سکوت اختیار کیا پھر فرمایا، ''بہتر!'' اور اسے امان دے دی۔ عکرمہ بن ابی جہل نے یمن کی جانب راہ فرار اختیار کی تھی، اس کی بیوی اُم حکیم بنت حارث بن ہشام اسلام لے آئی تھی، اس نے عکرمہ کے لیے آپ ﷺ سے امان کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے اسے بھی امان دے دی۔ اُم حکیم اپنے شوہر کی تلاش میں نکلی اور اسے لے آئی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے صفوان بن امیہ کو بھی

Marfat.com

معافی دے دی جو فرار ہونے میں عکرمہ کا ہم سفر تھا۔ یہ دونوں سمندر کے راستے یمن جا رہے تھے۔ ان دونوں کو ٹھیک اس وقت لایا گیا جب کشتی روانہ ہونے ہی کو تھی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ابوسفیان کی بیوی ہند کو بھی معافی دے دی، ہند نے غزوۂ احد میں آپ ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کا کلیجہ چبایا تھا۔ غرض آپ ﷺ نے جن لوگوں کے قتل کا حکم دیا تھا ان میں سے اکثر کو معاف کر دیا اور امان دے دی۔ ان میں سے صرف چار اشخاص کو تہ تیغ کیا گیا۔ ان میں ایک حویرث تھا جس نے لوگوں کو آپ ﷺ کی دختر نیک اختر زینب رضی اللہ عنہا کی ایذا رسانی پر آمادہ کیا تھا جبکہ وہ مکہ سے عازم مدینہ تھیں۔ دو شخص اور تھے جو پہلے اسلام لا چکے تھے، بعد میں انہوں نے مدینہ میں ایک شخص کو قتل کیا اور بھاگ کر مکہ چلے گئے جہاں انہوں نے راہ ارتداد اختیار کی تھی۔ ابن اخطل کی دو لونڈیوں میں سے ایک لونڈی جو آپ ﷺ کی ہجو میں اشعار گایا کرتی تھی قتل کی گئی، دوسری لونڈی بھاگ گئی تھی اور بعد میں لوگوں کے کہنے سننے سے اسے امان مل گئی تھی۔

مکہ مکرمہ کو حرم قرار دیا گیا

فتح مکہ کے بعد صبح کے وقت اگلے دن بنی خزاعہ نے بنی بدیل کے ایک مشرک پر قابو پا کر اسے قتل کر دیا، اس سے آپ ﷺ ناراض ہوئے اور لوگوں سے یہ خطاب فرمایا:۔

> "اے لوگو! جس روز خدا نے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق کی اسی روز اس نے مکہ کو حرم قرار دے دیا اور قیامت تک اس کی یہی حیثیت رہے گی۔ کسی شخص کے لیے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو، یہ جائز نہیں کہ وہ اس میں خونریزی کرے یا کسی درخت کو کاٹے۔ یہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں ہوا اور نہ میرے بعد کسی کے لیے حلال ہوگا اور میرے لیے صرف اسی وقت یہاں کے لوگوں پر اللہ کی غضب آلودگی کے سبب حلال ہوا ہے۔ اس کے بعد پھر اس کی حرمت بدستور برقرار رہے گی۔ تم میں سے جو لوگ حاضر ہیں وہ غیر حاضر لوگوں تک یہ بات پہنچا دیں۔ جو شخص تم سے یہ کہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مکہ میں جنگ کی ہے اس سے کہہ دو کہ اللہ نے اسے اپنے رسول ﷺ کے لیے حلال کر دیا تھا لیکن اے بنی خزاعہ! تمہارے لیے حلال نہیں کیا گیا۔ خونریزی سے دست بردار ہو جاؤ اگرچہ یہ سود مند ہے لیکن اب اس کی ضرورت نہیں۔ تم نے ایک شخص کو قتل کیا ہے جس کا خوں بہا میں ادا کیے دیتا ہوں۔ میرے اس اعلان کے بعد جو شخص مقتول ہو اس کے وارث دو باتوں میں سے ایک اختیار کر سکتے ہیں۔ وہ چاہیں تو قاتل کو قتل کر سکتے ہیں اور چاہیں تو اس کا خوں بہا قبول کر سکتے ہیں۔"

بعد ازاں آپ ﷺ نے اس مقتول کا خوں بہا ادا کر دیا جسے بنی خزاعہ نے قتل کیا تھا۔ اس سلوک اور

Marfat.com

اس رویے سے جو عفو عام کے اعلان سے بھی بڑھ چڑھ کر تھا آپ ﷺ نے اہل مکہ کے دل موہ لیے اور خود بخود وہ اسلام کی جانب مائل ہو گئے۔ کسی نے کھڑے ہو کر کہا، ''تم میں سے جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے گھر میں کسی بت کو توڑے بغیر نہ چھوڑے۔'' بعد ازاں آپ ﷺ نے بنی خزاعہ کی ایک جماعت کو ان ستونوں کی مرمت اور اصلاح کے لیے بھیجا جو مکہ کے اردگرد واقع تھے، اس سے اہل مکہ کو یقین ہو گیا کہ آپ ﷺ مکہ کا دل وجان سے احترام کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں آپ ﷺ کی محبت جڑ پکڑ گئی۔ جب آپ ﷺ نے ان پر یہ حقیقت واضح کی کہ آپ ﷺ باقی تمام لوگوں کی بہ نسبت ان سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور اگر وہ آپ ﷺ کو وہاں سے دیس نکالا نہ دیتے تو آپ ﷺ انہیں نہ چھوڑتے اور کسی کو بھی ان کے برابر نہ خیال کرتے، تو ان کا تعلق خاطر آپ ﷺ سے اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق باپ کو جو فتح مکہ کے دن جبل ابوقبیس پر چڑھ گئے تھے، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لائے۔ آپ ﷺ نے انہیں دیکھ کر فرمایا، اس مرد بزرگ کو وہیں رہنے دیتے میں خود ان کے پاس پہنچ جاتا۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے عرض کیا ''یارسول اللہ! آپ ﷺ کے چل کر جانے سے اس کا آپ ﷺ کی خدمت میں چل کر آنا زیادہ مناسب تھا۔'' آپ ﷺ نے ابوقحافہ کے سینے پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا۔ ''اسلام قبول کرلو۔'' چنانچہ انہوں نے اسلام قبول کیا اور پکے مسلمان ہو گئے۔ اس طرز عمل سے آنحضرت ﷺ نے اپنے اخلاق حسنہ کی بنا پر ان لوگوں کو جو آپ ﷺ کے جانی دشمن تھے اپنا والہ وشید ابنا لیا۔ آج ان سب کے دلوں میں آپ ﷺ کی تعظیم وتکریم کا احساس تھا۔ قریش کے مرد وزن آپ ﷺ کے دست اقدس پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور سب نے حق وصداقت کی راہ اختیار کی۔

آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں پندرہ دن قیام فرمایا۔ اس اثنا میں آپ ﷺ نے مکہ کے داخلی نظام کی حالت درست کی اور اہل مکہ کو دینی احکام کی تلقین کی۔ اس اثنا میں آپ ﷺ نے فوج کے کچھ دستے اطراف مکہ میں دعوت وتبلیغ کے لیے روانہ کیے اور انہیں یہ ہدایت کی کہ تلوار نہ اٹھانا۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے نخلہ کی جانب رخ کیا تاکہ بنی شیبان کے بت عزیٰ کو توڑ دیں۔ اس بت کے انہدام کے بعد آپ نے بنی جزیمہ کی طرف توجہ کی۔ انہوں نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر ہتھیار اٹھا لیے اور مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ ہتھیار رکھ دو کیونکہ تمام لوگ اسلام لا چکے ہیں۔ بنی جزیمہ کے ایک شخص نے کہا، اے بنی جزیمہ! تمہارا برا ہوا، یہ خالدؓ بن ولید ہیں۔ بخدا ہتھیار ڈال دینے کے بعد قید کے سوا اور کچھ نہ ہوگا اور قید کے بعد ظاہر ہے کہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ بنی جزیمہ نے کہا، کیا تو یہ چاہتا ہے کہ ہمارا خون بہایا جائے؟ تمام لوگ ایمان لے آئے ہیں اور لڑائی ختم ہو چکی ہے، لوگوں کو امان بھی مل چکی ہے۔ آخر وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے اس پر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے انہیں گرفتار کر لیا اور ان میں سے بعض کو تہ تیغ بھی کیا۔ جب نبی کریم ﷺ کو یہ اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف

Marfat.com

اٹھا کر کہا: ''اے اللہ! جو کچھ خالدؓ نے کیا ہے میں اس سے بری الذمہ ہوں۔'' پھر آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بنی جزیمہ کی طرف روانہ کیا اور یہ ہدایت کی کہ ان لوگوں کی طرف جاؤ اور حالات کا جائزہ لو، جاہلی رسوم ختم کردی جائیں۔ حضرت علیؓ آنحضرت ﷺ کا عطا کیا ہوا کچھ مال لے کر وہاں پہنچے اور اس سے مقتولین کا خوں بہا ادا کیا۔ جب تمام مقتولین کا خوں بہا اور ان کے مال کا معاوضہ ادا کیا جا چکا تو جو مال باقی بچا آپ نے اسے بھی احتیاطاً انہی میں تقسیم کردیا۔

دو ہفتے تک مکہ میں قیام کے دوران میں آپ ﷺ نے وہاں سے بت پرستی کے تمام آثار محو کر دیے کعبہ کے قدیم مناصب میں سے کعبہ کی کلید برداری اور سقایت کے سوا اور کوئی منصب باقی نہ رہا۔ کلید برداری کا عہدہ آپ ﷺ نے عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد ان کے خاندان کے لیے وقف کردیا تاکہ وہ پشت در پشت قیامت تک، اس عہدے پر قائم رہیں اور جو شخص یہ عہدہ ان سے چھینے اسے ظالم سمجھا جائے۔ زمزم کی سقایت کا عہدہ آپ ﷺ نے اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ کے سپرد کردیا۔ اس طرح مکہ کے تمام لوگ ایمان لے آئے اور توحید کا نور گھر گھر پھیل گیا۔ اس کے بعد مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ اس سے تمام اطرافِ عالم منور ہو گئے۔

❁

حواشی

۱۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے معاملہ میں دو مختلف خیال ہیں: (۱) سیر نویسوں کا ایک گروہ اس ملاقات کی کڑی مقام رابغ سے ملاتا ہے۔ رابغ یا حجفہ دونوں میں سے کوئی مقام سہی، ان حضرات کے نزدیک حضرت عباسؓ اسی وقفہ میں اسلام لائے۔ (۲) دوسرے گروہ کا یہ کہنا ہے کہ جناب عباس رضی اللہ عنہ فتح مکہ سے پہلے مدینہ تشریف لے گئے اور اسلام لانے کے ساتھ ہی اس لشکر کے ہمراہ مکہ آئے۔

۲۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بات یہی ہے جو تم نے کہی لیکن ابوسفیان، یہ بادشاہت نہیں بلکہ نبوت ہے۔''
(زاد المعاد، ابن القیم فصل فی الفتح العظیم)

Marfat.com

باب 23

غزوۂ حنین و طائف

فتح مکہ کے بعد مسلمان خاصے دنوں تک مکہ میں قیام پذیر رہے۔ انہیں یہ خوشی تھی کہ خدا نے ان کی مدد کی اور زیادہ قتل وغارت کے بغیر انہیں اتنی بڑی فتح عطا فرمائی۔ جب بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کی آواز ان کے کانوں میں آتی تو وہ نماز کے لیے کعبہ میں پہنچتے اور فریضہ ادا کرتے۔ آنحضرت ﷺ جہاں ہوتے مسلمان آپ ﷺ کے گرد جمع ہوجاتے۔ مہاجرین اپنے چھوڑے ہوئے گھروں میں دوبارہ آگئے اور اپنے اعزہ واقارب سے مل جل کر رہنے لگے جو فتح مکہ کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے تھے۔ وہ اس بات سے مطمئن تھے کہ اسلام کو اب استحکام حاصل ہوگیا ہے اور جہاد کے بیشتر مواقع پر انہیں فتح وکامرانی نصیب ہوئی ہے۔ انہیں ابھی مکہ میں رہتے ہوئے پندرہ روز ہوئے تھے کہ انہیں ایسی خبریں ملیں جن سے ان کی مسرت تردد وتشویش میں تبدیل ہوگئی۔ بات یہ تھی کہ بنی ہوازن مکہ کے جنوب مشرقی پہاڑوں میں سکونت پذیر تھے، جب انہیں فتح مکہ کا علم ہوا اور یہ خبر ہوئی کہ بتوں کو نیست ونابود کر دیا گیا ہے تو انہیں خدشہ ہوا کہ اب ان کی باری آئے گی اور مسلمان ان پر ٹوٹ پڑیں گے لہٰذا انہوں نے سوچا کہ اس متوقع حادثے سے بچاؤ اور مسلمانوں کی پیش قدمی کی روک تھام کے لیے تدابیر اختیار کی جائیں، چنانچہ مالک بن عوف نے بنی ہوازن اور بنی ثقیف کو جمع کیا، بنی نصر اور بنی جشم بھی ان میں شامل ہوگئے۔ بنی ہوازن میں سے بنی کعب اور بنی کلاب کے سوا کوئی قبیلہ پیچھے نہ رہا۔ بنی جشم میں درید بن صمہ بھی تھا، وہ بہت بوڑھا ہوچکا تھا اور اس قابل نہ تھا کہ لڑائی میں حصہ لے سکے لیکن سالہا سال تک چونکہ اس کی عمر جنگ کے میدانوں میں گزری تھی چنانچہ وہ تجربے کی بنا پر مفید رائے دے سکتا تھا۔

یہ سب قبائل اپنے اہل وعیال اور مال ودولت کے ساتھ جمع ہوگئے۔ جب وہ میدان اوطاس میں جا کر اترے تو ان کا اجتماع پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ جب درید نے اونٹوں کے بلبلانے، گدھوں کے رینکنے، بچوں کے چیخنے اور بکریوں کے ممیانے کی آوازیں سنیں تو اس نے مالک بن عوف سے پوچھا، جنگجو اپنے مال اور اہل وعیال کو کس لیے ہمراہ لائے ہیں؟ مالک نے جواب دیا، یہ اس لئے کہ جنگجو بہادروں کو غیرت وحمیت دلائی جا سکے۔ درید نے کہا، کیا بھگوڑوں کو بھی کوئی چیز روک سکتی ہے؟ اگر جنگ کا فیصلہ تمہارے حق میں ہوا تو شمشیر

Marfat.com

زنوں اور نیزے بازوں کے سوا کوئی بھی کارآمد نہ ہوگا اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہوا اور تمہیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا تو تمہارے اہل وعیال اور مال پر دشمن کا قبضہ ہوگا اور اس میں تمہاری رسوائی ہوگی۔اس مسئلے پر مالک اور درید میں اختلاف رائے ہوگیا۔لوگوں نے مالک کی رائے کو ترجیح دی اور اسی پر عمل کیا۔یہ مالک تیس سال کی عمر کا جوان تھا اور لوگ اسے پختہ ارادے اور محکم رائے کا مالک سمجھتے تھے لہٰذا درید بھی کثرت رائے کی مخالفت پر نہ جم سکا اور اپنی تجربہ کاری کے باوجود چار و ناچار اسے بھی ان سے متفق ہونا پڑا۔

حنین کے درے میں پناہ گیری

مالک نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ حنین کی چوٹیوں اور وادی کے درے میں جمع ہوجائیں، جونہی مسلمان یہاں پہنچیں سب کے سب آن کی آن میں ان پر ٹوٹ پڑیں اور ان کی صفیں درہم برہم کردیں تاکہ وہ بدحواسی کی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے سے الجھ پڑیں اور مجبوراً زچ ہوکر راہ فرار اختیار کریں نیز فتح مکہ سے انہیں اپنی طاقت پر جو زعم ہوگیا ہے اس کا طلسم بھی پاش پاش ہوجائے۔اس طرح بلادعرب میں قبائل حنین کو یہ فخر حاصل ہوجائے گا کہ انہوں نے اس قوت کو زیر کرلیا جو تمام بلادِعرب پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتی تھی چنانچہ تمام قبائل نے مالک کے حکم کی تعمیل کی اور وادی حنین کے درے میں روپوش ہوکر بیٹھ گئے۔

مکہ میں دو ہفتے کے قیام کے بعد مسلمانوں نے آنحضرت ﷺ کی قیادت میں ایسی بھاری تعداد میں کوچ کیا جس کی نظیر ابھی تک دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ان کی فوج بارہ ہزار جنگجو بہادروں پر مشتمل تھی۔ان میں دس ہزار تو وہ تھے جنہوں نے مکہ پر چڑھائی کرکے اسے فتح کیا تھا اور دو ہزار وہ بہادر تھے جو قریش میں سے اسلام لائے تھے، ابوسفیان بن حرب بھی ان میں شامل تھا۔تمام کے تمام زرہ پوش تھے۔فوج کے آگے آگے شہ سواروں کی جماعت اور ذخیرہ بردار اونٹ تھے۔یہ مسلمانوں کا ایک ایسا لشکر تھا جس کی مثال بلادعرب میں مشکل ہی سے مل سکتی تھی۔ہر قبیلہ کی فوج کے آگے آگے اس کا پرچم تھا۔تمام فوجیوں کے دل کثرت تعداد کے باعث بلیوں اچھل رہے تھے اور انہیں اطمینان تھا کہ آج ہمیں کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا۔آپس میں اسی قسم کی گفتگو ہورہی تھی کہ آج ہم اتنی تعداد میں ہوتے ہوئے مغلوب نہ ہوں گے۔

یہ لشکر جرار شام کے دھندلکے میں حنین کے مقام پر جا پہنچا۔انہوں نے وادی سے باہر پڑاؤ ڈال دیا اور صبح تک وہیں ٹھہرے رہے، پھر فوج نے حرکت کی۔آنحضرت ﷺ اپنے سفید خچر پر سوار لشکر کے پیچھے پیچھے تھے اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بنی سلیم کے سالار کی حیثیت سے فوج کے آگے آگے تھے۔یہ لشکر وادی حنین کے درے سے داخل ہوکر تہامہ کی ایک وادی میں اترا۔جونہی انہوں نے وادی میں قدم جمائے مخالفین نے مالک بن عوف کی ہدایت کے موجب ان پر اچانک حملہ کردیا اور لگے تیروں کی بارش کرنے، ابھی تک آخر شب کی تاریکی کا فور نہ ہوئی تھی۔مسلمان اس ناگہانی حملے سے حواس باختہ ہوگئے اور پر اتنی بوکھلاہٹ طاری ہوئی کہ بھگدڑ مچ گئی۔ابوسفیان نے ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے کل مکہ جیسا مورچہ فتح کیا تھا، کہا: ''ان

لوگوں کے طور طریقوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سمندر تک سے ادھر نہیں رک سکتے۔'' اس وقت ابوسفیان کے چہرے پر تعجب کے آثار تھے۔تکلم کے وقت ان کے دونوں ہونٹ کھل گئے اور دانت نظر آنے لگے۔

شیبہ بن عثمان ابی طلحہ نے کہا، آج میں محمد ﷺ سے انتقام لوں گا۔اس کا باپ غزوۂ احد میں مارا گیا تھا۔کلدہ بن حنبل نے کہا، آج ان کا جادو ٹوٹ گیا۔اس کے بھائی صفوان نے اسے جواب دیا، خاموش رہ خدا تیرا منہ بند کرے۔بخدا اگر قریش کا کوئی ایک شخص مجھ پر فرمانروائی کرے تو اس سے بہتر ہے کہ مجھ پر ہوازن کے کسی شخص کی حکومت ہو۔صفوان ابھی تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔یہ باتیں ہو رہی تھیں اور مسلمانوں کی فوج درہم برہم ہو رہی تھی۔آنحضرت ﷺ فوج کے آخر میں تھے۔مفرورین یکے بعد دیگرے پیٹھ پھیر کر بھاگے جاتے تھے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے۔

آپ ﷺ کی ثابت قدمی

ایسے نازک حالات میں آپ ﷺ نے کیا رُخ اختیار کیا؟ کیا آپ ﷺ اپنی بیس سال کی جدوجہد کا حاصل ایسے موقع پر رائیگاں جانے دیتے جب ابھی عروج اسلام کی ابتدا تھی اور کیا اللہ تعالیٰ ایسی مایوسی کے عالم میں آپ ﷺ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیتا؟ یہ ہرگز نہ ہوسکتا تھا۔ایسا ہونے سے پہلے کئی قبائل کٹ مرتے اور کئی قومیں کھیت ہو جاتیں۔اگر ایسی صورت ہوتی تو آپ ﷺ خود ہی اپنی جان نذر کر دیتے۔کیونکہ مقصد تو یہ تھا کہ اللہ کا دین سر بلند ہو اور حق کی فتح ہو۔موت کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب اس کا مقررہ وقت آ جاتا ہے تو ایک لمحے کی تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہوتی چنانچہ آنحضرت ﷺ اپنی جگہ ثابت قدم رہے۔مہاجرین و انصار اور آپ ﷺ کے اہل بیت آپ ﷺ کے ارگرد کھڑے تھے۔جب لوگ آپ ﷺ کے پاس سے بھاگتے ہوئے گزر رہے تھے تو آپ ﷺ نے انہیں پکارا، لوگو کہاں جاتے ہو! لیکن لوگوں پر اتنی دہشت طاری تھی کہ وہ کچھ نہ سنتے تھے اور ان کے دلوں میں بجز اس کے اور کوئی خیال نہ تھا کہ بنی ہوازن اور بنی ثقیف پہاڑ کی چوٹیوں میں اپنی کمین گاہوں سے نکل کر ان کا تعاقب کریں گے۔ان کا یہ خیال غلط بھی نہ تھا کیونکہ بنی ہوازن واقعی اپنی کمین گاہوں سے سیلاب کی طرح نکل آئے تھے۔ان کے آگے آگے ایک شخص سرخ اونٹ پر سوار تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک بلند نیزے پر سیاہ پرچم بندھا ہوا تھا۔اس کی نظر جس مسلمان پر پڑتی وہ اس پر نیزے سے وار کرتا۔اس کے پیچھے پیچھے بنی ہوازن اور بنی ثقیف اپنے مددگاروں کے ساتھ نیزوں سے حملے کرتے ہوئے چلے آتے تھے۔آنحضرت ﷺ کا جذبہ حمیت ابھرا اور آپ ﷺ نے اپنے سفید خچر کے ذریعے سے دشمنوں کے اس بے پناہ سیلاب کو روکنا چاہا تاکہ جو خدا کو منظور رہے ہو جائے لیکن ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب نے آپ ﷺ کے خچر کی لگام پکڑی اور آپ ﷺ کو پیش قدمی سے روکے رکھا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی پکار

حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب کی آواز بہت بلند تھی۔ آپ نے اپنی آواز کی پوری گونج اور کڑک سے کہا۔ "اے گروہِ انصار! تم نے آنحضرت ﷺ کو پناہ دی اور ان کی مدد کی۔ اے مہاجرین! تم وہی تو ہو جنہوں نے درخت کے نیچے اپنے پیغمبر ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ پیغمبر اسلام ﷺ بقیدِ حیات ہیں۔ ادھر آؤ۔" حضرت عباسؓ نے یہ الفاظ بار بار دہرائے حتیٰ کہ وادی کے تمام گوشے گونج اٹھے۔ اس وقت گویا ایک معجزنما نقشہ نگاہوں کے سامنے آیا۔ جن لوگوں نے مقام عقبہ پر بیعت کی تھی انہوں نے عقبہ کا نام سنا تو انہیں اپنا عہد و پیمان اور اپنے فضائل یاد آ گئے۔ اسی طرح مہاجرین نے جب آپ ﷺ کا اسم گرامی سنا تو انہیں اپنی فداکاریاں اور اپنی دوسری فضیلتیں یاد آ گئیں۔ سب جماعتوں نے جان لیا کہ پیغمبر اسلام مہاجرین و انصار کی مختصر سی جماعت کے ہمراہ اپنی پامردی اور ثابت قدمی کا ثبوت دے رہے ہیں، انہیں غزوۂ احد میں بھی اس چیز کا مشاہدہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے خیال کیا کہ اگر ہم آپ ﷺ کو اس وقت تنہا چھوڑ جائیں گے تو نتیجہ یہ ہو گا کہ مشرکین اللہ کے سچے دین پر غلبہ پالیں گے۔ اس دوران میں حضرت عباسؓ کی آواز متواتر ان کے کانوں میں گونج رہی تھی اور اس سے ان کے دلوں کے تار جنبش میں آ رہے تھے چنانچہ وہ اطراف سے بلند آواز سے پکار اٹھے۔ "لبیک! لبیک" اور نہایت جوش و خروش سے پھر میدان جنگ میں لوٹ آئے۔

مسلمانوں کی واپسی

جب آنحضرت ﷺ نے انہیں لوٹتے اور واپس آتے دیکھا تو آپ ﷺ کو اطمینان نصیب ہوا۔ اس وقت تک بنی ہوازن اپنی کمین گاہوں سے نکل کر وادی کے میدان میں مسلمانوں کے بالمقابل آ کھڑے ہوئے تھے۔ سورج کی پہلی کرنوں نے آخر شب کے دھندلکوں کی تاریک ردا تار تار کر دی تھی۔ سیکڑوں کی تعداد میں مسلمانوں نے آپ ﷺ کے گرد جمع ہو کر مخالف قبائل کا مقابلہ کیا اور ان کے سامنے ڈٹے رہے۔ لحظہ بہ لحظہ واپس آنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جن لوگوں کی ہمتیں پست ہو گئی تھیں ان کے لوٹ آنے سے قوی ہو گئیں۔ انصار آپس میں بلند آواز سے پکارے، اے گروہ انصار! پھر وہ پکارے، اے گروہ خزرج! پیغمبر اسلام ﷺ طرفین کی جنگ آزمائی کا منظر دیکھتے رہے جب آپ ﷺ نے اندازہ کیا کہ معرکہ سخت ہو گیا ہے اور مسلمان بھی بلند ہمتی سے نبرد آزمائی کر رہے ہیں اور دشمنوں کے پرے کے پرے صاف ہو رہے ہیں تو آپ ﷺ پکار اٹھے۔ "اب جنگ اپنے پورے شباب پر آئی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے جو وعدہ کیا اس کی خلاف ورزی نہیں ہو گی۔" آپ ﷺ نے حضرت عباسؓ سے کنکریوں کی ایک مٹھی لے کر دشمنوں پر پھینکی اور فرمایا۔ "چہرے بدہیئت ہو گئے۔"

مسلمان بڑھ بڑھ کر دادِ شجاعت دے رہے تھے اور خدا کی راہ میں موت انہیں حقیر چیز نظر آ رہی تھی۔

Marfat.com

انہیں یقین ہو چلا تھا کہ انجام کار جیت ہماری ہے اور ہم میں سے جو شخص جام شہادت نوش کرے گا اس فتح میں اس کا حصہ زندہ رہنے والے سے بھی زیادہ ہوگا۔ جنگ زوروں پر جاری تھی۔ جب بنی ہوازن اور بنی ثقیف نے دیکھا کہ مقابلہ مفید نہیں ہے اور یہ خطرہ ہے کہ وہ سب کے سب فنا کے گھاٹ اتار دیے جائیں گے تو وہ شکست خوردہ ہو کر ایسے بھاگے کہ انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اپنی عورتوں بچوں اور مال کو پیچھے چھوڑ گئے جس پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ مالِ غنیمت میں ۲۴ ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں اور چار ہزار اوقیہ[1] چاندی شامل تھی۔ قیدیوں کی تعداد چھ ہزار تھی، انہیں حفاظت سے وادی جعرانہ میں منتقل کر دیا گیا جہاں انہیں اس وقت تک زیر حراست رکھا گیا جب تک مسلمان مفرورین کے تعاقب اور طائف میں بنی ثقیف کے محاصرے سے فراغت پا کر واپس آئیں۔

مسلمانوں نے دشمن کا تعاقب گرم جوشی سے کیا۔ آنحضرت ﷺ نے اعلان فرما دیا تھا کہ جو مسلمان کسی مشرک کو تہ تیغ کرے گا اس کا سامان اور اس کے اسلحہ اس کی ملکیت قرار دیے جائیں گے۔ اس اعلان کے سبب مسلمانوں نے تعاقب میں اور بھی زیادہ سرگرمی دکھائی۔ ربیعہ ابن دغنہ نے ایک اونٹ دیکھا جس پر ایک پالکی نما ہودہ رکھا ہوا تھا، اس نے اسے عورت خیال کیا اور اس کے مال پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی چنانچہ اس نے اونٹ کو بٹھایا تو اس پر ایک بوڑھے شخص کو سوار دیکھا جسے وہ نہ پہچانتا تھا۔ یہ بوڑھا شخص درید بن صمہ تھا۔ درید نے ربیعہ سے پوچھا، تم کیا چاہتے ہو؟ اس نے کہا، میں تم کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس پر تلوار سے پے در پے حملے کیے لیکن درید پر اس کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ درید نے کہا تمہاری ماں نے تمہیں اچھے ہتھیار نہیں پہنائے۔ میرے کجاوے کے پیچھے سے یہ تلوار لو اور اس سے وار کرو لیکن ہڈیوں سے اوپر اور دماغ سے نیچے ضرب لگاؤ، میں بھی اسی طرح لوگوں پر وار کیا کرتا تھا۔ جب تم اپنی ماں کے پاس جاؤ تو اس سے کہنا میں نے درید بن صمہ کو قتل کیا ہے۔ بخدا میں نے بہت سی جنگوں میں تمہارے قبیلے کی عورتوں کو بچایا ہے۔ جب ربیعہ اپنی ماں کے پاس گیا اور اسے یہ سرگزشت سنائی تو اس نے کہا، خدا تیرے ہاتھ کو جلائے، یہ بات اس نے اس لیے کہی تھی کہ وہ ہمیں اپنے احسانات یاد دلائے جو اس نے ہم پر کیے ہیں۔ بخدا اس نے ایک دن میں تیری تین ماؤں یعنی مجھے، میری ماں کو اور تیرے باپ کی ماں کو آزاد کرایا تھا۔

مسلمانوں نے بنو ہوازن کا تعاقب کیا حتیٰ کہ وہ اوطاس تک جا پہنچے۔ وہاں انہوں نے ان کا خوب مقابلہ کیا اور انہیں مغلوب کر لیا۔ ان کی عورتوں کو گرفتار کر کے اور خاصا مالِ غنیمت لیے ہوئے آنحضرت ﷺ کے پاس آئے۔ مالک بن عوف نصری کچھ دیر تو مقابلہ کرتا رہا، اس کے بعد وہ اور اس کے اہل خانہ بنی ہوازن کے ہمراہ فرار ہو گئے۔ مقام نخلہ پر پہنچ کر وہ بنی ہوازن سے الگ ہو گیا اور اس نے طائف کا رخ کیا۔ وہیں اسے پناہ ملی۔

غرض مسلمان فاتح اور مشرکین مفتوح ہوئے۔ اس افراتفری کے بعد جو مشرکین کے ناگہانی حملے اور

مسلمانوں کی صف شکنی کے باعث مچی تھی صرف آپ ﷺ کی ثابت قدمی اور مسلمانوں کی مختصر سی جماعت کے پائے ثبات سے لشکر اسلام کو فتح نصیب ہوئی۔مندرجہ ذیل آیات اسی واقعے سے متعلق نازل ہوئیں۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝۲۵ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۶ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۷ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَاۗءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۲۸ (سورۃ التوبہ: ۲۵ تا ۲۸)

''بے شک اللہ نے بہت سے مواقع پر اور جنگ حنین میں بھی تمہاری مدد کی تم اپنی کثرت تعداد پر فخر کرتے تھے مگر وہ تمہیں کچھ مفید نہ ہوئی بلکہ زمین باوجود اپنی وسعت کے تمہیں تنگ نظر آنے لگی، پھر تم دشمن کے مقابلے سے پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے، اس کے بعد خدا نے اپنے رسول ﷺ اور مؤمنوں پر تسکین نازل کی اور ایسے لشکر بھیج دیے جو تم نے دیکھے تک نہ تھے اور کافروں کو سزا دی اور کافروں کو اسی طرح سزا دی جایا کرتی ہے۔اس کے بعد خدا جس کی چاہے گا تو بہ قبول کرے گا اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔اے ایمان والو! مشرکین تو ناپاک ہی ہیں پس انہیں اس سال کے بعد مسجد حرام کے نزدیک بھی نہ آنا چاہیے اور اگر تم مفلسی سے ڈرتے ہو تو ان شاء اللہ خدا تمہیں اپنے فضل و کرم سے بے نیاز کردے گا، بے شک خدا دانا اور بینا ہے۔

فتح کی قیمت

تاہم مسلمانوں کو یہ شاندار فتح بھاری قیمت ادا کئے بنا حاصل نہ ہوسکی۔اگر وہ پہلی بار میدان سے فرار اختیار نہ کرتے تو شدید انہیں اس قسم کا خمیازہ بھگتنا نہ پڑتا جسے دیکھتے ہوئے ابوسفیان کو بھی یہ کہنا پڑا کہ اب یہ سمندر سے ادھر نہ رکیں گے۔مسلمانوں کو یہ فتح حاصل کرنے کے سلسلے میں کئی مردوں اور کئی بہادروں کی جانیں قربان کرنی پڑی تھیں اگرچہ کتب سیرت میں اس جنگ کے تمام مقتولین کی تعداد نہیں بتائی گئی ہے تاہم اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے دو پورے کے پورے قبیلے تقریباً شہید ہوگئے تھے۔آنحضرت ﷺ نے ان کے حق میں جنت کی دعا کی۔

بہرحال مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور ایسی مکمل فتح کہ مسلمانوں نے دشمنوں پر غلبہ پالیا۔ان کے

Marfat.com

ہاتھ اتنے قیدی اور اتنا مالِ غنیمت آیا کہ اس سے پہلے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ کسی معرکے سے غرض اور کسی جنگ کا مقصد صرف فتح ہی ہوتی ہے خواہ اس کے حصول کے لیے کوئی قیمت ادا کرنی پڑے۔ مسلمان اس انعام پر جو خدا نے انہیں عطا کیا تھا بہت خوش تھے۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کے بعد مسلمانوں کا یہ ارادہ ہوا کہ لوٹ چلیں۔

آنحضرت ﷺ کے پیشِ نظر اس سے بھی زیادہ مہتم بالشان فتح کا تصور تھا۔ مالک بن عوف ہی نے تمام قبائل کو جنگ کے لیے جمع کیا تھا اور شکست کے بعد بنی ثقیف کے ہمراہ طائف میں اسی نے پناہ لی تھی۔ مصلحت وقت کا تقاضا یہ تھا کہ محاصرہ طائف کے بعد مسلمان اپنے ان دشمنوں کو اپنی گرفت میں لیں۔ نبی کریم ﷺ نے غزوۂ احد کے بعد اہل خیبر سے اور غزوہ خندق کے بعد بنی قریظہ سے یہی رویہ اختیار کیا تھا۔ غالباً اس موقع پر نبی کریم ﷺ کی آنکھوں کے سامنے اس زمانے کی تصویر پھر گئی تھی جب آپ ﷺ ہجرت سے چند سال قبل طائف میں لوگوں کو دعوت اسلام دینے کے لیے تشریف لے گئے تھے اور انہوں نے آپ ﷺ کا مذاق اڑایا اور ان کے بچوں نے آپ ﷺ پر سنگ باری کی تھی، آپ ﷺ نے ان کی ایذارسانی سے تنگ آ کر انگوروں کے ایک باغ میں پناہ لی تھی۔ شاید اس مرحلے پر آپ ﷺ نے یہ بھی سوچا ہو کہ آپ ﷺ گزشتہ ایام میں جب طائف گئے تھے تو تن تنہا تھے۔ ذات باری تعالیٰ کی تائید و نصرت کے علاوہ آپ ﷺ کا اگر کوئی مددگار تھا تو وہ ایمان کی زبردست اور بے پناہ قوت تھی۔ ایسی قوت جو پہاڑوں کو بھی ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ زمانے کا انقلاب دیکھیے کہ آج سفر طائف میں آپ ﷺ کے ہمراہ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد تھی کہ اس کی نظیر عرب کی گزشتہ تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔

طائف کا محاصرہ

آنحضرت ﷺ نے اپنے رفقا کو حکم دیا کہ وہ طائف کا رخ کریں تا کہ وہاں بنی ثقیف کا محاصرہ کیا جا سکے جن کا سرکردہ مالک بن عوف تھا۔ طائف ایک مضبوط شہر تھا اور اس زمانے کے اکثر عرب شہروں کی طرح اس کے دروازے بھی تھے جنہیں بوقت ضرورت بند کیا جا سکتا تھا۔ وہاں کے لوگ محاصرہ بندی کے سلسلے میں خاصا تجربہ رکھتے تھے اور ان کی مالی حیثیت بھی بہت اچھی تھی یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مضبوط قلعے بنا رکھے تھے۔ مسلمان طائف کی جانب روانہ ہوئے، اثنائے راہ میں وہ لیہ کے مقام سے گزرے جہاں مالک بن عوف کا ایک خاص قلعہ تھا۔ اسے انہوں نے گرا کر مسمار کر دیا، راستے میں بنی ثقیف کے ایک شخص کی چار دیواری تھی انہوں نے اسے بھی برباد کر دیا۔

جب مسلمان طائف پہنچ گئے تو آپ ﷺ نے اپنے لشکر کو شہر کے قریب پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ اب کیا صورت اختیار کرنی چاہیے۔ جونہی بنی ثقیف نے اپنے قلعوں کی نظارہ گاہوں سے مسلمانوں کو دیکھا، ان پر تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی جس سے چند مسلمان شہید ہو گئے۔ مسلمانوں کے لیے ان مضبوط قلعوں میں داخلہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک وہ مجبوراً ان وسائل

کے علاوہ کوئی اور وسیلہ اختیار نہ کرتے جن سے بنی قریظہ اور اہل خیبر کے محاصروں کے سلسلے میں انہوں نے کام لیا تھا۔ اگر وہ صرف محاصرے ہی پر اکتفا کرتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ وہ بنی ثقیف کو تنگ کر کے اپنے آگے سر تسلیم خم کردینے پر مجبور کردیتے؟ ان پر حملہ کرنے کے لیے نئے وسائل آخر کیا اختیار کیے جاسکتے تھے؟ ان امور پر غور وخوض کی ضرورت تھی، ایسے حالات میں کہ قلعوں کے اوپر سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی، مسلمانوں کو مخالفین کے تیروں کی زد سے دور رہنا چاہیے تھا تاکہ وہ نشانہ نہ بنیں اور ان کی جانیں ضائع نہ ہوں۔

مسجد طائف

آخر کار غور وخوض کے بعد آنحضرت ﷺ نے لشکر اسلام کو حکم دیا کہ وہ تیروں کی زد سے دور ہٹ کر اس جگہ قیام کریں جہاں طائف کی فتح اور اہل طائف کے قبولِ اسلام کے بعد مسجد کی تعمیر عمل میں آئی۔ اس صورت کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کیونکہ بنی ثقیف کے تیروں سے اٹھارہ مسلمان جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ بہت سے مسلمان زخمی بھی ہوئے تھے۔ ان مجروحین میں حضرت ابوبکرؓ صدیق کا ایک لختِ جگر بھی شامل تھا۔ اسی مقام کی ایک جانب آپ ﷺ کی ازواج مطہراتؓ حضرت اُم سلمہؓ اور حضرت زینبؓ کے لیے سرخ رنگ کے چمڑے کے دو خیمے بھی نصب کیے گئے تھے۔ یہ دونوں ازواج مطہراتؓ اس وقت سے جب سے آپ ﷺ نے مدینہ سے عزم سفر کیا تھا ان تمام ہنگاموں میں آپ ﷺ کے ہمراہ چلی آئی تھیں۔ آپ ﷺ ان دونوں خیموں کے درمیان نماز پڑھا کرتے تھے، غالباً مسجد طائف اسی جگہ تعمیر کی گئی۔

مسلمان اس بات کے انتظار میں تھے کہ دیکھیں ان کے اور ان کے دشمنوں کے درمیان قدرت کیا فیصلہ کرتی ہے؟ ایک اعرابی نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ بنی ثقیف اپنے قلعوں میں اس طرح ہیں جس طرح لومڑی اپنے بھٹ میں ہوتی ہے۔ اسے باہر نکالنے میں خاصے جتن کرنے پڑتے ہیں اور اگر اسے چھوڑ بھی دیا جائے تو وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی لیکن پیغمبر اسلام ﷺ کو یہ امر ناگوار تھا کہ بنی ثقیف کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر واپس آجائیں۔ بنی دوس کے لوگ جو مکے کے زیریں حصے میں رہتے تھے۔ منجنیق کے استعمال اور دبابوں کے ذریعے سے قلعوں کا محاصرہ کرنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ اس قبیلے کا ایک سردار طفیل دوسی جو غزوۂ خیبر کے بعد سے آنحضرت ﷺ کے رفقا میں شامل تھا، محاصرہ طائف میں بھی شریک تھا، آپ ﷺ نے اسے اس کی قوم کی طرف امداد حاصل کرنے کے لیے بھیجا چنانچہ ایک گروہ اس سردار کے ہمراہ اپنے ہتھیار لے کر آ گیا۔ یہ لوگ جس وقت پہنچے جب محاصرہ طائف کو چار دن بیت چکے تھے۔

غرض مسلمانوں نے طائف پر منجنیق کے ذریعہ سے حملے کیے اور دبابے بھی استعمال کیے جن کے نیچے چند مسلمان چھپے ہوئے تھے، انہوں نے دبابوں کے ذریعے سے طائف کی چہار دیواری پر تابڑ توڑ حملے کیے تاکہ اس میں شگاف ڈال سکیں لیکن اہل طائف بھی جنگ میں کچھ کم ماہر نہ تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو بھاگ کر پناہ لینے پر مجبور کردیا۔ اہل طائف نے یہ کیا کہ لوہے کے چند ٹکڑے آگ میں تپا اور پگھلا کر

Marfat.com

دبابوں میں پھینکے اور ان میں سوراخ ڈال دیے۔ جو مسلمان ان کے نیچے چھپے بیٹھے تھے جل جانے کے خوف سے نکل بھاگے، بنی ثقیف نے ان پر تیر برسا کر ان میں سے چند ایک کو ہلاک کر دیا۔ آخر یہ کوشش بھی کارگر ثابت نہ ہوئی اور مسلمان طائف کے مضبوط قلعوں پر غلبہ نہ پا سکے۔

آنحضرت ﷺ دیر تک اس مسئلے پر غور کرتے رہے کہ اب آپ ﷺ کو کیا کرنا چاہیے؟ آخر یہ تدبیر آپ ﷺ کے ذہن میں آئی کہ کیوں نہ ہم یہاں بھی وہ طریقہ اختیار کریں جو بنی نضیر پر قابو پانے کے سلسلے میں اختیار کیا تھا یعنی یہ کہ ان کے نخلستانوں کو نذر آتش کر کے ان پر غلبہ پایا تھا۔ طائف کے انگوروں کے باغ بنی نضیر کے نخلستانوں سے بھی زیادہ قیمتی تھے۔ یہ باغ تمام عرب میں مشہور تھے اور ان کے سبب طائف کو عرب کا سرسبز و شاداب علاقہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ طائف انگوروں کے ان باغوں کی وجہ سے ایک ایسا سبزہ زار تھا جسے خشک اور لق و دق صحرائے عرب میں ایک جنت کی سی حیثیت حاصل تھی۔

غرض آنحضرت ﷺ کے حکم سے مسلمانوں نے انگوروں کی بیلوں کو کاٹنا اور جلانا شروع کر دیا۔ بنی ثقیف نے جب یہ منظر دیکھا تو ان کے ہوش اڑ گئے، انہوں نے آپ ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر آپ ﷺ چاہیں تو یہ باغ اپنے تصرف میں لے لیں یا خدا کے لیے اس رشتے کی بنا پر جو ان کے اور آپ ﷺ کے درمیان ہے خود ہمارے لیے چھوڑ دیں۔ اس پیغام کے بعد آپ ﷺ نے اپنے آدمیوں کو اس کام سے روک دیا اور بنی ثقیف سے بہ آواز بلند کہا، اہل طائف میں سے جو شخص ہمارے پاس آجائے گا اس کے لیے امان ہے اور وہ آزاد ہوگا۔ اس اعلان پر طائف کے قریباً بیس آدمی قلعے سے نکل کر آپ ﷺ کے پاس آگئے۔ ان کی باتوں سے آپ ﷺ کو علم ہوا کہ قلعوں میں اتنا سامان خورونوش جمع ہے جو مدت دراز تک کافی ہوسکتا ہے۔ اس سے آپ ﷺ نے سمجھ لیا کہ یہ محاصرہ طول کھینچے گا اور لشکر اسلام کے ارادے یہ ہیں کہ وہ جلد سے جلد لوٹے اور مال غنیمت تقسیم کرے۔ آپ ﷺ نے سوچا کہ اگر محاصرے پر اصرار کیا گیا تو ان کا پیمانہ صبر لبریز ہو جائے گا۔ علاوہ بریں اشہر حرم قریب آگئے تھے جن میں جنگ اور خونریزی جائز نہیں ہے لہٰذا آپ نے یہ پسند کیا کہ فی الحال محاصرہ ختم کر دیا جائے۔ ماہ ذی قعدہ کا آغاز ہو چکا تھا، آپ ﷺ لشکر کے ہمراہ عمرہ بجا لانے کے لیے واپس آگئے اور یہ فرمایا کہ اشہر حرم ختم ہوتے ہی پھر اہل طائف سے جنگ ہوگی۔

بنی ہوازن کا وفد

آنحضرت ﷺ مجاہدین اسلام کی معیت میں طائف سے مکہ معظمہ واپس آگئے اور مقام جعرانہ میں جہاں وہ قیدی اور مال غنیمت چھوڑ آئے تھے، اترے اور وہاں مال غنیمت کی تقسیم شروع کی۔ آپ ﷺ نے مال غنیمت کا پانچواں حصہ اپنے لیے علیحدہ کر کے باقی مال اپنے رفقا میں تقسیم کر دیا۔ مسلمان ابھی جعرانہ ہی میں تھے کہ بنی ہوازن کے جو لوگ اسلام میں داخل ہو چکے تھے ان کا ایک وفد اس امید پر آنحضرت ﷺ

Marfat.com

کی خدمت میں حاضر ہوا کہ آپ ﷺ انہیں ان کا مال، عورتیں اور بچے جو اتنی مدت سے ان سے بچھڑے ہوئے ہیں اور خاصی تکالیف برداشت کر چکے ہیں۔ انہیں واپس کر دیں۔ یہ وفد آپ ﷺ سے ملا اور ان میں سے ایک نے عرض کیا یارسول اللہ! ان اسیروں میں آپ ﷺ کی پھوپھیاں، خالائیں اور دائیاں بھی ہیں جو آپ ﷺ کی پرورش کیا کرتی تھیں۔ اگر ہماری عورتوں نے حارث بن ابوشمر یا نعمان بن منذر کو دودھ پلایا ہوتا اور پھر اس کو ہمارے اوپر وہی اختیار ہوتا جو آج آپ ﷺ کو ہم پر حاصل ہے تو ہمیں اس سے مہر و کرم کی توقع ہوتی اور آپ ﷺ تو پھر بہترین ضامن ہیں۔ ان لوگوں نے آپ ﷺ سے رشتہ اور قرابت بتانے میں مبالغے سے کام نہیں لیا تھا۔ قیدیوں میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی جس پر مسلمانوں نے سختی کی تھی۔ اس نے یہ کہا تھا کہ میں تمہارے رسول ﷺ کی رضاعی بہن ہوں تو مسلمانوں کو اس پر یقین نہ آیا تھا اور وہ اسے آنحضرت ﷺ کے روبرو لے آئے تھے۔ یہاں یہ پتا چلا وہ حارث بن عبدالعزیٰ کی بیٹی شیما تھی۔ آپ ﷺ نے اس کی تعظیم کی اور اپنی چادر بچھا کر اسے بٹھایا، آپ ﷺ نے اسے اختیار دے دیا کہ اگر وہ چاہے تو آپ ﷺ کے پاس ٹھہرے یا آپ ﷺ اسے بحفاظت تمام اس کی قوم کے پاس پہنچا دیں چنانچہ اس نے اپنے قبیلے میں واپس جانے کو ترجیح دی۔

یہ قدرتی بات تھی کہ آپ ﷺ بنی ہوازن کے ان لوگوں سے جو قبولِ اسلام کے بعد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے حسن سلوک سے پیش آتے اور ان کے جائز مطالبے کو بھی مان لیتے کیونکہ ہر اس شخص سے جس نے آپ ﷺ سے کبھی کوئی اچھا سلوک کیا ہو آپ ﷺ کا ہمیشہ سے یہی برتاؤ تھا۔ حق شناسی اور دردمندوں کی چارہ جوئی آپ ﷺ کی سرشت میں داخل تھی۔ جب آپ ﷺ نے ان کی بات سنی تو پوچھا، تمہیں اپنے بچوں اور عورتوں سے زیادہ محبت ہے یا اپنے مال و منال سے؟ انہوں نے کہا، یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے ہمیں اہل و عیال اور مال و منال میں سے ایک چیز کا اختیار دیا ہے، مناسب یہ ہے کہ آپ ہمارے اہل و عیال واپس کر دیں کیونکہ وہ ہمیں زیادہ عزیز ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جو چیز میری اور بنی عبدالمطلب کی ہے اس پر تمہارا حق ہے، جب میں ظہر کی نماز پڑھا چکوں تو تم کھڑے ہو کر یہ کہنا: ''ہم پیغمبر ﷺ کو مسلمانوں کے سامنے اور مسلمانوں کو پیغمبر ﷺ کے سامنے اپنے اہل و عیال کی واپسی کے لیے سفارشی پیش کرتے ہیں۔'' میں اس وقت تمہیں اپنا حصہ بھی دے دوں گا اور مسلمانوں سے بھی کہوں گا کہ وہ تمہیں اپنا اپنا حصہ واگزار کر دیں۔

بنی ہوازن کے اسیروں کی واپسی

بنی ہوازن نے آپ ﷺ کی ہدایت پر عمل کیا۔ آنحضرت ﷺ نے انہیں یہ جواب دیا، جو چیز میری ہے اور جو بنی عبدالمطلب کا حصہ ہے، میں تمہیں بخشتا ہوں۔ مہاجرین و انصار کا ایک ہی سا جواب تھا: رسول اللہ ﷺ ہمارے حصے کے بھی مختار ہیں۔ البتہ ابتدا میں اقرع بن حابس، عیینہ بن حصن اور عباس بن مرداس

Marfat.com

نے اپنا اپنا حصہ چھوڑنے سے انکار کر دیا لیکن بعد میں رضامند ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو حصہ دار اپنا حصہ واپس کر دیں انہیں میں پہلی غنیمت پر ایک غلام کے عوض میں چھ غلام عطا کر دوں گا۔ اس طرح ہوازن کے ان لوگوں کو جو اسلام لے آئے تھے ان کے اہل وعیال واپس کر دیے گئے۔

آپ ﷺ نے ہوازن کے وفد سے مالک بن عوف نصری کا حال پوچھا، انہوں نے بتایا کہ وہ ابھی تک بنی ثقیف کے ساتھ طائف میں مقیم ہے۔ آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ اسے میرا پیغام پہنچا دو کہ اگر وہ بھی اسلام قبول کر لے تو میں اسے اس کے اہل وعیال کے علاوہ سو اونٹ بھی دوں گا۔ جب مالک کو آپ ﷺ کے اس وعدے کی اطلاع ملی تو وہ فوراً اپنے گھوڑے پر زین کس کر بنی ثقیف سے بچ بچا کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گیا، اس نے آکر اسلام قبول کر لیا اور اپنے اہل وعیال اور مال ومنال کے علاوہ سو اونٹ بھی لے لیے۔ مسلمانوں کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ اگر پیغمبر اسلام ﷺ تمام ایسے لوگوں پر جو آپ ﷺ کے پاس آتے رہے، نوازشیں فرماتے رہے تو مالِ غنیمت میں سے ان کا حصہ کم ہو جائے گا اس لیے انہوں نے اصرار کیا کہ ہر شخص مالِ غنیمت میں سے اپنا اپنا حصہ لے لے۔ اس سلسلے میں ان کے درمیان سرگوشیاں ہونے لگیں، جب آنحضرت ﷺ کو ان سرگوشیوں کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے ایک اونٹ کے قریب کھڑے ہو کر اس کے کوہان سے تھوڑی سی پشم اپنے ہاتھ میں لی اور اپنا ہاتھ اونچا کر کے فرمایا:۔

> ''بخدا! اس مالِ غنیمت اور اس پشم میں میرا صرف پانچواں حصہ ہے اور میں وہ پانچواں حصہ بھی تمہیں واپس کیے دیتا ہوں۔ ہر شخص اپنی اپنی غنیمت کا مال واپس کر دے تاکہ اسے انصاف سے تقسیم کیا جائے جو شخص عدل وانصاف کے بغیر کوئی چیز لے گا خواہ وہ ایک سوئی کے برابر ہی کیوں نہ ہو، قیامت تک اس کے گھر والوں کے لیے وہ چیز ننگ ورسوائی کا باعث ہوگی۔''

آپ ﷺ نے یہ الفاظ خفگی کے عالم میں فرمائے کیونکہ اس سے پہلے انہوں نے آپ ﷺ کی چادر لے لی تھی لیکن جب آپ ﷺ نے پکار کر کہا، لوگو! میری چادر تو مجھے واپس کر دو۔ بخدا اگر تہامہ کے درختوں کے برابر بھی بھیڑ بکریاں ہوتیں تو اس صورت میں بھی تمہارے درمیان تقسیم کر دیتا، تم مجھے بخیل، بزدل اور دروغ گو نہ پاؤ گے۔ اس پر انہوں نے آپ ﷺ کی چادر واپس کر دی۔ بعدازاں آپ ﷺ نے مالِ غنیمت میں سے پانچواں حصہ لے لیا اور اس پانچویں حصے میں سے کچھ مال آپ ﷺ نے ان لوگوں کو جو چند روز قبل تک آپ ﷺ کے بدترین دشمن تھے، دے دیا اور یہ عطیہ ان کے اپنے حاصل کردہ حصے کے علاوہ تھا چنانچہ ابوسفیان، اس کے بیٹے معاویہ، حارث بن حارث بن کلدہ، حارث بن ہشام، سہیل بن عمرو، حویطب بن عبدالعزیٰ اور دیگر بندگانِ قریش اور سرداران قبائل سے ہر ایک کو جو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تھے سو سو اونٹ عطا کیے گئے۔ جو لوگ رتبے اور درجے کے لحاظ سے ان سے کم تھے ان میں سے ہر ایک کو پچاس

Marfat.com

پچاس اونٹ دیے۔ ایسے لوگوں کی تعداد جن کو آپ ﷺ نے اپنا حصہ عطا کیا دس تک پہنچ گئی تھی۔ اس روز آپ ﷺ نے بے مثال جود وسخا کا مظاہرہ کیا جس کی بنا پر وہ لوگ جو کل تک آپ ﷺ کے دشمن تھے آپ ﷺ کے گن گانے لگے۔ آپ ﷺ نے ان نو واردانِ بساطِ اسلام کی ہر خواہش پوری کی۔ آپ ﷺ نے عباس بن مرداس کو چند اونٹ دیے مگر اسے اطمینان نہ ہوا اور اس نے یہ گلہ کیا کہ آپ ﷺ نے عینیہ اور اقرع وغیرہ کو مجھ پر ترجیح دی ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا، اسے لے جاؤ اور اتنا دو کہ اس کی زبان بند ہو جائے، چنانچہ اسے اتنا مال دیا گیا جس سے اس کی زبان سل گئی اور اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

انصار کا گلہ اور تالیف قلوب

آنحضرت ﷺ کی اس دریا دلی سے جس کا ثبوت آپ ﷺ نے مالِ غنیمت کی تقسیم میں دیا، حتیٰ کہ ان کو بھی نوازا جو کل تک آپ ﷺ کے خون کے پیاسے تھے، انصار تشویش میں مبتلا ہو گئے اور وہ آپس میں یہ کہنے لگے، بخدا آپ ﷺ نے اپنی قوم کی جھولیاں بھر دی ہیں اور انہیں بہت کچھ دیا ہے، سعدؓ بن عبادہ نے انصار کی جانب سے یہ بات آنحضرت ﷺ کے گوش گزار کی اور خود بھی ان کے موقف کی تائید میں اظہار خیال کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، اپنی قوم کو اس احاطے میں جمع کر دو۔ سعدؓ نے ان کو جمع کیا تو آپ ﷺ ان کے پاس آئے اور ان سے گفتگو اس انداز پر شروع ہوئی۔

رسول اللہ ﷺ: اے گروہ انصار! کیا یہ بات سچ ہے جو میں نے تمہارے بارے میں سنی ہے؟ شاید تمہارے دلوں میں کوئی گرہ پڑ گئی ہے۔ کیا یہ بات نہیں کہ میں نے تمہیں گمراہ پایا تھا اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہدایت دی؟ اور کیا تم مفلس نہ تھے اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں تونگر کر دیا؟ کیا تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن نہ تھے اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک دوسرے کا دوست بنا دیا؟

انصار: کیوں نہیں؟ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہم پر بہت کچھ احسانات کیے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ: اے گروہ انصار! کیا تم مجھے جواب نہ دو گے!

انصار: یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ ہم سے کس قسم کا جواب چاہتے ہیں؟ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہم پر واقعی احسانات کیے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ: بخدا! اگر تم چاہتے تو جواب دے سکتے تھے اور یہ جواب درست ہوتا اور اس کی تصدیق بھی کی جاتی مثلاً تم یہ کہہ سکتے تھے کہ ''تو اس حالت میں آیا تھا کہ لوگ تیری تکذیب کرتے تھے مگر ہم نے تیری تصدیق کی، تجھ سے سب نے منہ موڑ لیا تھا مگر ہم نے تیری نصرت کی، تجھے وطن سے بے وطن کر دیا گیا تھا لیکن ہم نے تجھے پناہ دی، تو مفلس تھا مگر ہم نے تجھ سے ہمدردی کی۔''
اے گروہ انصار! کیا تم دنیا کے اس مختصر سے مال پر جو میں نے نو مسلموں کی دلجوئی اور تالیف قلب کی خاطر انہیں دیا ہے، دل پر میل لاتے ہو؟ حالانکہ میں نے تمہاری ایمانی پختگی پر پورا پورا

Marfat.com

اعتماد کیا ہے۔ اے گروہ انصار! کیا تم اس بات سے مسرور و مطمئن نہیں ہو کہ لوگ تو اپنے ہمراہ اونٹ، بکریاں اور بھیڑیں لے جائیں گے اور تمہارے ہمراہ خدا کے رسول ﷺ ہوں گے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار میں سے ایک فرد ہوتا۔ اگر باقی لوگ ایک راہ پر چلیں اور انصار دوسری راہ پر تو میں بھی انصار کی راہ پر چلوں گا۔ اے اللہ! انصار پر، انصار کے بیٹوں پر اور ان کے بیٹوں کے بیٹوں پر رحم فرما۔

آپ ﷺ نے یہ باتیں کچھ اتنی دلسوزی سے کیں کہ انصار پر ان کا بہت زیادہ اثر ہوا، حقیقت میں آپ ﷺ کے دل میں ان لوگوں کے لیے خاصی گنجائش تھی جنہوں نے آپ ﷺ سے بیعت کی تھی اور آپ ﷺ کی نصرت میں پیش پیش رہے تھے۔ انہوں نے عزت پائی اور آپ ﷺ کی عزت افزائی کے لیے بھی اسباب کیے۔ انصار اتنے متاثر ہوئے کہ ان کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ کہنے لگے، ہم اس بات سے خوش ہیں کہ خدا کا رسول ﷺ ہمارے حصے میں آئے۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے طرز عمل سے یہ بات بھی ثابت کر دی تھی کہ جو مالِ غنیمت میں حاصل ہوا تھا آپ ﷺ کے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی حالانکہ اتنا مال پہلے کبھی نہ ملا تھا۔ آپ ﷺ نے اس مال سے ان لوگوں کی تالیف قلوب کا کام لیا جو چند ہفتے قبل کفر و شرک کی دلدلوں میں پھنسے ہوئے تھے تاکہ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے کہ انہوں نے جو دین قبول کیا ہے اس میں دنیا کی سعادت بھی ہے اور آخرت کی فلاح بھی۔ گو اس مال کی تقسیم سے آپ ﷺ کو ذہنی کوفت ہوئی تھی اس لیے کہ خود مسلمانوں کے دلوں میں غلط فہمیاں راہ پا گئی تھیں اور انصار نو مسلموں پر عطیات کی بارش سے کبیدہ خاطر ہو گئے تھے لیکن آپ ﷺ نے اس کے باوجود اس مال کی تقسیم میں ایسے عدل و انصاف، مآل اندیشی اور حسن تدبر سے کام لیا کہ عربوں کی یہ کثیر تعداد اس حال میں واپس آئی کہ کسی کو کوئی شکایت نہ تھی، سب خوش اور مطمئن تھے اور خدا کی راہ میں اپنی جانیں قربان کر دینے کے لیے تیار تھے۔

پیغمبر اسلام ﷺ جعرانہ سے ادائے عمرہ کے ارادے سے عازم مکہ ہوئے۔ اس موقع پر آپ نے عتاب بن اسید کو مکہ میں اپنا جانشین مقرر کیا۔ علاوہ بریں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یہ خدمت سونپی کہ وہ لوگوں کو دینی تعلیم دیں۔ آپ ﷺ نے خود انصار اور مہاجرین کے ہمراہ مدینہ کا رخ کیا اور وہاں اپنے بیٹے ابراہیمؓ کی ولادت تک توقف کیا۔ اس دوران میں آپ کو کچھ عرصے کے لیے دنیاوی ہنگاموں سے سکون بھی حاصل ہو گیا۔ بعد ازاں آپ نے غزوۂ تبوک کے لیے تیاری کا حکم دیا۔

Marfat.com

حواشی

۱۔ وادیٔ حنین مکہ سے جنوب مشرق کی طرف ہے اور حنین و مکہ دونوں سے سمندر عین مغرب کی سمت! یہی بحیرۂ احمر ہے۔
(نقشہ عرب)

۲۔ فی اوقیہ بمساوی ۱۰ تولہ (پاکستانی) ''اربع الاقاویل فی اصح الموازین والمکائیل'' (مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی)۔ اس حساب سے چار ہزار اوقیہ کا وزن چار لاکھ بیس ہزار تولہ۔

۳۔ نوفل بن معاویہ دئلی جو فتح مکہ کے روز اسلام لائے۔ (زاد المعاد از ابن قیم واصابہ از ابن حجر)

۴۔ بوجہ رضاعت سیدہ حلیمہ سعدیہ جن کی صاحب زادی جناب شیما غزوۂ اوطاس میں گرفتار ہوئیں۔ اس رضاعت کی وجہ سے جناب عبداللہ و انیسہ اور حذیفہ ابنائے حارث از بطن حلیمہ آنحضرت ﷺ کے عم بزرگوار کے رشتہ دار تھے۔
(اصابہ از ابن حجر در تذکرہ بی بی شیما)

Marfat.com

باب 24

مدینہ کو واپسی

فتح مکہ کا عرب پر اثر

فتح مکہ غزوہ حنین میں کامیابی اور محاصرہ طائف کے بعد آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے۔ عرب میں ہر شخص پر یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ عرب کے طول و عرض میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو آپ ﷺ کے مقابلے میں ٹھہر سکے۔ کسی کے اندر یہ ہمت اور یہ مجال بھی نہ تھی کہ وہ آپ ﷺ کے یا اسلام کے خلاف زبان طعن و تشنیع دراز کرے۔ انصار و مہاجرین جو آپ کے ہمراہ ان فتوحات کے بعد واپس آئے اس بات سے خوش تھے کہ رب قدوس نے اپنے نبی ﷺ کو فتح مکہ سے نوازا اور اہل مکہ کو اسلام کی ہدایت دی۔ عرب کے مختلف قبائل دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے چنانچہ اب یہ مسلمان دنیا کے ہنگاموں سے الگ تھلگ رہ کر آرام و آسائش سے زندگی کے دن گزارنے لگے۔ نبی کریم ﷺ مکہ میں عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو دینی مسائل اور قرآن کی تعلیم کے لیے معلم مقرر کر آئے تھے۔ اس جلیل القدر فتح نے جس کی نظیر تاریخ عرب اور اس کی روایات میں مفقود تھی تمام اہل عرب پر بہت زیادہ اثر کیا۔ اس چیز نے ان سرداروں اور پیشواؤں کے دلوں پر بھی اثر ڈالا جن کے وہم و گمان میں بھی کبھی ایسے دن اور ایسے حالات کا تصور نہ آیا تھا جب ان کی گردنوں میں آنحضرت ﷺ کی اطاعت کا طوق ہو گا۔ اس سے وہ شعراء بھی متاثر ہوئے جو ان سرداروں کی خوشنودی مزاج کے لیے ان کے خیالات کو اپنے اشعار میں پیش کرتے تھے اور انہیں مختلف قبائل کی تائید اور حمایت حاصل تھی۔ وہ بادیہ نشین اور خانہ بدوش قبائل بھی اس کا اثر قبول کیے بغیر نہ رہ سکے جو اپنے جذبہ آزادی کی خاطر بڑی سے بڑی قربانیاں دینے کے لیے تیار رہتے تھے اور جو کبھی یہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ وہ اپنے مخصوص پرچم کے علاوہ بھی کسی دوسرے علم کے نیچے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ شعراء کی شعر گوئی، سرداروں کی سرداری اور قبائل کی خود احتیاطی ایسی چیزوں کی اس غیر معمولی طاقت کے مقابلے میں حقیقت ہی کیا تھی جس کی ٹکر کوئی طاقت بھی نہ سنبھال سکتی تھی۔

کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ کا قصہ

فتح مکہ نے عربوں کے دلوں پر اتنا اثر کیا تھا کہ جب نبی کریم ﷺ طائف سے واپس آئے تو بجیر بن زہیر نے اپنے بھائی کعب بن زہیر کو ایک خط لکھا اور اس میں اسے یہ اطلاع دی کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے مکہ

Marfat.com

میں ان لوگوں کو تہ تیغ کر دیا ہے جو آپ ﷺ کو ہجو کر کے آپ ﷺ کو اذیت دیا کرتے تھے اور اس قسم کے جو شعراء باقی رہ گئے ہیں انہوں نے راہ فرار اختیار کی ہے میں تمہیں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ تم فوراً آپ ﷺ کی خدمت میں مدینہ پہنچو کیونکہ جو شخص آپ ﷺ کی خدمت میں اپنے فعل سے تائب ہو کر لوٹ آتا ہے، آپ ﷺ اسے قتل نہیں کرتے۔ ہاں اگر تم پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونا نہیں چاہتے تو پھر تمہیں چاہیے کہ کسی دور دراز علاقے میں پہنچ کر اپنی جان بچالو۔ بجیر نے سچ کہا تھا کیونکہ مکہ میں آپ ﷺ کے حکم سے چار اشخاص کے سوا اور کسی کو قتل نہ کیا گیا تھا جن میں سے ایک شاعر بھی تھا جس کی ہجو گوئی سے آپ ﷺ کو اذیت پہنچی تھی۔ دو شخص وہ تھے جنہوں نے آپ ﷺ کی بیٹی زینب ؓ کو اس موقع پر ایذا دی تھی جب وہ اپنے شوہر کی اجازت سے اپنے والد محترم کے پاس مدینہ جا رہی تھیں۔

کعب کو اپنے بھائی کے بیان کی صداقت پر یقین آ گیا اور اس نے یہ بات سمجھ لی کہ اگر وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر نہ ہو گا تو عمر بھر سرگرداں رہے گا۔ چنانچہ کعب بن زہیر بہ عجلت تمام مدینہ منورہ پہنچا اور وہاں اپنے ایک قدیم دوست کے یہاں فروکش ہوا۔ صبح ہوئی تو مسجد میں آ کر آپ ﷺ سے امان طلب کی اور اپنا وہ مشہور قصیدہ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے:

بَانَتْ سُعَادُ فَقَلْبِی الْیَوْمَ متبولُ
مُتَیَّمٌ اِثْرَهَا لَمْ یُفْدَ مَکْبُوْلُ

"سعاد داغ مفارقت دے گئی اور آج میرا دل اس کے فراق میں اتنا نڈھال، وارفتہ اور پابہ زنجیر ہے کہ اس کی رہائی ناممکن ہے۔"

پیغمبر اسلام ﷺ نے اسے معافی دے دی، بعد ازاں کعب بن زہیر ؓ قبولِ اسلام کے بعد راسخ العقیدہ مسلمان ہو گئے۔

وفود کی آمد

فتح مکہ کے نتائج و اثرات میں سے ایک چیز یہ بھی تھی کہ عرب کے مختلف قبائل آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے اور سر تسلیم خم کرنے لگے چنانچہ بنی طے کا ایک وفد زید الخیل کی سرکردگی میں آپ ﷺ کے پاس آیا۔ آپ ﷺ نے اس وفد کی خوب آؤ بھگت کی۔ زید نے آپ ﷺ سے گفتگو کی آپ ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا: عربوں میں سے جس جس شخص کے فضائل میرے سامنے بیان کیے گئے میں نے ملاقات اور گفتگو کے بعد انہیں اس معیار پر نہیں پایا جوان کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ زید الخیل کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس کے تمام فضائل مجھے بتائے نہیں گئے۔ آپ ﷺ نے زید کا نام زید الخیل کے بجائے زید الخیر رکھ دیا۔ زید کے ساتھ بنی طے کے وہ تمام افراد بھی اسلام لے آئے جو اس وفد میں شامل تھے۔

حاتم طائی کا بیٹا عدی عیسائی تھا وہ آپ ﷺ کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ جب اس نے

آپ ﷺ کی اور مسلمانوں کی عرب میں شاندار ترقی کے تذکرے سنے تو وہ اپنے اہل و عیال اور مویشیوں سمیت وہاں سے کوچ کر کے شام میں اپنے ہم مذہب عیسائیوں سے آ ملا۔ عدی نے ان ایام میں راہ فرار اختیار کی جب آپ ﷺ نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بنی طے کے بت کو توڑنے کے لیے روانہ کیا تھا۔ حضرت علیؓ نے بت توڑ ڈالا اور غنیمت اور قیدی ہمراہ لے کر لوٹ آئے۔ قیدیوں میں حاتم طائی کی ایک بیٹی یعنی عدی کی بہن بھی تھی، اسے مسجد کے دروازے کے قریب اس احاطے میں محصور رکھا گیا جہاں قیدیوں کو بند کیا جاتا تھا۔ جب آپ ﷺ اس کے پاس سے گزرے تو وہ کھڑی ہو کر کہنے لگی: اے اللہ کے رسول ﷺ! میرا باپ تو دنیا سے سدھار گیا ہے اور میرا مددگار بھائی غائب ہے۔ آپ ﷺ میرے ساتھ احسان کریں تا کہ خدا آپ ﷺ کے ساتھ احسان کرے۔ جب آپ ﷺ کو پتا چلا کہ اس کا بھائی عدی بن حاتم ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے خوف زدہ ہو کر فرار ہو گیا ہے تو آپ ﷺ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا لیکن اس نے دوبارہ اپنے باپ کے جود و سخا کا تذکرہ کیا جس کی شہرت عرب میں دور دور تک تھی تو آپ ﷺ نے اس کی رہائی کا حکم دیا اور اسے خوبصورت جوڑا مرحمت فرمایا اور زادِ راہ دے کر شام کی طرف جانے والے قافلے کے ہمراہ اس کے بھائی کے پاس بھیج دیا۔ شام پہنچ کر جب اس کی ملاقات اپنے بھائی سے ہوئی تو اس نے اس حسن سلوک کا ذکر کیا جو آپ ﷺ نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ عدی نے شام سے واپس آ کر آنحضرت ﷺ سے ملاقات کی اور اسلام قبول کر لیا۔ غرض فتح مکہ فتح حنین اور محاصرہ طائف کے بعد عرب کے مختلف قبائل اور ان کے پیشوا آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے دعوتِ اسلام پر لبیک کہا۔ آپ ﷺ اس دوران میں خدا کی تائید و نصرت پر اعتماد رکھتے ہوئے مدینہ میں امن و سکون سے زندگی بسر کرتے رہے۔

زینب رضی اللہ عنہا کی وفات

جہاں تک آپ ﷺ کے ذاتی اور خانگی حالات کا تعلق ہے آپ ﷺ کو ندرے تشویش تھی اور وہ اس لیے کہ آپ ﷺ کی دخترِ نیک اختر حضرت زینب رضی اللہ عنہا سخت علیل تھیں اور ان کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ ان کی صحت اس روز سے سنبھلی نہ تھی جب مکہ سے چلتے وقت حویرث اور ہبار کی ایذا رسانی سے ان کا حمل ساقط ہو گیا تھا، آخر اس مرض کا انجام موت ہوا۔ زینب رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی اولاد میں صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا باقی رہ گئی تھیں کیونکہ اُم کلثوم رضی اللہ عنہا اور رقیہ رضی اللہ عنہا دونوں زینب رضی اللہ عنہا سے پہلے ہی وفات پا چکی تھیں۔ آپ ﷺ کو زینب رضی اللہ عنہا کی وفات کا بہت غم ہوا اس موقع پر آپؐ کو ان کی نیک خصلتوں اور اپنے شوہر ابوالعاص بن ربیع سے وفاداری کا خیال آیا۔ ابوالعاص غزوۂ بدر میں قیدی بن کر آیا تھا۔ زینب رضی اللہ عنہا نے باجود اس کے کہ خود مسلمان تھیں اور ان کا شوہر مشرک، اس کی رہائی کے لیے فدیہ پیش کیا تھا حالانکہ وہ ان کے باپ ﷺ کے خلاف لڑتا رہا اور اگر قریش اس لڑائی میں غالب آ جاتے تو وہ ان کے باپ ﷺ کو زندہ نہ

Marfat.com

چھوڑتے۔ آپ ﷺ کو زینب رضی اللہ عنہا کے اخلاق اور پاسِ وفا کے علاوہ وہ تکالیف بھی یاد آئیں جو مدینہ میں آمد سے لے کر وفات تک انہیں بسلسلہ علالت برداشت کرنی پڑی تھیں۔ آپ ﷺ ہمیشہ ہر مصیبت زدہ کی مصیبت میں شریک ہوتے اور ہر دکھی کا دل مٹھی میں لیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ مدینہ کے اطراف و جوانب میں بیماروں کی عیادت کے لیے جاتے۔ مصیبت زدوں سے ہمدردی کرتے اور زخم رسیدوں کی خبر گیری رکھتے تھے۔ آپ ﷺ کو اپنی بیٹی کے انتقال کا صدمہ پہنچا۔ اس سے پہلے آپ ﷺ دوسری دو بیٹیوں کا صدمہ اٹھا چکے تھے۔ بعثت سے قبل آپ ﷺ کے بیٹے کا انتقال بھی ہو گیا تھا۔ قدرتی تقاضا تھا کہ آپ ﷺ نہایت غم زدہ ہوتے اور غم کی سوزش حد سے زیادہ بڑھ جاتی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آپ ﷺ کے سکون و اطمینان کے اسباب فراہم کیے۔

ابراہیم رضی اللہ عنہ کی ولادت

اللہ تعالیٰ نے کچھ ہی عرصے کے بعد ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے آپ ﷺ کو ایک فرزند ارجمند عطا کیا۔ آپ ﷺ نے ابو الانبیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام پر جو فطرتاً حنیف تھے اس بیٹے کا نام ابراہیم رضی اللہ عنہ رکھا۔ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا جب سے انہیں مقوقس نے آپ ﷺ کی خدمت میں ہدیے کے طور بھیجا تھا آپ ﷺ کی لونڈیوں میں شمار ہوتی تھیں اس لیے دیگر ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی طرح مسجد نبوی ﷺ سے متصل انہیں کوئی علیحدہ مکان نہ ملا تھا بلکہ آپ ﷺ نے مدینہ کے اطراف میں اس مقام کے جوار میں جو اب مشربہ ام ابراہیم (ابراہیم رضی اللہ عنہ کی والدہ کا گھاٹ) کہلاتا ہے ایک ایسے مکان میں ٹھہرا رکھا تھا جس کے اردگرد انگور کی بیلیں تھیں۔ آپ ﷺ ان کے یہاں اسی طرح آیا جایا کرتے تھے جس طرح کوئی اپنی لونڈی کے ہاں آمدورفت رکھتا ہے۔ مقوقس نے انہیں ان کی بہن سیرین کے ساتھ پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس بطور ہدیہ بھیجا تھا تو آپ ﷺ نے انہیں پسند فرمایا تھا اور سیرین حضرت حسان رضی اللہ عنہ بن ثابت کے حوالے کر دی گئی تھیں۔

اُم المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد یہ دیکھ کر کہ آپ ﷺ کی تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے کسی کے ہاں بھی پورے دس سال میں کسی بچے یا بچی کی ولادت کی خوشخبری سننے میں نہیں آئی حالانکہ ان میں سے بعض ابھی جوان تھیں اور بعض درمیانی عمر کی اور آپ ﷺ کے عقد میں آنے سے قبل بعض کے اولاد بھی ہو چکی تھی، آپ ﷺ کو آئندہ اولاد کی کوئی امید نہ تھی۔ جب ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا حاملہ ہوئیں اور ان کے بطن سے ابراہیم رضی اللہ عنہ متولد ہوئے تو آپ ﷺ کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہو چکی تھی، اس لیے آپ ﷺ کا دل مسرت سے لبریز ہو گیا اور بتقاضائے بشریت آپ ﷺ کو اتنی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ بیٹے کی ولادت سے آپ ﷺ کی نظر میں ماریہ رضی اللہ عنہا کا رتبہ کنیزی سے بڑھ کر زوجیت کے درجے تک پہنچ گیا اور ان کی قدرومنزلت بھی آپ ﷺ کی نگاہوں میں بہت زیادہ ہو گئی۔

Marfat.com

ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا اور دیگر ازواج

ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی اس قدرومنزلت سے باقی تمام ازواج کے دلوں میں جذبہ رشک وغیرت بیدار ہو گیا۔ یہ جذبہ خصوصیت سے اس لیے اور بیدار ہوا کہ ماریہ رضی اللہ عنہا ابراہیم رضی اللہ عنہ کی ماں بن چکی تھیں اور وہ سب لاولد تھیں۔ نومولود سے آپ ﷺ جس شفقت سے پیش آتے تھے اس نے اور بھی اس جذبہ رشک کو قوت پہنچائی۔ آپ ﷺ ابورافع کی بیوی کی جو ابراہیم رضی اللہ عنہ کی دایہ تھیں بہت آؤ بھگت کرتے تھے۔ جس روز ابراہیم رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی آپ ﷺ نے ہر مسکین کو ابراہیم رضی اللہ عنہ کے سر کے بالوں کے برابر تول کر چاندی کا صدقہ کیا۔ ابراہیم رضی اللہ عنہ کو دودھ پلانے کے لیے آپ ﷺ نے ام سیف کی خدمات حاصل کیں اور اسے سات بکریاں دیں تاکہ ابراہیم رضی اللہ عنہ کو ان کا دودھ پلایا جائے۔ آپ ﷺ ہر روز ماریہ رضی اللہ عنہا کے ہاں جاتے اور بچے کی معصومانہ اداؤں سے مسرور ہوتے۔ بھلا ان باتوں سے بڑھ کر جذبہ غیرت کی برانگیختگی اور کس چیز سے ہوسکتی تھی اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کہاں تک اس جذبے کو دبا سکتی تھیں۔

ایک دن آپ ﷺ ابراہیم رضی اللہ عنہ کو بازوؤں میں لے کر ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس لائے۔ آپ ﷺ کا چہرہ انور مسرت سے دمک رہا تھا۔ آپ ﷺ نے اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا سے کہا: دیکھو تو سہی مجھ میں اور ابراہیم رضی اللہ عنہ میں کتنی مشابہت ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بچے پر ایک نظر ڈالی اور کہا، مجھے تو آپ دونوں میں کوئی مشابہت نظر نہیں آتی۔ جب اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا نے یہ دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ فرزند کو دیکھ کر باغ باغ ہو رہے ہیں تو رشک میں اور شدت پیدا ہوگئی۔ عرض کیا ہر بچہ جو دودھ پیتا ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ تندرست ہوتا ہے۔ غرض ابراہیم رضی اللہ عنہ کی ولادت نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں خفگی اور ناراضی کے بیج بودیے۔ یہ خفگی صرف تلخ وترش جوابات ہی تک محدود نہ تھی بلکہ کچھ اس سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔ اس کا ذکر آپ ﷺ کی سیرت اور تاریخ اسلام کے صفحات میں رہ گیا ہے۔ اس سے متعلق وحی کا نزول بھی ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد کے ذریعے سے آپ ﷺ کے تقدس کا اعلان کر دیا۔

نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کی ازواج

ان نتائج کا ظہور ایک قدرتی چیز تھی۔ آپ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا مقام اتنا بلند کر رکھا تھا کہ عرب کی تاریخ میں اس سے قبل اس کی نظیر نہیں ملتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بار دوران گفتگو میں کہا تھا۔

> ''ہم ایام جاہلیت میں عورتوں کو کسی شمار قطار میں نہ لاتے تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں احکام نازل فرمائے اور ان کے لیے بھی حصہ مقرر کر دیا۔ چنانچہ ایک بار میں ایک معاملے میں مشورہ کر رہا تھا۔ جب میری بیوی نے کہا اس معاملے میں یہ راہ اختیار کرو۔ میں نے اس سے کہا تجھے اس معاملے سے کیا سروکار ہے؟ تو اس معاملے

Marfat.com

میں خواہ مخواہ کیوں دخل دیتی ہے۔؟ وہ کہنے لگی اے ابن خطاب! تعجب ہے کہ تو یہ بات بھی پسند نہیں کرتا کہ تجھ سے بات بھی کی جائے حالانکہ تیری بیٹی پیغمبر اسلام ﷺ سے مختلف امور میں تکرار کرتی رہتی ہے حتیٰ کہ بعض اوقات نبی ﷺ کو سارے سارے دن غم وغصہ میں وقت گزارنا پڑتا ہے۔ میں اپنی چادر لے کر گھر سے باہر نکلا اور حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس آ کر اس سے پوچھا: اے بیٹی کیا تو پیغمبر علیہ السلام سے معاملات میں تکرار کرتی ہے حتیٰ کہ وہ سارے سارے دن غم وغصہ میں وقت گزارتے ہیں۔ حفصہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا بخدا ہم آپ ﷺ سے تکرار کرتی ہیں۔ میں نے کہا تجھے خدا کے غضب اور پیغمبر ﷺ کی ناراضی سے ڈرنا چاہیے۔ اے بیٹی! تو اس عورت کی ریس نہ کر جو اپنے حسن و جمال پر اور پیغمبر اسلام ﷺ کی محبت پر ناز کرتی ہے۔ بعدازاں میں وہاں سے اٹھ کر ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا کیونکہ میرا ان سے قریبی رشتہ تھا۔ ان سے بھی میں نے اس بارے میں بات چیت کی۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے مجھ سے کہا: اے ابن خطاب! تعجب ہے تو ہر معاملے میں حتیٰ کہ پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ ﷺ کی ازواج کے معاملے میں بھی دخیل ہو رہا ہے۔ یہ جواب ایسا تھا کہ مجھے اپنے فعل پر ندامت ہوئی اور میں وہاں سے چلا آیا۔‘‘

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں حاضری کی اجازت مانگی، اجازت ملی تو حاضر ہوئے۔ بعدازاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت مانگی، انہیں بھی اجازت مل گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے اردگرد آپ ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن جمع ہیں اور آپ ﷺ غم وغصہ میں خاموش بیٹھے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دل میں سوچا کہ میں کوئی ایسی بات کہوں جس سے آپ تبسم فرمائیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! اگر خارجہ کی بیٹی (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ازواج کی جو فہرست ’’الفاروق‘‘ میں مولانا شبلی نعمانی نے دی ہے اس میں بنتِ خارجہ کا نام نہیں ہے۔ صحیح مسلم، طبری اور روح المعانی میں اس نام سے متعلق مختلف روایات ہیں۔ مؤخرالذکر کی روایت ’’بنتِ زید‘‘ درست معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ عاتکہ بنتِ زید فاروقِ اعظم کی ازواج میں شامل تھیں) کو میں دیکھوں کہ وہ مجھ سے نفقہ مانگتی ہے تو میں اٹھ کر اس کی گردن پر دھول ماروں۔ اس بات پر پیغمبر ﷺ کو ہنسی آ گئی اور آپ ﷺ نے فرمایا: یہ سب جمع ہو کر مجھ سے نفقہ کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ایک دھول ماری اور اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُم المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے ایک دھول رسید کی اور ان دونوں نے اپنی بیٹیوں سے کہا: کیا تم پیغمبر اسلام ﷺ سے اس چیز کی طلب کرتی ہو جو آپ ﷺ کے پاس نہیں ہے؟ انہوں نے کہا بخدا ہم آئندہ اس

Marfat.com

قسم کا کوئی مطالبہ نہ کریں گی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ آپ ﷺ نماز کے لیے مسجد نبوی ﷺ میں تشریف نہ لائے تھے اور مسلمان آپس میں اسی موضوع پر چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ اُم المؤمنین حضرت عائشہ ﷺ اور اُم المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے تقاضوں سے متعلق اور حضرات ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کی گفتگو کے بارے میں مندرجہ ذیل آیات نازل ہوئیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۲۸﴾ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾

(سورۃ الاحزاب: ۲۸،۲۹)

”اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیوی زندگی اور آسائش و آرائش کی خواہاں ہو تو آؤ میں تم کو تمہارا حق دے کر اچھی طرح رخصت کر دیتا ہوں اور اگر تم خدا اس کے رسول ﷺ اور آخرت کی خواہاں ہو تو جان لو کہ اللہ نے تم میں سے اچھے کام کرنے والیوں کے لیے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔“

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا باہمی مشورہ

اس واقعے کے بعد آپ ﷺ کی ازواج آپ ﷺ کے خلاف مشورے کیا کرتی تھیں۔ آپ ﷺ کا معمول تھا کہ نماز عصر کے بعد اپنی ازواج کے یہاں تشریف لے جاتے تھے۔ ایک روز ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے یہاں اور دوسری روایت کے مطابق زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے یہاں تشریف لے گئے۔ وہاں آپ ﷺ نے معمول سے زیادہ وقت گزارا۔ اس سے باقی ازواج کو رشک ہوا۔ اُم المؤمنین حضرت عائشہ ﷺ کا بیان ہے کہ میں نے اور حفصہ رضی اللہ عنہا نے صلاح کی کہ ہم میں سے جس کے پاس بھی آپ ﷺ آئیں وہ آپ ﷺ سے یہ کہے کہ مجھے آپ ﷺ سے مغافیر کی بو آتی ہے، معلوم ہوتا ہے آپ ﷺ نے مغافیر تناول کی ہے (مغافیر ایک میٹھی شے ہے جس کی بو مکروہ ہوتی ہے) چنانچہ جب آپ ﷺ ان میں سے ایک کے یہاں تشریف لے گئے تو اس نے آپ ﷺ سے یہی بات کہی۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں نے زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے یہاں شہد پیا ہے، آئندہ نہیں پیوں گا۔ سودہ رضی اللہ عنہا نے جنہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اسی قسم کا صلاح مشورہ کر رکھا تھا، بیان کیا ہے کہ جب پیغمبر ﷺ میرے قریب آئے تو میں نے آپ ﷺ سے کہا کیا آپ ﷺ نے مغافیر تناول کی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ میں نے کہا پھر یہ بو کیسی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا، حفصہ رضی اللہ عنہا نے مجھے شہد پلایا ہے۔ میں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ شہد کی مکھیوں نے ضرور عرفط کے درخت کا رس چوسا ہوگا۔ آپ ﷺ اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے یہاں گئے

Marfat.com

تو انہوں نے بھی وہی بات کہی جو اُم المؤمنین سودہ رضی اللہ عنہا نے کہی تھی۔ پھر جب آپ اُم المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے تو انہوں نے بھی وہی بات دہرائی۔ اس پر آپ ﷺ نے شہد اپنے اوپر حرام کرلیا۔ اس پر سودہ رضی اللہ عنہا نے کہا: سبحان اللہ! بخدا ہم نے شہد آپ ﷺ پر حرام کیا ہے۔ اس پر اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اُم المؤمنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی طرف رازدارانہ نگاہ سے دیکھا اور کہا، خاموش رہو۔

چونکہ آنحضرت ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا مقام عرب کی ان عورتوں کی نسبت کہیں بلند کر دیا تھا جنہیں معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہ تھا اس لیے یہ ایک قدرتی تقاضا تھا کہ وہ اپنے اس مقام سے ناجائز فائدہ اٹھاتیں جس سے عرب کی دوسری عورتیں محروم تھیں اور آپ ﷺ سے کبھی کبھی ایسی باتیں بھی کرتیں جن سے آپ ﷺ دن بھر خفگی کے عالم میں وقت گزارتے۔ آپ ﷺ کو بارہا ان سے روگردانی کرنا پڑتی تاکہ آپ ﷺ کی حد سے بڑھی ہوئی نرمی انہیں مزید سرکشی پر آمادہ نہ کردے اور وہ اپنے جذبہ غیرت کے اظہار میں اس انتہا کو نہ پہنچ جائیں جہاں ان کی اصلاح کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ جب ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ابراہیم رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی تو آپ ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو جذبہ غیرت نے کسی قدر ادب نا آشنا کر دیا تھا۔ آپ ﷺ کے اور اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس میں اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے اور ابراہیم رضی اللہ عنہ کے درمیان مشابہت بھی تسلیم نہ کی تھی تاکہ اس طرح ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی عصمت مشتبہ ہو جائے حالانکہ آپ ﷺ کو یقین کے درجے تک ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی پاک دامنی کا علم تھا۔

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی ہیجانی کیفیت

اتفاق سے ایک روز اُم المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اپنے میکے گئی ہوئی تھیں جہاں وہ اپنے باپ سے باتوں میں مصروف رہیں۔ اس دن آنحضرت ﷺ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے یہاں رونق افروز تھے، اتنے میں ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا بھی وہاں آ گئیں اور کچھ دیر یہیں ٹھہری رہیں۔ جب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا واپس آئیں اور ماریہ رضی اللہ عنہا کو اپنے گھر میں دیکھا تو ان کا جذبہ غیرت بھڑک اٹھا۔ وہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے چلے جانے کے انتظار میں رہیں اور جوں جوں انتظار بڑھتا گیا، جذبہ غیرت کی آگ اور برانگیختہ ہوگئی۔ جب ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا چلی گئیں تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے پاس آئیں اور بولیں: ''میں نے دیکھ لیا ہے کہ آپ ﷺ کے پاس کون تھا؟ بخدا آپ ﷺ نے میری توہین کی ہے۔ اگر آپ ﷺ نے مجھے ذلیل و خوار نہ سمجھا ہوتا تو آپ ﷺ ایسا نہ کرتے۔'' آپ ﷺ یہ بات سمجھ گئے کہ جذبہ غیرت حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو اس بات پر اکسائے گا کہ انہوں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کا اظہار دوسری ازواج کے سامنے بھی کریں چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو راضی کرنا چاہا اور یہ قسم کھائی کہ اگر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اس بات کا جو انہوں نے دیکھی ہے کسی سے تذکرہ نہ کریں تو ماریہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ پر حرام ہوگی۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے وعدہ کرلیا لیکن

Marfat.com

جذبہ غیرت حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ اس لئے وہ اس راز کا اخفا نہ کرسکیں بلکہ چوری چوری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہہ دیا۔ اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی اشارات و کنایات میں آپ ﷺ پر یہ بات واضح کردی کہ وہ راز جو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے سینے میں محفوظ تھا مجھ پر بھی اس کا انکشاف ہو گیا ہے۔ غالباً یہ راز صرف اُم المؤمنین حفصہ رضی اللہ عنہا اور اُم المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا تک ہی محدود نہ رہا تھا بلکہ جب ان دونوں نے حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کے اس واقعے کے بعد آپس میں صلاح مشورہ کیا اور باقی ازواج کو بھی اس کا علم ہوا کہ آپ ﷺ نے ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کا مقام بلند کردیا ہے تو وہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی ہم زبان ہو گئیں۔ یہ واقعہ بجائے خود اتنا اہم نہ تھا کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کا اپنی بیوی یا لونڈی کی جانب میلان ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ کچھ اس نوعیت کا نہ تھا کہ اس کی آڑ لے کر حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کی بیٹیاں اودھم مچا کر آپ ﷺ سے انتقام لیتیں اور وہ بھی اس بنا پر کہ آپ ﷺ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی جانب زیادہ میلان کیوں رکھتے ہیں؟ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ نان ونفقہ کی بنا پر یا اس شہد کے باعث جو آپ ﷺ نے زینب رضی اللہ عنہا کے یہاں کھایا تھا یا بعض دیگر اسباب کی بنیاد پر آپ کی ازواج آپ ﷺ سے روٹھ جایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی ان کی خفگی کا باعث یہ ہوتا کہ آپ اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یا حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کی جانب زیادہ میلان کیوں رکھتے ہیں؟ کبھی کبھی انہی وجوہ کی بنا پر آپ ﷺ کی ازواج تیور بدل کر بھی گفتگو کیا کرتی تھیں۔

زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا اور عائشہ رضی اللہ عنہا

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی یہ آزادی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ایک دن جب آپ ﷺ اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے یہاں رونق افروز تھے سب نے زینب رضی اللہ عنہا بنت جحش کو اپنی وکالت کے لئے آپ ﷺ کے پاس بھیجا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے برملا آپ ﷺ سے یہ بات کہی کہ آپ ﷺ اپنی ازواج کے سلسلے میں عدل و انصاف نہیں فرماتے، عائشہ کی جانب آپ ﷺ کا میلان ہماری حق تلفی کے مترادف ہے۔ کیا آپ ﷺ نے اپنی ہر اہلیہ کے لئے ایک دن اور ایک رات کی تخصیص نہیں کی؟ لیکن جب اُم المؤمنین سودہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ آپ ﷺ ان کی طرف توجہ نہیں فرماتے اور آپ ﷺ ان سے خوش نہیں تو انہوں نے اپنی باری کے دن رات آپ ﷺ کی خوشنودیٔ مزاج کی خاطر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لئے چھوڑ دیئے تھے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے صرف اسی بات پر اکتفا نہ کیا کہ آپ ﷺ اپنی ازواج کے سلسلے میں عدل و انصاف روا نہیں رکھتے۔ بلکہ انہوں نے اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں بھی جو سامنے بیٹھی تھیں کچھ سخت و سست باتیں کیں۔ اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن آنحضرت ﷺ کے اشارے سے خاموش رہیں اور ان کے جذبات پر اوس پڑ گئی لیکن حضرت زینب رضی اللہ عنہا ان کی خاموشی کے باوجود اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ترش و تلخ باتیں کرتی رہیں۔ غرض

Marfat.com

آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی اپنی مدافعت کی اجازت دے دی۔ پھر کیا تھا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس انداز میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی باتوں کی کاٹ کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا، اس سے آنحضرت ﷺ کو خوشی ہوئی اور آپ ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی کی زبان آوری پر دنگ رہ گئے۔

چونکہ آپ ﷺ اپنی بعض ازواج کو بعض پر ترجیح دیتے تھے۔ اس لئے بعض اوقات آپ ﷺ کی ازواج کے نزاعات اس حد کو پہنچ جاتے تھے کہ اگر وہ ترجیحی سلوک میں آپ ﷺ کو اپنی مرضی کا مالک نہ قرار دیتیں تو آپ ﷺ نے ان میں سے بعض کو طلاق دے دی ہوتی۔ جب ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ابراہیم رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی تو ازواج مطہرات کا جذبہ غیرت ابھر آیا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بہت زیادہ غیرت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ یہ جذبہ غیرت اس لئے اور بھی زیادہ ابھرا کہ آپ ﷺ نے اپنی ازواج کو بہت زیادہ آزادی دے رکھی تھی اور آپ ﷺ ان سے حد درجہ نرمی کا برتاؤ کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے پاس اتنا فارغ وقت نہ تھا کہ آپ ﷺ ان جھگڑوں قضیوں میں پڑتے اور اپنا وقت ضائع کرتے اس لئے یہ ناگزیر تھا کہ آپ ﷺ مستقل مزاجی اور دور اندیشی سے ان کی تادیب کچھ اس انداز سے فرماتے کہ وہ دائرہ اعتدال میں آ جاتیں اور آپ ﷺ پورے اطمینان سے فرائض رسالت کی انجام دہی میں مصروف رہتے۔ اس تادیب کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ﷺ ان سے جدائی اختیار کر کے انہیں طلاق کی دھمکی دیتے تھے تاکہ اگر وہ راہ راست پر آ جائیں تو فبھا ورنہ ادائے حقوق کے بعد آپ ﷺ انہیں خوش اسلوبی سے رخصت کر دیں۔

ازواج سے علیحدگی

آپ ﷺ نے پورے ایک ماہ تک اپنی ازواج سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس دوران آپ ﷺ کی زبان پر ان کی کوئی بات تک نہ آتی تھی، نہ کسی کو یہ جرأت تھی کہ آپ ﷺ کے سامنے اس بارے میں کوئی گفتگو کرے۔ اس مہینے میں آپ ﷺ یہ سوچتے رہے کہ اسلام کی اشاعت اور بیرون عرب اس کی تبلیغ کے لئے آپ ﷺ کو اور مسلمانوں کو کیا راہ عمل اختیار کرنی چاہئے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور آپ ﷺ کے دوسرے اعزہ و اقربا کو یہ اضطراب تھا کہ دیکھئے، ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا کیا حشر ہوتا ہے اور پیغمبر ﷺ کی خفگی اور اس کے نتیجے میں خدا اور اس کے ملائکہ کی ناخوشنودی کیا رنگ لاتی ہے؟ بعض کا تو یہ خیال تھا کہ آپ ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو افشائے راز کی پاداش میں طلاق دے دی ہے۔ مسلمانوں میں یہ چہ میگوئیاں عام تھیں کہ آپ ﷺ اپنی ازواج کو طلاق دینا چاہتے ہیں۔ اس اثناء میں آپ ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اس بات پر نادم تھیں کہ انہوں نے محض جذبہ غیرت کی بنا پر ایسے رحیم و کریم شوہر کو کیوں اذیت دی جو ان کے لئے بھائی، باپ، بیٹا سب کچھ تھے بلکہ اس کے علاوہ ان کی فلاحِ دارین بھی آپ ﷺ ہی سے وابستہ تھی۔ آپ ﷺ اپنا بیشتر وقت ایک بالا خانے میں صرف کرتے (جو ذخیرہ خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا)۔ جب تک آپ ﷺ اس بالا خانے میں رہتے تھے آپ ﷺ کا غلام رباح آستانے پر

Marfat.com

بیٹھا رہتا تھا۔ آپ ﷺ کھجور کے ایک تنے کے سہارے بالا خانے میں آتے جاتے تھے جس سے آپ ﷺ کو دشواری ہوتی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے استرضا کی سعی

اس مہینے کا آخری دن تھا جس کی نسبت آپ نے اپنی ازواج سے علیحدگی کا عہد کر رکھا تھا اور آپ حسب معمول بالا خانے پر رونق افروز تھے۔ مسجد نبوی میں صحابہ اس سوچ میں بیٹھے ہوئے آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ آپ نے اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو طلاق دے دی ہے، اس خیال سے ان کے دل اداس تھے اور چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے بالا خانے کی طرف چلے اور آپ کے غلام رباح سے حاضری کی اجازت چاہی۔ رباح نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس سے انہیں یہ اندازہ ہوا کہ آپ نے اجازت نہیں دی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رباح کو دوبارہ آواز دی لیکن پھر کوئی جواب نہ ملا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلند آواز سے پھر کہا، اے رباح، میرے لئے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کرو۔ آپ ﷺ کو شاید یہ خیال ہے کہ میں اپنی بیٹی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، بخدا اگر آپ ﷺ مجھے حکم دیں تو میں اس کی گردن اتار دینے کے لئے تیار ہوں۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اجازت دے دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بالا خانے میں آئے تو گردو پیش پر ایک نظر ڈال کر رو پڑے۔ آپ نے دریافت فرمایا، اے ابن خطاب روتے کیوں ہو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دیکھ کر روئے تھے کہ آپ ﷺ ایک کھجور کی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے اور کھجور کے ریشوں سے آپ ﷺ کے جسم پر بدھیاں پڑ گئیں تھیں۔ بالا خانے میں ایک مٹھی جو، کچھ ببول کی پھلیوں (دباغت کے کام آتی ہیں) اور چمڑے کی کھال کے سوا جو دیوار پر لٹک رہی تھی اور کچھ نہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سبب گریہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے انہیں دنیا سے بے رغبتی اور زہد کی تلقین فرمائی جس سے انہیں کچھ تسلی ہوئی۔ بعدازاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ، آپ اپنی ازواج کے سلسلے میں کیوں متردد ہیں؟ اگر آپ ﷺ نے ان کو طلاق دے دی ہے تو اللہ، اس کے فرشتے جبرئیل و میکائیل، یہ ناچیز، ابوبکر رضی اللہ عنہ اور تمام مسلمان آپ کے ساتھ ہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ دیر تک آپ سے ہم کلام رہے حتیٰ کہ آپ ﷺ کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور آپ ﷺ ہنس پڑے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو اس خوش مزاجی کے عالم میں پایا تو انہوں نے یہ ذکر کیا کہ مسلمان مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے طلاق ازواج کے سلسلے میں باتیں کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں نے اپنی ازواج کو طلاق نہیں دی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت چاہی کہ مسلمانوں کو یہ خوشخبری سنا دیں کیونکہ وہ ابھی تک مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے کسی نہ کسی فیصلے کے منتظر تھے غرض اجازت ملنے پر وہ مسجد نبویؐ میں آئے اور پکار کر اعلان کر دیا کہ آپ ﷺ نے اپنی ازواج کو طلاق نہیں دی ہے اس واقعے سے متعلق مندرجہ ذیل آیات کا نزول ہوا۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ

Marfat.com

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ
وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا
نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا
بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا ۭ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ
فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ
وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝ عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ
اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ
سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝ (سورۃ التحریم: ۱ تا ۵)

"اے پیغمبر! آپ ﷺ اپنی بیویوں کی خوشنودی کے لئے اس چیز کو کیوں حرام قرار دیتے ہیں جو خدا نے آپ کے لئے حلال کی ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے، خدا نے تمہارے لئے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے اور خدا تمہارا کارساز ہے اور وہ دانا و بینا ہے، جب پیغمبرؐ نے اپنی کسی بیوی کو رازداری کے طریق پر ایک بات بتائی اور اس نے اس کی خبر دوسری بیویوں کو دے دی اور خدا نے پیغمبر کو اس سے آگاہ کر دیا تو پیغمبر نے اس کے کچھ حصے کے متعلق تو اسے اطلاع دے دی اور کچھ حصے سے چشم پوشی کر لی جب پیغمبر نے اس کی اطلاع اس بیوی کو دی تو بیوی نے پوچھا، آپ کو کس نے اطلاع دی ہے؟ آپ نے کہا، مجھے اس ذات علیم وخبیر نے خبر دی ہے، اے پیغمبر کی دونوں بیویو! اگر تم اللہ کی بارگاہ میں توبہ کر لو تو اچھی بات ہے کیونکہ تم دونوں نے کج راہی اختیار کر لی ہے، اور اگر تم دونوں مل کر ان کے خلاف کارروائی کرو گی تو اللہ ان کا کارساز ہے اور جبرئیل اور نیک مومن اور فرشتے ان کے مددگار ہیں، اگر پیغمبر تم کو طلاق دے دے تو ممکن ہے کہ خدا تم سے بہتر بیویاں بدلے میں دے دے جو مسلمان، مومن، مطیع، توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار اور روزہ دار ہوں، بیوہ ہوں یا دوشیزہ۔"

اس صورت میں یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن راہ راست پر آ گئیں، آپ نے ان کی جانب رجوع کر لیا، اب انہوں نے توبہ کی اور عبادت گزار اور اپنے ایمان میں پختہ ہو گئیں، آپ کی خانگی زندگی میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور یہ چیز فرائض کی بجا آوری میں ہر انسان کے لئے ناگزیر ہے۔

تنقید کی کسوٹی پر

یہ واقعہ جس کا اوپر کی سطور میں ذکر کیا گیا ہے یعنی آپ کی ازواج مطہرات سے علیحدگی، ازواج مطہرات کو یہ اختیار کہ وہ حبالہ زوجیت میں رہیں یا طلاق لے لیں، آپ کی علیحدگی کے اسباب اور نتائج وغیرہ

Marfat.com

میرے نزدیک روایات و روایت کے اعتبار سے صحیح ہے۔ کتب تفسیر وحدیث کے بیانات اور مختلف کتب سیرت میں آپ کی اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی نسبت بیان کردہ متفرق حالات سے اس واقعے کی تصدیق وتوثیق ہوتی ہے لیکن سیرت کی کسی کتاب میں ان اسباب ونتائج کو اس ترتیب سے پیش نہیں کیا گیا ہے۔ سیرت کی بیشتر کتب میں یہ واقعہ سرے سے نظرانداز کر دیا گیا ہے گویا ان ارباب سیر کی نظر میں یہ واقعہ کسی اہمیت کا حامل ہی نہ تھا اسی لئے وہ اسے زیر بحث نہیں لائے۔ بعض کتب سیر میں شہد اور مغافیر کی روایت بیان کی گئی ہے لیکن حفصہ رضی اللہ عنہا اور ماریہ رضی اللہ عنہا کے واقعے کی جانب انہوں نے اشارہ تک نہیں کیا۔ مغربی مؤرخین حفصہ رضی اللہ عنہا اور ماریہ رضی اللہ عنہا کے واقعے اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے حفصہ رضی اللہ عنہا کے افشائے راز کے معاملے کو واقعات مابعد کی علت قرار دیتے ہیں جس سے ان کا مقصد اس غلط اور بے بنیاد خیال کی اشاعت ہے کہ پیغمبر ﷺ کو عورتوں سے حد درجہ محبت تھی۔ میرے خیال میں مسلمان مؤرخین کا اس بات میں سکوت مناسب نہیں کیونکہ اس واقعے کی تہ میں ایک عبرت اور ایک حکمت پوشیدہ ہے جس کی طرف ہم نے کسی قدر اجمال سے اشارہ کیا ہے۔ علمائے مغرب مذہبی تعصب کی بنا پر اس واقعے کی تاریخی تحقیق کی حدود سے تجاوز کر گئے ہیں۔ اگر کسی لاگ لپٹ کے بغیر تاریخی تنقید سے کام لیا جائے تو کوئی شخص بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ ایک عام انسان بھی چہ جائیکہ حضرت محمد ﷺ صرف اس بنا پر کہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے انہیں اپنی لونڈی کے ساتھ جو ان کی ملکیت اور ان کے لئے حلال تھی، ایک مکان میں دیکھا اور پھر اس کی اطلاع عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دی، پورے ایک ماہ تک اپنی ازواج سے علیحدگی اختیار کریں اور پھر ان سب کو طلاق کی دھمکی بھی دیں۔ اسی طرح صحیح تاریخی تنقید اس امر کو بھی درست قرار نہیں دے سکتی کہ شہد اور مغافیر سے متعلق واقعہ ازواج سے علیحدگی اور طلاق کی دھمکی کا سبب بنے۔ نبی کریم ﷺ ایسے صاحب عظمت، نرم طبع، فراخ حوصلہ اور بردبار شخص کی نسبت جو ایسی صفات عالیہ سے متصف ہو جن کا اعتراف تمام مؤرخین بلند آہنگی سے کرتے ہیں، یہ خیال کر لینا کہ ان دونوں معمولی واقعات میں سے کوئی ایک واقعہ اس علیحدگی اور دھمکی کا سبب ہوا ایک ایسا امر ہے جسے تاریخی تنقید سے دور کا واسطہ بھی نہیں لیکن اگر ان اسباب ونتائج کو اس ترتیب و تنظیم سے جو ہم نے قائم کی ہے مدنظر رکھا جائے تو تاریخی تنقید اور منطقی توجیہہ کی روشنی میں یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے واقعات بعض دیگر اسباب سے مربوط ہیں جن کی بنا پر ان کا ظہور ہوا۔ اس لحاظ سے یہ واقعات طبعی اور فطرت انسانی کے مطابق نظر آتے ہیں اور انہیں ہر صاحب عقل باور کر سکتا ہے۔ ہم نے ان واقعات کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس میں معقولیت ہے اور فطرت انسانی سے مطابقت بھی، نیز ان سے آنحضرت ﷺ کی حکمت مآبی، عظمت، مآل اندیشی اور دور بینی کی آئینہ داری بھی ہوتی ہے۔

علمائے یورپ کے اعتراضات کا جواب

بعض علمائے یورپ سورۂ تحریم کی ابتدائی آیات کے بعد، جو ہم نے اوپر نقل کی ہیں یہ کہتے ہیں کہ تمام

صحف سماویہ میں سے کسی میں اس قسم کا کوئی واقعہ جو گھر آنگن کی زندگی سے متعلق ہو اس انداز میں بیان نہیں کیا گیا ہے۔ ہمیں اس چیز کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ ہم ان واقعات کی تفصیل یہاں درج کریں جو آسمانی کتب میں (جن میں قرآن مجید بھی شامل ہے) قوم لوط کی بدکاری اور ان دو فرشتوں سے ان کی بحث و تکرار سے متعلق جو لوط علیہ السلام کے یہاں مہمانوں کی حیثیت سے فروکش تھے، مذکور ہوئے ہیں یا جو انہی کتب میں حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی اور اس کے طرز عمل سے متعلق وارد ہیں۔ تورات میں حضرت لوط علیہ السلام کی دو بیٹیوں کا واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے متواتر دو رات اپنے باپ کو شراب پلائی تا کہ وہ بدمستی و سرشاری کے عالم میں ہر رات ان میں سے ہر ایک سے مقاربت کریں اور اس طرح حاملہ ہو کر وہ بچے جنیں، مبادا اللہ تعالیٰ کے عذاب کی وجہ سے جو قوم لوط پر نازل ہوا تھا، آلِ لوط کا خاتمہ ہی ہو جائے۔

تمام آسمانی کتب میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات، ان کی سیرتوں اور دیگر پیش آمدہ حوادث کا ذکر لوگوں کی عبرت کے لئے کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم کی کئی مثالیں موجود ہیں جن میں پروردگار نے اپنے رسول کے علم و اطلاع کے لئے واقعات کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ قرآن مجید کا نزول صرف نبی کریم ﷺ کے لئے نہیں ہوا بلکہ اس کا پیغام تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے۔ آنحضرت ﷺ ایک پیغمبر تھے، آپ سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر گزر چکے ہیں، جن کے حالات قرآن مجید میں مذکور ہیں اس لئے اگر قرآن مجید میں آنحضرت ﷺ کے حالات اور آپ کی سیرت کے واقعات بیان ہوں اور وہ بھی مسلمانوں کی عبرت و موعظت کے لئے تو یہ طریق دیگر آسمانی کتب کی طرح قرآن مجید کے اسلوب بیان کے منافی نہیں ہے۔ دیگر آسمانی کتب میں انبیاء علیہم السلام کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اگر اس نکتہ کو مدنظر رکھا جائے کہ آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے علیحدگی کسی ایک سبب کی بنا پر نہ تھی جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے اور اس کا سبب یہ نہ تھا کہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ اور ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے تخلیے کا راز عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر منکشف کر دیا تھا (ایک مرد اپنی بیوی یا لونڈی سے تخلیے میں راز و نیاز کی گفتگو کر سکتا ہے اس میں کوئی قباحت نہیں) تو علمائے یورپ کا اعتراض تاریخی تنقید کے بالمقابل پادر ہوا نظر آتا ہے اور اسے آسمانی کتب کے عام اصول سے جو انہوں نے انبیاء علیہم السلام کے حالات کے سلسلے میں اختیار کیا ہے کوئی مطابقت نہیں ہے۔

❁

Marfat.com

باب 25

غزوۂ تبوک اور حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات

خراج وزکوٰۃ کا حصول

یہ خانگی حوادث جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے درمیان رونما ہوئے معمولات کی عام رفتار پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ فتح مکہ اور قریش کے قبولِ اسلام کے بعد اسلام اور پیروانِ اسلام کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ عرب کے تمام قبائل پر یہ حقیقت آشکارا ہو چکی تھی کہ مسلمان غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ بیت اللہ صدیوں سے تمام عرب کی مقدس زیارت گاہ کی حیثیت سے مرجع عوام بنا ہوا تھا، فتح مکہ کے بعد کعبہ اور اس کے متعلقہ مناصب مثلاً سدانت، رفادت، سقایت اور دیگر مراسم ایک نئے دین کے زیر اثر آ گئے تھے۔

فتح مکہ سے مسلمانوں کی شان وشوکت اور دولت وثروت میں اضافہ ہو گیا تھا اور ان کے ذہن میں یہ بات جاگزیں ہو چکی تھی کہ جزیرۂ عرب میں وہ اپنے اثر ورسوخ کے لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ دولت وثروت میں اضافہ کے ساتھ ہی ساتھ یہ ظاہر ہے کہ مصارف بھی کچھ زیادہ ہی ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں یہ ناگزیر تھا کہ مسلمان پر زکوٰۃ فرض کی جائے اور ان عربوں پر جو اپنے قدیم مذہب پر قائم تھے خراج کی قید عائد کی جائے۔ پہلے ان کیلئے یہ چیز ناگوار خاطر تھی اور وہ اس کے مطالبے پر نہ صرف غضب ناک ہوتے بلکہ جنگ کیلئے آمادہ ہو جایا کرتے تھے لیکن اسلام کے جدید نظام کا تقاضا تھا کہ زکوٰۃ اور خراج کی وصولی ہر حالت میں کی جائے لہٰذا فتح مکہ کے بعد آنحضرت ﷺ نے مختلف مقامات کی جانب اپنے عاملین زکوٰۃ روانہ فرمائے تاکہ وہ ان قبائل سے جو مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے ان کی آمدنی کا دسواں حصہ وصول کریں۔ یہ عاملین روانہ کئے گئے، مسلمان قبائل نے ان کا خیر مقدم نہایت خندہ پیشانی سے کیا اور اپنے اپنے مال کا دسواں حصہ بہ رضا ورغبت ادا کر دیا۔ بنی تمیم کی ایک شاخ اور بنی مصطلق کے سوا کسی نے بھی ادائے زکوٰۃ میں تامل نہ کیا۔

جب آنحضرت ﷺ کا عامل زکوٰۃ بنی تمیم کے ہمسایہ قبائل سے زکوٰۃ کا مطالبہ کر رہا تھا اور لوگ اپنے مال اور مویشیوں کی زکوٰۃ ادا کر رہے تھے تو بنی عنبر (بنی تمیم کی ایک شاخ تھی) کے کچھ لوگ قبل اس کے کہ ان

Marfat.com

سے زکوٰۃ کا مطالبہ کیا جائے عامل زکوٰۃ پر تیر تلوار لے کر چڑھ آئے اور اسے اپنے علاقے سے نکال دیا۔ جب آنحضرت ﷺ کو یہ اطلاع ملی تو آپ نے عینیہ بن حصن کو پچاس سواروں کے ہمراہ روانہ کیا جنہوں نے ان پر اچانک حملہ کر کے بھگا دیا اور پچاس سے زیادہ تعداد میں مردوں، عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے مدینے واپس آ گئے۔ آپ نے ان قیدیوں کو محبوس کر دیا۔ بنی تمیم کی ایک جماعت اس سے پہلے قبولِ اسلام کے بعد فتح مکہ اور غزوہ حنین میں آپ کی حمایت میں لڑ چکی تھی لیکن ان میں سے کچھ لوگ تا حال اپنے پرانے مذہب پر کاربند تھے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ بنی عنبر کا یہ حشر ہوا ہے تو انہوں نے اپنے سرداروں کا ایک وفد آپ کی خدمت میں روانہ کیا۔ یہ وفد مدینہ پہنچ کر مسجد نبویؐ میں داخل ہوا اور آپ کو آپ کے دولت کدے کے عقب سے پکار پکار کر بلایا اور کہا: اے محمد ﷺ باہر آؤ۔

پکار کے اس انداز سے آپ ﷺ کو ذہنی اذیت ہوئی۔ اگر ظہر کی نماز کیلئے اذان نہ کہی جاتی تو آپ ان سے ملنے کیلئے باہر تشریف نہ لاتے۔ جب انہوں نے آپ کو دیکھا تو عینیہ بن حصن کے سلوک کی شکایت کی۔ اس ضمن میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہم نے آپ کی حمایت میں جنگ کی ہے اور یہ کہ قبائل عرب میں ہمارے قبیلے کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہم آپ کے ساتھ مفاخرہ کرنے کیلئے آئے ہیں۔ آپ ہمارے خطیب اور ہمارے شاعر کو بیان مفاخر کی اجازت دیں۔ چنانچہ ان کا خطیب عطارد بن حاجب اٹھا اور اپنے قبیلے کے مفاخر بیان کرنے شروع کئے۔ جب وہ زور خطابت صرف کر چکا تو آپ نے ثابت رضی اللہ عنہ بن قیس سے کہا کہ اس کا جواب دیں۔ بعد ازاں ان کا شاعر زبرقان بن بدر اٹھا اور اس نے چند اشعار کہے، ان شعار کا جواب حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے دیا۔ جب مفاخرہ ختم ہوا تو اقرع بن حابس نے کہا مجھے اپنے باپ کی قسم، اس شخص کو (نبی کریم ﷺ کو) تائید ایزدی حاصل ہے۔ اس کا خطیب ہمارے خطیب سے زیادہ زبان آور ہے اور اس کا شاعر ہمارے شاعر سے زیادہ اچھا ہے، ان کی آوازیں ہماری آوازوں سے زیادہ بلند ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ آپ ﷺ نے ان کے قیدیوں کو رہا کر دیا اور انہیں ان کی قوم کی طرف جانے کی اجازت دے دی۔

رہے بنی مصطلق تو انہوں نے جب دیکھا کہ عامل زکوٰۃ چلا گیا ہے تو وہ اپنے انجام کار سے ڈرے اور انہوں نے قاصد بھیج کر آپ کو یقین دلایا کہ بے جا خوف اس پیش آمدہ غلط فہمی کا موجب ہوا ہے۔ تمام عرب میں کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں آفتاب اسلام کی شعاعیں نہ پہنچی ہوں اور جہاں آنحضرت ﷺ کے اثر و اقتدار کی پرچھائیں نہ پڑی ہو۔ جو گروہ یا قبیلہ بھی آپ سے ٹکر لینے کا ارادہ کرتا آپ ﷺ اس کی سرکوبی کیلئے کوئی فوجی دستہ بھیج دیتے، وہ یا تو خراج ادا کر کے اپنے مذہب پر قائم رہتا یا اسلام قبول کر کے زکوٰۃ دینے پر مجبور ہوتا۔

Marfat.com

غزوۂ تبوک

جن ایام میں آپ ﷺ کی کوشش یہ تھی کہ تمام اطراف عرب میں کسی قسم کی بدامنی پیدا نہ ہونے پائے اور ملک کے دور دراز کے علاقوں تک امن وسلامتی کی فضا رہے، آپ کو روم کی جانب سے یہ خبر ملی کہ وہ لوگ شمالی عرب کے اطراف پر ایک ایسا پرزور حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں جس سے اس غلبہ واقتدار کے اثرات زائل ہو جائیں جو مسلمانوں نے اپنی شجاعت وبسالت کی بنا پر حاصل کیا ہے وہ یہ چاہتے تھے کہ شام میں رومیوں کا اور حیرہ میں ایرانیوں کا تسلط قائم ہو جائے۔ یہ خبر آپ ﷺ تک بڑی ہولناک صورت میں پہنچی۔ آپ نے کسی تشویش کے بغیر یہ تہیہ کر لیا کہ آپ بذات خود اس طاقت کا مقابلہ کریں گے اور ان کی طاقت کو ایسی بری طرح کچل کر رکھ دیں گے کہ رومی آئندہ عرب پر حملے کا خیال بھی دل میں نہ لا سکیں۔ موسم گرما ابھی ختم نہ ہوا تھا، فصل خریف کی ابتدا میں عرب اس شدت کی گرمی سے دوچار ہوتا ہے کہ اس کی حشر سامانی موسم گرما کی شدت کو بھی مات کر دیتی ہے۔ علاوہ بریں مدینہ سے شام تک کا فاصلہ بھی اتنا زیادہ تھا کہ اس کا طے کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس صبر آزما سفر میں زادِ راہ اور پانی کی بھی اشد ضرورت تھی۔ اس خیال سے کہ مسلمان اس طویل سفر کیلئے پوری پوری تیاری کر سکیں، ضروری تھا کہ آپ مسلمانوں کو اپنے ارادے سے مطلع کریں۔ اس خلاف معمول طرز عمل پر کار بند ہوئے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا کیونکہ آپ ﷺ اکثر اوقات فوج کو کسی غیر معروف راستے سے کوچ کا حکم دیا کرتے تھے تاکہ دشمن آپ کے عزائم سے مطلع نہ ہو سکے۔ غرض آپ ﷺ نے تمام قبائل کی طرف پیغام بھیج دیا اور انہیں تیاری کی دعوت دی تاکہ جس قدر بھی عظیم الشان لشکر ترتیب پا جائے بہتر ہوگا۔ علاوہ بریں آپ ﷺ نے اربابِ دولت وثروت کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ خدا کے دیئے ہوئے مال سے فوج کی تشکیل میں مدد دیں اور لوگوں کو لشکر میں شمولیت کیلئے آمادہ کریں تاکہ اس تیاری سے رومی جو فوج کی تعداد اور اس کی ترتیب وتشکیل کے لحاظ سے مشہور تھے خوف زدہ اور حواس باختہ ہو جائیں۔

مسلمانوں پر دعوت کا اثر

غور طلب چیز یہ ہے کہ مسلمانوں نے آپ کی اس دعوت کا کس انداز میں خیر مقدم کیا؟ وہ جانتے تھے کہ اس سفر میں اہل وعیال اور مال وجائیداد سے جدا ہو کر وسیع بے آب وگیاہ جنگلوں اور ریگستانوں کی خاک چھاننی ہوگی اور وہ بھی شدت گرما میں۔ انہیں اس دشمن کا مقابلہ کرنا تھا جو ایرانیوں پر غالب آ چکا تھا اور جس پر مسلمان بھی پہلے فتح نہ پا سکے تھے۔ کیا ان کی ایمانی پختگی، رسول ﷺ کی محبت اور خدا کے سچے دین سے ان کا تعلق اس بات کے مقتضی تھے کہ وہ آپ کی دعوت پر اپنی توجہ مرکوز کریں اور جوق در جوق فوج میں بھرتی ہو کر وسیع جنگل کی فضاؤں میں پھیل جائیں؟ اپنے مال ومویشی ساتھ لے کر اس پوری تیاری سے صحرا

Marfat.com

کی خاک اڑاتے ہوئے آگے بڑھیں کہ دشمن خبر پاتے ہی لرزہ براندام ہو جائے اور اس بدحواسی سے راہ فرار اختیار کرے کہ پھر مڑ کر بھی پیچھے نہ دیکھے۔ کیا مسلمان بھی ایسے تھے جنہیں راستے کی مشقت، گرمی کی شدت، بھوک اور پیاس کا خوف میدان جنگ میں شرکت سے روکے اور وہ پیچھے ہٹ کر اپنی اپنی جگہوں پر جمے رہیں؟ اس وقت مسلمانوں میں دو قسم کے لوگ موجود تھے۔ بعض تو وہ تھے جن کے دل رشد و ہدایت کی تجلی سے منور تھے اور ان کے ریشے ریشے میں جذبہ ایمانی سمایا ہوا تھا۔ بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے کسی طمع یا خوف سے اسلام قبول کیا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ عرب کے تمام قبائل مسلمانوں کی ٹکر نہیں سنبھال سکتے بلکہ انہوں نے اپنی گردنوں میں اطاعت کا قلاوہ ڈال لیا ہے اور جزیہ دینے پر آمادہ ہو گئے ہیں تو ان کے دلوں میں مالِ غنیمت کی ہوس گداگری لینے لگی۔ اسی طرح وہ اس قوت سے خوف زدہ تھے جس کے مقابلے میں کوئی دوسری قوت نہ ٹھہر سکتی تھی اور جس کے غلبے سے تمام بادشاہ خوف زدہ تھے۔

پہلی قسم کے لوگوں نے تو آگے بڑھ کر دعوت پر لبیک کہا۔ ان میں سے بعض بے سروسامان تھے جن کے پاس سواری کے لئے کوئی جانور تک نہ تھا اور بعض ذی ثروت تھے جو بہ رضا و رغبت اپنا مال راہ اسلام میں قربان کر کے شہادت کا درجہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ دوسری قسم کے لوگوں نے پہلوتہی کی اور لگے عذر تراشنے۔ وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرتے اور آپ کی دعوت کا مذاق اڑاتے تھے کہ آپ ﷺ نے اس مہلک گرمی میں اس قسم کے دور دراز مقام پر چڑھائی کا ارادہ کیا ہے۔ یہ منافقین کا گروہ تھا جن کے بارے میں سورۂ توبہ نازل ہوئی جس میں جہاد کی دعوت کے علاوہ ان لوگوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرایا گیا ہے جو پیغمبر ﷺ کی دعوت سے سرتابی کرنے والوں پر نازل ہو سکتا ہے۔

منافقین کی مخالفت

منافقین آپس میں چہ میگوئیاں کرتے تھے کہ اتنی سخت گرمی میں سفر کرنا چاہئے؟ اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۗ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۗ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿٨١﴾
فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٢﴾

(سورۂ التوبہ: ۸۱، ۸۲)

"اور ان لوگوں نے کہا کہ شدت گرما میں گھروں سے نہ نکلو، آپ ﷺ کہہ دیجئے اگر انہیں کچھ سمجھ ہے تو دوزخ کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے کیا خوب ہوتا اگر وہ سمجھتے، تو (ایک دن ہوگا کہ) یہ لوگ ہنسیں گے کم اور روئیں گے بہت (اور یہ) بدلہ (ہوگا) ان اعمال کا جو (دنیا میں) کیا کرتے تھے۔"

آنحضرت ﷺ نے جد بن قیس سے جو بنی سلمہ میں سے تھا کہا: ''اے جد! کیا اس سال تو بنی اصغر کی جنگ میں حصہ لے گا؟'' اس نے جواب دیا، یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے (جنگ میں شریک نہ ہونے کی) اور مجھے فتنے میں نہ ڈالئے۔ میرے قبیلے کے لوگ جانتے ہیں کہ میں عورتوں سے خاص شغف رکھتا ہوں۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر مجھے بنی اصغر کی عورتیں نظر آئیں تو دامن صبر میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا (بنی اصغر سے رومی مراد ہیں)۔ آپ ﷺ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ (سورۃ التوبہ: ۴۹)

''ان میں سے وہ بھی ہے جو یہ کہتا ہے کہ مجھے اجازت دیجئے اور مجھے فتنے میں نہ ڈالیے آگاہ رہو کہ ایسے لوگ فتنے میں پڑ گئے اور دوزخ کفار کا احاطہ کرنے والا ہے۔''

ان لوگوں کو جن کے دلوں میں پیغمبر ﷺ کی دشمنی تھی، نفاق کا بیج بونے اور عوام کو جنگ سے پہلوتہی پر آمادہ کرنے کا اچھا موقع مل گیا۔ آپ ﷺ نے بہ تقاضائے مصلحت ایسے لوگوں سے بے توجہی نہ برتی کیونکہ خطرہ یہ تھا مبادا وہ اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو جائیں۔ آپ ﷺ نے چاہا کہ ان پر سختی سے گرفت کی جائے۔ آپ کو یہ خبر ملی کہ ان میں سے کچھ لوگ سویلم یہودی کے مکان میں جمع ہو کر دوسروں کو بدراہ کرتے اور جنگ سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہیں چنانچہ آپ نے طلحہ بن عبیداللہ کو اپنے چند ساتھیوں سمیت ان کی طرف روانہ کیا، اس عالم میں کہ وہ سب اس مکان میں جمع تھے۔ نبی کریم ﷺ کے فرستادوں نے سویلم کے مکان کو نذر آتش کر دیا، ان میں سے ایک تو مکان کے عقب سے بھاگ نکلا اور اس کا پاؤں ہی ٹوٹ گیا، باقی لوگوں نے آگ کے شعلوں سے جوں توں کر کے اپنی جان بچائی اور بھاگ نکلے پھر انہوں نے ایسی حرکت کبھی نہ کی۔ یہ واقعہ دوسروں کیلئے درس عبرت بن گیا اور آئندہ کسی کو اس قسم کے فعل پر اقدام کی جرأت نہ ہوئی۔

جیش عسرت

اس سختی کا منافقین اور ان کے ہم نواؤں پر بہت زیادہ اثر ہوا۔ اصحاب ثروت نے لشکر کی تیاری اور اس کے ساز و سامان کی بہم رسانی پر بہت کچھ خرچ کیا۔ صرف عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار دینار صرف کئے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے لوگوں نے اپنی اپنی ہمت اور اپنے اپنے حوصلے کے مطابق مال خرچ کیا۔ جو جو شخص اپنے اخراجات برداشت کر سکتا تھا اس نے اس کی ذمہ داری کا بار اٹھا لیا۔ ناداروں میں سے اکثر نے یہ خواہش کی کہ آپ ﷺ انہیں اپنے ہمراہ لے چلیں چنانچہ ان میں سے آپ جن کو اپنے ہمراہ لے جا سکتے تھے، لے گئے اور باقی اشخاص سے عذر خواہی کی اور فرمایا، مجھے تمہارے لئے سواری دستیاب نہیں ہو سکی،

Marfat.com

یہ سن کر ان لوگوں کی آنکھوں میں اس خیال سے آنسو بھر آئے کہ ان کے پاس کوئی خرچ نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کو اسی بنا پر ''بکائین'' (رونے والے) کہا جانے لگا۔ اس لشکر کی تیاری میں شروع سے آخر تک چونکہ آپ کو سخت تنگی اور دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا اس لئے اس کا نام ''جیش عسرت'' پڑ گیا۔ آخر تیس ہزار فوج آپ کے ہمراہ جانے کیلئے تیار ہو گئی۔

مدینہ کی آبادی سے باہر فوج جمع ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی عدم موجودگی میں نماز میں امامت کے فرائض انجام دیئے کیونکہ آپ تا حال مدینے میں داخلی نظام سے متعلق اہتمام فرما رہے تھے۔ آپ نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو اپنی غیر حاضری کے دوران میں اپنا خلیفہ مقرر کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اس خدمت پر مامور کیا کہ وہ ازواج مطہرات اور دیگر اہلی و عائلی معاملات کی نگہداشت دیکھیں۔ ان ہر دو حضرات کو آپ نے مناسب ہدایات دیں بعدازاں آپ فوج میں تشریف لائے اور ان کی امارت کی باگ ڈور سنبھالی۔ عبداللہ بن ابی اپنے قبیلے کے کچھ آدمیوں کو لے کر فوج میں شامل ہونے کیلئے آیا لیکن آپ نے اسے اور اس کے آدمیوں کو شریک فوج نہ کیا کیونکہ آپ ﷺ کو اس پر اعتماد نہ تھا اور نہ آپ اس کے ایمان و اسلام کی صحت سے مطمئن تھے۔

فوج کی روانگی

آپ ﷺ نے فوج کو روانگی کا حکم دیا۔ گرد و غبار اٹھا اور گھوڑے ہنہنانے لگے۔ مدینہ کی عورتیں اس لشکر جرار کا منظر دیکھنے کیلئے چھتوں پر چڑھی ہوئی تھیں اور یہ لشکر صحرا کے سینے کو چیرتا ہوا شام کی طرف بڑھا چلا جاتا تھا۔ اسے بھوک اور پیاس کی پرواہ نہ تھی۔ انہوں نے ان پست ہمتوں اور تن آسانوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا جنہوں نے آرام طلبی اور عیش پرستی کو خدا کی خوشنودی پر ترجیح دی تھی۔ فوج کے اس منظر نے جس کے آگے آگے دس ہزار سوار تھے اور چھتوں پر چڑھی ہوئی عورتوں کے تاثر نے بعض ان لوگوں کے دلوں میں بھی جوش و خروش کی لہر دوڑا دی تھی جنہوں نے دعوت رسول ﷺ پر لبیک نہ کہا تھا اور جنہوں نے جنگ میں شرکت سے پہلوتہی کی تھی، چنانچہ ابوخشیمہ یہ نظارہ دیکھ کر گھر لوٹا تو اس نے دیکھا کہ اس کی دو بیویوں نے سائبان بلند کر کے پانی کا چھڑکاؤ کیا تھا اور اس کیلئے کھانا بھی تیار کر رکھا تھا اور ٹھنڈا پانی بھی۔ یہ دیکھ کر وہ کہنے لگا، افسوس ہے کہ پیغمبر ﷺ تو دھوپ اور گرمی کی زحمت گوارا کریں اور ابوخشیمہ ٹھنڈے سائے میں بیٹھ کر خوشگوار اور خوش ذائقہ کھانے کھائے اور خوبصورت بیویوں کے پاس بیٹھ کر، جبکہ اس کا مال و متاع بھی اس کی نگاہوں کے سامنے ہو، وقت گزارے، میرے لئے زادِ راہ تیار کرو تا کہ میں بھی آپ ﷺ سے جاملوں چنانچہ انہوں نے توشہ تیار کیا اور وہ بہ عجلت تمام لشکر سے جا ملا۔ ابوخشیمہ کے علاوہ بہت سے دوسرے پسماندوں نے بھی جنگ سے پہلوتہی میں خفت محسوس کی اور وہ بھی ابوخشیمہ کی دیکھا دیکھی لشکر میں شامل ہو گئے۔

Marfat.com

مقام حجر میں ورود

لشکر اسلام منزلیں مارتا ہوا مقام حجر تک پہنچ گیا۔ وہاں قوم ثمود کے گھروں کے آثار چٹانوں میں ابھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ آپ ﷺ نے اس مقام پر پڑاؤ کا حکم دیا۔ لوگوں نے یہاں کنویں سے پانی پیا، جب وہ کچھ ستا لئے تو آپ نے ان سے فرمایا، اس کنویں کا پانی پینے یا وضو کیلئے استعمال نہ کرو۔ اگر اس پانی سے تم نے آٹا گوندھا ہو تو وہ اونٹوں کو کھلا دو، خود نہ کھاؤ، اس کے علاوہ تم میں سے کوئی کسی ساتھی کے بغیر باہر نہ نکلے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس سرزمین سے کوئی شخص نہ گزرتا تھا، گاہے وہاں ریت کے طوفان اُٹھتے رہتے تھے جو انسانوں اور اونٹوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے تھے۔ دو شخص آپ کی ہدایت کے برخلاف باہر نکلے، ایک کو تو ہوا اڑا کر لے گئی اور دوسرا ریت کے نیچے دفن ہو کر رہ گیا جب صبح ہوئی تو مسلمانوں نے دیکھا کہ ریت نے کنویں کو پاٹ دیا تھا اور اس میں پانی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ یہ دیکھ کر انہیں یہ خدشہ لاحق ہوا کہ پانی کا کیا بندوبست ہوگا۔ صبر آزما طویل مسافت سے بھی ان کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ اسی اثنا میں وہاں سے کچھ بادل برستے ہوئے گزر گئے۔ مسلمانوں کی پیاس بارش کے پانی سے بجھ گئی اور جس قدر پانی کی انہیں ضرورت تھی انہوں نے لے لیا۔ اس سے ان کا خدشہ زائل ہوا اور خوشی سے ان کے چہرے دمک اٹھے۔ بعض یہ کہنے لگے کہ یہ نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے اور بعض نے یہ سوچا کہ بادلوں کا یہ ناگہانی ظہور ایک اتفاقی امر تھا۔

رومی بھاگ گئے

بعد ازاں لشکر اسلام نے تبوک کی جانب کوچ کیا۔ رومیوں کو اس لشکر کی کثرت اور اس کی بے پناہ قوت کی اطلاع مل چکی تھی اس لئے انہوں نے لوٹ جانے ہی میں مصلحت سمجھی۔ رومیوں نے شام کے اندرونی علاقے میں جو قلعے تھے ان میں پناہ لی۔ جب مسلمان تبوک پہنچے اور آنحضرت ﷺ کو رومیوں کی خوف زدگی کا علم ہوا تو آپ نے اندرونِ ملک میں بھی ان کا تعاقب کیا۔ آپ ﷺ سرحد کے قریب مدت تک ٹھہرے رہے تاکہ اگر کوئی مقابلے پر آنا چاہے تو بے شک آئے۔

اس اثناء میں آپ نے حفظ ماتقدم کے طور پر احتیاطی تدابیر اختیار کیں تاکہ آئندہ کسی کو ایسا قدم اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکے۔ یوحنا بن روبہ حاکم ایلہ ان سرداروں میں سے تھا جو اس سرحد کے قریب رہتے تھے۔ آپ نے اس کی طرف پیغام بھیجا کہ تم یا تو ہماری اطاعت قبول کرو یا ہم سے لڑو۔ یوحنا اپنے سینے پر سونے کی ایک صلیب لٹکائے ہوئے کچھ تحائف لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے اطاعت قبول کر کے جزیے کی شرط پر آپ سے مصالحت کر لی۔ جربا اور اذرح کے باشندوں نے بھی جزیے کی شرط پر معاہدہ کر لیا (جربا شام میں مضافاتِ عمان کی بستی ہے۔ اذرح بلقا اور عمان کے گرد و نواح میں ایک شہر ہے)۔

Marfat.com

اہل سرحد کا معاہدہ

پیغمبر اسلام ﷺ نے ان سرداروں کو چند امان نامے تحریر کر دیئے۔ ایک امان نامہ جو آپ نے یوحنا کو لکھ کر دیا، اس کے الفاظ یہ تھے:

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحمن و رحیم ہے یہ خدا اور محمد ﷺ کی طرف سے جو خدا کا رسول اور نبی ہے یوحنا بن روبہ اور اہل ایلہ کے حق میں ان کی کشتیوں اور ان کے قافلوں کے بارے میں جو خواہ خشکی پر ہوں خواہ سمندر میں، امان ہے وہ اور اہل شام، اہل یمن اور بحری علاقوں کے وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں سب خدا اور اس کے رسول ﷺ کی پناہ میں ہوں گے ان میں سے اگر کوئی شخص کسی جرم کا مرتکب ہوگا تو اس کا مال، اس کی جان کی حفاظت کا ضامن نہ ہوگا۔ محمد ﷺ کے لیے لوگوں میں سے اسے گرفتار کر لینا روا ہوگا۔ یہ لوگ جس چشمہ پر جائیں یا جس راہ پر خشکی یا سمندر میں سفر کریں انہیں روکنا جائز نہیں۔"

اس معاہدے سے فریقین نے کامل اتفاق کیا، نشانی کے طور پر آپ نے ایک یمنی چادر یوحنا کو ہدیتا عطا فرمائی اور اس سے ہر قسم کی رعایت کی۔ اتفاق رائے سے یہ چیز طے پائی کہ ایلہ کے باشندے تین سو دینار سالانہ جزیہ ادا کیا کریں گے۔

دومتہ الجندل پر چڑھائی

رومیوں کی بازگشت اور اہل سرحد سے معاہدات کے بعد جنگ کا سوال ہی نہ رہا۔ آپ ﷺ مطمئن تھے کہ رومیوں کی فوج دوبارہ معرکہ آرائی کی جرأت نہ کرے گی لیکن آپ ﷺ کو یہ خدشہ پھر بھی لاحق تھا کہ اگر رومیوں نے دومتہ الجندل (دومتہ الجندل دمشق اور مدینے کے درمیان دمشق سے سات منزلوں کے فاصلے پر مشہور شہر ہے) کی جانب سے حملہ کیا تو دومتہ الجندل کا فرمانروا اکیدر بن عبدالملک کندی جو عیسائی تھا بغاوت پر کمر بستہ ہو کر ان کی مدد کرے گا۔ پیش بندی کے طور پر آپ ﷺ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو پانچ سو سواروں کے ہمراہ اس کی طرف روانہ کیا اور خود باقی فوج کے ساتھ مدینے کو مراجعت فرما ہوئے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے یہ کیا کہ برق رفتاری سے دومتہ الجندل کا رخ کیا اور راتوں رات وہاں پہنچ کر دم لیا۔

اس دوران تمام حالات سے بے خبر اکیدر چاندنی رات میں اپنے بھائی حسان کے ساتھ نیل گائے کے شکار کیلئے نکلا تھا، خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حملہ کیا تو حسان مارا گیا اور اکیدر قیدی ہوا۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسے دھمکی دی کہ اگر شہر کے دروازے نہ کھولے گئے تو اسے بھی تہ تیغ کر دیا جائے گا۔ اہل شہر نے اپنے فرمانروا کی جاں بخشی کی خاطر شہر کے دروازے کھول دیئے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے دو ہزار اونٹ، آٹھ سو بکریاں، چار سو

Marfat.com

دس گندم اور چار سو زرہیں بطور غنیمت حاصل کیں۔ یہ مالِ غنیمت لے کر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اکیدر کو پا بجولاں کئے ہوئے مدینے واپس آئے۔ آپ ﷺ نے اکیدر کو دعوت اسلام دی، اس نے اسلام قبول کیا اور آپ ﷺ سے معاہدہ کرلیا۔

مدینہ کو واپسی

آنحضرت ﷺ کی اتنی بڑی فوج کے ہمراہ شام سے مدینہ کو مراجعت کوئی معمولی بات نہ تھی۔ بہت سے مسلمانوں نے ان معاہدات کی مصلحت کو قطعاً نہ سمجھا جو آپ ﷺ نے ایلہ کے فرمانروا اور اس کے اردگرد کے علاقوں سے کئے تھے۔ ان معاہدات کے ذریعے سے آپ ﷺ نے جس طرح پورے عرب کی حفاظت کی تھی اور ان علاقوں کو جس حسن تدبیر سے آپ ﷺ نے اپنے اور رومیوں کے درمیان تاوان کی حیثیت دے دی تھی مسلمانوں نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ ان کی نظر صرف اس بات پر تھی کہ انہوں نے طویل سفر کی زحمت بھی برداشت کی اور پھر بھی قیدی اور مالِ غنیمت لئے بغیر واپس آ گئے، لڑائی کی نوبت تک نہ آئی، تقریباً بیس روز تبوک میں قیام کے بعد لوٹ آئے۔ ایسی سخت گرمی میں جبکہ مدینہ کے میوے پک چکے تھے اور ان کے کھانے کا وقت آ گیا تھا نہ معلوم یہ طویل سفر آپ ﷺ نے کیوں اختیار کیا تھا؟ ان میں سے بعض لوگ آنحضرت ﷺ کے اس اقدام پر آوازے کستے تھے۔

بعض صحابہؓ نے یہ باتیں آنحضرت ﷺ کے گوش گزار کیں۔ باتیں بنانے والے لوگوں سے آپ ﷺ نے موقع اور محل کے مطابق جیسا چاہا سلوک کیا، کہیں سختی سے کام لیا اور کہیں نرمی سے۔ فوج مدینے واپس آ رہی تھی اور اس کا انتظام آپ ﷺ کے سپرد تھا۔ جب آپ ﷺ مدینہ پہنچے تو تھوڑی دیر کے بعد خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی اکیدر کو لئے ہوئے دومتہ الجندل سے مدینہ پہنچ گئے۔ ان کے ہمراہ اونٹ، بکریاں، گندم اور زرہیں بھی تھیں۔ اکیدر نے ریشمی لباس پہن رکھا تھا جسے دیکھ کر اہل مدینہ دنگ رہ گئے۔

جو نہ جا سکے

اس اثناء میں جو لوگ آپ ﷺ کے ساتھ نہ جا سکے تھے سخت مضطرب ہوئے اور جو لوگ مذاق اڑاتے تھے انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ پیچھے رہ جانے والوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عذر خواہی کی مگر ان کی معذرت زیادہ تر بناوٹی باتوں پر مبنی تھی۔ آپ ﷺ نے ان کا معاملہ سپرد خدا کرتے ہوئے ان کے طرزِ عمل پر کوئی گرفت نہ کی۔ صرف ان میں سے تین اشخاص کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ نے خدا اور اس کے رسولؐ کے سامنے سچ سچ کہہ دیا اور اپنے قصور کا اعتراف کرلیا۔ آپ ﷺ کے حسب الحکم مسلمانوں نے پچاس روز تک ان سے قطع تعلق کئے رکھا۔ نہ ان سے کوئی شخص بولتا تھا اور نہ کوئی ان سے خرید و فروخت کرتا تھا۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور انہیں معافی دے دی۔ ان کے

Marfat.com

بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

(سورۃ التوبہ: ۱۱۷، ۱۱۸)

''یقیناً خدا نے پیغمبرؐ اور ان مہاجرین و انصار کی توبہ قبول کر لی جنہوں نے اس امر کے بعد کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل گمراہ ہو چکے تھے، تنگی کے وقت اس کی پیروی کی، پھر خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی کیونکہ وہ ان کے ساتھ مہربان اور رحیم ہے اور ان تین شخصوں کی توبہ بھی قبول کر لی جو پیچھے رہ گئے تھے حتیٰ کہ زمین باوجود اپنی وسعت کے ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں ان کے لئے مصیبت بن گئیں اور ان کو یقین ہو گیا کہ خدا کے عذاب سے خدا کے سوا اور کوئی پناہ نہیں ہے۔ پھر خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی تا کہ وہ صحیح حالت پر آ جائیں۔ بے شک خدا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔''

منافقین پر سخت گرفت

ان حالات میں آنحضرت ﷺ کا رویہ منافقین کے سلسلے میں کچھ سخت ہو گیا۔ اس سختی کا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کی تعداد بہت کچھ بڑھ چکی تھی، اگر منافقین اسی طرح ان سے مذاق کرتے رہتے تو خطرناک حالات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا لہٰذا تدارک کرنا ناگزیر تھا۔ خدا نے آنحضرت ﷺ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ آپ ﷺ کے دین کو ضرور غلبہ عطا کرے گا اور آپ ﷺ کی شان بالا ہو کر رہے گی۔ اس لئے آپ ﷺ کو اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہ تھا کہ آئندہ مسلمانوں کی تعداد کئی گنا زیادہ بڑھ جائے گی اور اس وقت منافقین کا وجود گراں گزرے گا۔ پہلے اسلام مدینہ اور اس کے گرد و نواح تک ہی محدود تھا۔ آپ ﷺ بذات خود معاملات کی نگرانی کر سکتے تھے لیکن اب آپ ﷺ کا دین عرب کے تمام اطراف میں پھیل چکا تھا بلکہ بیرون عرب بھی اس کی اشاعت اور توسیع کے اسباب فراہم ہو چکے تھے، ایسے حالات میں منافقین کے بارے میں سہل انگاری خطرناک نتائج پیدا کر سکتی تھی۔ اگر اس کے رینگتے ہوئے جراثیم ابھی سے نیست و نابود نہ کر دیئے جاتے تو بہت جلد خطرناک صورت اختیار کر لیتے۔ کچھ لوگوں نے مقام ذی اوان میں جو مدینہ سے ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا ایک مسجد کی تعمیر کی، منافقین کی ایک جماعت اس مسجد میں جمع ہوتی تھی، ان کا مقصد

Marfat.com

یہ تھا کہ وہ خدا کے کلام کا مفہوم بدل دیں اور اس طرح اسلام کو نقصان پہنچانے کے ناپاک ارادے سے اور اپنے کفر کی بنا پر مومنوں کے درمیان تفرقہ اندازی کریں۔ ان لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ﷺ اس مسجد میں پہلی نماز پڑھا کر مسجد کا افتتاح کریں۔ یہ واقعہ غزوۂ تبوک سے پہلے پیش آیا تھا اور آپ ﷺ نے ان کی درخواست پر عمل کرنے کے لئے غزوے سے واپسی تک کی مہلت مانگی تھی۔ جب آپ ﷺ اس غزوے سے واپس آئے اور مسجد کی غرض و غایت اور اس کے مقصد تعمیر کا آپ ﷺ کو علم ہوا تو آپ نے حکم صادر فرمایا کہ اس مسجد کو نذر آتش کر دیا جائے۔ اس تہدیدی حکم سے منافقین کانپ اٹھے اور خوفزدہ ہو کر انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کی۔ عبداللہ بن ابی کے سوائے جوان کا سردار اور بزرگ تھا اور کوئی ان کا حمایتی نہ رہا۔

عبداللہ بن ابی غزوۂ تبوک کے بعد دو ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ اسے بیماری نے ایسا گھیرا کہ اس سے جانبر نہ ہو سکا اور انتقال کر گیا۔ جب سے آپ ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تھے عبداللہ بن ابی مسلمانوں کے خلاف بغض و عناد رکھتا تھا لیکن آپ ﷺ یہ پسند نہ کرتے تھے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں اسے کوئی تکلیف پہنچے۔ اس کی وفات کے بعد جب اس کے جنازے کی نماز پڑھانے کے لئے آپ ﷺ سے درخواست کی گئی تو آپ ﷺ نے اسے قبول فرما لیا۔ نماز کے بعد آپ ﷺ اس کے دفن ہونے تک قبر کے پاس رونق افروز ہوئے۔ عبداللہ بن ابی کی موت سے منافقین کا زور ٹوٹ گیا اور باقی ماندہ منافقین نے منافقت سے دستبردار ہو کر توبہ کر لی۔

غزوۂ تبوک کے بعد اسلام نے تمام عرب کا احاطہ کر لیا اور آپ ﷺ کو عرب کے تمام مخالفین کی جانب سے ایک گونہ اطمینان ہو گیا۔ عرب کے جو لوگ باقی رہ گئے تھے۔ وہ بھی سرِ تسلیم خم کر کے دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر لیا۔ غزوۂ تبوک وہ آخری معرکہ تھا جس میں آپ ﷺ نے بہ نفسِ نفیس شرکت فرمائی۔ بعد ازاں آپ ﷺ خدا کی عطا کردہ نعمتوں کے سبب مدینہ میں سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے۔

اپنے فرزند ابراہیم رضی اللہ عنہ سے وابستگی

آپ ﷺ کے فرزند ابراہیم رضی اللہ عنہ کی عمر ۱۶ یا ۱۸ ماہ کی ہو چکی تھی، جب آپ ﷺ نے وفود کی آمد، مسلمانوں کے عام معاملات، فرائض رسالت کی انجام دہی اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے حقوق کی ادائی سے فراغت پائی تو آپ ﷺ کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ ﷺ کا یہ بچہ نشوونما پا رہا تھا اور رفتہ رفتہ اس کے چہرے مہرے میں آپ کی شباہت کے آثار نمودار ہوتے جاتے تھے۔ آپ ﷺ کو اس مماثلت کی وجہ سے اس بچے سے اچھی خاصی وابستگی ہو گئی تھی۔ اس اثناء میں ابراہیم رضی اللہ عنہ کی دایہ ام سیف اسے اپنا اور ان بکریوں

Marfat.com

کا دودھ پلاتی رہی تھیں جو آپ ﷺ نے انہیں ہدیۃً عطا کی تھیں۔

ابراہیم رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کی وابستگی فرائض رسالت کا جزو نہ تھی۔ جہاں تک توحید و رسالت کا تعلق تھا آپ ﷺ کو اپنی اولاد یا وارث کی مطلق فکر نہ تھی بلکہ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے، پیغمبر کوئی وراثت نہیں چھوڑا کرتے جو مال وہ چھوڑ جاتے ہیں، صدقہ ہوتا ہے۔ ابراہیم رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کی وابستگی کا سبب وہ بشری جذبہ تھا جو قدرت نے آپ ﷺ کو خصوصیت سے ودیعت کیا تھا اور یہی وہ بشری جذبہ تھا جس سے ہر عربی کے دل میں تحریک ہوتی تھی کہ وہ اپنا کوئی ایسا جانشین چھوڑ جائے جو اس کی دنیوی حیات کے تسلسل کا ذریعہ و وسیلہ قرار پائے۔ اسی جذبے کے تحت آپ ﷺ اپنے فرزند ابراہیم رضی اللہ عنہ کو حد درجہ محبت و شفقت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس جذبے میں اس سبب سے اور بھی شدت پیدا ہو گئی تھی کہ آپ ﷺ اس سے قبل اپنے دو بیٹوں قاسم اور طاہر کو جبکہ وہ اپنی والدہ اُم المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی گود ہی میں تھے، کھو بیٹھے تھے اور اُم المؤمنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی بیٹیاں بھی جو جوانی کی عمر کو پہنچ کر رشتہ ازدواج میں منسلک اور عیالدار بھی ہو چکی تھیں یکے بعد دیگرے آپ ﷺ کو داغ مفارقت دے گئی تھیں اور ان میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سوا کوئی بھی بقید حیات نہ تھی۔ ان بیٹوں اور بیٹیوں کی وفات نے جو آپ ﷺ سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئی تھیں اور جنہیں آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں دفن کیا تھا آپ ﷺ کو غم سے نڈھال کر دیا تھا۔ ابراہیم رضی اللہ عنہ کی ولادت سے اس غم کا زخم کسی قدر مندمل ہو گیا تھا اور اب آپ ﷺ کے دل میں امید و آرزو کی کرنیں پھوٹ نکلی تھیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ آپ ﷺ ہشاش بشاش رہتے تھے۔

ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات

آپ ﷺ کی یہ مسرت چند ماہ تک قائم رہی، اس لئے کہ ابراہیم رضی اللہ عنہ اتنے بیمار ہوئے کہ ان کی زندگی خطرے میں پڑ گئی۔ صحت کی بحالی کی خاطر انہیں ام ابراہیم کی گھاٹی کے قریب ایک نخلستان میں رکھا گیا۔ ماریہ رضی اللہ عنہا اور ان کی بہن سیرین رضی اللہ عنہا ان کی تیمارداری کرتی تھیں۔ مگر جو ہونا تھا ہو کر رہا۔ جب ابراہیم رضی اللہ عنہ پر جانکنی کی حالت طاری تھی تو آپ ﷺ کو اطلاع دی گئی۔ اس سے آپ ﷺ کو اتنا صدمہ ہوا کہ آپ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کا سہارا لے کر چلتے ہوئے اس نخلستان میں تشریف فرما ہوئے جس کے قریب آج بھی گھاٹ موجود ہے۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ ابراہیم رضی اللہ عنہ اپنی والدہ محترمہ کی آغوش میں دم توڑ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں اپنی گود میں لے لیا۔ آپ ﷺ کا دل دھڑک رہا تھا اور ہاتھ کانپ رہے تھے، آپ ﷺ پر شدت غم کا غلبہ تھا اور رنج و الم کے اثرات آپ ﷺ کے چہرے سے نمایاں تھے۔ آپ ﷺ نے ابراہیم رضی اللہ عنہ کو گود میں لے کر فرمایا۔ ''اے ابراہیم رضی اللہ عنہ ہم تیرے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکتے۔'' پھر شدت غم سے آپ ﷺ پر سکوت طاری ہو گیا اور آنکھیں تھیں کہ ان سے ٹپ ٹپ کر آنسو بہہ رہے تھے۔

Marfat.com

بچے کا دم لبوں پر تھا اور اس کی والدہ اور خالہ دونوں رو رہی تھیں، آپ ﷺ نے اس فعل سے انہیں روکا نہیں۔ جب ابراہیم رضی اللہ عنہ نے جان دے دی اور ان کا جسم بے حس و حرکت رہ گیا تو اس کی موت سے آپ ﷺ کی امید کا وہ چراغ بھی گل ہو گیا جس سے آپ کی طبیعت بندھی ہوئی تھی، اس سانحے سے آپ ﷺ پر رقت طاری ہو گئی اور فرمایا:

"اے ابراہیم! اگر موت ایک امرِ حق اور سچا وعدہ نہ ہوتا اور ہم میں پیچھے رہ جانے والے آگے جانے والوں سے نہ جا ملا کرتے تو ہم تجھ پر اس سے زیادہ اظہارِ غم کرتے۔"

بعدازاں تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد فرمایا:

"آنکھ روتی ہے اور دل غمزدہ ہے لیکن ہم اس بات کے سوا جو خدا کو خوش کرنے والی ہے کوئی بات منہ سے نہیں نکالتے۔ اے ابراہیم! ہم غم میں ڈوبے ہوئے ہیں۔"

صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کو اس عالم میں دیکھا تو چند دانشمندوں نے چاہا کہ آپ ﷺ کو متفکر و الم زدہ نہ رہنے دیں۔ چنانچہ انھوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں یہ عرض کیا، آپ ﷺ تو دوسروں کو اس چیز سے روکا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ "میں نے کسی کو اس قسم کے غم سے منع نہیں کیا بلکہ میں نے بلند آواز سے رونے دھونے سے روکا ہے۔ تم اس وقت جو میری حالت دیکھ رہے ہو یہ تو محبت و شفقت کا نتیجہ ہے۔ جو کسی پر مہربانی اور شفقت نہیں کرتا لوگ بھی اس پر شفقت نہیں کرتے۔" یا آپ ﷺ نے کچھ اسی قسم کے الفاظ کہے۔

بعدازاں آپ ﷺ نے اپنے غم کو دبانے اور آتشِ اندوہ کو سرد کرنے کا ارادہ کیا۔ آپ ﷺ نے ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا اور سیرین رضی اللہ عنہا کی طرف لطف و کرم میں ڈوبی ہوئی نظر سے دیکھا اور انہیں یہ فرماتے ہوئے غم غلط کرنے کی تلقین کی کہ ابراہیم رضی اللہ عنہ کو جنت میں ایک دایہ ملے گی۔ ایک روایت کے مطابق ابراہیم رضی اللہ عنہ کو ام بردہ نے اور ایک دوسری روایت کے موجب فضل بن عباس نے غسل دیا، پھر ان کی میت ایک چھوٹے سے تختے پر اٹھا کر لے گئے۔ پیغمبر ﷺ، آپ ﷺ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ اور صحابہؓ کی ایک جماعت بقیع کے قبرستان تک جنازے کے ہمراہ گئے جہاں آپ ﷺ نے نماز پڑھائی اور تدفین کی رسم ادا کی۔ جب تدفین سے فراغت ہوئی تو آپ ﷺ نے قبر کی درزوں اور شگافوں کو بند کرنے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے قبر کی مٹی ہموار کی اور اس پر پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ شناخت کے لئے آپ ﷺ نے وہاں کوئی چیز نصب کر دی۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ علامتِ قبر سے میت کو نہ کوئی نفع پہنچتا ہے نہ نقصان البتہ زندوں کو اس سے ایک گونہ تسلی ہو جاتی ہے جب انسان کوئی کام کرتا ہے تو مناسب یہ ہے کہ اسے خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے انجام دے۔ خدا کو یہی بات پسند ہے۔

اتفاق کی بات کہ ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے دن سورج گرہن تھا، بعض صحابہؓ نے اسے بھی اعجاز سے

Marfat.com

تعبیر کیا اور کہنے لگے، سورج کو ابراہیم ؓ کی موت کے سبب گہن لگا ہے۔ آپ ﷺ نے یہ بات سنی۔ کیا قارئین کا یہ خیال ہے کہ اپنے فرزند ابراہیم ؓ سے انتہائی محبت اور صدمہ وفات کے سبب ان الفاظ سے آپ ﷺ کو کچھ تسلی ہوئی ہوگی یا کم از کم آپ ﷺ نے سکوت اختیار کر لیا ہوگا، یا آپ ﷺ نے لوگوں کو معذور خیال کیا ہوگا حالانکہ آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ اگر وہ اسے معجزہ قرار دیں گے تو ان سے اس کی باز پرس کی جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ یہ امر ممکن ہے ایسے لوگوں کو زیب دیتا ہو جو لوگوں کی نادانی سے کچھ فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں یا جن کو غم واندوہ کے احساسات راہ راست سے بھٹکا دیں لیکن ایسی باتیں ایک راست باز شخص کو زیب نہیں دیتیں۔ بھلا آپ ﷺ ایسے رفیع المرتبت رسول ان باتوں کو کہاں کوئی اہمیت دے سکتے تھے؟ چنانچہ آپ ﷺ نے ان لوگوں کی طرف دیکھا جو یہ کہتے تھے کہ سورج گرہن ابراہیم ؓ کی وفات کی وجہ سے واقع ہوا ہے اور ان سے کہا، چاند سورج خدا کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ وہ کسی کی موت یا زندگی کے سبب نہیں گہناتے۔ جب تم سورج یا چاند کا گہن دیکھو تو نماز پڑھ کر خدا کی یاد میں مشغول ہو جاؤ۔ بھلا اس سے زیادہ بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایسے حالات میں بھی جبکہ آپ ﷺ کا دل غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا تھا، اپنے فرائض رسالت کی ادائی میں کوتاہی نہ کی۔ مغربی مصنفین میں سے جن اشخاص نے اس واقعے کا ذکر کیا ہے وہ آپ ﷺ کی بزرگی سے انکار نہیں کر سکے اور انہیں یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ جس شخص نے زندگی کے نازک ترین موڑ پر بھی حق وصداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، اس کی راست بازی میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

قارئین کرام یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ازواجِ مطہرات ؓ کے اس بارے میں کیا احساسات ہوں گے جبکہ وہ ابراہیم ؓ کی وفات پر آپ ﷺ کو رنج و غم میں ڈوبا ہوا دیکھ رہی تھیں۔

بہرحال آنحضرت ﷺ کو رب قدوس کے فضل و کرم کے طفیل اپنی رسالت کے فرائض کی ادائی، مختلف وفود کی آمد اور اسلام کی اشاعت سے خاصی حد تک اطمینان نصیب ہو گیا تھا۔ وفود کی آمد کا سلسلہ برابر جاری رہا حتیٰ کہ ۱۰ھ کو ان کے سبب عام الوفود کے نام سے یاد کیا گیا۔ اسی سال حضرت ابوبکر ؓ نے حج میں امارت کے فرائض انجام دیے۔

❋

Marfat.com

باب 26

سالِ وفود اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امارتِ حج

غزوۂ تبوک کے نتائج

غزوۂ تبوک کا نتیجہ تمام جزیرۂ عرب میں اسلام کے اثر و نفوذ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ آپ ﷺ کو اپنے مخالفین کی شرانگیزیوں سے قریب قریب اطمینان نصیب ہوگیا۔ جب اس غزوے سے آپ ﷺ کی واپسی ہوئی تو اہلِ عرب جو تا حال شرک کی آلودگیوں کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے، سوچ میں پڑ گئے۔ جو مسلمان آپ ﷺ کے ہمراہ شام گئے تھے اور جنہوں نے طرح طرح کی مصیبتیں جھیلی اور بھوک پیاس کی شدتیں برداشت کیں تھیں واپسی کے وقت اس خیال سے دل ہی دل میں ناخوش تھے کہ نہ کوئی لڑائی ہوئی اور نہ مالِ غنیمت ہاتھ آیا کیونکہ رومی شام کے اندرونی علاقے کی پناہ گاہوں میں روپوش ہوگئے تھے لیکن رومیوں کی اس پسپائی نے عرب کے ان قبائل پر گہرے اثرات چھوڑے جو ابھی تک اپنی قدیم روش اور اپنے پرانے مذہب پر قائم تھے۔ یمن، حضرموت اور عمان وغیرہ کے جنوبی قبائل پر یہ اثرات اور بھی زیادہ نمایاں تھے۔ کیا وہ رومی ہی نہ تھے جنہوں نے ایرانیوں پر غلبہ پا کر ان سے اپنی صلیب واپس لے لی تھی اور اسے بڑی شان وشکوہ سے بیت المقدس میں واپس لے آئے تھے حالانکہ ایرانی وہ تھے جن کا مدت سے یمن اور گردونواح کے علاقوں پر تسلط قائم چلا آتا تھا۔

اب جبکہ مسلمانوں نے یمن اور تمام دیگر عرب کے علاقوں پر اپنی شوکت کا پرچم لہرا دیا تھا یہ امر کیسے مناسب تھا کہ یہ علاقے اس وحدت میں مدغم نہ ہو جاتے جس کی آنحضرت ﷺ نے طرح ڈالی تھی اور اس میں ان کا فائدہ بھی تھا اور وہ یہ کہ رومیوں اور ایرانیوں کے جبر و استبداد کے پنجے سے نجات کی صرف یہی ایک سبیل تھی۔ اس روش سے مختلف قبائل کے سرداروں کو بھی کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا کیونکہ یہ بات ان پر واضح ہو چکی تھی کہ جس نے بھی اسلام کی اطاعت کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا ہے، اسے آپ ﷺ نے اپنے قبیلے کی سرداری کے منصب پر برقرار رکھا ہے۔ غرض ہجرت کا دسواں سال عام الوفود تھا اور اس سال لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ غزوۂ تبوک میں رومیوں کی پسپائی صحابہؓ کی نظر میں فتح مکہ، فتح حنین اور محاصرۂ طائف سے بھی زیادہ نتیجہ خیز تھی۔

Marfat.com

عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اسلام

حسنِ اتفاق کہئے یا خوبی قسمت، اہل طائف جو محاصرے کے دوران میں مسلمانوں کے مقابلے میں ڈٹے رہے تھے اور انہوں نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ شہر میں داخل ہوئے بغیر ہی لوٹ جائیں، غزوۂ تبوک کے بعد انہی لوگوں نے اظہار اطاعت میں پہل کی۔ یہ قدم انہوں نے کافی غور وخوض کے بعد اٹھایا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے جب غزوہ حنین کے بعد طائف پر چڑھائی کی تھی تو عروہ بن مسعود ثقفی جو بنی ثقیف کا ایک سردار اور طائف کا ایک باشندہ تھا اس وقت یمن گیا ہوا تھا۔ جب اس کی واپسی ہوئی اور اسے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ تبوک میں فتح حاصل کرنے کے بعد مدینے تشریف لے آئے ہیں تو وہ فوراً اسلام لے آیا اور اس نے اپنی قوم کو بھی اسلام کی دعوت دی۔ عروہ بن مسعود ثقفی آپ ﷺ کی شخصی عظمت اور آپ ﷺ کے کارہائے نمایاں کی اہمیت سے بے خبر نہ تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے صلح حدیبیہ کے سلسلے میں قریش کی جانب سے آپ ﷺ سے گفتگو کی تھی۔

عروہ رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے بعد آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ وہ اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دینے پر تلا ہوا ہے۔ آپ ﷺ جانتے تھے کہ بنی ثقیف اپنے بت لات کی پرستش کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور ان کی خود بینی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے عروہ رضی اللہ عنہ کو اس سلسلے میں ڈرایا اور یہ فرمایا کہ لوگ تمہیں زندہ نہ چھوڑیں گے لیکن عروہ رضی اللہ عنہ نے اس خیال سے کہ ان کی قوم انہیں عزت واحترام کی نظر سے دیکھتی تھی، یہ عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! میری قوم مجھے آنکھوں پر بٹھاتی اور دل میں جگہ دیتی ہے! (اس پر غالباً آپ ﷺ نے سکوت فرمایا اور انہیں ان کے عزم سے نہ روکا) غرض عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ نے اپنی قوم کو دعوت دی۔ قوم کے افراد نے آپس میں صلاح و مشورہ کیا لیکن عروہ رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی خیال کا اظہار نہ کیا۔ صبح ہوئی تو عروہ بن ثقفی رضی اللہ عنہ نے اپنے بالاخانے پر چڑھ کر لوگوں کو نماز کے لئے پکارا۔ آنحضرت ﷺ کا قیاس صحیح نکلا، قوم نے غضب آلود ہو کر عروہ رضی اللہ عنہ کو گھیرے میں لے لیا اور چاروں طرف سے ان پر تیروں کی بارش کی۔ آخر ایک تیر اس تیزی سے آ کر لگا کہ عروہ رضی اللہ عنہ جانبر نہ ہو سکے۔ عروہ رضی اللہ عنہ کے اہل وعیال یہ خونچکاں منظر دیکھ کر حواس باختہ ہو رہے تھے۔ عروہ رضی اللہ عنہ دم توڑ رہے تھے لیکن ان کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

> ''یہ عظمت اور یہ سعادت مجھے خدا نے عطا کی ہے۔ مجھے شہادت کا مقام نصیب ہوا ہے۔ میری حالت انہی شہداء کی سی ہے جنھوں نے آپ ﷺ کے ہمراہ پہلے جام شہادت نوش کیا۔''

عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ نے یہ وصیت کی کہ انہیں انہی شہیدوں کے پہلو میں دفن کیا جائے چنانچہ ان کے اہل وعیال نے اس وصیت کی تعمیل میں انہیں اسی مقام پر سپرد خاک کر دیا۔

Marfat.com

عروہ رضی اللہ عنہ کا خون رائیگاں نہ گیا۔ طائف کے اردگرد رہنے والے تمام قبائل دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے اس لئے بنی ثقیف نے اپنے ایک سردار سے جو بدسلوکی کی اسے انہوں نے بڑا گھناؤنا فعل قرار دیا۔ اس سے بنی ثقیف کو یقین ہو گیا کہ وہ کسی جماعت کی طرف سے بھی محفوظ و مامون نہیں ہیں اور جو شخص بھی ان میں سے باہر نکلے گا اس کی تباہی و بربادی میں کوئی کلام نہیں۔ آخر بنی ثقیف نے باہم مشورہ کیا اور اپنے ایک سردار عبدیالیل ثقفی سے درخواست کی کہ وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر بنی ثقیف سے مصالحت کی بات چیت کریں لیکن عبدیالیل کو یہ خطرہ تھا کہ مبادا اس کی قوم اس سے بھی وہی بدسلوکی کرے جو اس نے عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کی تھی چنانچہ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضری کے لئے اس وقت تک آمادہ نہ ہوا جب تک انہوں نے اس کے ہمراہ پانچ آدمی اور روانہ نہ کئے۔ اب اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ اگر وہ ان کے ہمراہ جائے گا تو واپسی پر ان میں سے ہر شخص اپنے اپنے قبیلے کو اپنی طرف متوجہ کرے گا۔ جب یہ لوگ مدینہ کے قریب پہنچے تو ان کی ملاقات مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے ہوئی، انہوں نے بہ سرعت تمام اس کی اطلاع آنحضرت ﷺ کو دینی چاہی۔ اثنائے راہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں تیز رفتاری سے جاتا ہوا دیکھا اور یہ جان کر کہ اس سرعت رفتار کا کیا سبب ہے، انہوں نے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ آپؓ یہ کام مجھ پر چھوڑیں چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وفد ثقیف کی آمد کی اطلاع دی۔

اس وفد کو اپنی قوم پر فخر تھا اور محاصرہ طائف سے آپ ﷺ کی واپسی کی یاد بھی ان کے دلوں میں تازہ تھی۔ اگرچہ مغیرہ رضی اللہ عنہ نے انہیں یہ بتا دیا تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ سے ملیں تو اسلامی طریقے کے مطابق سلام کریں لیکن انہوں نے اس کے خلاف ایام جاہلیت کے انداز پر سلام کیا۔ ان کے لئے مسجد نبویؐ کے ایک گوشے میں ایک خاص خیمہ نصب کیا گیا۔ اس وفد کے افراد مسلمانوں سے بچے بچے رہتے تھے اور انہیں ان کی طرف سے اطمینان نہ تھا۔ خالد بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ ان کے اور آنحضرت ﷺ کے درمیان ایلچی گری کی خدمت پر مامور تھے۔ جو کھانا ان کے پاس بھیجا جاتا تھا اسے وہ اس وقت تک نہ کھاتے تھے جب تک خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نہ کھا لیتے۔ خالد رضی اللہ عنہ نے سفیر کی حیثیت سے آپ ﷺ کو اطلاع دی کہ یہ وفد قبولِ اسلام کے لئے آمادہ ہے لیکن اس کے افراد کا مطالبہ یہ ہے کہ آپ ﷺ ان کے بت لات کو تین سال تک کے لئے باقی رہنے دیں۔ نیز نماز کی معافی کا اعلان بھی کر دیں۔ آپ ﷺ نے ان کے اس مطالبے کو سختی سے رد کر دیا، اس کے بعد بنی ثقیف کے اس وفد نے دو سال کی مدت تک لات کی بقا چاہی، آپ ﷺ نے اسے بھی نہ مانا۔ اس مطالبے سے نیچے اتر کر وفد نے ایک سال کی مہلت طلب کی اور آخر میں ایک ماہ تک کی رعایت کا مطالبہ کیا لیکن آپ ﷺ کا انکار اتنا شدید تھا کہ اس میں کسی رعایت کی گنجائش ہی نہ تھی۔ وہ ایک ایسے نبی سے اس چیز کی توقع کیسے کر سکتے تھے جس کی دعوت خدائے واحد القہار کے دین کی جانب تھی۔ آپ ﷺ کا عزم تو یہ تھا کہ ایک بت بھی باقی نہ رہنے پائے۔ ایسا نبی اس بت کے معاملے میں سہل انگاری سے کیسے کام

Marfat.com

لے سکتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان اور کفر ہی صرف دو راہیں ہیں ان کے درمیان شک و تردد کا جو راستہ ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں، شک اور ایمان ایک دل میں ہرگز جمع نہیں ہو سکتے۔ جس طرح کفر و ایمان کی ایک دل میں یکجائی محالات سے ہے اسی طرح شک اور ایمان بھی یکجا نہیں ہو سکتے۔ بنی ثقیف کا یہ مطالبہ کہ ان کا بت لات بھی باقی رہے، اس امر کی دلیل تھا کہ وہ خدا کے ساتھ ساتھ اپنے بت کی بھی عبادت کر سکتے ہیں اور اصل میں یہ شرک ہے جسے خدا ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔

بنی ثقیف کے وفد نے نماز کی معافی کا مطالبہ کیا مگر آپ ﷺ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ جس مذہب میں سرے سے نماز ہی نہ ہو اس میں فلاح کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ آخر بنی ثقیف لات کی برقراری کے مطالبے سے دست بردار ہو گئے۔ اور انہوں نے یہ بھی مان لیا کہ ہم نماز پڑھیں گے لیکن اب انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ ہم پر یہ زور نہ دیا جائے کہ ہم اپنے بت اپنے ہاتھوں سے توڑیں۔ ہم ابھی ابھی ایمان لائے ہیں، ہماری قوم کے لوگ اس انتظار میں ہوں گے کہ ہم کس فیصلے کے بعد لوٹے ہیں اس لئے آپ فی الحال ہمیں معبودوں کی شکست و ریخت کے اقدام سے معاف رکھیں۔ آپ ﷺ نے مصلحتاً اس بارے میں سختی نہ کی کیونکہ اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ بنی ثقیف خود اپنے بتوں کو توڑیں یا کوئی دوسرا شخص یہ کام کرے۔ دونوں صورتوں میں مقصود یہ تھا کہ خدا کی عبادت پر یہ لوگ متفق ہو جائیں چنانچہ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا، ہم بت شکنی کے سلسلے میں تمہارا عذر قبول کرتے ہیں۔ بعدازاں آپ ﷺ نے عثمان بن ابی العاص کو جو ان سب میں کم سن تھے، ان کا پیشوا بنا دیا۔ انہیں نوعمری کے باوجود ان کا پیشوا اس لئے مقرر کیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور دیگر اکابر صحابہ کے قول کے مطابق انہیں اسلام کی تعلیمات کے حصول اور قرآن فہمی کا سب سے زیادہ اشتیاق تھا۔

بنی ثقیف کے یہ لوگ رمضان المبارک کے بقیہ ایام میں آپ ﷺ کے پاس ہی قیام پذیر رہے اور آپ ﷺ کے ساتھ روزے بھی رکھتے رہے۔ آنحضرت ﷺ افطار اور سحری کے وقت ان کے پاس کھانا بھیج دیتے تھے۔ جب یہ وفد اپنی قوم کے پاس واپس جانے لگا تو آپ ﷺ نے عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ میں وصیت فرمائی۔

> ''نماز میں اختصار ملحوظِ خاطر رکھو اور یہ خیال رہے کہ ان میں بوڑھے، بچے، کمزور اور ضرورت مند بھی ہوتے ہیں۔''

''لات'' کا انہدام

بنی ثقیف کا وفد اپنے علاقے میں واپس آ گیا۔ پیغمبر ﷺ نے ابوسفیان بن حب اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو جنہیں بنی ثقیف محبت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، وفد کے ہمراہ روانہ کیا تا کہ وہ ''لات'' کے

Marfat.com

انہدام کا بندوبست کریں۔ غرض ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور مغیرہ رضی اللہ عنہ بت شکنی کے لئے پہنچے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بت کو منہدم کر دیا۔ بنی ثقیف کی عورتیں ننگے سر رو رہی تھیں۔ چونکہ بنی ثقیف کے وفد اور آنحضرت ﷺ کے مابین "لات" کو توڑ ڈالنے کے سلسلے میں قول و قرار ہو چکے تھے، اس لئے کسی کو اس کے قریب جانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ نے لات کا وہ تمام مال اور وہ زیور لے لیا جو اس نے پہن رکھا تھا اور پیغمبر ﷺ کی ہدایت کے بموجب اسے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی رائے سے عروہ رضی اللہ عنہ اور اسود رضی اللہ عنہ کا قرضہ چکانے میں صرف کر دیا۔ لات کے انہدام اور اہل طائف کے قبولِ اسلام سے حجاز کا تمام علاقہ اسلام کے حلقہ اقتدار میں آ گیا۔

اسلام کے اثرات شام میں بلادِ روم سے لے کر جنوب میں علاقہ یمن اور حضرموت تک پہنچ چکے تھے۔ جنوبی عرب کے باقی ماندہ علاقوں کے لوگ اس نئے مذہب کو قبول کرنے پر آمادہ ہو رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی مدافعت پر ان کا پورا زور صرف ہو رہا تھا۔ مختلف اطراف سے ان کے وفود مدینہ میں آنے لگے، تا کہ وہ حلقہ اطاعت میں داخل ہو کر مشرف بہ اسلام ہو جائیں۔

وفود کی مسلسل آمد

وفود پے در پے مدینہ آتے رہے اور اس طرح کئی ماہ گزر گئے یہاں تک کہ حج کا زمانہ قریب آ گیا۔ اس وقت تک پیغمبر ﷺ نے فریضہ حج کے تمام مراسم اس طرح ادا نہ کئے تھے جس طرح آج مسلمان ادا کرتے ہیں۔ کیا امسال آپ ﷺ کو اظہارِ تشکر و اطمینان کے لئے عازم حج ہونا چاہئے تھا؟ کیونکہ خدا نے آپ ﷺ کو روم پر فتح عطا کی تھی اور طائف کے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے نیز دور دراز سے وفود کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ابھی جزیرہ عرب میں ایسے لوگ باقی تھے جو خدا اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہ لائے تھے۔ ابھی کفار کے علاوہ یہود و نصاریٰ بھی پائے جاتے تھے۔ کفار ابھی ایام جاہلیت کے مطابق مقدس اور محترم مہینوں میں حج بیت اللہ کی رسوم ادا کرتے تھے حالانکہ ان کی نجاست میں کوئی کلام نہ تھا۔ ان حالات کی بنا پر آپ ﷺ نے مناسب خیال کیا کہ آپ ﷺ ابھی مدینے میں قیام پذیر رہیں حتیٰ کہ خدا کی بات پوری ہو جائے اور خدا آپ ﷺ کو بیت اللہ کے حج کی اجازت دے اور اس سال امارتِ حج کے فرائض حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ انجام دیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امارتِ حج

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تین سو مسلمانوں کی معیت میں بہ ارادہ حج عازم مکہ ہوئے۔ مشرکین سالہا سال سے بیت اللہ کا حج کرتے چلے آتے تھے، کیا پیغمبر ﷺ اور لوگوں کے درمیان یہ عہد و پیمان نہ ہو چکا تھا کہ ہر اس شخص کو جو بیت اللہ کی زیارت کے لئے آئے گا روکا نہ جائے گا اور مقدس و محترم مہینوں میں کسی کو خوف زدہ نہ

Marfat.com

کیا جائے گا۔ کیا آپ ﷺ کے اور قبائل عرب کے درمیان مقررہ اوقات پر قراردادیں منظور نہ ہو چکی تھیں؟ جب تک یہ قراردادیں برقرار تھیں اس وقت تک وہ لوگ بھی بیت اللہ کی زیارت کر سکتے تھے جو خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے یا اس کے علاوہ کسی اور چیز کی عبادت کرتے تھے چنانچہ مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ کعبہ میں ایام جاہلیت کے مطابق مراسم عبادت بجا لائے جاتے ہیں لیکن وہ خاص خاص قراردادوں اور عہد و پیمان کی بنا پر کسی کو کعبہ کی زیارت اور عبادت سے باز رکھنے کے مجاز نہ تھے۔ اب جبکہ عربوں کے بہت سے بت توڑ ڈالے گئے تھے اور کعبہ کے اندر یا اردگرد کے تمام بت بھی نیست و نابود ہو چکے تھے تو رب قدوس کے گھر میں شرک و بت پرستی کے مخالفین کا مشرکین اور کفار کے ساتھ اجتماع ایک ناقابل فہم اور متناقض امر تھا۔ یہودی اور عیسائی دونوں مل جل کر اگر بیت المقدس کا حج کریں تو یہ بات عقلاً درست سمجھی جا سکتی تھی کیونکہ بیت المقدس یہودیوں کے خیال میں وہ سرزمین تھی جس کی حیثیت ان کے لئے ارض موعود کی تھی اور نصاریٰ کی نظر میں یہ مقام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش تھا۔ یہ اجتماع تو اتنا عجیب نہ تھا لیکن اس عبادت گاہ کے گرد جہاں بت توڑ ڈالے گئے تھے، انہی بتوں کی عبادت ایک عجیب معاملہ تھا، اس لئے یہ ایک قدرتی بات تھی کہ مشرکین کو اس عبادت گاہ کے قریب جانے سے روک دیا جائے جسے شرک اور بت پرستیوں کی تمام آلودگیوں سے پاک و صاف کر دیا گیا تھا۔ سورۂ توبہ کی چند آیات اس بارے میں نازل ہوئیں، دوسری طرف حج کا موسم شروع ہو چکا تھا اور مشرکین مختلف اطراف سے مراسم حج کی ادائی کے لئے آ چکے تھے۔ اس موقع پر مناسب تھا کہ مشرکین کو خدا کا فرمان پہنچا دیا جائے اور ان پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ مومنین اور مشرکین کے درمیان جو عہد و پیمان قائم تھے ٹوٹ چکے ہیں، ہاں! البتہ جو عہد و پیمان کسی مقررہ مدت تک کے لئے باندھے گئے تھے وہ اپنی مدت کے اختتام تک برقرار رہیں گے۔

اس مقصد کے پیش نظر آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا تا کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جائیں اور حج کے موقع پر عرفہ کے روز خدا اور اس کے رسول ﷺ کا فرمان لوگوں کو سنائیں چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ پیغام پہنچانے کے لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور دوسرے مسلمانوں کے پیچھے پیچھے جو حج کرنے کے لئے نکلے تھے جا پہنچے۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں دیکھا تو پوچھا، امیر بنا کر بھیجے گئے ہو یا تابع؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں ارشاد فرمایا، تابع کی حیثیت میں آیا ہوں۔ بعد ازاں انہوں نے فرمایا، چونکہ میں آنحضرت ﷺ کے اہل بیت میں سے ہوں اس لئے آپ ﷺ نے مجھے ایک فرمان سنانے کے لئے مامور کیا ہے۔ چنانچہ جب لوگ مراسم حج کی ادائی کے لئے منیٰ میں جمع ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اٹھے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی ان کی ایک جانب موجود تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بہ آواز بلند مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کی:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝١ فَسِيْحُوْا فِي

الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي
الْكٰفِرِيْنَ ۲ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ
بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ
تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ
اَلِيْمٍ ۳ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـــًٔـا وَّلَمْ
يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُتَّقِيْنَ ۴ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ
وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا
وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۵
وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ
مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۶ كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ
عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا
اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۷ كَيْفَ وَاِنْ
يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى
قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۸ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ
سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۹ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ
وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۱۰ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ
فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۱۱ وَاِنْ نَّكَثُوْٓا
اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ
لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۱۲ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا
بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ
تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۱۳ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ
وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۱۴ وَيُذْهِبْ غَيْظَ
قُلُوْبِهِمْ ۭ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۱۵ اَمْ حَسِبْتُمْ
اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۱۶ مَا كَانَ
لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿١٧﴾ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ
فَعَسٰۤى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿١٨﴾ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ
وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً
عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿٢٠﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ
وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿٢١﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ
عَظِيْمٌ ﴿٢٢﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ
اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٣﴾ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ
وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ا۟قْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ
تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى
يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٤﴾ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ
مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ
شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ
اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا
وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ
ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٧﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا
الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ
خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ
حَكِيْمٌ ﴿٢٨﴾ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ
مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى
يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿٢٩﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ
وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ
قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٣٠﴾ اِتَّخَذُوْٓا
اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ

Marfat.com

أُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰـهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٣١﴾
يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِــــُٔـوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ
الْكٰفِرُوْنَ ﴿٣٢﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى
الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿٣٣﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ
الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣٤﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى
بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا
مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿٣٥﴾ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ
اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ
الْقَيِّمُ ڏ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَاۗفَّةً كَمَا
يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَاۗفَّةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٣٦﴾ (سورۃ التوبہ: ۱ تا ۳۶)

''اللہ اور اس کا رسول ﷺ ان مشرکین سے بیزار ہیں جن سے تم نے بلاتعین مدت عہد کر رکھا تھا۔ اے مشرکو! تم اس سرزمین میں چار مہینے اور چل پھر لو اور یہ جان لو کہ تم خدا کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ کہ خدا کفار کو رسوا کرنے والا ہے۔ خدا اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے حج اکبر کے دن لوگوں کے سامنے اعلان کیا جاتا ہے کہ خدا اور اس کا رسول ﷺ مشرکین سے بیزار ہیں سو اگر تم توبہ کر لو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر تم اعراض کرو تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم خدا کو عاجز نہیں کر سکتے۔ اے پیغمبر! تم کفار کو دردناک عذاب کی خبر سنا دو۔ ہاں! وہ مشرکین جن سے تم نے عہد و پیمان کیا اور انہوں نے اسے پورا کرنے میں ذرا بھی کمی نہیں کی اور انہوں نے کسی کی تمہارے خلاف مدد بھی نہیں کی سو ان کے معاہدے مقررہ مدتوں تک پورے کر دو کیونکہ یقینا خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے سو جب مقدس و حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو تم جہاں بھی پاؤ قتل کر ڈالو، ان کو پکڑو اور گھیر لو اور ہر جگہ ان کی تاک میں بیٹھے رہو، پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز کے پابند ہو جائیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، واقعی خدا بخشنے والا مہربان ہے اور اے پیغمبر ﷺ! اگر کوئی مشرک آپ ﷺ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دو تا کہ وہ کلام اللہ سن سکے۔ پھر اسے اس کی جائے امن تک پہنچا دو کیونکہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے۔ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک مشرکین کا عہد

کیونکر قابل رعایت ہو سکتا ہے۔ ہاں جن لوگوں سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک عہد لیا ہے وہ لوگ جب تک تم سے سیدھے رہیں اس وقت تک تم بھی ان سے سیدھے رہو۔ یقیناً خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔ ان کا عہد کیونکر قابل رعایت ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اگر کہیں وہ تم پر غلبہ پالیں تو تمہارے بارے میں کسی قرابت یا عہد کا لحاظ نہ کریں۔ وہ تمہیں صرف زبانی باتوں سے خوش کرتے ہیں اور ان کے دل نہیں مانتے۔ ان میں سے اکثر بے راہ رو ہیں انہوں نے خدا کے احکام تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالے اور اس کی راہ سے ہٹ گئے، جو کام یہ کرتے ہیں برے ہیں۔ وہ کسی مومن کے حق میں قرابت یا عہد کا لحاظ نہیں کرتے اور یہی زیادتی کرنے والے ہیں سو اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ ہم جاننے والوں کے لئے احکام کھول کر بیان کرتے ہیں اور اگر یہ لوگ عہد و پیمان کے بعد اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر طعنہ کسیں تو تم پیشوایانِ کفر سے لڑو۔ ان کی قسمیں، قسمیں نہیں، شاید وہ باز آ جائیں۔ کیا تم ان لوگوں سے نہ لڑو گے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور پیغمبر ﷺ کو جلاوطن کرنے کی فکر کی؟ انہی نے پہلے تم سے چھیڑ کی۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ سو خدا اس امر کے زیادہ شایان ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ تم ان سے لڑو تاکہ خدا انہیں تمہارے ہاتھوں سزا دے اور انہیں رسوا کرے اور تمہیں ان پر فتح نصیب کرے اور بہت سے مومن لوگوں کے دل ٹھنڈے کرے اور ان کے دلوں کا غصہ نکالے اور جسے چاہے گا اللہ معاف کر دے گا اور اللہ صاحب علم و حکمت ہے۔ کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی تک خدا نے ایسے لوگوں کو آزمایا ہی نہیں جنہوں نے تم سے جہاد کیا اور اللہ، اس کے رسول ﷺ اور مومنوں کے سوا کسی کو اپنا رازدار نہیں بنایا اور اللہ تمہارے اعمال کی خبر رکھتا ہے۔ مشرکین کا یہ کام نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں اس حال میں کہ وہ اپنے کفر پر خود ہی شہادت دیتے ہوں۔ ایسے لوگوں کے اعمال اکارت گئے اور وہ آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کی مسجدوں کو تو صرف وہی آباد کرتا ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اور جو نماز ادا کرتا اور زکوٰۃ دیتا ہو اور اللہ کے سوائے کسی سے نہ ڈرتا ہو۔ سو امید ہے کہ یہی لوگ ہدایت یافتہ ہوں گے کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد کرنے کو اس شخص کے عمل کی مانند قرار دے دیا ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا اور جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا؟ وہ اللہ کے نزدیک برابر نہیں اور اللہ بے

Marfat.com

انصاف لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کیا وہ درجے کے لحاظ سے اللہ کے نزدیک زیادہ بڑے ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں، ان کا رب ان کو اپنی طرف سے رحمت اور خوشنودی اور جنت کے باغوں کی خوش خبری دیتا ہے، ان میں ان کے لئے دائمی نعمت ہوگی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے یقیناً اللہ کے پاس بڑا اجر ہے، اے ایمان والو اپنے باپوں کو اور اپنے بھائیوں کو رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان کے مقابلے میں کفر کو عزیز رکھیں اور تم میں سے جو ان سے رفاقت رکھے گا سو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں، اے پیغمبر ﷺ کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم کماتے ہو اور وہ تجارت جس کی کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو، تم کو اللہ، اس کے رسول ﷺ اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ مرغوب ومحبوب ہیں تو تم انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے اور اللہ حکم عدولی کرنے والوں کو ہدایت نہیں کرتا یقیناً اللہ نے بہت سے میدانوں میں تمہاری مدد کی اور جنگ حنین میں بھی جبکہ تمہاری بہتات نے تم کو مغرور کر دیا تھا سو وہ بہتات تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین باوجود فراخی کے تم پر تنگ ہوگئی پھر تم پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے، اس کے بعد اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر تسکین نازل کی اور ایسے لشکر اتارے جو تم نے نہ دیکھے اور کافروں کو سزا دی اور کافروں کی سزا یہی ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ جسے چاہے معاف کر دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اے ایمان والو، مشرک خالص ناپاک ہیں سو وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے قریب نہ آنے پائیں اور اگر تم مفلسی کا اندیشہ رکھتے ہو سو عنقریب اللہ اگر چاہے گا تو تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا یقیناً اللہ صاحب علم وحکمت ہے۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخرت پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام کیا ہے اور نہ سچے دین (اسلام) کو قبول کرتے ہیں، ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ذلیل ہو کر ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔ یہودیوں نے کہا، عزیر علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے یہ ان کے کہنے کی باتیں ہیں یہ بھی ان لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں خدا ان کو غارت کرے یہ کدھر الٹے جا رہے ہیں انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو اپنا رب بنا رکھا ہے اور مسیح علیہ السلام ابن مریم کو بھی حالانکہ انہیں صرف یہ حکم دیا

Marfat.com

گیا تھا کہ صرف ایک معبود کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی پرستش کے قابل نہیں، وہ ان کے شرک سے پاک ہے وہ اللہ کے نور کو اپنے منہ (کی پھونکوں) سے بجھا دینا چاہتے ہیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کئے بغیر نہ رہے گا خواہ کافر برا مانتے رہیں۔ وہ ایسی ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اسے باقی تمام ادیان پر غالب کر دے خواہ مشرک برا ہی کیوں نہ مانیں۔ اے ایمان والو! علماء اور مشائخ میں سے بہت سے لوگوں کے مال ناحق کھا جاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، اے پیغمبر! تو انہیں دردناک سزا کی خبر سنا دے، اس دن ان کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر ان سے ان لوگوں کی پیشانیوں، پہلوؤں اور ان کی پیٹھوں کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا، یہ ہے جسے تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، سو اب جمع کرنے کا مزا چکھو یقینا اللہ کے نزدیک اس کی کتاب میں مہینوں کی تعداد بارہ ہے اسی دن سے جس دن اس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا تھا ان میں سے چار ادب کے مہینے ہیں یہی سیدھا دین ہے سو تم ان میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو اور تمام مشرکین سے لڑو جیسے وہ تم سب سے لڑتے ہیں اور جان لو کہ خدا پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔"

لوگ جب مراسمِ حج ادا کر رہے تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر سورۂ توبہ کی یہ آیات پڑھیں جو تمام کی تمام ہم نے ایک خاص مقصد کے تحت جس کا عنقریب مذکور آئے گا، اوپر نقل کر دی ہیں۔ ان آیات کی تلاوت کے بعد کچھ دیر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سکوت فرمایا، پھر بآواز بلند یہ ارشاد کیا، اے لوگو! کوئی کافر جنت میں داخل نہ ہوگا۔ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لئے نہ آئے اور کوئی برہنہ شخص کعبے کا طواف نہ کرے۔ پیغمبر ﷺ سے جس شخص کا بھی عہد و پیمان ہے وہ اپنی مقررہ مدت تک قائم رہے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان چاروں باتوں کا لوگوں میں اعلان کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے چار مہینے کی مہلت دی تا کہ تمام لوگ اپنی اپنی پناہ گاہوں اور شہروں کو واپس چلے جائیں، اس دن سے کوئی مشرک حج کے لئے نہیں آیا اور نہ کسی برہنہ شخص نے کعبے کا طواف کیا۔ اس روز سے دولت اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی۔

اسی بنیاد کی وضاحت کی خاطر ہم نے سورۂ توبہ کے شروع کی مندرجہ بالا آیات یہاں نقل کی ہیں۔ اس سے غرض یہ ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے صرف حج کے دن ہی ان کے پڑھ لینے پر اکتفا نہ کیا بلکہ اس کے بعد آپ لوگوں کے گھروں میں بھی ان کی تلاوت کیا کرتے تھے جیسا کہ بہت سی روایات سے ثابت ہے۔ سورہ براۃ کی ان ابتدائی آیات کے مطالعے اور ان پر غور و خوض سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ یہ آیات ہر نوزائیدہ سلطنت کے لئے اعلیٰ درجے کی معنوی بنیاد کا کام دیتی ہیں۔

Marfat.com

سورہ براۃ پیغمبر ﷺ کے آخری غزوے کے بعد جبکہ اہل طائف بھی اس نئے مذہب میں داخل ہو چکے تھے نازل ہوئی اس وقت تمام علاقۂ حجاز کے علاوہ تہامہ اور نجد بھی پرچم اسلام کے نیچے آ چکے تھے نیز جنوبی عرب کے بیشتر قبائل آپ ﷺ کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہو کر آپ کے مذہب میں شامل ہو چکے تھے۔ ایسی حالت میں ان آیات کے نزول کی تاریخی مصلحت واضح ہو جاتی ہے جن پر دولت اسلام کی مصنوعی بنیاد قائم ہوئی کیونکہ کسی دولت کی تقویت کے لئے یہ چیز ناگزیر ہے کہ اس کے تمام پیرو ایک ہی معنوی عقیدے کے تابع ہوں اور ضرورت کے وقت وہ اپنی پوری قوت سے اس عقیدے کی حفاظت کریں، خدائے یگانہ پر ایمان لانے سے بڑھ کر اور کیا عقیدہ ہوسکتا ہے اور اس سے زیادہ کون سا عقیدہ دل پر اثر انداز ہوسکتا ہے کہ انسان کے دل میں یہ احساس جاگزیں ہو جائے کہ اس کی روح کو عالم وجود کے بلند ترین مظہر سے ایک گونہ تعلق حاصل ہے اور خدا کے سوا اس پر کسی کا تسلط نہیں اور اس کے سوا اس کے دل کا اور کوئی نگہبان نہیں ہے اگر کچھ لوگ ایسے بھی موجود ہوں جو اس عقیدے کی مخالفت پر کمربستہ ہوں جو کسی نوزائیدہ دولت کی بنیاد ہوسکتا ہے تو ان لوگوں کو بدکار کہا جائے گا اور یہ لوگ فتنہ و فساد کا موجب قرار دیئے جائیں گے ایسے لوگوں سے کسی قسم کا عہد و پیمان نہ ہونا چاہئے اور ان سے جنگ کرنی چاہئے۔ اگر ایسے لوگوں کی طرف سے اس عام عقیدے کی مخالفت سرکشی پر مبنی ہو تو ان سے جنگ ضروری ہے تاکہ آنکہ وہ سر تسلیم خم کرلیں اور اگر ان کی یہ مخالفت سرکشی پر مبنی نہ ہو جیسا کہ اہل کتاب کا حال ہے تو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ذلت اور پستی کی حالت میں جزیے کی ادائی کریں۔

اگر اس موضوع پر تاریخی اور اجتماعی نقطہ نظر سے غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ سورۂ توبہ کی ان آیات کا مقصود یہی ہے اور ہر سلیم الفطرت شخص ان سے یہی نتیجہ برآمد کرے گا لیکن جو لوگ اسلام اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں رائے زنی کرتے وقت بے اعتدالی سے کام لیتے ہیں، وہ اس سے قطع نظر سورۂ توبہ کی ان پُرزور آیات کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ آیات لوگوں کو تعصب کی دعوت دیتی ہیں جو اعلیٰ درجے کے تمدن کے مقتضا یعنی اصل انکاری اور رواداری کے منافی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق یہ آیات مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتی ہیں کہ وہ مشرکین کے خلاف جنگ کے لئے اٹھ کھڑے ہوں اور جہاں کہیں وہ انہیں ملیں وہ انہیں کسی رو رعایت کے بغیر تہ تیغ کر ڈالیں۔ اس طرح گویا یہ آیات پُرزور تسلط اور غالب اقتدار کی دعوت دیتی ہیں۔ یہ رائے بیشتر مصنفین مغرب نے قائم کی ہے۔ جن لوگوں میں تاریخی اور تمدنی اصول کی تنقید کا ملکہ نہیں وہ اس رائے کی طرف فوراً مائل ہو جاتے ہیں۔ بعض مسلمان بھی اس گروہ میں شامل ہیں لیکن یہ ایسی رائے ہے جو تاریخی اور تمدنی حقائق سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتی، اس لئے یہ رائے رکھنے والے لوگ سورۂ توبہ کی ان آیات اور اسی قسم کی دوسری آیات کی تفسیر جو جابجا قرآن مجید میں وارد ہیں ایسے طریق پر کرتے ہیں جس سے پیغمبر ﷺ کی سیرت کے واقعات ہرگز میل نہیں کھاتے اور اس جلیل القدر نبی کی بعثت سے وصال تک

Marfat.com

کی زندگی کے مسلسل حالات و واقعات سے اس مفہوم کی تائید نہیں ہوتی۔

آزادیٔ رائے اور مغربی تمدن

اس کی مزید وضاحت کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم دنیا کے موجودہ تمدن کی معنوی بنیاد کی تحقیق کے بعد اس کا مقابلہ اس روحانی بنیاد سے کریں جس کی طرف پیغمبر ﷺ نے دعوت دی ہے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ تمدن کی معنوی بنیاد آزادیٔ رائے پر ہے جس کی کوئی حد معین نہیں ہے۔ اس آزادی کو قانون سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ آزادیٔ رائے لوگوں کے دلوں میں ایک عقیدہ راسخ کی طرح جمی ہوئی ہے جس کی حمایت و حفاظت سختی سے کی جاتی ہے اور جس کی خاطر قربانیاں دی جاتی ہیں، اس کے قیام و بقا کے لئے پوری پوری کوشش کی جاتی ہے اور اس کی خاطر لڑائیاں بھی لڑی جاتی ہیں، اسے ایک ایسا شرف خیال کیا جاتا ہے جس پر مختلف اقوام فخر کرتی اور جس کی بنا پر وہ اپنے اسلاف پر ناز کرتی ہیں۔ اس وجہ سے مذکورہ بالا مغربی مصنفین کا یہ قول ہے کہ اسلام کی مسلمانوں کو دعوتِ جہاد اور ان لوگوں سے جنگ کی اجازت جو خدا اور روز قیامت پر ایمان نہیں لاتے، ایسے تعصب کی تعلیم ہے جو زمانے کی موجودہ آزادی کے منافی ہے حالانکہ یہ ایک فاش غلطی ہے کیونکہ اگر کسی رائے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو اس کی طرف دعوت نہ دی جائے اور اس پر عمل درآمد نہ ہو تو وہ رائے اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتی۔ اسلام نے عرب کے مشرکین سے جنگ کی اجازت ان کی اطاعت گزاری کی صورت میں کبھی نہیں دی۔ ایسے مشرکین سے جنگ کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا جو دوسروں کو شرک کی دعوت نہ دیتے تھے اور نہ خود اس پر عمل پیرا تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ عصر حاضر کا تمدن ایسی رائے کی جو عام عقیدے کے خلاف ہو اتنی شدت سے مخالفت کرتا ہے کہ مسلمان بھی اس زمانے کے مشرکین کی اتنی مخالفت نہ کرتے تھے۔ موجودہ تمدن کی نظر میں جو لوگ کسی جداگانہ عقیدے کے حامل سمجھے جاتے ہیں ان پر ایسی ایسی ناقابل برداشت قیود و حدود عائد کر دی جاتی ہیں جو اس جزیہ کے مقابلے میں کہیں سخت ہیں جو اسلام نے اہل کتاب پر فرض کر رکھی تھیں۔

ہم اس موقع پر مثال کے طور پر وہ واقعات پیش کرنا چاہتے ہیں جو غلاموں کی تجارت کے سلسلے میں پیش آئے حالانکہ وہ لوگ جو یہ تجارتی کاروبار کرتے تھے اسے جائز خیال کرتے تھے۔ ہم ان واقعات کی مثال اس لئے پیش نہیں کرتے تاکہ یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم شاید اس قسم کی تجارت کو برا خیال نہیں کرتے حالانکہ اسلام ایک ناپسندیدہ امر کی مخالفت کے سوا اور کسی صورت میں جنگ کی دعوت نہیں دیتا لیکن آج کل کا یورپ جو موجودہ زمانے میں اعلیٰ ترین تمدن کا مدعی ہے اور جسے امریکہ اور ایشیا اور مشرق بعید میں جنوبی علاقوں کی تائید حاصل ہے بالشویک ازم کے خلاف اعلان جنگ کئے بیٹھا ہے اور وہ بھی اس تمدن کی سخت مخالفت پر تلا ہوا ہے۔ ہم اہل مصر بھی بالشویک ازم کے خلاف جنگ کرنے میں موجودہ تمدن کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں اس کے باوجود کہ بالشویک ازم ایک متعدلانہ نظام ہے جو موجودہ تمدن کے پیش کردہ نظام کے خلاف

Marfat.com

ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اسلام اگر مسلمانوں کو ان مشرکین کے خلاف جنگ کی دعوت دے جو خدا سے پختہ عہدو پیمان کے بعد اسے توڑ دیں تو اسے تو ایک وحشیانہ اور متعصبانہ دعوت کہا جائے اور اسے آزادی کے خلاف تصور کیا جائے لیکن بالشویک ازم کے خلاف جنگ کی دعوت کو جو موجودہ تمدن کے نظام اجتماعی کو تباہ و برباد کرنے والی ہے ایک ایسی دعوت خیال کیا جائے جو آزادیٔ رائے اور اس کے احترام کی آئینہ دار ہے۔

(مصنف نے یہ کتاب ۴۰ کی دہائی میں لکھی اس وقت بالشویک ازم (کمیونزم) عروج پر تھا اور دنیا ''سرد جنگ'' کی وجہ سے دو ازموں کے درمیان بٹی ہوئی تھی)

برہنگی کی ترغیب دینے والی تنظیمیں

اکثر بلاد یورپ میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کا یہ نظریہ ہے کہ روحانی تربیت کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت بھی ناگزیر ہے اور یہ کہ جسم کے تمام یا بعض اعضا کو مستور رکھنا جنسی ترغیبات کی تحریک کا موجب ہوتا ہے اور اس سے اخلاق پر بھی برا اثر پڑتا ہے لہٰذا ان کا یہ خیال ہے کہ اگر مخلوق برہنگی اختیار کر لے تو کوئی خرابی راہ نہ پائے۔ اس نظریے کے حامیوں نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے بعض شہروں میں چند مقامات بھی متعین کر لئے ہیں اور جو لوگ اس قسم کی جسمانی تربیت میں حصہ لینا چاہیں ان کے لئے خاص خاص مستقر بھی قائم کر دیئے گئے ہیں۔ جونہی عوام میں اس خیال کی عام اشاعت ہونے لگی تو بہت سے علاقوں کے اربابِ حل وعقد نے بھانپ لیا کہ ایسے خیالات کی اشاعت اخلاق کی تباہی اور اجتماعی خرابی کا موجب ہوگی اس لئے انہوں نے مقاماتِ برہنگی کو ممنوع قرار دیا اور اس خیال کے حامیوں سے آمادۂ پیکار ہو گئے۔ قانونی طور پر اس قسم کی جسمانی تربیت کے مقامات ختم کر دیئے گئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر یہ خیال تمام قوم میں اشاعت پا جاتا تو دوسری قومیں اس قوم سے اعلان جنگ کر دیتیں کیونکہ یہ خیال انسان کی روحانی زندگی کو تباہ و برباد کر سکتا ہے۔ بردہ فروشی اور پردہ نشین عورتوں کی تجارت کی مخالفت میں سخت جنگیں لڑی جاتی رہی ہیں، یہ سب کچھ کس لئے ہوتا رہا، صرف اس لئے کہ مطلق آزادیٔ رائے اس وقت تک قابل برداشت سمجھی جا سکتی ہے جب تک وہ ایسی باتوں تک محدود رہے جن سے کوئی اجتماعی ضرر لازم نہ آتا ہو لیکن جب آزادیٔ رائے جماعت انسانی میں کوئی خرابی پیدا کرنے لگے تو ایسی تحریک اور اس کے اثرات کا مقابلہ ضروری ہے بلکہ خود ایسی رائے کی مخالفت بھی لازمی ہے۔ مخالفت کا انداز اور اس کی نوعیت ان خرابیوں کے مطابق ہونی چاہیے جو اس رائے کے اثرات کی بنا پر کسی جماعت میں پیدا ہو کر جماعت کے اخلاقی، اجتماعی اور اقتصادی نظام کو بگاڑنے کا موجب ہو سکتی ہوں۔

شریعت اور رائے عامہ

یہ وہ حقیقت اجتماعیہ ہے جسے موجودہ تمدن نے بھی تسلیم کیا ہے، اگر ہم مختلف اقوام کی زندگی پر اس کے

Marfat.com

اثرات اور مظاہر کا کسی قدر تفصیل سے بیان کریں تو بحث بہت زیادہ طول پکڑ جائے گی اور اس کا یہاں کوئی موقع نہیں ہے تاہم یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہر وہ شریعت جس کا مقصد کسی اجتماعی یا اقتصادی یا سیاسی تحریک کا ختم کر دینا ہو اس رائے عامہ کے خلاف جنگ کا اعلان کرتی ہے جس کی آغوش میں وہ تحریک پروان چڑھتی ہے۔ یہ اعلانِ جنگ اسی وقت تک جائز سمجھا جا سکتا ہے جبکہ ایسی رائے پر عمل درآمد سے جس سے جنگ کی تحریک ہوتی ہے جماعت انسانی کو کسی قسم کی ضرر پہنچتا ہو۔ جب ہم اس دعوتِ جہاد کا جائزہ لیں جو اسلام نے شرک اور اہل شرک سے مقابلے کی خاطر دی ہے اور وہ اس لئے کہ اسلام کے آگے ان کی گردنیں جھکیں تو ہمیں چاہئے کہ مشرکین کے افکار وعزائم اور ان کے رجحانات و میلانات کے پیش نظر یہ بھی غور کریں کہ آیا اسلام نے مسلمانوں کو جن حالات میں جنگ کی اجازت دی ہے اس میں جواز کا پہلو ہے یا عدم جواز کا، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مشرکین کی روش ہر دور میں جماعت انسانی کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوئی ہے تو اسلام کے لئے اس کے خلاف اعلانِ جنگ نہ صرف جائز بلکہ ناگزیر ہوگا۔

مشرکین کی زندگی کا نقشہ

نبی کریم ﷺ کی بعثت کے وقت جس شرک کا رواج تھا وہ صرف بت پرستی تک محدود نہ تھا، بہر حال اس کے خلاف جنگ ضروری تھی کیونکہ کسی انسان کا پتھر کو معبود قرار دینا ننگ انسانیت ہے اور اس سے اس کے شرف پر دھبہ لگتا ہے۔ ان ایام میں شرک دراصل کورانہ تقلید، جاہلانہ عقائد و عادات کے مجموعے کا نام تھا اور اس کی اساس پر جو اجتماعی نظام قائم تھا اس کی صورت بردہ فروشی، بالشویک ازم اور ہر اس قباحت سے بھی زیادہ گھناؤنی تھی جس کا تصور آج بیسویں صدی میں ممکن ہو سکتا ہے اس زمانے کے مشرکین لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے، تعددِ ازواج کی کوئی حد مقرر نہ تھی حتیٰ کہ ایک مرد کو حق حاصل تھا کہ وہ تیس چالیس، سو اور تین سو تک بلکہ ان سے بھی زیادہ شادیاں کر لے۔ سود اپنی بدترین شکل میں رائج تھا۔ لاقانونیت کا دور دورہ تھا۔ عرب کے بت پرست عادات اور غلط رسوم کے لحاظ سے دنیا بھر کی اقوام سے گرے ہوئے تھے۔

اب ہم انصاف پسند طبائع سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ اگر انسانوں کی ایک جماعت آج اپنے لئے ایک ایسا نظام وضع کر لے جس کے نصب العین اور جس کے نظریات وعقائد میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا، غیر متعین تعداد تک شادیاں کرنا، بردہ فروشی اور انتہائی بھونڈے طریق سے یعنی بذریعہ سود دوسرے کے مال کو قبضے میں لانا داخل ہو اور ان تمام امور کے خلاف ایک تحریک پیدا ہو جو ان قباحتوں کا خاتمہ کرنا چاہئے تو کیا ہم اس تحریک کو تعصب اور آزادی رائے کی مخالفت سے متہم کریں گے؟ اگر بالفرض ایک قوم اس قسم کے پست اجتماعی نظام کے تابع ہو جائے اور خدشہ ہو کہ یہ نظام دوسری قوموں پر بھی اثر انداز ہوگا تو اگر باقی قومیں اس کے خلاف آمادہ جنگ ہو جائیں تو ان کا ایسا کرنا جائز ہوگا یا ناجائز؟ کیا اس قسم کی جنگ اس جنگ عظیم کے

Marfat.com

مقابلے میں زیادہ ناروا ہوگی جس نے دنیا کے لاکھوں بے گناہ انسانوں کو محض سرمایہ دارانہ حرص وطمع کی بنا پر تباہ وبرباد کر دیا تھا۔ ان حقائق کی موجودگی میں سورۂ توبہ کی مندرجہ بالا آیات سے متعلق مستشرقین یورپ کے نقد و بصر کی کیا وقعت باقی رہ جاتی ہے؟ اسلام کا شرک اور اہل شرک کے خلاف اعلان جنگ جبکہ ان کی دعوت کا حاصل ایک ایسا نظام ہو جس میں مذکورہ بالا خرابیاں پائی جاتی ہوں کس حد تک حق بجانب اور راستی پر مبنی ہے؟

شرک کے خلاف اعلانِ جنگ کا جواز

یہ اس نظام کی تاریخی حقیقت ہے جو عرب میں شرک اور بت پرستی کے زیر سایہ قائم تھا۔ علاوہ بریں اس کے متعلق پیغمبر ﷺ کی زندگی سے ہمیں ایک اور تاریخی حقیقت کا علم حاصل ہوتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ بعثت کے بعد آپ نے پورے تیرہ سال اس حالت میں بسر کئے کہ آپ دلائل کے زور سے لوگوں کو دین برحق کی دعوت دیتے اور احسن طریق سے ان سے مباحثہ کرتے تھے۔ آپ نے جو جنگیں لڑیں ان میں آپ نے ہرگز کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ آپ ہمیشہ مسلمانوں کے جانب سے مدافعت کرتے اور اس دین کی طرف دعوت دیتے رہے جس کی تہ میں ان کی آزادی کے تحفظ کا راز مضمر تھا، نیز جس پر ان کا ایمان تھا اور جس کے لئے وہ اپنی جان تک بھی قربان کر دینے کے لئے تیار رہتے تھے۔ مشرکین کے خلاف جنگ کی دعوت محض اس بنا پر تھی کہ وہ نجس ہیں اور وہ اپنے عہد و پیمان پر قائم نہیں رہتے اور نہ وہ مسلمانوں کے تحول وقراء کی پروا کرتے ہیں۔ یہ دعوت بھی آپ نے اپنے آخری غزوے یعنی غزوۂ تبوک کے بعد پیش کی جب اسلام ان علاقوں میں پھیل گیا جہاں شرک کا دور دورہ تھا اور جہاں آپ کی بعثت کے وقت مشرکین کا تباہ کن اجتماعی اور اقتصادی نظام قائم تھا تو مسلمانوں نے وہاں کے لوگوں کو یہ دعوت دی کہ وہ اس نظام کو خیر باد کہیں اور خدا کے مقرر کردہ اوامر ونواہی پر عمل پیرا ہوں لیکن انہوں نے اس دعوت پر لبیک نہ کہا ایسی صورت میں ہر منصف مزاج شخص اس امر کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مسلمانوں کے لئے ان سے جنگ کرنا ناگزیر تھا تاکہ خدا کی بات پوری ہو جاتی اور دین صرف ذات الٰہی کے لئے پایہ تکمیل کو پہنچ جاتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب سورۂ براۃ کی مندرجہ بالا آیات کی تلاوت کی اور لوگوں سے کہہ دیا کہ جنت میں کوئی کافر داخل نہ ہوگا اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی برہنہ شخص کعبے کا طواف کرے تو ان امور کا نتیجہ بہت اچھا برآمد ہوا اور ان قبائل کے دل و دماغ سے ہر قسم کا تردد رفع ہو گیا جو دعوت اسلام پر لبیک کہنے میں ابھی تک سستی کر رہے تھے۔

عامر بن طفیل کا حشر

مندرجہ بالا امور کا نتیجہ یہ نکلا کہ یمن، مہرہ، بحرین اور یمامہ کے علاقے اسلام کے زیر نگیں آ گئے اور چند لوگوں کے سوا جو اپنے اوپر نازاں تھے اور جنہیں غرور جاہ قبولِ اسلام سے روکے ہوئے تھے، کوئی بھی

Marfat.com

آپ کا مخالف نہ رہا۔ ایسے لوگوں میں سے ایک عامر بن طفیل تھا۔ وہ بنی عامر کے ایک وفد کے ہمراہ قبولِ اسلام کے ارادے سے مدینہ آیا تھا۔ جب یہ وفد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچا تو عامر نے اسلام قبول نہ کیا بلکہ اس نے آپ کی ہمسری پر کمر باندھی، آپؐ نے اسے قبولِ اسلام پر آمادہ کرنا چاہا مگر وہ انکار پر مصر رہا اور یہ کہہ کر چلا گیا، بخدا! میں تم سے لڑنے کے لئے اس شہر کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں گا۔ آپ نے دعا کی، یا اللہ! مجھے عامر بن طفیل کے شر سے بچا۔ عامر اپنی قوم کی طرف لوٹ گیا، ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ اس کی گردن میں طاعون کی گلٹی نکل آئی۔ بنی سلول کی ایک عورت کے یہاں اسے موت نے آ دبایا۔ مرتے وقت اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔

''اے بنی عامر کیا میں اونٹ کی مانند گردن میں طاعون کی گلٹی لئے ہوئے ایک سلولی عورت کے گھر میں جان دے دوں گا؟''

اربد بن قیس کا حشر

اسی گروہ میں سے ایک اور شخص اربد بن قیس نے بھی قبولِ اسلام سے انکار کر دیا۔ وہ بھی بنی عامر کی جانب واپس آ گیا لیکن زیادہ دن نہ گزرنے پائے کہ وہ اپنے اونٹ پر سوار ہو کر اسے فروخت کرنے جا رہا تھا کہ اس پر بجلی گری اور وہ جل مرا۔ عامر اور اربد کے انکار کے باوجود ان کی قوم اسلام لے آئی اور ان کے عزم میں اس انکار سے مطلق فرق نہ آ سکا۔

مسیلمہ

ان سے بھی زیادہ گرا ہوا ایک اور شخص مسیلمہ بن حبیب تھا۔ وہ اہل یمامہ میں سے تھا، بنی حنیفہ کے وفد کے ہمراہ مدینہ آیا، قوم کے لوگ اسے مال اسباب کی حفاظت کی ذمہ داری سپرد کر کے خود پیغمبر ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ آپ نے ان میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ عطیہ مرحمت فرمایا، انہوں نے آپ سے مسیلمہ کا ذکر بھی کیا، آپ نے اسے بھی کچھ عطا کر دیا اور فرمایا، وہ تم سے کم رتبہ نہیں ہے آپ نے یہ بات اس لئے فرمائی کہ وہ ان لوگوں کے سامان کی حفاظت کے لئے پیچھے رہ گیا تھا۔ جب مسیلمہ نے اپنی قوم کی زبانی پیغمبر ﷺ کی یہ بات سنی تو اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور کہا، خدا نے مجھے حضرت محمد ﷺ کے ساتھ نبوت میں شریک کر دیا ہے پھر وہ اپنی قوم کے سامنے مسجع کلام پڑھنے لگا اور قرآن مجید کے جواب میں یہ کہنے لگا۔

لَقَدْ اَنعم الله علی الحُبلی۔ اخرج منها نسمة تسعی۔ من بین سفاق وحشا۔

''خدا نے حاملہ عورت پر احسان کیا، اس نے اس کے پیٹ کی جھلی اور انتڑیوں سے ایک

Marfat.com

جاندار کو نکالا جو دوڑتا پھرتا ہے۔''

مسیلمہ نے شراب خوری اور زنا کاری کو جائز و حلال قرار دے دیا اور اپنی قوم کو نماز کی معافی بھی دے دی۔ اس نے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ معدودے چند افراد کے ماسوا باقی قبائل عرب تمام اطراف سے جوق در جوق مدینہ میں آ کر مشرف بہ اسلام ہونے لگے۔ ان جماعتوں کے پیشوا بڑے بڑے لوگ مثلاً عدی بن حاتم، عمرو بن معدی کرب وغیرہ تھے۔ حمیر کے امراء نے ایک قاصد کے ذریعے سے پیغمبر ﷺ کے پاس خط بھیج کر اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کیا۔ آپ نے انہیں ایک تحریر کے ذریعے سے اسلام کے مقرر کئے ہوئے حقوق و فرائض سے آگاہ کیا جب اسلام عرب کے جنوب میں پھیلا تو آپ نے چند قدیم مسلمانوں کو ان کی طرف بھیجا تاکہ وہ انہیں دین کے مسائل سے خبردار کریں اور اسلام پر جمے رہنے کی تلقین کریں۔

ہم یہاں بعض قدیم سیرت نگاروں کی طرح ان تمام وفود کا تفصیلی ذکر نہیں کریں گے کیونکہ اس لحاظ سے کہ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے ایک ہی سطح پر نظر آتے ہیں۔ ابن سعد نے اپنی کتاب طبقات کبریٰ میں ان وفود کا ذکر پچاس صفحات میں کیا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ تمام عرب میں کوئی قبیلہ ایسا باقی نہ رہا جس نے اسلام قبول نہ کیا ہاں البتہ وہ چند افراد جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں قبولِ اسلام سے محترز رہے۔ عرب کے مشرکین کی یہ حالت تھی کہ انہوں نے قبولِ اسلام میں نہایت عجلت سے کام لیا اور بت پرستی ترک کر دی حتیٰ کہ عرب کے تمام علاقے بتوں کی نجاست سے پاک و صاف ہو گئے۔ یہ سب کچھ غزوۂ تبوک کے بعد اختیاری طور پر ان کی اپنی رضامندی سے ظہور میں آیا۔ اس سلسلے میں کسی جنگ یا خونریزی کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اب یہ دیکھنا چاہئے کہ یہود و نصاریٰ نے پیغمبر ﷺ سے کیا رویہ برتا اور آپ ﷺ نے ان سے کیا سلوک روا رکھا۔

Marfat.com

Marfat.com

باب 27

عرب کے اہلِ کتاب سے لے کر حجۃ الوداع تک

حج کے موقع پر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مسلم زائرین بیت اللہ اور مشرکین کے سامنے سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات کی تلاوت کی تھی اور منیٰ میں آپؓ نے انہیں آنحضرت ﷺ کے اس فرمان سے مطلع کیا تھا کہ جنت میں کسی کافر کا داخلہ ممکن نہیں، کسی مشرک کو اس سال کے بعد حج کی اجازت نہ ہوگی، کوئی شخص برہنگی کی حالت میں طواف نہ کر سکے گا اور جس شخص کا نبی اکرم ﷺ سے کوئی معاہدہ ہے، مقررہ مدت تک باقی رہے گا۔ ان حالات میں تمام مشرکین عرب کو اس بات کا پختہ یقین ہو گیا تھا کہ اب بت پرستی کا وجود باقی نہیں رہ سکتا اور اگر وہ اپنی قدیم روش پر جمے رہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ خدا اور رسول خدا ﷺ سے برسرِ پیکار ہیں۔ یہ ان لوگوں کے تصورات تھے جو عرب کے جنوبی علاقے یعنی یمن اور حضرموت میں مقیم تھے کیونکہ حجاز اور اس سے متصل شمالی علاقے کے لوگ اسلام قبول کر کے نئے دین کی پناہ میں آ چکے تھے لیکن جنوبی علاقے میں مشرکین اور عیسائیت کے پیرو موجود تھے۔ مشرکین کے بارے میں تو اوپر ذکر ہو چکا کہ وہ جوق در جوق خدا کے دین میں داخل ہو رہے تھے اور وہ مدینے میں اپنے وفود بھیج کر اسلام کی جانب مائل ہو رہے تھے۔ ان میں سے اکثر کو ان کے پہلے عہدوں پر بحال رکھا گیا اس لئے نئے دین کی محبت اور بھی زیادہ ان کے دل میں راسخ ہو چکی تھی۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں سورۂ توبہ کی مندرجہ ذیل آیات نازل ہوئی تھیں، جنہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں حج کے موقعہ پر ہزاروں آدمیوں کی موجودگی میں بلند آواز سے سنا دیا تھا۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا

Marfat.com

لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٣١﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ
يُّطْفِــــُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٣٢﴾
هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَي الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ
كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿٣٣﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ
لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ
يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣٤﴾ يَّوْمَ يُحْمٰي عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰي بِهَا جِبَاهُهُمْ
وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ
تَكْنِزُوْنَ ﴿٣٥﴾ (سورۃ التوبہ: ۲۹ تا ۳۵)

”اہل کتاب جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے حرام ٹھہرایا ہے اور نہ سچے دین کو قبول کرتے ہیں ان سے اس وقت تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر اور تمہاری رعایا بن کر جزیہ دینا منظور کر لیں۔ یہود میں سے (بعض) کہتے ہیں کہ عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسائیوں میں سے (اکثر) کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ ان کا قول ہے ان کے منہ سے کہنے کا (جس کا واقعہ میں کہیں نام ونشان نہیں) یہ بھی ان لوگوں کی سی باتیں کرتے ہیں جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں۔ اللہ ان کو غارت کرے۔ یہ کدھر الٹے جا رہے ہیں انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو (باعتبار طاعت کے) رب بنا رکھا ہے اور مسیح علیہ السلام ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ فقط ایک معبود برحق کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (دین اسلام) کو اپنے منہ سے بجھا دیں حالانکہ اللہ تعالیٰ بدوں اس کے کہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا دے مانے گا نہیں، خواہ کافر کیسے ہی ناخوش ہوں۔ وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام (بقیہ) دینوں پر غالب کر دے گا مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔ اے ایمان والو، اکثر احبار اور رہبان لوگوں کے مال ناجائز طریقے سے ہتھیاتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے باز رکھتے ہیں اور (غایت حرص سے) جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، سو (اے رسول!) آپ ان کو ایک بڑی دردناک سزا کی خبر سنا دیجیے کہ اس روز واقع ہو گی کہ اُن

Marfat.com

کو دوزخ کی آگ میں (اول) تپایا جائے گا پھر ان سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور ان کی کروٹوں اور ان کی پشتوں کو داغ دیا جائے گا (ان لوگوں سے کہا جائے گا) یہ ہے وہ جس کو تم نے اپنے واسطے جمع کر رکھا تھا سو اب اپنے جمع کرنے کا مزا چکھو۔"

سورۂ توبہ کی ان آیات کے پیش نظر جو سرور کائنات ﷺ کی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئی تھیں، بہت سے مؤرخین کا یہ خیال ہے کہ اہل کتاب کے متعلق رسول ﷺ کا موجودہ رویہ آپ کے پچھلے رویہ سے بالکل مختلف تھا۔ بعض مستشرقین نے بھی اسی نظریہ کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان آیات میں اہل کتاب کو مشرکین کے ساتھ ایک سطح پر رکھا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ محمد (ﷺ) یہودیت اور مسیحیت کی مدد سے جزیرہ عرب سے بت پرستی کا قلع قمع کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ آغازِ رسالت میں وہ بار بار اس امر کا اعلان کرتے رہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام اور گزشتہ انبیاء کے ادیان کو دوبارہ دنیا میں قائم کرنے کے لئے آئے ہیں لیکن جب مشرکین کے مقابلے میں انہیں پے در پے کامیابیاں نصیب ہونے لگیں اور یہ نظر آنے لگا کہ وہ قلیل عرصہ میں ان پر کامل فتح حاصل کر لیں گے تو انہوں نے یہود سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور ان پر عرصہ حیات تنگ کرنے لگے حتیٰ کہ انہیں جزیرہ نمائے عرب سے باہر نکال کر ہی دم لیا تاہم اس دوران میں انہوں نے مسیحیوں سے رشتہ الفت و مؤدت کو پوری طرح استوار رکھا اور لوگوں کے سامنے ایسی آیات بھی پیش کرتے رہے جو مسیحیوں کی تعریف و توصیف سے پُر ہوتی تھیں جن میں سے ایک آیت یہ ہے۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (سورۃ المائدہ: ۸۲)

"تمام لوگوں سے زیادہ مومنوں سے عداوت رکھنے والے آپ یہود اور مشرکین کو پائیں گے اور ان میں مسلمانوں کے ساتھ دوستی رکھنے کے قریب تر ان لوگوں کو پائیں گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں یہ اس سبب سے ہے کہ ان میں سے بہت سے علم دوست عالم ہیں اور بہت سے تارک الدنیا درویش اور اس سبب سے بھی کہ یہ لوگ متکبر نہیں ہیں۔"

لیکن فتح مکہ کے بعد جب انہیں عرب میں کامل اقتدار حاصل ہو گیا اور ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی تو انہوں نے عیسائیوں سے بھی وہی سلوک کرنے کا ارادہ کیا جو اس سے قبل مشرکین اور یہود سے کر چکے تھے اور انہوں نے عیسائیوں کو بھی انہی لوگوں کے زمرے میں شامل کر لیا جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے حالانکہ ان کی کامیابی میں بہت بڑا دخل عیسائیوں کی امداد و معاونت کو بھی ہے۔ یہ حبشہ کے عیسائی ہی تھے جنہوں نے محمد (ﷺ) کے پیروؤں کو اس وقت اپنے ہاں پناہ دی جب اللہ کی یہ زمین ان کے لئے تنگ ہو چکی تھی۔ بعد میں خود محمد ﷺ نے اہل نجران اور دوسرے عیسائیوں کو یہ عہد نامہ لکھ کر دیا تھا کہ

انہیں اسلامی ریاست کے تحت بدستور اپنے دین پر قائم رہنے اور اپنی عبادات اور رسوم بجا لانے کی مکمل آزادی ہوگی۔ مذکورہ مستشرقین لکھتے ہیں کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی دشمنی کا سلسلہ محمد ﷺ کے رویہ میں اس تبدیلی کے بعد ہی شروع ہوا اور یہ دونوں فریق ایک دوسرے سے اتنا دور ہوتے چلے گئے کہ اب ان کے مابین دوستی اور باہمی میل ملاپ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

مستشرقین کے یہ دلائل سادہ لوح اور ناواقف لوگوں کو تو ضرور متاثر کر سکتے ہیں لیکن تاریخ کا مطالعہ کرنے اور آیات قرآنیہ کے اسباب نزول پر غور کرنے سے یہ امر آشکار ہو جاتا ہے کہ یہودیت اور عیسائیت کے بارے میں اسلام اور بانیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا رویہ آغاز سے لے کر حضور ﷺ کی وفات تک یکساں رہا اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ ابتدا ہی سے قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دنیا کے سامنے اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول کی حیثیت میں پیش کیا اور ان کی الوہیت کے عقیدے کی سخت مذمت کی۔ اسلام دنیا کو وحدانیت کا سبق دینے آیا تھا۔ اس کی بنیاد ہی عقیدہ توحید پر تھی۔ وہ عیسائیوں کو خوش کرنے کی خاطر حضرت مسیح علیہ السلام کو خدائی میں کیسے شریک ٹھہرا سکتا تھا؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جا بجا ان کی تعریف ضرور کی ہے۔ انہیں روح اللہ اور کلمۃ اللہ کا لقب دیا ہے۔ انہیں خدائی برکات اور انوار کا مورد قرار دیا ہے لیکن ساتھ ہی قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝١ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝٢ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝٣ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝٤ کا اعلان کر کے ان کی الوہیت کی بھی پرزور الفاظ میں تردید کر دی ہے۔

اس بات کا مزید ثبوت کہ رسول اللہ ﷺ نے دین کے معاملے میں کبھی مداہنت نہیں کی اور عیسائیوں سے امداد لینے کی خاطر بے جا تعریف اور خوشامد سے کبھی کام نہیں لیا، اس واقعہ سے ملتا ہے کہ سورۂ توبہ کے نزول سے کافی عرصہ قبل نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد عقیدۂ توحید اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے متعلق بحث مباحثہ کرنے کی غرض سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بحث کے دوران میں انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہا: ''آپ کا دعویٰ ہے کہ اللہ واحد ولاشریک ہے اور اس کے کوئی بیٹا نہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ تو مریم علیہا السلام تھیں آپ یہ بتائیں کہ ان کا والد کون تھا؟'' اس پر اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیات نازل فرمائیں۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝٥٩ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝٦٠ فَمَنْ حَاۗجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاۗءَنَا وَاَبْنَاۗءَكُمْ وَنِسَاۗءَنَا وَنِسَاۗءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۣ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَي الْكٰذِبِيْنَ ۝٦١ اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَھُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝٦٢ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝٦٣ قُلْ يٰٓاَھْلَ

Marfat.com

الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ (سورۂ آل عمران: ۵۹ تا ۶۴)

''بے شک عیسیٰ (علیہ السلام) کی حالت اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم (علیہ السلام) کی حالت کے مشابہ ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے آدم کے قالب کو مٹی سے بنایا پھر ان کو حکم دیا کہ (جاندار) ہو جا پس وہ جاندار ہو گئے یہ امر واقعی آپ کے پروردگار کی طرف سے (بتلایا گیا) ہے سو آپ شبہ کرنے والے لوگوں میں سے نہ ہو جایئے پس جو شخص عیسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں (اب بھی) حجت کرے بعد اس کے کہ آپ کے پاس قطعی علم آ چکا ہے تو آپ کہہ دیجئے کہ آ جاؤ ہم (اور تم) بلالیں اپنے بیٹیوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے آپ کو اور تمہیں پھر ہم گڑگڑا کر دعا کریں اس طرح سے کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجیں ان پر جو اس بحث میں ناحق پر ہیں۔ بے شک یہ جو کچھ مذکور ہوا ہے سچی بات ہے اور کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے اور بے شک اللہ تعالیٰ ہی غلبہ والا اور حکمت والا ہے۔ پھر بھی اگر وہ سرتابی کریں تو بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے فساد کرنے والوں کو، آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! آ جاؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے یہ کہ ہم بجز اللہ تعالیٰ کے اور کسی کی عبادت نہ کریں اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو رب قرار نہ دے پھر اگر وہ لوگ حق سے اعراض کریں تو تم لوگ کہہ دو کہ تم (ہمارے اس اقرار کے) گواہ رہو کہ ہم تو ماننے والے ہیں۔''

اسی سورت (آل عمران) میں دوسری جگہوں پر اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو اس امر پر ملامت کی ہے کہ وہ ایمان لانے والوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہیں، اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کی خاطر انبیاء ماقبل کی تعلیمات میں اپنے حسب منشا تحریف کر دیتے ہیں۔ سورۃ آل عمران کے علاوہ اور بھی متعدد سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے باطل عقائد کا ذکر کر کے ان کی سخت مذمت فرمائی ہے۔ چنانچہ سورۂ مائدہ میں فرماتا ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ

مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝

(سورۃ المائدہ: ۷۳ تا ۷۵)

''یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں سے تیسرا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور اگر یہ لوگ اپنے ان اقوال سے باز نہ آئے تو جو لوگ ان میں کافر رہیں گے ان پر دردناک عذاب واقع ہوگا، کیا پھر بھی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ نہیں کرتے اور اس سے معافی نہیں چاہتے حالانکہ اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والا اور بڑی رحمت کرنے والا ہے، مسیح ابن مریم علیہ السلام کچھ بھی نہیں صرف ایک پیغمبر ہیں جن سے پہلے اور بھی پیغمبر گزر چکے ہیں اور ان کی والدہ صدیقہ ہیں وہ دونوں کھانا کھایا کرتے تھے دیکھو تو ہم کس طرح ان کے سامنے کھلے کھلے دلائل بیان کر رہے ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھو کہ وہ کدھر اُلٹے جا رہے ہیں۔''

اسی سورۂ مائدہ میں ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۤ بِحَقٍّ ڲ

(سورۃ المائدہ:۱۱۶)

''اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے عیسیٰ علیہ السلام بن مریم علیہا السلام کیا تم نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو بھی علاوہ خدا کے معبود قرار دے لو۔ عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے کہ اے اللہ! تو شرک سے پاک ہے مجھے کسی طرح زیبا نہ تھا کہ میں ایسی بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے اختیار نہ تھا۔''

یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہ سورۂ مائدہ وہی سورۃ ہے جس کی آیت:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (سورۃ المائدہ: ۸۲)

''تمام آدمیوں سے زیادہ مسلمانوں سے عداوت رکھنے والے آپ یہود اور مشرکین کو پائیں گے اور ان میں مسلمانوں کے ساتھ دوستی رکھنے کے قریب تر ان لوگوں کو پائیں گے جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں یہ اس سبب سے ہے کہ ان میں سے بہت سے علم دوست عالم ہیں اور بہت سے تارک الدنیا درویش ہیں اور اس سبب سے بھی کہ یہ لوگ

متکبر نہیں ہیں۔"

کو پیش کر کے مستشرقین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ محمد ﷺ نے ابتدا میں عیسائیوں کے حق میں بڑا ہمدردانہ رویہ اختیار کئے رکھا۔ لیکن جب ان کا کام مکمل ہو گیا اور وہ تمام عرب پر غالب آ گئے تو انہوں نے آنکھیں پھیر لیں اور عیسائیوں کو بت پرستوں کے ساتھ ایک سطح پر رکھ ان کی بیخ کنی کے درپے ہو گئے۔

دیگر سورتوں کا سورہ براۃ کے ساتھ موازنہ کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سورہ براۃ میں عیسائیوں کے متعلق کوئی نئی بات بیان نہیں کی گئی۔ ان میں ان کے عقیدۂ توحید کی چھوڑ کر مشرکانہ عقائد اختیار کرنے، لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھانے اور سونے چاندی کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بجائے ذخیرہ کرنے کا ذکر کیا گیا ہے اور یہی باتیں پہلے بھی متعدد بار بیان کی جا چکی تھیں ظاہر ہے کہ دین میں ردّ و بدل کرنے اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال ٹھہرانے اور غیر ایمانی طور طریق اختیار کرنے کے باعث ان میں اس دین کی رمق بھی باقی نہ رہی تھی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے تھے اور رسول اللہ ﷺ کو حق تھا کہ انہیں اور مشرکین کو ایک سطح پر رکھتے ہوئے ان سے جنگ کرتے اور انہیں عرب سے باہر نکال دیتے لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسا نہیں کیا بلکہ ان کے مشرکانہ عقائد کے باوجود انہیں محض ادائے جزیہ کا مکلف قرار دیا۔

وفود کی آمد کا تسلسل

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں حج کے موقعہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اعلان سے جنوبی عرب کے باشندوں کے لئے اسلام میں داخل ہونے کا دروازہ کھل گیا اور وہ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہونے لگے۔ قبائل عرب کے وفود کثرت سے مدینہ آنے لگے ان میں مشرکین کے وفود بھی ہوتے تھے اور اہل کتاب کے وفود بھی۔ رسول اللہ ﷺ ہر وفد کے ساتھ تعظیم و تکریم سے پیش آتے تھے اور ان کے سرداروں کو مناسب اعزاز و اکرام کے ساتھ مدینہ سے رخصت کرتے تھے منجملہ دیگر وفود کے اسی سواروں پر مشتمل کندہ کا وفد بھی اشعث بن قیس کی سرکردگی میں مدینہ آیا اور مسجد نبوی میں پہنچ کر رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان لوگوں کے کندھوں پر لٹیں بکھری ہوئی تھیں، آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا تھا اور ریشمی استر اور خوبصورت نقش و نگار والے جبے زیب تن کئے ہوئے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے انہیں دیکھا تو فرمایا:

"کیا تم لوگ ابھی تک اسلام نہیں لائے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "یا رسول اللہ ﷺ! ہم سب مسلمان ہیں۔"

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: "پھر یہ ریشمی لباس کیوں پہن رکھا ہے؟"

حضور ﷺ کا یہ ارشاد سن کر ان لوگوں نے اسی وقت وہ جبے تار تار کر دیئے۔ اشعث نے ازراہِ شگفتگی کہا: "یا رسول اللہ ﷺ! ہم دونوں اکل المرار کی اولاد ہیں۔"[1]

Marfat.com

یہ سن کر آنحضرت ﷺ مسکرائے اور فرمایا: "اکل المرار کی اولاد میں سے ہونے کا فخر اگر ہوگا تو عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اور ربیعۃ بن الحارث بن عبدالمطلب کو ہوگا میں تو اس کی اولاد میں سے نہیں ہوں۔"

اشعث کے ساتھ حضرموت کے ساحلی علاقہ کا سردار وائل بن حجر کندی بھی آیا تھا اس نے بھی رسول اللہ ﷺ دست مبارک پر اسلام قبول کیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے بدستور امارت کے عہدہ پر سرفراز رکھا البتہ اس سے یہ شرط کر لی کہ وہ اپنے علاقہ کے لوگوں سے عشر (لگان) اکٹھا کر کے آپ کے مقرر کئے ہوئے محصلین کو پہنچایا کرے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کے ساتھ کر دیا۔ وائل نے اپنے اونٹ کے پیچھے بٹھانا تو درکنار گرمی سے بچاؤ کی خاطر انہیں اپنی جوتیاں دینے سے بھی انکار کر دیا اور کہا کہ میں تم سے صرف اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ تمہیں اپنے اونٹ کے سایہ تلے چلنے کی اجازت دے دوں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس خیال سے کہ یہ نیا نیا مسلمان ہوا ہے، لڑنے جھگڑنے کے نتیجہ میں کہیں اسلام ہی سے برگشتہ نہ ہو جائے، اس تکلیف اور مصیبت کو گوارا کر لیا اور اس کے ساتھ اس کے قبیلے تک پا پیادہ چلتے چلے گئے۔

جب اسلام یمن میں پوری طرح پھیل گیا تو رسول اللہ ﷺ نے وہاں کے لوگوں کو دینی تعلیمات سے آگاہ کرنے کی غرض سے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو وہاں روانہ فرمایا۔ روانگی کے وقت آپ نے انہیں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا

> "معاذ! جہاں تک ممکن ہو وہاں کے لوگوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنا اور سختی سے پیش نہ آنا۔ انہیں اپنے سے مانوس رکھنا، نفرت نہ دلانا۔ وہاں تمہاری ملاقات اہل کتاب سے ہوگی وہ تم سے جنت کی کنجی معلوم کرنا چاہیں گے، تم جواب میں انہیں کلمہ توحید کا اقرار کرنے کی تلقین کرنا۔"

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اکیلے یمن نہیں گئے تھے بلکہ ان کے ساتھ اولین مسلمانوں اور محصلین کی ایک جماعت بھی تھی جو وہاں کے لوگوں کی دینی تعلیم و تربیت میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی معاون و مددگار تھی اور خدائی احکام کی روشنی میں مقامی لوگوں کے تنازعات اور مقدمات کا تصفیہ کرتی تھی۔

وحدتِ امت

اب عرب کے گوشے گوشے میں اسلام پھیل چکا تھا، شمال و جنوب اور مشرق و مغرب میں رسول اللہ ﷺ کی عملداری قائم ہو چکی تھی تمام قبائل ان گنت بتوں کی پرستش سے منہ موڑ کر خدائے واحد ولاشریک کے آگے سجدہ ریز ہو چکے تھے یہی قبائل آج سے بیس سال قبل ایک دوسرے کے جانی دشمن اور ایک دوسرے کی صورت سے بیزار تھے جب بھی کسی قبیلہ کو موقع ملتا وہ دوسرے قبیلہ کے خلاف صف آرا ہو کر

Marfat.com

قتل و غارت کا بازار گرم کر دیتا لیکن اسلام کے جھنڈے تلے آتے ہی ان کے دلوں سے بت پرستی کی نجاست دور ہو گئی۔ ہر ایک کا سر رب قدوس کے آگے جھک گیا۔ پرانے کینے اور دیرینہ عداوتیں آن واحد میں ختم ہو گئیں اور جنگ و قتال کے راستے مسدود ہو گئے۔ وہ تلواریں جو پہلے اپنے بھائیوں کی گردنوں پر چلتی تھیں اب مدافعت وطن اور حفاظت دین کی خاطر استعمال ہونے لگیں۔

اہل نجران کا قبولِ اسلام

نجران کے عیسائی قبیلہ بنو الحارث کی اکثریت نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا لیکن ابھی کچھ لوگ بدستور اپنے آبائی دین پر قائم تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید کو بغرض تبلیغ ان کے پاس بھیجا، جن کی تبلیغ و تلقین کے نتیجے میں بقیہ لوگ بھی اسلام لے آئے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے قبیلہ کے سرکردہ لوگوں پر مشتمل ایک وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدینہ بھیجا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حسب عادت ان لوگوں سے بھی بڑی خوش روئی سے پیش آئے۔

آخری وفد کی مدینہ میں آمد

یمن کا ایک قبیلہ نخع بھی ابھی تک اسلام سے برگشتہ تھا۔ اسلام قبول کرنے سے اسے یہ امر مانع تھا کہ اب تک اہل یمن حجاز پر چڑھائی کرتے رہے تھے، حجاز نے اب تک ان پر چڑھائی نہ کی تھی اس لئے ان کے دلوں میں اپنی برتری کا احساس پیدا ہو گیا تھا اور وہ اسلام کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اسلام کی دعوت دینے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا۔ پہلے تو یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑی سرکشی سے پیش آئے اور جنگ کے لئے آمادہ ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر اگرچہ اس وقت زیادہ نہ تھی اور آپ کے ہمراہ کل تین سو سوار تھے، لیکن آپ نے دلیری سے ان کا مقابلہ کیا اور ان کی جمعیت کو منتشر کر دیا۔ یہ لوگ دوبارہ اکٹھے ہو گئے اور ایک بار پھر منظم ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمت نہ ہاری اور انہیں گھیرے میں لے کر تہ تیغ کرنا شروع کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ حملہ اتنا سخت تھا کہ انہیں مجبوراً مسلمانوں کی اطاعت قبول کرنی پڑی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دعوت کے نتیجے میں وہ لوگ اسلام لے آئے اور ثابت قدمی سے اسلام پر قائم رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنا مفوضہ کام ختم کر کے واپس آ گئے اور ان لوگوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اٹھا لی اسلام قبول کرنے کے بعد ان کا بھی ایک وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوا، یہ آخری وفد تھا جو سرور کائنات ﷺ کی زندگی میں مدینہ آیا۔

حجۃ الوداع کی تیاری

جس زمانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن سے واپس آنے کی تیاری کر رہے تھے، رسول اللہ ﷺ حج کی تیاری میں مصروف تھے اور آپ نے دیگر مسلمانوں کو بھی اس غرض کے لئے تیاری کرنے کا حکم دے دیا تھا۔

Marfat.com

اس سال کا بیشتر حصہ گزر چکا تھا اور ماہ ذوالقعد بھی ختم ہونے کے قریب تھا۔ قبل ازیں رسول اللہ ﷺ دو مرتبہ عمرہ کر کے حج اصغر تو بجالا چکے تھے لیکن حج اکبر کی ادائیگی کا اب تک موقع نہ آیا تھا۔ اس اہم فریضہ کی ادائیگی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پیش نظر یہ امر بھی تھا کہ خود بنفس نفیس مسلمانوں کو ارکان حج سے آگاہ کیا جائے۔

جونہی یہ خبر قبائل میں پھیلی اور ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد لوگوں تک پہنچا کہ انہیں بھی اس سال اللہ کے رسول کے ہمراہ فریضہ حج ادا کرنا چاہئے، تمام جزیرۂ عرب میں ہلچل مچ گئی لوگ پہاڑوں اور وادیوں، میدانوں اور صحراؤں کو عبور کرتے ہوئے مدینہ کا رخ کرنے لگے مدینہ کے گرد خیموں کا ایک شہر آباد ہو گیا، جس میں ایک لاکھ سے زیادہ ایسے اشخاص سکونت پذیر تھے جو رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے آپ کے ہمراہ فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے جمع ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر اللہ کی قدرت پر ایمان لانا پڑتا تھا یہی وہ لوگ تھے جو کچھ عرصہ قبل ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے لیکن آج دین اسلام کی برکت سے ان کے درمیان سگے بھائیوں سے بھی زیادہ محبت پیدا ہو چکی تھی۔ ہر شخص رسول اللہ ﷺ کے ساتھ فریضہ حج ادا کرنے کی سعادت سے بہرہ مند ہونے پر شاداں وفرحاں نظر آتا تھا۔ ان کا یہ بابرکت اجتماع اسلام کی صداقت کا زندہ نشان تھا۔ دشمنانِ اسلام نے اس نئے دین کو مٹانے کی خاطر کیا کیا کوششیں نہ کیں لیکن ان کی یہ کوششیں رائیگاں ثابت ہوئیں حق وصداقت کی فتح ہوئی اللہ کا نور سرزمین عرب کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پھیل گیا اور وہ عرب جو پہلے ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے، اسلام سے وابستہ ہو کر دشمنان دین کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح متحد ہو گئے۔

رسول اللہ ﷺ کی حج کو روانگی

۲۵ ذوالقعد ۱۰ ھ کو رسول اللہ ﷺ اپنی تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو ہمراہ لے کر حج کے لئے روانہ ہوئے۔ آپ کے پیچھے وہ لوگ تھے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ اس مقدس فریضہ کی ادائیگی کے شوق میں مدینہ میں جمع ہوئے تھے۔ بعض مؤرخین نے ان کی تعداد نوے ہزار اور بعض نے ایک لاکھ چودہ ہزار لکھی ہے۔ ہر دل بیت اللہ کی زیارت اور حج اکبر کی ادائیگی کے خیال سے خوشی اور انبساط محسوس کر رہا تھا۔ جب یہ عظیم الشان قافلہ ذوالحلیفہ پہنچا تو رسول اللہ ﷺ نے پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ چنانچہ رات ذوالحلیفہ میں گزاری گئی۔ صبح کی نماز پڑھنے کے بعد رسول اللہ ﷺ اور تمام اہل قافلہ نے احرام باندھا اور امیر وغریب سب کے سب ایک لباس میں ملبوس ہو گئے جو محض ایک تہ بند اور ایک چادر پر مشتمل تھا۔ اس سے سادہ لباس شاید ہی اور کوئی ہو۔ اس طرح انہوں نے مساوات کا حقیقی اور عملی نمونہ پیش کر دیا۔

احرام وتلبیہ

احرام باندھنے کے بعد رسول مقبول ﷺ حضور قلب سے اپنے رب کی طرف متوجہ ہوئے اور بڑے

Marfat.com

سوز و گداز سے یہ تکبیریں پڑھیں:

لَبَّیْکَ۔ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ۔ اَلْحَمْدُ وَالنِّعْمَۃَ وَالشُّکْرُ لَکَ لَبَّیْکَ۔ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ

''اے اللہ! ہم تیرے حضور حاضر ہیں۔ تیرا کوئی شریک نہیں ہر قسم کی تعریف تیرے ہی لئے سزاوار ہے عطائے نعمت تیرے ہی کرم سے وابستہ ہے ہر قسم کا شکر تیرے ہی لئے واجب ہے اے خدائے واحد ولاشریک! ہم تیرے حضور حاضر ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں دیگر مسلمانوں نے بھی بلند آواز سے ان تکبیرات کو اس طرح ادا کیا کہ دشت وجبل گونج اٹھے۔

جب یہ قافلہ سرف پہنچا جو مکہ اور مدینہ کے درمیانی راستے پر واقع ہے تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ تم میں سے جس شخص کے ساتھ قربانی کا جانور نہیں ہے وہ عمرہ کی نیت کر لے لیکن جو لوگ قربانی ساتھ لے کر آئے ہیں ان کے لئے عمرہ کی نیت جائز نہیں وہ حج کی نیت کریں۔

۴ذی الحجہ کو رسول اللہ ﷺ اپنے ہمراہیوں کے ہمراہ مکہ پہنچے اور سیدھے خانہ کعبہ گئے۔ وہاں آپ نے حجر اسود کو بوسہ دیا۔ بیت اللہ کا سات مرتبہ طواف کیا۔ طواف کے بعد مقام ابراہیم پر نماز پڑھی اور دوبارہ حجر اسود کو بوسہ دیا پھر کوہ صفا پر آئے اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی۔ اس کے بعد آپ نے اعلان فرما دیا کہ جس شخص کے ساتھ قربانی کا جانور نہ ہو وہ احرام کھول دے۔ بعض لوگوں نے تردد کیا، جس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سخت غصہ آیا اور آپ نے فرمایا:

''میں جو حکم تمہیں دے رہا ہوں اسے بجا لاؤ۔''

اسی حالت غضب میں آپ ﷺ اپنے خیمے میں آئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا۔

''یا رسول اللہ! آپ کے چہرے پر برہمی کے آثار کیوں نظر آ رہے ہیں؟''

آپ نے فرمایا:

''مجھے غصہ نہ آئے تو اور کیا ہو میں لوگوں کو حکم دیتا ہوں لیکن وہ اس کی تعمیل نہیں کرتے۔''

اسی دوران میں ایک صحابی خیمے میں داخل ہوئے اور عرض کیا۔

''یا رسول اللہ! جو شخص آپ کو ناراض کرے گا اللہ تعالیٰ اسے دوزخ میں داخل کرے گا۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تمہیں یہ امر محسوس نہیں ہوا کہ میں نے لوگوں کو ایک حکم دیا لیکن وہ اس کی تعمیل میں پس و پیش کر رہے ہیں۔ اگر مجھے حج قران کی مشکلات کا علم ہوتا تو میں قربانی کے جانور خرید کر ہمراہ نہ لاتا اور احرام کھول دیتا۔''

یہ روایت مسلم کی بیان کردہ ہے۔ جب مسلمانوں کو علم ہوا کہ عدولِ حکم کی بنا پر رسول اللہ ﷺ ان سے ناراض ہیں تو انہیں بے حد افسوس ہوا اور انہوں نے فوراً احرام کھول دیئے۔ رسول اللہ ﷺ کی ازواج اور آپ کی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے بھی احرام کھول دیئے صرف ان لوگوں کے احرام باقی رہے جو اپنے ساتھ قربانی کے جانور لائے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یمن سے واپسی

مسلمان ارکان حج کی بجا آوری میں مشغول تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی یمن سے واپس آ پہنچے۔ انہیں جس وقت رسول اللہ ﷺ کے حج پر تشریف لے جانے کا علم ہوا تھا تو انہوں نے بھی حج کے لئے احرام باندھ لیا تھا لیکن جب وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ان کا احرام کھلا ہوا ہے۔ انہوں نے وجہ پوچھی تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے عمرہ کی نیت کرنے کا حکم دے کر احرام اتار دینے کا ارشاد فرمایا ہے۔ وہ یہ سن کر اسی وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس پہنچے اور آپ کی خدمت میں یمن کے تمام حالات عرض کئے جب بات ختم کر چکے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

"جا کر بیت اللہ کا طواف کرو اور پھر دوسرے لوگوں کی طرح تم بھی احرام اتار دو۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ میں نے احرام باندھتے وقت یہ نیت کی تھی:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُهِلُّ بِمَا اَهَلَّ بِهٖ نَبِيُّكَ وَعَبْدُكَ وَرَسُوْلُكَ مُحَمَّدٌ

"اے اللہ! میں انہی الفاظ میں تلبیہ[1] کہتا ہوں جن الفاظ میں تیرے نبی، تیرے بندے اور تیرے رسول محمد (مصطفی ﷺ) نے کہا تھا۔"

رسول اللہ ﷺ نے پوچھا۔ "تمہارے پاس قربانی کا جانور ہے؟"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نفی میں جواب دیا اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں اپنے ساتھ قربانی کے جانوروں میں شریک کر لیا۔ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ بدستور احرام باندھے رہے اور اسی حالت میں حج اکبر کے ارکان ادا کئے۔

ارکان حج کی ادائی

۸ ذی الحجہ کو ترویہ[2] کے دن رسول اللہ ﷺ مکہ سے منیٰ تشریف لے گئے اور وہاں ایک خیمہ میں فروکش ہوئے جو آپ کے ارشاد کے بموجب عرفات کے مشرقی جانب نمرہ بستی کے قریب نصب کیا گیا تھا۔ دن کی نمازیں آپ ﷺ نے وہیں ادا کیں۔ رات خیمہ میں گزاری اور اگلے روز صبح کی نماز پڑھ کر اپنی اونٹنی قصواء پر سوار ہوئے اور جبل عرفات کا رخ کیا۔ جب آپ پہاڑی پر چڑھے تو آپ کے گرد لاکھوں مسلمانوں کا

Marfat.com

مجمع تھا ان میں سے بعض لَبَّیْكَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ لَبَّیْكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ لَبَّیْكَ پکار رہے تھے اور بعض اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ کا ورد کرتے رہے۔

خطبہ حجۃ الوداع

زوالِ شمس کے بعد رسول اللہ ﷺ قصوا اونٹنی پر سوار ہو کر میدان عرفات کے وسط میں تشریف لائے اور اونٹنی ہی پر بیٹھے ہوئے بلند آواز سے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ خطبہ کا طریق یہ تھا کہ آپ ایک فقرہ ارشاد فرما کر چپ ہو جاتے اور ربیعہ بن امیہ بن خلف اسی فقرہ کو بآواز بلند دہراتے پھر دوسرا فقرہ ارشاد فرماتے اور ربیعہ بن امیہ اسے دہراتے اس طرح تمام مجمع نے نہ صرف یہ کہ آپ کا تمام خطبہ اچھی طرح سن لیا، بلکہ اسے ذہن نشین بھی کر لیا۔

آپ نے حمد و ثناء کے بعد فرمایا:

اَیُّھَا النَّاسُ اِسْمَعُوْا قَوْلِیْ فَاِنِّیْ لَا اَدْرِیْ لَعَلِّیْ لَا اَلْقَاکُمْ بَعْدَ عَامِیْ ھٰذَا بِھٰذَا الْمَوْقِفِ اَبَدًا۔

”اے لوگو! میری بات اچھی طرح سن لو کیونکہ شاید میں اس سال کے بعد اس جگہ تم سے پھر کبھی نہ مل سکوں۔“

اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ دِمَاءَ کُمْ وَ اَمْوَالَکُمْ عَلَیْکُمْ حَرَامٌ اِلٰی اَنْ تَلْقَوْا رَبَّکُمْ کَحُرْمَةِ یَوْمِکُمْ ھٰذَا وَ کَحُرْمَةِ شَھْرِکُمْ ھٰذَا۔

”اے لوگو! قیامت تک کے لئے تمہاری جانیں اور تمہارا مال ایک دوسرے کے لئے اسی طرح محترم ہے جس طرح یہ دن اور یہ مہینہ محترم ہے۔“

وَاِنَّکُمْ سَتَلْقَوْنَ رَبَّکُمْ فَیَسْاَلُکُمْ عَنْ اَعْمَالِکُمْ وَقَدْ بَلَّغْتُ۔

”عنقریب تم اپنے رب سے ملو گے وہ تم سے تمہارے اعمال کی جواب دہی کرے گا، اچھی طرح جان لو کہ میں نے تمہیں تمہارے پروردگار کی باتیں پہنچا دی ہیں۔“

فَمَنْ کَانَتْ عِنْدَهٗ اَمَانَةٌ فَلْیُؤَدِّھَا اِلٰی مَنِ ائْتَمَنَهٗ عَلَیْھَا۔

”جس شخص کے پاس کسی کی کوئی امانت ہو وہ اس کے مالک کو لوٹا دے۔“

وَاِنَّ کُلَّ رِبًا مَوْضُوْعٌ وَلٰکِنْ لَکُمْ رُؤُسُ اَمْوَالِکُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔

”آج سے ہر قسم کا سود ختم کیا جاتا ہے تم صرف اصل رقم کے حق دار ہو تم کسی پر ظلم نہ کرو۔ تمہارے ساتھ ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

Marfat.com

قَضَى اللهُ اَنَّهُ لَا رِبَا وَاِنَّ رِبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ مَوْضُوْعٌ كُلُّهُ۔

''اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ سود کو ختم کر دیا جائے عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا جو سود دوسروں کے ذمہ واجب ہے وہ ختم کیا جاتا ہے۔''

وَاِنَّ كُلَّ دَمٍ كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعٌ وَاِنَّ دِمَائِكُمْ اَضَعُ دَمُ ابْنُ رَبِيْعَةَ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ۔

''یاد رکھو جس قدر خون زمانہ جاہلیت کے تھے سب ختم کئے جاتے ہیں اور سب سے پہلے جو خون زمانہ جاہلیت کا میں معاف کرتا ہوں وہ ابن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کا ہے۔''

''اَمَّا بَعْدُ اَيُّهَا النَّاسُ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ يَئِسَ مِنْ اَنْ يُعْبَدَ بِاَرْضِكُمْ هٰذِهِ اَبَدًا وَلٰكِنَّهُ اِنْ يُّطَعْ فِيْمَا سِوٰى ذَالِكَ فَقَدْ رَضِيَ بِهِ مِمَّا تَحْقِرُوْنَ مِنْ اَعْمَالِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ عَلٰى دِيْنِكُمْ۔

''اے لوگو! اس تمہارے ملک میں شیطان اپنی پرستش سے ہمیشہ کے لئے ناامید ہو گیا ہے۔ البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں جنہیں تم بڑے گناہوں میں شامل نہ کرو گے، اس کی پیروی کرو گے اور وہ اس پر خوش ہوگا، لہٰذا تمہیں اپنے دین کی شیطان سے حفاظت لازمی ہے۔''

اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ النَّسِيْءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهُ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهُ عَامًا لِّيُوَاطِئُوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللهُ وَيُحَرِّمُوْا مَا اَحَلَّ اللهُ۔

''اے لوگو! نسی کی بدعت (حرام مہینوں کو حلال کر لینا اور اس کے بدلے حلال مہینوں کو حرام کر لینا (کفر ہے) وہ لوگ کسی مہینے کو کسی سال نفسانی غرض سے حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال جب کوئی غرض نہ ہو حرام سمجھتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ نے جو مہینے حرام کئے ہیں صرف ان کی گنتی پوری کر لیں اس طرح اللہ تعالیٰ کے حرام کئے ہوئے مہینے کو حلال کر لیتے ہیں اور اس کے حلال کئے ہوئے مہینے کو حرام۔''

وَاِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ كَهَيْئَةِ يَوْمَ خَلَقَ اللهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ وَاِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ۔ ثَلَاثَةٌ مُتَوَالِيَةٌ وَرَجَبُ مُفْرَدٌ الَّذِيْ بَيْنَ جَمَادِيْ وَشَعْبَانَ۔

''ابتدا میں خدا نے جب آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا زمانہ پھر پھرا کر آج پھر اسی نکتہ پر آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے سال کے بارہ مہینے مقرر فرمائے ہیں جن میں چار مہینے قابل احترام ہیں تین تو متواتر مہینے ہیں (ذی القعدہ ذی الحجہ اور محرم) اور ایک اکیلا مہینہ ہے یعنی

Marfat.com

رجب جو جمادی الثانی اور شعبان کے بیچ میں ہے۔"

اَمَّا بَعْدُ اَیُّهَا النَّاسُ، فَاِنَّ لَکُمْ عَلٰی نِسَاءِ کُمْ حَقًّا وَ لَهُنَّ عَلَیْکُمْ حَقًّا۔ لَکُمْ عَلَیْهِنَّ اَلَّا یُوْطِئْنَ فُرُشَکُمْ اَحَدًا تَکْرَهُوْنَهٗ وَ عَلَیْهِنَّ اَلَّا یَاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ۔ فَاِنْ فَعَلْنَ فَاِنَّ اللهَ قَدْ اَذِنَ لَکُمْ اَنْ تَهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَ تَضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَیْرَ مُبَرِّحٍ فَاِنِ انْتَهَیْنَ فَلَهُنَّ رِزْقُهُنَّ وَ کِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَیْرًا فَاِنَّهُنَّ عِنْدَکُمْ عَوَانٍ لَا یَمْلِکْنَ لِاَنْفُسِهِنَّ شَیْئًا وَاِنَّکُمْ اِنَّمَا اَخَذْتُمُوْهُنَّ بِاَمَانَةِ اللهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوْجَهُنَّ بِکَلِمَاتِ اللهِ۔

"اے لوگو! تمہارا تمہاری عورتوں پر حق ہے اور تمہاری عورتوں کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہارا عورتوں پر یہ حق ہے کہ وہ کسی غیر مرد کو اپنے قریب نہ آنے دیں۔ یہ بات تمہارے لئے غیظ و غضب کا موجب ہوگی۔ نیز وہ بے حیائی کے ارتکاب سے مطلق کنارہ کش رہیں اگر وہ ایسا کریں تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں اجازت دی ہے کہ تم انہیں اپنے سے جدا سلاؤ اور ایسی بدنی سزا دو جو زیادہ تکلیف دہ نہ ہو پھر اگر وہ ان باتوں سے باز آ جائیں تو عام دستور کے مطابق ان کے کھانے پینے کا خیال رکھو۔ عورتوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آتے رہو وہ تمہاری مددگار ہیں اور اپنے واسطے کچھ اختیار نہیں رکھتیں تم نے اللہ کی اس امانت کو اپنی تحویل میں لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ کلمات (ایجاب و قبول) ادا کرنے کے ساتھ انہیں خود پر حلال کیا ہے۔"

فَاعْقِلُوْا اَیُّهَا النَّاسُ قَوْلِیْ فَاِنِّیْ قَدْ بَلَّغْتُ وَ قَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ فَلَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا اَمْرًا بَیِّنًا: کِتَابَ اللهِ وَسُنَّةَ رَسُوْلِهٖ۔

"اے لوگو! میری باتیں گوشِ ہوش سے سنو۔ کیونکہ میں نے خدائی پیغام تم تک پہنچا دیا ہے میں تم میں وہ چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم انہیں مضبوطی سے پکڑ لو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے اور وہ ہیں کتاب اللہ اور اس کے نبی کی سنت!"

اَیُّهَا النَّاسُ اِسْمَعُوْا قَوْلِیْ وَ اعْقِلُوْهُ تَعَلَّمُنَّ اَنَّ کُلَّ مُسْلِمٍ اَخٌ لِلْمُسْلِمِ وَ اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ اِخْوَةٌ فَلَا یَحِلُّ لِاِمْرِئٍ مِنْ اَخِیْهِ اِلَّا مَا اَعْطَاهُ عَنْ طِیْبِ نَفْسٍ مِنْهُ فَلَا تَظْلِمُنَّ اَنْفُسَکُمْ

"اے لوگو! میری باتیں خوب غور سے سنو۔ دیکھو ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، پس کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ

وہ اپنے بھائی کی دلی رضامندی کے بغیر اس کی کوئی چیز لے پس تم ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے باز رہنا۔"

اَللّٰهُمَّ هَلْ بَلَّغْتُ

"اے اللہ! تو سن رہا ہے کہ میں نے تیرا پیغام لوگوں تک پہنچا دیا۔"

رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ لوگ یہ خطبہ اچھی طرح ذہن نشین کر لیں اسی لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر جملہ پر توقف فرماتے تھے اور ربیعہ اسے بلند آواز سے دہراتے تھے۔ خطبہ کو مزید ذہن نشین کرانے کے لئے اثنائے تقریر میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حاضرین سے بعض سوالات بھی کرتے جاتے تھے مثلاً:

"کیا تم جانتے ہو کہ آج کون سا دن ہے؟"

حاضرین جواب دیتے۔ "آج حج اکبر کا دن ہے۔"

حضور ﷺ فرماتے:

تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک تمہارے خون اور تمہارے مال ایک دوسرے پر اسی طرح حرام کئے ہیں جس طرح اس نے اس دن اور اس مہینہ کی حرمت کو قائم کیا ہے۔"

جب آپ خطبہ ختم کر چکے تو فرمایا:

"کیا میں نے خدا کا پیغام تم لوگوں تک پہنچا دیا؟"

ہر طرف سے آواز آئی "یقیناً" آپ نے فرمایا اے اللہ! تو گواہ رہ کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔"

نزول آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ

خطبہ ختم کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ اونٹنی سے اترے اور ظہر و عصر کی نمازیں ادا فرمائیں اس کے بعد پھر سوار ہوئے اور مقام صخرات میں جا کر اترے۔ وہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر یہ آیت نازل ہوئی جسے آپ نے اسی وقت لوگوں کو سنا دیا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط (سورۃ المائدہ:۳)

"آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کر لیا۔"

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ آیت سنی تو وہ رو پڑے کیونکہ انہوں نے مومنانہ فراست سے سمجھ لیا تھا کہ اب جبکہ رسالت اپنا فرض ادا کر چکی ہے تو سرورِ کائنات ﷺ کی وفات بھی نزدیک ہے۔

رسول اللہ ﷺ عرفات سے مزدلفہ روانہ ہوئے اور رات مزدلفہ میں گزاری۔ نماز فجر کے بعد وہاں

Marfat.com

سے روانہ ہوئے اور راستے میں جمرہ پر رمی فرماتے ہوئے منیٰ میں اپنے خیمہ میں فروکش ہوئے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مدینہ سے ایک سو اونٹ قربانی کے لئے لائے تھے۔ تریسٹھ اونٹ تو آپ نے اپنی طرف سے اپنی عمر کے ہر سال کے عوض میں ایک کے حساب سے قربانی میں ذبح کئے اور باقی اونٹ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ذبح کئے۔ اس کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سر منڈایا اور پھر احرام کھول کر حج کی جملہ رسومات سے فارغ ہو گئے۔

اس حج کو بعض لوگ حجۃ الوداع کہتے ہیں۔ بعض اسے حجۃ الاسلام کے نام سے پکارتے ہیں اور بعض حجۃ البلاغ کا نام دیتے ہیں۔ درحقیقت اس حج پر یہ تینوں ہی نام چسپاں ہوتے ہیں۔ یہ حج حجۃ الوداع ان معنوں میں تھا کہ یہ رسول اکرم ﷺ کا آخری حج تھا اس کے بعد آپ کو مکہ مکرمہ اور بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہونے کا موقعہ نہ ملا۔ حجۃ الاسلام اس طرح تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کی تکمیل اور لوگوں پر تمام حجت کا اعلان اسی حج کے دوران میں فرمایا اور حجۃ البلاغ اس لحاظ سے تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے دوران میں وہ تمام باتیں لوگوں تک پہنچا دیں جنہیں پہنچانے کا آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیثیت بشیر اور نذیر کی تھی اور اس لحاظ سے آپ پر جو فرائض عائد ہوتے تھے، انہیں اس حج کے موقعہ پر آپ نے تن دہی کے ساتھ ادا کیا۔

❁

Marfat.com

حواشی

۱۔ ''اکل المرار'' کے لفظی معنی پیلو کھانے والے کے ہیں۔ یہ لقب دراصل بنو کندہ کے بادشاہ حارث بن عمرو کا تھا اور اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ حارث بن عمرو قبیلے سے باہر کہیں گیا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے عمرو بن ہبولہ غسانی نے اس کی قوم پر دھاوا بول کر لوٹ کھسوٹ کا بازار خوب گرم کیا اور اس کی بیوی ام اناس بنت عوف کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ ام اناس نے راستہ میں عمرو کو اپنے خاوند سے ڈراتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے تو لے جا رہے ہو لیکن بہت جلد ایک سیاہ فام شخص جس کے پاؤں اونٹ جیسے ہیں اور جو پیلو کھایا کرتا ہے، آن کر تمہاری گردن پکڑ لے گا۔'' چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اُس دن سے حارث بن عمرو کا لقب ''اکل المرار'' پڑ گیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ربیعہ کے والد حارث کا جدی نسب والدہ کی طرف سے بنو کندہ سے ملتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ربیعہ تجارت کے لیے نکلے۔ کسی نے ان کا نسب دریافت کیا تو انہوں نے ازراہِ فخر کہہ دیا۔ ''نَحْنُ بَنُوْا اکل الْمُرَارِ (ہم اکل المرار کی اولاد ہیں) اسی لئے اشعث بن قیس نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہا تھا کہ آپ اور ہم دونوں اکل المرار کی اولاد ہیں۔ لیکن رسول اللہ ﷺ الحاق نسب والدہ کی بجائے والد سے کرتے تھے۔ اسی لئے آپ نے فرمایا: ''اکل المرار کی اولاد ہونے کا فخر اگر ہوگا تو عباس اور ربیعہ کو ہوگا۔ ہم تو نضر بن کنانہ کی اولاد ہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو اپنے اجداد کی طرف منسوب کرنا چاہیے۔''

۲۔ تلبیہ بمعنی لبیک! لبیک!

۳۔ ترویہ بمعنی کلمہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ اور یہ کلمہ تین تین مرتبہ ایامِ حج میں آٹھویں ذوالحجہ کی نمازِ فجر سے لے کر ہر نماز کے بعد بہ آوازِ بلند بعد سلام فرض پڑھنا تا بہ تیرہویں ماہ ذوالحجہ عصر تک۔ حاجی اور اہلی دونوں کے لئے! ہم اور آپ بھی اپنے اپنے ہاں اسی طرح ترویہ کہیں گے۔

Marfat.com

باب 28

از علالت تا بہ ارتحال

مناسک کی تکمیل کے بعد یہ لاکھوں زائرین اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹنا شروع ہوئے۔ ساکنانِ حضر موت نے اپنے وطن کی راہ لی۔ یارانِ مجد اپنے ملک کی طرف گامزن ہوئے۔ تہامہ میں بسنے والے اپنے دیس کی ڈگر پر چل دیئے اور سرور کائنات ﷺ مہاجرین و انصار کے ساتھ مدینہ تشریف لے گئے۔

دریں اثناء عرب میں اسلام کی ترقی اوجِ کمال کو پہنچ گئی تھی۔ لوگ جوق در جوق اسلام قبول کر رہے تھے۔ قبائل عرب پے بہ پے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے آگے سر تسلیم خم کر رہے تھے وہ سرزمین جو اس سے قبل فتنہ و فساد کا گڑھ تھی، جہاں آئے دن قبائلی تنازعات سر اٹھاتے رہتے تھے، اب اسلام کی برکت سے امن اور سلامتی کی سرزمین میں تبدیل ہو چکی تھی قبائل کے سردار اور مختلف علاقوں کے حاکم جو قبل ازیں ہمیشہ ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے تھے اور جن کا کسی امر پر متفق ہو جانا ناممکنات میں سے سمجھا جاتا تھا، رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر متفق ہو کر آپ کو اپنا سربراہ تسلیم کر چکے تھے اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ قبولِ اسلام کے بعد حضور ﷺ نے ان کے مراتب کو بعینہٖ قائم رکھا تھا اور کسی نو مسلم سردار کو اس کے منصب سے محروم نہ کیا تھا۔ اس کی روشن مثال ہمیں یمن میں نظر آتی ہے۔ سلطنت فارس نے وہاں ایک شخص ''بدھان'' کو عامل مقرر کیا ہوا تھا لیکن جب اس نے اسلام قبول کر لیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے اس کے منصب پر بدستور برقرار رکھا اور وہ یمن میں اسلام کا پرجوش داعی ثابت ہوا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ابھی چند لوگ ایسے موجود تھے جو اسلام کی محیر العقول ترقی کو دیکھ کر آتش حسد میں جل بھن رہے تھے اور علم بغاوت بلند کر کے مرکزی حکومت سے ناطہ توڑنے کی فکر میں تھے لیکن رسول اللہ ﷺ کو ان کی مخالفت کی پروا نہ تھی کیونکہ تمام جزیرہ نمائے عرب پر آپ کا کامل اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ باشندوں کی اکثریت بتوں کی پرستش سے منہ موڑ کر خدائے حی و قیوم کے آگے سر تسلیم خم کر چکی تھی وہ دل جو پہلے نور ہدایت سے بالکل محروم تھے اب جلوہ حق سے منور ہو کر خدائے واحد و قہار کے آگے سجدہ ریز ہو چکے تھے۔

جھوٹے نبیوں کا خروج

یہی وجہ تھی کہ جب عرب کے بعض علاقوں میں نبوت کے مدعیوں نے سر اٹھانا شروع کیا تو رسول

Marfat.com

اللہ ﷺ نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہ فرمائی۔ یہ صحیح ہے کہ عرب کے بعض دور دراز علاقوں کے باشندوں نے جب رسول اللہ ﷺ کی غیر معمولی کامیابی کو دیکھا تو اس خیال سے کہ انہیں بھی وہی مرتبہ اور شوکت و عزت حاصل ہو جائے جو قریش کو محمد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت قبول کر کے حاصل ہوئی ہے، اپنے اپنے قبیلوں کے مدعیان نبوت کی پیروی کرنی شروع کر دی ان قبائل کو مکہ اور مدینہ سے دوری کے باعث ان حالات سے مکمل آگاہی حاصل نہ تھی جو سرورِ کائنات ﷺ کی کامیابی کا باعث تھے لیکن اسلام کو عرب میں اس قدر اثر ونفوذ حاصل ہو چکا تھا کہ اب اس کا مقابلہ کرنا آسان نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے دین حق کی اشاعت کی خاطر جس قدر مصائب و آلام برداشت کئے تھے ان کا چرچا دور دور تک پھیل چکا تھا اور رسول اللہ ﷺ کے علاوہ اور کسی شخص کی طاقت نہ تھی کہ ان کا عشر عشیر بھی برداشت کر سکتا۔ رسول اللہ ﷺ اس لئے کامیاب ہوئے کہ آپ حق و صداقت کے پھیلانے کی خاطر کھڑے ہوئے تھے، لیکن ان مدعیان نبوت کا سارا کاروبار ہی جھوٹ اور افترا پر مبنی تھا۔ انہیں کس طرح کامیابی نصیب ہو سکتی تھی؟

ان مدعیان نبوت میں سے ایک شخص طلیحہ تھا جو بنو اسد کا سردار تھا اور اس کا شمار عرب کے بہادر آدمیوں میں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ اپنے قبیلے کے چند افراد کے ساتھ صحرا میں سفر کر رہا تھا۔ سخت گرمی کا موسم تھا اور دور دور تک پانی کا نشان نظر نہ آتا تھا۔ قافلے والے پیاس سے بے تاب تھے۔ اتفاقاً اس کے منہ سے نکل گیا کہ تمہیں بہت جلد پانی مل جائے گا۔ واقعہ میں ایسا ہی ہوا اور تھوڑی دیر کے سفر کے بعد قافلہ پانی کے ایک چشمہ پر پہنچ گیا۔ یہ واقعہ اس کی نبوت کے لئے ایک سہارا بن گیا اور اس نے اس ''معجزہ'' کو اپنی نبوت کی صداقت کے ثبوت میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ تاہم رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں وہ آپ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس کی بغاوت کا آغاز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں ہوا۔ لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسے شکست فاش دی اور وہ دوبارہ اسلام کی صفوں میں شامل ہو گیا۔ اس مرتبہ وہ استقامت کے ساتھ اسلام پر قائم رہا۔

طلیحہ کے علاوہ نبوت کے دوسرے مدعی مسیلمہ اور اسود عنسی تھے۔ مسیلمہ بنو حنیفہ کا سردار تھا اس نے رسول اللہ ﷺ کو ایک خط بھیجا جس میں لکھا کہ جس طرح خدا نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے اسی طرح مجھے بھی خلعت نبوت سے سرفراز فرمایا ہے۔ آپ تمام عرب کو اپنے زیر نگین لانا چاہتے ہیں حالانکہ عرب کا نصف علاقہ میرا ہے اور نصف علاقہ قریش کا، لیکن قریش عدل و انصاف سے کام لینا بالکل نہیں جانتے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ خط پڑھ کر مسیلمہ کے ایلچیوں کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ اگر قاصدوں کا قتل جائز ہوتا تو میں تمہیں قتل کرا دیتا۔ مسیلمہ کو آپ نے یہ جواب لکھ دیا کہ میں نے تمہارا خط سنا جو سر تا پا خرافات پر مشتمل تھا۔ تم نے عرب کے نصف حصے پر اپنا حق جتایا ہے لیکن ساری زمین اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور وہ اپنے نیک بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔

Marfat.com

اسود عنسی نے یمن میں خروج کیا تھا اور حاکم یمن بدھان کی وفات کے بعد زبردستی وہاں کا حاکم بن بیٹھا تھا۔ وہ جادوگری کا مدعی تھا اور خفیہ طور پر ٹونے ٹوٹکوں کا کام کرتا تھا۔ جب اس کے کاروبار کو کچھ ترقی ہوئی تو وہ کچھ فوج فراہم کر کے جنوب کی طرف بڑھا اور رسول اللہ ﷺ کے ان عمال کو جو یمن میں متعین تھے، وہاں سے نکال دیا۔ اس کے بعد نجران آیا۔ وہاں بدھان کا بیٹا مقیم تھا اس نے اسے قتل کر دیا اور اس کی بیوی سے زبردستی شادی کر کے اس علاقے میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے بھی زیادہ اہمیت نہ دی اور اس کے مقابلے کے لئے باقاعدہ فوج بھیجنے کی بجائے یمن میں اپنے عمال کو یہ حکم بھیج دیا کہ اگر ممکن ہو سکے تو اسود عنسی کو گرفتار کر لیا جائے ورنہ کسی ترکیب سے قتل کر دیا جائے۔ وہاں کے مسلمانوں نے اس کی بیوی سے رابطہ پیدا کر کے اس کے قتل کی سازش کی۔ اس کا دل اپنے پہلے خاوند کے قاتل کے خلاف پہلے ہی جوشِ انتقام سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے بخوشی ان کی سازش میں شریک ہونا منظور کر لیا اور خفیہ تدابیر اختیار کر کے اسود عنسی کا قصہ پاک کر دیا۔

رومی سلطنت پر چڑھائی کرنے کا ارادہ

رسول اللہ ﷺ کو عرب کے جنوبی حصے کی طرف سے اطمینان ہو چکا تھا کیونکہ اس علاقے کے لوگ اسلام قبول کر کے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غلامی میں داخل ہو چکے تھے لیکن شمالی جانب سے آپ بدستور خطرہ محسوس کرتے تھے کیونکہ اس طرف رومی عیسائی سلطنت مسلمانوں کی مخالفت پر ادھار کھائے بیٹھی تھی۔ لہٰذا حجۃ الوداع سے واپسی کے معاً بعد آپ نے اس خطرہ کا سدباب کرنے کے لئے عملی اقدامات شروع کر دیئے واقعہ یہ ہے کہ غزوہ موتہ کے بعد ہی سے رسول اللہ ﷺ کو رومی خطرہ کا شدت سے احساس ہو گیا تھا اس غزوہ کے موقعہ پر رومیوں کے لشکر جرار کے ہاتھوں اسلامی فوج کی کامل تباہی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور اگر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنی جنگی مہارت کو کام میں لا کر مسلمانوں کو دشمن کے نرغے سے نہ نکال لاتے تو لشکر کا ایک ایک آدمی رومیوں کے ہاتھوں شہید ہو جاتا اب ضرورت اس امر کی تھی کہ شمالی سرحدوں کی سختی سے نگرانی کی جاتی اور شام سے متصل سرحدی علاقے میں اسلامی سلطنت کی پوزیشن کو مضبوط تر بنایا جاتا۔ ایک طرف رومیوں کی جارحانہ سرگرمیوں کا سدباب ہو جاتا اور دوسری طرف وہ جلاوطن عیسائی جو عرب کو چھوڑ کر فلسطین میں جا بسے تھے اور وہاں کے لوگوں کی مدد سے دوبارہ اپنے وطن لوٹنے کے ارادے کر رہے تھے، اپنے منصوبوں میں کامیاب نہ ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ جونہی رسول اللہ ﷺ کو یہ معلوم ہوا کہ رومی عرب کی سرحدوں پر حملہ کرنے کے متعلق غور و فکر کر رہے ہیں آپ نے ایک بھاری لشکر تیار کیا اور خود اسے لے کر تبوک تک پہنچ گئے۔ جب رومیوں کو یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ شدید گرمی کو نظر انداز کر کے تپتے ہوئے صحراؤں کو عبور کر کے ایک بھاری فوج کے ہمراہ ان کے مقابلے کے لئے آ رہے ہیں تو ان کے حوصلے پست ہو

گئے اور انہوں نے اسلامی فوج کا مقابلہ کرنے کی بجائے اپنی فوجوں کو سرحدوں سے پیچھے ہٹا لینے اور اندرونی قلعوں میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا تاہم اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ شمالی جانب سے بے پروا نہ تھے۔ آپ کو ہر آن اس امر کا خدشہ تھا کہ نجران اور عرب کے دیگر علاقوں کے جلاوطن عیسائیوں کی انگیخت پر رومی سلطنت مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور اسلامی علاقوں کو تخت و تاراج کرنے کی کوشش کرے گی لہٰذا حجۃ الوداع سے واپس آتے ہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شام بھیجنے کے لئے ایک لشکر کی روانگی کی تیاری شروع کر دی۔ اس لشکر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر اور اولین صحابی بھی شامل تھے۔ لشکر کا سردار آپ نے حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو بنایا۔

لشکر کی سربراہی اسامہ رضی اللہ عنہ کو دینے کی مصلحتیں

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ اس زمانے میں جوانی کی ابتدائی منزلوں میں تھے اور ان کی عمر بیس برس سے متجاوز نہ تھی۔ انہیں مہاجرین اولین اور کبار صحابہ کا سردار بنا دینا مسلمانوں کو بڑا عجیب معلوم ہوا اور اگر انہیں رسول اللہ ﷺ پر ایمان صادق نصیب نہ ہوتا تو یقیناً وہ اس تقرری کو قبول نہ کرتے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو شام جانے والی فوج کا سردار مقرر کرنے میں رسول اللہ ﷺ کے پیش نظر کئی مصلحتیں تھیں۔ اول یہ کہ اسامہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جنہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بے حد عزیز رکھتے تھے، جنگ موتہ میں رومیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو ان کی شہادت کا بے حد رنج تھا۔ اسی لئے آپ نے اسامہ رضی اللہ عنہ کو سردار بنایا تاکہ وہ اپنے والد کا کما حقہ انتقام لے سکیں۔ ایک اور مصلحت یہ تھی کہ اس طرح آپ نوجوانوں میں عزم و حوصلہ کی روح پھونکنا اور انہیں شدائد و مصائب برداشت کرنے کا خوگر بنانا چاہتے تھے۔ سب سے اہم مصلحت یہ تھی کہ حضور ﷺ مسلمانوں کو کامل اطاعت و فرمانبرداری کا سبق سکھانا اور انہیں یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ ان پر خواہ کس قدر کم حیثیت شخص کو حاکم مقرر کر دیا جائے انہیں دل و جان سے اس کی اطاعت کرنی چاہیے۔

آپ ﷺ نے اسامہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ فلسطین پہنچ کر موتہ کے قریب بلقا اور روم کی سرحد پر حملہ کریں جہاں ان کے والد شہید ہوئے تھے۔ حملہ صبح سویرے کریں اور دشمنوں میں سے جس جس پر ان کا قابو چل جائے اسے قتل کر دیں اور آگ میں جلا دیں۔ سارا سفر بہت ہی خاموشی سے طے کریں تاکہ دشمنوں تک اس فوج کشی کی اطلاع نہ پہنچ سکے ورنہ وہ ہوشیار ہو کر پہلے سے اپنے بچاؤ کا سامان کر لیں گے۔ جب اللہ تعالیٰ انہیں فتح سے ہمکنار کر دے تو زیادہ عرصہ وہاں نہ ٹھہریں اور مالِ غنیمت لے کر بہت جلد مدینہ پہنچ جائیں۔

مرض الموت کا آغاز

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے قریب مقام جرف میں پہنچ کر روانگی کے انتظامات شروع کر دیئے۔

Marfat.com

ابھی انتظامات پورے طور پر مکمل نہ ہوئے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی علالت کی خبر پہنچی ایک دو روز بعد معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی بیماری شدت اختیار کر گئی ہے۔ یہ خبر سن کر لشکر کی روانگی ملتوی ہو گئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس لشکر کی روانگی کے متعلق رسول کریم ﷺ نے اتنی شد و مد سے تاکید فرمائی تھی اسے معرض التوا میں کیوں ڈال دیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ شام کا سفر بہت لمبا اور راستہ بے حد دشوار گزار تھا۔ راستے میں خوفناک صحراؤں اور پر خطر جنگلات میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ مسلمانوں کو یہ بات کسی طرح گوارا نہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی بیماری کی حالت میں وہ مدینہ چھوڑ کر اتنا لمبا سفر اختیار کریں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی انہیں ہر شے سے زیادہ عزیز تھی وہ ایسی بیماری میں حضور کو چھوڑ کر کس طرح جا سکتے تھے جس کا ہولناک انجام انہیں سامنے نظر آ رہا تھا۔ اب تک رسول اللہ ﷺ صرف دو مرتبہ بیمار ہوئے تھے پہلی مرتبہ ۶ ھ میں بھوک کی شدت کے باعث حضور کی طبیعت ناساز ہوئی تھی اور بعض لوگوں نے بالکل غلط طور پر یہ سمجھ لیا تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر یہود نے جادو کر دیا۔ دوسری مرتبہ ۷ ھ میں جبکہ ایک یہودی عورت نے آپ کو گوشت میں زہر ملا کر کھلا دیا تھا اور علاج کے طور پر حضور ﷺ کو فصد کھلوانی پڑی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کی طرز معاشرت اور تعلیمات پر نظر دوڑا کر بھی بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام قابل رشک صحت کے مالک ہوں گے اور آپ کا جسم آئے دن کی بیماریوں سے قطعی محفوظ ہوگا۔ آپ کی خوراک بہت کم اور لباس بہت سادہ ہوتا تھا۔ جسمانی صفائی کا آپ بے حد لحاظ رکھتے تھے۔ اول تو خود وضو ہی صفائی کا بہترین ذریعہ ہے لیکن آپ وضو ہی پر اکتفا نہ فرماتے تھے بلکہ منہ اور دانتوں کی صفائی کے لئے مسواک کا التزام بھی رکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر امت پر بار نہ ہوتا تو میں لوگوں کو ہر نماز کے وقت مسواک کا حکم دیتا۔

جو شخص عبادت اور دیگر تمام شعبہ ہائے حیات میں میانہ روی کو ملحوظ رکھتا ہو، خواہشات نفسانی سے دور بھاگنے کے ساتھ صحت و صفائی کے ادنیٰ سے ادنیٰ اصولوں پر پوری طرح کاربند ہو، مزید برآں اس کا جسم پیدائشی طور پر مضبوط اور توانا ہو، وہ بیماریوں سے محفوظ کیوں نہ رہے گا؟ یہی وجہ تھی کہ جب رسول اللہ ﷺ پر اچانک بیماری کا حملہ ہوا تو سارے مدینہ میں تشویش اور اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔

زمانہ رسالت میں رسول اللہ ﷺ کو جن شدائد کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ بڑے بڑے جگر گردے والے لوگوں کا پتہ پانی کر دینے کے لئے کافی تھے۔ متواتر بیس برس تک آپ حق و صداقت کی خاطر مصائب و آلام برداشت کرتے رہے۔ آپ نے سب سے پہلے مکہ میں توحید کی ندا بلند کی۔ یہ ندا بلند کرنے کی پاداش میں آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر اس قدر مظالم توڑے گئے کہ مجبوراً آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو حبشہ کی جانب ہجرت کرنے کا حکم دے دیا۔ شعب ابی طالب کے دردناک اور لمبے محاصرے میں آپ کو بھوک اور پیاس کی ناقابل برداشت تکلیف برداشت کرنی پڑیں۔ آخر جب مصائب و آلام کا یہ سلسلہ کسی طرح نہ رکا بلکہ اس میں

Marfat.com

روز بروز شدت پیدا ہوتی چلی گئی تو مجبوراً آپ کو انتہائی دردناک حالات میں مکہ سے مدینہ ہجرت کرنی پڑی۔ مدینہ میں بھی آپ کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ایک طرف مخالفین اسلام کے آئے دن کے حملے تھے، دوسری طرف یہود کی خوفناک ریشہ دوانیاں اور ان سب سے نبٹنے کے لئے سرور کائنات ﷺ کی اکیلی ذات۔ بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے مخالفین کا زور توڑ دیا اور قبائل عرب جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے تو رسول اللہ ﷺ کا کام پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا اور آپ کی ذمہ داریوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ مفتوحہ علاقوں کا انتظام و انصرام، نومسلموں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام، وفود سے ملاقات، ہمسایہ ملکوں کے بادشاہوں اور امراء سے خط و کتابت یہ تمام کام وہی شخص بحسن و خوبی انجام دے سکتا تھا جو مضبوط ترین اعصاب کا مالک ہو۔ جنگوں کے دوران میں بعض مواقع ایسے آئے جب بڑے بڑے بہادر حوصلہ ہار بیٹھے تھے لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان ہولناک موقعوں پر بھی کامل ثابت قدمی کا ثبوت دیا۔ اُحد کے واقعات سے کون مسلمان بے خبر ہو سکتا ہے۔ کفار کے اچانک حملے کے نتیجے میں مسلمانوں کی جمعیت تتر بتر ہو چکی تھی لیکن رسول اللہ ﷺ بدستور میدان جنگ میں موجود رہے حتیٰ کہ کفار کی سنگ باری سے آپ کے دو دانت بھی شہید ہو گئے۔ اسی طرح کا واقعہ جنگ حنین کے موقعہ پر پیش آیا۔ ہوازن کے بہادروں کے شدید حملے کے نتیجے میں مسلمانوں کے گھوڑے اور اونٹ بری طرح میدان جنگ چھوڑ کر بھاگے حتیٰ کہ ابوسفیان نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اب یہ سمندر سے قریب کسی صورت میں نہیں رک سکتے لیکن رسول مقبول ﷺ حیرت انگیز ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میدان جنگ میں موجود رہے اور مسلمانوں کو آواز دیتے رہے کہ کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ واپس آؤ اور دشمن کا مقابلہ کرو۔ یہ آواز سن کر مسلمانوں کے بھاگتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ واپس آئے اور دشمنوں پر فتح حاصل کی۔ ان امور کے علاوہ تبلیغ رسالت کا فریضہ کچھ کم تھکا دینے والا نہ تھا۔ حضور رسالت مآب ﷺ کو خود بھی اس امر کا احساس تھا۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مرتبہ فرمایا شَيَّبَتْنِيْ هُوْدٌ وَاَخَوَاتُهَا (مجھے ہود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے (قبل از وقت) بوڑھا کر دیا)۔

تمام صحابہ کے سامنے یہ تمام حالات و واقعات آئینہ کی طرح روشن تھے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے تمام مصائب و آلام اور شدائد و خطرات بے نظیر ہمت و استقلال کے ساتھ برداشت کئے تھے اور کسی مرض کو اپنے اوپر غلبہ نہ پانے دیا تھا۔ اب جبکہ حضور اچانک صاحب فراش ہو چکے تھے صحابہ ؓ کی بے چینی اور بے قراری کی کوئی حد نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شام جانے والے لشکر کی روانگی ملتوی کر دی گئی اور اہل مدینہ دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ انتظار کرنے لگے کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

اہلِ قبور سے نبی کریم ﷺ کا خطاب

جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بستر علالت پر دراز ہوئے تو شدت درد کے باعث رات کو نیند نہ آئی۔ گرمی کا موسم تھا۔ خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ آپ کا دل چہل قدمی کرنے کو چاہا۔ بستر سے اُٹھے۔ اپنے غلام ابو

Marfat.com

مویہبہ رضی اللہ عنہ کو ساتھ لیا اور شہر سے باہر بقیع الغرقد تشریف لے گئے جو مسلمانان مدینہ کا قبرستان تھا۔ قبروں کے درمیان کھڑے ہو کر آپ نے اہل قبور کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"اے اہل قبور! تم پر سلامتی ہو جس حالت میں تم ہو یہ تمہیں مبارک رہے یہ حالت اس حالت سے بہت بہتر ہے جس میں لوگ گرفتار ہیں۔ دیکھو فتنے اس طرح یکے بعد دیگرے چلے آ رہے ہیں جس طرح اندھیری رات کے پردے ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا آخر کار فتنہ پہلے فتنے سے بدر جہا بڑھ کر ہوگا۔"

حضرت ابومویہبہ رضی اللہ عنہ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھے بلایا اور فرمایا:

اے ابومویہبہ! مجھے بقیع الغرقد کے مدفونین کے لئے دعائے مغفرت کا حکم دیا گیا ہے تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

چنانچہ میں حضور ﷺ کے ساتھ قبرستان گیا۔ وہاں آپ نے (مندرجہ بالا الفاظ میں) اہل قبور کے لئے دعائے مغفرت فرمائی۔ پھر میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا:۔

"اے ابومویہبہ! مجھے اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ میں دنیا کے خزانوں، حیاتِ جاودانی اور جنت میں سے کسی ایک کو پسند کرلوں چنانچہ میں نے حیات جاودانی اور دنیا کے خزانوں کے مقابلہ میں اپنے رب کی ملاقات اور جنت کو پسند کرلیا ہے۔"

میں نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ حضور ﷺ پہلے دنیا کے خزانوں اور دنیا کی زندگی کو اختیار فرمائیں اس کے بعد اپنے رب سے ملاقات اور جنت کی خواہش فرمائیں۔"

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:۔

"اے ابومویہبہ! نہیں میں نے تو خدا ہی کی ملاقات کو اختیار کیا ہے۔"

جس رات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام قبرستان تشریف لے گئے اس سے اگلے دن صبح کو حضور کی بیماری شدت اختیار کر گئی جس پر لوگوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کی روانگی رک گئی۔

بعض لوگ حضرت ابومویہبہ رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ روایت کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محض رسول اللہ ﷺ کی تشویشناک علالت لشکر اسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی کے راستے میں روک نہ بنی تھی بلکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی سرداری پر بعض طبقوں کی طرف سے اعتراضات رسول اللہ ﷺ کی بیماری سے زیادہ لشکر کی روانگی میں رکاوٹ کا باعث بنے۔ ان مؤرخین نے ثبوت میں ان واقعات کا سہارا لیا ہے جو اس باب

Marfat.com

میں بیان ہوں گے۔ گو ہم ایسے اصحاب پر جرح وتنقید کرنا نہیں چاہتے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے بقیع الغرقد جانے اور اہل قبور کے لئے دعائے استغفار کرنے کے واقعہ سے بالکلیہ انکار نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ہمیں یہ امر تسلیم کرنے میں بھی کوئی عذر نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو پہلے ہی سے یہ علم ہو گیا تھا کہ ان کا آخری وقت قریب ہے اور وہ شاہد لم یزل سے ہم کنار ہونے والے ہیں۔

دورِ حاضرہ میں روحوں کے ساتھ مکالمہ ومخاطبہ ناممکن نہیں سمجھا جاتا۔ اس علم کے ماہرین کا کہنا ہے کہ روحوں سے بات چیت کا تعلق انسان کی روحانی قوت سے ہے اور مردہ لوگوں سے محض ایک دو نہیں بلکہ کافی باتیں کی جاسکتی ہیں، ان مکالمات میں جہاں ماضی و مستقبل باہم مل جاتے ہیں وہاں زمان ومکان کی قیود بھی حائل نہیں رہتیں۔ با ایں ہمہ اس علم کی ماہیئت کو واضح صورت میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جب متعدد اہل علم و بصیرت حضرات ارواح سے مکالمہ کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر ہمیں حضرت ابو موبہہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے انکار کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ جب کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ معنوی اور روحانی لحاظ سے عالم کون کے اسرار سے واقف تھے تو یہ امر تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے قبل از وقت اپنی وفات سے آگاہ ہو جانا مشکل نہ تھا۔

جس رات حضور ﷺ قبرستان تشریف لے گئے اس سے اگلے دن صبح کو آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے گزرے۔ اس وقت ان کے سر میں درد ہو رہا تھا اور وہ کراہ رہی تھیں۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"عائشہ رضی اللہ عنہا! میرے سر میں بھی سخت درد ہو رہا ہے۔"

تاہم ابھی تک درد کی شدت اس حد تک نہ بڑھی تھی کہ آپ کو بے حال کر دیتی اور آپ ﷺ کو بیویوں سے ہنسی مذاق کرنے سے روک دیتی۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کراہنا بند نہ ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"تمہیں غم کس بات کا ہے؟ اگر تم مجھ سے پہلے فوت ہو گئیں تو میں اپنے ہاتھ سے تمہاری تجہیز وتکفین کروں گا اور نماز جنازہ پڑھوں گا۔"

اس لطیف مزاح سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے دل میں نسوانی غیرت کے جذبات اُبھر آئے۔ وہ ابھی جوانی کی منزلیں طے کر رہی تھیں اور انہیں زندہ رہنے کی خواہش تھی۔ انہوں نے جواب دیا:

"آپ تو یہی چاہتے ہوں گے کہ مجھے سپردِ خاک کر دیں اور میرے حجرے میں واپس آ کر دوسری بیویوں کی صحبت سے لطف حاصل کریں۔"

رسول اللہ ﷺ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ درد کی شدت مزید ہنسی مذاق کی اجازت نہ دیتی تھی۔ کچھ دیر کے بعد طبیعت میں سکون پیدا ہوا تو عادت کے مطابق تمام بیویوں کے پاس چکر لگانے کا ارادہ کیا لیکن مرض

Marfat.com

آہستہ آہستہ بڑھتا چلا گیا۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے ہی تھے کہ درد کی شدت سے بے تاب ہو گئے اور تیمارداری کی حاجت محسوس کرنے لگے۔ آپ نے اپنی تمام ازواج کو وہاں بلایا اور فرمایا کہ مجھ میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں ہے۔ تم مجھے عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں رہنے کی اجازت دے دو۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حالت دیکھ کر تمام بیویوں نے آپ کو بخوشی اجازت دے دی۔ چنانچہ آپ نے سر پر پٹی باندھی اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سہارے لڑکھڑاتے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں تشریف لے آئے۔

بیماری کے باوجود مسجد میں تشریف آوری

مرض کے ابتدائی ایام میں بسا اوقات بخار بے حد تیز ہو جاتا تھا۔ حتیٰ کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جسم سے شعلے نکل رہے ہیں۔ لیکن کچھ دیر کے بعد بخار ہلکا ہو جاتا اور آپ نماز پڑھانے کے لئے مسجد میں تشریف لے جاتے۔ کچھ دنوں تک اسی طرح ہوتا رہا۔ آپ مسجد میں تشریف لاتے اور نماز پڑھاتے ہی واپس تشریف لے جاتے۔ معمول کے مطابق کوئی تقریر وغیرہ نہ کرتے لیکن اسی اثناء میں آپ کو یہ بات معلوم ہوئی کہ بعض لوگ اسامہ رضی اللہ عنہ کی امارت پر اعتراض کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ بڑے بڑے صحابہ کی موجودگی میں ایک کم سن بچے کو سردار بنانے میں رسول اللہ ﷺ نے کیا مصلحت سمجھی ہے۔ یہ سن کر آپ نے مناسب سمجھا کہ اس فتنہ کو ابتدا ہی میں دبا دیا جائے۔ آپ کو شدید بخار چڑھا ہوا تھا لیکن آپ نے اسی حالت میں مسجد میں تشریف لے جانے کا ارادہ کر لیا۔ آپ نے اپنی بیویوں سے کہا کہ مجھ پر مختلف کنوؤں کے پانی کی سات مشکیں ڈال دو، میں باہر جا کر لوگوں سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ سات مختلف کنوؤں سے پانی لایا گیا۔ بیویوں نے آپ کو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے ٹب میں بٹھا دیا اور پانی ڈالنا شروع کیا، کچھ دیر کے بعد آپ نے انہیں پانی ڈالنے سے روک دیا۔ کپڑے پہنے، سر پر پٹی کسی اور مسجد میں جا کر منبر پر جلوہ افروز ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی۔ اصحاب اُحد کے لئے دعائے مغفرت کی پھر فرمایا:

> ”اے لوگو! اسامہ کے لشکر کو جانے دو۔ آج تم نے اس کی امارت پر اعتراض کیا ہے اور کل اس کے باپ کی امارت پر معترض ہو چکے ہو۔ حالانکہ وہ بھی امارت کے لائق ہے اور اس کا باپ بھی امارت کے لائق تھا۔“

یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد دوبارہ تقریر جاری فرمائی اور فرمایا:

> ”اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو اختیار عطا فرمایا ہے کہ خواہ وہ دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے یا خدا کے پاس آخرت میں جو کچھ ہے اسے قبول کرے لیکن اس نے خدا ہی کے پاس کی چیزیں قبول کیں۔“

Marfat.com

یہ کہہ کر آپ دوبارہ خاموش ہو گئے۔ اس اثنا میں تمام لوگ اس طرح خاموش بیٹھے رہے گویا ان کے سروں پر پرندے ہیں اور انہیں ڈر ہے کہ اگر انہوں نے ذرا بھی حرکت کی تو وہ اڑ جائیں گے۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سمجھ لیا کہ ایک بندے سے رسول اللہ ﷺ کی مراد خود اپنی ذات ہے اور حضور اس جہان فانی سے ملاءِ اعلیٰ کو کوچ کرنے کی تیاری فرما رہے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی ان پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ وہ اپنے آپ کو روک نہ سکے اور روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اسی حالت میں انہوں نے عرض کیا:

''یا رسول اللہ! ہماری جانیں اور ہماری اولاد آپ پر نثار ہونے کے لئے تیار ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کو خدشہ محسوس ہوا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے رونے سے کہیں دوسرے لوگ بھی متاثر نہ ہو جائیں اور اس طرح مسجد آہ و بکا کی مجلس میں تبدیل ہو جائے۔ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خاموش ہونے کا ارشاد فرمایا اور حکم دیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دریچے کے سوا مسجد کے باقی تمام دریچے بند کر دیئے جائیں۔ جب تمام دریچے بند کر دیئے گئے تو سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

''سب سے زیادہ میں جس کی دولت اور صحبت کا ممنون ہوں وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اگر میں دنیا میں کسی کو اپنی امت میں سے اپنا خلیل بنا سکتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا لیکن اسلام کا رشتہ دوستی کے لئے کافی ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے پاس اکٹھا کر دے۔''

یہ تقریر فرما کر منبر پر سے اُترے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کی طرف قدم بڑھائے لیکن ایک ہی دو قدم بڑھائے تھے کہ واپس آ گئے اور فرمایا:

''اے گروہ مہاجرین! تم انصار سے اچھا سلوک کرنا کیونکہ دوسرے لوگ بڑھتے جائیں گے لیکن انصار کی تعداد میں اضافہ نہ ہوگا۔ انصار میرے محرم ہیں جن کے دامن میں مجھے پناہ ملی ہے۔ لہٰذا ان کی خوبیوں کی قدر کرنا اور ان کی غلطیوں سے درگزر کرنا۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امامت کا حکم

تقریر ختم کر کے آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں تشریف لے گئے لیکن جو کوفت آپ کو اٹھانی پڑی تھی اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بیماری کی شدت میں اضافہ ہو جاتا۔ طبیعت کی کمزوری کا اندازہ اسی بات سے ہو جاتا ہے کہ بدن پر سات مشکیں ڈلوا کر آپ اس قابل ہو سکے تھے کہ باہر جا کر کچھ دیر کے لئے لوگوں سے خطاب کر سکیں لیکن اس حالت کے باوجود آپ کو ملت کا غم کھائے جا رہا تھا اور مختلف تفکرات آپ کے ذہن پر اس طرح مستولی تھے کہ شدید بیماری کی حالت میں بھی ان سے یکسوئی حاصل نہ ہو سکی۔ امت کے مستقبل کا فکر، لشکر اسامہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے بے چینی، انصار کا غم، یہی تفکرات تھے جن کے باعث آپ ﷺ نے دوسرے روز بھی مسجد میں جا کر نماز پڑھانے کا ارادہ کیا لیکن شدت علالت کے باعث باہر تشریف نہ لے

Marfat.com

جا سکے اور فرمایا:

''ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہو وہ میری جگہ نماز پڑھا دیں۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خواہش تھی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خود نماز پڑھائیں کیونکہ نماز پڑھانا بھی ایک طرح سے صحت کی علامت تھی۔ انہوں نے عرض کیا۔

''یا رسول اللہ ﷺ! ابوبکر رضی اللہ عنہ رقیق القلب آدمی ہیں۔ جب قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں تو زار و قطار رونے لگتے ہیں۔ جب وہ نماز پڑھائیں گے تو حسب عادت رونے لگیں گے اور لوگوں کی نماز خراب ہوگی۔''

لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان کی بات کی طرف التفات نہ فرمایا اور دوبارہ فرمایا: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہو وہ نماز پڑھا دیں۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پھر اپنی بات پر اصرار کیا۔ اس پر حضور ﷺ نے بلند آواز سے فرمایا:

''یقیناً تم ہی وہ عورتیں ہو جنہوں نے یوسف علیہ السلام کو بہلانے پھسلانے کی کوشش کی تھی، ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہو وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔''

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کی جگہ لوگوں کو نماز پڑھائی۔ ایک دن انہیں مسجد میں آنے میں کچھ دیر ہوگئی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نماز پڑھانے کے لئے کہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بلند آواز تھے۔ جب انہوں نے تکبیر کہی تو اس کی آواز رسول اللہ ﷺ نے حجرے کے اندر سنی۔ آپ نے فرمایا:

''ابوبکر کہاں ہیں؟ اللہ اور مسلمان اس بات کو ناپسند کرتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بجائے کوئی اور شخص نماز پڑھائے۔''

رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا کیونکہ امامت رسول اللہ ﷺ کی جانشینی کا اولین مظہر ہے۔

مرض میں روز بروز شدت پیدا ہوتی گئی۔ بخار تیز ہوتا گیا۔ آپ ﷺ کے چہرے پر کپڑا پڑا ہوا تھا۔ جب بیویاں اور دوسرے تیماردار اس کے اوپر اپنا ہاتھ رکھتے تو بخار کی گرمی انہیں اس کپڑے پر محسوس ہوتی۔ آپ کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا روزانہ عیادت کے لئے حاضر ہوتیں۔ رسول اللہ ﷺ کو ان سے بے حد محبت تھی جب کبھی وہ آپ کے پاس آتیں آپ کھڑے ہو جاتے۔ ان کے ماتھے پر بوسہ دیتے اور انہیں اپنے پاس بیٹھا لیتے۔ اس حالت میں بھی آپ کے معمول میں فرق نہ آیا۔ ایک دن جب وہ حسب معمول آپ کی عیادت کے لئے حاضر ہوئیں تو آپ ﷺ نے انہیں پاس بٹھا لیا اور ان کے کان میں چپکے سے کوئی بات کہی جسے سن کر وہ رو پڑیں۔ اس کے بعد دوبارہ پھر چپکے سے کوئی بات کہی جسے سن کر وہ ہنس پڑیں۔ حضرت

Marfat.com

عائشہ رضی اللہ عنہا نے رونے اور پھر ہنسنے کا سبب پوچھا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا:

''میں رسول اللہ ﷺ کا راز افشانہ کروں گی۔''

حضور ﷺ کی وفات کے بعد انہوں نے خود ہی ذکر کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں بتایا تھا کہ وہ اس مرض سے جانبر نہ ہوسکیں گے۔ یہ بات سن کر میں رو پڑی۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد میرے اہل خاندان میں سے سب سے پہلے تم مجھے ملوگی۔ یہ سن کر میں فرطِ مسرت سے ہنس پڑی۔

بخار کی شدت کے باعث ٹھنڈے پانی کا لگن آپ کے پاس رکھ دیا گیا تھا۔ آپ بار بار اپنا ہاتھ اس میں ڈالتے اور پھر اسے چہرے پر ملتے۔ اسی اثناء میں آپ کو غشی کے دورے پڑنے شروع ہو گئے جب غشی سے افاقہ ہوتا تو چہرے پر شدید کرب کے آثار نظر آتے۔ ایک دن جب درد و کرب میں بہت زیادتی تھی تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بے چین ہو کر کہا:

''ہائے میرے باپ کی تکلیف۔''

آپ نے فرمایا:

''آج کے بعد تمہارے والد کو کبھی تکلیف نہ ہوگی۔''

حضور ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ آپ عنقریب اس دار المحن سے رخصت ہو کر اس جگہ جا رہے ہیں جہاں دکھ اور درد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

رسول اللہ ﷺ کی شدید بے چینی کو دیکھ کر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔

''یا رسول اللہ!.......... آپ ہم لوگوں کو یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ بیماری کی حالت میں درد و کرب کا اظہار نہ کرنا چاہیے۔ اب آپ کیوں اس قدر بے چین ہیں؟''

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا۔

''مجھے اس وقت جس قدر تکلیف ہے وہ دو مریضوں کے برابر ہے۔''

واقعہ قرطاس

اسی بیماری کے ایام میں جبکہ چند صحابہ آپ ﷺ کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا:

''میرے پاس دوات اور کاغذ لاؤ۔ میں تمہیں ایسی تحریر لکھا دوں جس پر عمل کرنے سے تم کبھی گمراہ نہ ہو گے۔''

یہ سن کر حاضرین میں سے کسی شخص نے (بعض مؤرخین نے کہا ہے کہ وہ شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے) کہا:

''رسول اللہ ﷺ سخت تکلیف میں مبتلا ہیں (اس حالت میں انہیں مزید تکلیف دینا ٹھیک نہیں)۔ ہمارے پاس قرآن کریم موجود ہے اور وہی ہمارے لئے کافی ہے (اگر ہم اس پر عمل کرتے رہیں تو کبھی گمراہ نہ ہوں گے)۔''

اس پر حاضرین میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی ضرور تعمیل کرنی چاہئے تاکہ بعد میں گمراہی کا خدشہ باقی نہ رہے لیکن بعض لوگوں نے اسی بات پر اصرار کیا کہ اس حالت میں رسول اللہ ﷺ کو تکلیف دینا ٹھیک نہیں ہماری ہدایت کے لئے کتاب اللہ ہی کافی ہے۔

جب رسول اللہ ﷺ نے یہ منظر دیکھا تو فرمایا۔

''میرے پاس سے اُٹھ کھڑے ہو۔ نبی کے سامنے اس قسم کا مناقشہ ٹھیک نہیں۔''

بعد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی تعمیل نہ کر کے بہت کچھ ضائع کر دیا۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کی رائے کو تسلیم نہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (سورۂ انعام: ۳۸)

''یعنی ہم نے اس کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں رکھی۔''

سرور کائنات ﷺ کی تشویشناک علالت کی خبر دور دور تک پھیل گئی۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اور جرف میں مقیم ان کے دوسرے ساتھیوں کو جب یہ علم ہوا تو وہ لوگ مدینہ آئے۔ مدینہ پہنچ کر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن اس وقت تک تابِ گویائی ختم ہو چکی تھی جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسامہ رضی اللہ عنہ کو اپنے سامنے کھڑا ہوا دیکھا تو آپ نے دعا کے لئے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور پھر انہیں اسامہ رضی اللہ عنہ پر رکھ دیا۔

دوا پینے سے بیزاری

آپ کے اہل خانہ نے جب یہ تشویش ناک حالت دیکھی تو انہیں علاج کی طرف توجہ پیدا ہوئی۔ اُم المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی ایک قرابت دار اسماء نے ایک شربت تیار کیا جسے بنانے کی ترکیب انہوں نے ہجرتِ حبشہ کے زمانے میں معلوم کی تھی۔ وہی شربت غشی کی حالت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حلق میں ٹپکا دیا گیا۔ جب آپ ہوش میں آئے تو شربت کی کرواہٹ کا مزا محسوس کر کے فرمایا کہ مجھے یہ شربت کیوں پلایا گیا تھا۔ آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

''یا رسول اللہ! ہمیں ڈر ہے کہ کہیں آپ کو ذات الجنب (نمونیہ) نہ ہو۔''

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

''مجھے تو اللہ تعالیٰ نے ذات الجنب میں مبتلا ہونے سے محفوظ فرمایا ہے۔''

اس کے بعد حکم دیا کہ عباس رضی اللہ عنہ کے سوا باقی تمام لوگوں کو جو گھر میں موجود ہیں، یہ شربت پلایا جائے چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا روزہ سے تھیں لیکن انہیں بھی حضور ﷺ کے حکم کے بموجب یہ

Marfat.com

شربت پینا پڑا۔

آخری پونجی کو صدقہ کر دینے کا حکم

ایام علالت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس سات دینار تھے۔ جب بیماری نے شدت اختیار کی تو آپ کو خدشہ پیدا ہوا کہ ایسا نہ ہو میں تو دنیا سے رخصت ہو جاؤں اور یہ دینار اس طرح پڑے رہیں۔ آپ نے گھر والوں کو ہدایت کی کہ انہیں صدقہ کر دیا جائے لیکن بیماری کی گھبراہٹ، رسول اللہ ﷺ کی دیکھ بھال اور تیمار داری میں حد درجہ منہمک ہونے کے باعث اہل خانہ کے ذہن سے یہ بات نکل گئی۔ اتوار کے روز جب حضور کو غشی سے کسی قدر افاقہ ہوا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ ان دیناروں کا کیا ہوا؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ وہ ابھی میرے ہی پاس ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں لانے کا حکم دیا۔ جب دینار آپ کی خدمت میں حاضر کر دیئے گئے تو آپ نے انہیں ہاتھ میں لے کر فرمایا:

"اگر یہ دینار اسی طرح رہ جاتے تو میں اپنے رب کے متعلق اپنے ساتھ کیا گمان لے کر جاتا؟"

اس کے بعد اسی وقت انہیں مسلمان فقراء میں تقسیم کر دیا۔

آخری بار مسجد میں آمد

رات رسول اللہ ﷺ نے اطمینان اور سکون سے بسر کی۔ بخار بھی اتر گیا۔ لوگوں نے سمجھا کہ یہ اس دوا کا اثر ہے جو آپ کے اہل خانہ نے آپ کو پلائی تھی۔ طبیعت میں اس حد تک سکون پیدا ہو گیا کہ آپ صبح کی نماز کے وقت سر پر پٹی باندھ کر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب اور فضل بن عباس رضی اللہ عنہ کا سہارا لے کر مسجد میں تشریف لے گئے۔ اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے جب مسلمانوں نے حالت نماز میں رسول اللہ ﷺ کو تشریف لاتے دیکھا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور وہ آپ کے لئے راستہ بنانے کی خاطر ادھر اُدھر سرکنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اشارہ کیا کہ وہ اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہیں۔ مسلمانوں کو نماز میں مشغول دیکھ کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی بہت خوش ہوئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی آہٹ سے اس بات کا احساس ہوا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لا رہے ہیں اور لوگ آپ کے لئے راستہ بنا رہے ہیں چنانچہ انہوں نے اپنی جگہ سے ہٹ کر پچھلی صف میں آنے کا ارادہ کیا لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: "لوگوں کو تم ہی نماز پڑھاؤ۔"

خود ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دائیں پہلو میں بیٹھ گئے اور ان کی امامت میں نماز ادا کی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں کی طرف منہ کیا اور بلند آواز سے فرمایا:

"اے لوگو! آگ بھڑک اٹھی ہے اور اندھیری رات کی طرح فتنے امڈے چلے آ رہے

Marfat.com

ہیں۔ خدا کی قسم! میرے فرمان کے علاوہ تمہیں اور کسی چیز سے تمسک نہ کرنا چاہئے۔
میں نے تمہارے لئے صرف وہی چیزیں حلال کی ہیں جو قرآن نے حلال قرار دی ہیں
اور وہی چیزیں حرام کی ہیں جنہیں قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو
اس قوم پر جس نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنالیا۔"

رسول اللہ ﷺ کی بحالی صحت کی یہ کیفیت دیکھ کر مسلمانوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی چنانچہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے لشکر کو لے کر شام جانے کی اجازت چاہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی صحت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اچھی ہے۔ آج میری باری حبیبہ بنت خارجہ کے ہاں ہے کیا میں کچھ دیر کے لئے ان کے پاس ہو آؤں؟" رسول اللہ ﷺ نے اجازت دے دی چنانچہ وہ مدینہ کے نواحی گاؤں سنح چلے گئے جہاں ان کی بیوی رہتی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ دوسرے مسلمان بھی جو کل تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشویشناک بیماری کے باعث سخت مغموم اور پریشان تھے رسول اللہ ﷺ کی موجودہ حالت کو دیکھ کر مسرت و امتنان کے جذبات لئے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو آ گئے۔ سرور کائنات ﷺ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں واپس آ گئے۔ اس وقت اگرچہ آپ کو شدید کمزوری محسوس ہو رہی تھی لیکن آپ کا دل یہ تصور کر کے باغ باغ ہو رہا تھا کہ مسلمانوں کو نماز کے ساتھ کس قدر لگاؤ اور عشق ہے۔

تاہم رسول اللہ ﷺ کا مسجد میں تشریف لانا محض ایک سنبھالا تھا۔ حجرے میں واپس آتے ہی آپ کی حالت لحظہ بلحظہ بگڑنی شروع ہوئی اور حضور ﷺ کو یقین ہو گیا کہ اب آپ کا آخری وقت قریب آ پہنچا ہے اور زندگی کے محض چند لمحات باقی ہیں۔

۸ جون ۶۳۲ء کا دن تھا۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی آپ کے قریب ٹھنڈے پانی کا لگن رکھا ہوا تھا جس میں آپ بار بار ہاتھ ڈالتے اور پھر اسے سر پر ملتے تھے۔ اسی دوران میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایک لڑکا مسواک لے کر حجرے میں داخل ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے مسواک کرنا چاہتے ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مسواک اپنے بھائی کے ہاتھ سے لے کر چبائی اور جب اس کے ریشے خوب نرم ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں پکڑا دی حضور نے اسے اپنے دانتوں پر ملا۔

اب نزع کی حالت شروع ہو گئی تھی جو حضور ﷺ کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اس موقعہ پر آپ نے گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی۔

"اے اللہ اس جاں کنی کے وقت میری مدد فرما۔"

وفات

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ اس وقت رسول اللہ ﷺ کا سر میری گود میں تھا۔ میں نے محسوس

کیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جسم اچانک بھاری ہو گیا ہے۔ میں نے آپ کے چہرے پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ آپ کی آنکھیں پتھرائی جا رہی تھیں اور آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے:

بَلِ الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰی مِنَ الْجَنَّةِ

''اب تو جنت میں اپنے پروردگار کے پاس ہی جانا چاہتا ہوں۔''

یہ سن کر میں نے کہا:

''خدا کی قسم جس نے آپ کو حق و صداقت کے ساتھ مبعوث فرمایا، اللہ نے آپ کو دنیا اور آخرت دونوں میں سے ایک کا اختیار دیا لیکن آپ نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دی۔''

حضرت عائشہ کہتی ہیں ''رسول اللہ ﷺ نے میری گود میں ٹیک لگائے ہوئے جان دی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے آج تک کبھی کسی شخص کو حالت نزع میں نہ دیکھا تھا میں اپنی کم عمری اور ناسمجھی کی وجہ سے سمجھ ہی نہ سکی کہ رسول اللہ ﷺ پر سکراتِ موت طاری ہے۔ جب مجھے حضور ﷺ کی وفات کا احساس ہوا تو میں نے آپ کا سر تکیہ پر رکھ دیا اور دوسری عورتوں کے ساتھ گریہ زاری کرنے لگی۔''

رسول اللہ ﷺ تو فوت ہو چکے تھے لیکن بعض لوگوں کو آپ کی وفات کا ہرگز یقین نہ تھا۔ اس طرح مسلمانوں کے اختلاف نے زبردست فتنہ کی شکل اختیار کر لی۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال نہ ہوتا اور وہ اپنے دین کی نصرت کے لئے کھڑا نہ ہوتا تو مسلمانوں کے مابین خانہ جنگی کی آگ بھڑک اٹھنے میں کوئی کسر نہ رہ گئی تھی۔

رسول اللہ کی وفات سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انکار

رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں اس جہان فانی سے راہ گزارِ عالم جاودانی ہوئے جب مسلمانوں کو مسجد میں اچانک اس حادثہ فاجعہ کی خبر پہنچی تو وہ حیران و ششدر رہ گئے کیونکہ انہوں نے تھوڑی دیر پہلے فجر کی نماز میں حضور ﷺ کی زیارت کی تھی اور آپ کی ظاہری حالت سے پتا چلتا تھا کہ طبیعت صحت کی طرف مائل ہو رہی ہے۔ کسی کو اس بات کا سان گمان بھی نہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ ﷺ انہیں اس قدر جلد چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے فدائی بھی کچھ دیر کے لئے اپنی بیوی حبیبہ بنت خارجہ کے پاس مقام سخ میں چلے گئے تھے۔

جب رسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبر لوگوں میں مشہور ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوراً اس جگہ آئے جہاں حضور ﷺ کا جسد اطہر رکھا ہوا تھا۔ انہیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ حضور ﷺ فوت ہو چکے ہیں۔ انہوں نے چہرے پر سے کپڑا ہٹایا تو جسم میں حرکت کے آثار مطلق نظر نہ آئے لیکن انہوں نے اس حالت کو بیہوشی سے تعبیر کیا اور یہ سمجھا کہ حضور بہت جلد ہوش میں آ جائیں گے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ کے اصرار پر انہوں نے کہا ''تم جھوٹ کہتے ہو'' اور باہر آ کر مسجد

Marfat.com

میں ایک تقریر کی جس میں کہا:

"بعض منافقین یہ خبر اڑا رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے لیکن یہ بالکل غلط ہے وہ حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کی طرح اپنے رب کے پاس گئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی چالیس دن تک اپنی قوم سے غیر حاضر رہے تھے اور ان کی غیر حاضری میں لوگوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ فوت ہو گئے لیکن جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آ گئے اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی واپس آئیں گے اور جو لوگ آپ کی وفات کی خبر مشہور کر رہے ہیں ان کے ہاتھ پیر قلم کریں گے۔"

مسلمان اس وقت عجیب سراسیمگی کی حالت میں تھے۔ ایک طرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے سے عورتوں کے گریہ و بکا کی آوازیں آ رہی تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ دوسری طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد میں برملا اعلان کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبر منافقوں نے اڑائی ہوئی ہے اور عنقریب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے رب کے پاس سے واپس آ کر ان منافقین کے ہاتھ پیر قلم کریں گے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس بات کا یقین کریں اور کس کا نہ کریں وہ اسی پریشانی اور سراسیمگی کی حالت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گرد اکٹھے ہو گئے اور ان کی باتیں سننے لگے۔ واقعی صورت حال ایسی پیدا ہو گئی تھی کہ ان کے ذہن رسول اللہ ﷺ کی وفات کا تصور کرنے کے لئے تیار ہی نہ ہوتے تھے کیونکہ ابھی کچھ عرصہ پیشتر وہ آپ کی زیارت سے مشرف ہو چکے تھے۔ انہیں یہ خیال بھی آتا تھا کہ ابھی پیشگوئیوں کے مطابق قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کی تسخیر باقی ہے۔ ان عظیم الشان بادشاہتوں کو زیر نگین لائے بغیر رسول اللہ ﷺ کس طرح وفات پا سکتے ہیں۔ یہی خیالات تھے جن کی بنا پر انہیں آہستہ آہستہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی باتوں کا یقین آتا گیا اور یہ امید بڑھتی گئی کہ عنقریب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام واپس تشریف لے آئیں گے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی واپسی اور مسلمانوں سے خطاب

اسی دوران حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی اس حادثہ فاجعہ کا علم ہونے پر سنح سے واپس آ گئے۔ مسجد نبوی میں انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تقریر کرتے اور مسلمانوں کو ان کی تقریر غور سے سنتے ہوئے دیکھا لیکن انہوں نے ان کی طرف التفات نہ فرمایا بلکہ سیدھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے دروازہ پر پہنچے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ آج کسی شخص کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے اندر داخل ہو کر رسول اللہ ﷺ کی نعش مبارک پر سے کپڑا اٹھایا اور پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا:

"کیا ہی بابرکت تھی آپ کی زندگی اور کیا ہی پاکیزہ ہے آپ کی موت۔"

Marfat.com

اس کے بعد آپ کے سر کو تکیہ سے ذرا اٹھا کر غور سے چہرہ کی طرف دیکھا جو اسی طرح تر و تازہ تھا جس طرح زندگی میں رہتا تھا اور کہا:

"میرے ماں باپ آپ پر قربان! خدا کی طرف سے جو موت آپ کے لئے مقدر تھی وہ تو ہو چکی۔ اب اللہ تعالیٰ اس کے بعد کبھی آپ پر موت وارد نہ کرے گا۔"

یہ کہہ کر سر دوبارہ تکیہ پر رکھ دیا اور چہرہ مبارک پر چادر ڈال کر مسجد میں آئے۔ ابھی تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ بدستور لوگوں کو یہ یقین دلانے میں مصروف تھے کہ رسول اللہ ﷺ فوت نہیں ہوئے۔ لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر ان کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور کہا: "عمر! خاموش ہو جاؤ۔" لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنی ان سنی کر دی اور اپنی تقریر میں منہمک رہے۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور کہا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں اسے غور سے سنو۔ بھلا کون شخص تھا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی باتوں پر دھیان نہ دیتا! لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر فوراً ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللهَ فَإِنَّ اللهَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ

"اے لوگو! تم میں سے جو شخص محمد کی پرستش کرتا تھا وہ سن لے کہ محمد تو فوت ہو گئے لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو یقیناً اللہ تعالیٰ زندہ ہے اس پر کبھی موت وارد نہ ہوگی۔"

اس کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللهَ شَيْئًا ۗ وَسَيَجْزِي اللهُ الشَّاكِرِينَ ﴿۱۴۴﴾ (سورۃ آل عمران: ۱۴۴)

"محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں اگر محمد ﷺ وفات پا جائیں یا شہید کر دیئے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل (کفر کی جانب) پھر جاؤ گے؟ اور جو شخص اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے وہ اللہ کو ذرا سا بھی ضرر نہیں پہنچا سکتا اور عنقریب اللہ شکر گزار بندوں کو نیک بدلہ دے گا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب لوگوں کی توجہ ہمہ تن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھی تو وہ خود بھی اپنی تقریر ختم کر کے آپ کی باتیں سننے لگے۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دماغ پر پڑا ہوا پردہ آہستہ آہستہ ہٹنے لگا اور بالآخر انہیں یقین ہو گیا کہ واقعی رسول اللہ ﷺ فوت ہو

Marfat.com

چکے ہیں۔ اس یقین کا ان کے دل پر اتنا شدید اثر ہوا کہ ان کی ٹانگیں ان کا بوجھ نہ سہار سکیں اور وہ بے سدھ ہو کر زمین پر گر پڑے۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس آیت کو سن کر یہ محسوس کیا جیسے انہوں نے اس سے قبل یہ آیت سنی ہی نہ تھی۔ اس طرح ان کے دلوں سے تمام شکوک وشبہات زائل ہو گئے اور انہیں یقین کامل ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے منہ موڑ کر دوسرے جہان میں اپنے رب کے حضور پہنچ چکے ہیں۔

کیا رسول اللہ ﷺ واقعی فوت ہو چکے ہیں؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات سے انکار کر کے اور دوسرے لوگوں کو بھی اس معاملے میں اپنا ہمنوا بنا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مبالغہ سے کام لے رہے تھے؟ ہمارا جواب ہے: ''نہیں!'' علماءِ ہیئت کا دعویٰ ہے کہ سورج کی روشنی آہستہ آہستہ کم ہوتی جائے گی اور ایک دن ایسا بھی آئے گا جب یہ سیاہ رنگ کا ایک گولہ بن کر رہ جائے گا اور اس میں روشنی کی ایک کرن بھی باقی نہ رہے گی۔ کیا علماءِ ہیئت کے اس مفروضے کو شک وشبہ کے بغیر قبول کیا جا سکتا ہے اور یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ یہ سورج جو آج پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا ہے کسی وقت بالکل ماند پڑ جائے گا اور طرفہ یہ کہ دنیا سورج کے فنا ہونے کے بعد بھی کم از کم ایک دن تک یقینا قائم رہے گی۔ محمد ﷺ بھی روشنی، حرارت اور قوت کے لحاظ سے سورج سے کم تر نہ تھے۔ جس طرح سورج تمام عالم کو اپنی کرنوں سے منور کرتا رہتا ہے، اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ نے تشریف لا کر اپنی تعلیم سے تمام دنیا کو منور کر دیا اور آپ کی تعلیمات کی روشنی تا ابد قائم رہے گی۔ جس طرح سورج کا اثر کائنات کے ذرے ذرے پر ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی روح بھی کائنات کے گوشے گوشے پر اپنا سایہ کئے ہوئے ہے۔ لہٰذا اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے فوت ہو جانے سے انکار کیا تو انہیں کوئی الزام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی صفات کے لحاظ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہیں اور آپ پر کبھی موت وارد نہیں ہو سکتی۔

واقعہ سقیفہ بنو ساعدہ

مسلمان اس وقت سخت پریشانی کے عالم میں تھے جب انہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی وفات کا یقینی علم ہو گیا تو وہ ادھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ البتہ انصار کا ایک قبیلہ سیدھا سقیفہ بنو ساعدہ میں اپنے سردار سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر جا کر ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ مہاجرین اور ان کے ساتھ اسید بن حضیر محلہ بنو عبدالاشہل میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس چلے گئے۔ اسی دوران میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خبر ملی کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کا جانشین بنانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور انصار سقیفہ بنو ساعدہ میں جمع ہو کر اس بارے میں صلاح ومشورہ کر رہے ہیں۔ خبر

Marfat.com

لانے والے نے یہ بھی کہا کہ اگر آپ لوگوں کو امت کے مصالح سے کوئی دلچسپی ہے تو انصار کے کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے پہلے پہلے سقیفہ بنو ساعدہ میں پہنچ جایئے۔

ابھی تک رسول اللہ ﷺ کی تجہیز و تکفین عمل میں نہیں آئی تھی اور آپ کے گھر والوں نے حجرے کا دروازہ بند کیا ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو انصار کے اس اجتماع کی خبر سن کر بے حد تشویش لاحق ہوئی۔ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ہمیں ابھی انصار کی طرف چلنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا کر رہے ہیں چنانچہ وہ دونوں بعض مہاجرین کے ہمراہ اسی وقت سقیفہ بنو ساعدہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ راستے میں انہیں انصار کے دو اشخاص ملے۔ انہوں نے ان سے پوچھا: ''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ لوگ سقیفہ بنو ساعدہ جا رہے ہیں تو انہوں نے کہا: ''مناسب یہی ہے کہ آپ وہاں نہ جائیں بلکہ اپنا معاملہ علیحدہ طے کریں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ''نہیں ہمیں وہاں ضرور جانا ہے۔'' چنانچہ وہ سقیفہ پہنچے۔ وہاں ایک صاحب کمبل اوڑھے ہوئے لیٹے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''یہ کون ہیں؟'' لوگوں نے کہا: ''یہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ہیں اور بیماری کے سبب لیٹے ہوئے ہیں۔'' جب مہاجرین بیٹھ گئے تو انصار میں سے ایک شخص نے اٹھ کر تقریر شروع کی اور کہا:

> ''ہم اللہ کے انصار ہیں اور ہمیں اسلامی لشکر کی حیثیت حاصل ہے۔ تم اے مہاجرین! ہماری فوج کا ایک دستہ ہو لیکن تم نے مدینہ ہی میں ہماری جڑیں کاٹ کر ہمیں اپنے ماتحت رکھنے کے منصوبے بنانے اور ہمارے حقوق غصب کرنے کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی بعض انصار اسی قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے تھے لہٰذا جونہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ سنے انہوں نے جواب دینے کا ارادہ کیا چونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو احساس تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طبیعت میں بلا کی سختی ہے اس لئے انہوں نے انہیں خاموش رہنے کی ہدایت کی اور خود انصار سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> ''اے لوگو! ہم مہاجرین اولین اشخاص ہیں جو اسلام لائے، حسب و نسب اور عز و شرف کے لحاظ سے بھی ہم تمام عربوں سے بڑھ چڑھ کر ہیں، ان تمام باتوں کے علاوہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کے قریبی رشتہ دار ہونے کا فخر بھی حاصل ہے ہم تم سے پہلے ایمان لائے اور قرآن میں بھی ذکر تم سے مقدم ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
>
> وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ (سورۃ التوبہ: ۱۰۰)
>
> ہم مہاجرین ہیں اور تم انصار، تم دین میں ہمارے بھائی، غنیمت میں ہمارے شریک اور

دشمنوں کے مقابلے میں ہمارے مددگار رہو باقی تم نے اپنی فضیلت کا جو ذکر کیا ہے اس سے ہمیں انکار نہیں تم واقعی اس کے اہل ہو اور روئے زمین پر سب سے زیادہ تعریف کے مستحق لیکن عرب اس بات کو کبھی نہ مانیں گے کہ سلطنت قریش کے سوا کسی اور قبیلے کے ہاتھ میں رہے اس لئے امارت تم ہمارے سپرد کرو اور وزارت خود سنبھال لو۔“

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تقریر ختم ہونے پر ایک انصاری نوجوان کھڑا ہوا اور جوش سے کہا:

”یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم تمہاری ماتحتی گوارا نہیں کر سکتے زیادہ سے زیادہ رعایت ہم تمہیں یہ دے سکتے ہیں کہ ایک امیر ہم میں سے ہو جائے اور ایک تم میں سے۔“

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”نہیں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں امیر بہر حال ہم میں سے ہوگا اور تمہیں ہمارے وزیر کی حیثیت حاصل ہوگی۔ یہ عمر رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بیٹھے ہیں ان میں سے جس کی بیعت چاہو کر لو۔“

اس وقت شور و شغب بہت بڑھ گیا اور اختلاف کا سخت خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلند آواز سے کہا: ”ابوبکر رضی اللہ عنہ! اپنا ہاتھ بڑھایئے۔“

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً ان کی بیعت کر لی اور کہا:

”ابوبکر رضی اللہ عنہ! کیا آپ کو رسول اللہ ﷺ نے حکم نہ دیا تھا کہ آپ مسلمانوں کو نماز پڑھائیں۔ اس لئے آپ ہی خلیفۃ اللہ ہیں ہم آپ کی بیعت اس لئے کرتے ہیں کہ آپ ہم سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کے محبوب تھے۔“

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ بات تمام حاضرین کے دل کو لگی اور انہیں فوراً اس امر کا احساس ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی جگہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امام الصلوٰۃ مقرر کر کے دراصل اپنی زندگی ہی میں اپنے جانشین کا فیصلہ فرما دیا تھا کیونکہ امامت جانشینی کا اولین مظہر ہے۔ چنانچہ مہاجرین اور انصار سب نے صدق دل سے آپ کی بیعت کر لی۔

سقیفہ بنو ساعدہ میں بیعت ختم ہونے پر مسلمان مسجد نبوی میں واپس آ گئے۔ اس وقت شام ہو چکی تھی اگلے روز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور پچھلے روز کے واقعہ پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا:

”میں نے تم سے کل ایسی بات کہی تھی جو نہ کتاب اللہ میں پائی جاتی ہے اور نہ میں نے

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ سے کبھی سنی تھی لیکن میں اپنی محبت کے جوش میں یہ سمجھتا تھا کہ آپ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ہمارے تمام کاموں کی نگرانی بہ نفس نفیس فرماتے رہیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے وہ کتاب باقی رکھی ہے جس سے خود رسول اللہ ﷺ نے ہدایت حاصل کی پس اگر تم اسے مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو اسی طرح ہدایت پاؤ گے جس طرح آپ نے پائی۔ تمہارا خلیفہ اللہ نے اس شخص کو بنایا ہے جو تم میں سب سے بہتر ہے یہ رسول اللہ ﷺ کا مقرب ہے اور یہی ہے جسے غار (ثور) میں آپ کی رفاقت کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ اس لئے اٹھو اور اس کی بیعت کرو۔"

چنانچہ اس وقت عام بیعت ہوئی جبکہ سقیفہ بنو ساعدہ کی بیعت میں صرف خاص خاص لوگ شریک تھے۔

بیعت کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا پہلا خطبہ

بیعت کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا جسے حکمت وموعظت کا شاہکار ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد فرمایا:

"اے لوگو! میں تمہارا حکم تو بنایا گیا ہوں لیکن تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں نیک کام کروں تو اس میں میری مدد کرو اور اگر برا کام کروں تو مجھے ٹوکو۔ صدق امانت ہے اور کذب خیانت، تمہارا کمزور شخص میرے نزدیک قوی ہے جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں اور تمہارا قوی آدمی میرے نزدیک کمزور ہے جب تک اس کے ذمے جو حق ہے وہ اس سے لے لوں جو قوم اللہ کے راستے میں جہاد ترک کر دیتی ہے اس پر اللہ ذلت وخواری مسلط کر دیتا ہے اور اگر کسی قوم میں بے حیائی پھیل جاتی ہے تو اللہ اس پر بلائیں اور عذاب عام کر دیتا ہے تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں لیکن اگر مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔ اب نماز کے لئے کھڑے ہو اللہ تم پر رحم فرمائے۔"

رسول اللہ ﷺ کی تدفین کی تیاریاں

بیعت کے اختتام کے بعد رسول اللہ ﷺ کی تدفین کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ اس موقع پر مہاجرین میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ بعض کا خیال تھا کہ حضور ﷺ کو مکہ لے جا کر دفن کیا جائے جو آپ کا پیدائشی وطن تھا اور جہاں آپ کے بہت سے عزیز واقربا رہائش رکھتے ہیں۔ بعض نے بیت المقدس کی صلاح دی جہاں آپ سے بیشتر بہت سے انبیاء مدفون ہو چکے تھے۔ تعجب ہے کہ یہ تجویز کس طرح پیش کی گئی کیونکہ بیت المقدس اس زمانے میں رومی سلطنت میں شامل تھا اور رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان غزوۂ موتہ اور تبوک کے وقت

Marfat.com

سے دشمنی پیدا ہو چکی تھی حتیٰ کہ اپنی وفات سے چند دن قبل حضور ﷺ اسامہ رضی اللہ عنہ کو شام پر لشکر کشی کرنے کا حکم بھی دے چکے تھے۔ مسلمانوں کی اکثریت نے نہ اس رائے پر اتفاق کیا اور نہ وہ حضور ﷺ کی نعش مبارک کو مکہ لے جانے پر راضی ہوئے بلکہ مدینہ ہی میں دفن کرنے کی صلاح دی جہاں حضور ﷺ کفار مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر پناہ گزین ہوئے تھے اور جہاں کے باشندوں نے ہر طرح سے آپ کی مدد و نصرت کی تھی۔

مقام کے تعین کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوا کہ تدفین کس جگہ عمل میں لائی جائے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ حضور ﷺ کو مسجد نبوی میں منبر کے قریب دفن کیا جائے جہاں آپ کھڑے ہو کر خطبہ دیتے اور نماز پڑھاتے تھے لیکن بہت جلد یہ رائے ترک کر دی گئی کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ حدیث بیان کی کہ مرض الموت میں حضور ﷺ کے چہرے پر ایک سیاہ چادر پڑی ہوئی تھی۔ مرض کی شدت میں حضور کبھی اسے اتار دیتے تھے اور کبھی چہرے پر ڈال لیتے تھے اسی حالت میں آپ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ اس قوم پر لعنت کرے جس نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا۔"

اس معاملہ کا تصفیہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا۔ آپ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جو اسی جگہ دفن نہ کیا گیا ہو جہاں اس کی وفات ہوئی تھی چنانچہ فیصلہ ہوا کہ حضور ﷺ کی قبر اسی جگہ کھودی جائے جہاں آپ کی وفات ہوئی تھی۔

غسل

رسول اللہ ﷺ کو غسل آپ کے قریبی عزیزوں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، ان کے دونوں لڑکوں فضل رضی اللہ عنہ اور قثم رضی اللہ عنہ اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے دیا۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ ﷺ کے غلام شقران رضی اللہ عنہ بدن پر پانی ڈالتے جاتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ غسل دیتے جاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے جسم مبارک پر ایک قمیص تھی۔ بعض لوگوں نے اسے اتار دینے کا مشورہ دیا لیکن حضرت علی نے انکار کر دیا۔ غسل کے دوران میں حضور کے جسم سے برابر خوشبو آتی رہی۔ بعض مستشرقین نے اس کی یہ توجیہہ بیان کی ہے کہ حضور ﷺ اپنی زندگی میں اس کثرت سے خوشبو کا استعمال فرماتے تھے کہ وہ آپ کے جسم میں رچ گئی تھی۔ غسل کے بعد آپ کو کفن پہنایا گیا جو ایک دھاری دار اور دو یمنی چادروں پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ ایک قمیص پہلے ہی زیب تن تھی۔

رسول اللہ ﷺ کا آخری دیدار

تجہیز و تکفین مکمل ہونے کے بعد جنازہ کو چار پائی پر رکھ دیا گیا تاکہ عاشقان رسول ﷺ آپ کے آخری دیدار سے مشرف ہو سکیں مسلمان مسجد کی جانب سے حجرہ میں داخل ہوتے، حضور ﷺ کے چہرہ مبارک

Marfat.com

پر الوداعی نظر ڈالتے، آپ پر درود بھیجتے اور غم وحزن کے جذبات لئے ہوئے دوسرے دروازے سے نکل جاتے۔

رسول اللہ ﷺ کی نماز جنازہ

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز جنازہ پڑھنے کے لئے داخل ہوئے تو تمام حجرہ لوگوں سے بھر گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی نماز جنازہ صحابہ نے علیحدہ علیحدہ ادا کی۔ باجماعت نماز ادا نہیں ہوئی۔ جب حجرہ لوگوں سے بالکل پر ہو گیا اور خاموشی چھا گئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بلند آواز سے کہا:

"السلام علیک یا رسول اللہ و رحمۃ اللہ و برکاتہ...... ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے نبی اور رسول تھے آپ نے اپنے رب کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لئے اپنی پوری قوت صرف کر دی اور اس کے راستے میں اس وقت تک جہاد میں مشغول رہے جب تک اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو کامل فتح عطا نہ فرما دی۔ ہم اس بات پر بھی گواہ ہیں کہ اللہ کے رسول نے اپنے پروردگار کے ساتھ جو عہد باندھا تھا وہ پورا کر کے دکھایا اور لوگوں کو اس بات کی تلقین کی کہ وہ خدائے واحد و لاشریک کے ساتھ کسی کی پرستش نہ کریں۔"

مسلمان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہر جملہ پر بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ آمین کہتے تھے۔ جب مرد نماز جنازہ سے فارغ ہو گئے تو عورتیں آنی شروع ہوئیں۔ عورتوں کے بعد بچوں کی باری آئی اور انہوں نے بھی اپنے محبوب رسول ﷺ کے آخری دیدار کا شرف حاصل کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی جدائی کے باعث ہر شخص حسرت و یاس کی مکمل تصویر بنا ہوا تھا اور کوئی فرد و بشر ایسا نہ تھا جس کے چہرے سے اداسی اور بے چارگی نہ ٹپکتی ہو۔

سانحہ عظیم

حضور ﷺ کی وفات کے سانحہ عظیم کو ساڑھے تیرہ سو برس گزر چکے ہیں لیکن میں تو جب بھی اپنے ذہن میں اس واقعہ کا تصور کرتا ہوں مجھ پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ ذرا آپ بھی اپنے ذہن میں اس وقت کا نقشہ لائیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں وہ ہستی ابدی نیند سو رہی ہے جو کل تک تمام عالم کے لئے نور اور رحمت تھی اور جس نے لوگوں کو ضلالت اور گمراہی کے اتھاہ اندھیروں میں سے نکال کر ایمان اور یقین کی روشنی سے منور کر دیا۔ نیکی، رحم دلی، بہادری اور انصاف پسندی میں اس کا کوئی نظیر نہ تھا۔ اس کے عاشق جو زندگی میں پروانوں کی طرح اس کے گرد رہتے تھے، اب حسرت و یاس کی تصویر بنے ہوئے ایک ایک کر کے اس کے جنازے کے برابر میں سے گزر رہے ہیں۔ ان کے دل رنج و الم سے بھرپور ہیں اور یہ تصور کر کے ان کے دل بیٹھے جا رہے ہیں کہ یہ جسم اطہر جسے دیکھنے سے وہ نور اور سرور حاصل کرتے تھے، کل قبر کی آغوش میں

Marfat.com

پہنچ جائے گا اور اب کبھی وہ اس کی زیارت سے مشرف نہ ہو سکیں گے۔

قبائل عرب میں ارتداد کی لہر

جونہی رسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبر پھیلی، عربوں نے فوراً حکومت مدینہ کا جوا کندھوں سے اتارنے اور بعثت نبوی سے قبل کی بدویانہ وغیر ذمہ دارانہ زندگی گزارنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آناً فاناً عرب کے ہر قبیلے میں ارتداد کی لہر دوڑ گئی۔ نفاق کا ستارا اوج کو پہنچ گیا۔ یہودیوں اور نصرانیوں کی بن آئی اور چاروں طرف مسلمانوں کے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ اہل مکہ تک نے اسلام سے روگردانی اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا حتیٰ کہ عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو جو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مکہ کے عامل تھے، خوف کے مارے روپوشی اختیار کرنی پڑی۔ اس وقت سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے زبردست جرأت ایمانی کا ثبوت دیا اور انہوں نے اہل مکہ کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی وفات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا:

> اس واقعہ سے اسلام کی شان و شوکت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ جو شخص اسلام کے متعلق شک و شبہ کو اپنے دل میں جگہ دے گا، ہم اس کی گردن اڑا دیں گے۔"

پھر کہا:

> "اے اہل مکہ! تم وہ لوگ ہو جو سب سے آخر میں اسلام لائے، اب سب سے پہلے ارتداد اختیار کرنے والے نہ بنو۔ اللہ تعالیٰ اس دین کو ضرور غلبہ عطا فرمائے گا جیسا کہ وہ اپنے رسول سے وعدہ کر چکا ہے۔"

سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کی اس تقریر سے اہل مکہ کے متزلزل دل دوبارہ ثبات و قرار پکڑ گئے اور وہ بدستور اسلام پر قائم رہے۔

قبر کی کھدائی

عرب میں قبر کھودنے کے دو طریق تھے۔ ایک طریق اہل مکہ کا تھا۔ وہ صندوقی قبر کھودتے تھے۔ دوسرا اہل مدینہ کا تھا جو بغلی قبر کھودتے تھے مدینہ میں دو شخص قبر کھودنے کے ماہر تھے۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ جو اہل مکہ کے دستور کے مطابق قبر کھودتے تھے اور حضرت ابوطلحہ زید بن سہل رضی اللہ عنہ جو اہل مدینہ کے دستور کے مطابق قبر کھودتے تھے۔ لوگوں میں اختلاف پیش آیا کہ کس قسم کی قبر کھودی جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "اختلاف مناسب نہیں۔ دونوں صاحبوں کے پاس آدمی بھیجا جائے جو پہلے آ جائے وہ اپنے طریق کے مطابق قبر کھودے۔" لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا۔ چنانچہ حضرت عباس نے دونوں صاحبوں کے پاس آدمی بھیجے۔ اتفاقاً کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ گھر پر موجود نہ تھے۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ آئے اور ان ہی نے مدینہ کے رواج کے مطابق قبر کھودی جو لحدی یعنی بغلی تھی۔

Marfat.com

تدفین

نصف شب کے قریب جب مسلمان رسول اللہ ﷺ کے آخری دیدار سے فارغ ہو چکے تو اہل بیت نے حضور کو دفن کرنے کا ارادہ کیا۔ قبر میں انہوں نے وہ سرخ چادر بچھا دی جسے رسول اللہ ﷺ اوڑھا کرتے تھے۔ جن لوگوں نے آپ کو غسل دیا تھا انہیں ہی حضور کے جسد اطہر کو لحد میں اتارنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ لحد میں رکھ دینے کے بعد اسے کچی اینٹوں سے ڈھانپ دیا گیا اور پھر مٹی ڈال کر قبر بنا دی گئی۔ حضرت عائشہ ؓ اور حضرت فاطمہ ؓ کہتی ہیں کہ نصف شب کے قریب کدالوں کی آواز سن کر ہمیں معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو دفن کر دیا گیا ہے حضور کی تدفین ۱۴ ربیع الاول کی رات کو وفات سے دو روز بعد عمل میں لائی گئی۔

حضرت عائشہ ؓ جوارِ نبی میں

حضرت عائشہ ؓ بعد میں بھی اسی حجرہ میں مقیم رہیں جس کے ایک کونہ میں رسول اللہ ﷺ مدفون تھے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس ہمسائیگی کو اپنے لئے باعث فخر و سعادت سمجھتی رہیں۔ جب حضرت ابوبکر ؓ فوت ہوئے تو وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ اسی طرح حضرت عمر ؓ کو بھی وفات کے بعد اپنے دونوں ساتھیوں ہی کے پہلو میں جگہ ملی۔ روایت ہے کہ جب تک حضرت عمر ؓ حجرہ مبارک میں دفن نہیں ہوئے تھے حضرت عائشہ ؓ مزار مبارک کی زیارت کے لئے نقاب اوڑھے بغیر حاضر ہوا کرتی تھیں لیکن جب حضرت عمر ؓ وہاں مدفون ہوئے تو انہوں نے بے نقاب جانا چھوڑ دیا بلکہ جب جاتیں تو نقاب اوڑھ کر اور پورا پردہ کر کے جاتیں۔

لشکر اسامہ ؓ کی روانگی

رسول اللہ ﷺ کی تدفین کے معا بعد حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم کی تعمیل میں لشکر اسامہ کو شام روانہ ہونے کا حکم دے دیا۔ اس موقعہ پر بعض مسلمانوں نے حضرت اسامہ ؓ کی سرداری پر پھر وہی اعتراض کیا جو وہ رسول اللہ کی زندگی میں کر چکے تھے۔ اس مرتبہ حضرت عمر ؓ بھی مخالفین کے ہم نوا تھے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ فی الحال لشکر کی روانگی کو ملتوی کر دیا جائے کیونکہ چاروں طرف سے ارتداد کی خبریں آ رہی ہیں مبادا ایسا ہو کہ مدینہ کو خالی دیکھ کر دشمن اس پر چڑھ آئیں اور اگر لشکر کی روانگی رک نہیں سکتی تو کم از کم یہ ضرور کیا جائے کہ اسامہ ؓ کی جگہ کسی تجربہ کار، جہاندیدہ اور سن رسیدہ شخص کو لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا جائے۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے دونوں باتیں رد کر دیں اور اسامہ ؓ کو لشکر تیار کرنے اور جلد از جلد روانہ ہونے کا حکم دے دیا جب روانگی کا وقت آیا تو حضرت ابوبکر ؓ خود بھی بغرض مشایعت مدینہ سے باہر تشریف لے گئے۔ اس وقت انہوں نے حضرت اسامہ ؓ سے درخواست کی

Marfat.com

کہ وہ عمر رضی اللہ عنہ کو مدینہ ہی میں چھوڑتے جائیں تاکہ وہ امورِ سلطنت کی انجام دہی میں ان کی مدد کر سکیں۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے بڑی خوشی سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں رہنے کی اجازت دے دی۔ ابھی لشکر کی روانگی کو بیس روز نہیں گزرے تھے کہ مسلمانوں نے بلقاء کی سرحد پر حملہ کر دیا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے جنگ موتہ میں شہید ہونے والے مسلمانوں اور اپنے والد زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا خوب اچھی طرح انتقام لے لیا اور اس طرح اس ذمہ داری کو باحسن پورا کر دیا جو رسول اللہ ﷺ اور بعدازاں حضرت ابوبکر صدیق نے ان پر ڈالی تھی۔ جب یہ لشکر مدینہ واپس آیا تو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اپنے والد کے قاتل کے گھوڑے پر سوار تھے اور رسول پاک ﷺ نے جو علم انہیں مرحمت فرمایا تھا وہ اس گھوڑے کی زین سے بندھا ہوا تھا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی میراث طلبی

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں اور مطالبہ کیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جو زمین فدک اور خیبر میں تھی اس میں سے ان کا حصہ انہیں دے دیا جائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ہم انبیاء کی جماعت کسی شخص کو اپنے ترکہ کا وارث نہیں بناتے۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں اسے صدقہ سمجھا جائے۔"

پھر فرمایا:

"تاہم اگر آپ کے والد ﷺ نے یہ زمینیں آپ کے نام ہبہ کر دی ہوں تو میں آپ ہی کے فرمانے کے بموجب انہیں آپ کے حوالے کر دوں گا۔"

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا

"اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کہی لیکن ام ایمن رضی اللہ عنہا نے مجھے بتایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وہ زمینیں مجھے ہبہ کرنے کا ارادہ فرمایا تھا۔"

یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فدک اور خیبر کی زمینوں کو بیت المال میں داخل فرما دیا۔

رسول اللہ ﷺ کی روحانی وراثت

رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو یہاں کی فانی چیزوں میں سے کوئی چیز اپنے پیچھے چھوڑ کر نہ گئے۔ جس حالت میں آپ ﷺ دنیا میں آئے تھے، اسی حالت میں دنیا سے گئے البتہ تمام بنی نوع انسان کے لئے دین اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کی شکل میں ایک ایسا ورثہ چھوڑ گئے جس کے حیات بخش چشمہ سے پیاسی دنیا قیامت تک سیراب ہوتی رہے گی۔ آپ ﷺ نے توحید کو جو دنیا سے بالکل مٹ چکی تھی دوبارہ قائم فرما دیا اور بت پرستی کے تمام مظاہر کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔ آپ نے لوگوں کو ایک دوسرے کے

Marfat.com

ساتھ نیکی اور محبت سے پیش آنے اور ہر معاملہ میں تقویٰ کو ملحوظ رکھنے کی تلقین کی اور اپنے بعد کتاب اللہ کو انسانوں کے لئے ہدایت اور رحمت کے سرچشمہ کی حیثیت میں چھوڑا۔ آپ دنیا کے لئے کامل نمونہ تھے اور جو کچھ آپ نے کہا اس پر عمل کر کے بھی دکھا دیا۔

مرض الموت کے دوران میں ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

''اے لوگو! میں نے کسی کی پیٹھ پر کوڑا مارا ہو تو میری یہ پیٹھ حاضر ہے وہ مجھ سے اپنا انتقام لے لے، اگر میری زبان سے کسی شخص کے متعلق کوئی ناروا بات نکل گئی ہو تو وہ اسی طریق سے مجھ سے اپنا انتقام لے لے، اگر میرے ذمہ کسی شخص کا کچھ قرض ہو تو یہ میرا مال حاضر ہے اس میں سے وہ اپنی رقم لے لے، ایسے لوگوں کی طرف سے میرے دل میں ہرگز بغض اور کینہ پیدا نہیں ہوگا کیونکہ بغض اور کینہ رکھنا میری عادت نہیں۔''

اس پر ایک شخص نے کھڑے ہو کر تین درہم کا مطالبہ کیا اور آپ ﷺ نے کھڑے کھڑے اسے تین درہم دلوا دیئے۔ اس طرح آپ نے وہ عظیم الشان روحانی میراث چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے سفرِ آخرت اختیار کیا جو رہتی دنیا تک قائم و دوائم رہے گی اور جس سے دنیا کے ہر طبقہ اور ہر زمانہ کے لوگ حصہ حاصل کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد فرمائے گا اور اسے تمام دینوں پر غالب کر کے کفار کے لئے بغض و حسد کا سامان پیدا کر دے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے جو یقیناً پورا ہو کر رہے گا۔

آخر میں ہم رسول پاک ﷺ کی مقدس روح پر درود و سلام بھیج کر اس تذکرے کو ختم کرتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

❋ ❋ ❋

Marfat.com

مستشرقین اور مطالعہ سیرت

ڈاکٹر نثار احمد

ہمارے ہاں کے علمی اور دینی حلقوں میں مستشرقین کا نام اور ان کا کام اب خاصا مشہور و متعارف ہو چکا ہے اور فی زمانہ ایسے بالغ نظر علماء کی کمی نہیں ہے جو مستشرقین کی علمی مساعی، ان کے ''تحقیقی کارناموں'' اور ان کے مالہ و ماعلیہ سے واقف نہ ہوں۔ تاہم اسلامی علوم کے حوالے سے بالعموم، اور مطالعۂ سیرت کے حوالے سے بالخصوص، مستشرقین کے کام کی نوعیت، ان کے رویہ اور سلوک اور ان کی کیفیت وکمیت سے عام طور پر بے خبری پائی جاتی ہے۔ اور وقت کی ضرورت ہے کہ اردوداں طبقہ کے سامنے خاص طور پر، پورے مسئلہ کا ایک مفصل علمی جائزہ پیش کر دیا جائے۔

تعارف

واقعہ یہ ہے کہ مستشرقین کے بارے میں صورت حال اب پہلے سے بہت مختلف ہو چکی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اسلام پیغمبرِ اسلام ﷺ اور اہلِ اسلام کے لیے مستشرقین کا تعصب و تظلم اپنی انتہا پر تھا[1]۔ اور ان کی تحریروں میں بے باکی وگستاخی فحاشی کی حد تک پائی جاتی تھی جس سے بعضوں کو خود شرم آئی[2]۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ بحیثیت مجموعی، مختلف عوامل کے نتیجہ میں، شدت کم ہوتی چلی گئی، مختلف مکاتیبِ فکر وجود میں آئے اور انکشافِ حقیقت کے ساتھ ساتھ خود مستشرقین کے گروہ میں کچھ معتدل قسم کے مصنفین بھی شامل ہو گئے۔[3] یہاں تک کہ عہد جدید میں استشراق (Orientalism) اور مستشرقین (Orientalists) مسلم اور غیر مسلم دونوں کی تنقید کا نشانہ بنے ہوئے ہیں کہ انہوں نے اسلام اور دنیائے اسلام کو بہت غلط طور پر پیش کیا ہے۔ [4]نتیجتاً یہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ جو کچھ نظریات پہلے قائم کیے گئے تھے ان کو بالکل بدلنا ممکن نہ ہو، تو ان پر نظر ثانی بہر حال کی جانی چاہئے۔ [5]شاید یہی وجہ ہے کہ اب بعض مستشرقین نے اپنے نظریات واقعتاً تبدیل کر لیے ہیں۔[6] اور بعض جگہ حلقہ بگوشِ اسلام بھی ہو گئے ہیں۔[7]

آغازِ کار

دنیا کی مختلف زبانوں میں بالعموم اور انگریزی[8] اور عربی میں بالخصوص مستشرقین کے بارے میں

Marfat.com

بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مستشرقین کے علم و تحقیق کی نوعیت و حقیقت اپنے پرایوں سب پر کھلتی چلی جا رہی ہے۔ بلکہ پچھلے دو ایک عشروں میں تو انگریزی زبانوں میں بعض کتابوں کی اشاعت نے خود مغربی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا ہے۔[۹] اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی حالات، دنیا کے ہر حصہ میں بہت کچھ منقلب ہو چکے ہیں۔ علم و تحقیق کی بہت سی نئی راہیں دریافت ہو چکی ہیں اور بوڑھوں کے مقابلہ میں نوجوان نسل فکر و نظر کی نئی تبدیلیوں کی نقیب بنتی جا رہی ہے۔ انگریزی کے علاوہ عربی زبان میں بھی مستشرقین کے حوالہ سے بعض اہم کتابیں منصہ شہود پر آ چکی ہیں۔[۱۰] جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے تو تاریخی اعتبار سے جس طرح سیرت نگاری کے حقیقی دور کا آغاز سرسیّد احمد خاں ۱۸۹۸ء اور ان کے رفقاء سے ہوا[۱۱] اُسی طرح مستشرقین کے حوالہ سے بھی مطالعہ سیرت کا علمی محاذ بھی سب سے پہلے دراصل سرسیّد احمد خاں نے ہی کھولا، اور اس حقیقت کے باوجود کہ سرسیّد کے دینی افکار میں تجدّد کا رنگ نمایاں تھا، اور راسخ العقیدہ علماء کو اُن سے حد درجہ اختلاف تھا اور ہے، سرسیّد نے جذبہ ایمانی اور خالص جرأت رندانہ سے کام لے کر[۱۲] اپنے ہمعصر مستشرق سرولیم میور[۱۳] کی دل آزار تصنیف The Life of Mohammad[۱۴] (حیاتِ محمد ﷺ) کی اشاعت پر خاموشی کو گناہ کے برابر خیال کیا، اور تمام تر کم مائیگی کے باوجود، اہانت رسول کا خاموش بدلہ لینے کے لیے اپنا تن من دھن سب لگا دیا اور خالص علمی سطح پر میور کی کتاب پر تنقید و محاکمہ کر کے، مناظرانہ رنگ سے پاک، تاریخی حقائق و اسناد پر مبنی ایک جوابی کتاب ''الخطبات الاحمدیہ علی العرب والسیرت المحمدیہ'' لکھی۔[۱۵] اور یوں انیسویں صدی کے اواخر سے گویا مستشرقین کے مقابلہ میں ایک جوابی علمی تحریک کا آغاز ہو گیا۔ یہ بڑا اہم دور تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مستشرقین یورپ فی الواقع سیرت رسول ﷺ کے اصلی عربی مآخذ سے علمی طور پر واقف ہوئے اور پھر اُن ہی منظم کوششوں سے بہت سے مآخذ حلیہ طبع سے آراستہ ہو کر مسلمانوں تک پہنچے۔[۱۶] اسی دور میں مستشرقین نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ پر اپنے شدید حملے جاری رکھے اور تلاش کر کر کے مجروح اور ناقابلِ اعتماد روایتوں کو بطور سلاح استعمال کیا تا کہ مسلمانوں کے دلوں سے سیرتِ رسول ﷺ کا اعتبار اُٹھ جائے اور پھر اس کے نتیجہ میں آپ کا لایا ہوا دین بھی بے اعتبار و بے وقعت ٹھہرے۔

ابتدائی جائزہ

سرسیّد کی مخلصانہ کوششوں سے تحریکِ استشراق کے بالمقابل جس علمی تحریک کا آغاز ہوا تھا اُسے بعد میں مزید توسیع و ترقی حاصل ہوئی۔ اس سلسلہ میں اگرچہ مختلف بزرگوں نے قلم اٹھایا[۱۷] اور سیرت پر متعدد کتابیں لکھی گئیں، لیکن جو شہرت عام اور بقائے دوام علامہ شبلی م ۱۹۱۴ء کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آئی۔ علامہ شبلی کو یہ تقدم بھی حاصل ہے کہ انہوں نے محض چند مستشرقین کی انفرادی کوششوں کو ہی نشانہ

Marfat.com

تنقید نہیں بنایا بلکہ انہوں نے پورے گروہِ مستشرقین کو اپنے سامنے رکھا جو اسلام اور علوم اسلامی پر بالعموم اور سیرتِ رسول ﷺ پر بالخصوص طبع آزمائی کر رہا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ تحریکِ استشراق کے جواب میں علمی و تحقیقی کام کا ایسا نقشہ مرتب کیا کہ اگر ان کی زندگی وفا کرتی اور وہ اس کو عملی جامہ پہنا سکتے تو سیرۃ النبی ﷺ، مستشرقین کے اعتراضات و مطاعن کا بھی یادگار جواب بن جاتی۔ بہرحال مطبوعہ سیرۃ النبی ﷺ کے آغاز میں ہی اور باتوں کے علاوہ علامہ شبلی نے ''یورپین تصنیفات''[18] کے عنوان سے مستشرقین کی تصنیفات، ان کے اسباب و محرکات[19] ان کے اصولِ مشترکہ[20] اور ان کی مساعی کا عہد بہ عہد جائزہ لیا[21] اور پھر مشہور مستشرقین کی ایک مختصر فہرست بھی شاملِ کتاب کر دی۔[22] یہ تمام کام اپنے ابتدائی درجہ میں تنقیح طلب ہونے کے باوجود نہایت وقیع ہے۔[23]

علاوہ ازیں علامہ شبلی چونکہ اپنی کتاب سیرۃ النبی کو ایک دائرۃ المعارف بنانا چاہتے تھے۔[24] اس لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ مستشرقین کے مطالعہ سیرت کو معیارِ تنقید پر نہ پرکھتے اور نہ زیرِ بحث لاتے[25] بلکہ مستشرقین کی نام نہاد علمی تحقیقات کا پردہ چاک کرنا اور سیرت کے حوالہ سے ان کی غلط بیانیوں پر تنقید و تعقیب تو گویا منتہائے مقصود تھا۔[26] اور ان کی زندگی کی آخری خواہش۔[27] غالباً اسی لیے انہوں نے سیرۃ النبی کے مجوزہ خاکے میں ''پانچواں حصہ'' خاص یورپین تصنیفات کے متعلق شامل کیا تھا۔[28] جو اگرچہ پورا نہ ہوسکا۔ تاہم آنے والوں کے لیے روشنی چھوڑ گیا اور یہ ثابت کر گیا کہ خود مولانا شبلی مسئلہ مستشرقین کی گیرائی و گہرائی کا بہ حدِ غایت ادراک رکھتے تھے۔

افسوس کہ علامہ شبلی کے بعد مستشرقین کے حوالہ سے سیرتِ رسول ﷺ کے مطالعہ و تحقیق کا کوئی بڑا اور منظم کام سامنے نہیں آیا اور نہ ہی ہمارے ہاں کے سیرت نگاروں نے اس مسئلہ سے تعرض کو قرار واقعی اہمیت دی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اِکا دُکا انفرادی و اجتماعی کوششیں کی جاتی رہی ہیں اور اب بھی مقالات و مضامین اور کتابچوں وغیرہ کی شکل میں اس جانب کچھ نہ کچھ پیش رفت بہرحال ہو رہی ہے۔[29] مثلاً ایک مسلمان مصنف محمد حسین ہیکل کی کتاب ''حیاتِ محمد ﷺ'' کا تذکرہ بے محل نہیں معلوم ہوتا جو اگرچہ عربی زبان میں ہے لیکن اردو ترجمہ کے بعد گویا وہ اردو ادب کا ہی سرمایہ بن گئی ہے۔[30] ہیکل نے اپنے بیان کے مطابق نہ صرف یہ کہ ''جامدین عن المسلمین کے جمود آمیز خیالات کا رد کیا بلکہ مستشرقین کی ہرزہ سرائیوں کا مثبت انداز سے جواب دینے کے لیے کتاب بھی لکھی۔ ہیکل نے متن کتاب کے علاوہ اپنے طویل مقدمہ میں اور پھر بعد میں "المستشرقون والحضارۃ الاسلامیہ" کے تحت مستشرقین کی معاندانہ سرگرمیوں اور ان کے علم و تحقیق کا سنجیدہ علمی تجزیہ کیا ہے۔ اور مختلف عنوانات (مثلاً اسلام اور مسیحیت کی کشمکش[31]، مسیحی مصنفین کی نظر میں آنحضرت ﷺ کا مقام[32]، مسلمان مصنفین اور مغربی افترا پرداز مستشرقین[33] وغیرہ) کے تحت اصل حقائق کو نمایاں کیا ہے اور جرأت و قوت کے ساتھ مسیحی سوانح نگاروں کے مطاعن کا جواب دینے کی سعی کی ہے۔[34]

Marfat.com

نوعیّتِ مسئلہ

یہ جائزہ اگرچہ مختصر ہے لیکن یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ مستشرقین کی برپا کی ہوئی تحریکِ استشراق کا قرار واقعی جواب اردو زبان و ادب میں اب تک نہیں دیا گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سر سیّد احمد خاں نے جس جوابی علمی تحریک کا آغاز کیا تھا اور جسے شبلی نے منظم و مؤثر بنانے کی کوشش کی تھی، اس کا رنگ آہستہ آہستہ پھیکا اور آہنگ روز بروز مدھم ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اب سرگرمی نہ ہونے برابر ہے۔[۲۵] اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ادھر مغربی، یورپی مستشرقین کی سرگرمیاں تو لب و لہجہ کے فرق کے ساتھ تا حال جاری و ساری ہیں اور ان کے عزائم و مقاصد میں بھی سرِ مُو فرق نہیں آیا ہے۔[۲۶] لیکن ادھر ہماری طرف سے انتظام و اہتمام صفر ہے۔ مولانا شبلی وغیرہ نے مستشرقین کی عملی تحقیقات اور ان کے معیار کی جو نشان دہی کی تھی اور ان کی تصانیف کو جس طرح کذب و افتراء کا دفتر قرار دیا تھا اُس کا تقاضا تھا کہ مستشرقین کی کتابوں کو کھنگالا جاتا، اور تمام علوم اسلامی میں بالعموم اور سیرتِ رسول ﷺ کے باب میں بالخصوص واقفیتِ تامہ حاصل کر کے، ان کی غلطیوں، بددیانتی اور تلبیس و تحقیق کا پردہ چاک کیا جاتا، اور اس سلسلہ میں بڑے پیمانہ پر ایک منظم کام کا نقشہ بنایا جاتا مگر ایسا نہیں ہوسکا۔ بلکہ المیہ یہ ہوا کہ اس مسئلہ کی اہمیت و شدّت کو سمجھا ہی نہیں گیا نہ ایسے ادارے وجود میں آئے جو اعلیٰ سطح پر علم و تحقیق کی سرپرستی کر سکیں اور ان کی کوششوں کو متحد و منظم کر سکیں جو انفرادی و اجتماعی اور نجی و سرکاری مختلف پیمانوں پر کی جاتی ہیں۔ ہماری ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں اُس معیار کی عملی و فنی تیاری نہیں پائی جاتی جو مستشرقین کی طرۂ امتیاز ہے کہ مستشرقین کے حملوں کا دفاع محض عبارت آرائی یا جوابی الزام تراشی سے نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لیے اُسی تیاری کی ضرورت ہے جس قسم کی تیاری خود مستشرقین نے کی تھی (مثلاً علم و تحقیق کے اداروں کا قیام، مختلف زبانوں کی تحصیل، تجسس و تفحص کے آداب، فنی مہارت اور جدید تکنیک سے واقفیت، ادب و ثقافت کا گہرا مطالعہ، ضروری علوم و فنون سے دلچسپی، مشنری جذبہ، متعین مقاصد اور انتھک محنت و ریاضت وغیرہ) مستزاد یہ کہ مستشرقین کی تحریک کو ایک گونہ تقویت خود اُن مسلمان محققین و علماء کے رویہ سے مل رہی ہے جو دنیائے مغرب کے مختلف اداروں میں حصولِ علم و تحقیق کے لیے جاتے ہیں تو وہاں کے احوال و مناظر سے اس درجہ متاثر و مرعوب ہو جاتے ہیں کہ انہیں کے ہم آواز ہو جاتے ہیں۔[۲۷] اس لیے ضرورت ہے کہ جوابی علمی تحریک کو نئے سرے سے منظم کیا جائے اور مرحلہ اوّل میں مسئلہ مستشرقین کی نوعیت و حقیقت کو سمجھ لیا جائے اور یہ جائزہ لے لیا جائے کہ استشراق و مستشرقین کی تحریک، اس کے مقاصد، اسباب و محرکات، عہد بہ عہد ارتقاء اور اعلام و مشاہیر کی عام صورت کیا ہے۔ زیرِ نظر مقالہ کا مدعا یہی ہے۔

Marfat.com

استشراق، مستشرق

استشراق اور صاحبانِ استشراق (مستشرقین) کی پوری تاریخ پر ایک عمومی نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ استشراق اپنی حقیقت و ماہیت میں چونکہ اسلام کے خلاف ہے اور ہر دور کے (غیر مسلم) مستشرقین کی تمام سرگرمیاں، اپنے علمی تنوع کے باوجود، چونکہ اسلام، پیغمبرِ اسلام ﷺ، تاریخ اور اسلامی علوم و آداب کے حوالہ سے بہرحال معاندانہ رہی ہیں، اور چونکہ مستشرقین کی پوری جماعت میں شامل افراد، اپنی اصل و نسل میں یہودی ہیں یا عیسائی، اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اسلام اور یہودیت و عیسائیت کے مابین آویزش کے ساتھ ہی استشراقی جذبہ وفکر کی نمو ہو گئی تھی۔[۸] تاہم اپنے مخصوص فنی و اصطلاحی معنوں میں، اور اطلاقات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ تحریکِ استشراق کا باقاعدہ آغاز اور مستشرقین کی علمی و تحقیقی سرگرمیاں بہت بعد میں شروع ہوئیں۔[۹] شاید یہی وجہ ہے کہ:

(ا) استشراق (Orientalism) اور مستشرق (Orientalist) کی اصطلاحیں لغوی اعتبار سے بہت زیادہ قدیم العہد نہیں ہیں بلکہ انگریزی زبان و ادب میں ان کا استعمال اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں اٹھارھویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا۔[۱۰] چنانچہ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کی تصریحات کے مطابق مذکورہ بالا دونوں الفاظ Orient سے مشتق ہیں۔ جس کے معنی ہیں شرق، یا مشرق، یا مشرقی سمت، جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے۔[۱۱] پھر اسی سے Oriental ہے یعنی مشرقی، جو تمام معنوں میں مغربی (Occidental) کا ضد ہے۔[۱۲] مشرقی کے مفہوم میں وہ متوطن بھی ہے جو مشرق یعنی ایشیاء یا اُن ممالک کا باشندہ ہو، جو بحرِ روم متوسط اور قدیم رومی سلطنت کے مشرق میں واقع ہیں جبکہ Orientalism[۱۳] یعنی مشرقیت یا استشراق کے معنی ہوں گے، مشرقیت، مشرقی خصوصیات، مشرقی طرز و ادا، اقدار۔ علوم و آداب، اور فنون و ثقافت وغیرہ سے واقفیت و مہارت وغیرہ۔ نیز اس کے تحت Oriental scholarship کا مطلب ہوگا مشرقی زبانوں سے واقفیت (۱۸۱۱ء) اور پھر اس سے Orientalist (مستشرق) بنا ہے۔[۱۴] اس سے مراد وہ شخص ہوگا جو مشرقی زبانوں، علوم وفنون، آداب و ثقافت اور تہذیب و تمدن وغیرہ پر عبور رکھتا ہو۔ یا بقول مولوی عبدالحق صاحب ماہر مشرقیات ہو۔[۱۵]

(ب) عربی، فارسی اور اردو کی قدیم لغات میں استشراق کا اصل مادہ یعنی ش رق تو موجود ہے لیکن زیرِ بحث الفاظ، یعنی بابِ استفعال میں اس کے معنی و مفہوم یا بطور فعل ان لغات سے بحث نہیں پائی جاتی (البتہ جدید لغات میں ان کا ذکر موجود ہے)۔

عربی قواعد کی رُو سے استشراق، ثلاثی مزید کا باب استفعال ہے، جس کا مادہ ش۔ر۔ق (شرق ہے۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس باب کے جملہ خصائص ولوازم یعنی اتخاذ وطلب، وجدان و حسبان، اور تحول

Marfat.com

وتکلف وغیرہ کی جلوہ نمائی، صاحبانِ استشراق کے احوال وشخصیات سے، اور ان کی تحقیقات وتخلیقات میں بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ گویا الفاظ کا پیکر، بجائے خود اس بات کا مظہر ہے کہ مستشرقین کا علم تمام تر اکتسابی ہے جسے انہوں نے بڑی محنت وریاضت سے، طلب وجستجو کر کے حاصل کیا، اُس کی خاطر سفر وحضر، تمکّن و توطن اختیار کیا اور پھر اپنی تحقیقات کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ اُن میں تخمین وظن اور تخیل سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ عربی میں ''استشراق کے لغوی معنی ہوں گے بہ تکلف مشرقی بننا، اور مستشرق کا مطلب ہوگا وہ شخص جس نے بہ تکلف مشرقیت اختیار کی یا مشرقی بنا ہو''۔[۴۶] اردو لغت میں بھی کم وبیش یہی مفہوم ہے یعنی مستشرق کا مطلب ہوگا ''وہ فرنگی جو مشرقی زبانوں اور علوم کا ماہر ہو''۔[۴۷] یا وہ فرنگی یا امریکانی جو مشرقی زبان یا علوم کا ماہر ہو''۔[۴۸]

زبان ولغت کی مندرجہ بالا بحث سے استشراق اور مستشرق کا مفہوم اگرچہ کسی قدر واضح ہو جاتا ہے اور مستشرق کی نوعیت و ماہیت بھی بڑی حد تک سمجھی جا سکتی ہے، تاہم استشراق کی اصل حقیقت اس وقت سامنے آئی جبکہ استشراق، السنۂ مشرقیہ کی واقفیت اور اسلامی علوم وآداب کے یک رُخی مطالعہ تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ آگے بڑھ کر اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ سے بغض وعناد، اس کا جزوِ لازم ٹھہرا، پھر یہی بغض و عناد، پہلے پہل تو مشنری جذباتیت کا آئینہ دار رہا لیکن کچھ عرصہ بعد اُس نے متعین[۴۹] مقاصد کے تحت علمیت کا لبادہ اوڑھ لیا۔ گویا اس دوسرے مرحلہ میں استشراق نے ایک تحریک، ایک مستقل رویہ اور سلوک (Discipline) کی شکل اختیار کر لی۔ اور اس رویہ اور سلوک کے احاطہ میں رہتے ہوئے تمام ضروری مباحث کو موضوعِ سخن بنایا گیا، مثلاً اسلام اور اس کی تعلیمات کو مجبوراً یا تکلفاً غلط طور پر پیش کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ زمانے کے عہد بہ عہد ارتقا کے ساتھ وہ تعلیمات ہم آہنگ نہیں ہوسکتیں۔ قدیم تہذیبوں، قدیم زبانوں کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے مصر، عراق، شمالی افریقہ اور دوسرے علاقوں میں سرگرمیوں کو منظم کیا گیا تاکہ یہ تہذیبیں اسلامی تہذیب وتمدّن کے لیے چیلنج بن سکیں۔ عربی زبان کے لیے کہا گیا کہ قرآنی عربی عہدِ جدید کی ضروریات وحالات سے مطابقت پیدا نہیں کرسکتی اس لیے مقامی زبانیں اور مردہ لغات کو آگے بڑھانا چاہیے بلکہ عربی رسم الخط کو رومی رسم الخط سے تبدیل کر دینا چاہیے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سیرت و کردار کے بارے میں اُن نکات کو اچھالا گیا، جن سے عام ذہن کے لوگ بھی اچھا تاثر نہ لے سکیں اور ان کے لائے ہوئے مشن کو ناقابلِ التفات گردانا جائے، اسلامی تہذیب وثقافت کی تعمیر وترکیب میں بیرونی عناصر کی کارفرمائی ثابت کی جائے تاکہ اسلامی ثقافت مجموعہ خرافات ٹھہرے[۵۰] وغیرہ وغیرہ، ان تمام مطالعات کا ہدف بہرحال مستشرقین کے نزدیک اپنے عزائم کی تکمیل کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ حکمتِ عملی تبدیل ہوتی رہی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مستشرقین جذباتیت کے تنگ دائرہ سے نکل کر عقلیت، علمیت اور استدلال کے اوزان و پیمانے استعمال کرنے لگے، اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ

کے متعلق اپنے رویہ پر انہوں نے خود نظرِ ثانی کی اور بد نیتی کے باوجود مخالفت و مخاصمت کا اظہار رفتہ رفتہ سلیقہ سے کیا جانے لگا اور اسلام کے مقابلہ میں تعصب و تظلم کا پھیلاؤ بھی نسبتاً کم ہوتا گیا۔

مختصر یہ کہ مستشرقین کا رویہ ہر زمانے میں یکساں نہیں رہا اور اسی لیے ان کے ہاں علم، تجربہ، اندازِ استدلال، مذہبی حیثیت اور وابستگی کے مختلف نمونے نظر آتے ہیں اور اسی لحاظ سے اُن کے فکر و فن اور تحقیق و تالیف کا معیار بھی جدا جدا ہے۔[۵۱]

ممکن یہ اجمالی گفتگو کسی ذہنی اشکال کا سبب ہو اِس لیے اس اجمال کی کچھ تفصیل آئندہ صفحات میں عرض کی جائے گی تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ استشراق جذبہ و فکر سے آگے بڑھ کر تحریک کیسے بنا اور مطالعہ و تحقیق کے مختلف دائروں میں مستشرقین کا رویہ و سلوک کیا رہا۔

تحریکِ استشراق کا آغاز

تحریکِ استشراق کو اگر خلافِ اسلام سرگرمیوں کی علامت مانا جائے تو یہ امرِ واقعہ ہے کہ اس قسم کی سرگرمیوں کا آغاز دراصل ظہورِ اسلام کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔[۵۲] اور باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کرنے سے پہلے بھی، اہلِ مغرب کی طرف سے، اسلام کے خلاف بالعموم اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے خلاف بالخصوص، بغض و عداوت کا اظہار موقع بہ موقع، تاریخ کے مختلف ادوار میں ہوتا رہا، اور وفورِ جذبات سے سرشار، رومی، بازنطینی، لاطینی، مسیحی اور یہودی روایتیں صدیوں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں، افواہوں کے دوش پر سفر کرتی رہیں۔ اور کبھی کبھار تحریر و تصنیف اور وقائع و اسفار کے قالب میں ڈھلتی رہیں اور ان کی اپنی آئندہ نسلوں کا سرمایۂ افتخار قرار پائیں۔ چنانچہ ظہورِ اسلام کے بعد سے کوئی چار ساڑھے چار سو سال تک اسلام اور بانیٔ اسلام ﷺ کے حوالہ سے اُن کی مخالفت و مخاصمت کا عام انداز یہی رہا۔ اور اِس تمام عرصہ میں بلکہ اس کے بعد بھی، مغربی دنیا اس قابل نہ ہو سکی کہ حقائق و واقعات کا صحیح ادراک کر سکے اور مسلمانوں کی تاریخ و ثقافت کو علم کی روشنی میں جان سکے۔ اِس صورت حال کا ایک بظاہر سبب، ان کے دلی جذبات کے علاوہ یہ تھا کہ صحیح معلومات کے لیے اصل اسلامی آخذ تک رسائی ممکن نہ تھی، پھر تعصب، سُنی سنائی باتوں، غلط فہمیوں اور خود ساختہ مفروضات نے انہیں اس قابل ہی نہ رکھا کہ وہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی حقیقی تصویر دیکھ سکیں۔ اس پر مستزاد تصادم و کشمکش کے وہ واقعات تھے جو تاریخ میں بار بار دُہرائے گئے۔[۵۳] خاص طور پر آنے والے زمانے میں صلیبی[۵۴] محاربات کا سلسلہ دشمنی و عداوت کا ایسا نشہ ان پر طاری کر گیا ہے جو آج تک نہیں اُترا۔ صلیبی جنگوں کے طویل محاربات میں دنیائے مغرب کی ناکامی سے نہ صرف یہ کہ یورپ کی مشترکہ عسکری قوت پاش پاش ہو گئی بلکہ یہی شکست اس بات کا زبردست محرکہ بن گئی کہ جنگی محاذ پر پسپا ہونے کے بعد ذہنی و فکری محاذ پر اسلام اور دنیائے اسلام کو زک پہنچائی جائے۔

Marfat.com

اس کی تدبیر اس سے بہتر اور کوئی نہ تھی کہ اسلام، اسلامی عقاید، پیغمبرِ اسلام ﷺ اور اسلامی معاشرہ کو ہدفِ تنقید بنایا جائے۔ چنانچہ اس کام کے لیے جذباتی طوفان پہلے سے موجود تھا، پھر لاطینی آبادکار اور مسلم علاقوں سے آئے ہوئے عیسائی اور یہودی، اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو کچھ علم، معلومات رکھتے تھے وہ کتنی ہی خام و ناکارہ سہی، ان کے لیے، بہرحال مفید مطلب تھیں، جن کی مدد سے اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی (خاکم بدہن) ایک نفرت انگیز، کریہہ المنظر اور بھیانک تصویر پیش کی جاسکتی تھی۔ اور سیرت ختم الرسل ﷺ کو افراط و تفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیالی اور قیاسی انداز سے پیش کیا جاسکتا تھا۔ مختصر یہ کہ اس پورے عرصہ میں بحیثیت مجموعی، پیغمبرِ اسلام ﷺ کے بارے میں، مغرب کے پاس معلومات انتہائی ناقص اور مبہم تھیں اور اس خلا کو افسانہ طرازی اور دیومالائی کہانیوں سے پُر کیا گیا۔ اس افسانوی مواد کے بھی دو حصے تھے۔ ایک حصہ تو وہ تھا جس کے تحت آنحضرت ﷺ کے واقعاتِ سیرت کو پیکرِ خیال میں پیش کیا گیا، اور دوسرا حصہ وہ تھا جس کی اپنی کوئی اصل اور حقیقت نہ تھی بلکہ وہ مغربی ذہن کی ایجاد و اختراع اور کذب و افتراء سے عبارت تھا۔[۵۵] اس عہد میں آنحضرت ﷺ کے لیے حد درجہ اہانت آمیز الفاظ استعمال کیے گئے۔ مثلاً (نقل کفر، کفر نہ باشد) آپ کو نبی کاذب، مخالفِ مسیح، موجدِ مذہبِ نو اور بہروپیا کہا گیا۔ اور بہر عداوت اس حد تک گر گئے کہ آپ ﷺ کے لیے محمد ﷺ استعمال کرنے کے بجائے Mahound سے تعبیر کیا گیا جس کے معنی ہیں ''شہزادۂ تاریکی''۔ پھر جب صلیبی جنگوں کی ناکامی نے ان کی آتشِ عداوت اور بھڑکا دی تو وہ حضور ﷺ کے لیے Baphomet، Maphomet اور Bafum کے الفاظ استعمال کرنے لگے۔ اور آپ ﷺ کی سیرت و سوانح کے بارے میں مہمل کہانیاں، دیومالائی قصے اور بے سروپا باتیں مشہور کی گئیں۔ ایک خیال یہ پھیلایا گیا کہ مسلمان دراصل کچھ زیادہ ہی بُت پرست (Pagan) تھے اور ان کا مرکزِ پرستش محمد ﷺ کا بُت تھا۔ پھر ایک سے زائد تین بتوں کی پرستش کرنے کا فسانہ تراشا گیا اور یہ انکشافِ حقیقت کیا گیا کہ ''آنحضرت ﷺ تو دراصل خود پیرو دینِ عیسوی تھے لیکن پوپ منتخب نہ ہوسکے تو انتقاماً رومی چرچ سے بغاوت کر کے اسلام ایجاد کرلیا۔'' وحی و تنزیل کے حوالہ سے یہ افسانہ تراشا گیا کہ محمد (ﷺ) نے ایک سفید کبوتر، فاختہ یا قمری (Dove) کو سدھا رکھا تھا جو ان کے کندھے پر بیٹھا اُن کے کان سے دانے چگا کرتا تھا جس سے ان کے خیال میں یہ آتا تھا کہ فرشتہ ان سے باتیں کرتا ہے اور دوسروں کو بھی یہ تاثر دیتے تھے کہ ان پر وحی نازل ہو رہی ہے۔[۵۶]

ان مثالوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مغربی علماء و مستشرقین صدیوں کیسی شدید ناواقفیت کا شکار رہے۔ وہ کیسی کیسی خرافات روایات کو ان کے بڑے بڑے علماء سیرت و سوانح کے نام پر پھیلاتے رہے اور اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی کیسی نفرت انگیز تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے۔

اس قسم کی تصویر کشی میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان کے نام تو بہت ہیں۔[۵۷] لیکن یہاں تفصیل کا

موقع نہیں ہے البتہ ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر جان آف دمشق ہے۔[۵۸] جان کو بازنطینی روایات کا بانی سمجھا جاتا ہے۔[۵۹] اسلام اور آنحضرت ﷺ کے خلاف نفرت اور دشمنی کی آگ پہلے اُسی نے بھڑکائی۔ جان اور اُس کے پیروؤں نے (نعوذ باللہ) آنحضرت ﷺ کو بے دین اور جھوٹا نبی قرار دیا۔ اُس کا دعویٰ یہ بھی تھا کہ اسلام میں محمد ﷺ کی پوجا کی جاتی تھی۔ نیز جان ہی وہ پہلا مشنری تھا جس نے حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس پر جنسی وشہوانی الزامات کی بھرمار کر دی۔[۶۰] اس نے حضور ﷺ کو نبی کی حیثیت دینے کے بجائے بنیادی طور پر ملحد، بدعتی اور گمراہ (Heratic) قرار دیا (نعوذ باللہ) اور اسلام کا تعارف ایک نبی کاذب کے بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے کرایا اور یہ نکتہ پیش کیا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس اللہ کا فرستادہ ہونے کی کوئی سند نہیں تھی۔[۶۱] جان کے بعد آنے والے قرونِ وسطیٰ کے تمام مصنفین نے بھی جان کا تتبع کرتے ہوئے تصویرِ رسول ﷺ کو خوب بگاڑا۔ گھسے پٹے الزامات واتہامات عائد کیے اور چبائے ہوئے نوالوں کو پھر سے چبایا۔ اُس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کے مآخذ (Sources) کم وبیش یکساں تھے۔[۶۲] اس لیے جب بھی انہوں نے سیرت وسوانح رسول ﷺ پر قلم اٹھایا، یا اپنا موضوعِ سخن بنایا تو نظم ہو یا نثر، دونوں میں سیرت ختم الرسل ﷺ کو افراط وتفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیال وقیاس کے سہارے پیش کیا۔[۶۳] اس تفصیل کا مدعا یہ ہے کہ ظہورِ اسلام کے بعد کئی صدیوں تک بھی مسیحی نفرت وعداوت کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی اور اہلِ مغرب آنحضرت ﷺ کو بدستور جھوٹا، بہروپیا، دھوکا باز، مکار اور شیطان کا چیلا قرار دیتے رہے تھے کہ اتنے میں صلیبی جنگوں کے طویل سلسلہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ صلیبی جنگوں میں صلیب سرنگوں ہوگئی اور تمام تیاریوں کے باوجود دنیائے اسلام کو زک پہنچانے کا منصوبہ ناکام ہوا، اور انہوں نے دیکھ لیا کہ میدانِ جنگ میں رسد، کمک اور سامانِ جنگ کی فراوانی کے باوجود وہ مسلمانوں کا زیادہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے، تو پھر انہوں نے کمال عیاری سے اسباب، وسائل اور تدبیر وحکمتِ عملی کو یکسر بدل ڈالا اور گویا یہ فیصلہ کر لیا کہ جنگ جیتنے کے لیے نیا ترکش، نئے تیر استعمال کیے جائیں اور ''گرم جنگ'' نہ سہی، ''سرد جنگ'' میں مسلمانوں کو زیر کیا جائے اور یہ سرد جنگ ''مادی'' ہتھیاروں سے نہیں، علم وتحقیق کے ''معنوی'' ہتھیاروں سے لڑی جائے۔ شاید اس لیے رائمنڈ لل (Rayomond Lull) نے اہلِ مغرب کو سب سے پہلے مشرقی علوم کی تحصیل پر آمادہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''ایک پُرامن صلیبی جنگ جاری رکھی جائے جس کے اسلحہ خالص روحانی ہوں۔''[۶۴]

اس سلسلہ میں اہلِ مغرب کو دو قسم کی سہولتیں حاصل تھیں۔ ایک طرف تو یہ کہ ان کے اپنے اسلاف نے مشرق، مغرب دونوں جگہ ذہنی پس منظر تو پہلے سے تیار کر رکھا تھا اور گزشتہ کئی صدیوں میں، اسلام، پیغمبرِ اسلام ﷺ اور دنیائے اسلام کے بارے میں، مہمل خیالات، بے سروپا قصے کہانیوں، بیہودہ الزامات و اتہامات اور تشکیک وتذبذب کے بیج بو کر، خرافات کا ایسا جنگل اُگا دیا تھا، جسے کاٹنا آسان نہ تھا، برسہا برس کے پروپیگنڈے نے مغربی ذہن کو اسلام دشمنی کے معاملہ میں ویسے ہی راسخ کر دیا تھا۔ دوسری طرف انہیں

Marfat.com

یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ اُس زمانے میں مسلمان علم وفن کے دائروں میں جو ترقیاں کر رہے تھے، اس کے سبب یونانی علوم وفنون کی سینکڑوں کتابیں ترجمہ کے ذریعہ عربی میں منتقل ہو چکی تھیں اور یوں اُن کے اپنے آباؤ اجداد کا وہ علمی ورثہ جس سے وہ پہلے خود بھی زیادہ واقف نہ تھے، عربی میں محفوظ ہو چکا تھا۔[65]

علاوہ ازیں علوم وفنون اور آداب ومعافر کے اسلامی مراکز سے اخذ واستفادہ کے لیے، اور اندلس و صقلیہ میں مسلمانوں کے اسلاف کی روشن کی ہوئی شمعِ عرفان وحقیقت کی روشنی سے اپنے آپ کو مستنیر کرنے کے لیے بھی عربی زبان میں مہارت اور اسلامی علوم وثقافت سے واقفیت بالکل ناگزیر تھی۔[66] چنانچہ سولھویں صدی عیسوی میں بالآخر وہ مرحلہ آ گیا جبکہ ایک طرف تو عیسائیوں کے مختلف فرقوں کا اتحاد ہوا، سب نے مل کر اسلام کو اپنا واحد مشترک دشمن قرار دیا اور ایک متحدہ رومی کیتھولک چرچ کی بنیاد رکھی گئی۔[67] اور دوسری طرف یہ طے کیا گیا کہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے خلاف جس محاذ پر پہلے صرف عیسائی، یہودی، راہب، پادری، قصہ گو، مناظر، شاعر وغیرہ ڈٹے ہوئے تھے، اب اُن کی جگہ مغربی دنیا کے وہ عقلائی، فضلاء لیں گے جو کلاہِ علمی سے آراستہ ہوں گے اور درس وتدریس کی مسندوں پر فائز ہو کر دادِ تحقیق دیں گے، تاکہ اُدھر اُن کے اَن دیکھے جذباتِ نفرت وعداوت بھی تسکین پائیں اور اِدھر علم وتحقیق کے حوالے سے ان کا رعب ودبدبہ قائم ہو جائے۔

چنانچہ یہی ضرورتیں گیام پوسٹل (Guillaume Postal) کو سامنے لائیں،[68] جو عام طور پر مستشرقینِ یورپ کا باوا آدم شمار ہوتا ہے۔ وہ پہلا اصولی مستشرق تھا جس نے تحریک استشراق کو منظم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا اور بطور خاص لغت اور لسانیات کے حوالہ سے اہم خدمات انجام دیں۔[69] پوسٹل ہی کے لیے ۱۵۳۹ء میں کلیہ فرانس (College de France) قائم کیا گیا۔[70] اور وہ عربی کی پہلی کرسیِ صدارت پر فائز ہوا۔ گیام پوسٹل کے کام کو لغت ولسانیات کے ہی مکرر حوالے سے اُس کے لائق وفائق شاگرد جوزف اسکالیجر (Joseph Scaliger) نے آگے بڑھایا۔[71] بہرحال کم وبیش پینتالیس سال کی تیاری کے بعد ۱۵۸۶ء میں عربی مطبوعات کا سلسلہ یورپ میں شروع ہوا۔ جس کا سہرا بڑی حد تک ڈیوک آف تسکانی (Duke of Tuscany) کے سر ہے۔[72]

اوپر کی تفصیل سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ یعنی:

(ا) یہ کہ سولھویں صدی عیسوی کو ہم باقاعدہ طور پر تحریکِ استشراق یا Orientalism کا سرِ آغاز قرار دے سکتے ہیں۔ یہی وہ دور ہے جبکہ مستشرقینِ یورپ نے کام کا مربوط ومنظم نقشہ مرتب کیا۔

اور یہ کہ:

(ب) اس تحریک کی شروعات خالص مسیحی مشنری اور کلیسائی پس منظر میں ہوئی، جس کا اثر تاریخ مابعد پر جاری وساری رہا۔ کیونکہ مستشرقین کا خانوادہ چرچ (کلیسا) کا ہی پروردہ تھا۔[73]

Marfat.com

تحریک کا ارتقاء

تحریکِ استشراق کے حوالہ سے ۱۷ ویں اور ۱۸ ویں صدی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ زمانہ تحریک کے ارتقائی، اُس کے پھلنے پھولنے کا عہد ثابت ہوا۔ جہاں تک ۱۷ ویں صدی عیسوی کا تعلق ہے۔ بقول مولانا شبلی یہ صدی یورپ کے عصر جدید کا مطلع ہے۔[۷۴] اور یورپ کی جدّ و جہد، سعی و کوشش اور حریت و آزادی کا دور اسی عہد سے شروع ہوتا ہے۔[۷۵] پھر یہ عروجِ استعمار کی صدی ہے، جس کے پنجہ استبداد میں رفتہ رفتہ عالمِ اسلام آتا چلا گیا۔ یورپی شہزادوں کی سرپرستی میں اسلامی مطبوعات کے بارے میں معلومات جمع کی جانے لگیں۔ عربی زبان کی ماہیت و خاصیت کو سمجھنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ارپی نیس (Erpenius 1584-1624) نے پہلی عربی کی قواعد شائع کی، جو لغوی اصولوں پر مرتب کی گئی تھی۔ پھر اُس کے اتباع میں اُس کے شاگرد جیکب جولیس (Jacob Goluis 1596-1667) نے بھی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔[۷۶]

اور پھر ۱۶۳۸ء میں ایڈورڈ پوکاک[۷۷] (Edward Pococke 1604-1691) پہلا انگریز مستشرق تھا جسے آکسفورڈ میں شعبہ عربی کا صدر نشین بنایا گیا۔[۷۸] مزید برآں عربی زبان کی قواعد اور لغت کی ترتیب کا کام آسٹریا کے میرنسکی (Lorriunuer Franz Meurnski) نے بھی ۱۶۸۰ء میں انجام دیا۔ اس کے علاوہ اسلامی علوم اور تہذیب و تمدّن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک ادارہ ڈی ہربیلوٹ (D'Herbelot) کی سرکردگی میں قائم کیا گیا۔ اس ادارہ نے ایک اہم کام یہ کیا کہ اس وقت تک جس قدر بھی مشرقی علوم پر کتابیں شائع ہوئی تھیں، ان کی ایک باقاعدہ فہرست مرتب کر کے شائع کر دی جو بڑی معلومات افزا تھی۔ اسی ادارہ کے تحت آنحضرت ﷺ پر ایک کتابچہ بھی شائع کیا گیا۔[۷۹]

سترھویں صدی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بقول مولانا شبلی سنے سنائے عامیانہ خیالات کے بجائے کسی قدر تاریخ اسلام و سیرت پیغمبر ﷺ کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی۔ گو موقع بہ موقع معلوماتِ سابقہ کے مصالحہ کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔[۸۰] اس صدی میں مستشرقین کے رویہ اور سلوک میں اس تبدیلی اور فرق کی اصل وجہ گویا ان کے مآخذ (Sources) کے بدل جانے میں مضمر تھی۔ ازمنہ وسطیٰ کے روایتی لاطینی اور بازنطینی مواد کی سیاہیوں میں اسلامی اور عربی مصادر نے روشنی پیدا کی اور انہوں نے اس تضاد کو بھی سمجھ لیا جو سیّاحوں کے سفرناموں کے اندراجات، ان کے تصورات اور اصل حقائق کے مابین پایا جاتا تھا۔[۸۱] اس عہد میں بھی حسب سابق مطبوعات اور تصنیفات بہت کم ہیں۔[۸۲] البتہ جو مستشرقین، مطالعہ سیرت رسول ﷺ کے حوالے سے سامنے آئے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں:

(۱) ولیم بیڈول (Bedwell.W) انگریز مستشرق تھا۔ جس کا زمانہ ۱۵۶۱ء تا ۱۶۳۲ء ہے۔ اُس

Marfat.com

کے آثار و باقیات میں دو کتابیں قابلِ ذکر ہیں۔ ایک عربی لغت جو سات جلدوں میں ہے اور ۱۶۱۰ء سے پہلے شائع ہوئی اور دوسرے سیرت رسول پر کتاب جو لندن سے ۱۶۱۵ء میں شائع ہوئی۔[۸۳] سیرت کی کتاب نہایت گستاخانہ ہے اور نہایت بے باکی سے کام لیتے ہوئے اُس کا نام ہی "محمد کاذب" (Mohammadis Imposturae) (نعوذ باللہ) رکھا گیا ہے۔[۸۴]

(۲) واٹیئر (Vattier,P) فرانسیسی مستشرق تھا۔ اس کا زمانہ ۱۶۱۳ء تا ۱۶۶۷ء تھا۔ عربی میں مہارت حاصل کرنے کے بعد بڑی کثرت سے فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔[۸۵]

(۳) ہاٹنجر (Hottinger, J.H) سوئٹزرلینڈ کا ایک مستشرق (۱۶۲۰ء تا ۱۶۶۷ء) اُس کے باقیات میں مشرقی تصانیف کی ایک فہرست (مطبوعہ ہائیڈلبرگ ۱۶۵۸ء) قابلِ ذکر ہے۔[۸۶]

(۴) ڈاکٹر ہنری اسٹب (Dr. Henry Stubbe) سترھویں صدی کا مشہور مستشرق بہ زمانہ (۱۶۳۱ء تا ۱۶۷۶ء)۔ اُس کی مشہور کتاب (جو پہلے پہل لندن سے ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی)[۸۷] کا نام ہے:

An Account of the rise and progress of Mohammtanism کہا جاتا ہے کہ اگر اِس کی کتاب کی کچھ تاریخی غلطیاں نظرانداز کر دی جائیں، تو اسے سیرتِ رسول ﷺ کی ایک معقول و معتدل تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور جیسا کہ اُس کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کتاب گویا مغرب کی جانب سے سیرتِ رسول ﷺ کے بارے میں اولین اعتذار ہے۔ اِس کتاب میں اسٹب نے نہ صرف یہ کہ اُس رویہ کا جائزہ لیا ہے جو پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ مسیحی مصنفین نے پہلے اختیار کر رکھا تھا[۸۸] بلکہ اُن مصنفین کی تصویر کو اُس نے مکروہ قرار دیا ہے جو اُنہوں نے اخلاق و کردارِ نبوی ﷺ کی کھینچی تھی[۸۹] اور انتہائی عالمانہ شان سے یہ اقرار کیا ہے کہ "اِس آسمان کے نیچے سوائے محمد ﷺ کے کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو تمام دنیائے انسانیت کی مرکزِ توجہ بنی ہو کہ اپنے تو اُس پہ عقیدت کے پھول نچھاور کریں اور غیر اُسے نگاہِ آتشیں سے دیکھیں، مشرق میں اُسے سراہا گیا، لیکن مغرب نے التفات نہ کیا"۔[۹۰]

دوسرے مستشرقین میں سے جین بررڈ (Genebrard) کا زمانہ اگرچہ (۱۵۳۵ء تا ۱۵۹۷ء) تھا لیکن اُس کا موقف تقریباً سترھویں صدی میں عام ہوا۔ وہ ایک مشہور کیتھولک مناظرہ باز تھا۔ جین بررڈ کو سب سے بڑا اعتراض اس بات پر تھا کہ حضور ﷺ نے قرآن کو عربی میں کیوں لکھا؟ وہ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ قرآن کو عبرانی، یونانی اور لاطینی جیسی خالص مہذب زبانوں میں کیوں نہیں لکھا گیا؟ پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ اس لیے کہ "محمد (خاکم بدہن) خود ایک حیوان (جانور، چوپایہ) تھے اور صرف ایک ہی حیوانی (وحشیانہ) زبان (عربی) جانتے تھے، جو اُن کے مخصوص وحشیانہ ماحول سے عین مطابقت رکھتی تھی۔[۹۱] اس لیے، اس کے نقطۂ نظر کے مطابق، قرآن عربی جیسی وحشی زبان میں لکھا گیا۔ (نعوذ باللہ)

Marfat.com

۱۶۵۳ء میں الیگزینڈر روس (Alexander Ross) نے اپنی جو کتاب Pandeblis شائع کی وہ اگرچہ تقابلِ ادیان کے حوالے سے سامنے آئی لیکن اس کے ایک حصہ میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے بارے میں کچھ بہتر مواد پایا جاتا ہے حالانکہ اس کی پہلی کتاب A brief sketch of the life and death of Mahomet, the prophet of the Turks, and author of the Al-coran accompanying the translation of the Koran. قرونِ وسطیٰ کے روایتی خرافاتی مواد، قصے کہانیوں اور زہریلے معاندانہ مواد پر مشتمل تھی۔[۹۲]
لینسلوٹ ایڈیسن (Lancelot Addison) نے ۱۶۷۸ء میں اپنی کتاب The first state of Mohammetanism or an account of the author and doctrines of the imposture کے نام سے شائع کی لیکن اگلے سال یہی کتاب نئے عنوان the life and death of Mohammad (حیات و ممات محمد ﷺ) سے سامنے آئی۔[۹۳] مگر اس کے مصادر حسبِ معمول لاطینی خرافات تھے۔ آنحضرت ﷺ کے خلاف اُسے سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اپنی کتاب'' قرآن'' کو اپنی زندگی میں شائع نہیں کیا تھا''۔[۹۴] ایک اور مستشرق، ہمفرے پرائی ڈیکس (Humphrey Prideaux) نے حضور ﷺ کی سوانح لکھی لیکن اپنے دامن کو وہ بھی خرافات سے نہ بچا سکا۔ اور دوسروں کی طرح آپ ﷺ کو خدانخواستہ ''مدعی کاذب''، مکار، فریبی (Imposture) قرار دیا۔ اس پر تماشہ یہ ہے کہ اُس کی کتاب تقریباً ایک صدی تک دوسروں کے لیے ''معیاری کتاب حوالہ'' (Standard work of reference) بنی رہی۔ ایک ہی سال (۱۶۹۷ء) میں دو اشاعتیں عمل میں آئیں اور فرانسیسی ترجمہ بھی ۱۶۹۸ء میں ہوگیا۔[۹۵] اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مستشرقین کے حلقوں میں عام مذاق کیا تھا اور کس قسم کے مواد کو ان کے بڑے بڑے علماء استعمال کرتے تھے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے دوران بھی تحریکِ استشراق منازلِ ارتقاء طے کرتی رہی البتہ سفر جیسے جیسے آگے بڑھتا رہا، رختِ سفر کم و بیش ہوتا رہا اور اپنے تمام تر مذہبی، مشنری، سیاسی اور استعماری عزائم کے علی الرغم، مستشرقین کے رویہ میں کچھ لچک اور نرمی بھی پیدا ہوگئی۔ اس نرمی اور لچک کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان میں سے چند کا رویہ، رنگ و آہنگ اور آواز و انداز بدلا اور نسبتاً انصاف پسندی سے کام لیا بلکہ دل و نگاہ میں گنجائش پیدا کر کے اثبات و معروضیت (Objectivity) سے آگے بڑھ کر توصیف و مدح (Admiration) اسلام و پیغمبرِ اسلام ﷺ میں بھی بخل سے کام نہیں لیا[۹۶] ورنہ پرانے خیالات اور ان کے اپنے متقدمین کے قائم کیے ہوئے نظریات بہرحال گرم سفر رہے اور مقبولیت بھی انہی کو حاصل رہی، تاہم اتنا ضرور ہوا متشدد و متعصبانہ رویہ کے شانہ بہ شانہ معقولیت و انصاف پسندی کا رجحان بھی جاری و ساری ہوگیا۔ اور اس رجحانِ نو کا ساز غالباً اِس صدی میں سب سے پہلے ولندیزی مستشرق ریلان[۹۷] (H. Reland)

Marfat.com

نے ۱۷۰۴ء میں De Rehgrone Mohammadica لکھ کر چھیڑا اور اپنے ہم مشربوں سے مطالبہ کیا کہ "ہم مشرق کو اس کے اپنے اصل مآخذ کے ذریعہ ہی سمجھ سکتے ہیں"۔ اور برملا کہا کہ "تاریخی انصاف" کی ترازو میں تو ہمیں اسلام کو بھی تولنا چاہیے۔[98] پھر اس "نے نوازی" میں پیری بائل[99] (Pierie Bayle) اور بولین[100] ولیرز (Count of Boulainvilliers) وغیرہ بھی شامل ہو گئے۔

بہرحال مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارھویں صدی میں مغرب نے اسلام، پیغمبرِ اسلام ﷺ اور مسلمانوں کی طرف بہ نظرِ شفقت دیکھا اور افہام و تفہیم کی جانب پیشقدمی کی۔[101]

اس صدی میں مستشرقین کی ذاتی و انفرادی کاوشوں کے علاوہ، سرکاری اور اجتماعی سطح پر بھی سرگرمیاں منظم کی گئیں۔ خصوصاً اِس صدی کے اواخر میں اِن رجحانات نے زیادہ زور پکڑا۔ بقول مولانا شبلی "یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کی قوتِ سیاسی، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہوگئی، جس نے "اورینٹلسٹ" کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کر دی، جنہوں نے حکومت کے اشارہ سے السنہ مشرقیہ کے مدارس کھولے، مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائیٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع و اشاعت کے سامان پیدا کیے، اورینٹل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا"۔[102] "اور آخر کار ان مدارس اور سوسائیٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درسگاہیں اور انجمنیں جاری ہوگئیں، عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا"۔[103] السنہ مشرقیہ کے علاوہ مسلمانوں کے سائنسی علوم پر علمی و تحقیقی کام کی غرض سے پیرس میں ۱۷۹۵ء میں ایک اور ادارہ Eco Le des langues Orientales vivanless قائم کیا گیا۔ اس کے تحت اضافی طور پر مشرقی زبانوں کے بارے میں بھی معلومات اکٹھی کی گئیں۔

اٹھارھویں صدی کی ایک خصوصیت اس تحریک کے حوالے سے یہ بھی ہے کہ استشراق (Orientalism) اور مستشرق (Orientalist) کی اصطلاحوں کا رواج اسی زمانے میں شروع ہوا۔[104] چنانچہ انگلستان میں ۱۷۷۹ء کے لگ بھگ اور فرانس میں ۱۷۹۹ء کے قریب مستشرق کی اصطلاح رائج ہوئی اور پھر جلد ہی "استشراق" نے بھی رواج پایا۔[105] اور اِس کے ساتھ ایک مخصوص تصوّر اور مخصوص سلوک اور رویہ (Discipline) نے بھی جنم لیا۔[106] بہرحال اس صدی کے مشاہیر علمائے مستشرقین میں سے مندرجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں:

(۱) سائمن اوکلے (Ocklay. S.) انگریز مستشرق۔ جس کا زمانہ ۱۶۷۸ء تا ۱۷۲۰ء تھا۔[107] اس کی کتاب مسلمانوں کی تاریخ پر History of the Saracens کے نام سے ۱۷۰۸ء تا ۱۷۱۸ء شائع ہوئی۔[108] یہ تین جلدوں میں تھی۔[109] کہا جاتا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مستشرقین کے نتائجِ تحقیق کو عام لوگوں کی رسائی کے قابل بنایا گیا۔[110]

Marfat.com

(۲) ایڈورڈ پوکاک (Pocoke, G) انگریز مستشرق جس کا زمانہ ۱۶۴۸ء تا ۱۷۲۷ء تھا۔[۱۱] اس کا ہم نام ایک مستشرق ۱۷ویں صدی میں گزر چکا ہے۔

(۳) جارج سیل (Sale, G) انگریز مستشرق۔ جس کا زمانہ ۱۶۹۷ء تا ۱۷۳۶ء تھا۔ اُس نے ۱۷۳۴ء میں قرآن کا ترجمہ شائع کیا۔[۱۲] اور بعض مستشرقین کے کلماتِ خیر کے ردِ عمل میں آنحضرت ﷺ کو نبی کاذب اور اسلام کو فاسد مذہب (False religion) قرار دیا۔ (نعوذ باللہ)[۱۳]

(۴) جین گیجنیر (Gagnier J) انگریز مستشرق۔ جس کا زمانہ ۱۶۷۰ء سے ۱۷۴۰ء تک تھا۔[۱۴] اس نے دو کتابیں شائع کیں۔ اِن دونوں کتابوں کا مقصد بولین ولیر کی تالیف کی تاثیر کو کم کرنا تھا بلکہ بولین ولیر کے مقابلہ میں اس نے ایک نئی تالیف Vie de Mohammet پیش کی جو ۱۷۴۸ء میں ایمسٹرڈم سے نمودار ہوئی۔[۱۵]

(۵) رسک (Reiske, J.J) جرمن مستشرق۔ جس کا زمانہ ۱۷۱۶ء سے ۱۷۷۴ء تک تھا۔[۱۶] وہ جرمنی کا کلاسیکی لغوی اور عربی اسکالر تھا اور یونانی زبان وادب پر سند مانا جاتا تھا۔[۱۷]

(۶) ایڈورڈ گبن (Gibbon, E) انگریز مورّخ (زمانہ ۱۷۳۷ء تا ۱۷۹۴ء)۔ اپنی کتاب تاریخ زوالِ رومہ کے لیے خاص شہرت کا حامل[۱۸]۔ اس نے ۱۷۵۰ء میں کتاب مذکور کے پچاسویں باب میں اسلام اور آنحضرت ﷺ کو نبی کاذب (Imposter) کا خطاب دیتے ہوئے لکھا ہے آنحضرت ﷺ آخری ایام میں شہوت، لالچ، جاہ طلبی اور بوالہوسی میں مبتلا ہو گئے تھے۔[۱۹] (نعوذ باللہ)

(۷) والٹیئر (Voltaire Fr.) فرانسیسی مصنف، زمانہ ۱۶۹۴ء تا ۱۷۷۸ء۔[۲۰] اُس نے پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں اپنا مشہور ڈرامہ تحریر کیا جس کا عنوان تھا (Le Fanatisme on Mohammetle Prophete) یہ ڈرامہ اگرچہ تاریخی لحاظ سے بے بنیاد تھا۔[۲۱] تاہم یہ امر ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ اُس وقت تک مستشرقین شریعتِ اسلامی کی باریکیوں سے واقف نہ ہوئے تھے یہ ڈرامہ ۱۷۴۲ء میں منظر عام پر آیا۔ اُس نے نہ صرف اسلام کے خلاف نفرت وحقارت کا اظہار کیا بلکہ یورپ کے اُن تمام مستشرقین کی شدّت کے ساتھ مذمت کی جنھوں نے اسلام اور آنحضرت ﷺ کی جانب نرمی کا رویہ اختیار کیا یا انصاف کا مطالبہ کیا۔ اُس نے آنحضرت ﷺ کو نبی کاذب (Imposter) اور اسلام کو وحشی اور فاسد مذہب سے موسوم کیا۔ اُس نے ڈرامہ کو پوپ XIV کے نام سے منسوب کیا اور اس کے مقدمہ میں اسلام کے خلاف خوب زہر اگلا، پھر اپنے مقالات کے مجموعہ (۱۷۵۶ء) میں بھی والٹیئر نے آنحضرت ﷺ اور اسلام

Marfat.com

کے خلاف سخت نفرت کا مظاہرہ کیا۔ والٹیئر کی شخصیت اور تالیفات کا گہرا اثر دوسرے مستشرقین پر بھی پڑا۔ [۲۲] چنانچہ ڈیڈی رَوٹ (Diderot) اس فحش نگاری پر بھی اتر آیا کہ "محمد ﷺ دنیا میں سب سے بڑھ کر عورتوں کے دوست، اور سنجیدگی و معقولیت کے دشمن تھے۔" [۲۳] (نعوذ باللہ)

تحریکِ استشراق کا عروج

انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے ربع اوّل تک کا زمانہ مسلمانوں اور مستشرقین دونوں کے لیے متعدد اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔ پچھلی صدیوں میں عالمِ اسلام کو دنیا کے مختلف حصوں میں سقوط و انحطاط کی جن منزلوں سے گزرنا پڑا تھا [۲۴] ایک تو ان کے سبب ہی مسلمانوں کی حاکمانہ حیثیت ختم ہوئی، اس پر مستزاد یہ کہ ان کے پرانے حریف "مغرب" کو زمانۂ بیداری کے بعد سے سیاسی، عسکری، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ہر میدان میں مسلسل تفوق و بالا دستی حاصل ہوتی چلی جا رہی تھی، اور اس کی سامراجی گرفت عہد بہ عہد مضبوط ہوتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ انیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے اُدھر عالمِ اسلام خستہ و نزار ہوا اور ادھر مغرب کا پرچم استعمار اور بلند ہوا۔ یہ صورتِ حال مسلمانوں کے لیے کیسی ہی اذیت ناک کیوں نہ ہو، اقوامِ مغرب کے لیے بہرحال خوش آئند تھی اور اس سے برابر کا فائدہ مستشرقین نے بھی اٹھایا۔ چنانچہ زیرِ نظر دَور (۱۹۰۰ء تا ۱۹۲۵ء) تحریک استشراق کے عروج و کمال سے عبارت ہے۔ اس عہد میں تحریکِ استشراق کو بھرپور فروغ حاصل ہوا۔ مستشرقین کے انداز و اطوار اگرچہ بدل گئے تاہم کیفیت و کمیّت دونوں اعتبار سے اُن کے اخلاف اپنے اسلاف پر بازی لے گئے۔ چنانچہ:

(ا) کمیّت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ زیرِ بحث دور میں مستشرقین کی ایک بہت بڑی تعداد سامنے آئی، اس میں ہر قسم کے مستشرقین شامل تھے جو خاموش صلیبی جنگ کے اِس محاذ پر یورپ کے تقریباً تمام علاقوں کی نمائندگی کرنے والے تھے۔ مثلاً فرانس، اٹلی، انگلستان، اسپین، پرتگال، آسٹریا، ہالینڈ، جرمنی، ڈنمارک، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، ہنگری، روس، بلجیم، چیکوسلواکیہ، فن لینڈ وغیرہ اور امریکہ والے بھی شریک ہو گئے۔ [۲۵]

(ب) کیفیت کے اعتبار سے مستشرقین نے تصنیف و تالیف کے ڈھیر لگا دیئے۔ ان کے مطالعہ اور تحقیق و تدقیق کا دائرہ بھی محدود نہ رہا بلکہ عقائدِ اسلام، قرآن، حدیث، سنّت، فقہ، اجتہاد، عرب اور اہلِ عرب اور احوالِ عرب، ترکوں عربوں کے تعلقات، اسلام کی اصلیت، اسلامی تہذیب و تمدن، اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سیرت و سوانح وغیرہ پر کثرت سے لکھا گیا۔ اس دَور میں مستشرقین کا معیارِ تحقیق و استدلال بھی بلند ہوا۔ اور تحقیق و جستجو اور تفتیش و تفحص میں انہوں نے ایسا کمال دکھایا جو آج بھی باعثِ حیرت ہے۔ قدیم عربی مآخذ کی تلاش، مخطوطات اور قلمی نسخوں کی دریافت، آثار و اکتشافاتِ قدیمہ کا مطالعہ، کتابوں کی تصحیح و اشاعت، اسلامی تاریخی مآخذ کی ترتیب و تدوین،

Marfat.com

فہرستوں، اشاریوں اور تبویب وغیرہ کی تیاری اور اسی طرح کی دوسری سرگرمیاں، ان کی محنت و ریاضت، علم شناسی اور مشرق نوازی کی روشن دلیل ہیں۔[۲۶] بلکہ یہ اُن کا مسلمانوں پر احسان ہے کہ اُن ہی کی کوششوں کے طفیل بہت سی نادر اور مفقود الخبر کتابیں مسلمانوں تک پھر سے پہنچیں اور مشہور و متعارف ہوئیں۔[۲۷]

(ج) مستشرقین کے گروہ میں حسبِ سابق دونوں قسم کے افراد نے تصنیف و تالیف میں حصہ لیا۔ ایک طرف اگر روایتی قسم کے متشدد اور متعصب علمائے استشراق تھے[۲۸] تو دوسری طرف حقیقت بیں، انصاف پسند، نرم رَو اور معتدل قسم کے مصنفین بھی تھے۔ مثلاً گاڈ فرے ہگنز[۲۹] کاسن دی پرسیوال[۳۰] ویل[۳۱] بیان[۳۲] گوئٹے[۳۳] شول[۳۴] کارلائل[۳۵] درمنگھم[۳۶] وغیرہ۔

(د) مستشرقین کے سلوک اور رویہ میں نکھار پیدا ہوا، اور بحیثیت مجموعی اس دور میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ ان کا رویہ پہلے جیسا نہ رہا۔ بلکہ مختلف عوامل کے نتیجہ میں نرم، حقیقت پسندانہ اور معقول ہوتا چلا گیا۔ اِس کی بظاہر ایک وجہ تو مشرقی مصادر تک ان کی رسائی، عربی اور دوسری مشرقی زبانوں سے واقفیت تھی کہ جس کے نتیجہ میں محض تخمین وظن کے بجائے وہ عقل و استدلال اور علم کی روشنی میں بات کرنے لگے، مشرقی ممالک کے مشاہدات و اسفار نے ان کے اپنے اسلام کی لغویت ثابت کر دی اور بیان و واقعہ کا تضاد سامنے آ گیا۔ دوسری بڑی وجہ خود یورپ کی بدلتی ہوئی فضا تھا۔ نیز جدت پسندی، سائنسی ایجادات و اختراعات، تعصب اور تقشف کے خلاف عام بے چینی، رومانی تحریک، کلاسیکی نظریات کے خلاف بغاوت، تاریخی تنقید کی تحریک وغیرہ بھی موثر عوامل ثابت ہوئے۔ اِن باتوں کی روشنی میں گویا یہ کہنا درست ہوگا کہ مستشرقین کی اس فکری تبدیلی کی تہہ میں، نہ تو اخلاص جلوہ گر تھا اور نہ کدورت ونفرت پر محبت و مودّت کے جذبات غالب آ گئے تھے بلکہ درحقیقت حالات کی ستم ظریفی نے انہیں نقطہ نظر بدلنے پر مجبور کیا تھا، ورنہ ان کے اصل مقاصد میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بہرحال اصل وجہ ہم کسی کو قرار دیں، واقعہ عملاً یہ پیش آیا کہ:
(i) اس دور میں ان کے یہاں لغویات کم ہوگئیں اور الزامات و اتہامات کا دائرہ سمٹ کر محدود ہوگیا، نیز (ii) صورتِ حالات نے کلیسا کا طلسم توڑ کر ایسے مستشرقین بھی پیدا کر دیئے، جنھوں نے جرأت سے کام لے کر اپنے پیشرو مصنفین کی تغلیط کی اور اُن کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا۔

(ہ) اپنی سرگرمیوں کو منظم و مرتب کرنے کے ضمن میں مستشرقین نے اس دور میں متعدد تحقیقی ادارے قائم کیے۔ مثلاً سوسائٹی ایشیاٹک آف پیرس ۱۸۲۲ء رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ بریٹن اینڈ آئرلینڈ ۱۸۲۳ء اور امریکن اورینٹل سوسائٹی ۱۸۴۲ء وغیرہ۔[۳۷] ان تمام اداروں نے جلد ہی اپنے اپنے جریدے نکالنا شروع کر دیئے جن سے ان کی تحریک کو بے پناہ تقویت حاصل ہوئی۔

Marfat.com

لوگوں کے اذہان وقلوب کو متاثر کرنے میں رسائل و جرائد کو چونکہ ہمیشہ سے خاص اہمیت حاصل رہی ہے اس لیے متذکرہ بالا مجلّات کی اشاعت کو کافی نہیں سمجھا گیا اور بلکہ اپنی حکمتِ عملی کا مستقل حصہ بناتے ہوئے مستشرقین نے دوسرے متعدد رسائل و جرائد کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا۔ چنانچہ ہندوستان سے The Muslim World کا اجراء[۱۳۸] پیرس سے ۱۸۹۵ء میں Revaed-el-Islam کا اجرائی، روس سے ۱۹۱۲ء میں Mir Islam کا اجراء وغیرہ۔[۱۳۹]

رسائل و جرائد اور مجلّات کی اِن اشاعتی سرگرمیوں کا مقصد بظاہر تو یہ تھا کہ وہ اپنی تحقیقات سے دوسروں کو روشناس کرا سکیں لیکن بہ باطن مدعا اپنے پرانے استشراقی مقاصد کی تکمیل ہی تھا۔ رہی اُن کی بلند آہنگی، تو وہ صاف نتیجہ تھی اقوامِ یورپ کی بالا دستی کا، اور استعماری و سامراجی تسلّط کا۔ بہرحال اب منزل وہ بھی آئی کہ مستشرقین نے اپنی پہلی عالمی کانگریس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور ۱۸۷۳ء میں اسے پہلی بار عملی جامہ پہنا دیا گیا۔ عالمی کانگریسیوں کا انعقاد بھی ان کے لیے بڑا مفید مطلب تھا۔ مختلف اداروں کی سرگرمیاں، کارکردگی، نتائج، اطلاعات کا تبادلہ، بڑے بڑے علماء فضلاء کی شرکت، مقالات، خطبات، صلاح مشورے، قرار دادیں وغیرہ، یہ سب باتیں تحریکِ استشراق کو فعال اور سرگرم بنانے کے لیے بہرحال ضروری تھیں اور مستشرقین نے اس پہلو کو تشنہ توجہ نہیں چھوڑا اور ۱۹ ویں صدی کے اواخر سے ہی سالانہ اجتماعات کو ایک روایت کے طور پر جاری کر دیا۔[۱۴۰]

بہرحال یہ تفصیل اس اجمال کی تھی کہ انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے رُبع اوّل تک کا زمانہ تحریکِ استشراق کا دورِ عروج و کمال تھا۔ اور پھر ہم نے دیکھا کہ تحریک کے تمام شعبوں میں انتہائی رفتار سے ترقی ہوئی، مستشرقین کا ایک مستقل رویہ اور سلوک (Discipline) نکھرتا چلا گیا اور بحیثیت مجموعی ان کی تمام سرگرمیاں بہت منظم طریقے سے، ہر سطح پر اپنے اثرات کو ظاہر کرتی رہیں۔ اسی عہد کی آخری دہائی میں اگرچہ عالمی جنگ اور بین الاقوامی سیاست اور متعدد واقعات و حوادث نے ایک مرتبہ پھر سیاسی سماجی اور معاشی و ثقافتی حالات کا نقشہ منقلب کر ڈالا تاہم یہ جائزہ ہم آیندہ صفحات میں عہدِ جدید کے تحت لیں گے۔ یہاں زیرِ بحث دور کے کچھ مشاہیر کا تعارف کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار بطورِ خاص مدِّنظر رکھا ہے:

(۱) جان جاک سیدیلو (Secillo, J.J.) مشہور فرانسیسی مستشرق، جس کا زمانہ ۱۷۷۷ء تا ۱۸۳۲ء تھا۔ متعدد کتابیں یادگار چھوڑیں جن میں ایک تاریخ عرب پر بھی ہے۔[۱۴۱]

(۲) دیورجے (Desvergers A.N) فرانسیسی مستشرق۔ زمانہ ۱۸۰۵ء تا ۱۸۶۷ء اس کے آثار میں متعدد تصانیف شامل ہیں۔ تاریخ ابی الفداء سے سیرۃ النبی کا خلاصہ متن و ترجمہ کے ساتھ ۱۸۲۷ء میں شائع کیا۔ بلادِ عرب پر کئی مجلدات بشمول تاریخ خلافت، عہدِ مغلیہ تک، مطبوعہ

Marfat.com

۱۸۴۷ء۔ [۱۴۲]

(۳) ڈاکٹر پیرون (Perron A.) فرانسیسی مستشرق۔ زمانہ ۱۸۰۵ء تا ۱۸۷۶ء۔ مصنفِ کتاب نساء العرب قبل الاسلام و بعد، مطبوعہ ۱۸۵۸ء، نیز ترجمہ کتاب الطب النبوی از جلال الدین ابی سلیمان داؤد مطبوعہ ۱۸۶۰ء۔ [۱۴۳]

(۴) گارسن دی تاسی (Tassy, Garcin, de.) فرانسیسی مستشرق بہ زمانہ ۱۷۹۴ء تا ۱۸۸۷ء صاحبِ تصانیف، دینِ اسلام، قرآن، مذہبی تعلیمات و فرائض وغیرہ۔ [۱۴۴]

(۵) جوزف وھایٹ (White J.) انگریز مستشرق، زمانہ ۱۷۴۶ء تا ۱۸۱۴ء اسلام اور نصرانیت کے تقابلی مطالعہ پر مشتمل مقالات و محاضرات۔ [۱۴۵] اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ پر خطبات۔ [۱۴۶]

(۶) ولیم رائٹ (Wright, W.) برطانوی مستشرق اور مصنف۔ زمانہ ۱۸۳۰ء تا ۱۸۸۹ء۔ [۱۴۷]

(۷) ایڈورڈ ہنری پالمر (Palmer. E.H.) برطانوی مستشرق اور مشہور مترجم قرآن۔ [۱۴۸] ترجمہ قرآن مطبوعہ آکسفورڈ ۱۸۸۰ء۔ اس کا زمانہ ۱۸۴۰ء تا ۱۸۸۳ء تھا۔ [۱۴۹]

(۸) ڈی جونگ (Jong; P. de.) ہالینڈ کا مستشرق۔ زمانہ (۱۸۳۲ء۔ ۱۸۹۰ء)۔ دوسرے ہم وطن مستشرق ڈی جوجے (Goeje, M. J. de) کے ساتھ مل کر سیرت ابنِ ہشام پر کام کیا۔ متن اور لاطینی میں ترجمہ لیدن سے ۱۸۸۱ء میں شائع کرایا۔ [۱۵۰]

(۹) ڈی جوجے (Goeje. M. J. de) ہالینڈ کا مستشرق۔ زمانہ (۱۸۳۶ء۔ ۱۹۰۹ء)، کثیر التصانیف، وفیات الاعیان از ابنِ خلکان پر کام کیا اور اپنے ہم وطن مستشرق ڈی جونگ کے ساتھ مل کر سیرت ابن ہشام کے متن و ترجمہ کی اشاعت کی۔ [۱۵۱]

(۱۰) فلایشر (Fleischer, H.L) جرمن مستشرق تھا۔ زمانہ (۱۸۰۱ء تا ۱۸۸۸ء)۔ متعدد کتابیں لکھیں۔ تاریخ ابی الفداء کو متن و ترجمہ کے ساتھ اور تعلیقات و حواشی سے آراستہ کر کے لیبزگ سے ۱۸۳۱ء میں شائع کرایا۔ ایک اور کتاب تاریخِ عرب قبل از اسلام پر لکھی جو لیبزگ سے اسی سنہ میں چھپی۔ [۱۵۲]

(۱۱) وسٹنفیلڈ (Wustenfeld. F.) جرمن مستشرق۔ زمانہ (۱۸۰۸ء تا ۱۸۹۹ء) زود قلم مصنف، تاریخ مکۃ المکرمہ، سیرت ابنِ ہشام مع تعلیقات و حواشی (تین جلدیں)، اراضی مدینہ منورہ، اور تاریخ الشراف مکہ وغیرہ یادگار ہیں۔ [۱۵۳]

(۱۲) بیریزین (Beresine, N.) مشہور روسی مستشرق۔ زمانہ ۱۸۱۸ء تا ۱۸۹۶ء۔ گویا روسی مستشرقین کے زمرۂ اساتذہ میں شامل۔ متعدد تصانیف۔ مصادر اسلامی، تہذیب و تمدّن اور اسلام کے درمیان تعلق وغیرہ پر کتابیں، روسی دائرۃ المعارف میں مشرق اور مشرقی علوم و آداب پر متعدد

مقالات اسی مستشرق کے قلم سے ہیں۔[154]

(۱۳) بلانکو (White Joseph Blanco)۔ مشہور مستشرق۔ برطانوی مذہبی مصنف، زمانہ ۱۷۷۵ء تا ۱۸۴۱ء، مستند پادری، خاص کام کا میدان اندلس کی تاریخ پر کیا۔[155]

(۱۴) ایڈورڈ سخاؤ (Sachau Edward)۔ مشہور و معروف جرمن مستشرق، برلن میں مشرقی زبانوں کے کلیہ کا سربراہ، خود بڑا اسکالر اور زبان دان تھا۔[156] بقول مولانا شبلی پروفیسر سخاؤ کی ہی خاص کوششوں اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور نادر الوجود طبقات جس سے زیادہ مبسوط سیرتِ نبوی ﷺ میں کوئی تصنیف نہیں شائع ہوئی۔[157]

(۱۵) سلیم نوفل۔ روسی استشراق کی تاریخ میں اہم نام، استادوں کا استاد، سرخیل مستشرقینِ روس میں سے ایک تھا۔ زمانہ (۱۸۲۸ء۔ ۱۹۰۲ء) توطن لبنانی، کام فرانسیسی میں کیا۔ سیرۃ نبوی ﷺ اور اسلامی تعلیمات پر تصانیف۔[158]

(۱۶) فان کریمر (Von Kremer) آسٹریا کا مشہور مستشرق، ولادت ویانا میں ہوئی اور تعلیم بھی وہیں پائی۔ ترقی کر کے وزارت کے درجہ تک پہنچا اور وفات تک، وزارتِ خارجہ اور دوسری وزارتوں میں خدمات انجام دیتا رہا، اسلامی مصادر کی تقریباً بیس عربی کتابوں کو تلاش کر کے شائع کیا۔ ان میں سے واقدی کی ''المغازی'' ماوردی کی الاحکام السلطانیہ، نشوان کا ''قصیدۃ الحمیر یہ'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اُس نے اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے بارے میں کثرت سے کتابیں لکھیں جو جرمن زبان میں ہیں۔[159]

(۱۷) سرولیم میور۔ مشہور انگریز مستشرق۔ اس کا تفصیلی تعارف ابتدائی صفحات میں آ چکا ہے۔

(۱۸) مینارڈ (Maynard, Barbier de) فرانسیسی مستشرق۔ زمانہ (۱۸۲۷ء تا ۱۹۰۸ء) اس نے استشراق پر پہلا رسالہ لکھا اور شائع کرایا۔ جغرافی، تاریخی ادبی لغت مرتب کی۔ مسعودی کی مروج الذہب کا متن و ترجمہ شائع کیا۔[160]

(۱۹) رینی باسے (Basset, Rene) فرانسیسی مستشرق۔ زمانہ (۱۸۵۵ء تا ۱۹۲۴ء) بے شمار کتابوں کا مصنف۔ مثلاً الشعر العربی قبل الاسلام، مطبوعہ ۱۸۸۰ء۔ بوصیری کے قصیدۂ بردہ، نقد شرح مع ترجمہ مصنف، وغیرہ وغیرہ۔[161]

(۲۰) ڈاکٹر لیبان (Lebon Dr. G) فرانسیسی مستشرق، مشہور عالم طبیب اور تمدن و حضارتِ مشرق کا جاننے والا مؤرخ تھا۔ ۱۸۴۱ء میں پیدا ہوا۔ متعدد ضخیم کتابیں لکھیں۔ تمدنِ مصر، تمدنِ عرب اور اندلس میں عربی تمدن پر کام قابلِ ذکر ہے۔[162] اس کا شمار ان مغربی مستشرقین میں ہوتا ہے جو انصاف پسند تھے اور اسلامی خوبیوں کے قائل تھے۔[163]

Marfat.com

(۲۱) گولڈزیہر (Goldziher Y.) ہنگری کا مشہور و معروف مستشرق، زمانہ (۱۸۵۰ء تا ۱۹۲۱ء) کثیر التصانیف شخص تھا، قرآن، تفسیر، حدیث، سیرت پر بے شمار دراسات شائع کیے۔[۱۶۴] گولڈزیہر کی خاص بات یہ ہے کہ اُس نے نالدیکے کے نقدِ حدیث سے آگے بڑھ کر انکار حدیث کے اسکول کی داغ بیل ڈالی، اور پھر رفتہ رفتہ مستشرقین کا ایک گروہ انکار حدیث میں اُس کا ہمنوا بن گیا۔ انکارِ حدیث کے بعد گولڈزیہر نے سیرت کے دوسرے مصادر کو بھی نشانہ بنایا۔[۱۶۵]

(۲۲) ولہازن (Welhausen, J) جرمن مستشرق۔ زمانہ (۱۸۴۴ء تا ۱۹۱۸ء) بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں۔ مختلف موضوعات پر لکھا، تاریخ یہود، محمد ﷺ مدینہ میں، دینِ اسلام کے مطالعات، عہدِ نبوی ﷺ میں دستورِ مدینہ، مکاتیب نبوی اور وفود، منقول از ابن سعد مع متن و ترجمہ[۱۶۶] وہ پروٹسٹنٹ تھیوموجین اور بائبل پر عبور رکھتا تھا۔[۱۶۷]

(۲۳) واشنگٹن اروِنگ (Irving, Washington) ۔ معروف امریکی اسکالر اور مستشرق۔[۱۶۸] زمانہ ۱۷۸۳ء تا ۱۸۵۹ء۔ بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں۔ خصوصاً سیرتِ محمد ﷺ اور خلفاء پر دو جلدیں، جو ۵۰۔۱۸۴۹ء میں شائع ہوئیں۔[۱۶۹] اس کی کتاب حیاتِ محمد ﷺ کا ترجمہ عربی میں بھی شائع ہوا۔

(۲۴) یوجین یونگ (Eugene Young) ۔ فرانسیسی مستشرق، متعدد کتابوں کا مصنف، ایک ضخیم رسالہ ''نورِ اسلام کی خاص کرن''، دوسرا ''مشرق جس طرح اسے مغرب نے دیکھا''، سیرت نبوی بزبان فرانسیسی وغیرہ وغیرہ۔ انتقال ۱۹۲۰ء میں ہوا۔[۱۷۰]

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ قرونِ وسطیٰ کا مسیحی دماغ بدلتا چلا گیا۔[۱۷۱] اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، اگرچہ اُن کے عزائم اور مقاصد میں فرق نہیں آیا۔ تاہم دینِ اسلام اور سیرتِ رسول ﷺ کے بارے میں مستشرقین کا رویہ اور سلوک (Treatment) یکساں نہیں رہا۔ اور جیسے جیسے عہدِ جدید کی منزل قریب آتی گئی، مجموعی طور پر ان کے ظاہری رویہ میں معقولیت کا رنگ نمایاں ہوتا چلا گیا، اور وہ خود یہ محسوس کرنے لگے کہ تعصب اور تشدد کی انتہا پسندی خود ان کے لیے اور ان کی تحریک کے لیے ضرر رساں ہوگی۔ بہرحال اب ہم اگلے دور میں قدم رکھ رہے ہیں۔

عہدِ جدید

پچھلا دَور جو بیسویں صدی کے رُبع اوّل میں اختتام کو پہنچا، جیسا کہ واضح ہوا، تحریکِ استشراق کا نقطۂ کمال ثابت ہوا اور ہر اعتبار سے استشراقی سرگرمیوں نے فروغ پایا۔ اب وہ دور جسے ہم عہدِ جدید سے تعبیر کرسکتے ہیں بیسویں صدی کے ربع اوّل سے شروع ہوا اور تاحال جاری وساری ہے۔

عہدِ جدید آیا تو اپنے جلو میں نت نئے رجحانات لے کر آیا۔ اور سیاسی وعسکری، اور معاشی وسماجی سطح

Marfat.com

پر پچھلی بہت سی باتوں کو زیر وزبر کر گیا، چنانچہ عالمی جنگیں اور اس کے نتیجہ میں مشرقی و مغربی معاشروں پر ہمہ گیر اثرات، نو آبادیاتی علاقوں کی بیداری، ظلم و استحصال کی تاریکیوں کے خلاف حریت و آزادی کی روشنی، استعماری قوتوں کی شکست و ریخت، ایجادات و اختراعات کے ظہور، سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظریات کے نمو اور تہذیب و تمدّن کے تنوع نے حالات و مسائل کی نوعیت کو بہت کچھ بدل ڈالا۔

اُدھر استشراق کے حال سے یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ تحریک استشراق پچھلے دور میں جس نقطۂ کمال تک پہنچ چکی تھی، ہر کمالے را زوال کے مصداق، غالباً مزید پیش قدمی ممکن نہ رہی۔ اس لیے یہ سوال بجا طور پر پیدا ہوا کہ کیا تحریکِ استشراق رو بہ زوال ہوگئی ہے؟[172] بہر حال واقعہ یہ ہے کہ مستشرقین کی کوششوں کا ایک رُخ تو یہ ٹھہرا کہ جو کچھ حاصل کر لیا گیا تھا اُسے بہر طور باقی رکھا جائے۔ دوسری طرف اسلام، پیغمبرِ اسلام ﷺ اور عالمِ اسلام کے اعمال و احوال کے مطالعہ میں زیادہ انہماک، توجہ اور امعان نظر برتا جانے لگا، جز وقتی اسکالرز کے بجائے کل وقتی علماء نے جگہ حاصل کی اور آکسفورڈ، کیمبرج، لندن اور مغرب کی دوسری جامعات میں قرآن، حدیث، فقہ، تصوف، اور دوسرے اسلامی، مشرقی مباحث کے لیے باقاعدہ نشستیں مخصوص کی جانے لگیں۔[173] یہ مطالعہ لازماً خلوص پر مبنی نہ تھا مگر ان کے اشتغال و انہماک پر ضرور دلالت کرتا ہے کہ اس سے خال خال مفید نتائج بھی پیدا ہوئے اور کعبہ کو صنم خانے سے بعض پاسبان بھی مل گئے۔

مطالعۂ سیرت کے حوالے سے کسی حد تک اعتدال اور انصاف پسندی کی روایت جسے ویل، گوئٹے اور کارلائل وغیرہ نے آگے بڑھایا تھا، اس عہد میں بھی جاری و ساری ہے اور الفانسو، آرچر، ٹائن بی، بلاشیر اور واٹ وغیرہ کے یہاں روایتی انتہا پسندی کے ساتھ ساتھ معقولیت و معدلت کے نمونے بھی نظر آجاتے ہیں۔ اسلامی مصادر کی تحقیق و دریافت، ان کی تبویب، اور اشاریہ سازی (Indexing) کا کام نہ صرف آگے بڑھا بلکہ ایک طرف تو مستشرقین نے اس معاملے میں اپنی محنت و ریاضت سے ایک طرح کی اجارہ داری حاصل کر لی۔[174] اور دوسری طرف اسلامی مشرقی مصادر پر نقد و جرح کے کام کو بھی وسیع پیانے پر انجام دیا جانے لگا۔ یہ غالباً تحریکِ استشراق کے مزاج سے بھی ہم آہنگ تھا کہ مصادر و ماخذ کا اعتبار اسی طریقے سے اٹھ سکتا تھا اور مشرقی اذہان و قلوب میں تشکک و تذبذب کے بیج بوئے جاسکتے تھے۔ اس ضمن میں قرآن، سنت اور دوسرے مصادرِ سیرت کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا[175] اور مآل کار یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ نعوذ باللہ آنحضرت ﷺ بس ایک پکے مفاد پرست، سیاسی رہنما تھے اور مذہبی خلوص و سچائی ان میں بہت کم تھی۔[176]

اس عہد میں جو نئے رجحانات پروان چڑھے اُن میں سے چند قابلِ ذکر ہیں۔ بعض مستشرقین نے سیرت نبوی ﷺ کا مطالعہ طبی اور مرضیاتی (Pathological) نقطہ نظر سے کیا، کچھ نے اس عہد کے معاشی اور سماجی عوامل سے متاثر ہو کر آنحضرت ﷺ کو محض ایک معاشی اور معاشرتی مصلح کی حیثیت سے

اہمیت دی، اور کچھ نے ان سب سے مرکب و مرتب شدہ نظریہ قائم کیا۔ یہ تمام نقطہ ہائے نظر دراصل مخصوص ذہنی وفکری پس منظر کی پیداوار تھے۔[177]

طبی اور مرضیاتی نقطہ نظر سے سیرت کے مطالعہ میں یہ مؤقف قائم کیا گیا کہ آنحضرت ﷺ (خاکم بدہن) نفسیاتی و دماغی امراض کا شکار تھے۔ انہیں مرگی کے دورے پڑتے تھے۔ اور ہنری[178] لامنس کی دریافت یہ ہے کہ یہ دورے حد درجہ اشتہا کے نتیجہ میں پیدا ہوئے۔[179] اس سے پہلے اُس نقطۂ نظر کی ترجمانی، مشہور برطانوی مستشرق اسپرنگر بھی کر چکا تھا اور یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کر چکا تھا کہ خدانخواستہ آنحضرت ﷺ کا نظامِ اعصاب (Nervous System) چونکہ مختل تھا اور آپ ﷺ نعوذ باللہ ہذیان واضطرابِ اعصابی کے مریض تھے اس لیے ان کے لائے ہوئے دین اور ان کی سیرت میں اس کا مظاہرہ نظر آتا ہے۔[180] طبی اور مرضیاتی نقطۂ نظر کو مزید تقویت مطالعہ سیرت میں علم النفس کے اصول کے اطلاق سے ملی۔ اس کے تحت اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سیرت کی نفسیاتی تحلیل کی کوششیں کی گئیں اور اس معاملہ میں فرانز بھل (Frants Buhl) اور طور اینڈرے (Tor Andrae) نے سبقت دکھائی اور حق ترجمانی ادا کیا۔[181]

زیر بحث دَور میں جن نئے رجحانات اور نئی تحریکوں نے جنم لیا ان میں اشتراکی نقطہ نظر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مارکس اور اینجلز کے خیالات اور تاریخ کی مادّی تعبیر نے اپنا حلقہ اثر پیدا کیا اور ایسے مستشرقین آگے آئے جن کی نظر میں اسلام کی اشاعت وفروغ اور پیغمبر اسلام کی کامیابیاں، دراصل سیاسی، سماجی اور معاشی عوامل کی کارفرمائیوں کا نتیجہ تھیں۔ چنانچہ اس ضمن میں جرمن مستشرق ہیوبرٹ کرائم (Hubert Crimme) کا نام معاشی نظریہ کے ارتقاء کی علامت بنا۔ اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ پر اُس کی دو کتابیں شائع ہوئیں۔ اُس کی تحقیقات کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام کو ایک مذہبی دینی نظام کی بہ نسبت ایک سماجی اشتراکی نظام کی حیثیت سے سمجھنا چاہئے اور آنحضرت ﷺ کو محض ایک پیغمبر کے بجائے صرف ایک سیاسی سماجی اور معاشی مصلح ماننا چاہئے۔[182] سیاسی سماجی اور معاشی نقطہ ہائے نظر کا رنگ مارگولیتھ[183] (Margoliouth) نے اور گہرا کیا۔ اور مارگولیتھ نے اپنے مطالعہ سیرت میں آنحضرت ﷺ کو محض ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے ہی پیش کیا۔ اور اپنی کتابوں اور مقالات میں یہاں تک لکھا کہ مکہ میں اپنی ''دکان'' سے لے کر مدینہ میں ایک مملکت کی تعمیر تک ۲۳ سال کا عرصہ لگایا۔ پھر دریدہ دہنی کی انتہا کرتے ہوئے آنحضور ﷺ کو نعوذ باللہ ''ڈاکوؤں کا سردار'' اور ''مدینہ کا ظالم مستبد'' لکھنے میں بھی تکلف نہیں کیا۔[184] اطالوی مستشرق پرنس لیون کتانی[185] (Prince Leone Cactani) نے اپنے دیوپیکر کام کا ماحصل یہ قرار دیا کہ ''آنحضرت ﷺ بس ایک چالاک سیاست دان تھے اور انہوں نے معاشی و سیاسی مفادات کی خاطر مذہبی داعیات کو قربان کر دیا تھا۔[186] وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ''محمد ﷺ (خاکم بدہن) پکے مفاد پرست

Marfat.com

(Opportunist) تھے اور اپنی سیاست بازی میں انہوں نے اپنی مذہبیت کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ ۱۸۷ مطالعہ سیرت میں یہ انتہا پسندی خلافِ حقیقت بھی تھی اور خود گروہِ مستشرقین میں سے بھی بعض نے اسے بالکل پسند نہیں کیا۔ ۱۸۸ تاہم بعض مستشرقین نے ایک بین بین رویہ اختیار کیا۔ مثلاً عہدِ جدید کا مشہور مؤرخ ٹائن بی اپنی عظیم الشان تصنیف ''مطالعہ تاریخ'' میں دنیا جہان کی تہذیبوں کا مطالعہ کرتا ہے اور واقعات سے اصولوں کو اخذ کرتا ہے، پھر اسلام کے بارے میں بھی عمومی طور پر معقول رویہ کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن جب سیرتِ رسول ﷺ پر قلم اٹھاتا ہے تو آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو دو مراحل میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اُس کے نزدیک پہلا مرحلہ تو وہ ہے جبکہ آنحضور ﷺ کا قیام مکہ میں رہا۔ اس دوران بقول ٹائن بی آپ کلیتہ، مذہبی مشنری سرگرمیوں میں منہمک رہے، لیکن دوسرے مرحلہ میں مدینہ پہنچ کر انہوں نے بقول ٹائن بی، مذہبی مقاصد سے الگ ہو کر سیاسی سرگرمیوں کو جاری وساری کیا۔ وہ بہرحال اس خیال کی پرزور تردید کرتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک بہروپیا (Imposture) تھے۔ ۱۸۹ ٹائن بی کے افکار کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام ایک مثالی پیغمبر تھے۔ ۱۹۰ ایک اور جدید مصنف بلاشیر (Blachere) اپنی کتاب Le Proleme de Mahomet میں حضور ﷺ کی زندگی سے زیادہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مصادر سے بحث کرتا ہے۔ اور غلو سے بچتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ احادیث وسیر کے ذخیرے میں بہرحال ایک حصہ ایسا ہے جسے تکنیکی طریقوں سے جانچ پرکھ کر مستند تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۱ اسی قسم کا نقطہ نظر ولیم منٹگمری واٹ کا بھی ہے۔ ۱۹۲ مطالعہ سیرت کے ضمن میں واٹ نے متعدد کتابیں تحریر کیں۔ ۱۹۳ واٹ کی تصنیفات کو بہرحال آخری جدید ترین کوششوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے نزدیک مصادر نے جہاں تک اجازت دی اپنی دانست میں ایک مکمل تصویر پیش کرنے کی کوشش کی۔ واٹ کے کام کی خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے پچاس سال کے دوران ''علمیت'' نے جو ترقی کی ہے اس کا مظاہرہ اس کی تصانیف میں نظر آتا ہے اور اس کی تصانیف اسلامی مآخذ کی جدید ترین دریافت اور جرح وتنقید کے جدید اصولوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ۱۹۴ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ واٹ کا مؤقف ٹائن بی سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے کہ وہ بھی آنحضرت ﷺ کی شخصیت کو مکہ اور مدینہ میں مختلف سمجھتا ہے۔ ۱۹۵

بہرحال عہدِ جدید کا یہ عمومی جائزہ اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ عہدِ جدید کے مستشرقین اگرچہ اپنے اندازِ تحریر، اپنی علمیت اور طرز ہائے تحقیق میں اپنے اسلاف سے بہت مختلف ہو گئے ہیں اور بہت سے معاملات میں انہوں نے بالکلیہ رجوع کر لیا ہے تاہم یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ تمام تر جدیدیت کے علی الرغم تحریکِ استشراق کا اصل محرک جذبہ اب بھی کارفرما حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ عہدِ جدید کا ایک مصنف ۱۹۶ اپنی زبان قلم سے یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ ''پرانی دشمنی عہدِ جدید میں بھی جاری وساری ہے''۔ ۱۹۷ علاوہ ازیں اِس صورتِ حال میں ایک اور جدید ترین مصنف ایڈورڈ ڈبلیو سعید کا یہ تجزیہ بالکل

Marfat.com

درست معلوم ہوتا ہے کہ استشراق (Orientalism) اور اس کی تحریک کا اہتمام وانضباط بنیادی طور پر، اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی میں ایک سیاسی ضرورت کے تحت ہوا۱۹۸ اور استشراق کو جہانِ مشرق پر اس وقت مسلّط کیا گیا جبکہ مشرق مغرب کے مقابلہ میں مغلوب ومنفعل تھا اور پھر ''قوت وضعف'' کے اسی تفاوت نے بعض لازمی نتائج کو پیدا کیا۔۱۹۹ استشراق کے درحقیقت دو چہرے، دو رخ ہیں۔ایک اس کا داخلی اور پوشیدہ پہلو (Latent) اور دوسرا ظاہری، خارجی رُخ (Manifest)۔ پہلا داخلی پوشیدہ رُخ (Latent Orientalism) تو ہمیشہ سے ایک ہے جسے کبھی کسی زمانہ میں نہیں چھوا گیا جبکہ دوسرا ظاہری پہلو (Manifest Orientalism) متغیر ہوتا رہا یعنی مشرقی معاشرہ وتہذیب، زبان، ادب، تاریخ، معاشرت وغیرہ کے بارے میں خیالات وافکار بدلتے رہے۔مختصر یہ کہ مستشرقین کے خیالات میں تبدیلی اسی ظاہری استشراق کے حوالہ سے آتی رہی لیکن داخلی جذبہ استشراق، ہمیشہ سے لے کر آج تک یکساں محکم و مستحکم رہا اور کسی واضح تبدیلی سے آشنا نہیں ہوا۔۲۰۰ بہرحال خلاصہ یہ کہ استشراق کسی مثبت اور تعمیری رویہ اور سلوک و دستور (Positive Doctrine) کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ مغرب کی جاری کردہ مؤثر علمی روایت ہے۔۲۰۱

عہدِ حاضر کے اس مختصر علمی جائزہ کے بعد مناسب ہے کہ اس دور کے چند مشاہیر مستشرقین کا تعارف پیش کر دیا جائے:

(۱) مونٹے (Montet, Ed.) فرانسیسی مستشرق۔ زمانہ ۱۸۵۶ء تا ۱۹۲۷ء۔ علمی یادگاروں میں اسلام، حال و مستقبل (مطبوعہ پیرس ۱۹۱۰ء) الاسلام (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) تاریخ اسلام (مطبوعہ ۱۹۱۳ء) اور فرانسیسی میں ترجمہ قرآن (مطبوعہ ۱۹۲۹ء) شامل ہیں۔۲۰۲

(۲) گاڈفرے ڈی ممبائن (Goudefroy Demombynes, M.)۔فرانسیسی مستشرق۔ زمانہ ۱۸۶۲ء تا ۱۹۵۷ء۔ پیرس میں مشرقی علوم والسنۃ کے شعبہ میں عربی کا استاذ، متعدد کتابوں کا مصنف مثلاً اسلام میں نظم (۱۹۳۱ء) مکہ و مدینہ (۱۹۱۸ء) عالم اسلامی اور بازنطینی صلیبوں تک (۱۹۳۱ء) وغیرہ۔۲۰۳

(۳) کارلو الفانسو نلینو (Nalino, Carlo Alfanso) اطالوی مستشرق۔ زمانہ ۱۸۷۲ء تا ۱۹۳۸ء۔ بے شمار مصنفات و مطبوعات اُس سے منسوب ہیں۔ مثلاً منتخبات القرآن (لیپرگ ۱۸۹۳ء)، اسلام سے پہلے قبائلِ عرب کی تکوین و ترتیب (۱۸۹۳ء) تاریخ میں قبل اسلام (۱۹۲۷ء) ممالک عرب کی اسلام کے بعد عصر حاضر تک تاریخ، جغرافیہ، ثقافت، عادات، اسمائی، قبائل وتراجم رجال، فہرست مخطوطات اور شخصیات کی تحقیق، رواۃ، روایت اور مصادر کی تحلیل وغیرہ، اور حیاتِ محمد ﷺ جو اس کے انتقال کے بعد رومہ سے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی۔۲۰۴

Marfat.com

(۴) سر تھامس آرنلڈ (Arnold, Sir thomas) انگریز، برطانوی مستشرق۔ زمانہ ۱۸۶۴ء تا ۱۹۳۰ء اُس کی مشہور ترین کتاب دعوتِ اسلام (The Preaching of Islam) مطبوعہ لندن ۱۸۹۶ء ہے۔ ح ۲۰۵

(۵) رابرٹ بریفالٹ (Briffault, Robert Staphen) برطانوی مستشرق، انگریز سرجن اور ناول نگار، مشہور ترین کتاب ''دی میکنگ آف ہیومینٹی'' تھی۔ ح ۲۰۶

(۶) مارماڈیوک پکتھال (Pickthall M.W) زمانہ ۱۸۷۵ء تا ۱۹۳۶ء۔ مشہور برطانوی شخصیت۔ ترجمہ قرآن اور اسلامی تہذیب پر خطبات یادگار حیثیت رکھتے ہیں۔ ح ۲۰۷

(۷) اسٹینلے لین پول (Stanlay Lane Poole) مشہور برطانوی مستشرق۔ زمانہ ۱۸۵۴ء تا ۱۹۳۱ء۔ مورخ، ماہر آثاریات، برٹس میوزیم میں پرانے سکّوں کا محافظ (۱۸۷۴ء۔ ۱۸۹۲ء)، تاریخ مسلمانانِ اندلس پر خاص کام ہے۔ ح ۲۰۸

(۸) نکلسن (Nicholson, R.A.) مشہور برطانوی مستشرق۔ متعدد تصانیف۔ لیکن خاص الخاص کتاب عرب کی ادبی تاریخ مطبوعہ لندن نیویارک ۱۹۰۷ء اور اس کا مضمون ''محمد ﷺ اور قرآن'' نیز ''محمد ﷺ کی ایک نامعلوم سوانح''۔ نکلسن کا زمانہ ۱۸۶۸ء تا ۱۹۴۵ء ہے۔ ح ۲۰۹

(۹) نولدیکے (Noldeke, Th.) مشہور جرمن مستشرق۔ زمانہ ۱۸۳۶ء تا ۱۹۳۰ء۔ تصنیفات زیادہ تر سامی زبانوں پر اور تاریخ اسلام ح ۲۱۰ پر، نیز قرآن کی سورتوں کی اصل اور ترکیب پر بحث، ح ۲۱۱ نقد حدیث کے اسکول کا سرخیل ح ۲۱۲، سیرت پر Das Hebsen Muhammad's nach der Quellen popular Largestelt مطبوعہ ۱۸۶۳ء۔

(۱۰) ہرگرونج (Snouck, Hergronje, C) ہالینڈ کا مستشرق۔ زمانہ ۱۸۵۷ء تا ۱۹۳۶ء۔ اس کے آثار میں ''مکّہ کا حج، فقہ اسلامی اور سیاست نبوی ﷺ شامل ہے۔ ح ۲۱۳ مذہباً عیسائی، زیادہ تر کام ولندیزی زبان میں۔ ماہرِ اسلامیات سمجھا جاتا تھا۔ اُس نے لکھا ہے کہ اسلام اپنی ابتدا سے ہی سیاسی مذہب تھا۔ بہرحال اسلام کے بارے میں اسے بہت سی غلط فہمیاں تھیں اور اس نے نجی اسلام اور سرکاری اسلام کے درمیان فرق متصور کیا۔ ح ۲۱۴

(۱۱) ونسنک (Wensinck A.J) ولندیزی مستشرق۔ زمانہ ۱۸۸۱ء تا ۱۹۳۹ء۔ اس کی علمی یادگاروں میں ''یہودِ مدینہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا موقف'' جو اس کے مقالہ ڈاکٹریٹ کا موضوع بھی تھا اور لیدن سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ اور محمد ﷺ اور یہود، الاسلام (مطبوعہ ۱۹۱۱ء) وغیرہ خاص ہیں۔ ح ۲۱۵

(۱۲) زاخاؤ (Sachau. E.) جرمن مستشرق۔ زمانہ ۱۸۳۵ء تا ۱۹۲۰ء۔ ح ۲۱۶ جیسا کہ مولانا شبلی نے

Marfat.com

لکھا ہے کہ ابنِ سعد کی طبقات اس کی کوششوں سے زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ ۲۱۷

(۱۳) جوزف ہوروویز (Horovitz, J) جرمن مستشرق۔ زمانہ ۱۸۷۴ء تا ۱۹۳۱ء۔ اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ میں مغازی واقدی پر قلم اٹھایا (مطبوعہ ۱۸۹۸ء) ۲۱۸

(۱۴) جوزف ہیل (Hell. Joseph) جرمن مستشرق۔ زمانہ ۱۸۷۵ء تا ۱۹۵۰ء۔ آثار میں عربی تہذیب پر اُس کی کتاب مشہور ہے۔ ۲۱۹

(۱۵) کارل بروکلمان (Brockelmman, C) جرمن مستشرق۔ زمانہ ۱۸۶۸ء تا ۱۹۵۶ء۔ بے شمار کتابوں کا مصنف، لیکن مشہور ترین تصنیف "تاریخ اقوامِ مسلم" میں آنحضرت ﷺ پر تحریر قابلِ ذکر ہے۔ ۲۲۰

(۱۶) بارتھولڈ (Barthold V.V.) روسی مستشرق۔ زمانہ ۱۸۶۹ء تا ۱۹۳۰ء۔ تصانیف کثرت سے مثلاً اسلامی تہذیب، تاریخ ترکستان، عالمِ اسلام، خلفائے راشدین اور حضرت عمر بن عبدالعزیز وغیرہ۔ ۲۲۱

(۱۷) صمویل زویمر (Zewemer S) امریکی مستشرق۔ اجل علمائے مستشرقین میں سے اس کی تصانیف کثرت سے ہیں، خاص طور پر مسیحیت اور اسلام کے تعلقات پر، اس کی دیگر کتابوں میں اسلام سے پہلے بلادِ عرب، دنیا میں اسلام، حیاتِ محمد ﷺ، اسلام صحرائے عرب میں، ورثہ نبوی وغیرہ۔ ۲۲۲

(۱۸) ایچ. جی ویلز (Wells, Herbert, Gorge) انگریز مستشرق۔ زمانہ ۱۸۸۶ء تا ۱۹۴۶ئ۔ افسانہ نگار، ماہر عمرانیات اور مورخ۔ ۲۲۳ متعدد تصانیف یادگار ہیں۔ خصوصاً دی آؤٹ لائن آف ہسٹری میں محمد ﷺ اور اسلام۔

(۱۹) گب (Gibb. Sir Hamilton. A.R) اس عہد کا مشہور ترین برطانوی بزرگ مستشرق ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوا۔ ۲۲۴ اور ابھی چند سال پہلے وفات ہوئی ہے۔ گب کی تصانیف اگرچہ بہت سی ہیں تاہم اصل شہرت کتاب Mohammadenism (محمدیت ﷺ) سے ہوئی، جو ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کے نام کے سلسلے میں گب نے خود توجیہات پیش کیں۔ لیکن یہ نام و توجیہات خود اس کے شاگرد اسمتھ کو پسند نہیں آئیں۔ ۲۲۵ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ گب کے یہاں مختلف نظریات، تصورات اور خیالات میں ارتقا واقع ہوا اور وقت و حالات کے تحت بہت سے اندازے غلط ثابت ہوئے ۲۲۶ جس کا ثبوت اُس کی مختلف تحریروں سے ملتا ہے۔ اپنی عمر کے آخری ایام میں بہرحال اُس نے اسلام کے بارے میں نرم روی کا مظاہرہ کیا۔ ۲۲۷

(۲۰) ولفریڈ کینٹویل اسمتھ (Smith, W.C.)۔ گب کا شاگرد زندہ مستشرق، پیدائش جولائی ۱۹۱۶ء

Marfat.com

میں ہوئی۔ پی ایچ ڈی کی سند ۱۹۴۹ء میں ایک اور مستشرق فلپ کے حٹی ۲۲۸ کے زیر نگرانی تحقیقی مقالہ (مجلہ الازہر، تجزیہ وتنقید) پر حاصل کی۔ مذہباً عیسائی، متعدد کتابوں کا مصنف، حال پروفیسر ریلیجن ڈلہوزی یونیورسٹی کناڈا۔ ۲۲۹

(۲۱) جوزف شاخت (Schacht, J) جدید، زندہ جرمن مستشرق۔ پیدائش ۱۹۰۲ء میں ہوئی۔ ۲۳۰ خالص یہودی۔ اسلام اور علوم اسلامی پر متعدد تصانیف، لیکن اصل کام قانون اور اصولِ فقہ اسلامی پر کیا۔ ۲۳۱

(۲۲) برنارڈ لوئیس (Lewis, Berrnard) عہد جدید کا مشہور انگریز مستشرق، پیدائش لندن میں ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔ تصانیف کثرت سے ہیں لیکن مشہور کتابوں میں Arabs in History اور Islam in History، کیمبرج ہسٹری آف اسلام اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا مدیر و مقالہ نگار۔ اسلام دشمنی کے لیے مشہور ومعروف ہے اور آج کل یہود پرستی اور اسلام دشمنی میں غالباً سرِ فہرست ہے۔

عہدِ جدید کے مشاہیر مستشرقین کا مندرجہ بالا تعارف اگرچہ مختصر ہے لیکن تحریک استشراق کے کیف وکم کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہے۔ اور بطور خلاصہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تحریک استشراق، اپنے آغاز اور عروج وارتقاء کی مختلف منزلیں طے کرنے کے بعد آج کے عہد میں انتشار (Crisis) سے دوچار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مصنفین اپنی اصل تحریک کو اب بھی سینہ سے لگائے ہوئے ہیں۔ لیکن رویہ اور سلوک کی وہ یکسانیت بہر حال نظر نہیں آتی جو پہلے ان کا خاصہ تھا۔ ۲۳۲ مستشرقین کی نوجوان نسل، زمانے کے حالات ومسائل کے پیش نظر ذہن وفکر کی نئی تبدیلیوں سے دوچار ہورہی ہے، ادھر اسلامی دنیا میں سوچ کی نئی لہریں پیدا ہورہی ہیں، اور بعض جدید مفکرین ومصنفینِ مشرق کی تحریروں نے خود مغربی دنیا میں مدوجزر پیدا کردیا ہے۔ پھر یہ بات بھی صاف ہے کہ اب طاقت وقوت کے سارے اوزان اور پیمانے بدل گئے ہیں استعمار اور استحصال کی لغات منقلب ہوگئی ہیں۔ علمی وذہنی مرعوبیت کا عالم پہلے جیسا نہیں رہا، اور اب مشرق بھی آنکھیں کھول کر فلک، فضا اور زمین دیکھ رہا ہے۔ اس لیے کیا عجب کہ آنے والا زمانہ تحریکِ استشراق کے کوچ کا بگل بجادے۔ اس لیے بقول ایک مصنف ''وقت آگیا ہے کہ اسلامی مفکرین وعلماء اپنے حریفوں کے مدِّ مقابل آئیں اور معاندین ومخالفینِ اسلام کے خلاف، علمی محاذ پر حقیقی معرکہ کے لیے صف آراء ہو جائیں۔ البتہ معروضیت (Objectivity) کا خواہ مخواہ دعویٰ نہ کریں کہ علمی معروضیت تو درحقیقت فریبِ نظر (Myth) ہے۔ ۲۳۳

اسباب ومحرکات

تحریکِ استشراق نے اپنے آغاز سے لے کر عہدِ حاضر تک کا سفر جس انداز سے طے کیا ہے اُس کا

ایک عمومی جائزہ اگرچہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے اور بین السطور، تحریک کے اغراض و مقاصد اور محرکات کی بڑی حد تک نشان دہی بھی ہو چکی ہے۔ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کے پسِ پردہ محرکات واسباب کو صاف صاف بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ بطور خلاصہ انہیں مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے:

(۱) اسلام اور ادیانِ غیر میں بڑے بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اسلام کا نظریہ حیات، اس کا نظامِ فکر و عمل، اس کے تہذیب و تمدن کا اظہار، یہودیت، عیسائیت اور دوسرے مشرکانہ مذاہب سے یکسر مختلف ہے۔ پھر دانائے سبل، ختم الرسل ﷺ نے اسلام کی جو دعوت پیش کی اُس نے روزِ اوّل ہی ادیانِ باطلہ کی نفی کر دی تھی۔ اس لحاظ سے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ دوسرے مذاہب کے علمبردار، اسلام، اہلِ اسلام اور عالمِ اسلام کے بارے میں سخت معاندانہ جذبات رکھتے ہیں۔ اور اپنے بغض و عناد کا اظہار ہر ممکن طریقہ سے کرتے ہیں۔ اُن کا یہ رویہ اور ان کی شقاوت و قساوت دراصل نظریاتی اور فکری بنیادوں پر استوار ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ایک جگہ ۲۳۴ اس حقیقتِ کبریٰ کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ''تم دیکھو گے کہ اہلِ ایمان کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہودی اور مشرک ہیں۔ اور دوستی کے لحاظ سے مومنوں سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس لیے کہ ان میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی، اور وہ تکبر نہیں کرتے''۔ ۲۳۵ جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے، ان کے پورے گروہ میں نمایاں ترین عناصر، یہود، نصاریٰ اور مشرکین ہیں۔ ۲۳۶ انہیں اسلام، اہلِ اسلام اور عالمِ اسلام کی سرفرازی کسی طور پسند نہیں۔ ۲۳۷ بلکہ وہ ہر آن زک پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے تحریک استشراق کی اٹھان اسلام دشمنی کے زیرِ سایہ ہوئی اور مستشرقین کی مساعی کا ہدف یہ ٹھہرا کہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کو دنیا کے سامنے کریہہ المنظر بنا کر پیش کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ان کی مساعی کا ذکر پچھلے صفحات میں آ چکا ہے۔

(۲) نظریاتی سبب کے علاوہ ایک سبب تاریخی بھی ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا انقلاب آن کی آن میں پھیلتا چلا گیا۔ اور اس کے علمبرداروں نے انتہائی مختصر مدت میں اسلام کا پرچم دنیا کے دور دراز علاقوں میں جا کر لہرا دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اپنی پیش قدمی میں اسلام نے اپنی راہ کی تمام مزاحمتوں کو اِس آسانی کے ساتھ ختم کر دیا کہ دُنیائے مغرب آج تک انگشت بہ دنداں ہے۔ خاص طور پر اُس وقت کی معلوم دنیا کی دو بڑی طاقتوں روم و فارس کا سرِ غرور یوں سرنگوں کیا کہ وہ صدیوں خمیدہ رہا۔ بہرحال اسلام کی انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ وسعت و اشاعت نے جہاں ایک طرف دنیائے مغرب کی مذہبی و نظریاتی رفعتوں کو پامال کیا وہاں دوسری طرف اسلام کی عسکری

Marfat.com

فتوحات نے ان کی شوکت وسطوت کو پارہ پارہ کر دیا۔ بازنطینی سلطنت کے زرخیز خطوں (شام، فلسطین، مصر وغیرہ) پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا، اور چرچ کے مضبوط قلعے فتح ہو گئے۔ شمالی افریقہ کی فتوحات، اندلس اور سسلی کی عرب فتوحات نے دنیائے مغرب کو زیر وزبر کر دیا اور یوں اسلام اور مغرب کے درمیان عداوت کی مستقل بنیاد پڑ گئی۔ یہ تاریخی منظر مستشرقین کی معاندانہ سرگرمیوں اور مخاصمانہ کارروائیوں کا بھی نقطہ آغاز ثابت ہوا۔

(۳) محاربات صلیبی کو اگر ہم تحریکِ استشراق کا فوری سبب قرار دیں تو غلط نہ ہوگا۔ صلیبی جنگوں کو تاریخ یورپ بلکہ تاریخ عالم اور تاریخ اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے البتہ اس حد تک نشان دہی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ دنیائے اسلام کے خلاف دنیائے یورپ کی متحدہ کوششیں چونکہ ناکام ونامراد ہوئی اور (۱۰۹۶ء سے ۱۲۹۲ء تک کے) معرکہ ہائے صلیب وہلال کے نتائج اربابِ کلیسا کے حق میں اچھے نہ نکلے۔ [۲۳۸] اس لیے انہوں نے عسکری محاذ پر شکست کھانے کے بعد گویا یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو شکست دینے کے لیے علمی وفکری محاذ کو منظم کیا جائے۔ یہی فیصلہ بالآخر تحریکِ استشراق کی شکل میں سامنے آیا۔ اس سلسلہ میں لارڈ ایلی کا یہ تبصرہ قابلِ ذکر ہے کہ "فوجی اعتبار سے تو اب صلیبی جنگیں ختم ہو چکی ہیں مگر یورپی لوگ دینِ اسلام اور اس کی تہذیب کے بارے میں تحریراً جن خیالات کا اظہار کریں گے اُن میں تعصب کے اثرات ہمیشہ باقی رہیں گے"[۲۳۹]۔ ایک فرانسیسی (Pierre Martino) اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ "جب عیسائی ترکوں کے خلاف جنگ ہار گئے تو وہ ہرزہ سرائیاں کرنے لگے یہاں تک کہ انہوں نے عیسائیت کی شکست کا بدلہ میدانِ ادب میں لے لیا"۔ چنانچہ تحریکِ استشراق کی صورت میں اہلِ یورپ اور اربابِ کلیسا کی تمنائیں پوری ہوئیں۔ اور اس طرح تحریکِ استشراق کے جلو میں دنیائے مغرب کا یہ منظم حملہ، واقعتۂ عسکری محاذ پر اُن کے صلیبی حملوں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ مختصر یہ کہ اسلام دشمنی کی جو چنگاریاں پہلے سے دبی ہوئی تھیں وہ لو دینے لگیں اور رفتہ رفتہ ان کی آتشِ عداوت دامنِ مشرق کو جلانے لگی۔

(۴) مستشرقین من حیث المجموع چاہے قدیم ہوں یا جدید، مغرب کے ہوں یا مشرق کے، اپنی اصل و نسل کے اعتبار سے بہر حال یہودی، عیسائی اور مشرک ہی رہے ہیں۔ گویا اختلافِ دین و مذہب کی بناء پر اُن کے جذبات و خیالات تو پہلے سے ہی، مذہبی بغض و عداوت (Relious Hostility) کے آئینہ دار تھے۔ اس پر مستزاد یہ امر ہوا کہ وہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے حقیقی مآخذ سے دور، صدیوں جہالت و بے خبری اور عدمِ واقفیت کا شکار رہے۔ اس کا واضح نتیجہ ایک طرف تو یہ سامنے آیا کہ اسلام اور داعی اعظم ﷺ کے بارے میں، کم وبیش ۱۹ویں صدی کے

Marfat.com

اواخر تک، دانستہ یا نادانستہ طور پر وہ جو کچھ لکھتے رہے اور پھیلاتے رہے، وہ صریحاً ظن وتخمین، وہم وگمان کی پیداوار تھا۔ چنانچہ بے سروپا روایات، من گھڑت حکایات، فسانہ وفسوں، لچر قصے کہانیاں اور اسی طرح کا بلاتحقیق خام مواد مستشرقینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی نفرت انگیز تصویر پیش کرنے کے لیے بڑی دلیری کے ساتھ صدیوں استعمال کرتے رہے۔ جس کا کچھ اندازہ پچھلے تاریخی جائزہ میں بھی سامنے آ چکا ہے اور کچھ جھلکیاں آئندہ فصل میں سامنے آئیں گی۔ پھر دوسری طرف جب جہالت و بےخبری کا پردہ چاک ہوا اور مستشرقین اسلامی مآخذ کی تحقیق وتفتیش میں منہمک ہوئے، تب بھی انہوں نے دانستہ طور پر قرآن و احادیث سے کھیلنے میں کوئی تکلف نہیں کیا۔[۲۴۰] نیز مشرقی مصادر کی ترتیب وتبویب کے سلسلہ میں، تمام تر محنتوں کے باوجود، فاش قسم کی غلطیاں کرتے رہے۔[۲۴۱] بہرحال ان تمام باتوں کا مقصد ایک تھا، یعنی تشکک وتذبذب کے بیج بو کر اسلام اور سرورِ عالم ﷺ کے بارے میں مسلمانوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا اور انہیں آمادہ بہ نفرت کرنا۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مستشرقین اپنی تحقیقات کے پردہ میں، بقول ایک مصنّف ایسے خیالات کو خاموشی کے ساتھ اسلام کے نظامِ فکر میں داخل کر دیں جس کا ادراک راسخ العقیدہ لوگوں کے سوا دوسرے نہ کر سکیں۔ انہوں نے خیال کر لیا کہ ان کی تحقیقات سے مرعوب ہو کر ان کی ہر بات کو بلا چون و چرا درست مان لیا جائے گا۔ چنانچہ علومِ اسلامی کا ہر میدان انہوں نے اپنی جولانگاہ کے لیے منتخب کیا اور علومِ اسلامیہ کا کوئی شعبہ ایسا نہ چھوڑا جس میں انہوں نے خلطِ مبحث سے کام نہ لیا ہو۔[۲۴۲]

(۵) مسلمانوں کا زوال و انحطاط بحیثیت مجموعی، تحریکِ استشراق کے فروغ کا باعث ہوا۔ اِدھر عالمِ اسلام سیاسی انتشار کا شکار ہوا، اندلس مسلمانوں کے قبضہ سے نکلا، اور پھر سیاسی انحطاط، معاشرتی و اخلاقی زوال اور تہذیب وثقافت کے تنزّل کا باعث ہوا تو اُدھر مسیحی یورپ کی ہمتیں بلند ہوئیں، بلکہ اندلس کو مسلمانوں کے ہاتھ سے واپس لے کر تو اتنا غرور پیدا ہوا کہ صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پھر ۱۵ویں صدی عیسوی کے بعد سے انہیں سیاسی عروج حاصل ہونے لگا تو اقوامِ یورپ نے ایشیائی، افریقہ اور دوسرے مشرقی علاقوں پر قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ اور یوں استعماریت کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ اس کا نتیجہ واضح تھا۔ مغربی تہذیب کا غلبہ ہوتا چلا گیا اور مغربی تمدن اپنا اثر جمانے لگا تو مسلم ثقافت مغلوب ہونے لگی اور تمدنی چمک دمک ماند پڑ گئی۔ اور اس طرح مستشرقین کو موقع ملا کہ وہ اپنے ہتھیار تیز کر لیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی زبانیں سیکھیں، ان کے افکار وعلوم سے واقفیت حاصل کی اور اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ مسلمانوں کے مآخذ کو استعمال کر سکیں اور یوں اپنی تحریک کو آگے بڑھا سکیں۔

(۶) ۱۵ویں صدی عیسوی کے بعد یورپ نے پھر سے انگڑائی لی، اس کے عہدِ تاریک کا خاتمہ ہوا، اور ان کے ہاں علم و تحقیق، بیداری، تہذیب و تمدن کی ترقی کا دور شروع ہوا۔ یہ ان کے سیاسی فروغ سے ہم آہنگ تھا اور انہیں ضرورت تھی کہ ایشیاء اور افریقہ میں انہوں نے اپنی جو کالونیاں قائم کی ہیں انہیں مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے مادّی وسائل اور اسلحہ سے زیادہ توجہ علمی و ذہنی کاوشوں پر صرف کی جائے۔ چنانچہ استعمارِ مغرب کے تحفظ کے لیے بجائے خود تحریکِ استشراق کی سرگرمی ناگزیر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے مفتوح ممالک کے تمام علوم وفنون کو حاصل کرنے اور تحقیقات کے پردہ میں اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے، یورپی حکمرانوں نے تحریکِ استشراق کی مکمل سرپرستی کی۔ یہ سرپرستی صرف مالی صورت میں نہیں تھی مستشرقین کو وہ تمام سہولتیں مہیا کی گئیں جو ان کی تحقیق و تفتیش کے لیے ضروری تھیں۔

(۷) مذہبی اور سیاسی محرکات کے ساتھ تجارتی مفادات بھی تحریکِ استشراق سے وابستہ تھے۔ اقوامِ یورپ اور مشرقی ممالک میں رابطہ کی ابتداء تجارتی تعلقات سے ہی ہوئی تھی۔ پھر امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ وہی تجار بالآخر سیاہ و سفید کے مالک اور حکمران بن بیٹھے۔ تاہم منڈی والی تجارت میں وہ اب بھی منہمک تھے۔ استشراقی سرگرمیوں کے نتیجہ میں کتابوں کی طباعت و اشاعت، مورخین کی کتابوں کی جلد فروخت اور مستشرقین کی تعداد میں مسلسل اضافہ اہلِ یورپ کے تجارتی مفادات کے تحفظ و فروغ کا باعث بھی ہوا۔

اسباب و محرکات کا یہ مختصر سا تجزیہ، تحریکِ استشراق کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور ان کے مالہ، و ماعلیہ کو جاننے کے لیے کافی ہے۔ اس لیے اب ہم آگے بڑھ کر ایک نظر اُن اعتراضات، الزامات اور مفتریات پر ڈالنا چاہتے ہیں، جو مستشرقین کی طرف سے ہمارے ہادیِ برحق سیّد الانبیاء والرسل کی شخصیت و کردار کو (نعوذ باللہ) مجروح کرنے کے لیے ان کی تحریروں میں بالعموم پائے جاتے ہیں۔

اعتراضات، الزامات، مفتریات و ہفوات

مستشرقین کی جانب سے اسلام کے لیے بالعموم اور آنحضرت ﷺ کے لیے بالخصوص جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا اُس کا مختصر سا خاکہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے۔ اب جہاں تک سیرتِ رسول ﷺ کے حوالے سے ان کے اعتراضات اور الزامات کا تعلق ہے اِس مختصر مقالہ میں ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اس لیے بھی ممکن نہیں کہ اعتراضات و الزامات کی کوئی حد نہیں ہے اور وہ مستشرقین کی تحریروں میں، اُن کے پیدا کردہ لٹریچر میں، اور ان کے خرافات کے ذخیرہ میں بکثرت پائے جاتے ہیں (جو صدیوں پر پھیلا ہوا ہے) اُن کے ہاں الزامات و اعتراضات کی بہتات اس لیے بھی قابلِ فہم ہے کہ الزامات و اعتراضات قائم کر کے (خواہ وہ

Marfat.com

کتنے ہی بے بنیاد کیوں نہ ہوں) سیرتِ رسول ﷺ کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا۔مستشرقین کی حکمت عملی کا مستقل لازمی حصہ رہا ہے۔کیونکہ اس جہت سے یہ گنجائش باقی رہتی ہے کہ معصوم الذہن لوگ، اور وہ افراد جن کا علم ومطالعہ راسخ نہیں۔ان کے پروپیگنڈہ سے بآسانی منفعل ومتاثر ہو سکتے ہیں۔[۲۴۳] حق تو یہ ہے کہ مستشرقین کے تمام اعتراضات والزامات کو مرتب کر کے اُن کا مفصل جواب دیا جائے، لیکن اس کی نہ فرصت ہے نہ موقع، تاہم ذیل میں ہم مختصراً سیرتِ رسول کے حوالہ سے مستشرقین کے اعتراضات والزامات بلکہ مفتریات کو نقل کر رہے ہیں تاکہ عام قارئین یہ اندازہ کر سکیں کہ سیرت نبوی ﷺ کے باب میں مستشرقین نے کیا کیا گل کھلائے ہیں اور کیسے کیسے الزامات واعتراضات عائد کیے ہیں۔ان میں سے بیشتر اعتراضات ایسے ہیں جن کے بودے پن کو عام پڑھا لکھا مسلمان بھی محسوس کر سکتا ہے۔

نام، حسب ونسب

(۱) یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ پیغمبر اسلام کا نامِ گرامی اسمِ گرامی ''محمد'' (ﷺ) نہیں تھا بلکہ ماہومٹ (Mahomet) تھا۔بعض نے دل کی انتہائی کدورتوں کے ساتھ ''ماہونڈ'' (Mahound) یعنی بقول ان کے ''شہزادۂ تاریکی'' کا نام تجویز کیا۔اور بعض کے نزدیک ''بافومٹ'' (Baphomet) اور ''بافم'' (Bafum) تھا۔[۲۴۴]

(۲) نیچ ذات (Low birth) تھے۔[۲۴۵] (العیاذ باللہ)

تعارف

(۳) محمد ﷺ، دراصل خود ایک مسیحی پادری (Cardinal) تھے۔خواہش تھی کہ پوپ منتخب ہو جائیں۔یہ تمنا پوری نہ ہوئی تو انتقاماً رومی کلیسا سے تعلق منقطع کر لیا اور عیسائیت کے بالمقابل ایک نئے مذہب ''اسلام'' کو ایجاد کر لیا اور اپنے آپ کو مخالف پوپ قرار دے لیا۔[۲۴۶]

(۴) دنیائے مسیحیت میں نئے فرقے کے بانی تھے۔[۲۴۷]

(۵) مخالف مسیح (Anti-christ) اور دشمنِ عیسائیت تھے۔[۲۴۸]

(۶) ترکوں کے پیغمبر تھے۔[۲۴۹]

(۷) بُت پرست تھے۔[۲۵۰] (نعوذ باللہ)

(۸) خود اپنے آپ کو مرکزِ پرستش قرار دے لیا تھا۔[۲۵۱]

(۹) آپ بقول ایک مصنف ''عرب منافق ونا پاک تھے''۔[۲۵۲]

(۱۰) جین بررڈ (Genberard) کے نزدیک (خدانخواستہ) آپ ﷺ حیوان (Beast) تھے۔[۲۵۳]

(۱۱) آپ ﷺ (حاشا اللہ) شہوت پرست (Lesciverus) تھے۔خود بھی ملوث، اپنے پیروکاروں

کو بھی ملوث کیا۔ ۲۵۴ء

(۱۲) دھوکہ باز، مکّار، کاذب، جھوٹے، خوفناک حد تک بے شرم تھے۔ ۲۵۵ء (استغفر اللہ)

(۱۳) وہ ایک ہنر مند، مکمل سیاستدان تھے۔ ۲۵۶ء

نبوّت و رسالت

(۱۴) نبوت نتیجہ تھی ان کی طویل خود خیالی (Auto Suggestion) ۲۵۷ء یا خود ایعازی اور القائے نفس کا۔

(۱۵) وہ خواب بہت دیکھا کرتے تھے۔ وحی بھی بطور خواب دیکھا کرتے تھے۔ ۲۵۸ء

(۱۶) وہ بزعمِ خود اس خام خیالی میں مبتلا تھے کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے حالانکہ یہ محض ایک ڈھونگ تھا۔ بہرحال دُوسروں کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ اُن پر وحی اُترتی ہے محمد ﷺ نے ایک سفید دُودھیا رنگ کے کبوتر (Pigeon) یا فاختہ (Dove) کو سدھا رکھا تھا، جو ان کے کندھے پر بیٹھا رہتا اور وقفہ وقفہ سے چونچ مار مار کر ان کے کان میں سے دانے (Grains) چُگا کرتا تھا۔ اور اس طرح وہ دوسروں پر یہ تاثر قائم کرتے تھے کہ فرشتہ ربانی (جبریلؑ) ان پر وحی نازل کر رہا ہے اور انہیں املا کرا رہا (Dictating) ہے۔ ۲۵۹ء

(۱۷) انہیں (نعوذ باللہ) اعصابی مرض لاحق تھا اور وہ توہمات، فریب حسّی (Hallucination) میں مبتلا تھے۔ ۲۶۰ء

(۱۸) نزولِ وحی کے وقت مرگی کا دورہ پڑتا تھا۔ ۲۶۱ء

(۱۹) مرگی زدہ تو نہیں البتہ جنونی (Hysterical) ضرور تھے۔ کیونکہ وہ غیر متوازن اعصابی مزاج والے (Abnormal Nervous Temper) آدمی تھے۔ ۲۶۲ء

(۲۰) اعصابی دَورے پڑتے تھے، اور وہم ہو جاتا تھا کہ تابع الہام ہیں۔ ۲۶۳ء

(۲۱) اپنے الہامی اور الٰہیاتی مشن کے بارے میں خود مشکوک و متذبذب تھے۔ ۲۶۴ء

(۲۲) مذہبیت اور الٰہیات کی تشکیل میں شام کے مسیحی اثرات کو بڑا دخل تھا۔ ۲۶۵ء

(۲۳) ان کو بائبل کی تعلیمات کا علم تھا۔ ۲۶۶ء

(۲۴) نبوت کا تسلسل برقرار نہیں رہا۔ ۲۶۷ء

(۲۵) محمد (ﷺ) اُن کے فحش خیال میں نبی کاذب (False Prophet) تھے۔ ۲۶۸ء

(۲۶) وہ (نعوذ باللہ) مکار، دغاباز، مدعی کاذب (Imposture) تھے۔ ۲۶۹ء

(۲۷) شیطان کے آلہ کار، اور توہین آمیز جاسوس (Blasphemous Emissary of

Marfat.com

(Satan) تھے۔۲۷۰

(۲۸) ترویج و اشاعت مذہب کے لیے تشدّد (Violence) کا سہارا لیا۔۲۷۱

(۲۹) اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا۔۲۷۲

(۳۰) ہِٹی (Hitti) کے خیال میں حضور ﷺ کے ابتدائی حالات کا پتا نہیں چلتا۔۲۷۳ اور لامنس کے نزدیک اُن ﷺ کی مکی زندگی کے حالات محض افسانہ (Fiction) ہیں۔۲۷۴

(۳۱) اصل استفادہ عیسائیت سے کیا۔ چنانچہ مسیحی نسطوری راہب بحیرہ سے ملاقات خاص ہے۔۲۷۵

(۳۲) مستشرقین کے نزدیک ایک مقبول عام و زنی الزام یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی مکہ سے پیغمبرانہ رہی لیکن مدینہ جا کر بادشاہی میں بدل گئی اور وہاں لشکر کشی انتقام خونریزی کا بازار گرم کر دیا۔۲۷۶

کارہائے نبوت و رسالت۔ واقعاتِ سیرت

(۳۳) دنیا داروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی اختیار کی۔۲۷۷

(۳۴) میور لکھتا ہے: ''کارِ نبوت کی ابتدا میں تو ایمان داری سے یہودی اور عیسائی طور طریقوں اور نظام کو اپنایا گیا اور اپنے مذہب کی انہیں بنیاد بنا دیا گیا، لیکن جب مطلب حاصل ہو گیا اور اقتدار حاصل ہو گیا تو اُن سے برأت ظاہر کی اور پھر انہیں بالکل مردود قرار دے دیا''۔۲۷۸

(۳۵) اسلام کو یہودیت سے بدلنے کی کوشش کی۔ واٹ لکھتا ہے کہ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ جا کر یہ کوشش کی کہ اسلام کو مذہب قدیم ''یہودیت'' سے بدل دیا جائے''۔۲۷۹

(۳۶) تحویل قبلہ۲۸۰ (ایک خاص وقت کے بعد یہودیت و عیسائیت سے بیزاری کی کوشش)

(۳۷) شاید اسلام یہودیت کا ایک حصہ یا فرقہ بن جائے۔۲۸۱

(۳۸) محمد ﷺ نے مسلمانوں کو اپنے آپ کی پرستش کی دعوت دی۔۲۸۲

(۳۹) منشورِ مدینہ (Charter of Madinah) میں حضور ﷺ کا مقام و مرتبہ غیر معین تھا۔۲۸۳

(۴۰) حضور ﷺ کی ہجرت سے قریشِ مکہ بڑے خوش ہوئے۔۲۸۴

(۴۱) حضور ﷺ نے قریشِ مکہ کو (بلا وجہ) اپنے خلاف بھڑکایا۔۲۸۵

(۴۲) غزوات محض لوٹ مار کی مہمیں (Plundering Expeditious) تھیں۔۲۸۶ اور عربوں کی غربت و تنگدستی دور کرنے کا ذریعہ۔

(۴۳) بعض یورپی مصنفین کا خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ کا لایا ہوا انقلاب اور مذہبی اصلاحات اس لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں کہ وہاں کا ماحول دراصل ان کے موافق اور مناسب

Marfat.com

(Congeniel) تھا اور اہلِ عرب مذہبی معاشرتی تبدیلی کے متلاشی اور پیاسے تھے۔ ۲۸۷

(۴۴) جنگِ موتہ...... جنگ کا مقصد متعین کرنا مشکل ہے۔ ۲۸۸

متفرقات

(۴۵) ٹائن بی کے خیال میں آنحضرت ﷺ محض قیصرِ عرب تھے۔ ۲۸۹ ایک سیاسی لیڈر تھے۔ ۲۹۰

(۴۶) جے سی آرچر کے نزدیک محمد ﷺ محض ایک صُوفی اور مجذوب (Mystic) تھے۔ ۲۹۱

(۴۷) آپ ﷺ (نعوذ باللہ) راہزنوں، قزاقوں کے سردار (Robber chief) تھے۔ ۲۹۲

(۴۸) اسلام ایک بدقسمت تاریخی حادثہ تھا اور محمد ﷺ مرگی میں مبتلا ہو کر مر گئے جو شدّتِ بھوک کا نتیجہ تھا۔ ۲۹۳

(۴۹) اسلام ایک اشتراکی رجحان تھا ۲۹۴ اور محمد ﷺ صرف ایک معاشرتی سماجی مصلح تھے نہ کہ پیغمبر۔ ۲۹۵

(۵۰) وہ ایک موقع پرست، مفاد پرست تھے۔ ۲۹۶

(۵۱) کثرتِ ازدواج اور میل الی النسا۔ ۲۹۷ عورتوں کے دوست، سنجیدگی اور معقولیت کے دشمن، بہت شادیاں کرنے والے۔ ۲۹۸

(۵۲) آنحضرت ﷺ اور قرآن، تہذیب وتمدّن، حریّت وآزادی اور سچائی کے بدترین مخالف اور ضدی وسرکش دشمن (Stubborn Enemies) تھے کہ ان جیسا دشمن صفحہ ہستی پر نمودار نہیں ہوا۔ (نعوذ باللہ) ۲۹۹

(۵۳) لونڈی، غلام بنانے کی اجازت دی اور اس پر عمل بھی کیا۔ (نعوذ باللہ) ۳۰۰

(۵۴) داستانِ غرانیق۔ شیطانی آیات۔ (نعوذ باللہ) ۳۰۱

(۵۵) واقعہ حضرت زید وزینب۔ (نعوذ باللہ) ۳۰۲

(۵۶) اُن کا آہنی تابوت (Iron Coffin) خانہ کعبہ میں دو ۲ ستونوں کے درمیان معلق رہا۔ ۳۰۳

(۵۷) ابتداً میں اپنی نبوت کا جواز پیدا کرنے کے لیے تمام انبیائے بنی اسرائیل کو تسلیم کیا لیکن جب قوت واقتدار مل گیا تو سب سے بڑے نبی خود بن بیٹھے اور سلسلۂ نبوت کو اپنی ذات پر ختم کر لیا۔

(۵۸) بانی اسلام ﷺ سے معجزات کی نسبت محض انبیاء ماسبق کے ہم پلّہ ثابت کرنے کے لیے قائم کی گئی۔

(۵۹) ایک نیا اور جھوٹا مذہب جاری کیا، حالانکہ یہ ان کا خود ساختہ تھا۔ ۳۰۴

(۶۰) بداطوار، جادوگر، لٹیرا، ریاکار۔ ۳۰۵ (استغفر اللہ)

(۶۱) ایسا خدا بن بیٹھا، جس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے اس کے پیرو انسان کی قربانی پیش کرتے

Marfat.com

ہیں۔۶۰۶ع

(۶۲) محمد ﷺ نے شراب کی مستی میں جان دی، اس کے پیروؤں نے اُس کی لاش کوڑے کے ڈھیر پر پھنکوادی۔ ۶۰۷ع (اعاذنا اللہ منہ)

(۶۳) وہ دوسروں کو دھوکا دیتا تھا، بلکہ خود دھوکا میں مبتلا تھا۔ ۶۰۸ع (نقل کفر، کفر نہ باشد)

اعترافات

اگر چہ، گزشتہ فصل کی روشنی میں مستشرقین کا انتہائی بے باکانہ، گستاخانہ اور معاندانہ رویہ بڑی حد تک سامنے آ جاتا ہے تاہم یہ ان کے مطالعہ سیرت کا صرف ایک رُخ ہے جو اوّل تا آخر کذب و افترا سے عبارت ہے۔ ایک دوسرا رُخ وہ ہے جس میں مستشرقین کے بعض سرکردہ افراد اپنے تعصب و تظلم کا برملا اعتراف کرتے ہیں، اور جب ذرا انصاف و اعتدال سے کام لیتے ہیں تو اقرار کرتے ہیں کہ ذاتِ رسالت مآب ﷺ ہر عیب سے منزّہ ہر الزام سے مبرّا، خَلق و خُلق کی تمام خوبیوں سے مرصّع دنیائے انسانیت کا حاصل تھی اور اُن کی کامیابیوں، کامرانیوں اور کارناموں کے حوالے سے اُن کا کوئی مثیل نہیں ہے۔ اس موضوع پر اگر چہ دفتر کے دفتر نقل کیے جا سکتے ہیں لیکن ہم یہاں صرف چند نمونوں پر اکتفا کر رہے ہیں:

ا۔ اثر انگیز شخصیت

"جسٹینین کی وفات کے چار سال بعد ۵۶۹ء میں، مکّہ میں وہ آدمی پیدا ہوا جس نے انسانیت پر تمام انسانوں میں سب سے زیادہ اثر ڈالا"۔ (ڈریپر) ۶۰۹ع

۲۔ ناقابلِ فراموش:

"اگر مقصد کی عظمت، وسائل کی قلت اور حیرت انگیز نتائج! ان تین باتوں کو انسانی تعقل و تفکر کا معیار بلند مانا جائے تو کون ہے، جو تاریخ کی کسی قدیم یا جدید شخصیت کو محمد (ﷺ) کے مقابل لانے کی ہمت کر سکے۔ لوگوں کی شہرت ہوئی کہ انہوں نے فوجیں بنا ڈالیں، قوانین وضع کرائے اور سلطنتیں قائم کر ڈالیں۔ لیکن غور طلب یہ ہے کہ انہوں نے حاصل کیا کیا؟ صرف مادّی قوتوں کی جمع پونجی؟ وہ تو ان کی آنکھوں کے سامنے لٹ گئی۔ بس صرف یہی ایک آدمی ایسا ہے، جس نے یہی نہیں کہ فوجوں کو مرتب کیا، قوانین وضع کیے اور مملکتیں، سلطنتیں قائم کیں بلکہ اس کی نظر کیمیا اثر نے لاکھوں متنفس ایسے پیدا کر دیئے، جو اس وقت کی معلوم دنیا کی ایک تہائی آبادی پر مشتمل تھے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر، انہوں نے قربان گاہوں کو، خداؤں کو، دین و مذہب کے پیروکاروں کو، خیالات و افکار کو، عقاید و نظریات کو، بلکہ روحوں تک کو بدل ڈالا۔ پھر صرف ایک کتاب کی بنیاد پر، جس کا لکھا ہوا ہر لفظ قانون تھا، ایک ایسی روحانی اُمت کی تشکیل کر دی گئی جس میں ہر زمانے، وطن، قومیت کا حامل فرد موجود تھا۔ وہ ہمارے

سامنے مسلم قومیت کی ایک ناقابلِ فراموش خصوصیت یہ چھوڑ گئے کہ صرف ایک ان دیکھے، خدا سے محبت اور ہر معبودِ باطل سے نفرت''۔ (لا مارٹن) ۱۰ے

۳۔ جامعیتِ کُبریٰ

''عالمِ الٰہیات، فصاحت و بلاغت میں یکتائے روزگار، رسول (بانی مذہب)، آئین و قانون ساز (شارع)، سپہ سالار، فاتح اصول و نظریات، معقول، عقاید کو جلا بخشنے والے، بلا تصویر مذہب کے مبلّغ، بیسیوں علاقائی سلطنتوں کے معمار، دینی روحانی حکومت کے موسس، یہ ہیں محمد رسول اللہ ﷺ۔ (جن کے سامنے پوری انسانیت کی عظمتیں ہیچ ہیں) اور انسانی عظمت کے ہر پیمانے کو سامنے رکھ کر ہم پوچھ سکتے ہیں، ہے کوئی جو اُن سے زیادہ بڑا، اُن سے بڑھ کر عظیم ہو؟'' (لا مارٹن) ۱۱ے

۴۔ بے مثال کارنامہ

''کسی انسان نے اتنے قلیل ترین وسائل کے ساتھ، اتنا جلیل ترین کارنامہ انجام نہیں دیا، جو انسانی ہمت و طاقت سے اس قدر ماوراٗ تھا۔ محمد (ﷺ) اپنی فکر کے ہر دائرے اور اپنے عمل کے ہر نقشہ میں، جس بڑے منصوبہ کو رُو بہ عمل لائے، اُس کی صورت گری بجز اُن کے، کسی کی مرہونِ منت نہ تھی، اور مُٹھی بھر صحرائیوں کے سوا ان کا کوئی معاون و مددگار نہ تھا۔ اور آخر کار ایک اتنے بڑے مگر دیر پا انقلاب کو برپا کر دیا، جو اس دنیا میں کسی انسان سے ممکن نہ ہو سکا۔ کیونکہ اپنے ظہور سے لے کر اگلی دو صدیوں سے بھی کم عرصہ میں اسلام، فکر و عقیدہ اور طاقت و اسلحہ دونوں اعتبار سے سارے عرب پر، اور پھر ایک اللہ کا پرچم بلند کرتے ہوئے، فارس، خراسان، ماوراء النہر، مغربی ہند، شام، مصر، حبشہ، شمالی افریقہ کے تمام معلوم علاقوں پر بحر متوسط کے جزیروں پر اور اندلس کے ایک حصہ پر بھی چھا گیا''۔ (لا مارٹن) ۱۲ے

۵۔ تاریخ کی پوری روشنی میں

''یہ صحیح ہے کہ تاریخ کی روشنی میں ہم حیاتِ مسیح علیہ السلام کے کچھ واقعات دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اُن تیس سالوں سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے جو اُنہوں نے (نبوت سے پہلے) گزارے۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں، اس نے اگرچہ دنیا کی معلومات میں کسی حد تک اضافہ کر دیا ہے اور آیندہ مزید انکشافات متوقع ہیں، تاہم ایک مثالی زندگی، کون جانے، کتنی قریب ہے کتنی دور! کتنی ممکن ہے اور کتنی ناممکن! ہم ابھی بہت کچھ نہیں جانتے۔ ہم اُن کی ماں کے بارے میں، ان کی گھریلو زندگی کے بارے میں، ان کے ابتدائی دوست احباب اور ان کے تعلقاتِ باہم کے بارے میں اور اس سلسلہ میں بھلا کیا جانتے ہیں کہ مسندِ نبوت پر وہ بتدریج فائز ہوئے یا وحی پا کر یکدم، خدائی مشن کے حامل بن گئے؟ بہر حال کتنے ہی سوال ایسے ہیں جو ہم میں سے اکثر کے ذہنوں سے ٹکراتے ہیں، مگر وہ بس سوالات ہیں، جواب کے بغیر! البتہ محمد (ﷺ) کے بارے میں اتنا ہی

Marfat.com

جانتے ہیں جتنا کہ لوتھر اور ملٹن کے بارے میں۔ یہاں واقعات کا دامن، خیال محض، قیاس، تخمین وظن، ماورائے فطرت روایات اور فسانہ وفسوں سے آلود ہونے کے بجائے، حقائق سے آراستہ ہے۔ اور ہم بہ آسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ یہاں کوئی شخص نہ خود اپنے آپ کو دجل وفریب میں مبتلا کر سکتا ہے نہ دوسروں کو۔ یہاں ہر چیز دن کی پوری روشنی میں جگمگا رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی شخصیت کے بہت سے پرت ہیں اور ان میں سے ہر ایک تک ہماری رسائی ممکن نہیں ہے۔ تاہم محمد (ﷺ) کی زندگی کے متعلق ہم ہر چیز جانتے ہیں۔ اُن کی جوانی، اُن کی اٹھان، اُن کے تعلقات، اُن کی عادتیں، ابتدائی حالات اور پہلی وحی کے نازل ہونے تک کا لمحہ، ذہنی سفر اور ارتقاء وغیرہ۔ نیز ان کے داخلی، باطنی زندگی کے متعلق بھی، اور یہ کہ جب اعلانِ نبوت کر چکے تو پھر ہم ایک ایسی مکمل کتاب پاتے ہیں جو اپنی ابتداء، اپنی حفاظت اور متن وغیرہ کے کئی پہلوؤں کے لحاظ سے بالکل ممتاز ومنفرد ہے۔ اور اب تک ایسی کوئی معقول ومستند وجہ سامنے نہیں آئی جس کی بنیاد پر اس کتاب کے خلاف کوئی شدید اعتراض کیا جا سکے''۔ ۱۳ (باسورتھ اسمتھ)

۶۔ انقلاب، انقلاب، انقلاب

''بہرحال مختصراً عرب کے یہ معاشرتی اور مذہبی حالات تھے، جن میں، اگر ہمیں والٹیئر کی زبان کے استعمال کی اجازت دی جائے، عرب کا رُخ بدل گیا، انقلاب آ گیا۔ انقلاب بھی کیسا؟ ایسا انقلاب کہ آج تک کسی سرزمین پر نہیں آیا، مکمل ترین، اچانک ترین اور سرتاسر غیر معمولی انقلاب!'' ۱۴ (باسورتھ اسمتھ)

۷۔ منفرد مقام

''تاریخ مذاہب وادیان میں محمد (ﷺ) کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ وہ نہ ولی تھے نہ فرشتہ۔ اور خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کر کے دکھایا، اس میں کوئی مافوق البشریت نہ تھی۔ اور ان کی عظیم شخصیت میں انسانی عمل کے اعتبار سے کوئی ایسی چیز نہ تھی جو عام حالات میں اُن کو دوسرے مسلمانوں سے ممتاز ومیز کر سکے''۔ ۱۵ (بوڈلے)

۸۔ سب سے بڑا انسان

''دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے، جس نے دس برس کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفے، ایک نئی شریعت، ایک نئے تمدّن کی بنیاد رکھی، جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی۔ لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ اُمّی اور ناخواندہ تھا۔ وہ کون؟ محمد بن عبداللہ قریشی، عرب اور اسلام کا پیغمبر! اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لیے اور اس سلطنت کے لیے، جس کو اس نے قائم کیا، ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دیئے۔'' ۱۶

۹۔ عظیم و مخلص

"عظیم۔ محض اس لیے نہیں کہ وہ ایک روحانی پیشوا تھے۔ انہوں نے ایک عظیم ملت کو جنم دیا۔ اور ایک عظیم سلطنت قائم فرمائی۔ بلکہ ان سب سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک عظیم عقیدہ کا پرچار کیا۔ مزید برآں اس لیے بھی (عظیم تھے) کہ وہ اپنے آپ سے بھی مخلص و وفادار تھے، اپنے امتیوں سے بھی مخلص تھے اور اپنے اللہ سے بھی مخلص و وفادار تھے۔ اِن باتوں کو تسلیم کرتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلام ایک کامل، سچا مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں کو انسانیت کی تاریک گہرائیوں سے نکال کر نور و صداقت کی رفعتوں سے ہمکنار کرتا ہے"۔ ۳۱۷ (لیونارڈ)

۱۰۔ مقام و مرتبہ

"محمد (ﷺ) ایک رسول تھے نہ کہ صوفی۔ یہ حقیقت اتنی واضح ہے کہ کوئی کہہ کر بھی شرمندہ ہو جائے۔ وہ جو اِن کے گرد جمع ہوئے اور جو ملّتِ اسلامیہ کے اوّلین ارکان تھے، وہ قانون کی اطاعت پر، توحید الٰہی پر راضی تھے اور محمد (ﷺ) کی تعلیمات اور اُن کے اُسوہ کی پیروی پر اکتفا کرنے والے تھے۔ وہ مطمئن تھے کہ وہ ایک سیدھے سادے اور مضبوط دین کے پیرو ہیں جو مختصر عبادات اور چند مراسم پر مشتمل تھا"۔ ۳۱۸ (گاڈفرے ڈی مبائنز)

"محمد (ﷺ) نے ازخود کبھی معصومیت کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ ایک موقع پر تو ایسی وحی نازل ہوئی، جس میں انہیں تنبیہ کی گئی کہ انہوں نے ایک باعزّت شہری سے بات کرنے میں ایک فقیر سے منہ کیوں موڑا؟ پھر انہوں نے اُس وحی کو شائع بھی کیا۔ یہ وہ آخری دلیل ہے جس کی روشنی میں اس بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ وہ (نعوذ باللہ) ایک مدعی کاذب (Imposter) تھے۔ جیسا کہ معصوم مسیحی اُس عظیم عرب کو الزام دیتے ہیں"۔ ۳۱۹ (لیتھر)

"محمد (ﷺ) نے اپنا جو مذہبی نظام قائم فرمایا وہ نہ صرف یہ کہ ان کے اپنے ہم مشربوں کے فہم و ادراک کے مطابق تھا اور اس ملک میں پائے جانے والے رسوم و رواج اور اُن کے ساتھیوں کے جذبات سے ہم آہنگ تھا۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ عام انسانی حالات و نظریات سے بھی ایسی مناسبت و ہم آہنگی رکھتا تھا کہ جس کے نتیجہ میں تمام انسانوں کی نصف سے زیادہ آبادی نے اسے قبول کیا۔ اور یہ سب کچھ چالیس سال سے بھی کم عرصہ میں ہو گیا"۔ ۳۲۰ (کاونٹ ڈی بولین ویلیرز)

۱۱۔ روشنی

"پس وہ روشنی آ گئی۔ عربوں کی تاریک روحوں کو منور کرنے کے لیے۔ ایک ایسی تاریکی میں جو موت کی نقیب تھی۔ چکا چوند پیدا کرنے والی روشنی، زندگی اور آسمانوں کا جاہ و جلال لیے ہوئے، اُس نے

Marfat.com

اسے ''وحی'' کہا اور لانے والے فرشتہ کو جبرئیل۔ اور ہم ابھی تک سوچ رہے ہیں کہ اسے کیا نام دیں؟ یہ خدائے ذوالجلال کی طرف سے اشارہ ہے۔ ہمارے سمجھنے کے لیے۔ کسی چیز کی سچائی اور حقیقت جاننے کی کوشش، دراصل ایک روحانی عمل ہے۔ جس کے بارے میں ہر منطق اور قیاس ہوا میں تیر چلانے کے مترادف ہے۔ بقول نوالی ایک خدا پر اعتقاد کا اعلان، کیا ایک معجزہ سے کم تھا؟ کہ محمد (ﷺ) کا وجود کامل، جسم وروح اس حقیقت اور سچائی کے نور سے مستنیر تھا''۔[۳۲۱] (کارلائل)

۱۲۔ نُور ہی نُور

''عرب قوم کو یہی نور ظلمتوں سے نکال کر روشنی میں لایا۔ عرب کو اسی کے ذریعہ پہلے پہل زندگی ملی۔ بھیڑوں بکریوں کے چرانے والے لوگ، جو ازل سے صحراؤں میں بے کھٹکے، بے روک ٹوک گھومتے پھرتے تھے کہ ایک ''ہیرو پیغمبر'' ان کی طرف بھیجا گیا۔ ایک پیغام کے ساتھ، جس پر وہ ایمان لا سکتے تھے۔ اور پھر سب نے دیکھا کہ جو کسی کے نزدیک قابلِ اعتنا نہ تھے، دنیا بھر کے لیے قابلِ ذکر بن گئے۔''[۳۲۲] (کارلائل)

۱۳۔ عظیم فاتح

''فتح مکّہ کے اِس موقع پر یہ بات ان کے حق میں جائے گی اور وہ قابلِ تعریف ٹھہریں گے کہ اُس وقت جبکہ اہلِ مکّہ کے، ماضی کے انتہائی ظالمانہ سلوک پر انہیں جتنا بھی طیش آتا، کم تھا اور ان کی آتشِ انتقام کو بھڑکانے کے لیے کافی تھا۔ مگر انہوں نے اپنے لشکر وسپاہ کو ہر قسم کے خون خرابے سے روکا اور اپنے اللہ کے سامنے انتہائی بندگی وعبدیت کا مظاہرہ کیا اور شکر بجا لائے۔ صرف دس بارہ آدمی ایسے تھے، جنہیں پہلے سے ہی، ان کے وحشیانہ رویہ کی وجہ سے جلا وطن کر دیا گیا تھا اور ان میں سے بھی صرف چار کو قتل کیا گیا۔ لیکن دوسرے فاتحوں کے وحشیانہ افعال وحرکات کے مقابلہ میں اسے بہرحال انتہا درجہ کی شرافت وانسانیت سے تعبیر کیا جائے گا (مثال کے طور پر صلیبیوں کے مظالم، کہ ۱۰۹۹ء میں فتح یروشلم کے موقع پر انہوں نے ستر ہزار سے زائد مسلمان مرد، عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا، یا وہ انگریز فوج جس نے صلیب کے زیر سایہ لڑتے ہوئے ۱۸۷۴ء میں افریقہ کے سنہری ساحل پر ایک شہر کو نذرِ آتش کر ڈالا) محمد (ﷺ) کی فتح درحقیقت دین کی فتح تھی، سیاست کی فتح تھی، انہوں نے ذاتی مفاد کی ہر علامت کو پسِ پشت ڈالا اور کرّ وفر شاہی کے ہر نشان کو مسترد کر دیا۔ اور جب قریش کے مغرور ومتکبّر سرداران کے سامنے سرنگوں ہو کر آئے تو محمد (ﷺ) نے اُن سے پوچھا کہ ''تمہیں مجھ سے کیا توقع ہے؟'' ''رحم، اے سخی وفیاض برادر! رحم'' وہ بولے ''جاؤ تم سب آزاد ہو''۔ انہوں نے فرمایا''[۳۲۳] (آرتھر گلمین)

۱۴۔ صاحبِ خلقِ عظیم

''اخلاق وعادات میں وہ حد درجہ سادہ تھے۔ البتہ اپنے معمولات میں وہ بہت محتاط تھے۔ ان کا

Marfat.com

کھانا پینا، ان کا لباس اور فرنیچر وغیرہ وہی معمولیؔ درجہ کا تھا اور ہمیشہ وہی رہا جبکہ وہ اپنی طاقت وحکومت کی معراج تک پہنچے۔ انہیں تخّیل وتصور کی بے پناہ قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت ہوئی تھیں، ان کا ذہن رسا تھا اور نازک سے نازک جذبات واحساسات کا پرتو قبول کر لیتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پردے کے پیچھے بھی ایک کنواری سے زیادہ باحیاء، عفت مآب اور شرمیلے تھے۔ اپنے چھوٹوں سے انتہائی رعایت کرتے اور یہ پسند نہ کرتے کہ ان کی کمزوریوں کو تلاش کر کے مذاق اڑایا جائے۔ ان کے خادم انس کہتے ہیں کہ میں دس سال تک اُن کی خدمت میں رہا لیکن انہوں نے کبھی اُف تک نہ کہا۔ انہیں بچوں سے بہت محبت تھی۔ وہ انہیں راستے میں روک لیتے اور ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے۔ انہوں نے زندگی میں کسی کو نہیں مارا۔ اگر کسی کے بارے میں انتہائی برائی بیان کرتے تو بس اتنا کہتے کہ ''اسے کیا ہوگیا ہے؟ اس کی پیشانی خاک آلود ہو''۔ جب اُن ﷺ سے کسی کے بارے میں بددعا کرنے کی درخواست کی جاتی تو فرماتے: ''میں بددعا کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں، میں تو انسانیت کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔'' وہ بیماروں کی عیادت کرتے، کوئی جنازہ ملتا تو پیچھے چلتے، غلام کی دعوت کو بھی قبول کر لیتے۔ اپنے کپڑوں کی مرمت خود کر لیتے، بکریوں کا دودھ خود دوہ لیتے اور دوسروں کا ہمہ تن انتظار کر لیتے۔ وہ اپنی ازواج کے ساتھ ایک قطار میں بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے معمولی مکانوں میں رہتے تھے۔ وہ آگ خود جلا لیتے، فرش کی جھاڑو دے لیتے۔ تھوڑا بہت کھانا جو کچھ بھی گھر میں موجود ہوتا، اس میں وہ لوگ ہمیشہ شریک ہوتے جو وہاں موجود ہوتے، ان کے گھر کے باہر ایک چھپّر (صفّہ) تھا جہاں ایسے متعدد غریب افراد موجود رہتے جن کی گزر بسر کا تمام تر انحصار اُنہی کی فیاضی پر منحصر تھا۔'' ۳۴۴ (لین پول)

۱۵۔ سنجیدگی، اخلاص، وفاداری

''محمد (ﷺ) پر کارلائل کے خطبات کے بعد سے مغرب کو یہ اچھی طرح معلوم ہوگیا ہے کہ محمد (ﷺ) کی سنجیدگی پر یقین کرنے کی معقول وجوہات موجود ہیں، اپنے ایمان وعقیدہ کی خاطر مظالم سہنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا، اُن پر اعتقاد رکھنے والوں کا اعلیٰ اخلاق وکردار، اور ان کی طرف امام وپیشوا کی حیثیت سے دیکھنا، پھر آخر کار ان کی عظمتیں اور کامیابیاں، یہ سب دلیل ہیں ان کے اخلاصِ کامل کی۔ اس لیے محمد (ﷺ) کو ایک مدعی کاذب (Imposter) قرار دینے سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ اور پیدا ہو جاتے ہیں۔ مزید برآں تاریخ کی کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے جسے مغرب میں اس قدر کم سراہا گیا ہو جتنا کہ محمد (ﷺ) کو۔ اس لیے اگر ہم محمد (ﷺ) کو کچھ بھی سمجھنے کی نیت رکھتے ہوں تو ضروری ہے کہ ہم محمد (ﷺ) کو اپنے مشن میں دیانت دار قرار دیں اور مقصد سے ان کے خلوص اور وابستگی کے قائل ہو جائیں۔ اگر ہم اُن غلطیوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں جو اپنے ماضی سے ہم نے ورثہ میں پائی ہیں تو ہمیں ہر معاملہ میں ان کے خلوص اور

دیانت کو بہر حال پیش نظر رکھنا ہوگا جب تک کہ کوئی الزام ان کے خلاف پوری طرح ثابت نہ ہو جائے"۔

(واٹ)[۲۵]

"یہ بات ان کی زندگی کے ہر واقعہ سے ثابت ہے کہ ان کی زندگی اغراض و مفاد پرستی سے کلیتہً خالی تھی۔ مزید یہ کہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اپنی نگاہوں کے سامنے دین کے مکمل قیام و استحکام اور لامحدود اختیارات حاصل ہو جانے کے بعد بھی انہوں نے اپنی ذات اور انا کی تسکین کا کوئی سامان بہم نہیں پہنچایا۔ بلکہ آخر وقت تک اُسی سادہ طرز و انداز کو برقرار رکھا جو اوّل دن سے اُن کے بود و باش سے نمایاں تھا۔" (ڈیون پورٹ)[۲۶]

۱۶۔ مشن کی سچائی

"محمد (ﷺ) کو بلا شک و شبہ اپنے مشن کی سچائی پر یقین تھا۔ وہ اس پر مطمئن تھے کہ اللہ کے فرستادہ ہونے کی حیثیت سے انہوں نے ملک کی تعمیر و اصلاح کی ہے۔ ان کا اپنا مشن نہ تو بے بنیاد تھا اور نہ فریب دہی، جھوٹ و افترا پر مبنی تھا بلکہ اپنے مشن کی تعلیم و تبلیغ کرنے میں نہ کسی لالچ یا دھمکی کا اثر قبول کیا اور نہ زخموں اور تکالیف کی شدتیں ان کی راہ کی رکاوٹ بن سکیں۔ وہ سچائی کی تبلیغ مسلسل کرتے رہے۔"[۲۷]

(ڈیون پورٹ)

۱۷۔ سچے رسول

"جہالت! جس کا مظاہرہ اکثر و بیشتر مسیحیوں کی طرف سے مسلمانوں کے مذہب کے بارے میں ہوتا رہتا ہے، افسوسناک امر ہے۔ محمد (ﷺ) اس وقت کی اقوام میں، ایک خدا پر یقین رکھتے تھے۔ اور دوسرے خداؤں کی نفی کرتے تھے۔ انہوں نے بہ تاکید راست بازی اور دین داری کو کردار کا سرچشمہ قرار دیا۔ اور بدرجۂ فرض متعدد نمازوں کی، حیّ و قیوم خدا کے لیے ادائیگی، تمام انسانوں کی عزت و احترام، اور سب کے ساتھ رحم و شفقت برتنے پر زور دیا۔ ہر قسم کی نشہ آور چیزوں سے پرہیز، ہر معاملے میں عدل و توازن، اور ہر قسم کی تعلیم حاصل کرنے کی تلقین ان کے دین و مذہب کا حصہ تھی۔ لہٰذا محمد (ﷺ) ایک روحانی قوت کے مالک اور ایک سچے رسول تھے۔ مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے وہ خدا سے ہمکلام ہوتے تھے اور سرچشمہ روحانی سے ان پر وحی اُترتی تھی۔"[۲۸] (لنڈسے)

۱۸۔ امتحانِ سخت سے گزرے

"اُن سے پہلے کوئی پیغمبر اتنے سخت امتحان سے نہ گزرا تھا جیسا کہ محمد (ﷺ)۔ کیونکہ منصبِ نبوت پر سرفراز ہوتے ہی انہوں نے اپنے آپ کو سب سے پہلے اُن لوگوں کے سامنے پیش کیا جو انہیں سب سے زیادہ جانتے تھے اور جو ان کی بشری کمزوریوں سے بھی سب سے زیادہ واقف ہو سکتے تھے۔ لیکن دوسرے

پیغمبروں کا معاملہ برعکس رہا کہ وہ سب جگہ، سب کے نزدیک معزز و محترم ٹھہرے اِلّا یہ کہ جو انہیں اچھی طرح جانتے تھے۔" ۳۲۹ (گبن)

۱۹۔ آسمانوں کی بادشاہت زمین پر

"اسلام کے ذریعہ محمد (ﷺ) نے دس سال کے اندر ہی عربوں کی شدید ترین نفرتوں کو، انتقامی جذبات کو، نزاع و انتشار کو، رقابت و عداوت کو نکال پھینکا، لاقانونیت، عورتوں کی ذلت، سُود خوری، شراب خوری، قتل و غارت گری، دختر کشی کی رسوماتِ قبیحہ کا استیصال کیا اور انسانی قربانیوں، سفیہانہ خیالات و توہمات اور مادیت و اشیاء پرستی سے نجات دلائی۔ پھر اسی مذہب کے ذریعہ آسمانوں کی اُس بادشاہت کو اُنہوں نے عملاً اِس زمین پر قائم کر دیا جس کی بشارت ذوق و شوق سے جناب مسیح نے دی تھی۔" ۳۳۰ (گبن)

۲۰۔ ہمہ گیر اصلاح

"ممکن ہے یہ سوچا جائے کہ وہ آدمی، جس نے اتنی بہت سی اور تا دیر قائم رہنے والی اصلاحات کیں، انواع و اقسام کی بت پرستی کے بدلے، جس میں لوگ مدّتوں سے مبتلا تھے، ایک خدا کی عبادت کا داعی بنا، جس نے دُختر کشی کی رسمِ قبیح کو مٹایا، شراب اور دوسری نشہ آور اشیاء کو حرام ٹھہرایا، جُوئے کی ممانعت، نسبتاً ایک دائرہ میں رہتے ہوئے تعدّدِ ازواج کو محدود کیا، وغیرہ وغیرہ۔ کیا ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اُس ﷺ کا خدائی مشن اُس کے ذہن کی محض اختراع تھی؟ اور کیا وہ جھوٹ کو جانتے بوجھتے نبھاتا رہا؟ نہیں، ہرگز نہیں! محمد (ﷺ) کو درحقیقت سچے مذہبی ادراکات اور روحانی احساسات حاصل تھے، جن کے سبب انہوں نے اپنے مشن کو انتہائی مستقل مزاجی، پامردی و استقلال سے آگے بڑھایا اور نہ اُس کے جھٹلائے جانے کی پروا کی، نہ اس کی راہ میں مصائب و مشکلات کی۔ یہ سچائی، یہ حق کی معرفت انہیں ابتداً سے انتہاء تک حاصل رہی یعنی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سامنے پہلی وحی کے نزول سے لے کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باہوں میں آخری سانس لینے تک۔" (ڈیون پورٹ)

۲۱۔ عظمتوں کے نشاں

"حالات، مواقع اور وقت سب نے محمد (ﷺ) کا ساتھ دیا اور مختلف عوامل نے مل کر ان کی زندگی میں کامیابیوں کی اور ان کے بعد اسلام کی توسیع و ترقی کی راہ ہموار کی۔ محمد (ﷺ) کی ذات میں صفات و کمالات کا جو حسین امتزاج موجود تھا، اُس کی تین جہتیں تھیں۔ ایک نبوت کا فیضان۔ دوسرے سیاست و حکمرانی میں اُن کی بصیرت۔ اور تیسرے ایک منتظم کی حیثیت سے اُن کی مہارت و حذاقت اور تمام مناصب پر اہل ترین افراد کا انتخاب۔ جب کوئی اسلام کی ابتدائی تاریخ اور سیرت محمد (ﷺ) پر جس حد تک نظر ڈالتا ہے وہ اُسی حد تک ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں پر حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ حالات نے انہیں کس درجہ ساز

Marfat.com

کاری عطا کی، اُس طرح کے مواقع تو کسی کو شاذ و نادر حاصل ہوتے ہیں۔ بالکل وقت کی آواز بن کر ایک پیغمبر اور ایک منتظم کی حیثیتیں انہیں اگر حاصل نہ ہوتیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے پیچھے ایک خدا پر انہیں غیر متزلزل اعتقاد نہ ہوتا، اور اگر وہ اِس یقینِ محکم سے بہرہ ور نہ ہوتے کہ وہ اللہ کے فرستادہ ہیں تو شاید تاریخ انسانیت کا ایک اہم اور قابلِ ذکر باب رقم ہو جانے سے رہ جاتا۔" ۳۳۱ (واٹ)

۲۲۔ صدق و صفا

"یہ محمد (ﷺ) کے صدق کی دلیلِ قاطع ہے کہ ان سے قربت رکھنے والے لوگ، اُن پر ایمان لائے، حالانکہ وہ اُن کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف تھے اور اگر اُنہیں ان کی صداقت میں ذرّہ برابر بھی شُبہ ہوتا تو ان پر وہ ہرگز ایمان نہ لاتے۔" ۳۳۲ (ایچ جی ویلز)

۲۳۔ اتمام و اکمال

"محمد (ﷺ) کی وفات کے وقت اُن کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا۔ آپ ﷺ ایک سلطنت کی، جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر تھا، بنیاد ڈال چکے تھے۔ آپ ﷺ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا۔ آپ ﷺ نے عرب کو ایک مشترکہ مذہب عطا کیا، اور اُن میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا، جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔" ۳۳۳ (مارگولیتھ)

فہرست مستشرقین

مستشرقین کی زیرِ نظر فہرست دو (۲) حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اوّل میں اکثر و بیشتر وہ مستشرقین شامل ہیں جنہوں نے سیرتِ رسول ﷺ پر مستقل تصنیف یادگار چھوڑی ہے یا جو مطالعہ سیرت کے حوالے سے مشہور و معروف ہیں اور جن کا مکمل حوالہ بھی مل گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں وہ مستشرقین شامل ہیں جن کی سیرت پر اگرچہ مستقل تصنیف نہیں ہے لیکن ان کے مضامین، مقالات اور کتابوں میں سیرت کے کسی ایک پہلو یا چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور جن کا پورا حوالہ بھی دستیاب نہیں ہوا۔ دونوں حصّوں میں ترتیب حروفِ تہجی کے اعتبار سے قائم کی گئی ہے، زمانی تقدم و تاخر کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ ۳۳۴

Marfat.com

حواشی

۱۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مصنفین کٹر مذہبی جذبہ کے حامل تھے اور ان کا مشنری جذبہ، جوشِ عداوت میں حقائق سے بے پروا سطر سطر سے عیاں ہوتا تھا۔ بقول ایک مصنف ''پروفیسر آربری نے اپنی کتاب Portraits of Persian Poets کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ یورپ میں اسلام پر لکھنے والوں کے تین دور ہیں۔ جن میں سے پہلا مشنری دور ہے جبکہ یہ لوگ لکھتے ہی تھے اسلام کو رسوا اور بدنام کرنے کے لیے۔'' (اکبر آبادی، مولانا سعید احمد، پروفیسر اجناس گولڈ زیہر، ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، شمارہ اگست ۱۹۸۲ء۔ ص۹۶) ایک اور مصنف لکھتا ہے کہ ''انتہائی افسوس ہے کہ ماضی میں تمام تر تعلقات، عداوت ومخالفت پر مبنی رہے ہیں، سیاسی اور مذہبی دونوں ہی دائروں میں''۔

(Loofty Levoian, studies in Relationship between Islam and Christianity, London, 1940 p.109.)

۲۔ مثلاً سترھویں صدی کا ایک مستشرق ہنری اسٹب م ۱۶۷۶ء اپنی کتاب میں اقتباسات نقل کر کے بار بار (خصوصاً باب دوم وہشتم وضمیمہ ص ۴۹، ۱۴۱، ۱۹۵ و مابعد) معذرت کرتا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

Stubbe, Dr. Henry, An Account of the Rise and Progress of Mohammetanism (Reprint of 1911 ed) Al-Bairuni Lahore. 1976.

۳۔ ان باتوں کی کچھ تفصیل آئندہ صفحات میں تاریخی جائزہ کے تحت آئے گی تاہم مجموعی تصور کے لیے دیکھئے:

Rodinson, Maxim, The Western image and Western studies of Islam. the legacy of Islam. Ed. Joseph Schacht, C.E Bosworth Oxford Clarendon Press, 1974. p 9-62.

۴۔ ملاحظہ ہو:

Ahsan, M.M. Orientalism and the study of West. the Muslim World. book Review. Vol.1: No.4 Summer 1981. London. p51.

۵۔ G.H. Militant Islam Jansen, Pan Books. London 1979 p.76.

۶۔ مثلاً عہد جدید کے عظیم ترین مستشرق گب کے نظریات یا دورِ حاضر کے مستشرق اسمتھ وغیرہ۔ اسمتھ اپنی تازہ ترین تصنیف میں رقم طراز ہے کہ ''جدید سائنسی تحقیقات نے بہت سے مفروضات کو باطل قرار دے دیا ہے اور جدید مغرب اب اسلام کے معاملہ میں نرم (Soft) پڑ گیا ہے۔ اور ہر معاملہ میں نفی (No) سے رجوع کر لیا ہے (ص۲۹۶)، اس نے سرتاج علمائے مغرب H.A.R. Gibb کے بارے میں صاف لکھا ہے کہ وہ قرآن کو وحی الٰہی اور تنزیل ماننے لگا تھا (ایضاً) ایک اور مسیحی عالم Kenett Cragg کے متعلق اس کی شہادت ہے کہ وہ قرآن کو مذہبی اعتبار سے مسترد کرنے سے انکاری ہے (ایضاً) آگے چل کر اسمتھ نے توقع ظاہر کی ہے کہ آئندہ زمانہ (چند سالوں) میں غالباً مسلمانوں اور غیر مسلموں کے سوال وجواب میں یکسانیت پیدا ہو جائے گی (ص۱۹۹)

Smith, W.C. On understanding Islam, Selected Studies. Mounton Publishers. Hague. 1981.

۷۔ مثلاً زندہ مستشرقین میں سے مارٹن لنگو (Martin Lings)، شن (Schun) اور حامد الگر (Hamid Alger) وغیرہ۔ مارٹن لنگو نے تو سیرتِ رسول ﷺ پر ایک ضخیم کتاب، اسلامی ابتدائی ماخذ کی روشنی میں لکھی ہے۔ دیکھئے:

Lings, Martin, Muhammad: (His life based on the earliest Sources). George Allen & Unwin London 1983)

۸۔ انگریزی زبان میں اس موضوع پر لکھی جانے والی قابلِ ذکر کتابوں کی فہرست کے لیے ملاحظہ ہو:

(i) Ahsan, M.M. A select Bibliography. The Muslim World. Book review vol. 1. No.4 London Summer 1981 p.51=60.

(ii) Hamadah, Muhammad Maher, Muhammad The Prophet, A selected Bishiography. Ph.D. Thesis. Michigan University 1965 (Unpublished - Micro-film copy. Varsity of Kar).

(iii) Pearson, J.D. Index Islamicus. (1906-1955) W. Haffer. Cambridge. England. 1958. Supplement I (1956-1960) Mansell London 1973 Supplement II (1961-1965) Mansell 1974.

۹۔ ان کتابوں میں خاص طور پر ایڈورڈ ڈبلیو سعید کی کتاب قابلِ ذکر ہے۔ مصنف نے استشراق کے تمام مسائل پر مفصل بحث اور جرأتمندانہ تجزیہ کیا ہے۔ دیکھئے:

Said, Edward, W Orientalism - Routledge Kegam Paul. London 1978.

۱۰۔ مثلاً دیکھئے: (۱) العقیقی، نجیب، المستشر قون، دارالمعارف۔ مصر ۶۵۔۱۹۶۴ء (ج ۱ تا ۳)

(۲) احمد، ابراہیم خلیل، المستشر قون والمبشر ون فی العالم الاسلامی۔ قاہرہ ۱۹۶۴ء۔

(۳) زکریا، ہاشم زکریا۔ المستشر قون دارالاسلام۔ لجنۃ التعریف بالاسلام۔ جمہوریۃ العربیۃ المتحدہ ۱۹۶۵ء۔

(۴) البہی، محمد۔ المبشر ون، المستشر قون فی موقفہم عن الاسلام۔ الازہر۔ طبع جدید۔

(۵) الہرادی، حسین، المستشر قون والاسلام۔ المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ۔ ۱۹۶۵ء۔

(۶) الدسوقی، محمد، الاسلام والمستشر قون۔ قاہرہ ۱۹۷۲ء۔

(۷) شبلی، عبدالجلیل۔ الاسلام والمستشر قون۔ قاہرہ ۱۹۷۷ء۔

(۸) صبرہ، دکتورہ عفاف۔ المستشر قون ومشکلات الحضارۃ۔ دارالنھضۃ العربیہ۔ قاہرہ ۱۹۸۰ء۔

ان میں سے اوّل الذکر کتاب اہم ترین اور مفصل ترین ہے جو سرنامہ کے عین مطابق اس موضوع پر واقعی ایک انسائیکلو پیڈیا (موسوعۃ) کی حیثیت رکھتی ہے۔ پوری کتاب تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے (تقریباً ۱۲۰۰ صفحات) العقیقی نے بڑی جامعیت کے ساتھ دنیائے مغرب کے تمام اہم علاقوں (فرانس، اٹلی، برطانیہ) اندلس، پرتگال، ہالینڈ، جرمنی، ڈنمارک، سوئٹزرلینڈ، سویڈن، روس، امریکہ وغیرہ) کے تمام قابلِ ذکر مستشرقین (اگرچہ بعض کا ذکر چھوٹ گیا ہے مثلاً فان کریمر وغیرہ) کے احوال و آثار کو جمع کر دیا ہے۔

۱۱۔ کشفی، سید ابوالخیر، اردو میں سیرت نگاری۔ نقشِ سیرت۔ مرتبہ نثار احمد۔ ادارہ نقشِ تحریر۔ کراچی ۱۹۶۸۔ ص ۶۴۔

Marfat.com

۱۲۔ سرسیّد جذباتِ دِل کو الفاظ کا جامہ یوں پہناتے ہیں:

خدا دارم، دلِ بریاں زعشقِ مصطفی دارم

نہ دارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

حالی رقمطراز ہیں کہ جس زمانے میں سرسیّد، سرولیم میور کی کتاب لائف آف محمد ﷺ کا جواب لکھنے کی تیاری کر رہے تھے انہوں نے ولایت سے مولوی سیّد مہدی علی خاں کو ایک خط میں یہ الفاظ لکھے تھے: ''مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی سیرۃ میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھی جائے اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں تو یہ کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اُس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد ﷺ کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا حاضر کرو۔ مارا ہمیں نغمہ شاہنشاہی بس ست''۔ ملاحظہ ہو (حالی، مولانا الطاف حسین۔ حیاتِ جاوید۔عشرت پبلشنگ ہاؤس۔ کراچی۔ طبع جدید۔ دسمبر ۱۹۶۵ء۔ ص ۲۲۶)

۱۳۔ سرولیم میور (۱۸۱۹ تا ۱۹۰۵) مشہور انگریزی مستشرق، عربی کا مستند عالم، انگریز سرکار کا نمائندہ، منتظم سپاس، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں آگرہ میں شعبہ جاسوسی کا سربراہ اور متعدد کتابوں کا مصنف تھا۔ اس کا بھائی جان میور (۱۸۱۰۔۱۸۸۲) بھی مستشرق اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا۔ ملاحظہ ہو:

Websters' Biographical Dictionary. Marian Co. Mussachusets. 1974. p.1067.

۱۴۔ یہ کتاب بزبانِ انگریزی چار جلدوں میں پہلی مرتبہ (۱۸۵۸ تا ۱۸۶۱) میں شائع ہوئی۔ (ایضاً) ایک مصنف کے بقول یہ کتاب سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہو جانے اور مسلمانوں کی خود مختارانہ حکومت اور سیاسی اقتدار کے خاتمہ کے بعد اسلام کے دینی تفوق کو مٹانے کے لیے مسیحی کوششوں کے ضمن میں اسٹراس کے طرزِ استدلال کی پیروی کرتے ہوئے شائع کی گئی تھی (نواب علی۔ پروفیسر سیّد۔ سیرتِ رسول اللہ ﷺ۔ مکتبہ افکار۔ ۱۹۶۶ء۔ دیباچہ ص ۱۸) یہ کتاب میور نے ایک مشہور یورپی پادری پی فنڈر کی فرمائش اور اصرار سے لکھی تھی۔ پانی پتی۔ دیباچہ۔ الخطبات الاحمدیہ۔ سرسید احمد خاں۔ نفیس اکیڈمی۔ کراچی ۱۹۶۴ء۔ ص ۹)

۱۵۔ یہ کتاب لکھنے کے لیے سرسید نے جس شیفتگی و وارفتگی کا مظاہرہ کیا وہ ان کی کتابِ ایمان کا اہم ورق ہے۔ میور کی کتاب دیکھ کر ان کا دل ''کباب'' ہو جانا، اور نقدِ جاں صرف ہو جانے کی بھی پروا نہ کرنا، پھر ۱۸۶۹ء میں ان کا انگلستان کا سفر، کتابوں کی تلاش و جستجو، کتب خانوں کی خاک چھاننا، قرض ادھار کر کے سرمایہ کی فراہمی اور اشاعت کے انتظامات اور کتاب کی تحریر و تسوید کے دوران اپنے اوپر خواب و خور حرام کر لینا، سرتا سر غیرت و حمیتِ ایمانی پر دلیل ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مکتوباتِ سرسید، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی (خطوط بنام محسن الملک مولوی مہدی علی خاں) مجلسِ ترقی ادب۔ لاہور ۱۹۵۱ء ص ۳۹ تا ۷۵۔ نیز دیکھئے، حالی۔ حیاتِ جاوید۔ ص ۱۵۰ تا ۱۶۰ نیز ص ۴۰۳ تا ۴۲۶۔ سرسیّد نے یہ کتاب پہلے اردو میں لکھی۔ پھر اس کا خلاصہ و ترجمہ انگریزی میں، لندن سے ہی Essays on the life of Muhammad کے نام سے ۱۸۷۰ء میں شائع کرایا (دیباچہ، الخطبات الاحمدیہ۔ کراچی۔ ایڈیشن ۱۹۶۴ء ص ۱۴۔ نیز ملاحظہ ہو:

Essays on the life of Mohammad (Preface 21 Mascklenburgh Square, London. W.C. March 1870);

Marfat.com

First Reprint. Premier Book House, Lahore 1969.

لندن میں قیام کے دوران ہی سرسیّد نے جان ڈیون پورٹ کی کتاب ''اپالوجی فار محمد ﷺ اینڈ قرآن'' کو خود اپنے روپے سے چھپوایا (حالی۔ص ۴۵۲) اور گاڈ فرے ہگنز کی کتاب کا ترجمہ کرایا (ایضاً) سرسیّد چند مصنفین سے خاص طور پر متاثر تھے (گبن، گاڈفرے ہگنز، کارلائل اور جان ڈیون پورٹ) چنانچہ دیباچہ میں ان کا تذکرہ بھی کیا ہے اور اقتباسات بھی نقل کیے ہیں۔

۱۶۔ مولانا شبلی کی تصریح کے مطابق سب سے پہلے (Reiske) م ۱۷۷۴ء نے تاریخ ابوالفدا مع ترجمہ لاطینی وحواشی پانچ جلدوں میں شائع کی۔۔۔۔ ۱۸۵۶ء میں وان کریمر (Kremer) نے کلکتہ میں محمد بن محمد واقدی کی کتاب المغازی طبع کرائی، ۱۸۶۰ء میں ابن ہشام کی مشہور تصنیف سیرۃ الرسول کی کوٹنگن (Cottingen) سے اشاعت کی۔اس کے علاوہ اسی مستشرق نے سمہودی کی تاریخ مدینہ اور ابنِ قتیبہ کی تاریخ معارف طبع کرائی، ۱۸۶۴ء میں ڈاکٹر ویل (G. Weil) نے ابن ہشام کا جرمنی میں ترجمہ کیا۔ ۱۸۷۷ء میں واقدی کا جرمن ترجمہ بعنوان ''محمد ین ﷺ مدینہ'' برلن سے شائع کیا۔۔۔۔ (دیکھئے شبلی، سیرۃ النبی ﷺ ج ۱، ص ۹۱)

۱۷۔ ان میں سے تین حضرات قابلِ ذکر ہیں:

(ا) جسٹس سیّد امیر علی (۱۸۴۹ء تا ۱۹۲۸ء)، جو مسلمانانِ ہند کے ایک لیڈر تھے اور ممتاز قانون دان ہونے کے ساتھ ساتھ بہت مشہور منصف و مصنف بھی تھے۔ان کی متعدد تصانیف ہیں۔ کچھ کتابوں کا اردو میں ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ان کی دوسری کتابوں میں بھی اگرچہ حضور ﷺ کی سیرت وسوانح بیان کی گئی ہے لیکن اہم ترین کتاب A critical Examination of the life and teachings of Mohammad. جو پہلے پہل لندن سے ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی (ہمارے سامنے اس کا کراچی ایڈیشن مطبوعہ ایس ایم میر ۱۹۷۸ء کا ہے) یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے اور اس میں مستشرقین پر تنقید ومحاکمہ بھی موجود ہے۔

(ب) قاضی سلیمان منصور پوری ایک غیرت مند مسلمان، محقق، عالم، مبلّغ، مناظر سب ہی کچھ تھے۔ان کی آرزو تھی کہ سیرت پر تین کتابیں لکھیں۔ مختصر، متوسط اور مفصّل۔ مختصر ۱۸۹۹ء کو ''مہرِ نبوت'' کے نام سے شائع ہوئی۔ متوسط کتاب ''رحمۃ اللعالمین'' تین جلدوں میں نکلی۔ پہلی جلد ۱۹۱۳ء میں، دوسری ۱۹۲۱ء میں اور تیسری ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔مطوّل کتاب قاضی صاحب نہ لکھ سکے تاہم جلد سوم میں قاضی صاحب نے بطورِ خاص غیر مذاہب کے اعتراضات کا جواب اور یہود ونصاریٰ کے دعاوی کا ابطال کیا ہے (دیکھئے خطبہ استقبالیہ۔ رحمۃ للعالمین۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور ۱۹۵۳ء)

(ج) پروفیسر سیّد نواب علی نے بڑی طویل عمر پائی۔ سیّد نواب علی (۱۹۶۱ء) علوم جدیدہ کے علاوہ مستشرقین کے ہرزہ سرائیوں سے بھی خوب واقف تھے۔ان کی متعدد تصانیف ہیں لیکن خاص ''سیرتِ رسول اللہ ﷺ'' ہے۔ کتاب کا اصل محرک مستشرقین کی ہرزہ سرائیاں ہی تھیں۔ (دیکھئے دیباچہ مطبوعہ مکتبہ افکار۔ کراچی ۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۶ء) کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔

۱۸۔ شبلی۔ سیرت النبی ﷺ۔ حصہ اوّل ص ۸۶۔

۱۹۔ ایضاً ص ۹۷ تا ۹۹۔

Marfat.com

۲۰۔ ایضاً ص ۱۰۰۔

۲۱۔ ایضاً ص ۸۸ تا ۹۲۔

۲۲۔ ملاحظہ ہو (ایضاً ص ۹۲ تا ۹۵) اس فہرست میں علامہ شبلی نے مشہور مستشرقین کے نام، ان کی تصنیفات اور ملک کا نام بقید سنین درج کیے ہیں۔ فہرست میں کل اندراجات ۲۷ لیکن نام ۳۲ مصنفین کے ہیں۔ بہ اعتبار توطن انہوں نے مستشرقین یورپ کے پانچ گروہوں کو شاملِ فہرست کیا ہے یعنی انگلستان کے (۱۳)، جرمنی کے (۸)، فرانس کے (۷)، ہالینڈ کے (۳)، اور اٹلی کا (۱)۔ ان میں بالالتزام صرف سیرت پر لکھنے والے نہیں ہیں بلکہ اسلام، پیغمبرِ اسلام ﷺ اور اسلامی مآخذ پر کام کرنے والے، سب ہی مستشرقین کا اندراج ہے۔

۲۳۔ شبلی کی کتاب بقول ڈاکٹر سیّد عبداللہ ''سیرۃ نگاری کا مثالی نمونہ ہے اور اس کا ایک خاص وصف جدید مغربی سوانح نگاروں کی مدلّل تردید وتنقید اور ان کے ذہنی اسباب کی پردہ دری ہے۔ تاہم بہت سے مقامات پر شبلی کی رائے معذرت خواہانہ ہے اور مدافعانہ ہے بلکہ شبلی نے مورخینِ یورپ کے اعتراضات سے دب کر آنحضرت ﷺ کے غزوات کے سلسلہ میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی معذرت کا لہجہ اختیار کیا ہے۔'' (ملاحظہ ہو عبداللہ، ڈاکٹر سیّد۔ فنِ سیرت نگاری پر ایک نظر۔ ماہنامہ فکر ونظر۔ اسلام آباد۔ شمارہ اپریل ۱۹۷۶ء۔ ص ۸۳۱)

۲۴۔ اپنے ایک مکتوب میں علامہ شبلی نے خود لکھا: ''سیرت کی چار جلدیں ہوں گی۔ ایک جلد اس کے لیے مخصوص ہوگی۔ چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب سیرت میں آ جائیں، یعنی تمام مسائل مہمات پر ریویو، قرآن مجید پر پوری نظر، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلو پیڈیا ہو۔ اور نام بھی ''دائرۃ المعارف النبویہ'' موزوں ہوگا۔ گو لمبا ہے۔ (دیکھئے مکاتیب شبلی۔ مرتبہ سید سلیمان ندوی۔ مطبع معارف۔ اعظم گڈھ ۱۹۲۸ء ص ۲۰۲)

۲۵۔ یہ فکر مولانا شبلی پر اس حد تک طاری تھی کہ نجی خطوط اور مکاتیب تک میں نشان دہی فرما دیتے تھے۔ مثلاً مولوی حبیب الرحمن صاحب شیروانی کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ ''بقدرِ ہمت کام کر رہا ہوں۔ یورپین مورخوں کی تصنیفات کشتِ زعفران نظر آتی ہیں۔ سینکڑوں ہوائی قلعے بنائے ہیں''۔ (مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۹۹)

تقریباً ایک ماہ کے بعد (۲۱ جولائی ۱۹۱۲ء) پھر رقمطراز ہیں: ''انگریزی کتابوں سے جس قدر اقتباسات ہو رہے ہیں اُن سے کذب وافترا کا عجیب منظر سامنے آ جاتا ہے۔ مرگولیس پروفیسر آکسفورڈ، سب سے بڑا عربی عالم ہے۔ اس کی ''لائف آف محمد ﷺ'' دیکھنے کے قابل ہے۔ لکھتا ہے کہ عبدالمطلب، مطلب کے غلام تھے۔ کعبہ آنحضرت ﷺ سے صرف سو برس پہلے کی عمارت تھی وغیرہ وغیرہ۔ (ایضاً ص ۲۰۱)۔ ۶ ستمبر ۱۹۱۲ء کے خط میں لکھا: ''آپ کو ایک تصنیف پر تعجب ہے، یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ مارگولیس سب سے بڑا عربی دان ہے۔ اس کی تصنیف کا لفظی ترجمہ ہو رہا ہے۔ ایک حرف بھی ساری کتاب میں صحیح نہیں۔ تحقیقات سنیے۔ رسول اللہ ﷺ نبوت سے پہلے سوتے وقت لات وعزیٰ کی پوجا کر لیا کرتے تھے۔ نبوت کی تعلیم انہوں نے مسیلمہ سے پائی۔ محمد ﷺ کا نام فیل محمود (ابرہہ کا) کی مناسبت سے رکھا گیا۔ مسیلمہ سے حنیفی دین کا لقب لیا۔ حضرت عثمان اس لیے مسلمان ہوئے کہ رسول اللہ کی صاحبزادی پر عاشق ہوئے (نعوذ باللہ) اور نکاح کا اقرار ہوا'' (ایضاً ص ۲۰۲)

۲۶۔ ایک خط کا متن ہے: ''سیرت نبوی جو زیرِ تصنیف ہے، میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آنحضرت ﷺ کے متعلق لکھا ہے اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے تا کہ ان کے تائیدی بیان حسبِ موقع حجتِ الزامی کے

Marfat.com

طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں انہوں نے غلطیاں اور بد دیانتیاں کی ہیں نہایت زور وقوت کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے۔(ایضاً ص ۲۰۱)

۲۷۔ منشی محمد امین کے نام ایک خط میں رقمطراز ہیں:

''سیرت کے سو صفحے ہو چکے تھے لیکن نظر ثانی میں پھر کچھ کا کچھ ہو گیا۔ یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے۔ ان کے ایک ایک حرف کے لیے سینکڑوں ورق الٹنے پڑتے ہیں۔ یہ کمبخت لکھتے جھوٹ ہیں لیکن بے پتہ نہیں لکھتے۔ یہاں ہمارے سیرت نگاروں نے خود بہت بے احتیاطیاں کیں۔ لیکن اب روپے کا نہیں میری جان کا معاملہ ہے، ہر حالت میں کام جاری رکھوں گا اور اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو ان شاء اللہ دنیا کو ایک ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی۔(ایضاً ص ۲۴۲، ۲۴۳)

۲۸۔ شبلی۔ حصہ اوّل ص ۱۰۲، ۱۰۳۔

۲۹۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں:

(۱) الفاخ، پروفیسر احمد رابت۔''مستشرقین کی بے خبری''۔ نظامِ اسلامی مشاہیر اسلام کی نظر میں۔ مرتبہ ومترجمہ خلیل حامدی۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور ۱۹۶۳ء (ص ۴۳۱)۔

(۲) حسین، ڈاکٹر محمد۔''دامِ ہمرنگ زمیں''۔ ایضاً ص ۲۲)

(۳) حمودی، عبدالوہاب۔''مستشرقین اور احادیثِ رسول ﷺ'' (ایضاً ص ۴۶۳)

(۴) ہاشمی، مولانا سیّد عبدالقدوس۔ مستشرقین اور تحقیقاتِ اسلامی'' (مقالہ جو شامِ ہمدرد راولپنڈی میں ۳۰ ستمبر ۱۹۶۹ء کو پڑھا گیا اور علیحدہ کتابچہ کی شکل میں شائع ہوا) مکتبہ ملّی۔ کراچی۔

(۵) عنایت اللہ، ڈاکٹر شیخ۔''رسولِ اکرم ﷺ کے سیرت نگار''۔ ماہنامہ فکر ونظر۔ اسلام آباد۔ شمارہ مارچ ۱۹۷۶ء۔

(۶) حسن، ڈاکٹر پیر محمد۔''مستشرقین کی تحقیقات پر تحقیق کی ضرورت''۔(ایضاً شمارہ مئی ۱۹۷۶ء)

(۷) پھلواروی، مولانا جعفر شاہ۔''قرآن اور مستشرقین'' ماہنامہ فاران۔ کراچی۔ ستمبر ۱۹۷۶ء۔

(۸) فاروقی، پروفیسر خواجہ احمد۔''مستشرقین کے تصورِ اسلام کا تاریخی پس منظر''۔ ماہنامہ معارف۔ اعظم گڈھ۔ شمارہ اکتوبر، نومبر ۱۹۸۲ء۔

(۹) شہاب محمد اسد،''روسی استشراق''۔(ایضاً شمارہ جولائی ۱۹۸۲ء)

(۱۰) ندوی، پروفیسر سیّد حبیب الحق۔''اسلام اور مستشرقین''۔(ایضاً شمارہ مئی، جون، جولائی ۱۹۸۳ء) تازہ ترین اور غالباً مفصل ترین مضمون۔ البتہ انداز کسی قدر مناظرانہ ہے بعض تفصیلات اور حوالوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہے تاہم مفید ہے۔ زیر نظر مقالہ میں بھی بھرپور استفادہ کیا گیا ہے (محمد ماہر حمادے کے تحقیقی مقالہ میں دی گئی بعض تفصیلات ومندرجات سے حیرت انگیز طور پر مشابہت پائی جاتی ہے)۔

(۱۱) حتی، فلپ کے۔ اسلام اور محمد ﷺ مغربی لٹریچر میں۔(اردو ترجمہ) وحید الدین خاں۔ ماہنامہ محدث۔ رسول ﷺ نمبر (ج ۲ ص ۳۴)۔

۳۰۔ ہیکل، محمد حسین۔ حیاتِ محمد ﷺ۔ مترجم۔ نوشہروی، ابو یحییٰ امام خاں۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور ۱۹۵۵ء۔

۳۱۔ ایضاً ص ۷

Marfat.com

۳۲۔ ایضاً ص ۳۱ تا ۳۶

۳۳۔ ایضاً ص ۴۳

۳۴۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے نزدیک ہیکل کی کتاب بیانیہ نگاری کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہے۔ اُس کی کتاب میں بقول اُن کے اعتذار کا لہجہ شبلی کے مقابلہ میں کم ہے اور تعبیر و توجیہہ میں جرأت مندی بھی زیادہ ہے۔ (ماہنامہ فکر ونظر۔ شمارہ اپریل ۱۹۷۶ء ص ۸۳۲)

۳۵۔ وقت کی اسی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ابھی کچھ عرصہ ہوا کہ ہندوستان کے مقتدر علمی ادارہ ''دارالمصنفین'' کے تحت ''اسلام اور مستشرقین'' کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سیمینار (۲۱ تا ۲۳ فروری ۱۹۸۲ء) منعقد ہوا تھا جس میں دنیا بھر کے منتخب مسلمان علماء اور دانشوروں نے شرکت فرمائی۔ خیالات انگیز مقالات (مثلاً المستشر قون و السیرۃ النبویہ از الدکتور عماد الدین خلیل۔ عراق، المستشر قون و السیرۃ النبویہ از استاذ انور الجندی۔ مصر، اسلام اینڈ دی اورینٹلسٹ از قاضی عبدالمجید۔ اندور۔ اور اسلام اینڈ دی اورینٹلسٹ از عبداللہ سرفراز۔ الہ آباد، وغیرہ، دیکھئے: ماہنامہ معارف۔ اعظم گڑھ۔ اکتوبر ۱۹۸۲ء بھی پیش کیے گئے اور مستشرقین کے سلسلہ میں جوابی کام کے لیے لائحہ عمل پر بھی غور و فکر کیا گیا (اجلاس کی روئداد معارف میں برابر شائع ہوتی رہی۔ اس سلسلہ کی آخری آٹھویں قسط اکتوبر ۱۹۸۲ء کے شمارہ میں شائع ہوئی)

۳۶۔ احسن، م، م (اورینٹلزم اینڈ دی اسٹڈی آف اسلام اِن دی ویسٹ) ص ۵۱۔ نیز ملاحظہ ہو: سعید، ایڈورڈ ڈبلیو، (اورینٹلزم) ص ۲۰۶۔

۳۷۔ سیرت نویسی میں دوست نما دشمنوں اور نادان دوستوں کے معاملے اور مستشرقین کی تصانیف پر مسلم نوجوانوں کے انعطاف پر ملاحظہ ہو: ہیکل (۴۱ تا ۴۴) ادھر دنیائے مشرق کے علماء، مغربی علماء اور مستشرقین پر اپنا علمی رعب قائم کرنے سے قاصر رہے ہیں بلکہ صورتِ حال یہ ہے کہ مشرق میں مستشرقین اور علمائے مغرب کو اعزاز و استناد حاصل ہے اور اس درجہ حاصل ہے کہ شام، عراق، مصر وغیرہ میں علمی و تحقیقی اداروں کی رکنیت انہیں پیش کی جاتی ہے۔ ان کے مشورے اور آراء کو خاص وقعت دی جاتی ہے اور عربی و اسلامی دنیا کے افلاس کا یہ عالم ہے کہ خود مستشرقین کی تحقیقات و مطالعات پر اندھا اعتبار کیا جاتا ہے اور ان کی دریافت کو حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

Abul Hasn Ali Nadvi, Maulana.
Islam and Western Orientalists, Umma Publishing House Karachi (Motammar Al-Al-Islami) p.21,22.

۳۸۔ استشراق اور مستشرقین پر لکھنے والے مسلمان علماء اور محققین کا عام رجحان یہی ہے، اور وہ اپنی بحث کا آغاز ہی اسلام اور مسیحیت کی کش مکش یا اسلام اور یہودیت کے تصادم سے کرتے ہیں۔ مثلاً دیکھئے: (زکریا ہاشم، المستشر قون و الاسلام۔ لجنۃ التعریف بالاسلام۔ جمہوریہ العربیۃ المتحدہ ۱۹۶۵ء۔ نیز ملاحظہ ہو: صبرہ، دکتورہ عفاف۔ المستشر قون و مشکلات الحضارۃ۔ دارالنہضۃ العربیہ۔ قاہرہ ۱۹۸۰ء وغیرہ) ایک جدید مسلمان محقق (پروفیسر ڈاکٹر سیّد حبیب الحق ندوی) نے مسئلہ مستشرقین کا ''قرآنی زاویہ'' بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مستشرقین کی تاریخ محض مذکورہ بالا آیات کریمہ ولن ترضی عنک الیھود ولا النصاریٰ کی تفسیر و تعبیر رہی ہے، بلکہ چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ انہی آیات کی تعبیر رہی ہے، سیاسی میدان ہو یا علم و دانش و ثقافت کا میدان، اسلام دشمنی مستشرقین کی پالیسی کا جزوِ اعظم رہا ہے''۔

Marfat.com

پھر آگے لکھا ہے کہ ان کے علمی وفکری، ذہنی ونفسیاتی رجحانات کا تسلسل ساتویں صدی عیسوی سے ۱۹۸۳ء تک قائم ہے۔ (ان نکات کی تفصیل کے لیے مقالہ دیکھئے "اسلام اور مستشرقین" ماہنامہ معارف۔ اعظم گڑھ۔ شمارہ مئی، جون، جولائی ۱۹۸۳ء۔ ص ۳۲۹ تا ۳۳۲) اس سلسلہ میں پروفیسر ظفر علی قریشی کا انگریزی مقالہ بڑا فکر انگیز اور معلومات افزاء ہے دیکھئے:

Qureshi, Professor Zafar Ali Prophet Muhammad and his Western critics: Monthly Islamic Literature. March. 1968 - October 1968 vol. XIV.

خصوصاً ملاحظہ ہو (شمارہ اپریل ۱۹۶۸ء) ص ۱۷

۳۹۔ اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آ رہی ہے۔

۴۰۔ دی آکسفورڈ انگلش ڈکشنری۔ کلارینڈن پریس۔ آکسفورڈ۔ ۱۹۳۳ء۔ ج ۷ ص ۲۰۰۔

۴۱۔ ایضاً۔ دوسری مہمات کتب میں بھی یہی معنی مذکور ہیں۔ مثلاً دیکھئے نیو ویبسٹرز ڈکشنری آف انگلش لینگویج۔ شکاگو ۱۹۷۵ء۔ ص ۱۰۴۶

۴۲۔ ایضاً۔

۴۳۔ ایضاً۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس (مولفہ جے ہیسٹنگز۔ ایڈنبرا ۱۹۷۴ء ج ۱۲ ص ۱۵۵) میں اس کا مرادف Syneretism کو قرار دیا گیا ہے، جس سے بجائے خود استشراق کے فلسفیانہ اور مذہبی تناظر کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

۴۴۔ من المتضلعین باللغات/ الشرقیہ وآدابہا۔ ملاحظہ ہو:

Badger, George P. = An English Arabic Lexicon. Kegan Paul. London 1881. p.700.

۴۵۔ عبدالحق۔ دی اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری۔ انجمن اردو پریس۔ دکن ۱۹۳۷ء۔ ص ۹۶۷۔

۴۶۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لیے دیکھئے: تاثرات۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی۔ ماہنامہ معارف۔ اعظم گڑھ۔ جولائی ۱۹۸۲ء۔ ص ۶۶ تا ۶۸ (بسلسلہ اسلام اور مستشرقین پر دار المصنفین کا بین الاقوامی سیمینار)

۴۷۔ فیروز الدین۔ فیروز اللغات۔ فیروز سنز لمیٹڈ۔ لاہور۔ حصہ دوم ص ۴۱۷۔

۴۸۔ خویشگی۔ محمد عبداللہ۔ فرہنگ عامرہ۔ کراچی ۱۹۵۷ء (ص ۵۷۷) یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہے کہ مستشرقین کی اصطلاح اگرچہ زیادہ اُن غیر مسلم مصنفین کے بارے میں استعمال ہوتی ہے جن کا تعلق یورپین ممالک سے ہو اور انہوں نے اسلام کے بارے میں کچھ لکھا ہو۔ لیکن ہم یہاں زیادہ وسیع مفہوم میں ان تمام غیر مسلم مصنفین کو شمار کر رہے ہیں جنہوں نے اسلام کے بارے میں بالعموم اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں بالخصوص لکھا ہو۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: صبرہ، دکتورہ عفاف۔ المستشرقون ومشکلات الحضارہ۔ ص ۹)

۴۹۔ مثلاً مسلمانوں کے کمزور پہلوؤں سے واقفیت حاصل کرنا، ازالہ اسلام کے لیے مناسب دلائل کی فراہمی، مسیحی تقدس کا نقش عالمِ اسلام پر قائم کرنا، مشنری سرگرمیوں کی توسیع وترقی وغیرہ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ صبرہ۔ (ص ۳۳۔ ۳۴)

Marfat.com

۵۰۔ ان میں سے کچھ نکات کی وضاحت کے لیے دیکھئے: ابوالحسن علی، مولانا۔ (اسلام اینڈ ویسٹرن اور پمفلٹ) ص ۷ تا ۲۰۔

۵۱۔ مولانا شبلی نے مصنفین یورپ کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے اور تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان میں سے پہلا گروہ تو وہ ہے جو عربی زبان اور اصل مآخذوں سے واقف نہیں۔ دوسرے وہ مستشرقین ہیں جو عربی زبان اور علم، ادب، تاریخ وفلسفہ، اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں۔ تیسری طرف وہ مستشرقین ہیں جنہوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے لیکن جب سیرتِ رسول ﷺ پر قلم اٹھایا تو کذب و افتراء اور تاویل وتعصب کی بھرمار کر دی۔ (شبلی ج ۱۔ ص ۹۵ تا ۹۷ ملخصاً)

۵۲۔ ایک مصنف Loofty Levenian لکھتا ہے کہ "افسوس کہ ماضی میں تمام تر تعلقات، سیاسی اور مذہبی دونوں دائروں میں، حریفانہ مخالفت ومخاصمت سے مغلوب رہے ہیں۔ حوالے کے لیے دیکھئے:

(Qureshi, Professor Zafar Ali - Military and Political Clash between Christendom and the world of Islam, Islamic Literature. Ed. Sh M. Ashraf. Lahore. vol. XIV No.4 (April 1968)p.18).

اگر بعض مصنفین کا بیان صحیح مانا جائے تو ان کے بقول اسلام اور مسیحیت کے درمیان اولین تصادم اُس وقت پیش آیا جبکہ عیسائی لشکر ابرہہ کی سرکردگی میں مکّہ پر حملہ آور ہوا مگر ناکام ونامراد ٹھہرا۔ اس واقعہ کے تقریباً دو ماہ بعد ہی پیغمبرِ اسلام ﷺ کی ولادت ہوئی (ایضاً ص ۱۹، بحوالہ تھامس رائٹ، ارلی کرسچنٹی ان اریبیہ۔ لندن ۱۸۵۵ء ص ۱۵۲) کم و بیش یہی مضمون ایک جدید مصنف اپنی کتاب میں بیان کرتے ہوئے یہاں تک دریدہ دہنی سے کام لیتا ہے اور ذرا عار محسوس نہیں کرتا کہ "اگر ابرہہ مکّہ فتح کر لیتا تو پورا جزیرہ نمائے عرب مسیحی و بازنطینی پرچم تلے آ جاتا، صلیب کعبہ کی چھت پر آویزاں ہوتی اور شاید محمد ﷺ بس ایک پادری یا راہب کی زندگی گزار کر چلے جاتے۔ ملاحظہ ہو:

A history of Medieval Islam Routledge and Kegan Paul London, 1965. p.14.

۵۳۔ اس تصادم کی تفصیلات اگرچہ اسلامی تاریخ کے تمام مآخذ میں پائی جاتی ہیں تاہم پروفیسر ظفر علی قریشی کا فاضلانہ مضمون قابلِ مطالعہ ہے۔ دیکھئے (ماہنامہ اسلامک لٹریچر۔ مدیر شیخ محمد اشرف۔ لاہور۔ ج ۱۴ شمارہ ۴ تا ۱۰ مطابق اپریل تا اکتوبر ۱۹۶۸ء)۔

۵۴۔ صلیبی محاربات میں پہل خود مسیحیت کی طرف سے ہوئی اور پوپ اربن ثانی کے خطبہ جنگ ۱۰۹۵ء کے بعد ہی میدانِ کارزار گرم ہوا۔ صلیبی جنگیں ۱۰۹۹ء تک جاری رہیں۔ ملاحظہ ہو: بارکر، ارنسٹ۔ حروب صلیبیہ، میراثِ اسلام۔ مرتبہ سرتامس آرنلڈ و الفریڈ گیام۔ اردو ترجمہ عبدالمجید سالک۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور ۱۹۶۰ء (ص ۵۵ تا ۱۰۵) نیز دیکھئے اظہر، ظہور احمد۔ صلیبی جنگیں۔ اردو دائرۃ معارف اسلامیہ۔ دانش گاہ پنجاب۔ لاہور ۱۹۷۳ء ج ۱۲ (ص ۲۰۹ تا ۲۲۱) نیز ملاحظہ ہو العقیقی، نجیب۔ المستشرقون۔ دارالمعارف۔ مصر۔ طبع ثالث ۱۹۶۴ء ج ۱ (ص ۶۰ تا ۶۵) وغیرہ وغیرہ۔

۵۵۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (ج ۱۲ ص ۶۰۵ تا ۶۰۹) نیز دیکھیے: حمادے، ص ۲۳۔

۵۶۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حمادے ص ۲۳ تا ۲۵، نیز دیکھئے ہیکل (حیاتِ محمد ﷺ) ص ۳۳ تا ۳۵۔

۵۷۔ مثلاً جربر ڈی ارالیاک (Gerbert de Oraliac) زمانہ (۹۳۸۔۱۰۰۳) قسطنطین افریقی (Constantian Africans) متوفی ۱۰۸۷ء، اڈلر باٹ (Adelard of Bath) زمانہ (۱۰۷۰ تا

۱۱۳۵) راجر بیکن (۱۲۱۴ تا ۱۲۹۴)۔ ملاحظہ ہو، العقیقی، ج ۱ ص ۱۲۰ تا ۱۳۱، نیز گیبرٹ (Guibert)، میتھیو پریس، جیکوس ڈی وری، ولیم آف ٹریپولی (حمادے ص ۳۳ تا ۳۵) وغیرہ۔

۵۸۔ جان آف دمشق کا زمانہ (۷۰۰ تا ۷۵۴) تھا۔ جان بنیادی طور پر ایک مذہبی عالم، مصنف، مشرقی کلیسا کا فارغ التحصیل، راہب اور پادری تھا۔ دیکھیے: ویبسٹرز بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۷۸۷۔

۵۹۔ حمادے۔ ص ۲۶

۶۰۔ ندوی (پروفیسر حبیب الحق) اسلام اور مستشرقین۔ ماہنامہ معارف۔ اعظم گڑھ۔ شمارہ مئی ۱۹۸۴ء ص ۳۳۳۔

۶۱۔ حمادے۔ ص ۲۶

۶۲۔ اُس دور میں عام طور پر چند ماخذ ان کے نزدیک تسلیم شدہ تھے:
(۱) قیاس وگمان، افسانہ طرازی، (۲) جان دمشقی کی کتاب De Haere Sibus (۳) عربی مسیحی ماخذ جو زیادہ تر کٹ حجتی اور مناظرانہ مباحث پر مشتمل تھے (۴) وہ بازنطینی مناظرہ باز جنہوں نے مطالعہ کی زحمت کیے بغیر ہی گویا اسلام پر فتح پالی (۵) عبدالمسیح بن اسحاق الکندی (جس کی نسبت آج بھی مشکوک ہے) کا رسالہ۔ الکندی ایک پڑھا لکھا نسطوری عیسائی تھا اور اسے خلیفہ مامون کے دربار میں خاص اثر و رسوخ حاصل تھا (۶) ایک بازنطینی مولف Nicctas کی کتاب Refutatoo Mohammadis (۷) تھیوفین (Thophans) ۷۵۸۔ ۸۱۶ کے وقائع (Chronicles) اور (۸) اختلافی، نزاعی، مناظرانہ کتابیں جو جھوٹ وفریب کا پلندہ ہیں۔ وغیرہ
(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حمادے ص ۲۵ تا ۳۱۔ نیز دیکھیے ندوی، ص ۳۳۳ تا ۳۳۵)

۶۳۔ مثلاً نثر میں والٹر کی لاطینی زبان میں کتاب یا فرانسیسی زبان میں الکو بنڈر ڈوپین کی کتاب یا گلبرٹ اور ولیم طرابلس کی تصانیف جن میں آنحضرت ﷺ کے خلاف جی بھر کر لکھا گیا یا مثلاً نظم میں ہلدی برٹ (Hildaburt) سے منسوب ۱۱۴۲ ابیات پر مشتمل نظم یا دانتے کی Divine Comedy دانتے کو گویا قرونِ وسطیٰ کے دور اور عہد بیداری، یورپ کے درمیان میں ایک پل کی حیثیت حاصل ہے (دیکھیئے ندوی ص ۳۳۹ تا ۳۴۴، حمادے ص ۲۵ تا ص ۲۹، نیز ایضاً ص ۳۲ تا ۳۵) دانتے نے اپنی شہرۂ آفاق نظم کی تدوین میں معراج نبوی ﷺ سے استفادہ کیا لیکن (عیاذ باللہ) محمد ﷺ کو جہنم میں مبتلائے عذاب دکھایا ہے۔ دانتے پر صلیبی جنگوں کا ایسا اثر تھا کہ اس نے صلاح الدین ایوبی کو تو جہنم رسید کیا لیکن مسیحی صلیبی شہداء کو جنت میں فرحاں وشاداں دکھایا ہے۔ (ندوی ص ۳۳۹ تا ۳۴۲)

۶۴۔ بارکر، ارنسٹ، (حروبِ صلیبیہ) ص ۸۸، نیز ملاحظہ ہو: سعید، ڈبلیو ایڈورڈ، ص ۳۳۱۔ نیز
Southern, R.W. Western views of Islam in the Middle Ages. Harvard University Press 1962. p.72.

۶۵۔ اظہر، ظہور احمد۔ صلیبی جنگیں۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ) ص ۲۱۹۔ مشہور مصنف زکریا ہاشم زکریا نے تاریخ استشراق کے بیان میں، ان باتوں کی مزید تفصیل ''دورِ اوّل'' کے تحت ذکر کی ہے۔ ملاحظہ ہو: زکریا ہاشم (المستشرقون) ص ۱۶۷۔

۶۶۔ عہدِ اسلامی میں اندلس اور صقلیہ کے مراکز علمی، ان کی اہمیت اور ان کے عروج وزوال کی مختصر تاریخ کے لیے ملاحظہ ہو: العقیقی ج ۱ ص ۴۸ تا ۶۰۔

Marfat.com

۶۷۔ مسیحیت و پاپائیت کی ضروری تاریخ، کلیسا کی درجہ بندی، مسیحی فرقوں، مسیحی عقاید، اہم اصطلاحات اور مسیحی عزائم سے عام واقفیت کے لیے: ڈاکٹر محمد نادر رضا۔ پاکستان میں مسیحیت۔ مسلم اکادمی۔ لاہور ۱۹۷۹ء۔

۶۸۔ گیام پوسٹل فرانسیسی مستشرق تھا۔ اُس کا زمانہ (۱۵۱۰ تا ۱۵۸۱) ہے۔ (دیکھیے: المنجد فی الادب والعلوم۔ المطبعۃ الکاثولیکیہ۔ بیروت ۱۹۲۷ء۔ ص ۸۹) پوسٹل کا اصل کام ابجدیات پر ہے (العقیقی ج ۱ ص ۱۶۰) پوسٹل اپنے زمانے کا زبردست مسیحی عالم تھا۔ ایڈورڈ سعید نے لکھا ہے کہ پوسٹل اور ارپی نیوس دونوں کا شمار یورپی نشاۃ ثانیہ کے مستشرقین میں ہوتا ہے۔ سعید کے بقول پوسٹل اس بات کا مدعی تھا کہ وہ اپنی زبان دانی کے سبب ایشیا سے لے کر چین کی سرحدوں تک بغیر کسی مترجم کے سفر کرسکتا ہے۔ دیکھیے: (سعید، ص ۵۰)۔

۶۹۔ روڈنسن (میراثِ اسلام) ص ۳۴۔

۷۰۔ ایضاً ص ۳۵

۷۱۔ ایضاً

۷۲۔ دیکھیے روڈنسن ص ۳۵۔ ایک مصنف کے نزدیک مشرقی مطبوعات کا سلسلہ پیرس میں ۱۵۱۹ء کو شروع ہوا (العقیقی ج ۱ ص ۱۶۰)

۷۳۔ ندوی، سید حبیب الحق۔ ص ۳۴۶۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے مسیحی پادریوں کی فہرست نقل کی ہے جو مدتوں مرتاض راہب سے تربیت حاصل کرتے رہے۔ ملاحظہ ہو: ہاشمی، مولانا سیّد عبدالقدوس۔ مستشرقین اور تحقیقاتِ اسلامی۔ مکتبہ ملی (۱۹۶۹ء) ص ۲۷، ۲۸۔

۷۴۔ شبلی ج ۱ ص ۸۸

۷۵۔ ایضاً ص ۸۹

۷۶۔ روڈنسن ص ۳۶۔

۷۷۔ انگلستان کا ایک مشہور عربی داں مستشرق تھا جو بلادِ مغرب میں ۱۷ ویں صدی کے مستشرقین میں ایک بلند مرتبہ رکھتا تھا۔ وہ ایک پادری کا بیٹا تھا جو ۱۶۰۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۴۱ء میں واپس آکسفورڈ آیا اور باقی عمر وہیں صرف کردی۔ اُس نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ پوکاک کے علمی کارناموں نے یورپ میں عربی علوم کی تحقیقات کے لیے ایک نیا باب کھول دیا۔ اس کی وفات ۱۶۹۱ء میں ہوئی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۵ ص ۷۰۷، ۷۰۸۔ نیز ملاحظہ ہو: ویبسٹرز بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۱۱۹۴) اُس نے چند عربی کتب کے ترجمے کیے۔ سیرتِ محمد ﷺ پر نظرثانی کی اور کئی افسانوں کو مسترد کردیا (ندوی، ص ۳۴۷)۔

۷۸۔ روڈنسن ۔ میراثِ اسلام ص ۳۶۔

۷۹۔ Hamadeh, Mohammad, Maher Muhammad, the Prophet - A selected Bibligraphy
The University of Michigan, Ph.D. 1965. Lib. Sc. p.57 (Photostat copy unpublished)

۸۰۔ شبلی۔ ج ۱۔ ص ۸۹۔ اس صدی میں لب ولہجہ کی تبدیلی کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ حمادے ص ۴۴۔

۸۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ندوی۔ ص ۳۴۶ تا ۳۴۸۔

۸۲۔ حمادے ص ۴۶

Marfat.com

۸۳۔ العقیقی۔ج۲ص ۴۶۴
۸۴۔ حمادے (ص۴۶) بڈول نے کمال خباثت سے کام لیتے ہوئے نعوذ باللہ حضور کی جعل سازیوں، مکاریوں، دغا بازیوں، جھوٹی پاکبازی کو گنوایا ہے (ایضاً)
۸۵۔ العقیقی ج۱ص ۱۷۲
۸۶۔ ایضاً ج۳ص ۸۸۷
۸۷۔ اب اس کی مکرر طباعت پاکستان میں ''البیرونی'' لاہور ۱۹۷۶ء سے ہوئی ہے اور راقم الحروف کے سامنے اس وقت یہی نسخہ ہے۔
۸۸۔ دیکھئے اسٹب کی کتاب کا باب دوم، خصوصاً ص ۴۹ و مابعد، ص ۱۹۵ و مابعد۔
۸۹۔ ایضاً باب ہشتم ص ۱۴۱ و مابعد۔
۹۰۔ ایضاً ضمیمہ ص ۲۱۱۔
۹۱۔ حمادے۔ص ۴۶، ۴۷
۹۲۔ ایضاً ص ۴۸
۹۳۔ ایضاً
۹۴۔ ندوی ص ۳۴۷، ۳۴۸
۹۵۔ حمادے ص ۴۹۔ ہمفرے کی کتاب کا بہت مفصل تعارف (ص ۴۹ تا ۵۲) دیا گیا ہے۔
۹۶۔ روڈنسن۔ص ۳۷، ۳۸
۹۷۔ ریلان نے اسلام کے بارے میں جو معروض رویہ پیش کیا وہ زیادہ تر اسلامی مآخذ پر مبنی تھا۔ (ایضاً ص ۳۷)
۹۸۔ حمادے ص ۵۲ (تفصیلات ص ۵۲۔۵۳)
۹۹۔ یہ بھی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ رواداری برتنے کا قائل تھا۔ اُس نے اپنی تنقیدی لغت کے پہلے ایڈیشن میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سوانح بیان کرنے میں مثبت انداز اختیار کیا۔ (روڈنسن ص ۳۷)
۱۰۰۔ اس کی کتاب فرانسیسی زبان میں Vie de Mohamet کے نام سے ۱۷۳۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کا انداز بیان بہت معذرت خواہانہ (Apologetic) تھا۔ (دیکھیے ایضاً) یہ کتاب اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی جانب پہلی دوستانہ کاوش تھی جو مسیحی یورپ میں ظاہر ہوئی (ندوی ص ۳۴۹) بولین ولیرز کا انداز ایک دوسرے متعصب مستشرق جیگنیئر (Gagnier) کو بالکل پسند نہ آیا۔ جیگنیئر نے اُس کے مثبت اندازِ فکر اور تعمیری رجحان کے رَد میں Via de Mohamet (مطبوعہ ایمسٹرڈم ۱۷۴۸ء) لکھی (حمادے ص ۵۴) اس وقت ہمارے سامنے بولین ولیرز کی کتاب کے انگریزی ترجمہ کی عکسی نقل ہے۔
۱۰۱۔ ملاحظہ ہو: روڈنسن ص ۴۰۔ پروفیسر ظفر قریشی کے بقول مغرب کی طرف سے ۱۸ویں صدی میں پہلی مرتبہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کا مطالعہ شروع ہوا۔ دیکھئے ص ۸ (مارچ ۶۸ء)
۱۰۲۔ شبلی ج۱ص ۹۰
۱۰۳۔ ایضاً ص ۹۱

Marfat.com

۱۰۴۔ روڈنسن۔ص ۴۷

۱۰۵۔ ایضاً۔ چنانچہ کچھ ہی عرصہ بعد ۱۸۳۸ء میں فرانس سے شائع ہونے والی اُس لغت میں بھی یہ اصطلاح جگہ پا گئی۔ جس کا نام تھا: Dictionnaire del' Academic Francaise (فرانسیسی کی لغتِ علمی) اور اس میں مندرج ہوا Orientalisme دیکھئے: ایضاً۔

۱۰۶۔ ایضاً

۱۰۷۔ العقیقی ج ۲ ص ۴۶۹

۱۰۸۔ روڈنسن۔ص ۳۹

۱۰۹۔ ویبسٹرز بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۱۱۱۳۔

۱۱۰۔ روڈنسن۔ص ۳۹۔

۱۱۱۔ العقیقی ج ۲ ص ۴۷۱

۱۱۲۔ ایضاً

۱۱۳۔ ندوی ص ۳۵۰

۱۱۴۔ العقیقی ج ۲ ص ۴۷۱

۱۱۵۔ ندوی (ص ۳۵۰)۔ بدبخت مؤلف نے آنحضرت ﷺ کو نہ صرف انسانیت کا بدترین دشمن بلکہ خدا کا بھی دشمن قرار دیا۔(ایضاً)

۱۱۶۔ العقیقی ج ۲ ص ۶۹۲

۱۱۷۔ ویبسٹرز بائیوگرافیکل ڈکشنری، ص ۱۲۷۴

۱۱۸۔ ایضاً ص ۵۹۱۔ گبن جدید انگریزی تاریخ نگاری کا معمار ہے (حمادے ص ۵۵)۔

۱۱۹۔ ندوی ص ۳۵۱۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حمادے ص ۵۵،۵۶۔

۱۲۰۔ ویبسٹرز بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۱۵۲۹۔

۱۲۱۔ حمادے۔ص ۵۶

۱۲۲۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: ایضاً ص ۵۶ تا ۵۸۔

۱۲۳۔ ایضاً ص ۵۸۔

۱۲۴۔ سقوط و انحطاط کی یہ داستان تو بہت طویل ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا آغاز گیارھویں صدی عیسوی میں ہوا۔ مثلاً اگر ایک طرف اندلس میں بنو امیہ کے بعد مسلم اسپین رُو بہ زوال ہوا، اور رفتہ رفتہ عملاً عیسائیوں کا باجگوار بن گیا اور سقوطِ غرناطہ (۱۴۹۲ء) کے بعد تو گویا مسلمان وہاں سے نکل کر متفرق و منتشر ہو گئے تو دوسری طرف صقلیہ کی باری آئی تو نارمنوں نے ۱۰۷۱ء میں اُس کے پایہ تخت پر قبضہ کر لیا اور پھر ۱۰۸۱ء تک پورا سسلی چھین لیا گیا۔ پھر ۱۲ ویں صدی میں نارمن حملے افریقہ پر ہونے لگے، بحرِ روم میں طاقت کا توازن درہم برہم ہو گیا اور اسی صدی کے اواخر تک بحرِ روم پر نارمنوں اور اطالیوں کی برتری قائم ہو گئی۔ یہ جراحتیں اسی طرح پہنچتی رہیں یہاں تک کہ سولھویں صدی عیسوی کا زمانہ مسلمانوں کی حاکمانہ حیثیت کا آخری زمانہ ثابت ہوا۔ اور اہلِ یورپ کے اعزاز کا یہی

Marfat.com

اوّلین دور ہے (زکریا ہاشم ص ۱۹۸) عالمِ اسلام اس کے بعد بڑی تیزی سے زوال پذیر ہوا۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جبکہ تحریک استشراق کا بھی باقاعدہ آغاز ہوا۔

۱۲۵۔ نجیب العقیقی نے اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے ان تمام علاقوں کے زیرِ عنوان، مستشرقین کی فہرست، ان کے تراجم اور کارنامے مرتب کر دیئے ہیں۔ ملاحظہ ہو: المستشرقون ج ۱، ۲، ۳۔

۱۲۶۔ اس کی کچھ تفصیل علامہ شبلی نے سیرۃ النبی ﷺ میں بھی دی ہے۔ اور بطور خاص اُن مستشرقین کا تذکرہ کیا ہے جن کی محنت و ریاضت کے نتیجہ میں قدیم ماخذ سامنے آئے۔ دیکھئے: شبلی ص ۹۱، ۹۲۔

۱۲۷۔ جس طرح خود مسلمانوں نے قرونِ وسطیٰ میں محنت و ریاضت کے نتیجہ میں اہلِ یورپ تک ان کی کتابیں پہنچائی تھیں۔

۱۲۸۔ مثلاً اسپرنگر (۱۸۱۳ء۔ ۱۸۹۳ء)، سرولیم میور (۱۸۱۹ء۔ ۱۹۰۵ء)، ڈوزی (۱۸۲۰ء۔ ۱۸۸۳ء)، ڈی گوجے (۱۸۳۶ء۔ ۱۹۰۹ء)، گولڈزیہر (۱۸۵۰ء۔ ۱۹۲۱ء) وغیرہ۔ حالات و سوانح اور تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: العقیقی ج ۲، ص ۶۳۱، ۴۹۲، ۶۵۸ تا ۶۶۰، ۶۶۳۔ ج ۳ ص ۹۰۶ (بالترتیب) نیز دیکھئے ویبسٹرز بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۱۳۹۳، ۴۳۷ وغیرہ۔ نیز اردو دائرہ معارف الاسلامیہ (مطبوعہ لاہور۔ متعلقہ جلدیں)، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ (جولائی ۱۹۸۲ء) وغیرہ۔

۱۲۹۔ اس کا زمانہ (۱۷۷۳ء تا ۱۸۳۳ء) تھا۔ اس کی کتاب Apology for Mohammad کے زیرِ عنوان، لندن سے ۱۸۲۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ ہمارے سامنے پریمئر بک ہاؤس لاہور کا ایڈیشن ہے۔ حالات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اس کا دیباچہ۔ سرسید بھی اس سے متاثر تھے اور انہوں نے اس کی کتاب کے ترجمہ کا انتظام بھی کیا تھا۔

۱۳۰۔ فرانسیسی مستشرق (۱۷۹۵ء۔ ۱۸۷۱ء) اُس کے آثار میں تاریخ العرب (۳ جلدیں۔ مطبوعہ ۱۸۴۷ء) اور قبل اسلام وعہدِ رسالت پر تصنیف شامل ہے (العقیقی ج ۱ ص ۱۹۳) سیّد امیر علی نے اپنی کتاب (اے کریٹیکل اگزامینیشن آف دی لائف اینڈ ٹیچنگو آف محمد) مطبوعہ لندن ۱۸۷۳ء (طبع حاضر ایس ایم میر کراچی ۱۹۷۸ء کے دیباچہ میں کاسن کے کام کو یورپین مصنفین نے ہر لحاظ سے عالمانہ اور بے لاگ قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۵ تا ۸)

۱۳۱۔ جرمن مستشرق (۱۸۰۸ء۔ ۱۸۸۹ء) متعدد کتابیں یادگار۔ عہدِ رسالت پر تین مجلدات، سیرت ابن ہشام کا جرمن ترجمہ مع تعلیقات وحواشی (العقیقی ج ۲ ص ۷۰۷) لیالی العرب کا بھی ترجمہ کیا اور تاریخ الخلفاء اور مسلمانوں پر ۵ مجلدات۔ (ویبسٹرز بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۱۵۵۵)

۱۳۲۔ فرانسیسی مستشرق (۱۸۲۳ء۔ ۱۹۸۲ء)، مختلف تصانیف یادگار چھوڑیں مثلاً تاریخ الادیان مطبوعہ ۱۸۵۷ء، کتاب الرسل مطبوعہ ۱۸۶۶ء، کتاب تقدم ال آداب الشرقیہ مطبوعہ ۱۸۶۶ء (العقیقی ج ۱ ص ۳۔ ۲۰۲) یہ فلسفی لغوی اور مورخ تھا (ویبسٹرز بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۱۲۴۸)

۱۳۳۔ شہرۂ آفاق جرمن شاعر (۱۷۴۹ء۔ ۱۸۳۲ء) ویبسٹرز بائیوگرافیکل ڈکشنری (ص ۴۔ ۶۰۳) اصل شہرت اُس کی مشہور نظم Le Mahomet's Gesang کے سبب ہوئی (شاخت و باسورتھ ص ۴۴) اس کی مزید تفصیل اور تنقید کے لیے ملاحظہ ہو: ندوی ص ۴۰۶۔

۱۳۴۔ جرمن ماہرِ آثاریات و حجریات اور نقاد بھی تھا۔ (ویبسٹرز بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۳۲۶)

۱۳۵۔ انگریز مستشرق (۱۷۹۵ء۔ ۱۸۸۱ء) العقیقی ج ۲ ص ۴۸۱ نیز ویبسٹرز ص ۳۵۱۔ مزید تفصیل و تنقید کے لیے ندوی

ص ۸۔۴۰۷۔
۱۳۶۔ العقیقی نے لکھا ہے: ''مستشرقین میں سب سے بہتر اُسی نے لکھا ہے''۔ دیکھئے ج ا ص ۲۹۷۔ عموماً افراط وتفریط سے گریز کیا (ہیکل ۳۳)
۱۳۷۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری (ج ۷ ص ۲۰۰)
۱۳۸۔ دیکھئے اُردو دائرہ معارف اسلامیہ (ج ۱۳، ص ۱۳۔۱۱۲)
۱۳۹۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری ج ۷ ص ۲۰۰
۱۴۰۔ زکریا ہاشم۔ص ۱۶۸
۱۴۱۔ العقیقی ج ا ص ۱۷۷
۱۴۲۔ ایضاً ص۔۱۹
۱۴۳۔ ایضاً ص ۱۹۵
۱۴۴۔ العقیقی ج ا ص ۱۹۶
۱۴۵۔ ایضاً ج ۲ ص ۴۷۴
۱۴۶۔ شبلی ج ا ص ۹۳
۱۴۷۔ العقیقی ج ۲ ص ۴۸۵
۱۴۸۔ قرآن کے تراجم میں تین مستشرقین بہت شہرت رکھتے ہیں ایک تو یہی پامر، دوسرے جارج سیل بہ زمانہ (۱۶۹۷ء۔ ۱۷۳۶ء)، اور تیسرے راڈویل۔ یہ حضرات ترجمہ قرآن کے سلسلہ میں جو بوالعجبیاں کرتے ہیں وہ تو الگ رہیں، دیباچوں اور مقدمات میں حضور ﷺ کی شان میں گستاخی اور بے باکی سے بھی باز نہیں آتے۔
۱۴۹۔ العقیقی ج ۲ ص ۴۸۳۔۴۸۲
۱۵۰۔ ایضاً ص ۶۶۱
۱۵۱۔ ایضاً ص ۶۶۴۔۶۶۳
۱۵۲۔ ایضاً ص ۷۰۷۔۷۰۶
۱۵۳۔ العقیقی ج ۲ ص ۷۱۳
۱۵۴۔ العقیقی ج ۳ ص ۹۳۸، ۹۳۹
۱۵۵۔ ویبسٹرز بائیوگرافیکل ڈکشنری۔ص ۱۵۶۷
۱۵۶۔ ایضاً ص ۱۲۹۹
۱۵۷۔ شبلی ج ا ص ۹۲
۱۵۸۔ العقیقی ج ۳ ص ۹۳۱۔۹۳۰
۱۵۹۔ الزرکلی، خیر الدین، الاعلام (قاموس تراجم لاشہر الرجال والنساء من العرب والمستعربین والمستشرقین) طبع مصر۔ طبع ثانی۔ج ا
۱۶۰۔ العقیقی ج ا ص ۲۱۴، ۲۱۵

Marfat.com

۱۶۱۔ ایضاً ص ۲۲۳ تا ۲۲۵

۱۶۲۔ ایضاً ص ۲۲۸

۱۶۳۔ زکریا ہاشم، ص ۲۱۸، ۲۱۹

۱۶۴۔ العقیقی ج ۳ ص ۹۰۶۔ نیز ملاحظہ ہو ویبسٹرز بایوگرافیکل ڈکشنری ص ۶۰۶۔

۱۶۵۔ ندوی۔ ص ۴۱۵، ۴۱۶۔ گولڈ زیہر پر ایک مستقل مضمون مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اگست ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا، قابلِ مطالعہ ہے۔

۱۶۶۔ العقیقی ج ۲ ص ۴۲۴

۱۶۷۔ ویبسٹرز بایوگرافیکل ڈکشنری، ص ۱۵۵۷۔

۱۶۸۔ العقیقی ج ۳ ص ۹۹۲، نیز ویبسٹرز بائیوگرافیکل ڈکشنری، ص ۷۶۲۔

۱۶۹۔ ویبسٹرز بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۷۶۲۔

۱۷۰۔ زکریا ہاشم۔ المستشر قون والاسلام۔ ص ۱۰۹۔

۱۷۱۔ دیکھئے:

Gabriel, Francesco, Muhammad and the conquests: of Islam (Translated from the Italian by Virgina Lulingand Rosaumd Linall) Mac Graw Hill Book Co. New York 1968. p.18.

۱۷۲۔ شاخت و بامورتھ ص ۶۴

۱۷۳۔ زکریا ہاشم ص ۱۶۹

۱۷۴۔ کتابیات (Bibliography) کے بانی اگرچہ مسلمان تھے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پچھلی صدیوں سے اسلام اور اسلامی دنیا کے بارے میں کتابیاتی مواد اور لٹریچر پوری طرح مستشرقین کے قبضہ میں ہے۔ مثلاً انڈیکس اسلامیکس وغیرہ (ماہنامہ دی مسلم ورلڈ۔ بک ریویو۔ لندن۔ ج ۱ نمبر ۴ ستمبر ۱۹۸۱ء ص ۶، ۷) یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مستشرقین اور ان کے اداروں کی تیار کردہ فہرست کتب یا کتابیات، ''حوالہ جاتی'' اہمیت سے زیادہ ''علمی مرعوبیت'' قائم کرنے کا مدعا رکھتی ہیں۔ گویا مستشرقین کی یہ علمی ریاضتیں محض علمیت (Scholarship) کے اظہار کے لیے نہیں ہیں بلکہ اس کے جلو میں دراصل ان کے نظریاتی اور سیاسی عزائم کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ اور آج کل کے مسلمان دانشوران باتوں کا خوب ادراک رکھتے ہیں۔ (ایضاً)

۱۷۵۔ آنحضرت ﷺ کی سیرت و سوانح کے مصادر و مآخذ پر نقد و جرح کا آغاز تو ۱۹ ویں صدی کے اواخر میں ہی ہو گیا تھا تاہم اس دور میں یہ کام اور آگے بڑھا اور دوسرے مآخذ کے علاوہ خود قرآن اور حدیث کو بطور خاص نشانہ بنایا گیا۔ قرآن کے متن اور نزول و ترتیب کو زیر بحث لا کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ ہمعصر مصدر ہونے کے باوجود قرآن سیرتِ رسول کا مستند ذریعہ معلومات نہیں۔ حدیث کے سلسلے میں انکار کے لیے حدیث کے کذب و افتراء، اور التباس کی داستانوں کو اچھالا گیا، نالدیکے، گولڈ زیہر وغیرہ نے تو انکارِ حدیث کے مکتبِ فکر کو بطور خاص فروغ دیا۔ (ملاحظہ ہو: حمادے، ص ۶۸، ۶۹۔ نیز دیکھئے ندوی، ص ۴۱۵، ۴۱۶)

۱۷۶۔ لامنس (Lammens) جس کی اسلام دشمنی معروف ہے، ظہورِ اسلام کو ایک ''بدقسمت تاریخی واقعہ قرار دیتا ہے۔

Marfat.com

اور یہ سمجھتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک ''تاریخی مسئلہ'' ثابت ہوئے۔ اس کی تحریریں بغض وعناد سے پُر ہیں۔ اقتباس کے لیے ملاحظہ ہو: حمادے، ص ۶۹، ۷۰)

۱۷۷۔ دیکھئے حمادے، ص ۶۷، ۶۸۔

۱۷۸۔ لامنس (Lammens, P.H.) راہب مستشرق تھا۔ بیلجیئم میں پیدا ہوا، فرانس میں توطن اختیار کیا اور راہب بن گیا۔ اُس کا زمانہ ۱۸۶۲ء تا ۱۹۳۷ء ہے۔ اس کی متعدد تصانیف ہیں: تاریخ سیرت، اخلاص محمد ﷺ، فاطمہ اور دیگر بنات محمد ﷺ اور گہوارۂ اسلام وغیرہ۔ (دیکھئے العقیقی ج ۲ ص ۱۰۶۸)

۱۷۹۔ حمادے۔ ص ۶۹

۱۸۰۔ ندوی۔ ص ۴۱۲۔ ۴۱۳

۱۸۱۔ حمادے ص ۴۳، ۷۳، بھل اور طور اینڈرے نے آنحضرت ﷺ کا گہرا نفسیاتی مطالعہ کیا۔ چنانچہ ہالینڈ کے بھل کو اس بات میں کوئی شبہ نظر نہیں آیا کہ آنحضرت ﷺ کو اپنے اندرونی کو اعتقاد کے اچانک پھٹ جانے کا ایسا تجربہ حاصل ہوا کہ وہ ''کلمۃ اللہ'' کے (نعوذ باللہ) مدعی بن گئے۔ بھل اپنی بے باکی میں یہاں تک لکھتا ہے کہ ''اپنے غیر معمولی جذباتی اعصابی نظام کے سبب ہی آنحضرت ﷺ نے (خدانخواستہ) اپنے آپ کو دھوکہ اور مغالطہ میں مبتلا رکھا۔ وہ ''مرگی'' سے انکار کر کے ہذیانی (Hysterical) سبب کو اصل قرار دیتا ہے۔ طور اینڈرے کی متعدد تصانیف ہیں لیکن اہم ترین سیرت رسول ﷺ ہے۔ اس کتاب میں اس نے بھی آنحضرت ﷺ کا گہرا نفسیاتی مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اسلام کے فروغ میں صرف ایک شخص یعنی اس کے بانی کے دماغ نے اصل کردار ادا کیا اور آنحضرت ﷺ کی مذہبی سرگرمی میں اثرات ان مسیحی روایات کے پڑے جو شام کے راستے ان تک پہنچی تھیں۔

(ایضاً ص ۴۲۔ ۷۳)

۱۸۲۔ حمادے۔ ص ۷۰۔

۱۸۳۔ مارگولیتھ (Magoliouth, D.S) مشہور برطانوی مستشرق۔ زمانہ ۱۸۵۸ء تا ۱۹۴۰ء۔ ان کی کتاب ''محمد ﷺ اور فروغ اسلام'' نیویارک سے ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی (العقیقی ج ۲ ص ۵۱۸، ۵۱۹)۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: وبسٹرز بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۹۷۰۔ نیز ندوی صفحہ ۴۱۷، ۴۱۸۔ مارگولیتھ کے بارے میں مولانا شبلی کا تبصرہ ابتدائی صفحات میں گزر چکا ہے (دیکھئے مکاتیب شبلی، حصہ اول۔ ص ۲۰۱) نیز ان کا دوسرا تبصرہ دیکھئے۔ شبلی (سیرۃ النبی ﷺ) ج ۱ ص ۹۶۔

۱۸۴۔ حمادے، ص ۷۱

۱۸۵۔ ایضاً ص ۷۲، اطالوی مستشرق کیتانی کا زمانہ ۱۸۶۹ء تا ۱۹۳۶ء ہے۔ اُس کے آثار میں سے اسلام کی اشاعت اور تمدن، اور تاریخ اسلام از ۱ھ تا ۹۲۲ھ (۶۲۲ء تا ۱۵۱۷ء) بہت مشہور ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: العقیقی ج ۱ ص ۲۷۲۔ کیتانی پر ایک مفصل مضمون ڈاکٹر ریاض الحسن کے قلم سے مجلہ ہمدرد اسلامیکس ج ۱ اسپرنگ ۱۹۸۲ء میں قابل مطالعہ ہے۔

۱۸۶۔ حمادے، ص ۷۲

۱۸۷۔ ایضاً نیز دیکھئے ندوی ص ۴۱۸، ۴۱۹

Marfat.com

۱۸۸۔ کارلائل نے اپنے خطبات میں (نسخہ مطبوعہ اسلام سروس لیگ بمبئی) جو راستہ دکھایا تھا اُس کی پیروی وقتاً فوقتاً متعدد مستشرقین نے کی۔ مثلاً باسورتھ اسمتھ نے اپنی کتاب Muhammad and Muhammadian (مطبوعہ نقش ثانی، سندھ ساگر اکادمی لاہور) میں اپنے مخصوص طرزِ تحریر میں بڑا انفعالی اور اعتذاری رویہ اختیار کیا۔ اسی انداز کا کام الفانسو اٹین ڈینٹ اور سلیمان ابن ابراہیم کے قلم سے "حیاتِ محمد ﷺ" کے عنوان سے سامنے آیا جس میں مصنفین نے سیرت ابنِ ہشام، طبقات ابنِ سعد اور سیرتِ حلبیہ کو اپنی تصنیف کی بنیاد بنایا۔ دیکھئے حمادے ص ۷۴، ۷۵۔ اسی طرح جے سی آرچر نے اسپرنگر کے مرضیاتی نقطہ نظر کی تردید کی۔ (ندوی ص ۴۲۱)

۱۸۹۔ دیکھئے حمادے ص ۷۵۔ نیز ندوی ص ۴۲۱ تا ۴۲۳

۱۹۰۔ حمادے ص ۷۶

۱۹۱۔ حمادے ص ۷۶۔ نیز ندوی ص ۴۲۳۔

۱۹۲۔ حمادے ص ۷۶

۱۹۳۔ مثلاً محمد ﷺ ایٹ مکہ (۱۹۵۳ء) محمد ایٹ مدینہ (۱۹۵۶ء) اور محمد ﷺ پروفٹ اینڈ اسٹیٹس مین (۱۹۶۱ء) وغیرہ (ایضاً) واٹ اور اس کی تصانیف پر ملاحظہ ہو تبصرہ، ڈاکٹر سیّد عبداللہ (ماہنامہ فکر ونظر، اسلام آباد، اپریل ۱۹۷۶ء ص ۸۳۲-۸۳۳)

۱۹۴۔ حمادے، ص ۷۶-۷۷

۱۹۵۔ ایضاً نیز ندوی ص ۵ (ماہنامہ معارف جولائی ۱۹۸۳ء)

۱۹۶۔ فرانسیسکو جبریئلی (Gabrieli, Francesco)، اطالوی مستشرق، پیدائش ۱۹۰۴ء (العقیقی ج ۱ ص ۳۹۴)

۱۹۷۔ جبریئلی، فرانسیسکو۔ محمد ﷺ اینڈ دی کونکوسٹ آف اسلام (ترجمہ انگریزی از ورجینیا اور روسو، میک گراہل، نیو یارک ۱۹۶۸ء) ص ۱۵۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ بیسویں صدی کا کیتھولک عالم لامنس، جو سیرۃ پر اپنی فاضلانہ تحریروں کے لیے مشہور ہے، آتشِ عداوت میں بھڑکتے ہوئے قرونِ وسطیٰ کے اعتذاری ادب پر سخت ترین ردِعمل کا اظہار کرتا ہے (ایضاً ص ۱۵)

۱۹۸۔ سعید، اورینٹلزم ص ۲۰۴ نیز ۲۰۱۔

۱۹۹۔ سعید، اورینٹلزم۔ ص ۲۰۴

۲۰۰۔ ایضاً ص ۲۰۶

۲۰۱۔ ایضاً ص ۲۰۳

۲۰۲۔ العقیقی ج ۱ ص ۲۲۹

۲۰۳۔ ایضاً ج ۱ ص ۲۸۴، ۲۸۵

۲۰۴۔ ایضاً ج ۱ ص ۳۷۷

۲۰۵۔ ایضاً ج ۲ ص ۵۰۴

۲۰۶۔ ویبسٹرز بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۱۹۳

۲۰۷۔ العقیقی ج ۲ ص ۵۱۲

Marfat.com

۲۰۸۔ وبسٹرز بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۸۵۶
۲۰۹۔ العقیقی ج ۲ ص ۵۲۵۔۵۲۶
۲۱۰۔ وبسٹرز بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۱۱۰۴
۲۱۱۔ العقیقی ج ۲ ص ۷۳۸ تا ۷۴۰
۲۱۲۔ ندوی ص ۴۱۵
۲۱۳۔ العقیقی ج ۲ ص ۶۶۶، ۶۶۷
۲۱۴۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: جانسن (ملی ٹینٹ اسلام) ص ۷۷ تا ۸۱
۲۱۵۔ العقیقی ج ۲ ص ۶۶۷
۲۱۶۔ العقیقی ج ۲ ص ۷۴۰
۲۱۷۔ شبلی، سیرت النبی ج ۱ ص ۹۲
۲۱۸۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: العقیقی ج ۲ ص ۷۴۳، ۷۴۴
۲۱۹۔ ایضاً ص ۷۷۴
۲۲۰۔ ایضاً ص ۷۷۷ تا ۷۸۳۔ نیز دیکھئے: بروکلمان پر مولانا عبدالقدوس ہاشمی کا تبصرہ۔ (مستشرقین اور تحقیقات اسلامی) ص ۹، ۱۰۔ نیز دیکھئے اس کی کتاب کا انگریزی ترجمہ: Brockelmann Carl, History of the Islamic Peoples. New York 1973.
۲۲۱۔ العقیقی ج ۲ ص ۹۴۳، ۹۴۴
۲۲۲۔ ایضاً ص ۱۰۰۵
۲۲۳۔ وبسٹرز بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۱۵۵۸
۲۲۴۔ العقیقی ج ۲ ص ۵۵۱
۲۲۵۔ ڈاکٹر مشیر الحق۔ ولفریڈ کینٹول اسمتھ۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ۔ جنوری ۱۹۸۳ء۔ ص ۱۳۔ حالانکہ بعد میں خود اسمتھ نے اسلام کے بجائے محمد نزم کو قابلِ ترجیح سمجھا۔ (ایضاً ص ۱۴)
۲۲۶۔ مزید تفصیل اور تنقید کے لیے ملاحظہ ہو: جانسن (ملی ٹینٹ اسلام) ص ۸۱ تا ۸۵۔
۲۲۷۔ جس کا حوالہ ابتدائی صفحات میں گزر چکا ہے۔
۲۲۸۔ حتّی، لبنانی الاصل، امریکی مستشرق، مشہور ترین کتاب "تاریخ عرب" (مطبوعہ ۱۹۲۷ء) جو متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ حتّی کی پیدائش ۱۸۸۶ء میں ہوئی تھی۔ دیکھیے العقیقی ج ۳ ص ۱۰۱۰۔۱۰۱۱
۲۲۹۔ ملاحظہ ہو مقالہ ڈاکٹر مشیر الحق (معارف۔ جنوری ۱۹۸۳ء)
۲۳۰۔ العقیقی ج ۲ ص ۸۰۳۔
۲۳۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مقالہ محمد طفیل، جوزف شاخت اور اصولِ فقہ۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ۔ اپریل ۱۹۸۳ء۔
۲۳۲۔ جانسن نے تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب برطانیہ اور فرانس مسلمان ممالک کے قابو میں تھے اور اسلامی مخالفت کا

Marfat.com

سامنا کر رہے تھے تو برطانوی اور فرانسیسی Islamists اُن ممالک کے مخالف اور غیر ہمدرد تھے جبکہ امریکی مصنفین عام طور پر ہمدرد (Sympathetic) تھے۔ لیکن حالیہ برسوں میں امریکی مصنفین اسلام کے بارے میں کم ہمدرد ہو گئے ہیں۔ یورپی مستشرقین اب غیر متعلق، بے پروا نظر آتے ہیں۔ کرداروں کا یہ تفاوت غالباً ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ اختیار کیا گیا۔ (دیکھئے جانسن ص ۸۶)

۲۳۳۔ جانسن، جی۔ ایچ۔ ملی ٹینٹ اسلام۔ پین بک، لندن ۱۹۷۹ء، ص ۸۵۔

۲۳۴۔ سورہ مائدہ (آیت ۸۶)

۲۳۵۔ قرآن کا یہ بیان تاریخی صداقت کا حامل ہے۔ یہود اور مشرکین اسلام دشمنی کے معاملہ میں روزِ ازل سے ہی انتہائی متعصب و متشدد رہے ہیں اور آج بھی ہیں جبکہ یہ شدتیں عیسائی مخالفین کے یہاں نسبتاً کم رہی ہیں۔ چنانچہ نجاشی شاہِ حبشہ کا قبولِ اسلام، قیصرِ روم کا پیغمبرِ اسلام ﷺ کے بارے میں ابوسفیان ؓ سے استفسار، مسیحیوں کے نجرانی وفد کا مباہلہ سے احتراز، اسلامی فتوحات کے نتیجہ میں مصر، شام، شمالی افریقہ، فارس اور دوسرے ممالک میں عیسائیوں کا کثرت سے قبولِ اسلام اور عہدِ جدید میں اسلام کی طرف ان کا میلان وغیرہ، کافی ثبوت ہیں۔

۲۳۶۔ اِس کا ایک اندازہ گزشتہ صفحات میں مستشرقین کے احوال سے ہو سکتا ہے۔ ایک مختصر فہرست مولانا ہاشمی کے کتابچہ میں بھی دی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو: ہاشمی، مولانا عبدالقدوس، ص ۲۰ و مابعد۔

۲۳۷۔ سورۂ بقرہ (آیت ۱۲۰)

۲۳۸۔ یہ معرکہ ہائے صلیب و ہلال جنہیں ''صلیبی جنگوں'' کے نام سے شہرت حاصل ہے خالص کلیسائی محرکات کا نتیجہ تھیں اور اس کا سرآغاز پوپ اربن ثانی (۱۰۴۲۔۱۰۹۹ء) کا وہ خطبہ جنگ تھا جو اُس نے ۲۷ نومبر ۱۰۹۵ء کو دیا تھا جس نے پورے یورپ میں ایک آگ لگا دی تھی۔ پوپ اربن ثانی کے ترجمہ، حالات اور اثر انگیزی کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

Hart, Michael H. The 100 Hart, P.co. New York 1978. p.268-270

۲۳۹۔ غازی، عرفان۔ مستشرقین اور سنتِ نبوی۔ سیارہ ڈائجسٹ، رسول نمبر، ج ۲۰ شمارہ ۵۵، مطابق نومبر ۷۳ء ص ۳۹۲۔

۲۴۰۔ ہاشمی۔ مولانا سیّد عبدالقدوس۔ مستشرقین اور تحقیقاتِ اسلام۔ مکتبہ ملی۔ کراچی۔ ص ۲۰، ۲۱

۲۴۱۔ اس سلسلہ میں تفصیل اور مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو: ایضاً۔ نیز دیکھئے شبلی، ج ۱، ص ۱۱۰، ۱۱۱

۲۴۲۔ حسن، پیر محمد۔ مستشرقین کی تحقیقات پر تحقیق کی ضرورت۔ ماہنامہ فکر و نظر اسلام آباد۔ جلد ۱۳۔ شمارہ ۱۱ ص ۴۲۔۴۳

۲۴۳۔ ہمارے علم میں اردو ادب میں ایسی کوئی تحریر سامنے نہیں آئی ہے جس میں مستشرقین کے پیدا کردہ شکوک و شبہات اور الزامات و اعتراضات کو یکجا کیا گیا ہو، اور پھر ان کے جوابات کا اہتمام کیا گیا ہو۔ البتہ متفرق طور پر چند الزامات کو سیرت کی کتابوں میں بالعموم اور مولانا شبلی کی سیرۃ النبی ﷺ میں بالخصوص ذکر کیا گیا ہے، علاوہ ازیں بعض اعتراضات (مثلاً تعددِ ازواج، انکارِ حدیث، نظم قرآن وغیرہ) کے بارے میں مفصل مضامین موجود ہیں تاہم حضور ﷺ کی شخصیت و کردار کے حوالہ سے تمام الزامات یکجا نہیں ملتے۔ انگریزی زبان میں جناب مظہر الدین صدیقی کا مضمون اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں غالباً پہلی مرتبہ مستشرقین کے قائم کردہ الزامات میں سے اٹھارہ ۱۸ کا انتخاب کر کے مختصر جوابات بھی شامل کر دیئے ہیں (ملاحظہ ہو:

(Siddiqi, Mazheruddin, The Holy Prophet and the orientalist.

Marfat.com

Islamic studies, Journal of the central Institute of Islamic Research, Islamabad. vol. XIX No.3 Autumn 1980.. p.143-165).

۲۴۴۔ واضح رہے کہ یہ مفروضات زیادہ تر مغربی یورپ میں حروب صلیبی کے بعد مروّج و متداول رہے (دیکھئے حمادے ص ۲۴) حضور ﷺ کا نام قرآن و حدیث میں محمد ﷺ اور احمد ﷺ مذکور ہے۔

۲۴۵۔ اس الزام کو خاص طور پر مارگولیتھ نے بڑی شد و مد کے ساتھ اپنی کتاب "محمد ﷺ اینڈ دی رائز آف اسلام" مطبوعہ لندن (ص ۴۷) میں پیش کیا۔ اس الزام کو نہ صرف یہ کہ دوسرے مشہور برطانوی مستشرق سر ولیم میور نے (لائف آف محمد ﷺ۔ ایڈنبرا ۱۹۲۴ء ص C XIV, CXV) ہی مسترد کر دیا بلکہ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ آنحضرت ﷺ انتہائی شریف النسب تھے۔ عرب کے شریف ترین گھرانے کے فرزند تھے، آپ کے جدِ امجد ہاشم تھے جن کے ذمہ شہری مملکت مکّہ میں "رفادہ" کی ذمہ داری تھی اور وہ اس پائے کے آدمی تھے کہ رومی امرأ اور غسانی شہزادے ان سے معاہدہ کیا کرتے تھے۔ (ملاحظہ ہو صدیقی، مظہر الدین۔ ص ۱۴۳)

۲۴۶۔ حمادے، ص ۲۵۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ یہ تعارف تاریخی صداقتوں کے سرتا سر خلاف ہے۔

۲۴۷۔ حمادے، ص ۲۴۔

۲۴۸۔ ایضاً

۲۴۹۔ ایضاً، ص ۴۸

۲۵۰۔ ایضاً ص ۷۱

۲۵۱۔ ایضاً ص ۲۴۔ اولان نے اپنی نظم میں جو واقعہ بیان کیا ہے اس میں ہسپانوی عیسائی فوجوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے اصنام توڑے جانے کا ذکر ہے، یہ تین تھے: (۱) ترخاجان (۲) محمد ﷺ (۳) اپولون۔

ایک انطاکی شاعر نے ان لوگوں کی شہادت پر حضور ﷺ کی ہجو لکھی جنھوں نے آپ ﷺ کی ایسی مورتی دیکھی تھی جو سونے اور چاندی سے بنی تھی۔ (ہیکل ص ۳۴)

۲۵۲۔ یہ تبصرہ ذروتی نے ۱۸۷۶ء میں کیا تھا۔ (ہیکل ص ۳۵)

۲۵۳۔ جین بررڈ (م ۱۵۹۷ء) دریدہ دہنی سے کام لیتے ہوئے لکھتا ہے کہ "محمد ﷺ ایک حیوان تھے اور صرف حیوانی (جنگلی) زبان (عربی) جانتے تھے۔ جو ان کے حیوانی ماحول کے لیے بالکل مناسب تھی"۔ دیکھئے حمادے (ص ۴۷)

۲۵۴۔ حمادے ص ۳۱

۲۵۵۔ بیڈول (Bedwell) کی ہرزہ سرائی اس کی کتاب Mohammadis Imposture میں۔ (ایضاً ص ۴۶)

۲۵۶۔ یہ لامنس کا خیال ہے۔ (ایضاً ص ۷۰)

۲۵۷۔ ایضاً

۲۵۸۔ ایضاً

۲۵۹۔ یہ افسانہ صدیوں یورپ میں مستشرقین کے حوالے سے مروّج رہا۔ اور ۱۹ ویں صدی کے اختتام تک اپنی موت آپ مر گیا۔ (ایضاً ص ۲۵)

۲۶۰۔ حمادے ص ۶۵

Marfat.com

۲۶۱۔ ایضاً۔ عہد حاضر کا مستشرق، واٹ، اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ الزام صریحاً بے بنیاد ہے (محمد پروفٹ اینڈ اسٹیٹس مین آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۶۱ء۔ص ۱۹) تفصیل کے لیے دیکھئے: صدیقی، مظہر الدین، ص ۱۴۴۔
۲۶۲۔ حمادے ص ۴۳
۲۶۳۔ نولکدیکے کے ذہن کی اختراع اور بوالعجبی۔ (ایضاً ص ۶۷)
۲۶۴۔ میور کے نزدیک ابتداً انہیں بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ خدا کی طرف سے فرستادہ ہیں۔ البتہ ایک طویل عرصہ تک شک و تذبذب میں مبتلا رہنے کے بعد بالآخر آمادہ بہ تبلیغ ہوئے۔ (میور۔ لائف آف محمد ﷺ ۱۹۲۳ء۔ص ۴۶۔۴۷) یہ الزام سراسر واقعات کے خلاف ہے۔ اور تاریخی اعتبار سے گمراہ کن ہے۔ اگر ذرا بھی تذبذب ہوتا تو اپنی زوجہ محترمہ خدیجہ ؓ کو، اپنے بھائی علی ؓ کو، اپنے جگری دوست ابوبکر ؓ کو کیونکر مطمئن کرتے۔
(ملاحظہ ہو: صدیقی، مظہر الدین۔ص ۱۴۵۔۱۴۶)
۲۶۵۔ حمادے، ص ۴۷۔
۲۶۶۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: صدیقی، مظہر الدین (ص ۱۶۱)
۲۶۷۔ یہ واٹ کا مفروضہ ہے۔ اس کی دلیل یہ دی ہے کہ مدنی زندگی کے ابتدائی زمانہ میں کچھ عرصہ کے لیے یہودِ مدینہ سے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ وہ ان کو نبی و رسول کی حیثیت سے تسلیم کر لیں۔ (ملاحظہ ہو: تفصیل، صدیقی ص ۱۵۵، ۱۵۶)
۲۶۸۔ حمادے، ص ۴۸۔
۲۶۹۔ ایضاً (ص ۶۱) مستشرقین نے حضور اقدس ﷺ کے لیے نبی کاذب اور مدعی کاذب (Imposture) کے فحش القابات کو مختلف سابقوں اور لاحقوں کے ساتھ ہر زمانے میں اتنی بار استعمال کیا ہے کہ گویا ان کا تکیہ کلام ہیں۔ حالانکہ بعض مستشرقین مثلاً ٹائن بی اس سے متفق نہیں وہ انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ مدعی کاذب ہرگز نہیں تھے۔ (ایضاً ص ۷۵)
۲۷۰۔ ایضاً ص ۴۴۔
۲۷۱۔ ایضاً ص ۳۱۔
۲۷۲۔ مشہور مصنف زکریا ہاشم زکریا نے اپنی کتاب المستشر قون والاسلام میں اس الزام کا خاص طور پر جائزہ لیا ہے اور بڑی تفصیل سے اس کا مدلل جواب لکھا ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام ایک تاریخی دین ہے۔ اپنی اصل و فرع ہر لحاظ سے "سلامتی" تھا۔ اور اسے رسول اللہ ﷺ نے اپنے اخلاق و کردار سے پھیلایا۔ (ملاحظہ ہو: زکریا، ص ۷ تا ۱۷ نیز ص ۴۳ تا ۵۸) اس کے علاوہ مستشرقین کے دوسرے چند اعتراضات بھی نقل کیے ہیں (ص ۲۱۲ تا ۲۲۵) لیکن ان کے جوابات میں اتنی تفصیل سے کام نہیں لیا ہے۔ البتہ فصل سادس میں چند مستشرقین کے اعترافی بیانات نقل کر کے کسی حد تک تلافی کر دی ہے۔ نیز دیکھئے شبلی ج ۱ ص ۱۰۰۔
۲۷۳۔ حتّی، فلپ کے۔ ہسٹری آف دی عربس۔ لندن ۱۹۳۷ء، ص ۱۱۱، ۱۱۲۔
۲۷۴۔ حمادے ص ۶۹
۲۷۵۔ یہ ملاقات بصریٰ میں جناب ابوطالب کے ہمراہ اس وقت ہوئی تھی جب آپ ۹ سال کے تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: صدیقی، مظہر الدین، ص ۱۴۵۔
۲۷۶۔ شبلی، ج ۱، ص ۹۹، ۱۰۰۔ ٹائن بی نے اس الزام کو شد و مد سے پیش کیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: حمادے، ص

Marfat.com

۲۷۵۔ نیز صدیقی، مظہر الدین، ص ۱۵۱۔

۲۷۷۔ شبلی، ج ۱، ص ۱۰۰۔

۲۷۸۔ میور، لائف آف محمد، ص ۲۱۴، تفصیل کے لیے: صدیقی، مظہر الدین، ص ۱۵۸۔

۲۷۹۔ اس دعویٰ بلا ثبوت کی تفصیل ملاحظہ ہو: میور، لائف آف محمد، ص ۱۵۶، ۱۵۷۔

۲۸۰۔ ایضاً ص ۱۵۸

۲۸۱۔ ایضاً ص ۱۵۹

۲۸۲۔ ایضاً ص ۱۶۱

۲۸۳۔ ایضاً ص ۱۵۳

۲۸۴۔ مارگولیتھ کہتا ہے کہ "یہ عین ممکن ہے کہ قریشی سردار (محمد ﷺ کی ہجرت کے بعد) آپس میں ایک دوسرے کو مبارک دے رہے ہوں کہ وہ اپنے ایک تکلیف دہ ہم وطن (Vexation Countryman) سے بغیر کسی خون خرابے کے نجات پا گئے"۔ (صدیقی، مظہر الدین۔ ص ۱۴۸ تا ۱۵۰) مارگولیتھ کی یہ خیال آفرینی بھی تاریخی واقعات کے بالکل خلاف اور لغو ہے۔

۲۸۵۔ یہ واٹ کی خام خیالی ہے۔ مہمات سرایا کا مطلب اُس کے نزدیک یہ تھا کہ قریش کو اپنے خلاف بھڑکایا جائے (نہ کہ مدینہ کی حفاظت کے لیے احتیاطی تدابیر اور جنگی کاروانوں کو روکنے کے لیے معاشی ناکہ بندی وغیرہ) یہ واقعات کے خلاف بھی ہے اور واٹ کے بیان کا تضاد بھی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: صدیقی، مظہر الدین۔ ص ۱۵۵۔

۲۸۶۔ یہ مستشرقین کا عام الزام ہے اور وہ اس بات کے شدت سے قائل ہیں کہ غزوات پاکیزہ جذبات، اعلیٰ و ارفع مقاصد، اور شوقِ شہادت کا نتیجہ نہ تھے بلکہ غریب و مفلوک الحال عربوں کی تنگدستی دور کرنے کا ذریعہ اور لوٹ مار کے تحت مال و دولت جمع کرنے کا شوق تھا۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: قریشی، پروفیسر ظفر علی، ماہنامہ اسلامک لٹریچر۔ ج XIV شمارہ ۵، مئی ۱۹۶۸ء۔ ص ۷، ۸۔ نیز شمارہ ۹، ستمبر ۶۸ء، ص ۸۷۔

۲۸۷۔ دیکھیے: صدیقی، مظہر الدین۔ ص ۱۶۳، ۱۶۴۔

۲۸۸۔ قریشی، پروفیسر ظفر علی (شمارہ اپریل ۶۸ء، ص ۲۰) جنگ موتہ عیسائیت اور اسلام کے درمیان تصادم کا پہلا معرکہ تھا اور یہی صدیوں کے لیے تصادم کا سبب بن گیا۔ (ایضاً ص، ۲۲ نیز ۲۳)

۲۸۹۔ حمادے ص ۷۶

۲۹۰۔ ایضاً ص ۷۱

۲۹۱۔ ایضاً ص ۷۵

۲۹۲۔ ایضاً ص ۷۱

۲۹۳۔ ایضاً ص ۶۹

۲۹۴۔ ایضاً ص ۷۰

۲۹۵۔ ایضاً ص ۷۲

۲۹۶۔ ایضاً ص ۷۲

۲۹۷۔ شبلی، ج ۱ ص ۱۱۴
۲۹۸۔ صدیقی، مظہر الدین ص ۱۶۲
(حضور ﷺ کی شادیوں اور تعددِ ازواج کے بارے میں ذاتِ رسالت پر اعتراض مستشرقین کا محبوب ترین موضوع ہے جس کے ذریعہ وہ (نعوذ باللہ) آپ کی بدمستی اور بوالہوسی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں انہیں کوئی خیر، پاکیزگی، عفت اور حکمت نظر نہیں آتی)
۲۹۹۔ حمادے ص ٦٦
۳۰۰۔ شبلی، ج ۱ ص ۱۱۴
۳۰۱۔ نبی کریم ﷺ نے ایک دفعہ حرم میں نماز ادا کی اور قرآن کی بھی تلاوت کی، اس وقت وہاں کفار بھی موجود تھے۔ جب آپ ﷺ نے سورۂ نجم کی یہ آیت (۲۰) پڑھی وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى، تو کہا جاتا ہے کہ شیطان نے آپ ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے: تلك الغرانیق العلی و ان شفاعتهن لترجیٰ (یہ بت معظم و محترم ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہے) اس شیطانی آیت کے بارے میں واقعہ کو مستشرقین بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور رائی کا پہاڑ بنا ڈالتے ہیں۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے: شبلی ج ۱، ص ۲۸۔ ۳۲۷، ۳۲۶)۔
۳۰۲۔ حضور ﷺ نے اپنی حقیقی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا نکاح کر دیا تھا لیکن پھر تعلقات قائم نہ رہ سکے اور شکر رنجی بڑھ گئی۔ آخر کار حضرت زید رضی اللہ عنہ نے ان کو طلاق دے دی۔ حضور ﷺ نے رسمِ جاہلیت مٹانے کے لیے اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی دلجوئی کے لیے خود نکاح کر لیا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا انتقال ۲۰ھ میں ہوا۔ مستشرقین کے نزدیک یہ صریحاً بوالہوسی تھی۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: نثار احمد۔ نقشِ سیرت۔ کراچی ۱۹۶۸ء۔ ص ۶۲۳ تا ۶۳۹۔
۳۰۳۔ حمادے ص ۲۵، ۴۷۔ یہ عجیب و غریب روایت مستشرقین کے یہاں ہمیشہ مروّج رہی ہے۔
۳۰۴۔ ڈیون پورٹ۔ این اپالوجی فار محمد ﷺ اینڈ دی قرآن (اشاعت اوّل ۱۸۶۹ء۔ اشاعت دوم، البیرونی لاہور ۱۹۷۵ء۔ ص ۱۳۳)
۳۰۵۔ ہیکل۔ ص ۳۲
۳۰۶۔ ایضاً (کذب و افتراء کا ایک شاہکار)
۳۰۷۔ ایضاً (کذب و افتراء کا دوسرا شاہکار)
۳۰۸۔ حمادے ص ۴۹ (یہ ایڈیسن صاحب کا نادر قیاس ہے)
۳۰۹۔ ڈریپر، جون ولیم، اے ہسٹری آف دی انٹلیکچوئل ڈیویلپمنٹ آف یورپ۔ لندن ۱۸۷۵ء (ج ۱ ص ۳۲۹)، یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی اثر انگیزی کا اعتراف ہمیشہ کیا جاتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کی شخصیت کی اثر انگیزی کا فراخدلانہ اعتراف عہدِ حاضر کا ایک مصنف ڈاکٹر مائیکل ایچ ہارٹ بھی کرتا ہے۔ اور دنیا بھر کی، ہر زمانے کی، عظیم ترین اور مؤثر ترین شخصیات کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ سرکار رسالت مآب ﷺ کو بجا طور پر اوّلین مرتبہ کا مستحق سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے: ”قارئین میں سے ممکن ہے کچھ لوگوں کو تعجب ہو کہ میں نے دُنیا جہان کی مؤثر ترین شخصیات میں محمد (ﷺ) کو سرِ فہرست کیوں رکھا ہے اور مجھ سے توجیہہ طلب کریں گے۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں صرف وہی ایک انسان ایسے تھے جو دینی اور دنیوی دونوں اعتبار سے غیر

Marfat.com

معمولی طور پر کامیاب، کامران اور سرفراز ٹھہرے"۔ ملاحظہ ہو ہارٹ میخائل، ایچ کی کتاب:

The 100: (A Ranking of the Most influential persons in history). Hart Publishing Co. New York 1978 (p.337).

۳۱۰۔ LAMARTINE کی کتاب Histoire deca Turquie پیرس ۱۸۵۴ء۔ ج ۲ ص ۲۷۶، ۲۷۷۔

۳۱۱۔ ایضاً

۳۱۲۔ ایضاً

۳۱۳۔ دیکھئے:

Smith, R. BBosworth, Muhammad and Mohammadanism London. 1876 (Second Ed) Reprint. Sind Sagar Academy Lahore p.11, 12.

۳۱۴۔ ایضاً ص ۴۲

۳۱۵۔ ملاحظہ ہو: Badley, R.C.V. the Messenger London 1946 p.338.

۳۱۶۔ ندوی، سید سلیمان۔ سیرت النبی۔ مطبع معارف۔ اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۱ء۔ ج ۴ ص ۴۰۰۔ بیروت کے مسیحی اخبار "الوطن" نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟ اس کے جواب میں ایک مسیحی عالم (داور مجاعص) نے یہ تبصرہ لکھا تھا۔

۳۱۷۔ دیکھئے:

Leonard, Major A.G. Islam - Her Moral and spiritual value. London 1927 p. 20,21;

۳۱۸۔ ملاحظہ ہو:

Guadefroy Demombynes Muslim Institutions London 1950. p.20.

۳۱۹۔ دیکھئے: Leither, G.W. Mohammadism. Lahore. 1893. p.4

۳۲۰۔ Le counte de Boulainvilliers La vie de Mahomet. Amesterdam. 1731 p. 143-44.

۳۲۱۔ Carlyle, Thomas, The Hero as Prophet Islam Service League - Bombay p.23,24

۳۲۲۔ ایضاً۔ ص ۵۳

۳۲۳۔ ملاحظہ ہو: Arther Gilman. The Saraceus. London 1887. p.184-5.

۳۲۴۔ ملاحظہ ہو:

Lane Poole, Stainley. The speaches and Table talk of the Prophet Muhamma. London 1882. p.27-29.

۳۲۵۔ دیکھئے: Watt, W. Montgomery, Muhammad of Mecca. Oxford 1953. p52

۳۲۶۔ Davenport. John, Aplogy for Mohammad and the Quran London (1889) Reprint Lahore 1975 Cap.3 p. 133-34.

۳۲۷۔ ایضاً۔

۳۲۸۔ ملاحظہ ہو:

Khattak, Mustafak. (Ed) Islam, The Holy Prophet. and non-muslim world. Sind Sagar Academay Lahore 1976, p.26. بحوالہ مقالہ "Muhammad's views of a future life. مطبوعہ Two Worlds مانچسٹر ۱۰ اگست ۱۹۴۰ء

۳۲۹۔ ایضاً ص ۶۸ بحوالہ زوال سلطنت روما، ص ۱۰۸

۳۳۰۔ ایضاً ص ۷۹۔ ۸۰

۳۳۱۔ ملاحظہ ہو:

Watt. W. Montgomery, Mohammad Prophet and statesman. Oxford University Press. London 1961 p.236, 237.

۳۳۲۔ زکریا ہاشم زکریا (بحوالہ ہ۔ ج۔ ویلز) ص ۲۷۰

۳۳۳۔ سید سلیمان ندوی (سیرۃ النبی ﷺ) ج ۴ ص ۳۹۹۔

۳۳۴۔ اس فہرست کی تیاری میں اگرچہ اُن تمام کتابوں سے مدد لی گئی ہے جن کا حوالہ وقتاً فوقتاً تاریخی جائزہ کے سلسلہ میں دیا گیا ہے۔ تاہم بطور خاص تین کتابوں سے آزادانہ استفادہ کیا گیا ہے یعنی (۱) العقیقی، نجیب، المستشر قون۔ (۲) الزرکلی، خیر الدین۔ الاسلام (۳) حمادے۔ محمد ﷺ دی پروفٹ۔ اے سلیکٹڈ ببلیو گرافی۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وقت اور وسائل کی کمیابی کے سبب یہ ممکن نہ تھا کہ مستشرقین کے ناموں کے تلفظ اور ہجے، وطن ملک اور زبان کی رعایت سے تحقیق کر کے لکھے جاتے۔ اس سلسلہ میں عام انگریزی مفہوم کو سامنے رکھا گیا ہے۔ تاہم یہ توقع ہے کہ مزید کے ضمن میں یہ سرسری فہرست ان شاء اللہ نقطۂ آغاز ثابت ہوگی، اور دوسرے کام کرنے والوں کے لیے مدد و معاون ہوگی۔ (وما توفیقی إلّا باللہ)

Marfat.com

فہرست مستشرقین حصہ اوّل

تصنیف/تالیف	نام	نام	نمبر شمار
Mohammad and Mohammadanism Chicago 1900.	Adams, Isaac.	آدم	1.
The life and Death of Muhammad, the author of the Turkish religion(London.1679).	Addison, Lancelat	ایڈلیسن	2.
Moyammed.(Philladelphia 1901).	Addler, Felix.M.	ایڈلر	3.
Mohammadals Religions stifter (Leipzig.1935)	Ahren, Karl.	اہرن	4.
The Land of the Messiah, Mohomet and the Pope (London. 1854).	Aiton, John	ایٹن	5.
The Preaching of Islam(London.1896).	Arnold. T.W.	آرنلڈ	6.
Islam; its history, character and relation to christianity (London 1874).	Arnold, J.M.	آرنلڈ	7.
Life of Mahomet (New York 1811).	Irving, Washington	اروِنگ	8.
History of the Saracens (London 1847).	Ockley, Simon.	اوکلے	9.
Confutacion del Alovany Secta Mahammetana (Gronada 1555).	Oksegon, L.Le.	اوکسی گان	10.
Mohammad de Profet der Arabieren. (Amesterdam 1898).	Eigeman, Jakob.	ایج مین	11.
Des effects de tareligion de Mohammed	Oelsner, C.E	اوسنر	12.
Islam under the Arabs (London. 1876).	Osbon, R.D.	اوسبم	13.
Vizlat Muhammad Kuranjanak Ethik ejabiz. Budapest.1902.)	Osztern. S.	اوزرن	14.
An Account of the rise and progress of Mahometanism. (London 1911).	Stubbe. h	اسٹیب	15.

Marfat.com

History of the Ottomon Empire. Preceded by the life of Mohammad (Hurst. 1826 - 35).	Upham, Edward	افام	16.
(i) تاریخ العرب وآدابہم (لندن ۱۸۹۰ء). (ii) ترجمہ روضۃ الصفا فی حیاۃ محمدؐ المصطفیٰ (لندن ۱۸۹۳ء) بمعاونۃ ربہاستنسک	Arbuthnot,F.F.	اربتھنوٹ	17.
Life of Mohammad - (Allahabad.1851). (Das Lebes and die Lehredes Mohammad. 1851- 1861.)	Sprenger, A.	اشپرینگر	18.
Muhamad and Muhammadenism London. 1874 (Reprint - Lahore).	Smith, Bosworth.	اسمتھ	19.
Mahmomet at les Arabs (Rome.1878).	Bachelat, Theodore.	بچیلات	20.
Mohammad and Islam. A comparison with orthodox christianity. (New York 1911).	Bacon. A.S.	بیکن	21.
Mohammad und de Seinen (Leipzig 1907)	Beckendarf.H.C.	بیکن ڈارف	22.
Talks on Mohammed and his followers. (London 1932).	Barton, Theodore.	بارٹن	23.
The dictionary historical and critical of Mr.Peter Bayle (Ed) (London. 1734- 1738).	Bayle, Pierre	بائیل	24.
Mohammedis impos turae (London 1615).	Bedwell.W.	بیڈویل	25.
Mohammad, His Biography and the beginning of the religion of Islam (Warsaw.1914).	Bernfeld, Simon.	برن فیلڈ	26.
The life and teachings of Muhammad (Adyar-1932).	Besant,Annie.	بیسان	27.
Le Problems de Mahomet Paris, 1952.	Blachore, Regis	بلاخر	28.
Mohammad of Koramon (Hamar)-1904.	Blom.P.	بلام	29.

Marfat.com

Muhammad Islam Store profet. Kristiannica. 1911.)	Blytt.Eva.	بلائٹ	30.
Life of Mohammed. (Bombay 1851)	Bowen, George.	بووین	31.
Muhammad skuespiel. the akter. (Ohenhaven 1895).	Brandes. C.E.C.	برانڈے	32.
The Messenger - the life of Mohammed. (London 1946).	Bodley, R.V.C.	بوڈلے	33.
i) Historedes Arabes, aved. la vie de Mahomet (Amersterdam 1731). ii) Vie de Mahomet - 1730.	Boulain Villiers H.C.	بولین ولیرز	34.
Veber Muhammed (Frankfurt 1791).	Brequigny. H.D.	بری گگنی	35.
Budha, Muhammad, Jesus (London, 1938).	Briem. O.E.	بریم	36.
History of the Islamic people.(New York.1947). Eng.Tr.	Brockelmann C.	بروکلمان	37.
Islam' A short study.	Brooks, Archihald	بروکس	38.
The way of the Prophet: An introduction to Islam. (London. 1962).	Brown, D.A.	براؤن	39.
The Era of Mahomet(London 1856).	Brown,G.L.	براؤن	40.
The Begger or the soldier Gautame or Mahomet. (London 1903)	Buckle, Henry.	بکل	41.
Des Leban Muhammeds (Leipzig 1930)	Buhl,F.P.W.	بوہل	42.
Founders of Great Religions: Being persnal sketches of the famous leaders. (New York 1931)	Burrows, Miller	براوز	43.
The life of Mohammed: Founder of the Religion of Islam and the Empire of the saracens. (New York 1830).	Bush, George.	بُش	44.

Marfat.com

of Islam and the Empire of the ;saraes. (New York 1830).			
قصیدۃ البردہ۔ بوصیری مع سیرت مصنف، نقد و شرح ۱۸۹۴ء	Basset, Rene.	باسے	45.
Pilgrimage to Mecca and Medina (1856).	Burton	برٹن	46.
Mohammed undder Koran (Stuttgart. 1951).	Ponet,Rudi	پونی	47.
The Holy Sworel the story of Islam from Muhan to the present. (London 1961).	Payne,P.S.R.	پائنی	48.
Contra Lospartalista. Mahometanos (Rome. 1905-06).	Pedlo,San Paswal.	پیڈلو	49
Uber die Bluctrache beiden Voreslamisschen Arabern und Mahomeds. (Leipzig 1899).	Prucksch, otto.	پروخش	50.
History of Mohametanism and its sects. (London 1834).	Taylor W.C.	ٹیلر	51.
Sances of the Quien, (London 1905).	Tinsdall,W.st.C.	ٹلسڈال	52.
Muhamad the Great Arabian (Houston 1912).	Townsend,Med.W.	ٹاؤن سینڈ	53.
A study of History (London.1954-61).	Toynbee A.J.	ٹائن بی	54.
Muhammed (Leipzig 1907).	Trampe,E.Von.	ٹرمپے	55.
Studies in Biography.(London 1865).	Trotter, H.J.	ٹروٹر	56.
Historie de la vie de Mahomet, Legislative de L Arabic (Paris 1776 - 79).	Turpin, F.R.	ٹرپن	57.
Muhammed and the conquests of Islam. (New York 1968).	Gabrieli, Francesco.	جبرئیلی	58.
Vie de Mahomet (Amesterdam 1748).	Gagnier,J,	جیگنیئر	59.
Mohammed (Paris 1838).	Genevay A.	جینوسے	60.
Mohammadein characrbild. (Berlin. 1878).	Georgens, E.P.	جیورگن	61.
Islam Mohammed and his religion. (New York 1958).	Jaffery, Arthur	جیفرے	62.

Marfat.com

Muhammad and his power. New York 1901.	Johnston, P.Lacy de	جانسٹن	63.
سیرۃ ابن ہشام مع متن و ترجمہ لاطینی - لیڈن ۱۸۸۱ء بمعاونت دی خویہ۔	Jong, P.de	جونگ	64.
La vie de Mahomet, (Paris 1962).	Cheorghur,c.v.	چیورغیو	65.
Mahomet les Khalifes (Paris.1912).	Chagavat,Michel.S.	چگاوٹ	66.
La vie de Mal.omet, (Paris 1929).	Dermanghem.E.	درمنگھم	67.
Maomettòn.1931. سیرۃ الرسول (فلورنس ۱۹۲۹)	Ducati,Bruno	دوکات	68.
Maishaya Muhammad(London 1909).	Dale Codetrey.	ڈالے	69.
Mohammad (New York 1926), Dibble, R.F.	Dibble. R.F.	ڈبلے	70.
Apology for Mohammad and the Quran. London. 1869). Reprint, Lahore 1975).	Davenport , John.	ڈیون پورٹ	71.
The Alcoran of Mahomet(London 1649).	Duryer, Andre	ڈوریر	72.
Mahomet,Founder of Islam(London.,1915).	Draycott.G.M.	ڈریکاٹ	73.
Mahomet dauson lemps.(Geneva.1908).	Ducasse Raymond.	ڈوکاسے	74.
Vie de Mohammed. (Paris 1837)	Desvergers.N.	ڈیورجرس	75.
Spanish Islam (1863). Het.Islaminne (Kruseman.1863).	Dozy.R.P.A.	ڈوزی	76.
The life and death of Mahomet (London 1637).	Raleigh, Sir.W.	ریلے	77.
Vita diMaometto(Milano 1922).	Ram Polde	رام پوڈی	78
Mohammad und die seninen (Leipzig.1907)	Reckender,H.	ریکینڈر	79.
Reflections on Mohammedenism and the conduct of Mohammed (London 1712).	Reeland. A.	ریلینڈ	80.
Mohammad und die welt des Islam. (Leipzig. 1755).	Rehm.H.S.	ریم	81.

Marfat.com

Notice Sur Mahomet.(Paris.1860).	Reinaud, J.J.	رینو	82.
De religione Mohammedica Libra due. (utruht 1704)..	Reland , H.	ریلان	83.
Mahomet et ler origines de L Islamism. (Paris 1880).	Renan, Ernest.	رینان	84.
L.Islam et son prophet- Lausanne 1870).	Rink,F.Th.	رنک	85.
Hayyey Muhammad (Mizz .1932).	Rivlin, Josef. J.	ریولین	86.
I). L' Islam: Mahomet et les origins de L'Islam.. Paris 1957.	Rodinson .M.	روڈنسن	87.
II). Mahomet.(Paris.1961).			
Life of Mahomet.(London 1833).	Roebuck J.A.	روبک	88.
Mohammed (Newyork 1907).	Romro, Jacob	رومرو	89.
Voici le vraj Mohammed et la faux Coran. Paris 1960).	Zakarias, Henna.	زکریا	90.
Le Gedenze religiose de Maometto. Rome 1922.	Sacco,G.	سیکو	91.
The Koran or Al-Coran of Mohammed. (London 1734).	Sale, George.	سیل	92.
Morale de Mahomet. (Paris. 1784).	Sawary Claude E.	سوارے	93.
The life of Mohammed (London.1913).	Sell,Edward.	سیل	94.
Quosuccessu Davidiros. Hymanes Unitatussit Muhammad (Upsaluse.1886).	Svan Borg A.	سوان	95.
A History of Medieval Islam.(London.1965).	Saunders,J.J.	سونڈرز	96.
Muhammadtestics veritatis contraseipsum. (Leipzig.1718).	Schroeder.M.G	شروڈر	97.
Mohammad. The Man and his faith.(Tr.) London 1956.	Tor-Andrae.	طور اینڈرے	98.

Mahomet : La Science chezes Arabs. Paris 1866).	Favrot, Alexis	فیورٹ	99.
Mahometanism unveiled. (London 1829).	Forster Charles.	فارسٹر	100.
Mohammad a Pegebbi Zsidosag Megitelescben. Budapest.1934).	Fried, Dezro	فرائڈ	101.
i). Annali dell's Islam(Hepoli 1905-26). ii). Maometto Profeta d'Arabia(Italina 1910).	Forebing,J.C.	فوربنگ	102.
i). Annali de''s Islam(Hepoli 1905-26). ii). Maometto Profeta d'Arabia(Italina 1910).	Caetani, Leone.	کیتانی	103.
The Hero as prophet - Mahomet.(Newyork.1902).	Carlyle, Thomas	کارلائل	104
Comte dp.L.Islam.Impressions et.etudes. (Paris 1912).	Castries,Henridelac.	کاستری	105.
Leban Muhammad's des stifters der Muhammadanism religion (Hamburg 1814).	Clemens, J.F.G.	کلیمن	106.
Muhammed's religionaus deen Koran(Atona 1908).	Cludius,H.H.	کلاڈیس	107.
Maometto egli Ebrei (Milano 1925).	Corinaldi, Guid.'	کوریناالڈی	108.
Anacdotes of Hazrat Mohammad(London 1939).	Karimi R.W.	کریمی	109.
Muhammad,Hans Lefnad berstted. (Stockholm.1908).	Kastman, Carl.	کاسٹ مین	110.
Mohammad and Mohammedanism (London 1889).	Koelle S.W.	کوئیل	111.
Mohammad der prophet (Hamburg 1851).	Kroppen,P.	کروپن	112.
Essai sur L' Historire des Arabes (1847).	Caussin de Perceval A.P.	کاسن ڈی پرسیوال	113.
Risalah - Ed. Tien. (London 1880). TheApology of al-kindi (London 1887). by Muir.	al-Kindi.	الکندی، عبدالمسیح بن اسحٰق	114.
Le Doctorine et les Deviors de La Religion Musulmane (Paris.1826).	Garcin de Tussy.	گارساں دی تاسی	115.

Marfat.com

Mahomet. (Paris.1957).	Gaudefroy Demombynes	گاڈفرے ڈی مبائن	116.
Mohammedanism an Historical survey. London (1953).	Gibb. H.A.R.	گب	117.
Life of Mahomet (New York 1879).	Gibbon, Edward.	گبن	118.
Mohammed & Islam.(Tr) Yale 1917).	Goldziher, Ignac	گولڈزیہر	119.
The Saracens (London. 1887).	Gilman, Arthur.	گلمین	120.
Mahomet.at son Denure.(Paris 1897)	Gold I.L	گولڈ	121.
The life of Mahomet, founder of the religion of islam and the empire of the Saracens (London 1840).	Green Samuel	گرین	122.
Mohamad Des Leban Nachden Quellen (Mimster 1892 - 95).	Grimme Hubert.	گریم	123.
Muhammad (London 1983).	Lings Martin.	لنگز	124.
Vie de Mahomet d apres la tradition. Paris 1897-98).	Lamairesse EFD.G.	لیمیریس	125.
I) Mahomet in les grand Bommes-de orient (Paris 1889). II) Histore de la Turquie Paris 1854	Lamartine, A.M.	لامارٹن	126.
Muhammedanism (woking. 1889). Reprint Lahore 1893.	Leitner G.W.	لیٹنر	127.
vie de Mahomet (Paris 1939).	Lerougue R.	لیروگ	128.
Moise Jesus et Mahomet on les Trios grands (Paris 1887).	Levy, Simon.	لیوی	129.
The Arabian Prophet' a life of Mohammed from Chinese and Arabic Sources. (Shanghai 1921).	Lew, Che, Fi.	لیو چی فی	130.
Islam, Her moral and spiritual value (London 1927).	Leonard, Arthur G.	لینارڈ	131.
The speeches and table talk of the Prophet Mohammad (London 1882)	Lane Pool, Stainley	لین پول	132.
اخلاص محمدؐ (۱۹۱۱) فاطمہ وبناتِ محمدؐ (روم ۱۹۱۲) مہدالاسلام (روم ۱۹۱۴)	Lammens P. H.	لامنس	133.

Marfat.com

Muhammai mais hayake, Pamoje na haboariza waslium na Maturuki (London 1888). Engt. T. London 1896.	Madan,A.C.	میڈن	134.
i) Allahe-ilaue prefeta parma (Estere 1922). ii) Mahomet ne imposter London 1920.	Magne.mil L.	مگنامی	135.
La vita di Maometto (Milano 1888).	Manfredi vit.	ملنفریدی	136.
Mohammad and the rise of Islam New York, 1905).	Margolioth,D.S.	مارگولیتھ	137.
Mahomometiv ita rerunque gestarm synopsis (Roma 1691).	Maracci, Loius	مراکی	138.
Historia del falsay perverso profete Mahoma (Madrid 1781).	Martin M.J.	مارٹن	139.
The life and the religion of Mohamad and the prophet of Arabia (London 1912).	Menezes,J.L.	مینازلیس	140.
Maometto eil paradise (Milano 1946).	Messara, Pina.	مسارا	141.
An Histry of Muhammedanism (London 1817).	Mills, Charles.	مل	142.
Memories of the life of Mahomet(London 1727).	Millman .H'H.	مل مین	143.
Mahoma su vida (Madrid.1727).	Montero,y vidal J,	مونٹیرو	144.
False divinites.c: On Moses christ and Mahomet and other religions deceptives (London.1870).	Moses, the Lawgiver	موسٰی	145.
History of religios. Judaism,christianity, Mohammedanism (New York 1929).	Moore G.F.	مور	146.
The life of Mahomet from original sources. (London .77).	Muir,Sir William.	میور	147.
Spiritual heroes, a study of some of the worlds' prophets.(New York.1959).	Muzzay,D.S.	موزے	148.
Vita di Maometto(Rome 1946).	Nathene,C.A.	ناتھن	149.
A literary history of the Arabs. (New York. 1907).	Nicholson R.A.	نکلسن	150.
Das Heben Muhammed's nach der Quellen popular darquistett. (Hanover 1863).	Noldeke, Theodor	نولدیکے	151.
An outline of Islam(London 1934).	Norith C.E.	نارتھ	152.
i) Muhammad at Mecca (1953) ii) Muhammad at Medina (1956). iii) Muhammad Prophet and statesman (London 1961)	Watt.W.M.	واٹ	153.
Mohammad de Prophet sein leban and scine lechre(Stuttgart 1843).	Weil, Gustav	ویل	154.

Marfat.com

Fra Missionen Blanat (Muhammedaners (Denmark 1909).	Wellejus, H.	ویلیجس	155.
Half hours with Muhammad: Being a popular Account of the prophet of Arabia and of His More immediate followers together with a short synopsis of the religion he founded (London.)	Wollaston Sir A.N.	والسٹن	156.
Muhammad und sein werk (Stuttgart 1923).	Wueaz,Friechich.	ویاز	157.
(تاریخ مکۃ المکرمہ۔ سیرۃ ابن ہشام مع تعلیقات، اراضی مدینہ منورہ، تاریخ اشراف مکہ وغیرہ)	Wusten feld.F.	وسٹنفیلڈ	158.
L Histore Mahometane (Paris 1657).	Vattier.Pierre.	ویٹیئر	159.
i) Mohammad Messenger d'Allah (Philip 1657). ii. Mohammad (A Bengali Account of the life of Muhammad)Calcutta 1892.	Vieillard,Rene	ویلارڈ	160.
Religio Turcica, Mahometisvita Succorum)1659).	Wallich J.U.	والش	161.
Das Bilal Muhammeds in wandel der Zeiten (Berlin 1916).	Hoss Hans	ہوس	162.
Mohammad elete estana (Budapest 1878).	Hatala, Peter.	ہٹالا	163.
The three great prophets of the world(woking) 1923).	Headley Rowland G.	ہیڈلے	164.
An apology for the life and character of the celebrated prophet of Arabia called Mohammad or the illustrious (London 1829).	Higgins,Godpray.	ہگنز	165.
History of Mahomet the Great Imposter. (Falkirk.1821).	Hillard, Frederick H.	ہلارڈ	166.
Mohammed(Batari.a 1939)	Hopvell,W.R.B.V.	ہوویل	167.
Moises Jesus, Mahomet,(L. Valencia 1903).	Holbach, Paul H.	ہولباش	168.
Mohamet Prophete des Arabs (Paris.1946).	Holma Harri	ہولما	169.
The story of Mohammad (London 1914).	Holland, Edith	ہالینڈ	170.
Muhammad in selected works(ed) Leiden. 1957).	Hurgronje, C.S.	ہرگرونج	171.

Marfat.com

فہرست مستشرقین حصہ دوم

172. اتین مارک (Etieunne Marc Quatreimere)
173. اڈمنڈ کاسل (Edumund Castell
174. اڈولف وارمنڈ Adolf Wahrmund)
175. البرٹس شولٹنز (Albertus Schultens)
176. الفرڈ اکٹاف بل (Alfred Octave Bel)
177. امیلولا فونتے الکنترا Emilo Lafountey Alkontara)
178. اربی نیوس Erponus)
179. اڈلر (Adler, J.G)
180. اسٹینلے ڈین (Stanley Dean).
181. الفسٹن (Elphistone)
182. امبریکو آف مینز (Embrico of Mainz).
183. اسمتھ (Smith W.C)
184. اوٹو (Otto, Richard)
185. الیکزینڈر روس (Allexander Ross).
186. الیس (Alles, T.W)
187. الکوک (Alcocke, Nathan).
188. اموس Amos Pseuel)
189. اوجودی سانتالا (Ugodi Santalla)
100. ایڈورڈ جے جرجی (Edward J.Jurji).
191. اہرٹ (Ehrharth, Jacob)
192. الورٹ (Ahlwardt, Wilhelm)
193. امبرڈس (Imberdis, Victor)
194. اشپربر Sperther , Jakob)
195. اسپاتن (Spien , Bernard)
196. اسپائرو (Spiro, Jean)
197. اڈیلرڈ آف باث (Adelard of Bath)
198. براؤن (Brown, E.G)
199. بریزین (Beresine, N.)
200 بارتھولڈ (Barthold, V.V).
201. برخارٹ (Burchardt. L)
202 بی وائز (Beauvais Vincentde)
203. بیجر (Badger, G.P)
204. بارو (Barrau J.J)
205. بارٹول (Bartol)
206. باڈیئر (Baudier, Michel)
207. بازن (Bazin, Louis)
208. بنیسن Benson A.C)
209. بتمان (Bethman, W,C)
210. بیون (Bevan A.A)
211. بحلیانڈر (Bihliander, ,, Theodor)
212. بلم (Blum Ernest, Alfred)
213. بوساشیو (Boccacio, Giovauni)
214. بولیتھو (Bolitho, William)
215. بیکر (Becker C.H)
216. بریفالٹ (Briffault, R.S)
217. بنگ (Byng, E.J)
218. باکر (Barker E)
219. برنارڈ لوئیس (Lewis, B)
220. بیل (Bell.R)
221. پوکاک (Pococke E)
222. پوسٹل[1] (Postel G)
223. پیرون[2] Perron A)
224. پکتھال[3] (Pickthal M. M.)
225. پامر (Palmer E. H)
226. پالگریو (Palgrave) Arabia 1867.
227. پرائس (Major Price) History of Mohammadan dynasties London 1812.
228. پیٹر (Peter the Venerable).
229. تھیوفین (Theophanes, Saint).
230. تھامس برٹران (Thomss Bertran).
231. تھامپسر (Thompsor, J.W)
232. تھامسن (Thomson, William).
233. ٹیٹس (Titus, M. T).
234. ٹوری (Tory, Fowford.H)
235. ٹریٹن (Tritton, A. S)
236. ٹرولش (Troltsch, Charlotle, F.K.)
237. تشودی (Tochudi, R.)

---

[1] قواعد اللغۃ العربیہ ۱۵۳۸ء [2] ترجمہ۔ الطب النبوی از جلال الدین ابی سلیمان داؤد ۱۸۶۰ء [3] ترجمۃ القرآن، الثقافۃ الاسلامیہ۔

Marfat.com

238. تھیوڈور ولیم جان Theodore Wilhelum Jean Juynboll

239. جرٹرود مارگریٹ[1] (Gertrude Margaret LOrothian Bell)

240. جوتلف برگ (Gotihelf Bergstrasser).

241. جارج جیکب (Jacob, George).

242. جویدی (Ignazio Guidi)

243. جلازر (Edward Glaser)

244. جان ارتھوکی (Jean Arthorki)

245. جبرئیل فیران (Gabriel Ferrand).

246. جبرئیل لیوان (Gabried Levenq).

247. جربرٹ دی اورلیاک (Jarbert de oraliac).

248. جیر (Geer, B. J)

249. جرازبری (Jarazbhry. A.Q.A)

250. جیکل (Jackel, R.).

251. جیمز ڈی روڈا (Jimez de Roda R).

252. جان (John. V.)

253. جونز (Jones, David).

254. جونگ (Jon P.De.)

255. جانسن (Johnson, E. N.)

256. جان کنیتینو (Jon Contineau).

257. جونز (Sir Waillan Joes).

258. جان آف دمشق (John of Damascus)

159. جانسٹن (Johnston).

260. جان لڈگیٹ (John Lydgate)

261. جینی برڈ (Gene berard)

262 چاژکو

263. حتی ((Hitti, P.K) .

264. درنبرگ (Derenbouirg. H)

265. دینی (Etienne Dinet))

266. دی ساسی (AntoineIsac Silvestre de sacy)

267. دورن (.Bernhardt Dorn.)

268. دانتے (Dante)

269. دی خویہ (Gooje, M. J. de)

270. ڈیکوئیل (Decuil)

271. ڈلبرگ (Dalberg. F. V.)

272. ڈالاپورٹ Dalaporte, P.H.).

273. ڈائس (Dias, Eduardo)

274. ڈیل (Diehl, Charles).

275. ڈابس (Dobs, Marcus).

276. ڈی لنگر (Deelinger J. J. I. V.)

277. ڈوگارک (Dugarric, F.J)

278. ڈن (Dunn)

279. ڈیلا ویڈا لیوی (Della vida G Levi)

280. ڈیفریمری (Charles Francois Defreimery)

281. رینکے (Ranke, Leopold, Von)

281. راٹی جی (Rattiges, W.H)

282. ریناخ (Reinach, Satmon)

283. ریسک (Reiske, J K,)

284. ریوش (Reusch, R)

285. رائمنڈ (Reymond, J)

286. رٹر (Ritter H)

287. روپر (Ruper, C. L.)

288. راجر بیکن (Roger Bacon)

289. راڈویل (Rodwell, J, M)

290. ریکنڈورف (Reckendorf)

291. روزنتھال (Rosenthal El.J.)

292. روزنتھال (Rosenthal, F)

293. رونزیوال Sebastien Ronzevalle)

294. روزن (Victor Romaunoivliche Rosen)

295. رازموسن (Lassen Rasmussen)).

296. زامبرینی (Zam Brini F))

297. زویمر (Zwemer, S. M.)

298. زخاؤ (Sachau, E)

299. زیٹرسٹین (Zettersteen, K. V)

300. ساسمنٹو (.Sasmieuto, Mantiu),

301. سرسانو (Sarsano.M.Y S)

302. سرویر (Servier, Andie)

303. سائن (Sine W)

---

[1] انگریز مستشرقہ

Marfat.com

304.	سائمن	Simon, Gottefried)
305.	سلیرو	(Solero, Silvio)
306.	سارڈل	(Sourdel, D,)
307.	سودے	(Southey, R.)
308.	سائیکس	(Sykes, Sir Percy)
309.	سائبرگ	(Syburg, F)
310.	سیورے	(Savery)
311.	سینٹ ہلیر	(Barthelonyst Hailaire.)
312.	سان پیڈرو پیسکال	(San Pedro Perseual)
313.	سدیو جان جاک	(Sedillot, J.J.)
314.	سلیم نوفل	(Salim Nofal)
315.	شن	(Schuon F. J.)
316.	شول	Scholl, Adolf
317.	شروڈر	(Schroeder E)
318.	شووین	(Victor Chauvin)
319.	شولتنز	(Henrik Alber Schultens)
320.	شاخت	(Schacht, J)
321.	شولتنز	(Schultens J.J)
322.	شوفاجیہ	(Jean Sauvaget)
323.	شیناس	(Francis Joseph Steingass)
324.	طنطاوی، الشیخ محمد عیاد	
325	غریفینی	(Eugenio Griffini)
326.	فلکے	(Falke , Robert)
327.	فنگر	(Finger, Charles)
328.	فنلے	(Finlay, G)
329.	فشر	(Fisher, A.M)
330.	فلیگل	(Flugel, G.L)
331.	فونٹین	(Foutane Marivo E)
332.	فوسٹر	(Foster, H.F)
333.	فری مین	(Freeman, E.A)
334.	فک	(Fuck, J)
335.	فان کریمر	(Alfred Von Kremer)
336.	فلایشر	(Fleischer H.L)
337.	فرڈیننڈ	(August Ferdinand Mehren)
338.	فیل	(Gotthold Wail)
339.	قسطنطین الافریقی	(Constantinus Africans)
340.	کانتو	(Centu, Cesare)
341.	کارا	(Carra devon, B)
342.	کیش	(Cash W.W)
343.	کیو	(Cawe,Sydney)
344.	کلارک	(Clarke, James,F)
345.	کلینارڈس	(Clenardus,N)
346.	کریگ	(Cragg, Kenneth)
347.	کیوریو	(Curio,C.A)
348.	کیبل	(Kaibel, F.V)
349.	کلرہال	(Kellerhals,E)
350.	کلین	(Klein,F.A.P)
351.	کرے ہل	(Krehl, C.L.'E)
352.	کارلائل	(Carlyl. H.H.Macartney)
353.	کیوریٹن	(William Curreton)
354.	کوزے گارٹن	(J.G.L.Kosegarten)
355.	کوندے	(Conde)
356.	کوڈیرا	(Franciscus Codera Zaydus)
357.	کروگر	(Kruger)
358.	کلود کاہن	(Cohen Cl)
359	کولن جارج	(Colin,G.S)
360.	کاظم میرزا بک	Kazim Mirza Bek :
361.	کریمسکی	(Krynsky A.E.)
362.	کراتشوفسکی	(Kratch Kovsky, I J)
363.	کلورلے	(Calverley E.E)
364.	کاسٹینو	(Clestino Schea'parelli)
365.	گیر	(Gear,Joseph)
366.	گارڈے	(Gardet,L)
367.	گولڈسیک	(Goldsack,William)
368.	گڈرچ	(Goodrich,C.A)
369.	گیبرٹس	(Guibertus)
370.	گیدی	(Guidi M)
371.	گیام	(Guillaumme Alfred)
372.	گوئٹے	(Goethe)
373.	گرینیبام	(Grunebaum G.E.V)
374.	لسڈن	(Leusden Johan)
375.	لابیوم	(La Beaume,J)

Marfat.com

376.	لفیٹ	(Laffitte Pierre)
377.	لنٹ	(Lunt,'Theodore)
378.	لائتھ	(Lyth,Henricus)
379.	لیبان	(Lebon Dr.G)
380.	لیفی پروفنسال	(Levi Provencal, E)
381.	لارنس	(Lawrence,T.E)
382.	لین	(Edward William Lane)
383.	لینڈبرگ	(Carlo Landberg)
384.	لیس	(William Nassau Lees)
385.	میکڈونلڈ	(Macdonald,D.E)
386.	ماسی	(Mass'e Henri)
387.	مازاس	(Mazas,Alexander)
388.	مورلے	(William Hook Morley)
389.	مینسنگ	(J.Petrus M.Mensing)
390.	مل مین	(Milman)
391.	مورس	(Maurice,F.D)
392.	میلبوگنار	(Melbo Gunnar)
393.	مرکاڈیر	(Mercadier,G)
394.	مارکیل	(Markel,G.H.C)
395.	میار	(Mayer Edward)
396.	میر	(Mayer J.J)
397.	میرس	(Meyerus, P)
398	میمیر	(Meymier,E)
399.	میرو	(Mierow C.C)
400.	میور	(Muir John)
401.	موزرے	(Mouzeray,F.de)
401.	موئر	(Moyer,E.S)
402	منرو	(Munro,D.C)
403.	مینارڈ	(Maynard,Barbier de)
404.	مونٹے	(Montet,Ed)
405.	میشو	(Michaux Bellaire,E)
406	ملر	(August Muller)
407	متوخ	(Eugen Mittwoch)
408	مرکس ملر	(Marcus Joseph Muller)
409	ناتھر	(Nather E.S)
410.	نوفال	(Nauphal.I)
411.	نیل	(Neale, W.H)
412.	نیلسن	(Neilson J.B)
413.	نی مین	(Niemann, A.K)
414.	نللینو	(Nallino Carlo Alfonso)
415.	نبیہ عبود	(Abbot,N)
416.	نسطاس بازنطینی	(Nicetas of Byzantine)
417.	والٹیئر	(Voltair,F.M)
418.	وارف	(Wayriffe V)
419.	ولہاؤزن	(Wellhausen)
420.	ویلز	(Wells, H.G)
421	ویلزوفر	(Welzhofer, H)
422	ونسنک	(Wensinck, A.J)
423	ولیم	(William Monier)
424	وڈس	(Woods, Mathew)
425	وہائٹ	(White Joseph Blanco)
426	ویبرن	(Wybarne, Joseph)
427	ولیم مارسے	(Marcais, W)
428	ولیم رائٹ	(Wright,W)
429	ویپکے	(Frantz Woepcke.)
430	ویٹسٹین	(Johann G.Watzstein)
431	ہاٹنجر	(Hotrtinger,J.H)
432	ہالان	(Hallan)
433	ہیکس پین	(Hackspan)
434	ہال	(Hall, M.P)
435	ہارٹ مین	(Hartman,M)
436	ہیمر	(Hammer,P.J)
437	ہوری	(Hauri,Joh.)
438	ہارٹ	(Haurt,C.L)
439	ہیوٹ	(Havet.Ernest
440.	ہاکنس	(Hawkins, A.F.H.)
441	ہربلوٹ	(Herbelot:d)
442	ہیل	(Hell, Joseph.)
443	ہربل	(Herbel of de Molaimville)
444	ہالفن	(Halphon.L)
445	ہرمیلن	(Hermalin, D)
446	ہگڈن	(Higdon, Ranulf.)
447	ہنداس	(Hondas, O.V)

Marfat.com

448	ہبنر	(Hubner.F)
449	ہیوز	(Hughes,J.P)
450	ہیوز	(Husges, William)
451	ہاروے	(New comb Harvey)
452	ہمفرے	(Prideauf Humphrey)
453	یوپی نیوس	(Erpenus Thomas)
454	یولوجیس قرطبی	(Eulogius Cordovan
455	یوجین یونگ	(Eugene Young)

Marfat.com

(1) کتب تفاسیر وعلوم القرآن

۱ الآلوسی، ابوالفضل شہاب الدین سید محمود، روح المعانی، داراحیاء الترث العربیہ، بیروت، (س ن)

۲ ابن تیمیہ، تقی الدین، التفسیر الکبیر، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۹ھ

۳ ابن عربی، محی الدین، تفسیر القرآن الکریم، انتشارات ناصر خسرو، ایران، ۱۹۷۸ء

۴ ابن القیم لجوزیہ، شمس الدین محمد بن ابی بکر، بدائع التفسیر، دارابن الجوزیہ، مکہ مکرمہ، (س ن)

۵ ابن کثیر، ابوالفدا عماد الدین اسماعیل، تفسیر القرآن الکریم، دارالفکر، بیروت، ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء

۶ ابوحیان، محمد بن یوسف الاندلسی، البحر المحیط، دارالفکر، بیروت، ۱۴۱۲ھ

۷ ابوالاعلیٰ مودودی، سید، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۷۸ء

۸ البغوی، محمد الحسین بن مسعود الفراء، معالم التنزیل، دارالکتب العربیہ، بیروت، ۱۴۱۴ھ

۹ البقاعی، برہان الدین ابوالحسن ابراہیم بن عمر، نظم الدرر، دارالکتاب الاسلامی، قاہرہ، ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۲ء

۱۰ البیضاوی، ابوالخیر عبداللہ بن عمر، انوار التنزیل، دارفراس للنشر والتوزیع، مصر، (س ن)

۱۱ الثعالبی، ابوزید عبدالرحمٰن بن محمد، الجواہر فی تفسیر القرآن، مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات، بیروت، (س ن)

۱۲ الجصاص، ابوبکر احمد بن علی رازی، احکام القرآن، سہیل اکیڈمی، لاہور، ۱۴۰۰ھ

۱۳ الخازن، علاء الدین علی بن محمد، لباب التاویل، دارالکتب العربیہ، پشاور، (س ن)

۱۴ الرازی، فخر الدین محمد بن ضیاء الدین، التفسیر الکبیر، دارالفکر، بیروت، ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء

۱۵ الزحیلی، وہبہ، تفسیر منیر، دارالفکر، بیروت، ۱۴۱۲ھ

۱۶ الزرقانی، محمد عبدالعظیم، مناہل العرفان فی علوم القرآن، داراحیاء التراث العربی، بیروت، (س ن)

۱۷ الزرکشی، بدرالدین محمد بن عبداللہ، البرہان فی علوم القرآن، دارالفکر، بیروت، (س ن)

۱۸ الزمخشری، ابوالقاسم جاراللہ محمود بن عمر، الکشاف عن الحقائق التنزیل، نشر البلاغہ، قم، ایران، ۱۴۱۳ھ

۱۹ السیوطی، جلال الدین، الدرالمنثور فی التفسیر بالماثور، ادارۃ المعرفۃ، بیروت، (س ن)

Marfat.com

۲۰ السیوطی، جلال الدین، لباب النقول فی اسباب النزول، دارالکتب العلمیہ، بیروت، (س ن)

۲۱ ایضاً..............الاتقان فی علوم القرآن، سہیل اکیڈمی، لاہور، (س ن)

۲۲ الشافعی، ابوعبداللہ محمد بن ادریس، احکام القرآن، داراحیاء العلوم، بیروت ۱۴۰۱ھ

۲۳ الشوکانی، محمد بن علی بن محمد، فتح القدیر، دارالمعرفہ، بیروت، (س ن)

۲۴ الصابونی، محمد علی، التبیان فی علوم القرآن، دمشق، مکتبۃ الغزالی، ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء

۲۵ صبحی الصالح، ڈاکٹر، مباحث فی علوم القرآن، دارالقلم، بیروت، ۱۹۶۸ء

۲۶ الطبری، ابوجعفر محمد بن جریر، جامع البیان فی تفسیر القرآن، دارالمعرفہ، بیروت، ۱۴۰۹ھ

۲۷ الطنطاوی الجوہری، الجواہر فی تفسیر القرآن، المکتبہ الاسلامیہ، ریاض، (س ن)

۲۸ (حضرت) عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما)، تنویر المقباس، مکتبہ آیت العظمٰی، ایران، (س ن)

۲۹ عبدالرزاق، ابوبکر بن ہمام الصنعانی، تفسیر القرآن العظیم، دارالمعرفہ، بیروت، (س ن)

۳۰ عبدالرحمٰن بن ناصر السعدی، تیسیر الکریم الرحمٰن فی تفسیر کلام المنان، الموسستہ السعدیہ، ریاض، (س ن)

۳۱ المراغی، احمد مصطفٰی، تفسیر المراغی، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۸۵ھ

۳۲ المظہری، قاضی محمد ثناء اللہ، التفسیر المظہری، بلوچستان بک ڈپو، کوئٹہ، (س ن)

۳۳ القرطبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، دارالفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ

۳۴ قطب، سید، محمد، فی ظلال القرآن، دارالعلم، جدہ، ۱۴۰۶ھ

۳۵ قمی، ابوالحسن علی بن ابراہیم، تفسیر قمی، دارالکتاب، ایران، ۱۴۰۶ھ

۳۶ محمد کرم شاہ، الازہری، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۳۹۹ھ

۳۷ النسفی، ابوالبرکات احمد بن محمد، مدارک التنزیل، دارالکتب العربیہ، پشاور، (س ن)

۳۸ نعیم الدین مرادآبادی، سید، محمد، خزائن العرفان، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور، (س ن)

(2) کتب احادیث

۲۹ ابن حجر العسقلانی، شہاب الدین احمد بن علی، فتح الباری، دار نشر الکتب الاسلامیہ، پاکستان ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء

۳۰ ابن خزیمہ، ابوبکر محمد بن اسحاق، صحیح ابن خزیمہ، المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۳۹۵ھ

۳۱ ابن ماجہ، ابوعبداللہ محمد بن یزید قزوینی، سنن ابن ماجہ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، (س ن)

۳۲ ابوداؤد سلیمان بن اشعث، سنن ابوداود، دار الحدیث، بیروت، ۱۳۱۹/ ۱۹۷۱ء

۳۳ احمد، ابوعبداللہ بن محمد بن حنبل، المسند، المکتب الاسلامی، بیروت، (س ن)

۳۴ البخاری، ابوعبداللہ بن محمد بن حنبل، کتاب الزھد، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۴ھ

۳۵ البخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، دار ابن کثیر، ۱۴۱۰ھ/ ۱۹۹۰ء

۳۶ البغوی، ابومحمد الحسین ابن مسعود الفراء، شرح السنہ، المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۴۰۳ھ

۳۷ البیہقی، ابوبکر احمد بن الحسین بن علی، السنن الکبرٰی، مجلس دائرۃ المعارف، دکن، ۱۳۵۴ھ

۳۸ ایضاً.................معرفۃ السنن والآثار، دار الکتب العلمیہ، بیروت (س ن)

۳۹ التبریزی، محمد بن عبداللہ الخطیب، شعب الایمان، المکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۵ھ

۴۰ الترمذی، ابوعیسٰی محمد بن عبداللہ الخطیب، مشکاۃ المصابیح، المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۴۰۵ھ

۴۱ الحاکم، ابوعبداللہ محمد بن عیسٰی، جامع الترمذی، نشر السنۃ، ملتان، (س ن)

۴۲ الدارقطنی، علی بن عمر، سنن الدارقطنی، دار المحاسن، قاہرہ، ۱۳۸۶ھ

۴۳ الدارمی، ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن، سنن الدارمی، دار احیاء السنۃ النبویہ، (س ن)

۴۴ الذھبی، شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن احمد، کتاب الکبائر، مکتبۃ الریاض الحدیثہ، الریاض، ۱۳۹۱ھ

۴۵ ایضاً.................تلخیص المستدرک، مکتبہ دار الباز، مکہ مکرمہ (س ن)

۴۶ الزرقانی محمد، شرح الزرقانی علی الموطاء، دار الفکر، بیروت (س ن)

۴۷ السیوطی، جلال الدین، الجامع الصغیر، دار المعرفہ، بیروت، ۱۳۹۱ھ

Marfat.com

۴۸ ایضا............ جامع الاحادیث، الکبیر، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۴ھ

۴۹ ایضا............ اللآلی المصنوعۃ فی احادیث الموضوعۃ، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء

۵۰ الشافعی، محمد بن ادریس، المسند، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۰ھ

۵۱ الشوکانی، محمد بن علی، الفوائد المجموعة فی الحادیث المو ضوعة، المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۴۰۲ھ

۵۲ الطبرانی، ابوالقاسم سلیمان بن احمد، المعجم الصغیر، مکتبہ سلفیہ، مدینہ منورہ، ۱۳۸۸ھ

۵۳ ایضا............ المعجم الاوسط، مکتبۃ المعارف، ریاض، ۱۴۰۵ھ

۵۴ ایضا............ المعجم الکبیر، دار احیاء التراث العربی، بیروت، (س ن)

۵۵ الطیبی، شرف الدین حسین بن محمد بن عبداللہ، شرح الطیبی، ادارۃ القرآن، پاکستان، ۱۴۱۳ھ

۵۶ عبدالرزاق، ابوبکر بن ہمام الصنعانی، المصنف، بیروت المجلس العلمی، ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء

۵۷ علی القاری، بن سلطان محمد، شرح مسند ابی حنیفہ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۵ھ

۵۸ ایضا............ مرقات، مکتبہ امدادیہ ملتان، ۱۳۹۰ھ

۵۹ العینی، بدر الدین ابومحمد بن احمد، عمدۃ القاری، ادارۃ المنیریہ، مصر، ۱۳۴۸

۶۰ مالک، ابوعبداللہ بن انس الاصبحی، موطا امام مالک، دار الکتب العربیہ، بیروت، ۱۴۰۵ھ

۶۱ مبارک پوری، ابوالعلی محمد بن عبدالرحمٰن، تحفۃ الاحوذی، نشر السنۃ، ملتان، (س ن)

۶۲ المناوی، محمد المدعو عبدالرؤف بن علی، کنوز الحقائق، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۷ھ

۶۳ المناوی، محمد المدعو عبدالرؤف، فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، دار احیاء السنۃ النبویۃ، (م ن)، ۱۰۹۳ھ

۶۴ المنذری، عبدالعزیز بن عبدالقوی، مختصر سنن ابوداؤد، دار المعرفہ، بیروت، (س ن)

۶۵ النسائی ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب، سنن النسائی، بیروت، دار الکتاب العربی، (س ن)

۶۶ النسائی ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب، سنن کبریٰ، دار الکتب العربیہ، بیروت، ۱۴۱۱ھ

۶۷ النووی، محی الدین ابوزکریا یحییٰ بن شرف، شرح صحیح مسلم، نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ

۶۸ الہندی، علاء الدین علی المتقی، کنز العمال، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۰۵ھ

Marfat.com

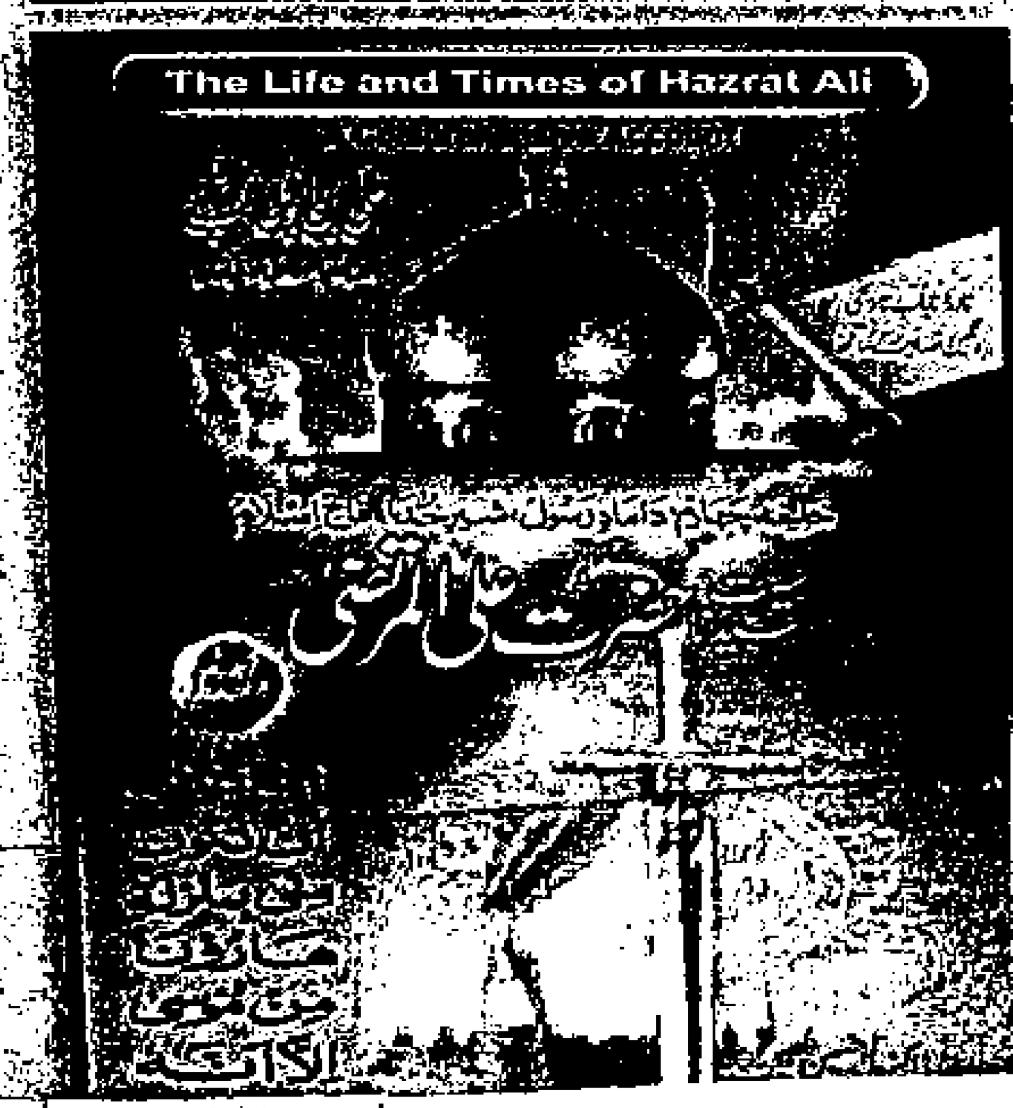

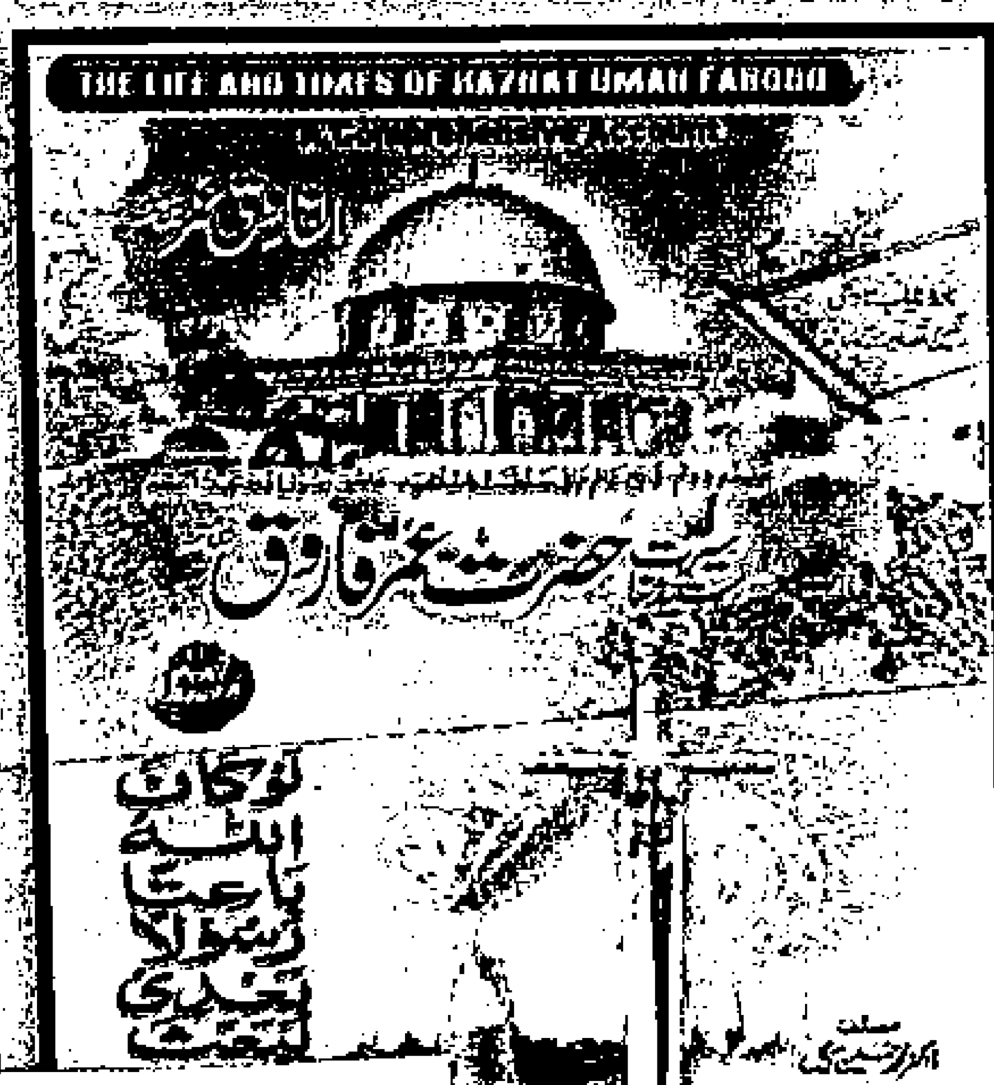

297.9921 م 28 ١٠
145290-U-67

Rs. 995

دُعا پبلی کیشنز

الحمد مارکیٹ اُردو بازار لاہور فون: 042-37233585

E-mail: duapublications@yahoo.com

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل 20 اگست 1888ء کے روز مصر کے شہر کفر غنم میں پیدا ہوئے۔ آپ مصر کے مشہور صحافی، مصنف اور سیاستدان ہونے کے علاوہ وزیر تعلیم کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ 1909ء میں آپ نے قانون میں بی اے کیا اور 1912ء میں پیرس کی سوربون یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پیرس میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران آپ نے اپنا پہلا ناول ''زینب'' تحریر کیا جسے مصر کا پہلا جدید ناول سمجھا جاتا ہے۔ مصر واپسی کے بعد آپ دس سال تک وکیل کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس کے بعد صحافت کے شعبے سے منسلک ہوئے اور ''السیاسہ'' نامی اخبار کے ایڈیٹر انچیف کے عہدے تک پہنچے۔ 1937ء میں آپ کو محمد محمود پاشا کے دوسرے دورِ حکومت میں تعلیم کی وزارت سونپی گئی۔ اپنے دورِ وزارت میں آپ نے کئی اصلاحات متعارف کرائیں۔ آپ مفتی محمد عبدہٗ، احمد لطفی سید اور قاسم امین کی جامع اصلاحات سے بہت متاثر تھے۔ اس دوران لکھنے لکھانے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ آپ کی مشہور کتابوں میں زینب (مطبوعہ 1914ء)، مصری اور مغربی شخصیات کے سوانح (مطبوعہ 1929ء)، حیاتِ محمد ﷺ (مطبوعہ 1933ء)، دارالوحی میں (مطبوعہ 1939ء)، الصدیق ابوبکرؓ (مطبوعہ 1942ء)، سیدنا الفاروق عمرؓ (مطبوعہ 45-1944ء)، ایک مصری سیاستدان کی یادداشتیں (مطبوعہ 53-1951ء)، یوں میری تخلیق ہوئی (مطبوعہ 1955ء)، ایمان، علم اور فلسفہ (مطبوعہ 1964ء)، سلطنتِ اسلام اور مقدس مقامات (مطبوعہ 1964ء)، مصری افسانے (مطبوعہ 1967ء)، اور سیدنا عثمانؓ ابن عفان (مطبوعہ 1968ء) شامل ہیں۔ آپ نے 8 دسمبر 1956ء کے روز وفات پائی۔

Marfat.com

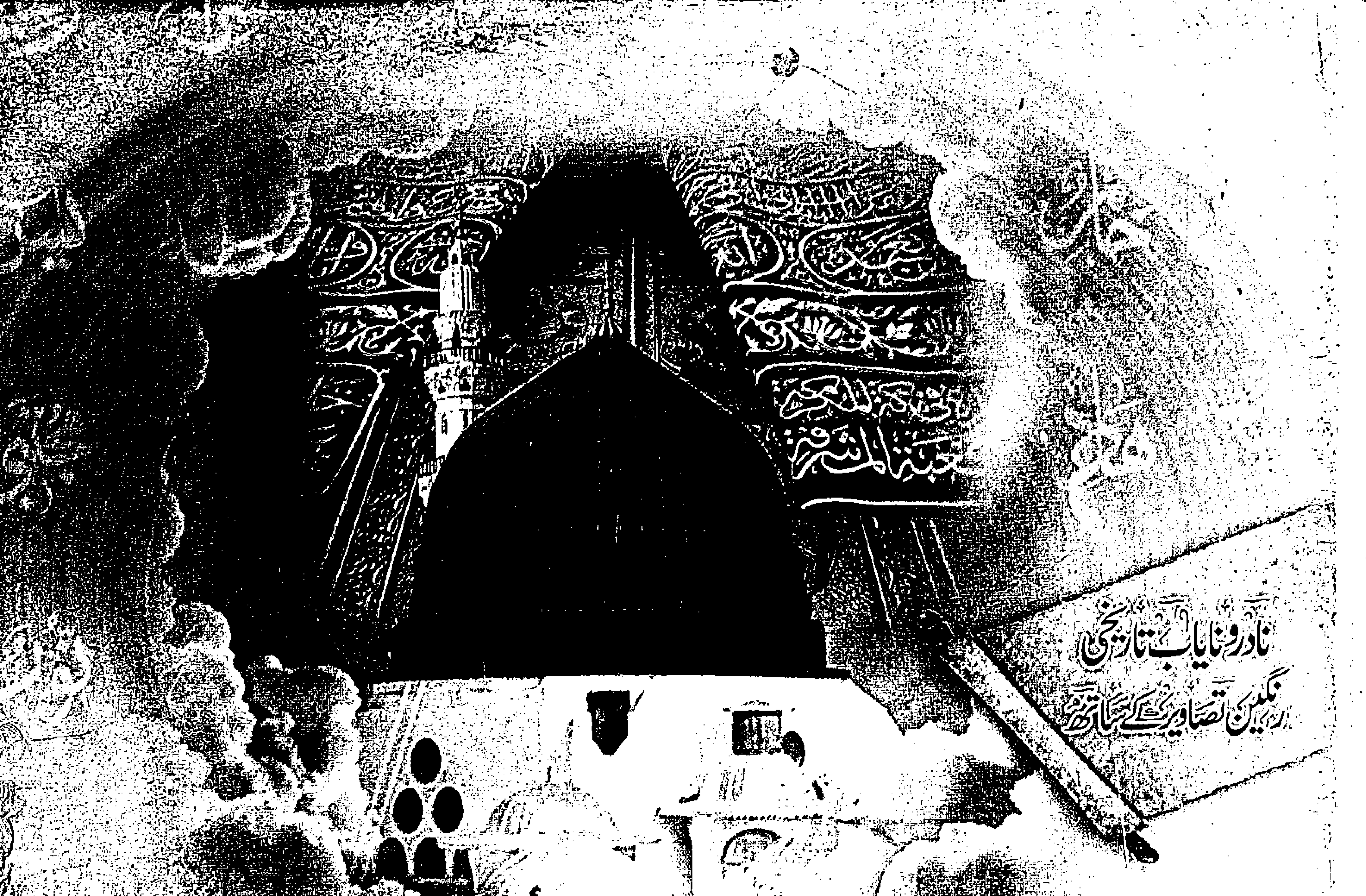

اللھم صل علی محمد النبی
الامی وعلی آلہ وسلم تسلیما
افضل البشر خیر الرسل خاتم النبیین

حیاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

THE LIFE AND TIMES OF HOLY PROPHET (P.B.U.H)

A COMPREHENSIVE ACCOUNT

مصنّف
ڈاکٹر محمد حسین ہیکل
مترجم
معاذ ہاشمی

Marfat.com